برگِ گُل

ایم سُلطانہ فخر

آتے جاڑوں کی رُت تھی۔

ایسا موسم کہ کبھی ٹھنڈ سی محسوس ہونے لگتی اور کبھی گرمی۔

ائیر کنڈیشنڈ خوابگاہ کے دروازے کھڑکیاں گو بند تھیں مگر مغربی سمت کی کھڑکیوں کے پردے سمٹے ہوئے تھے اور شیشوں کی رکاوٹیں پار کرتی ڈھلتی ہوئی سہ پہر کی نیم جان اور سنہری دھوپ اپنے پُرشکوہ ڈبل بیڈ پر بیٹھی بیگم زینت شعیب کے پیروں میں لوٹ رہی تھی۔

بیگم زینت شعیب فربہی مائل جسم۔

کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔ فربہی کی وجہ سے بھرے بھرے پُرگوشت گالوں پر دبتی ہوئی کھڑی کھڑی سی ناک۔ لپ اسٹک کے ہلکے سے شیڈ سے رنگے پتلے پتلے ہونٹوں، چھوٹے سے دہانے، غلافی پپوٹوں اور ڈبل چن یعنی دوہری ٹھوڑی کے ساتھ۔ مجموعی طور پر ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی قبول صورت نظر آ رہی تھیں۔

ان کے گھونگھریلے تراشیدہ اور پولی کلر سے رنگے سُرخی مائل براؤن بال گیلے ہونے کی وجہ سے دونوں شانوں پر اور پیچھے کی طرف بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ باڈر کی ہلکے چمپئی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک کھلا ہوا خط ہاتھ میں لیے، وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں کہ دفعتاً خوابگاہ کے غسلخانے کا دروازہ کھلا اور ان کے دراز قامت اور خوش شکل شوہر شعیب منصور ٹاول کلاتھ کے باتھ گاؤن میں ملبوس تولیے سے اپنے گیلے بال پونچھتے ہوئے برآمد ہوئے۔ وہ چند گھنٹے قبل ہی اپنے کسی کاروباری دورے سے واپس لوٹے تھے۔ غسل خانے سے باہر آتے ہی انہوں نے بیوی پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

"کیا تم نے اس خط کو ابھی تک پڑھا نہیں؟"

تو زینت اپنی محویت سے چونک کر قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں بولیں۔

"نہیں، پڑھ تو لیا ہے مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیوں کیا لاطینی یا کوئی غیر مرئی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس خط میں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔" شعیب منصور نے بال پونچھتے پونچھتے ہاتھ روک کر پوچھا۔ پھر تولیے کو جھٹکتے ہوئے غسل خانے میں چلے گئے اور تولیے کو اسٹینڈ پر ڈال کر واپس

پلٹتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"بھئی صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ فاخرہ بی نے سلوط کے معاملے کو صیغۂ راز میں رکھنے کی تاکید کی ہے اور بس۔"

تو شوہر کی بات پر زینت نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"مگر یہی راز داری میں رکھنے کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس قدر اس کے نکلنے چھپانے سے فائدہ ہی کیا ہوگا۔ دیکھیں نا جب چاند چڑھتا ہے تو کل عالم اسے دیکھتا ہے پھر سلوط کا معاملہ تو ——"

"او ہو تو اتنی باریکیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب فاخرہ بی نے ایسا ہی لکھا ہے تو اس کے پیچھے بھی ان کی کوئی مصلحت ہی پوشیدہ ہوگی۔" شعیب منصور قدرے چڑ کر بولے۔

"واہ عجیب مصلحت ہے۔" زینت نے گردن نیہوڑا کر نکتہ چینی کی۔

"عجیب ہو یا غریب اس سے مجھے یا تمہیں کیا غرض۔ انہوں نے تاکید نہیں ایک طرح کی درخواست کی ہے تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ان کی بات کا تھوڑا بہت پاس ضرور رکھیں اور اس سے ہمارا گھٹ بھی کیا جائے گا۔"

شعیب منصور نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ملازم نے چائے لانے کی اطلاع دی تو شعیب منصور جلدی سے لباس تبدیل کرنے غسل خانے میں چلے گئے۔ اجازت ملنے پر ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا اور زینت کے آگے رکھ کر الٹے پیروں واپس جانے لگا تو زینت نے ٹرالی کا ایک جائزہ لے کر پوچھا۔

"یہ چائے لانے سے پہلے تم نے اسے چیک بھی کر لیا تھا کہ خانساماں نے کیسی بنائی ہے۔"

"جی بیگم صاب! ہم نے خود اپنے ہاتھ سے صاب کے لیے یہ چائے دم کیا ہے۔ بڑا اسٹرونگ قسم کا بنایا ہے۔" ملازم اپنی فوقیت جتانے کی غرض سے دانتوں کی ہلکی سی نمائش کرتا ہوا بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ خانساماں پر نظر رکھا کرو۔ نیا اور اجنبی آدمی ہے۔" انہوں نے کہا تو ملازم کریم "جی بہتر ہے" کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد شعیب منصور آف وہائٹ سلکن کرتے پاجامے میں ملبوس غسل خانے سے برآمد ہوئے اور سامنے دیوار پر لگے خوبصورت ریک پر رکھا اپنا پائپ اٹھا کر پریسر سے اس میں تمباکو بھرتے ہوئے بولے۔

"کیا پرانے خانساماں کو نکال دیا ہے جو نئے خانساماں کو رکھنے کی ضرورت پڑ گئی؟"

"میں نے تو نہیں نکالا بلکہ وہ خود ہی نکل گئے۔ روٹیاں جو لگ گئی تھیں نا نہیں۔ ایک تو ان کے دماغ بہت ہو گئے تھے دوسرے مہینے بھر کا راشن آٹھ دن میں ختم۔ وہ تو مالی اور دربان نے ہی ایک دن ان کی چوری پکڑ لی۔ ایک دکان پر بیچ رہے تھے چاول۔ اس بات پر میں نے انہیں چیک کیا تو سامان اٹھا کر بلا نوٹس ہی غائب ہو گئے۔" زینت نے خانساماں کے جانے کی تفصیل بتائی۔

"ہوں۔ اصل میں خاتونِ خانہ کی بے توجہی اور غفلت سے یہ ملازمین بہت فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ ——"

"لیکن میں ان خواتین میں سے نہیں ہوں۔ جنہیں ہر وقت اپنے بناؤ سنگھار اور سیر و تفریح کی ہی پڑی رہتی ہے۔ میں سوشل ضرور ہوں اور ہر ایکٹویٹی میں حصہ بھی لیتی ہوں۔ مگر گھریلو امور سے کبھی غافل نہیں رہتی۔ اور یہی تربیت میں نے اپنی بچیوں کو بھی دی ہے۔ اور آپ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔" زینت نے شوہر کی بات کو طنز پر محمول کرتے ہوئے اچھا خاصا لیکچر جھاڑ دیا۔

"ہاں ہاں بھئی، تمہاری اس خوبی کے تو ہم دل سے معترف ہیں۔ اور تمہاری انہی خوبیوں سے مرعوب ہو کر تو تم سے شادی کی تھی۔" پائپ کو لائٹر کا شعلہ دکھانے کے بعد دو تین لمبے لمبے کش لے کر شعیب منصور نے بیڈ کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یاد ہے کہ ہماری ارینج میرج ہوئی تھی لو میرج نہیں۔ پھر بھلا آپ میرے اندر چھپی خوبیوں سے کیونکر مرعوب ہو سکتے تھے۔" زینت نے شوہر کی بات کو استہزا پر محمول کیا۔

"ارے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے نا بیگم اور دل کی آنکھیں ان ظاہری آنکھوں سے کہیں تیز ہوتی ہیں۔ سو ہم نے انہی کے ذریعے تمہارے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا تھا۔" شعیب منصور نے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا تو زینت نے کچھ کہنے کے بجائے اٹھلا کر ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر ٹی کوزی ہٹا کر ٹی پاٹ سے پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔

"پہلے چائے پی لیں پھر یہ نکوٹین کا زہر بھرا دھواں پھیپھڑوں میں اتاریے گا۔" زینت شوہر کی تمباکو نوشی کی عادت سے سخت نالاں تھیں۔ انہوں نے چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے قدرے ناگواری سے کہا۔

"ارے سب چلتا ہے زینت بیگم! اب آپ کے روکنے ٹوکنے پر سگریٹ کے بجائے ہم نے یہ پائپ پینا شروع کر دیا ہے۔ تو آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے۔" شعیب منصور نے ان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اونہہ سگریٹ پیا یا پائپ پیا بات ایک ہی ہوئی۔ گویا کسی نہ کسی صورت میں تمباکو کے سٹے لگانا۔" زینت اپنی پیالی میں چینی گھولتی ہوئی ہونٹوں کو بھکائی دے کر بولیں۔ شعیب منصور خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

"کمال ہے سگی بھتیجی کی شادی ہے اور ہمارا تو گویا یہ پہلا کاج ہے۔ پھر بھی سگی پھوپھی نے خود آنے کے بجائے اپنی نند کو بھیج دیا۔ وہ بھی اتنی نصیحتوں اور فضیحتوں کے ساتھ۔" زینت چائے کا گھونٹ حلق سے اتار کر خود ہی بولیں۔

"لیکن اور باتوں کے ساتھ انہوں نے اپنی مجبوری بھی تو ظاہر کر دی ہے کہ عاقب انہیں اپنے ساتھ ورلڈ ٹور پر لے جا رہے ہیں۔ پھر بھلا وہ کیسے ہماری بیٹی کی شادی میں شریک ہو سکتی ہیں۔" شعیب منصور نے بہن کی طرف سے صفائی پیش کی تو زینت نے طنز سے کہا۔

"جی ہاں، جب ہی تو انہوں نے سلوط کو اپنا ریپریزنٹ ٹیٹو (نمائندہ) بنا کر یہاں بھیج دیا ہے۔"

"چلو اگر بھیج بھی دیا ہے تو اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد سلوط تنہا وہاں رہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔"

"اونہہ۔ ہر بات میں مصلحت ہی مصلحت۔ کیا بات بات میں مصلحت برتنا فاخرہ کی کوئی حکمتِ عملی ہے۔" نزہت جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"ممکن ہے کہ حکمتِ عملی ہی ہو لیکن تمہیں اس بات پر اس قدر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل تو یوں بھی تمہارے گھر مہمانداری کا سلسلہ چل رہا ہے۔ سلوط کی دو روٹیاں تم پر بھاری تو نہیں ہوں گی۔" شعیب منصور بیوی کے جلے کٹے انداز پر چڑ کر بولے۔

"کیا آپ کے خیال میں، میں کوئی گری پڑی ہوں جو سلوط کی دو روٹیاں بھاری سمجھوں گی۔ میرے تو سان گمان میں بھی ایسا رکیک خیال کبھی نہیں آیا۔ میں تو صرف اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ میرے نزدیک تو یہ کوئی معیوب بات نہیں جس کی فاخرہ اتنی پردہ پوشی کرنا چاہ رہی ہیں۔" زینت چیں بجبیں سی کیفیت میں بولیں۔

"تمہارے خیال میں نہ سہی لیکن فاخرہ بی کے خیال میں تو ہے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ خود سلوط ہی پسند نہ کرتی ہو۔ اور اس نے فاخرہ بی کو یہ سب لکھنے پر مجبور کیا ہو۔" شعیب منصور بیوی کے سامنے چھوٹی بہن کو ہمیشہ فاخرہ بی ہی کہتے تھے اور زینت کو فاخرہ کے ساتھ یہ "بی" کی دم بہت کھلتی تھی۔ یوں بھی نند کی اتنی طرف داری کرنے پر اندر ہی اندر جز بز ہو رہی تھیں۔ کڑوا سا منہ بنا کر بولیں۔

"خیر جو کچھ بھی سہی ہمیں کیا پڑی ہے پرائے پھٹے میں پیر اٹکانے کی۔"

"ہاں، واقعی ہمارا کسی کی نجی باتوں سے کیا واسطہ۔ ویسے بائی دا وے تم نے اسے کیسا پایا؟" شعیب منصور نے پیالی خالی کر کے اسے میز پر رکھ کر اپنا پائپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیسے؟" زینت بولیں۔

"سلوط کو اور کیسے۔"

"ابھی دو تین ہی روز تو ہوئے ہیں اسے یہاں آئے۔" وہ سلوط کا نام سن کر بیزاری سے بولیں۔

"مگر پوت کے پاؤں تو پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔" شعیب منصور نے ان کی بیزاری پر مسکرا کر کہا۔

"بظاہر تو خاصی معقول ہے۔ یوں بھی شروع شروع ہی تو سب ہی اپنی باندگی دکھاتے ہیں۔" وہ میاں کے مسکرانے پر چڑ کر بولیں۔

"باندگی دکھانے کا محاورہ نہایت بے محل ہے کیونکہ وہ تمہاری نند کی نند ہے۔ ملازمہ یا کام کرنے والی نہیں۔" شعیب منصور نے بیوی کو فوراً ہی ٹوکا۔

"افوہ! آپ تو میری ذرا سی بات کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ورنہ میں نے ان معنوں میں تو یہ محاورہ استعمال نہیں کیا تھا میں نے تو ایک آمد سخن بات کہی تھی۔ مگر بہن کا معاملہ ہے نا اس لیے آپ کو اس میں بھی برائی نظر آئی۔" زینت بگڑ کر بولیں۔

"بہن کا نہیں بہن کی نند کا معاملہ ہے۔ یعنی سمدھیانے کی بات ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ ہمارے کسی رویے سے عاقب کے احساسات کو ٹھیس پہنچے اور کوئی شکر رنجی پیدا ہو۔ بس اس خیال سے تمہیں محتاط رہنے کی تلقین کر رہا ہوں۔" شعیب منصور سنجیدہ ہو کر بولے۔

"کمال ہے بتیس برس گزر گئے ہیں ہمیں ایک ساتھ زندگی گزارتے اور آپ اب تک میری فطرت اور مزاج کو نہیں پہچانے اور ادھر ایک دنیا میری عادات اور اخلاق کی گرویدہ اور معترف ہے۔" زینت نے شاکی سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ جب کہ ان

کا لہجہ چبھتا سا تھا۔

"نہیں، گرویدہ اور معترف تو ہم بھی بہت ہیں۔ لیکن وہ جو ایک روایتی قسم کی جیلسی ہوتی ہے نند اور بھاوج کے درمیان اس کے پیشِ نظر کہہ رہے ہیں۔"

"ہیں کیا کہا۔ جیلسی۔ یعنی میں آپ کی بہن سے جیلس ہوں۔ بغض و حسد رکھتی ہوں اس سے۔ واہ کیا خوب صِلہ دیا ہے آپ نے اتنے برس کی ریاضتوں اور قربانیوں کا۔" زینت شوہر کی طنزیہ باتوں پر ایک دم کھَول ہی اٹھیں۔

"بھئی یہ تم پر کوئی الزام یا بہتان تو نہیں جو تم اس قدر بُرا مان رہی ہو۔ یہ تو ایک فطری سی بات ہے جس کا میں عینی شاہد ہوں میں نے ایک دو مرتبہ نہیں بارہا فاخرہ بی کے ساتھ تمہارے رویے اور تیوروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصے کو اب گڑے مردے اکھیڑ کر خواہ مخواہ ہی تلخیاں پیدا کرنے سے حاصل ہی کیا ہوگا۔" شعیب منصور نے پائپ کے تمباکو کو پریسر سے دباتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ! تلخیاں تو آپ گھول ہی چکے ہیں۔ اور جب آپ نے بات ہی چھیڑی ہے تو پھر میں بھی یہی کہوں گی کہ آپ کی چہیتی بہن نے کبھی میری حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ کبھی بنا کر رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بارہ برس کی تھیں جب میں بیاہ کر آپ کے گھر میں آئی تھی۔ یہی سوچ کر کہ اکلوتی ننھی بہن کی مثل۔ اس پر بے ماں کی بچی ہے۔ اس لیے اسے سر پر بٹھا کر رکھوں گی۔ میں نے اس کا خیال رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ چھوڑی مگر وہاں میری محبت و شفقت کے جواب میں ہمیشہ بے مہری اور بے گانگی سے ہی نوازا گیا۔ اب آپ بُرا مانیں یا بھلا۔ یہاں یہ عادت ہے کہ کوئی اکڑتا ہے یا کتراتا ہے تو ہم بھی اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا پسند نہیں کرتے مگر چونکہ لاڈلی نند کا معاملہ تھا اس لیے ہمیں دل پر جبر کر کے جھکنا پڑتا تھا۔ ان کے سامنے اصل میں آپ لوگوں کے بے جا لاڈ پیار نے فاخرہ کو کچھ زیادہ ہی اوور کانفیڈنس کر کے رکھ دیا تھا۔" زینت نے بڑے ڈھکے ڈھکے انداز میں نند کی نظرت اور مزاج پر چوٹ کی۔

"اصل میں فاخرہ بی ایک ہی تو بہن ہیں ہم تینوں بھائیوں کی۔ بھائی جان نے خیر لندن جا کر اپنی دنیا ہی الگ بسالی تھی لیکن میں اور سہیل ہی رہ گئے تھے ان کے ناز اٹھانے کو۔ وہ صرف چار سال کی تھیں جب بی اماں کا انتقال ہوا تھا۔ ابا میاں نے ان کے انتقال کے تین چار ماہ بعد ہی عقدِ ثانی کر لیا تھا۔ اور بیوی کو لے کر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو کہ اتنی سی بچی کو ہم دونوں بھائیوں نے ہی ماں اور باپ کی شفقت دی تھی بلکہ بھائی جان نے بھی کیونکہ اس زمانے میں تو وہی ہم دونوں سے بڑے تھے۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال کے مگر یہ حقیقت ہے کہ دوسرا خواہ بچے کو کتنا ہی پیار دے اس کے باوجود بھی والدین سے محرومی کا احساس بچے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔ سو یہی کچھ فاخرہ بی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس پر بھائی جان کی جدائی نے بھی انہیں گم صم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ تمہارا یہ شکوہ کچھ بے جا نہیں کہ وہ سگی بھتیجی کی شادی میں شریک نہیں ہو رہیں۔ مگر کیا کریں ان کی فطرت ہی کچھ ایسی بے پروا اور روکھی پھیکی ہے۔ بس ہمارے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ اپنے گھر میں سُکھ چین سے رہ رہی ہیں۔" شعیب منصور نے متعدد بار بتائی ہوئی بات پھر دہرائی تو زینت بڑی دیر سے دل میں کھٹکتی ایک بات کو زبان پر لے آئیں۔

"ہاں دیکھیں ادھر آپ دونوں بہن پر جان چھڑکنے والے بھائی ہیں اور ادھر وہ آپ کے بہنوئی عاقب صاحب ہیں کہ اپنی سیر و تفریح کی خاطر بے چاری اکلوتی بہن کو یہاں بھیج دیا۔ وہ بھی سروس کرنے کی غرض سے۔ جب کہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس پر ایک ہی بہن وہ بھی بے چاری غمزدہ۔ اسے تو عاقب کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے تھا۔ یا دیکھ بھال کے کسی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما دیتے۔"

"لو عاقب بھی بھلا کوئی آدمی ہیں جو ان سے اس قسم کی توقع رکھی جائے۔ پتا نہیں کیسی بھربھری مٹی سے اٹھایا گیا ہے ان کا خمیر کہ زمانے بھر کا اکھل کھرا پن ان میں سما گیا ہے۔ اگر پوچھو کہ بھئی کیسے حال چال ہیں تو جواب ملتا ہے کہ بس اللہ کا کرم ہے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ آج کل کیا شغل ہے تو کہیں گے کہ کوئی خاص نہیں یا کام کیسا چل رہا ہے تو کہا جائے گا کہ بس ویسا ہی جیسا کہ ہمیشہ سے چلتا آ رہا ہے۔ وہ بھی کچھ اتنے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہ معلوم ہوگا جیسے حلق میں نیچے تک ریت پھسلتی جا رہی ہے۔ وہ بندۂ خدا تو محض ضرورتاً ہی بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ رہ کر وہ ہماری فاخرہ بھی یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے گونگی ٹرپ کر رکھی ہو۔ وہ بھی مروتاً ہی بات کر لیتی ہیں۔"

گو شوہر کی باتوں سے زینت کبیدہ خاطر ہو رہی تھیں پھر بھی انہوں نے جس انداز میں اپنے بہنوئی کے نروٹھے پن کا نقشہ کھینچا تھا اس پر ہنسے بنا نہ رہ سکیں۔

"چلیں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ عاقب کو بیوی بھی ہم مزاج ہی ملی ورنہ کوئی شوخ و شنگ مل جاتی تو گزارا مشکل سے ہی ہوتا۔ کہ ازدواجی زندگی میں تو آپس کی انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ ساتھ خیالات اور مزاج کی ہم آہنگی بھی بہت ضروری ہوتی ہے جب

کہ دونوں اولاد جیسی نعمت سے محروم بھی ہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح نبھ رہی ہے۔ خیر فاخرہ کو خدا سدا سُکھی رکھے۔"

"آمین۔" شعیب منصور بولے۔

"اور ہاں ایک پیالی اور بنا دوں آپ کے لیے۔" زینت کو کچھ خیال آیا تو انہوں نے پوچھا۔

"ہاں بنا دو۔ چائے کے تو ہم سدا سے رسیا ہیں یا تمہارے اس نازک سے وجود کے۔" شعیب منصور نے چاہت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ بہانے بہانے میرے موٹاپے کو نشانہ کیوں بناتے ہیں۔ آخر میری عمر تو دیکھیں بڑھاپے کو چھونے لگی ہے اور اس عمر میں تو۔" زینت نے ان کی بات کو طنز پر محمول کر کے بُرا ماننے کے سے انداز میں کہا تو شعیب منصور نے تکیے سے کمر ہٹا کر سیدھے ہوتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

"خدا نہ کرے جو تم بوڑھی ہو۔ ذرا میری نظروں سے تو خود کو دیکھو جن میں تم ویسی ہی دھان پان، نازک بدن اور سیم تن سی نظر آتی ہو۔"

"اے بس چھوڑیں بھی یہ چکنی چپڑی باتیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کی نظروں میں میری کیا وقعت اور حیثیت ہے۔" زینت ان کی پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے بولیں۔

"کیوں کیا میں نے تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ تمہاری محبت میں کبھی خیانت سے کام لیا ہے جانم! جو آج میرے لیے تمہارے احساسات اس قدر منفی ہو رہے ہیں۔"

زینت نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چائے کی پیالی خاموشی سے ان کی طرف بڑھا دی لیکن انہوں نے ایک ہاتھ سے پیالی کے نیچے ان کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پیالی لے کر بیڈ پر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"سنو جانِ من! تمہیں میری صاف اور کھری گفتگو سے تکلیف پہنچی ہے نا تو یہ بھی تو سوچو کہ والدین، بہن بھائی، اولاد سب کے لیے جذبہ ایک ہی ہوتا ہے یعنی محبت۔ لیکن اس محبت میں بھی رشتوں کی مناسبت سے ایک تفریق ضرور ہوتی ہے کہ والدین کے جذبے میں محبت کے ساتھ احترام، تابعداری اور آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اسی طرح بھائی بہن اور اولاد کے رشتوں کے تقدس کو محفوظ رکھتے ہوئے محبت کی جاتی ہے اور اسی تفریق کے ساتھ بیوی کی محبت کے انداز ہی کچھ نرالے ہوتے ہیں۔ وہ رفیقِ سفر بھی ہوتی ہے اور دکھ سکھ کی ساتھی بھی۔ اور ایک چاہنے والی اور باوفا شوہر کو کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ شاید تم کبھی لگا ہی نہیں سکتیں۔ لیکن تم تعلیم یافتہ ہو جوان جوان بچوں کی ماں ہو۔ محبت کی اس تقسیم پر ایک بار ٹھنڈے دل سے غور کر لو۔ تو پھر ہمارے درمیان شکوے شکایت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی۔" شعیب منصور سمجھ گئے تھے کہ وہ کس وجہ سے اتنی دل گرفتہ ہو رہی ہیں! انہوں نے ان کا ہاتھ تھامے تھامے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیے۔" زینت ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں بولیں۔

"نہیں پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی لغو باتوں پر اپنا دل نہیں جلاؤ گی۔ نہسو مسکراؤ پھر۔" انہوں نے کچھ زیادہ ہی مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔ چھوڑیے نا۔ اگر کوئی آ گیا تو کیا سوچے گا بھلا۔" زینت جھینپے جھینپے انداز میں مسکرا کر بولیں۔

"آہا ہا ہا۔ آج اس عمر میں اتنے عرصے بعد بھی تمہیں کسی کے آ جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ کمال ہے عمر کے اس دور میں یہ شرم و احتیاط شاید تمہارا ہی حصہ ہے۔" شعیب منصور نے ان کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں تو ڈھلتی ہوئی عمر کے اس دور میں شرم و حیا کوئی مٹ تو نہیں جاتی۔" زینت ٹرالی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"لیجیے آپ کچھ کھائیں تو۔ دوپہر کا کھانا بھی آپ نے نہیں کھایا۔" انہوں نے ٹرالی شوہر کی طرف کھسکا کر کہا۔

"نہیں، دوپہر کا کھانا تو جہاز میں ہی کھا لیا تھا۔ پھر یہاں کا کس پیٹ میں بھرتا۔" شعیب منصور بولے۔

"ہاں، خوب معلوم ہے کہ کتنا کھایا ہوگا۔ یوں بھی آپ گھر سے باہر کچھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ وہاں بھی دو چار لقمے ہی حلق سے اتار لیے ہوں گے۔" زینت دُلار سے بولیں۔

"نہیں، خیر گھر سے باہر کا نہیں شہر سے باہر کا معاملہ تھا۔ اس لیے اپنی اس عادت کو بحالتِ مجبوری چند روز کے لیے ترک کرنا ہی پڑا۔"

"اچھا چلیں اب تو کچھ کھا لیں۔ کم از کم یہ چکن پیٹیز اور بسکٹ ہی چکھ لیں۔" زینت اصرار کرنے کے سے انداز میں بولیں۔ اور

چکن پیٹیز کی پلیٹ اور بسکٹوں کی کوکی نچلے خانے سے اٹھا کر ٹرالی کی بالائی ٹرے پر رکھ دی۔

"اوہ آپ کچھ کھلائیں اور ہم نہ کھائیں۔ ہماری بھلا یہ مجال کہاں مگر یہ بسکٹ کے لیے چکھنے کا محاورہ بھی خوب ہے۔" شعیب منصور نے کوکی سے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"اُلٹی سیدھی باتوں میں پھر چائے ٹھنڈی کر لی آپ نے۔" زینت بولیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہاری قربت میں ہمیں ٹھنڈی چائے بھی ایک دم کڑک لگتی ہے۔" شعیب منصور نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ تو زینت نظریں کترا کر بولیں۔

"کچھ معلوم بھی ہے کل سے شادی کی رسمیں شروع ہونے والی ہیں اور ادھر بابا صاحب اب تک کاغان ویلی کی سیر سے ہی نہیں لوٹے ادھر آپ بھی دورے پر تھے۔ مجھے جتنی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

"کیوں سہیل اور زوبیا تو ایک ہفتے قبل ہی آ گئے تھے۔ کیا انہوں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی؟" شعیب منصور نے ایک ہی گھونٹ میں پوری پیالی ختم کر کے اسے ٹرالی میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں مدد تو بہت کی دونوں نے ہی مگر زوبیا بھاگ دوڑ کے کام تو نہیں کر سکتی تھیں نا۔ سب کچھ بے چارے سہیل منصور پر ہی پڑ گیا۔ پھر بھی لڑکی کی شادی میں تو رخصتی تک سو سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ صاحبزادے کو کم از کم اتنا تو احساس ہونا چاہیے تھا کہ زندگی میں یہ پہلا خوشی کا موقع ہے وہ بھی بہن کی شادی کا مگر باہر کی ہوا لگ کر تو ان کی نظر میں رشتوں ناتوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔" زینت کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لاابالی پن سے بہت نالاں ہیں۔

"ادھو کچھ زیادہ ہی ناراض معلوم ہوتی ہو۔ اپنے لاڈلے سے لیکن یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ وہ آوارہ گردی کی نیت سے نہیں گیا بلکہ اپنے فارنر دوستوں کو پاکستان کے پُرفضا مقامات کی سیر کرانے کی غرض سے گیا ہے۔ ویسے اسے اب تک واپس تو آجانا چاہیے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شام کے پلین سے آجائے۔"

"ہوں۔ آ بھی جائیں گے تو کون سا تیر ماریں گے۔ ہر معاملے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔" زینت آہستہ سے سر کو جھٹک کر بولیں۔

"لو اس سرے نہ اس سرے۔ آخر تم اس سے چاہتی کیا ہو۔ بے چارا— چار سال تک تو ملک سے باہر ہی رہا اور یہاں بھی رہتا تھا تو زیادہ تر اپنی نصابی سرگرمیوں میں ہی مشغول رہتا تھا۔ اسے بھلا آٹے دال کا بھاؤ کہاں معلوم ہوگا۔ ویسے بائی دا وے۔ کیا کسی چیز کی کمی باقی رہ گئی ہے؟" شعیب منصور نے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے بعد پوچھا۔

"لیجیے۔ کوئی ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ وہاں تو ابھی بے شمار چیزیں باقی رہ گئی ہیں ابھی تو نشان کے طور پر دولہا کو خوانوں میں جو جوڑے چڑھائے جاتے ہیں۔ ان پر چھڑکنے کے لیے کھیلیں بتاشے میٹھی کھیلیں یعنی سفید شکر کے الائچی دانے بھی نہیں منگوائے پنڈیوں کے لیے میوہ اور مکھانے بھی نہیں آئے۔ باتھ گاؤن زری کا دوشالا اور سلیپنگ سوٹ تک نہیں خریدا۔ ادھر آج جیولر نے بھی بلوایا ہے۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ چھوٹی موٹی چیزوں اور ست لڑے کے علاوہ کم از کم چار سیٹ تو بھاری قسم کے دے دوں بیٹی کو۔" زینت بولیں۔

"لیکن ہمارا جیولر تو بہت پرانا بلکہ خاندانی ہے تم نے اس سے زیورات کے سیٹ یہیں منگوا کر پسند کر لیے ہوتے۔ خود جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" شعیب منصور نے پائپ کا دھواں نتھنوں سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"وہ بے چارہ تو سر آنکھوں پر دوڑا دوڑا آجاتا مگر دکان پر جانے کی بات اور ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی بہت سے ڈیزائن نظر پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ یہاں وہ بے چارہ پوری دکان اٹھا کر لانے سے تو رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ— آٹھ دس سیٹ ہی لے آتا۔" زینت بولیں۔

"اچھا تو پھر اٹھو۔ ابھی تو صرف ساڑھے پانچ ہی بجے ہیں۔ یعنی دکان بند ہونے میں آدھ پون گھنٹہ باقی ہے۔ آج ہم اپنی جیب خاص سے ایک علیحدہ سیٹ خرید کر آپ کی نذر کریں گے۔" شعیب منصور اٹھنے کی غرض سے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کیا سچ؟" زینت نے خوش ہو کر پوچھا۔ پھر اٹھتی ہوئی بولیں۔

"لیکن اگر بھاری ہوا تو اسے بھی میں اپنی بیٹی کے جہیز میں لگا دوں گی۔"

"نہیں وہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ایک گفٹ ہوگا اور بیٹی کے لیے زیور کی کیا کمی ہے۔ چار نہیں تم چھ بھاری سیٹ دے دینا۔ چلو اب دیر نہ کرو۔" شعیب منصور نے جوتیوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا بس ایک منٹ میں ذرا یہ لباس تبدیل کر لوں۔" زینت غسلخانے کا رُخ کرتی ہوئی بولیں جس سے ملحق ان کا ڈریسنگ روم تھا۔

"مگر تمہارا یہ لباس کونسا بُرا ہے۔ کتنا سوٹ بھی کر رہا ہے تم پر۔" شعیب منصور نے ان کے لباس کا ایک سرسری جائزہ سا لے کر کہا۔

"ہاں رَو سلک کی ساڑھی ہے جو میں نے سنگاپور سے خریدی تھی مگر گھریلو استعمال کی ہے بس ایک منٹ میں چینج کر کے آتی ہوں اسے۔"

زینت یہ کہتی ہوئی جلدی سے ٹوائیلٹ میں گھس گئیں۔ پھر جب دو منٹ بعد باہر آئیں تو انہوں نے ہلکے آسمانی رنگ کی سیلف پرنٹ کی ایک بہت ہی خوبصورت قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جو ان پر بُری طرح کھب رہی تھی۔ شعیب منصور نے انہیں دیکھ کر شوخ سے انداز میں سیٹی بجائی۔ اور پھر گاڑی کی چابی سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر ان کے ساتھ باہر آ گئے۔

باہر پورچ میں شعیب منصور کی نئے ماڈل کی مرسیڈیز کھڑی تھی جس میں بیٹھنے سے پہلے زینت نے ملازم کریم کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور پھر شعیب منصور نے دروازہ کھول کر پہلے انہیں سیٹ پر بٹھایا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور اپنے پُرشکوہ بنگلے سے باہر نکل آئے۔

باہر ایک گہما گہمی تھی۔ غروبِ آفتاب کے نزدیک بھی زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ایک سیل سا بہہ رہا تھا۔ زینت کا دل خوش تھا۔ روح مگن تھی اور دماغ آسودہ اس لیے انہیں چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری نظر آ رہی تھیں۔

نیون سائن پر رقص کرتی روشنیاں۔

دکانوں میں جلتے قمقمے۔

مکانوں میں جلتی روشنیاں۔

کاروں بسوں اور رکشاؤں کی ہیڈ لائٹیں۔

اور شام کی سنہری فضاؤں میں سرسراتی ہوائیں۔ انہیں مسرت و شادمانی کا سندیس دیتی لگ رہی تھیں۔ فرنٹ سیٹ پر اپنے چاہنے والے اور محبوب شوہر کے ساتھ بیٹھی وہ خود کو فضاؤں میں پرواز کرتا محسوس کر رہی تھیں۔

دولت، ثروت، حیثیت، اسٹیٹس، خوبصورت اور لائق فائق اولاد۔ شوہر کا التفات اور سب سے بڑھ کر دلی طمانیت اور سکون۔

کونسی ایسی نعمت تھی جس سے وہ محروم تھیں۔

کار میں ٹیپ ریکارڈر پر مغربی موسیقی کی ہلکی سی دھن بج رہی تھی۔ جس سے اپنے طور پر شعیب منصور محظوظ ہو رہے تھے۔ زینت اپنی کسی خوبصورت سوچ سے نکل کر ٹیپ بند کرتی ہوئی بولیں۔

"معلوم بھی ہے میں نے کیا سوچا ہے؟"

"ہاں کیا سوچا ہے؟"

"نازیہ روزی کی شادی کے بعد بابا کو بھی ازدواجی بندھن میں باندھ دوں گی۔ بہت چھٹے چھٹے پھرتے ہیں ہر وقت۔ یوں بھی اب انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔"

"لیکن تعلیم اس لیے مکمل تو نہیں کی کہ اسے تہہ کر کے شادی کر کے بیٹھ جائے۔ پہلے اسے اپنے فیلڈ میں قدم تو جمانے دو۔" شعیب منصور نے کہا۔

"قدم بھی جمالیں گے انہیں روپے پیسے کی کوئی کمی تو نہیں۔ یہ اتنی ساری جائیداد مربعے، دونوں فیکٹریاں اور اتنا بینک بیلنس یہی کیا کم ہیں ان کی اکیلی جان کے لیے۔" زینت بولیں۔

"خیر اکیلی جان تو نہ کہو ابھی دو بیٹیاں اور ہیں تمہارے سامنے اور پھر یہ جو تم جائیداد اور مربعوں وغیرہ کے حوالے سے بات کر رہی ہو تو پیسہ قطرہ قطرہ کر کے دریا ضرور بنتا ہے لیکن وہ بھی برسوں میں جا کر لیکن خرچ ہونے میں چند دن ہی لیتا ہے اور میری خواہش ہے کہ اسفند خود اپنے زورِ بازو سے کمائے اور معاشرے میں اپنا ایک مقام بنائے۔ کیونکہ والدین کے پیسے یا اپنی وراثت پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے۔

والے لوگ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے اندر دوسروں کی محتاجی اور بے حسی کی علت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کیمبرج کے اخراجات بھی میں اسے ایک حد ۔ میں بھیجتا رہا جسے تم میری کنجوسی پر محمول کرتی رہیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہاں کا ماحول اور معاشرہ کیسا ہے اور پیسے کی طرف سے بے فکری ذراسی دیر میں انسان کو بھٹکا دیتی ہے۔ اب دیکھ لو چار سال بعد واپس آیا ہے تو کبھی میم ویم کی بیخ ساتھ لگا کر نہیں لایا۔" شعیب منصور نے بیوی کی بات پر اتنا لمبا لیکچر جھاڑا تو وہ اکتا کر بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں خود اس معاملے پر ان سے بات کر دوں گی۔"

"کس معاملے پر؟" شعیب منصور نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ شادی کرنے کے موڈ میں ہیں یا اپنی پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" زینت نے بیزاری سے کہا۔

"ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کر لی ہے۔" شعیب منصور نے قیاس آرائی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ لڑکی کو دیکھ کر تو سچ مچ میری رال ٹپک رہی ہے۔"

"اچھا تو کیا وہ املی یا اچور کی خاصیت رکھتی ہے۔ کیونکہ عموماً کھٹی چیزوں کو دیکھ کر ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔" شعیب منصور نے ہنس کر کہا۔

"اب آپ تو ہر بات کو یا تو مذاق میں اڑانے لگتے ہیں یا پھر سیریس ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکی آپ کے داماد احمد سروش کی خالہ زاد ہے۔ بڑے ہی ویل آف لوگ ہیں اور زرنباش تو اتنی خوبصورت ہے جیسے خدا نے اسے اپنے ہاتھ سے ہی بنایا ہو۔ اس پر تعلیم یافتہ اور اسٹائلش بھی بہت ہے اور با اخلاق اور ہنس مکھ بھی ایسی کہ یوں لگتا ہے جیسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلیاں سی چٹک رہی ہوں۔" زینت نے لڑکی کا نقشہ کھینچا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا لڑکی نہ ہوئی کلیوں کا گلدستہ ہو گئی۔ مگر بیٹی کی سسرال سے بہو لانے کی کبھی سوچنا بھی نہیں۔ کیونکہ اگر تمہارے بیٹے کا مزاج اس سے ملا نہیں جس کے امکانات یقینی ہیں تو تمہاری اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تلخیوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔"

"واہ آپ کو کیا الہام ہوا ہے کہ اسفند کا مزاج اس سے نہیں ملے گا۔ ہونہہ! یہ کہیے کہ آپ بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو ہی نہیں رکھتے۔" زینت برا سا منہ بنا کر بولیں۔

"اب میری ذات کو اپنے طنز کا نشانہ نہ بناؤ۔ بھلا کون باپ ایسا ہوگا جسے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو نہ ہو۔ لیکن ہر کام موقع اور محل پر ہی اچھا لگتا ہے۔ ابھی اس کی دو بہنیں اور بیٹھی ہیں۔ چلو اگر نیلما چھوٹی بھی ہے تو کم از کم نیلوفر تو اس قابل ہے کہ ایک آدھ سال بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر تمہیں اپنے بیٹے کے خیالات بھی معلوم ہیں کہ وہ کیسی لڑکی چاہتا ہے۔ کم از کم زرنباش جیسی لڑکی کو تو بالکل پسند نہیں کرے گا کیونکہ وہ فطرتاً سادگی پسند ہے۔" شعیب منصور کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فی الوقت بیٹے کی شادی کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ زینت بھی سمجھ ہی گئیں۔

"خیر۔ یہ تو اس کا عندیہ لینے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ زرنباش اس کے معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں اترتی۔ مگر یہ آگے کہاں بڑھے جا رہے ہیں۔ کیا بھول گئے جوہری کی دکان۔ وہ پیچھے رہ گئی ہے مگر آپ کار یہیں روک دیجئے۔"

زینت نے ان کی بات کا جواب دیتے دیتے انہیں جوہری کی دکان کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بیک ویو مرر میں دیکھ کر کار کو وہیں روکنے کے بجائے ریورس گیر میں ڈال کر اسے بیک کیا کہ اتفاق سے پیچھے کار پارکنگ کا حصہ خالی تھا۔ پھر دونوں میاں بیوی کار سے اتر کر جوہری کی دکان میں داخل ہو گئے۔

شعیب منصور کے والد منصور احمد اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ بس تین چار مربعے اور تھوڑی سی جائدادیں ان کی ملکیت تھیں۔ ان کی بیوی خدیجہ بیگم رشتے میں ان کی پھوپھو زاد بھی تھیں۔ خدیجہ بیگم کے بطن سے منصور احمد کی اولادیں تو کئی ہوئی تھیں مگر تین لڑکے اور ایک لڑکی ہی زندہ رہ سکی تھی لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ منصور احمد اچھے خاصے آسودہ حال تھے۔ اس لیے انہوں نے بیوی کا علاج معالجہ بھی خوب کرایا۔ مگر شاید وہ تیس برس کی عمر ہی لکھوا کر لائی تھیں۔ جو مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق صحت یاب ہونے کے بجائے ان کی صحت گرتی ہی گئی۔ اور وہ فاخرہ کو جنم دینے کے پورے چار سال بعد سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

اس سمے سب سے بڑے بیٹے ضعیب منصور عمر کی سولھویں منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ شعیب ان سے چار سال چھوٹے تھے اور سہیل منصور آٹھ برس ۔ اور بن ماں کی چار سالہ بچی فاخرہ گھر کے گوشے گوشے میں ماں کو تلاش کرتی نظر آتی تھی۔ باپ کچھ فطرتاً رنگین مزاج کے واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع سے ہی اولاد پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی بیرونی دلبستگی تھی وہ بچوں کی تعلیم کی طرف سے بھی لاپرواہ تھے۔ کیونکہ ایک تو خود انہوں نے زیادہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ دوسرے زمیندار تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کی طرح ان کے بیٹے بھی بڑے ہو کر زمینوں کا کام سنبھال لیں گے۔ مگر خدیجہ بیگم کے میکے میں تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد بھی ایک مدرسے میں معلم رہ چکے تھے اور دادا بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ وہ خود بھی خاصی پڑھی لکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میاں کی مخالفت کے باوجود اپنے تینوں بیٹوں کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ ضعیب کو خود بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور سولہ سال کی عمر میں انہوں نے میٹرک بھی پاس کر لیا تھا۔

گھر میں باپ کے علاوہ بڑی اولاد یا بڑے بھائی کی حیثیت بھی میر کارواں کی سی ہوتی ہے۔ اگر بڑا بھائی اچھی عادات، عمدہ خصائل، اخلاق اور کردار کا ہو تو اس سے چھوٹی اولادیں اس کی تقلید ضرور کرتی ہیں۔ شعیب منصور کا رجحان تعلیم کی طرف نہ تھا۔ ہر وقت کھیل کود، دھینگا مشتی اور آوارہ گردی میں ہی مصروف نظر آتے۔ آٹھ سالہ سہیل منصور بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے مگر ضعیب منصور دونوں کو ٹھونک بجا کر کسی نہ کسی طرح راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر ماں کی علالت بھی شدت اختیار کر گئی تھی۔ ماں کے یہ تینوں بھائی دم و دیوانہ تھے۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور نے بڑے بھائی کے احکامات پر خاموشی سے سر جھکا

دیا تھا۔ سہیل تو یوں بھی چھوٹے تھے اور باپ سے زیادہ بڑے بھائی سے ان کی جان نکلتی تھی۔ اس لیے ان پر ضعیب کو زیادہ محنت صرف کرنی نہیں پڑی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز خدیجہ بیگم جیسی جان چھڑکنے والی اور عزیز ترین ماں ان چاروں بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر منہ موڑ گئیں۔ اور زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ان تینوں بھائیوں کے لیے سانحہ سے کم ثابت نہ ہوا۔

ماں کے انتقال کے بعد باپ جو تیسرے چوتھے دن گھر میں نظر آجاتے تھے۔ دسویں کی فاتحہ تک ہی اپنے بچوں کا ساتھ نباہ سکے تھے۔ اس کے بعد دسویں پندرھویں دن ہی ان کی صورت دیکھنے کو ملتی تھی۔ تین چار روز کے قیام کی غرض سے گھر میں آتے بھی تو بیٹوں کی شامت آجاتی۔ سب سے زیادہ ضعیب سے نالاں تھے جو زمینوں کا کام سنبھالنے کے بجائے تعلیم کی طرف راغب تھے۔ اپنی اولاد میں اگر تھوڑا بہت لگاؤ تھا تو وہ معصوم سی چار سالہ فاخرہ سے ہی تھا۔ اصل میں تو وہ اسی کے خیال سے آبھی جاتے تھے مگر نہ معلوم کیوں فاخرہ ان سے بہت گھبراتی تھی۔ بُلانے پر ان کی گود میں چلی تو جاتی تھی مگر یا تو رونے لگتی یا مچل کر فوراً ہی اُتر جاتی۔

بہرحال بیوی کے انتقال کے بعد یہ شروع شروع کے چونچلے تھے۔ باپ کے دل میں قدرت نے شاید اولاد کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھا ہی نہ تھا۔ جو منصور احمد نے رفتہ رفتہ آمد و رفت بالکل ہی کم کر دی تھی۔ البتہ خرچ بڑی باقاعدگی سے بھجوا دیا کرتے تھے۔

پھر ایک روز وہ آئے تو ان کے ساتھ ایک اجنبی صورت محترمہ بھی تھیں۔ جن کا تعارف بچوں سے انہوں نے "تمہاری چھوٹی امی" کہہ کر کرایا۔ دو چار روز وہ اپنی محترمہ کے ساتھ گھر میں قیام فرما رہے۔ اس کے بعد جو گئے تو معلوم ہوا کہ چھوٹی حویلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس وقت ضعیب ہی ساری اولادوں میں کچھ باشعور تھے۔ حالات کی تلخیوں نے اس نوعمری میں ہی ان پر فہم و ادراک کے دروازے کھول دیے تھے۔ انہوں نے باپ کی زندگی میں ہی باپ کی جانشینی اختیار کر کے بھائیوں اور بہن کو پڑھایا لکھایا۔ وقت بہتے دریا کی مانند آگے ہی بڑھتا رہا اور تشنۂ علم، دریائے علم سے سیراب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ خود ضعیب نے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔

شعیب بھی اس دوران میں گریجویشن کر چکے تھے اور چونکہ سہیل پڑھائی میں ان سے زیادہ دلچسپی لیتے آئے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے تھرڈ ایئر میں آگئے تھے اور فاخرہ نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ ضعیب کو بیرون ملک جاکر بار ایٹ لا کی ڈگری لینے کا سودا سمایا۔ اور وہ بھائیوں کو بہن کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی بھی تاکید کر کے انگلستان روانہ ہوگئے۔

شعیب کا رجحان واقعی پڑھائی کی طرف نہیں تھا پھر بھی بڑے بھائی کی تاکید پر مارے باندھے انہوں نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ مگر اس دوران میں ایک بڑا خوبصورت حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں خلافِ توقع اس قدر سوتیلی ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جیسی کہ روایتی سوتیلی مائیں ہوتی ہیں۔ وہ خود تو ان کے گھر نہیں آتی تھیں مگر جب بھی سوتیلے بیٹے باپ سے ملنے چھوٹی حویلی جاتے تھے وہ بڑی مہر و لگاوٹ سے پیش آتی تھیں۔ ان دنوں شعیب منصور نے ایم۔ اے پریویس میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ نصاب کی قیمتی کتابیں خریدنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ جس کا حل ڈھونڈنے وہ باپ کے پاس گئے تھے۔ وہیں ایک خاتون موجود تھیں۔ بڑی طرح دار اور باوقار سی۔ انہوں نے شعیب منصور کو دیکھتے ہی اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا۔ وہ شعیب منصور کی سوتیلی ماں کی سہیلی تھیں۔ شعیب منصور کے جانے کے بعد انہوں نے ان سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کی تو سوتیلی ماں سلمیٰ بیگم یہ رشتہ طے کرانے پر فوراً تیار ہوگئیں۔

پھر ایک دن انہوں نے کسی بہانے سے شعیب منصور کو بلا کر زینت کو بھی دکھا دیا۔ شعیب منصور کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ سوتیلی ماں یہ کیا چکر چلا رہی ہیں۔ وہ تو بعد میں بات کھلنے پر ہی علم ہوا کیونکہ انہوں نے زینت کے بارے میں۔ ان کا عندیہ لیا تھا۔ اور چونکہ چہیتی بیوی کی خواہش تھی۔ اس لیے باپ بھی فوراً ہی اس رشتے کے لیے راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے شعیب منصور کے ہزار عذر تراشنے کے باوجود بالآخر انہیں راضی کر ہی لیا تھا۔ روپے پیسے کی تو کوئی کمی ہی نہ تھی۔ اس لیے ایک روز ایک شبھ گھڑی میں دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔

ضعیب کو اطلاع دی گئی تو جواب میں انہوں نے بڑی ڈانٹ ڈپٹ کا ایک خط لکھا جس میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے بے دلی سے سہی مگر شادی کے بعد بھی شعیب منصور پڑھتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایم۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اور اس ساری کارکردگی اور کارگزاری میں تین سال کا عرصہ لگ گیا۔

فاخرہ سترہویں سال میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ان کی شادی بھی سلمیٰ بیگم نے ہی کرائی تھی۔

سلمیٰ بیگم کو اوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں مگر پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے گریجویشن کے علاوہ اُردو سبجیکٹ میں ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کر رکھے تھے۔ زیادہ خوبرو نہیں تھیں مگر پُرکشش ضرور تھیں اوسط طبقے سے

تعلق رکھتی تھیں۔ جن کی چادر اتنی مختصر ہوتی ہے کہ بڑی مشکل سے کھینچ تان کر انسان کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ جہاں اعلیٰ تو کیا معمولی درجے کا جہیز مہیا کرنا بھی کار دارد ہی ہوتا ہے۔ اور سلمیٰ بیگم کی تو تین تین جوان بہنیں اور بھی تھیں۔ پیغامات زیادہ تر اوسط طبقے کے ہی آتے تھے ——— اس لیے گھر کی حیثیت دیکھ کر ایسے جاتے کہ پھر کبھی واپس نہیں لوٹتے تھے۔ اور پھر یوں زندگی کے کسی مضبوط سہارے کی آرزو میں بیٹھے بیٹھے سلمیٰ بیگم کے بال پکنے لگے۔ چہرے سے بھی جوانی کی ساری شادابی رخصت ہوگئی۔ اور وہ ایک اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے مرجھایا ہوا پھول بن کر رہ گئی تھیں۔ ایک دن ایک مشاطہ قسم کی عورت نے جو شہر شہر قریہ قریہ گھوم کر آسمانوں پر رقم کیے رشتوں کو زمین پر ملانے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ سلمیٰ بیگم سے منصور احمد کے بارے میں بات کی۔

منصور احمد کی عمر اس سمے اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی جب کہ سلمیٰ بیگم اس سے ایک آدھ سال اوپر پھلانگ چکی تھیں۔ گو وہ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں شادی رچانے کے لیے بالکل تیار نہ تھیں مگر اس مشاطہ کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے بھی سوچا کہ آئندہ نہ معلوم کتنا عرصہ اور جینا پڑے تو کیا ساری عمر بچوں کو تہذیب و اخلاق کا درس دے کر اور پڑھا لکھا کر گزاری جاسکے گی۔ عورت کے لیے مرد کا وجود تو ایک کمین گاہ کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے تلے بیٹھ کر وہ دنیا کی سرد و گرم ہی سے نہیں برائیوں اور خطرات سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ والدین کب تک بیٹی کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ان کے بعد لڑکیاں بھائیوں سے زیادہ بھاوجوں کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے بھائی اچھے بھی ہوتے ہیں۔ تب بھی بھابیاں بے سہارا نندوں کے وجود کو برداشت ہی نہیں کرتیں۔ اور ہر طرح سے بھائیوں کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

سلمیٰ کا بھی ایک ہی بھائی تھا۔ جو نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ اس کے دو بچے بھی تھے۔

چونکہ سلمیٰ کے والدین زندہ تھے اس لیے بھائی بھاوج مع بچوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

مگر آئے دن کسی نہ کسی بات پر چخ چخ ضرور ہوتی رہتی تھی۔ سلمیٰ کا گھر پر خاصا رعب تھا۔ چونکہ وہ سب سے بڑی اولاد تھی پھر سلمیٰ پڑھی لکھی اور سمجھدار تھی اور مستقبل کے آئینے میں آنے والے حالات کا عکس دیکھ چکی تھی۔ اس لیے بحالتِ مجبوری اس نے منصور احمد سے عقد کر لیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سوتیلی روایتی ماؤں سے بالکل مختلف تھی۔

زینت کی والدہ سے سلمیٰ بیگم کی پرانی شناسائی تھی وہ بھی کچھ یوں کہ زینت جب چھوٹی سی تھیں تو انہی کے اسکول میں پڑھتی تھیں اور چونکہ حساب اور جغرافیہ میں کمزور تھیں۔ اس لیے کچھ عرصہ سلمیٰ سے ٹیوشن بھی لیتی رہی تھیں۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ زینت کی والدہ سلمیٰ سے ملنے ان کے گھر آئی ہوئی تھیں کہ شعیب منصور آگئے۔ بہرحال سلمیٰ کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ عاقب کی چھوٹی خالہ سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی تھی کیونکہ ان کی بیٹی بھی سلمیٰ کے اسکول میں پڑھتی تھی بلکہ سلمیٰ اس کی کلاس ٹیچر تھیں۔ گو سلمیٰ کی حیثیت ان کے لباس اور سادگی سے فوراً ہی تاڑ لی جاتی تھی لیکن ان کی شخصیت میں ایک وقار سا تھا۔ اور بات کرنے کا انداز بھی کچھ ایسا پُرکشش تھا کہ دوسرا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ چنانچہ عاقب کی خالہ بھی جو خاصی متمول تھیں۔ ان سے جلد ہی گھل مل گئی تھیں۔ اور ان سے دوستی کا سلسلہ شادی کے بعد بھی چلتا رہا تھا کہ شادی کے بعد تو وہ سردار منصور احمد کی اہلیہ بن کر صاحبِ حیثیت ہوگئی تھیں۔ اس لیے جو کبھی بنظرِ حقارت بھی انہیں دیکھتے تھے وہ بھی ان سے ملنے کھنچے کھنچے چلے آتے تھے۔

پھر اس عرصے میں جب شعیب منصور فارغ التحصیل ہو کر کسی ملازمت کی تلاش میں تھے۔ خدا نے انہیں ایک بہت خوبصورت بیٹے سے نواز دیا۔ زینت کی مستقل اقامت تو اس گھر میں تھی جس میں ان کے شوہر، جلیٹھ، دیور اور نند پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ لیکن شادی کے بعد شعیب منصور چونکہ سوتیلی ماں کے اخلاق اور کردار سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ اسی لیے ان کی آمد و رفت باپ کے یہاں بھی رہتی تھی۔ وہ بیوی اور بچے کو بھی چھوٹی حویلی لے جاتے تھے۔ اور یہ بھی خدا کی شان ہی تھی کہ منصور احمد نے اولاد کے کبھی چاؤ چونچلے نہیں کیے تھے مگر وہ پوتے کے شیدا تھے کہ یوں بھی اصل سے سود زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ پوتے کو ایک منٹ بھی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سلمیٰ بیگم بھی چونکہ بے اولاد تھیں۔ اس لیے یہ بچہ ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بس اس کی محبت میں دونوں میاں بیوی کچھ ایسے گرفتار ہوئے تھے کہ انہوں نے چھوٹی حویلی کی رہائش چھوڑ کر شہر میں اپنی پرانی وضع کی کوٹھی میں جس میں ان کے بچے رہائش پذیر تھے سکونت اختیار کر لی تھی۔

دادا نے پوتے کا نام سردار محمد اسفند رکھا تھا اور اپنی زندگی میں ہی اپنی آدھی جائداد اس کے نام منتقل کر دی تھی۔ شعیب منصور کو بیٹے کی پیدائش کے فوراً ہی بعد منسٹری آف ہیلتھ میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ سہیل کو چونکہ پودوں اور درختوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ باٹنی کے سبجیکٹ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بچپن ہی سے جب کبھی انہیں زمینوں یا شکار پر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیشہ جڑی بوٹیاں اور معدنیات ہی تلاش کرتے نظر آتے تھے اور شعیب منصور کی سفارش پر ہی باپ نے ہزار مخالفت

کے باوجود انہیں کینیڈا جانے کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ ساری اولادمیں کچھ پوتے کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ باپ کی خوشی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شعیب منصور نے زمینوں اور جائدادوں کی دیکھ بھال شروع کردی تھی۔ باپ کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت کچھ سوا ہوگئی تھی۔

پھر چار برسوں پر محیط وقت تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور شعیب کو قدرت نے ایک عدد بیٹی سے بھی نواز دیا۔ بیٹے پر تو باپ نے اپنی ساری محبت اور شفقت نچھاور کرکے ایک طرح سے قبضہ کرلیا تھا اور شعیب منصور کو ہمیشہ سے بیٹی کا بہت ارمان تھا کیونکہ ان کے خاندان میں بیٹیوں کی بہت کمی تھی۔ اور اسی لیے بیٹیوں کی بہت قدر بھی کی جاتی تھی۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور بیٹی کو بہت چاہتے تھے۔ دادا بھی پوتی کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔ لیکن موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ پوتی سے بھی مان گون کرتے۔ وہ دمے کے پرانے مریض تھے اور پرہیزی کھانا کھاتے تھے مگران دنوں ایک تو سردی کی شدید لہر آئی ہوئی تھی۔ اس پر نہ جانے کیا سوجھی یا یہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہونے کا ایک بہانہ ہی تھا کہ بیوی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود فرج میں رکھی ٹھنڈی کھیر کھالی۔ بس اس تھوڑی سی کھیر نے ان کی جان پر بنا دی۔ دمے نے کچھ ایسا شدید حملہ کیا کہ دو تین روز میں چٹ پٹ ہوکر رہ گئے۔

باپ کے انتقال کے بعد شعیب گو ورثے میں چھوڑی جائداد وغیرہ کا بٹوارہ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایک تو دونوں بھائی بیرونی ممالک میں رہ رہے تھے۔ دوسرے سب سے بڑا مسئلہ اس آدھی جائداد کا تھا جو باپ نے اپنی زندگی میں ان کے بیٹے کے نام کردی تھی۔ مگر شعیب منصور اس معاملے میں بھی ان کے بہت کام آئے۔

اصل میں باپ کے رویئے سے وہ کچھ ایسے بددل ہوئے تھے کہ انہوں نے بھائیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ لندن میں ہی سیٹل ہوگئے تھے وہ۔ وہیں انہوں نے ایک ترک خاتون سے شادی کرلی تھی۔ جس سے ان کی دو بیٹیاں بھی تھیں اور انہوں نے باپ کی ورثے میں چھوڑی جائداد سے دستبرداری کے اعلان کے ساتھ ہی شعیب منصور کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بھائی، بہن اور سوتیلی ماں کے حصے ان تینوں کے حوالے کرکے اپنے حصے میں آئی ہوئی رقم سے کوئی معقول سا کاروبار کرلیں۔

سو شعیب منصور نے بھی بھائی کے مشورے کو بہت صائب جانا کہ یوں بھی تین ہزار کا مشاہرہ ان کے شایان اخراجات کے لیے بہت ناکافی ہوتا تھا۔ اور سردست ترقی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ باپ کی زندگی میں انہوں نے شادی کے بعد کبھی ان سے ایک پائی بھی لینی گوارا نہیں کی تھی۔ لہٰذا سب کا حصہ دے کر اور بیٹے کا حصہ نکال کر بھی اتنا بچا تھا کہ انہوں نے اس سے تمام چینی کے برتن بنانے اور گلاس ورک کی دو فیکٹریاں لگالیں۔

غیر بیٹے کی جائداد سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ اسے تو وہ اس کے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرلتے رہتے تھے۔ مگر ان کی زمینوں اور جائداد سے جو کچھ بھی حاصل ہوتا تھا فیکٹری کی آمدنی کے ساتھ چند برسوں میں اتنا ہوگیا کہ بڑے ساہو کاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اور ان کا کاروبار فیکٹریوں سے نکل کر قالینوں کاروں اور ائرکنڈیشنروں تک پھیل گیا۔ مگر ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ خصلت اور کردار کے بھی بہت اچھے تھے۔ غرور نام کو نہیں تھا۔ تھوڑے سے مذہبی خیالات کے بھی حامل تھے۔ اور اپنے معبود حقیقی سے ڈرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں زینت قدرے زودرنج واقع ہوئی تھیں۔ ان کے مزاج میں تھوڑا سا تکون تھا۔ قوت فیصلہ گو مضبوط تھی مگر وہ ظاہر ایسا کرتی تھیں جیسے دوسروں سے مشورہ لیے بغیر کوئی عملی قدم ہی نہ اٹھاسکتی ہوں مگر روشن اور آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد فرض شناس اور میاں کے تیور دیکھ کر چلنے کی عادی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شوہر پر اتنی حاوی نہ تھیں۔ جتنی کہ عام طور پر چہیتی بیویاں ہوتی ہیں۔

بہرکیف آپس میں انڈر اسٹینڈنگ تھی اس لیے بڑی اچھی طرح نباہ ہو رہا تھا۔ قدرت نے انہیں مزید دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ اس لیے اسفند کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

سردار محمد اسفند اپنے نام کے آگے باپ کا نام لکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عجیب سی خصلت اور عادات کا مالک تھا وہ بھی۔ بادوسرے معنوں میں ماں باپ سے زیادہ دادا کی خصلت اور مزاج اس کے اندر حلول کرگئی تھیں۔ اس لیے سخت لاابالی ہونے کے ساتھ ساتھ خشک مزاج اور تند خو بھی تھا۔ کچھ بے جا اور بے انتہا لاڈ و پیار نے بھی اس کے مزاج میں طنطنہ اور تنک سی پیدا کردی تھی۔ اس پر بہنوں کے مقابلے میں خود کو کسی بزرگ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے خاص طور نازپرور کو ہمیشہ یہی ارمان رہا کہ اس کا اکلوتا بھائی کبھی تو ہنس کر اس سے بات کرے یا کم ازکم اس کے ساتھ کیرم، لوڈو اور تاش جیسے گیمز میں شریک ہی ہوجائے۔ مگر کبھی وہ سیدھے منہ اس سے بات ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ اپنی بڑائی کا رعب ہی جھاڑتا نظر آتا تھا۔ گھر میں صرف نیلما ہی تھی۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے جس سے کبھی وہ ہنس بول لیتا تھا۔ باپ سے زیادہ اس کی دوستی چچا سے تھی۔

باپ سے تو وہ صرف ضرورتاً ہی بات کرتا تھا۔ ماں سے بھی وہ اتنا فری نہ تھا جیسے کہ عموماً اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو چاہتا تھا اور کسی سے فری تھا تو وہ اس کی دادی سلمٰی بیگم ہی تھیں۔ جن کے پاس بیٹھ کر وہ پہروں باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور انہیں سے اپنی شکایتیں اور دکھ سکھ کہتا تھا اور سوتیلی ساس ہونے کی وجہ سے زینت اس بات پر بہت خار کھاتی تھیں۔ یوں تو شعیب منصور کے دل میں بھی سوتیلے پن کا احساس ضرور تھا مگر سلمٰی بیگم کی محبت اور خلوص کے آگے وہ خود کو بے بس سا محسوس کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے بیوی کے شکوے شکایتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔

بہرحال یہ تو اس وقت تک کی باتیں تھیں جب اسفند لڑکپن کے دور میں تھا۔ اس کے بعد تو کاروبار میں توسیع ہوجانے کے بعد شعیب منصور کراچی چلے آئے تھے۔ اور وہاں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ بلکہ بینگلور ٹاؤن میں مین ڈرگ روڈ پر ایک عالیشان بنگلہ بھی تعمیر کرالیا تھا۔ جس میں اب ان کی اقامت تھی۔

بیٹیاں بھی اسکولوں کی سرحدیں پار کرکے کالجوں میں پہنچ گئی تھیں اور بیٹا میڈیکل سائنس کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے بیرون ممالک جانے کے لیے پرتول رہا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس کے مزاج میں سنجیدگی اور بردباری آگئی تھی۔ فہم و ادراک کے در تعلیم نے کسی قدر وا کردیے تھے۔ اس لیے رشتوں کی پہچان کا شعور بھی آگیا تھا۔ مزاج میں وہ طنطنہ اور برافرختگی بھی بڑی حد تک کم ہوگئی تھی۔ والدین کے مرتبے کا بھی احساس ہوگیا تھا۔ اور بہنوں کی حیثیت کا بھی۔ مگر ایک عادت سی بن گئی تھی لیے دیے رہنے کی۔ اس لیے ایک گھر میں رہ کر بھی وہ سب سے الگ تھلگ سا رہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھیں جو ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگی رہتی تھیں۔

پھر ایک دن وہ عازم سفر ہوا اور پورے چار برس تک دیار غیر کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتا رہا۔ ایک تو باپ ہی اخراجات کے لیے ایک محدود رقم بھیجتے تھے اس پر اس کی ریزرو رہنے کی عادت اور مزاج میں طنطنے نے اور کچھ وہاں جاکر ایک انسٹی ٹیوٹ میں ٹیوشن دینے کی وجہ سے اسے اتنا وقت ہی نہ ملا کہ وہ وہاں کی آزاد اور اخلاقی قیود سے باہر نکلی ہوئی رنگین فضاؤں میں بھٹک جاتا۔ اس پر مستزاد گھر اور اپنے لتنے زیادہ چاہنے والوں اور پیاروں سے دور چلا گیا تھا۔ تو وہاں کی اجنبی فضاؤں میں اپنی کوتاہیوں کا خیال گاہے گاہے ایک پچھتاوا بن کر اس پر لوٹتا رہتا تھا کہ گھر اور ملک سے باہر جانے کے بعد انسان کو اپنے گھر والوں کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ احساس کبھی کبھی خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ہرچند کہ اسفند بہت لاابالی اور بے پرواہ فطرت کا حامل تھا۔ لیکن یہ احساس ایک پچھتاوا بن کر دونوں اسے تکلیف پہنچاتا رہا تھا۔ گو وہاں کے ماحول میں انسان کو بہت چست اور چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے کہ ہر کام حتیٰ کہ ضروریات زندگی سے متعلق امور بھی وقت کی پیمائش میں محدود کرکے انجام دیے جاتے ہیں۔ اصل میں بیرونی ممالک کی روزافزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں وقت کی قدر کی جاتی ہے۔

ہر شعبۂ زندگی میں ہر بات اور ہر معاملے میں وقت کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ گویا انسان وقت کو نہیں بلکہ وقت انسان کو گزارتا ہے۔

اپنے تعلیمی مشاغل، نصابی سرگرمیوں اور ٹیوشن پڑھانے سے اسفند کو اتنی فرصت ملتی ہی نہ تھی کہ وہ خالی الذہن ہوکر کچھ سوچ سکے۔ شام تک وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ لیٹتے ہی نیند آجاتی تھی۔ مگر لیٹنے کے بعد نیند آنے تک کے قلیل عرصے میں کبھی اپنوں کی یاد آجاتی تو خیالات کے سارے دھارے گھر کی طرف ہی بہنے لگتے تھے۔

بہرحال پورے چار برس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے یا علم کے سمندر کی گہرائیاں ناپنے کی وجہ سے وہ زینت کے بقول انسان بن کر یا اتنا بدل کر نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ اس کے احساسات کی بیداری تھی جس نے اسے ایک دم تبدیل سا کرکے رکھ دیا تھا۔ اور شعیب منصور کی یہ بات یا خیال کچھ غلط نہ تھا کہ باہر کے ماحول نے اس کے اندر کا جمود توڑ دیا ہے۔ اب وہ باپ سے بھی گھل مل کر بات کرتا تھا۔ ماں کے آگے بھی بچھا نظر آتا تھا اور بہنوں سے بھی ہنس بول لیتا تھا۔ سلمٰی بیگم اب کافی ضعیف ہوگئی تھیں۔ اس پر وہ ان کے بقول انگلستان سدھار گیا تھا۔ اس لیے گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا اور وہ اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی تھیں۔ مگر اس نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ انہیں ان کے بھائی کے گھر سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اسے وطن واپس آئے صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ نازپرور کی نسبت تو اس کے آنے سے پہلے ہی طے ہوچکی تھی اس کے آنے کے فوراً بعد ہی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی تھی۔ اور بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اچانک ہی اس کے چند فارنر دوست پاکستان کی سیاحت کی غرض سے آگئے گو ان کا پروگرام تو بھارت اور نیپال وغیرہ تک جانے کا تھا مگر چونکہ وہ کراچی آئے تھے اس لیے وہ انہیں دادی کاغان اور سوات وغیرہ کی سیر کرانے کی غرض سے لے گیا تھا۔ اور پورے پندرہ روز ہوگئے تھے اسے گئے ہوئے۔

اگلے روز سے شادی کی رسومات شروع ہونے والی تھیں اور اس کا کوئی پتا اور نشان نہیں تھا۔ اور اسی بات پر زینت سخت چِڑتا سی ہو رہی تھیں کہ گھر کی بڑی اولاد تھا۔ بڑا بھائی جس کی موجودگی نہ صرف بہت ضروری تھی بلکہ اصل میں تو اسے ہی بڑھ چڑھ کر بہن کی شادی میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ مگر اسے کسی بات کی کچھ پروا ہی نہ تھی۔ جب کہ سہیل منصور جنہوں نے شادی کے بعد کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی سے ایک ماہ قبل مع اہل و عیال کراچی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھی کینیڈا میں ہی اپنی ایک ہم جماعت پاکستانی لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس سے ان کی ایک بیٹی تھی کوثر جو نیلما کی ہم عمر تھی۔

رات گیارہ بجے کا عمل تھا۔ بزرگ پارٹی اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب تھی۔ لیکن نازپرور کے کمرے میں اس سمے تیز روشنیوں اور گہماگہمی کی وجہ سے دن کا سا سماں ہو رہا تھا۔ کہ آج دوپہر سے ہی مہمان آنے شروع ہو گئے تھے اور نازپرور کی دونوں بہنوں نیلوفر اور نیلما سمیت چچازاد اور ماموں زاد، خالہ زاد اور شعیب منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی بھی موجود تھی اور سلوط بھی ایک کونے میں رکھے پف پر بیٹھی تھی۔ سامنے قالین پر دیوار کے قریب کپڑے میں بندھی ڈھولک اور ہارمونیم بھی رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ تمام گفتگو نازپرور کی شادی کے بارے میں ہو رہی تھی۔ بوریت کے آثار تقریباً سب کے ہی چہروں سے ہویدا تھے کہ نیلما نے کسی کے سوال کے جواب میں بڑی بیزاری سے کہا۔

"ہاں، پتا نہیں یہ ممی کو کیا سوجھی جو مایوں کی رسم کل پر ملتوی کر دی۔ ورنہ اس وقت ہم کتنا انجوائے کر رہے ہوتے۔"

"لیکن مایوں کی رسم پر ہی کیا موقوف ہے۔ گانے تو آج سے بھی شروع کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو سنا ہے کہ مہینہ بھر پہلے سے ہی دروازے پر نوبت رکھ دی جاتی تھی۔ اور شادی کے گیت گائے جاتے تھے۔" نازپرور کی ماموں زاد عمیرہ نے کہا جو نازپرور کی ہی ہم عمر تھی۔

"ہاں واقعی، یہ تو خوشی کا موقع ہے کوئی ضروری تو نہیں کہ مایوں والے دن سے ہی گانا بجانا شروع کیا جاتا۔ سچ ہم تو اگر پہلے سے آ جاتے تو آتے ہی شادی کے گیت شروع کر دیتے۔" شعیب منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی یعنی نازپرور کی پھوپھی زاد درخشاں بولی۔ یہ بھی نازپرور کی ہم عمر ہی تھی۔

"تو پھر بسم اللہ آپ ابھی سے شروع کر دیجیے تاکہ اس بوریت سے کچھ تو نجات ملے۔" اسماء بولی۔ جو نازپرور کی خالہ زاد تھی۔

"نہیں بھئی اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہارے شور شرابے سے بزرگ لوگ ڈسٹرب ہوں گے۔" نازپرور نے کہا۔

"اب اس ڈسٹربنس کو چند روز کے لیے تو ان لوگوں کو برداشت ہی کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی تو آپ کا بیڈ روم الگ تھلگ ہے۔" نیلوفر نے کہا۔

"اصل میں نازو آپا تخلیے کی ریہرسل کرنا چاہتی ہیں۔ تبھی تو ہمیں کسی طرح یہاں سے ٹالنا چاہ رہی ہیں۔" حمیرا ہنس کر بولی۔

"نہیں خیر، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" نازپرور لجا کر بولی۔

"مگر اپیا اس طرح مل بیٹھنے کے مواقع —— بار بار تو نہیں آتے کہ تقریباً ساری کزنز اکٹھی ہوں۔ ایسے میں تھوڑا بہت انجوائے تو کرنا چاہیے نا۔" نیلما سب سے زیادہ بوریت محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں اور مشکل تو یہ ہے کہ ہمیں نیند بھی نہیں آ رہی لہٰذا اگانا نہیں تو کم از کم کوئی اور شغل ہی ہونا چاہیے۔" حمیرا نے نیلما کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں واقعی کوئی اِن ڈور گیمز ہی کھیل لیتے ہیں۔" حمیرا کی تجویز پر نیلما نے اپنی جمائی روک کر کہا۔

"اِن ڈور گیم؟ مگر کونسا؟ کارڈز، کیرم —— کرکٹ، اسکریبل —— جو بھی کھیلو گی اس میں اتنے سارے پارٹنر تو شریک نہیں ہو سکیں گے۔ جتنے یہاں موجود ہیں۔" نیلوفر نے نکتہ چینی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"تو پھر تم ہی بتا دو کہ کونسا گیم موزوں رہے گا ہم سب کے لیے۔" حمیرا کتاہٹ سے بولی۔

"کوڑا جمال شاہی۔" درخشاں نے برجستگی سے کہا تو سب کو ہنسی آ گئی۔

"یہ کوڑا جمال کے بجائے اگر کوڑا جلال شاہی ہوتا تو کچھ بات بھی بنتی معنوی اعتبار سے یعنی جلال شاہی کا کوڑا۔" اسماء ہنسنے کے بعد بولی۔

"بھئی اصل میں یہ کھیل تاریخی نوعیت رکھتا ہے۔" نیلوفر کچھ سوچ کر بولی۔

"اچھا۔ کیا واقعی!" فضیلہ نے تعجب سے پوچھا۔ جو نیلوفر کی خالہ زاد تھی۔

"ہاں بھئی۔ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ جمال شاہ۔ مگر فطرت اور مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے نام کی ضد تھا۔

— اس نے اپنے فریادیوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ایسی سزا تجویز کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے فریادیوں کو جمع کرتا تھا اور ایک دائرے کی صورت میں کھڑا کرا کے اپنے سپاہیوں کے ہاتھ میں شاہی کوڑے دے دیتا تھا اور وہ سپاہی فریادیوں کے چاروں طرف گھومتے رہتے تھے اور با آوازِ بلند پوچھتے تھے کہ بتاؤ کس کو کیا شکایت ہے۔ اور جو فریادی بھی پلٹ کر اپنی شکایات پیش کرتا تھا اسے کوڑے مار مار کر ادھ موا کر دیتے تھے۔"

نیلوفر نے جس طرح سوچ سوچ کر یہ ساری حکایت بیان کی تھی۔ درخشاں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ گپ ہانک رہی ہے۔ اس پر نازپرور نے بھی جو اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی گھٹنوں میں منہ دے کر اپنی مسکراہٹ چھپالی۔

"چلو چلو اب اتنی بڑی گپ نہ ہانکو کہ ایک معمولی سے کھیل کو ہسٹوریکل پس منظر پر بھی پیش کر دیا۔" درخشاں نے جتانے والے انداز میں ہنس کر کہا۔

"ہاں ہاں واقعی۔ اور یہ بھول گئیں کہ کوڑے سے کسی کو مارا نہیں جاتا بلکہ جس کے پیچھے کوڑا رکھا جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر رکھنے والے کو مارتا ہے۔" عمیرہ نے بھی ٹھٹھہ مار کر کہا۔ تو سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"نہیں خیر۔ کھیل تو یہ تاریخی نوعیت کا ہی ہے مگر نیلوفر نے اسے لیجنڈ بنا کر پیش کیا ہے۔" نازپرور مسکرا کر بولی۔

"اُف توبہ یہ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئے آپ لوگ۔ بور کرنے کی حد ہوتی ہے۔" نیلما بڑی بیزاری سے بولی۔

"اصل میں نیلوفر کی سمجھ میں کوئی موزوں گیم نہیں آیا ہوگا نا۔ اس لیے یہ قصے کہانیاں سنانے میں لگ گئیں۔" حمیرا جلے کٹے انداز میں بولی۔

"اگر مجھ سے پوچھتی ہو تو میں یہی مشورہ دوں گی کہ اب جا کر آرام سے سو جاؤ کیونکہ یوں بھی گیارہ بج چکے ہیں۔" نازپرور نے کہا۔

"جی ہاں بڑا سو جاؤ۔ سب سے زیادہ تو آپ ہی بور کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ورنہ سوتے تو ہم روز ہیں مگر رتجگے کے مواقع بار بار تو نہیں آتے نا۔" بہن کے مشورے پر نیلما چمک کر بولی۔

"تو پھر سوچو کہ کونسا شغل اختیار کیا جائے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی تو اچھا نہیں لگ رہا۔" سہیل منصور کی بیٹی کوثر جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی سب کی باتیں سن رہی تھی زچ ہو کر بولی۔

"سوچ لیا۔ سوچ لیا۔" تبھی نیلوفر نے پنجوں پر تھوڑا سا اُچکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"آنکھ مچولی۔" نیلوفر نے بتایا۔

"ارے ہاں اپیا بڑا مزہ آئے گا۔ پلیز اپیا۔" نیلما بہن کی تجویز پر خوش ہو کر نازپرور سے بولی۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔ بھلا میں اس وقت تمہارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں گی۔" نازپرور دراے آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی۔

"کیوں آج کیا خاص یا غیر معمولی بات ہو گئی اپیا! آپ تو اکثر و بیشتر ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہی رہی ہیں۔" نیلما نے کہا۔

"ہاں اور ابھی تو آپ مایوں بھی نہیں بیٹھیں کہ کمرے سے نکلنے پر پابندی عائد ہو۔"

"نہ دور دور تک ان کے آنے کا احتمال ہی ہو سکتا ہے۔" درخشاں نے حمیرا کی بات میں گویا حاشیہ لگایا تو ایک بار پھر سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"ہائے دیکھیں نا اپیا! کس غضب کی سحر انگیز چاندنی ہے۔" نیلوفر جو اس اثنا میں کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ سمیٹ کر باہر ہر سو پھیلی کیف بداماں چاندنی پر ایک نظر ڈال کر نازپرور سے کہا۔

"ارے ہاں آج تو فل مون ہے نا۔ اس پر موسم بھی عاشقانہ سا ہو رہا ہے۔ بس اب جلدی سے اُٹھ جائیں اپیا!" نیلما نے بھی بیٹھے بیٹھے ہی اُچک کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اٹھیں نا پلیز نازو آپا! کل سے تو آپ مایوں بیٹھ کر گوشہ نشین ہی نہیں پردہ نشین بھی ہو جائیں گی۔" حمیرا نے بھی نیلما کے اشارے پر اصرار کیا۔

"ہاں اور اس کے بعد تو شاید کبھی ایسا موقع نصیب ہو بلکہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شادی کے بعد تو لڑکیاں بالکل ہی بدل کر رہ جاتی ہیں۔" حمیرا کی بہن عمیرہ بولی۔

"کیوں کیا شادی کے بعد لڑکیوں کے سینگ وینگ نکل آتے ہیں؟" نازپرور نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں سینگ وینگ تو نہیں نکل آتے البتہ ایک بغیر سینگوں والا مینڈھا ہر دم خدائی فوجدار کی طرح قابض جو رہتا ہے۔" درخشاں نے کہا تو ایک قہقہہ پڑا۔

"اف تو بہ کس بُری طرح وقت کے ساتھ ناانصافی کررہی ہیں اپیا آپ پتا بھی ہے ساڑھے گیارہ ہو چکے ہیں ۔ اب آپ کی ناں ناں میں دو بج گئے تو اندر سونے والے یہی سمجھیں گے کہ پائیں باغ میں رات کی بلائیں نازل ہو گئی ہیں۔" نیلما نے شاکی انداز میں کہا۔

"تم ویسے بھی کسی بلا سے کم ہو کیا جو پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ اب بھلا اتنی رات گئے پائیں باغ میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کسی زہریلے کیڑے نے ڈس لیا تو۔" ناز پرور نے انہیں یوں ڈرایا کہ کسی نہ کسی طور پر وہ خود کو کھیل کود سے بچانا چاہ رہی تھی۔

"اوہ! بہانہ بازی نہیں بلکہ بہانہ سازی کوئی اپیا سے سیکھے۔" نیلما زچ ہو کر بولی۔

"یوں بھی کون بیوقوف اس وقت آنکھ مچولی کھیل سکتا ہے اپیا! پائیں باغ میں چھپنے کی جگہ ہی کہاں ہے ہم تو وہ بلائنڈ بفیلو کھیلیں گے آج۔ آپ کو تو یہ کھیل بہت پسند ہے اپیا!" نیلوفر نے جو ہمیشہ اپنی ہی چلانے کی عادی تھی۔ کھیل کا فیصلہ سناتے ہوئے ناز پرور سے کہا۔

"بلائینڈ بفیلو۔" سب نے زیرِ لب کہا۔

"ہا ہا ہاؤ فنی۔ سمجھ گئی سمجھ گئی۔ مگر بھئی سیدھی طرح اُردو میں ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ کہ اندھا بھینسا کھیلنے کو جی چاہ رہا ہے۔" حمیرا چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہنستی ہوئی بولی۔

"بھئی اصل میں اردو میں بہت غیر شاعرانہ سا بن جاتا ہے یہ "اندھا بھینسا" کا لفظ۔" نیلوفر نے گویا وضاحت کی۔

"نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ——— یہ نیلوفر خود کو ایشین گیمز اینڈ ایتھلیٹ سمجھتی ہیں نا اس لیے — اس لیے ہر گیم کو انٹرنیشنل بیسز پر رکھ کر بات کرتی ہیں۔" نیلما نے ہنس کر فقرہ چست کیا۔ تو کوثر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ مگر نیلوفر جھینپنے یا خفیف ہونے کے بجائے بڑی متانت سے بولی۔

"بھئی اصل میں اگر کسی معمولی سے معمولی گیم کو بھی بین الاقوامی سطح پر رکھ کر پیش کیا جائے تو اس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔"

"افوہ! ہر بات کو اتنا طول کیوں دینے لگتے ہیں آپ لوگ۔ اب کسی طرح اُٹھ بھی چکیں۔" نیلما پر بس کھیل کی ہی دُھن سوار تھی۔

"ہاں بھئی اٹھو ورنہ ہم ڈنڈا ڈولی کر کے بھی تمہیں باہر لے جا سکتے ہیں۔" عمیرہ نے گویا وارننگ دی۔

"ہاں چلو اٹھو تمہاری خاطر آج میں بھی اس کھیل میں شریک ہو جاؤں گی۔" درخشاں بولی۔

"آہا بڑی نوازش بڑا کرم ہے آپ کا جو آپ نے خود ہی اعلان کر دیا ورنہ آپ کی اطلاع کو ہم بھی اس کمرے کی چوکسی پر آپ کو مامور کرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔" نیلما ہنس کر بولی۔

"ارے یہ نیلما تو بڑی تیز ہو گئی ہے"

"تسلیمات! مگر اب باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ اور کسی طرح اپیا کو لے کر باہر آجائیں۔" نیلما نے کہا۔

"او کے ڈیئر کزن۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" حمیرا بڑے چلبلے سے انداز میں بولی پھر سب ناز پرور کو زبردستی کھینچ کر باہر لے جانے لگیں تو عمیرہ نے سلوط کی طرف دیکھ کر آہستہ سے نیلوفر کے کان میں کچھ کہا تو نیلوفر جاتے جاتے پلٹ کر اس سے بولی۔

"آپ بھی آئیے نا سلوط! یہ ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چن کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں۔" کہنے کا انداز بھی ایسا کٹیلا سا تھا کہ عمیرہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہی اور اس کے نزدیک آکر بولی۔

"میں تو آپ کی خاموشی کو آپ کی آمادگی پر محمول کر رہی تھی اور آپ ہیں کہ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔ آئیے چلیے نا پلیز۔"

"نہیں نہیں میں بھلا آپ سب کے ساتھ کھیلتی کیا اچھی لگوں گی عمیرہ! آپ سب بچیاں ہیں۔ آپ کی عمر ہے کھیلنے کی مجھے تو معاف ہی رکھیے۔" سلوط نے کہا۔

"او وہ بچیاں۔" نیلما منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"ایمان سے آپ نے تو دادی اماں کو بھی مات کیا سلوط آپا! آپ خود کیا شے ہیں کس پرسنیلٹی اور خوبیوں کی مالک ہیں۔ یہ ہم سے پوچھیے۔" کوثر بولی۔

"ہاں ہاں بھئی، وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں مگر یہ کچھ زیادہ ہی اپنی تعریف کرانا چاہتی ہیں۔" عمیرہ بولی۔

"نہیں خیر میں ایسی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں نہ کسی بات کی داد ہی چاہتی ہوں۔" سلوط نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو۔ بہت کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں آپ تو۔" نیلما چھیڑنے کے سے انداز میں بولی۔

"افوہ بھئی کن فضولیات میں پڑ گئیں تم۔ چلو جلدی سے باہر چلو۔ اتنی مشکلوں سے تو اپیا تیار ہوئی ہیں اگر دوبارہ اندر آگئیں تو پھر کوئی طاقت بھی انہیں باہر نہیں لے جا سکے گی۔" نیلوفر نے بڑی ناگواری سے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی، آپ لوگ جائیے نا۔ میری وجہ سے بیکار میں اپنا وقت کیوں برباد کر رہی ہیں۔" سلوط، کوثر اور عمیرہ وغیرہ سے بولی۔

"نہیں جناب آپ کو ہر قیمت پر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ چلیں اٹھیں بھی اب۔" عمیرہ نے کہا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔ تو بادلِ نخواستہ اسے بھی اٹھنا ہی پڑا۔

باہر وسیع و بسیط آسمان پر بدرِ کامل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی نور افشاں چاندنی کے خم پر خم لنڈھاتا نظر آرہا تھا کہ طویل و عریض پائیں باغ کے گوشے گوشے پر پھیلی ہوئی چاندی کے ملمع کا گمان ہو رہا تھا۔

ہوائیں بھی گلوں کی خوشبو چُرائے بڑی شوخ سی ہو رہی تھیں۔

وہ سب کی سب یعنی ناز پرور، نیلوفر، نیلما، درخشاں، اسماء، حمیرا، عمیرہ، کوثر، فضیلہ۔ فضیلہ کی چھوٹی بہن راحیلہ جو نیلما سے بھی چھوٹی تھی اور سلوط۔ کچھ دیر تک تو منظر کی سحر انگیزی میں کھوئی رہیں پھر نیلوفر سب کو دائرے کی صورت میں کھڑا کر کے "اکڑ بکڑ لوہے کی ٹکڑ اکی دکی دس" کہتے ہوئے ہر لفظ کے ساتھ ہر لڑکی کے سینے پر انگلی رکھتی گئی مگر چونکہ لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے دس کا لفظ آنے کے بعد بھی چار لڑکیاں باقی رہ گئیں۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ناز پرور آنکھوں پر دوپٹہ باندھ کر جس لڑکی پر ہاتھ رکھے گی وہی اندھا بھینسا بنے گی۔ چنانچہ یہی ترکیب آزمائی گئی اور سب سے پہلے درخشاں ہی چور بنی اور یوں گویا کھیل شروع ہو گیا۔

"دیکھو چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ میں اندر چلی جاؤں گی۔" کھیل کے آغاز پر ایک بار پھر ناز پرور نے تاکید کی۔

"ہاں ہاں بھئی دادی اماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہم بھی بچیاں نہیں ہیں جو کلکاریاں مار مار کے گھر تو کیا محلے والوں کو جگا دیں گے۔" عمیرہ چیخ کر بولی۔

"ناؤ بی ریڈی۔" نیلوفر نے درخشاں کے دوپٹہ کس کر اس کی آنکھوں پر باندھنے کے بعد گویا کھیل شروع کرنے کا اعلان کیا۔

اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔

باری باری سب لڑکیاں چور یا اندھا بھینسا بنتی رہیں۔

مگر سلوط جو جبر کر کے اس کھیل میں شامل ہو گئی تھی اور بڑی بے دلی سے کھیل رہی تھی اب تک کسی کے ہاتھ نہیں آئی تھی اور آتی بھی کیسے وہ تو چور کی آنکھوں پر پٹی بندھتے ہی بھاگ کر دُور جا کھڑی ہوتی۔ آخر کوثر اور عمیرہ کی ملی بھگت پر وہ ان کے ہاتھ آہی گئی تو سب نے اسے گھیر لیا۔ اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کا ہی دوپٹہ کس کر اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

"دیکھو بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ہیں یہ انہیں ذرا لمبا چکر دینا۔" نیلوفر نے باری باری ساری لڑکیوں کو تاکید کی۔

اس کی آنکھوں پر پٹی بندھتے ہی وہ دور دور تک پھیل گئیں۔ پٹی بھی اس طرح کس کر باندھی تھی نیلوفر نے کہ آنکھیں اور کنپٹیاں دُکھنے کے علاوہ اسے سانس لینے میں بھی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر آوازوں کی سمت کا اندازہ لگا کر اٹکل سے ادھر ہی بڑھنے لگتی۔ کبھی پیچھے پلٹ آتی اور کبھی دائیں بائیں مڑ جاتی مگر کوئی ہاتھ ہی نہ آتا کہ سب سرکتی سرکتی بہت دُور چلی گئی تھیں ———

اور ناز پرور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔ اور اس کی تقلید میں درخشاں ——— نیلوفر اور عمیرہ بھی چپکے سے اندر کھسک آئی تھیں۔ اب حمیرا، کوثر، اسماء، فضیلہ اور راحیلہ رہ گئی تھیں۔ جو سلوط کے بہت آگے نکل جانے پر بھاگ کر پھر پیچھے چلی گئی تھیں۔ مگر وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ قریب ہی کہیں کھڑی ہیں۔ ادھر آنکھوں پر پٹی کس کر بندھی ہونے کی وجہ سے کچھ اتنی تکلیف دے رہی تھی کہ جی چاہ رہا تھا نوچ کر پھینک دے۔ اسی لیے وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

"دیکھو بے ایمانی نہیں چلے گی فرینڈز۔ اب مجھے زیادہ نہ تھکاؤ۔ یوں بھی تم لوگوں نے دوسروں کو تو اتنا دق نہیں کیا تھا۔ اب جلدی سے میرے قریب آجاؤ ورنہ میں یہ پٹی اتار پھینکوں گی پھر تم یہ نہ کہنا کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔" تبھی چند لمحے بعد ہی اسے اپنے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ اندازہ لگا کر اس طرف بڑھی اور اگلے ہی لمحے اس نے "آہا پکڑ لیا نا" کہہ کر کسی کا بازو پکڑا ہی تھا کہ یوں لگا جیسے قیامت آگئی ہو۔

ہاں وہ قیامت ہی کی ایک حرکت تھی۔

کیونکہ اگلے ہی لمحے دو انتہائی سخت اور کرخت ہاتھوں نے کچھ اتنی بے دردی سے اس کی آنکھوں پر مضبوطی سے بندھی پٹی کو

نوچنے اور گھسیٹنے کے انداز میں اتارا کہ وہ بمشکل اپنی چیخ کو دبا سکی۔ پٹی واقعی کچھ ایسے وحشی اور جنگلی پن سے اتاری گئی تھی کہ نہ صرف اس کے بال کھنچ گئے تھے اور کنپٹیاں پھوڑا ہو رہی تھیں۔ بلکہ آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچ گئے تھے۔ اس لیے وہ اس جنگلی سے انسان کی شکل بھی نہ دیکھ سکی تھی۔ لیکن مارے غصے کے اس کا حال بُرا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی۔

"تم جو کوئی بھی ہو انتہائی غیر مہذب اور جنگلی قسم کے انسان ہو۔ ایک دم وحشی جانور۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ تھا پٹی اتارنے کا۔"

ادھر شاید اس کا مخاطب بھی بہت تُند اور تیکھے مزاج کا حامل تھا جو لفظوں کی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا اور ڈپٹ کر بولا۔

"جانور میں نہیں تم ہو جو اپنے گلّے سے بچھڑ جانے والی بھیڑ کی طرح اتنی رات گئے یہاں کھڑی شور مچا رہی تھیں۔ دوسروں کے آرام میں خلل ڈالنا بھی کوئی شرافت ہے۔ یو ڈیم ایڈیٹ گنوار لڑکی۔"

اُف — اپنی بے ہودگی اور زیادتی پر شرمندہ ہونے کے بجائے وہ الٹا اسے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ "ڈیم ایڈیٹ" کہہ رہا تھا۔ اس کا جی تو چاہا کہ اس کے منہ پر ایسا ہاتھ مارے کہ اس کا پورا جبڑا حلق میں گھس جائے۔ مگر اب بینائی بحال ہونے کے بعد دیکھ لیا تھا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہے اور اس پر تھوڑا تھوڑا وحشی بھی۔ اس لیے اس نے بڑی مشکل سے خود کو اسے تھپڑ مارنے سے باز رکھا۔ مگر زبان کا وار کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

"اے یو ڈیم ایڈیٹ اور گنوار ہوگے تم اور تمہارا باپ زیادہ میرے مُنہ لگے تو ایک ایسا تھپڑ رسید کروں گی کہ یہ تمہارا طباق سا چہرہ پچک کر رہ جائے گا۔ سمجھے۔" اور جواب میں وہ تو سچ مچ آگ بگولا ہی ہو گیا۔ کچھ کہنے کے بجائے دانت کچکچا کر اور ہاتھ کو کراٹے کی پوزیشن میں اٹھا کر اس کی طرف بڑھا تو وہ ڈر کر سر پر پیر رکھ کر جو بھاگی تو اندر آ کر ہی دم لیا۔ اندر جہاں ساری لڑکیاں پہلے سے ہی مسکین سی صورتیں بنائے اس کے انتظار میں بیٹھی [illegible] افتاد سے یکسر لاعلم تھیں جو ابھی ابھی اچانک ہی اس جنگلی کی شکل میں اس پر ٹوٹ پڑی تھی مگر وہ اپنے طور پر یہی سمجھی کہ کسی وجہ سے وہ سب اتنی خاموش بیٹھی ہیں۔ اس پر کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ طاری ہوگئی اور وہ ان سب سے اپنے آنسو چھپاتی اپنے رہائشی کمرے میں چلی آئی۔

اپنی اتنی ذلت و خواری پر مارے غصے اور کھسیاہٹ کے اس کی آنکھوں میں بدلیاں سی اُمڈے پڑ رہی تھیں جو اپنے رہائشی کمرے میں آتے ہی بارش کی تیز بوچھاڑ کی طرح ایک دم ہی برسنے لگی تھیں۔ اصل میں غصہ تو اسے ان لڑکیوں پر آ رہا تھا جو اس کے خیال میں جان کر اسے تنہا باہر چھوڑ آئی تھیں یا دوسرے معنوں میں انہوں نے دانستہ اس جانور نما انسان کے ہاتھوں اسے ذلیل کرایا تھا۔ مگر آخر وہ کون تھا؟

یعنی کوئی ہوّا یا ڈریکولا قسم کا عفریت تو ہرگز نہیں تھا۔

بلکہ بظاہر تو بہت ہی اچھی شکل کا تھا۔

قد و قامت اور تن و توش کے لحاظ سے بھی بہت معقول اور مکمل تھا۔

مگر فطرتاً بہت بد اخلاق اور اُجڈ سا۔ ایک دم مرکھنے بیل کی خاصیت کا لگ رہا تھا۔

تبھی تو میرے منہ توڑ جواب پر کیسے آنکھیں نکال کر اور دانت کچکچا کر مجھ پر جھپٹ پڑا تھا اور — اُف — اگر میں سر پر پیر رکھ کر نہ بھاگتی تو نہ معلوم وہ میرا کیا حشر کرتا۔

جب کہ اس کے جنگلی پن سے پٹی اتارنے پر میری پیشانی اور سر دکھ رہا ہے۔

آنکھوں اور کنپٹیوں پر بھی جلن سی ہو رہی ہے۔

خیر میں نے اس کی اس بد اخلاقی پر اسے ایسی بے نقط سنائی ہے کہ اس کے بھی دانت ہی کھٹے ہو گئے ہوں گے۔ اپنے رہائشی کمرے میں آ کر کچھ دیر تک آنسو بہانے کے بعد وہ آنسو پونچھ پونچھ کر یہی سوچتی رہی اور یہی سب سوچتے ہوئے نیند کی وادی میں قدم رکھنے تک اس کے دماغ میں یہی ایک سوال گردش کرتا رہا کہ آخر وہ کون تھا؟ جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ گھر ہی کا کوئی فرد ہے۔ مگر گھر کے افراد سے تو وہ بخوبی واقف تھی۔ دو میاں بیوی، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ مگر بیٹا تو اپنے دوستوں کے ساتھ وادیٔ کاغان کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ جبھی تو مایوں کی رسم اگلے روز پر ملتوی کر دی گئی تھی۔ پھر یہ کون تھا؟ اتنا بدتمیز، منہ پھٹ اور درندہ صفت۔

اگلے روز بھی یہی سوال اس کے تجسس میں اضافہ کرتا رہا۔ جی چاہا کسی سے پوچھ ہی لے مگر بھلا کیا بتا کر پوچھتی۔ یوں بھی شعیب منصور کی بیٹیوں سمیت تقریباً سبھی لڑکیاں ہی غیر اور اجنبی تھیں اور اس لیے اس سے مغایرت بھی برتتی تھیں۔ ایک ذرا نیلما کا رویہ ہی دوستانہ سا تھا۔ مگر وہ بھی بس ایک لمٹ (حد) میں رہ کر بات کرتی تھی۔ سلوط خود بھی بہت خود دار اور رکھ رکھاؤ والی تھی اور جلد ہی کسی سے بے تکلف ہونے کی عادی نہ تھی اس لیے اس نے اس سوال کو ہی ذہن سے نکال پھینکا تھا۔ کہ یوں بھی گذشتہ روز ہی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اسفند خواہ آئے یا نہ آئے ناز پرور

کو اگلے روز مایوں بٹھا دیا جائے گا کیونکہ زینت بیٹے کی غیر حاضری سے نہیں بلکہ خود بیٹے سے ہی بڑی چڑی نظر آتی تھیں اور یہ فیصلہ انہوں نے ہی کیا تھا۔

اس روز زینت نے صبح ہی صبح ان مہمانوں کو ناز پرور کو مایوں بٹھانے کی اطلاع دے دی تھی جو مایوں کی رسم میں مدعو کیے گئے تھے اور یوں تو مایوں کے سلسلے میں تیار کی جانے والی تمام اشیاء پہلے سے ہی تیار کر لی گئی تھیں یعنی کھٹولے نما چوکی اور چھتر۔ ناز پرور کے کپڑے۔ اور دیگر جملہ لوازمات جو سب کے سب پیلے رنگ کے تھے۔ حتیٰ کہ چھتر۔ کھٹولے کے پائے اور پایوں پر لگی بلّیاں جن پر چھتر لگایا گیا تھا اور کھٹولے میں بھی سوزنی تک پیلے رنگ کی تھی۔ بلیوں پر بڑی خوبصورتی سے گنگا جمنی کرن اور گوٹا لپیٹا گیا تھا۔ تمام خواتین نے بھی پیلے رنگ کے ملبوسات زیب تن کیے تھے یعنی پیلے رنگ کی کامدار ساڑھیوں کے ساتھ ہلکا پھلکا طلائی زیور اور ہاتھوں کانوں میں چنبیلی کے گجرے پہنے تھے۔ حتیٰ کہ جوڑوں میں بھی چنبیلی کے گجرے لگائے تھے اور لڑکیوں نے بھی ہلکے طلائی زیورات کے ساتھ پیلے رنگ کے کھڑے دوپٹے سوٹ پہنے تھے اور ان کے ساتھ پھولوں کے گہنے جو عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ ماسوا سلوط کے جس کے پاس پیلے رنگ کا کوئی لباس تھا نہ اس سے کہا ہی گیا تھا کہ وہ پیلے رنگ کا لباس پہنے ورنہ وہ رنگوا ہی لیتی۔

یوں بھی زینت کا رویہ اس سے بہت مغایرانہ اور اپرایا اپرایا سا تھا۔ ناز پرور اور نیلوفر بھی ماں جیسی ذہنیت اور مزاج رکھتی تھیں اس لیے اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ اور پھر اسے آئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ کل پانچ روز۔ اور آئی بھی ایسے موقع پر تھی کہ سب شادی کی گہما گہمی میں مصروف تھے۔ کچھ اس لیے بھی اسے کسی کی طبیعت اور مزاج کا اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ایک کے لیے دوسرے کی نگاہوں میں جو مروّت اور اپنا اپنا پن سا ہوتا ہے اسے تو ایک بچہ بھی محسوس کر لیتا ہے۔ اس نے آسمانی رنگ کا لباس زیب تن کیا تھا جس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اِدھر چہل پہل اور گہما گہمی کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی تو اتنی تھی کہ صبح سے کسی کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

زینت نے مہمانداری بھی کچھ زیادہ ہی کر لی تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کا پہلا خوشی کا کار ہے اور دل کے سارے تو نہیں آدھے سے زیادہ ارمان نکالنا چاہتی ہیں۔ سلوط کو کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا کہ وہ بھی گھر کے کاموں میں برابر کا حصہ لے۔ پھر بھی وہ اخلاق اور مروّت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اور کچھ اس لیے بھی کہ ہمدھیانے کی بات تھی ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق بعد مغرب ناز پرور کو مایوں بٹھایا جانے والا تھا۔ اور اس سمے شام اپنا سرمئی آنچل پھیلاتی دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی جس کے ساتھ ساتھ برقی قمقموں، فانوسوں اور ٹیوب لائٹس کے جل اٹھنے کی وجہ سے گھر کے گوشے گوشے میں روشنیوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا تھا۔ یوں تو رہائشی کمرے نچلی منزل میں ہی تھے کیونکہ بالائی منزل پر صرف دو کمرے ہی تعمیر کیے گئے تھے۔ جو عام دنوں میں زیادہ تر بند ہی رہتے تھے اور اگر استعمال میں بھی لائے جاتے تھے تو خاص خاص موقعوں پر۔ اور اب بھی شادی کے موقع پر چونکہ نیچے مہمان ہی مہمان بھرے ہوئے تھے اس لیے فرنشڈ کمروں کو جھاڑ پونچھ کر ان میں سے ایک میں ناز پرور کے جہیز کا بجلی کا سامان یعنی فرج۔ ٹی وی۔ اے سی۔ واشنگ مشین۔ سوئنگ مشین۔ مسکر گرائینڈر، آٹا گوندھنے اور قیمہ بنانے کی مشین۔ جوسر۔ استری بمعہ اسٹینڈ۔ الیکٹرک کیٹل اور کوکنگ رینج وغیرہ رکھوا دیے گئے تھے اور دوسرے میں میوہ جات اور کھانے کی بہت سی دیگر اشیاء کے ساتھ مہندی، ——— تیل وغیرہ۔ نیچے کچن تک میں اتنی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سکون سے بیٹھ کر کوئی کام کیا جا سکتا۔ اس لیے زینت کی بڑی بہن زینب گھر کی پُرانی ملازماؤں کو لے کر کھلی اور اُبٹنا گندھوانے اوپر چلی آئی تھیں انہوں نے سات سہاگنوں کا ہاتھ لگوا کر (کہ جو اپنے اپنے شوہروں کی چہیتی بیویاں تھیں) گھر کی دونوں پُرانی شادی شدہ خادماؤں سے اُبٹنا گندھوایا تھا جس میں چند خوشبودار مسالوں اور کھلی کی آمیزش تھی اور جسے خالص چنبیلی کے تیل سے گوندھا گیا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک اوپر ہی کام میں مصروف تھیں۔ سلوط کے سپرد مہمانوں کی چائے پانی کا انتظام تھا اور وہ اس سے کہہ کر آئی تھیں کہ بیٹی میرے لیے ایک پیالی چائے اوپر بھجوا دینا۔ سلوط کام میں اتنی مصروف تھی کہ اسے کچھ یاد ہی نہ رہا۔ بس شام کو ہی خیال آیا تو وہ جلدی جلدی [illegible] اوپر پہنچی۔ زینب بڑی خوش خلق اور خوش مزاج تھیں اور سلوط سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں۔ انہوں نے اتنے اہتمام سے چائے لانے پر اسے بڑی اچھی اچھی دعاؤں سے نوازنے کے بعد کہا۔

"لینا بیٹی! ذرا یہ اُبٹن کے طشت تم ہی نیچے لے جاؤ۔ یہ لوگ تو گانے اور فضول باتوں میں رات ہی کریں گے اور ہاں۔ زینت سے کہنا کہ اب رسم شروع کریں۔ میں بھی کمرہ مقفل کر کے ابھی آتی ہوں۔" اور وہ لے جانا تو نہیں چاہ رہی تھی لیکن اخلاق و مروّت میں انکار نہ کر سکی۔ اور چُپ چاپ دونوں نقشین طشت اٹھانے لگی تو زینب نے پھر کہا۔

"یہ دونوں طشت امّاں جان (سلمیٰ بیگم) کو دے دینا۔ زینت تو اس وقت مہمانوں میں مصروف ہوں گی۔ یوں بھی انہیں رسمیں رمیں کہاں آتی ہیں۔"

"جی اچھا۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ زینہ کوریڈور کے آخری سرے پر تھا جو نیچے ہال سے ملحق راہداری نما کمرے میں اُترتا تھا۔ کوریڈور سے لے کر سیڑھیوں تک سرخ قالین بچھا تھا اور نیچے اس کمرے نما سیج میں بھی آف وہائٹ قالین کا فرش تھا۔ زینے پر دونوں

اطراف میں بڑی ہی خوبصورت ریلنگ لگی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں میں طشت تھامے قدرے محتاط انداز میں نیچے دیکھتی۔ تیسری سیڑھی پر آئی تھی کہ تبھی اس کی نظریں نیچے سے آتے ایک شخص پر پڑیں جو اپنی ہی کسی دُھن میں ریلنگ سے نیچے دیکھتا اوپر آ رہا تھا۔ اُف۔ یہ تو وہی جانور نما انسان تھا۔ گو اس نے سلوط کو دیکھا نہیں تھا مگر اس کا رخ تو اسی کی طرف تھا۔ اس سے دوبارہ سامنا ہونے کے خیال سے نہ صرف سلوط کی سٹی گم ہو گئی بلکہ وہ کچھ سہم سی گئی اور کچھ اتنی بوکھلائی کہ یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ سیڑھیاں اُتر رہی ہے۔ پیر اگلی سیڑھی پر پڑنے کے بجائے تیسری سیڑھی پر پڑا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ ادھر اس کے ہاتھوں میں اُبٹن کے طشت بھی تھے ورنہ کم از کم ریلنگ کو ہی تھام لیتی۔ بس لڑھکتی ہوئی سیدھی اس پر جا کر گری تو وہ جو اس ساری صورت حال سے یکسر بے خبر اور لاعلم تیزی سے اوپر آ رہا تھا بری طرح اس کی لپیٹ میں آ کر لڑھکتا ہوا فرش پر جا گرا۔ ایک دم تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ آفت ناگہانی اچانک کیسی ٹوٹ پڑی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ اُبٹن کے دونوں طشت کچھ اس ترتیب سے اس پر آ گرے تھے کہ نہ صرف اس کا نیا نیا سا لباس بلکہ چہرہ اور بال بھی اُبٹن میں بری طرح لتھڑ گئے تھے اور یہ دوہری مصیبت اس کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑاک۔ دھم۔

ایک چھناکہ ہی نہیں بلکہ دھماکا سا ہوا۔ تو قریب ہی ایک کمرے میں بیٹھی خواتین الٰہی خیر کہتی ہوئی باہر بھاگیں اور ان بھاگنے والیوں میں زینت سب سے آگے تھیں۔ زینے میں قدم رکھتے ہی انہوں نے دیکھا سلوط زینے کی نچلی سیڑھی کے آگے گھٹنوں کے بل جھکی بیٹھی ہے اور وہ سر تا پاؤں اُبٹنے میں لتھڑا۔ اس کے سامنے کھڑا اپنی پاٹ دار آواز میں اسے پھٹکار رہا ہے۔

"کیا اندھی ہو جو دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ ایک تو اسکائی لیب کی طرح مجھ پر اچانک گر کر میری پسلیاں توڑ دیں۔ اس پر میرے کپڑوں کا بھی ستیاناس کر دیا۔ میں کوئی ہوّا یا آدم خور تو نہیں تھا کہ جو تمہیں کچا چبا جاتا۔ نہ اتنا خوبصورت ہی ہوں کہ مجھے دیکھ کر تم پھسل پڑیں۔ اسٹوپڈ کہیں کی۔"

"کیا ہوا۔ کیا بات ہو گئی سنی بیٹے۔؟" زینت نے اس کے قریب پہنچ کر سخت تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہوتا کیا ممی! کیا آپ دیکھ نہیں رہیں میری دُرگت جو اس لڑکی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے۔" وہ سخت جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ مگر زینت بیٹے کی دُرگت سے زیادہ اتنے سارے اُبٹنے کے ضائع ہو جانے پر دل ہی دل میں کھول رہی تھیں۔ انہوں نے سلوط کو مخاطب کر کے بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیوں بھئی، یہ کیا حرکت تھی سلوط۔؟ اور یہ اُبٹن تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟" انہوں نے دوہرا سوال کیا تھا۔ مگر اتنے سارے لوگوں کے سامنے اپنی ذلت اور توہین۔ سلوط کی گردن کچھ زیادہ ہی جھک گئی۔

"ہونہہ وہاٹ ربش۔ یہ سب پوچھنے سے اب فائدہ ہی کیا ہوگا امی۔ غلطی سراسر آپ کی ہے جو آپ بلا جانے بوجھے نہ معلوم کیسے کیسے نمونوں کو ملازم رکھ لیتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم پہلے انہیں ٹرینڈ تو کر لیا کیجیے۔"

"کیا ہوا۔ یہ کس کو ٹرینڈ کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اور یہ آپ سب یہاں کیوں مجمع لگائے کھڑے ہیں؟" شعیب منصور جو تیار ہو کر اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے بیٹے کو گرجتا اور کڑکتا دیکھ کر ادھر ہی چلے آئے تھے جہاں سب کھڑے تھے۔

"تماشا جو ہو رہا ہے نا یہاں۔" زینت جل کر منہ ہی منہ میں بولیں۔

شعیب منصور اسی اثنا میں بیٹے کے قریب آ گئے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولے۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے سنی۔ کیا اُبٹنا کھیلنے کا بہت ہی شوق چرایا تھا تمہیں؟"

"جی نہیں، مجھے نہیں۔ ان محترمہ کو ہی چرایا تھا۔ تبھی تو انہوں نے دو طشت پورے کے پورے میرے اوپر تھوپ دیے۔" وہ بے حد جلے کٹے انداز میں بولا۔

"ہائیں۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تو سلوط ہے۔ کسی اور نے تم سے یہ بیہودہ مذاق کیا ہوگا۔" شعیب منصور نے متعجب سے انداز میں کہا اور تبھی انہیں کچھ خیال آیا تو وہ تشویش بھرے انداز میں براہ راست سلوط سے مخاطب ہو کر بولے۔

"یہ تم اس پوزیشن میں کیوں بیٹھی ہو سلوط۔ آخر معاملہ کیا ہے؟" تو زینت بولیں۔

"معاملہ کیا ہوگا۔ سیڑھیوں سے پھسل گئی تھیں اس لیے اس پوزیشن میں بیٹھی ہیں۔"

"ہائیں یعنی گر پڑی تھی اور تم لوگوں نے اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی اور اپنی اپنی بولیاں بولنے میں لگ گئے۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ اس کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔" شعیب منصور نے ملامت بھرے انداز میں کہا اور پھر قدم بڑھا کر سلوط سے پوچھا۔

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹی؟"

تب سلوط نے چہرے کے ساتھ ساتھ پلکوں کی چلمن اٹھا کر ایک نظر اسفند پر ڈالی اور پھر شعیب منصور کو دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اچھا۔ تو یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ چلو اٹھو میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں۔" شعیب منصور اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں چوٹ لگنے کی وجہ سے پھوڑا ہو رہی تھیں۔ اٹھ کر کھڑے ہونے میں اسے سخت دقت پیش آئی تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شعیب منصور سمجھ گئے تھے کہ اسے کافی چوٹ آئی ہے۔

"واہ! ہم تو شاید لوہے اور فولاد سے ڈھالے گئے ہیں جو دو ہزار پونڈ وزنی بم اچانک آ گرنے کے باوجود بھی ہماری چوٹ کا کسی کو خیال نہیں۔" وہ باپ کو سلوط پر اس قدر مہربان دیکھ کر سر کو جھٹکتے ہوئے بڑی ناگواری سے بولا۔ سارا غصہ تو اسے اپنے کپڑوں کی بربادی پر آ رہا تھا۔

"اگر آپ کے چوٹ بھی لگی ہے تو بھی یہ اچھا شگون ہے اسفند بھائی۔ اب دیکھ لیجیے گا نازو کے بعد آپ کی ہی شادی ہوگی۔" عمیرہ جو گانا گاتے گاتے اٹھ کر سلمیٰ بیگم کے لیے چائے لانے کی غرض سے اسما کے ساتھ باہر آ گئی تھی اور بہت سی خواتین کو زینے کے آگے کھڑا دیکھ کر ادھر ہی آ گئی تھی اور اسفند کی ہیئت کذائی پر بری طرح ہنس رہی تھی، اس نے ہنس کر کہا۔ اور وہ تو پہلے ہی جلا بھنا سا ہو رہا تھا چیخ کر بولا۔

"ہاں۔ ہو گی تو مگر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تم سے ہرگز نہیں ہو گی۔" تو اس کے جواب پر عمیرہ کٹ کر بولی۔

"ہائے آپ تو بہت ہی بیہودہ ہیں اسفند بھائی!"

"ہاں۔ ہوں تو مگر تم سے کم ہی ہوں۔" اس نے پھر دوبدو کہا۔ اس کی بات پر سب کو ہنسی آ گئی اور عمیرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

شعیب منصور اس وقت وہیں کھڑے تھے اور اس نے باپ کا ادب و لحاظ بھی ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ شعیب منصور کو ناگوار تو بہت گزرا مگر انھوں نے یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر سلوط کو سہارا دینے کی غرض سے اسما کو بلایا اور سلوط کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

"ویسے بائی دے وے ممی! اس نئی دریافت کا سہرا کس کے سر ہے؟" اس نے جان کر انہیں سنانے کو اونچی آواز میں پوچھا تو زینت نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ یہ سلوط تمہاری پھوپھو فاخرہ کی نند ہے۔ عاقب بھائی کی بہن۔"

"ہاں بلکہ اکلوتی بہن۔" شعیب منصور کی فرسٹ کزن عائشہ نے گویا ٹکڑا لگایا۔

"اوہ۔ اچھا۔" اس تعجب انگیز انکشاف پر بھویں اچکا کر وہ اسی قدر کہہ سکا اور تبھی زینب زینے سے نیچے آتی نظر آئیں۔ ان کی نظر پہلے اسفند ہی پر پڑی۔ وہ شاکی انداز میں بولیں۔

"لے لو۔ یہاں تو ابٹنا بھی کھیلا جا چکا اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں، بلوانا تو دور کی بات۔"

"ارے کیسا ابٹنا آپا! اُبٹنے کا تو بیڑا ہی غرق کرا دیا آپ نے سلوط کے ہاتھ بھجوا کر۔" زینت زینے کے قریب ہو کر بولیں۔

"کیوں۔ خیر تو ہے۔ سلوط نے ایسا کیا کیا؟" زینب تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی تردد سے بولیں۔ اور آخری سیڑھی پہ آ کر رک گئیں تو زینت نے ان کے قریب ہو کر انہیں سارے واقعے کی تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

"کھلی بدشگونی ہوئی یہ تو سچ آپا۔ مجھے تو بڑا وہم آ رہا ہے۔"

"ہاں بھئی، وہم تو مجھے بھی آ رہا ہے۔"

"کس بات پر؟" زینب نے پوچھا۔

"اے لیجیے آپا۔ ایک تو بچی کو لگنے سے پہلے ہی سارا ابٹنا ملیامیٹ ہو گیا۔ اس پر آپ نے بھیجا بھی تو کس کے ہاتھ۔" ان کے پوچھنے کے انداز پر ان کی بھاوج عفت جہاں چمک کر بولیں۔

"اے ہاں آپا بیگم! آپ کو بھی اسی کے ہاتھ بھجوانا رہ گیا تھا ابٹنا۔ اس پر سے گر بھی پڑا سارا کا سارا۔ کیا یہ وہم اور بدشگونی کی بات نہیں ہے!" عائشہ بیگم بھی دبی زبان سے بولیں۔

"اے پڑھی لکھی ہو کر تم جاہلوں کی سی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ آخر وہ بے چاری بھی ہماری تمہاری طرح انسان ہی ہے۔ اور تمہارے آگے تو بیٹیاں بھی ہیں ایسی بات نہ کرو جو خدا کو بری لگ جائے اور اُبٹنے کا کال تو نہیں پڑا۔ آدھے سے زیادہ تو اوپر بچا پڑا ہے۔ ابھی جا کر گندھوائے دیتی ہوں۔ اے ہاں ایسے کون سے ہاتھی گھوڑے لگیں گے اس کام میں۔" زینب نے تینوں کو بری طرح لتاڑا اور پلٹ کر اوپر چل دیں۔

"آخر بات کیا ہے زینت بھابی! یہ آپا فاخرہ کی نند کیا نحس ہے یا پھر بیوہ ہے؟" زینت کی ایک رشتے کی دیورانی نے پوچھا تو اسفند جو نہ جانے کیوں اور کس مقصد سے ابھی تک وہیں اپنی جگہ کھڑا کسی سوچ میں گم تھا اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور ماں کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش سا ہو گیا۔ مگر۔ "نہیں خیر نحس ہے نہ بیوہ ہے" سے زیادہ کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ سن سکا۔ کیونکہ شعیب منصور سلوط کو چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ شاید اس لیے اپنی دیورانی کو پوری بات بتانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سب یہی سمجھ رہے تھے ۔ وہی سب جو اس کی فطرت اور مزاج سے واقف تھے کہ چونکہ اپنی اس دُرگت پر اس کا موڈ آف ہوچکا ہے اس لیے وہ مایوں کی رسم میں شرکت نہیں کرے گا۔ زینت کو ملال ہی یہی تھا کہ اس کا کریم کلر سلک کا نیا اور قیمتی شلوار سوٹ جو اس نے خاص طور پر مایوں کی رسم پر پہننے کی غرض سے سلوایا تھا اُبٹنے میں لت پت ہوکر بالکل ناکارہ ہوگیا ہے بلکہ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ اب وہ لباس تو ضرور تبدیل کرے گا لیکن تیار ہوکر یا تو کہیں گھومنے پھرنے نکل جائے گا یا پھر کمرے میں بند ہوکر بیٹھ رہے گا۔ اس لیے وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ جاؤ جلدی سے لباس تبدیل کرکے آجاؤ تاکہ مایوں کی رسم ادا کی جائے (کیونکہ مایوں کی رسم میں باپ، بھائی، چچا، ماموں وغیرہ کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی کہ کچھ لین دین کا معاملہ بھی ہوتا تھا) اس لیے انہوں نے اس سے بس اتنا ہی کہا۔

"اُف تمہارے سوٹ کا تو بالکل ہی ستیاناس ہوگیا۔ جاؤ بابا کم از کم انہیں تبدیل تو کرلو۔"

"ڈیش نو پرابلم ممی ۔۔ ستیاناس تو ہونا ہی تھا۔ آخر اُبٹنا کھیلنے میں بھی تو داغ دھبے پڑ ہی جاتے سو اب پہلے سے ہی پڑ گئے ہیں۔ خیر اب تو میں ذرا اوپر جارہا ہوں تاکہ خالہ امی کا تھوڑا سلاہاتھ بٹا دوں۔ اتنے آپ جاکر رسم کی تیاری کیجیے۔"

یہ اسفندیار کہہ رہا تھا اتنی صلاحیت اور انسانیت سے۔

شاید زندگی میں پہلی بار ان کی توقع کے خلاف اس نے اتنی معقولیت برتی تھی۔

انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

کچھ دیر وہ منہ کھولے تعجب سے دیکھتی رہیں۔

مگر پھر اسے اوپر کا رخ کرتے دیکھ کر مسرت سے جھومتے دل کے ساتھ عائشہ بیگم اور عفت سمیت دوسری خواتین کے ساتھ نازپرور کے کمرے میں چلی آئیں۔ لڑکیاں جو بڑی دیر سے سہاگ گیت گارہی تھیں ان کے آنے کی غرض و غایت جان کر انہوں نے مایوں کا گیت شروع کردیا۔

پیلا جوڑا پہن کے
تیل ابٹن لگا کے

ریشم کی سیج سجا کے
سنہرے چھتر تلے

نازو مایوں بیٹھے گی
بنو مایوں بیٹھے گی

چاند مکھڑا چھپا کے
بھیگی پلکیں جھکا کے

سپنے کے خواب سجا کے
خوب لجا شرما کے

نازو مایوں بیٹھے گی
گوری مایوں بیٹھے گی

"ارے یہ گانا وانا چھوڑو اور جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ معلوم بھی ہے بابا خود ابٹن لے کر آرہے ہیں۔" زینت نے بہت فخریہ لڑکیوں کو بتایا

"ہائیں کیا واقعی اسفند بھائی ابٹنا لے کر آرہے ہیں پھوپھو جان؟" سمیرا نے جو ڈھولک بجا رہی تھی ہاتھ روک کر نہایت بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی واقعی۔ بھلا میں غلط بیانی سے کام کیوں لینے لگی۔" زینت کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"اوہ، دیٹ از ان کریڈیبل" (یہ ناقابل یقین ہے) نیلوفر نے حسب عادت انگلش جھاڑی۔

"ہاں اگر سچ پوچھو تو اب سے کچھ دیر پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ مگر آج تو بابا نے کمال ہی کردیا۔" زینت بولیں۔

"اچھا، کیا کوئی خاص بات ہوگئی تھی ممی؟" نیلو نے پوچھا۔

"خاص بات کیا اصل میں ان کے کپڑوں پر ابٹنا گر گیا تھا۔ وہی نیا شلوار سوٹ جو سلوایا تھا اس پر ۔۔ اور میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب موڈ اتنا خراب ہوگا کہ وہ رسم میں شریک ہی نہ ہوں گے۔ مگر وہ تو خوشی خوشی ابٹنا لینے چل دیے اوپر اور مجھے تیار رہنے کا کہہ کر یہاں بھیج دیا۔"

زینت نے مختصراً تفصیل بتائی۔

"لیکن خالہ جانی! تیاری تو ساری مکمل ہی ہے پھر آپ کس تیاری کی بات کررہی ہیں؟" درخشاں نے پوچھا۔

"جی۔ اس وقت تو صرف انتظار کا مرحلہ درپیش ہے ورنہ تیار تو ہم کل سے ہی بیٹھے ہیں۔" فضیلہ نے ہنس کر کہا تو زینت بھی ہنس کر بولیں۔

"بس اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ خیر سے بابا کسی دم آتے ہی ہوں گے۔"

نازپرور کا کمرہ بہت بڑا تو نہیں مگر خاصا کشادہ تھا۔ داخلی دروازہ کمرے کی دیوار کے بیچوں بیچ تھا اور دروازے کے مقابل کی دیوار میں کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن پر گلابی شیڈ کے پھول دار پردے پڑے ہوئے تھے۔ دائیں طرف دائیں ہی کونے میں کمرے سے ملحق یعنی اٹیچڈ غسلخانہ تھا اور دائیں ہی طرف کھڑکیوں کے آگے اس کا بیڈ پڑا تھا۔ بیڈ کے پائنتی دروازے کے قریب ہی چھتر لگی کھٹولے نما چوکی رکھی تھی اور بیڈ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑکیوں کے آگے اور دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے ہی صوفے رکھے تھے۔ بائیں سمت بیڈ کے عین مقابل میں اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک دیوان پڑا تھا اور بائیں طرف بھی دیوار کے ساتھ دروازے تک صوفے رکھے گئے تھے۔ فرش پر کھلتے ہوئے گلابی رنگ کا قالین بچھا تھا۔ بڑی عمروں کی خواتین صوفوں اور دیوان پر بیٹھی تھیں جن میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سلمیٰ بیگم بھی ایک طمطراق سے متمکن تھیں اور نیچے قالین پر۔ تو شادی شدہ لڑکیاں اور عورتیں بھری ہوئی تھیں اور آدھے کمرے میں نازپرور کی بہنیں، کزنز اور سہیلیاں بیٹھی تھیں۔ گویا کمرے میں اس وقت تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حتیٰ کہ نازپرور کے بیڈ پر بھی اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور وہیں ایک طرف ایک تپائی پر پھولوں کے دونے رکھے تھے۔

زینت اپنی زرد ساڑھی سنبھالتی اور سب کے درمیان میں سے اپنی جگہ بناتی آگے بڑھیں تو ان کی نظر سب سے پہلے پھولوں کے دونوں پر ہی پڑی۔ انہوں نے جھک کر دونوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یہ پھول کس مصرف کے لیے منگائے ہیں۔ کیوں چچی جان مایوں کی رسم میں دلہن کو پھول تو نہیں پہنائے جاتے نا؟"

"نہیں۔ مایوں بٹھانے سے پہلے تو زیور تک اتار لیا جاتا ہے۔ عطر اور پھول تو دور کی بات اور آجکل تو ریشم کا استعمال ہونے لگا ہے، ورنہ ہمارے زمانے میں تو پرانے سوتی کپڑے رنگوا کر دلہن کو پہنائے جاتے تھے۔ کیونکہ ابٹنے کا رنگ دھوئے نہیں اترتا۔" شعیب منصور کی چچی کشور جہاں نے کہا۔

"اے آج کل کا تو چلن ہی کچھ اور ہوگیا ہے کہ لڑکیوں کو بس ایک دو روز ہی مایوں بٹھایا جاتا ہے۔ وہ بھی بس رسم پوری کرنے کو۔ ورنہ ہمارے زمانے میں تو لڑکی کو شادی سے ایک ماہ پہلے مایوں بٹھایا جاتا تھا۔ روزانہ دن میں کئی کئی بار کھلی ابٹن کی مالش ہوتی تھی اور ایسے مرغن کھانے کھلائے جاتے تھے کہ شادی کے دن لڑکی کے چہرے پر ایسا نور اترتا تھا کہ سرخی پوڈر لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔" ایک اور عزیزہ بولیں جو کشور جہاں کی ہم عمر تھیں۔

"افوہ۔ ہاؤ فنی۔ پھر تو بغیر میک اپ کے دلہن بے چاری بیمار ہی لگتی ہوگی۔" نازپرور کی سہیلی نے کڑوا سا منہ بنا کر آہستہ سے کہا۔

"بھئی اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔" درخشاں بولی۔ زینت ابھی تک پھولوں کی طرف ہی متوجہ تھیں۔

"ممی یہ پھول تو آپ کی یہ چاروں سمدھنیں لائی ہیں۔ شاید یہ ان کے یہاں کوئی رسم ہوگی۔" نیلما نے ان کی توجہ دولہا کی بہنوں کی طرف دلائی جو بیڈ سے کچھ فاصلے پر صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اے آپ کب آئیں۔ مجھے تو خبر تک نہ ہوئی۔" زینت ان کی طرف بڑھتی ہوئی بولیں۔

"بس آہی گئے چپکے سے آنٹی۔ اور یہ پھول تو امی نے آپ کو بھیجے ہیں۔" ان چاروں لڑکیوں میں سے ایک نے جو دولہا کی بہنوں میں سب سے بڑی تھی، انہیں سلام کرنے کے بعد کہا۔

"اوہ۔ بے حد شکریہ۔ پھر تو میں یہ ضرور پہنوں گی۔ میری بہن نے اتنی محبت سے جو بھیجے ہیں۔" زینت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں

"لو بھلا مایوں کی رسم میں لڑکے والوں کا کیا کام۔ مایوں کی رسم تو بہت گھریلو قسم کی ہوتی ہے جس میں سب اپنے ہی اپنے شریک ہوتے ہیں لے کہیں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس رسم میں پرائے گھر کے لوگ بھی شریک ہوں۔ اے زینت بیگم کے تو گھر کی بات ہی نرالی ہے۔" رشتے داروں میں سے ہی کسی صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا تو زینت نے شرمندہ ہوکر جلدی سے بات بنائی۔

"بھئی، یہ چاروں بچیاں کوئی غیر تو نہیں، اپنی نیلوفر کی سہیلیاں اور سب سے بڑھ کر ہمارے بیٹے احمد سروش کی بہنیں ہیں۔ یہ تو اگر نہ بھی آتیں تو ہم زبردستی انہیں بلوا لیتے۔" پھر انہوں نے لڑکیوں کو مخاطب کرکے آہستہ سے کہا۔

"ایسی محفلوں میں ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بچیوں تم کچھ خیال نہ کرنا۔" تو احمد سروش کی وہی بہن تائیداً ہنس کر بولی۔

"اوہ نہیں آنٹی! ہم تو آپ کو اپنا ہی سمجھ کر آئے ہیں۔ آخر یہ ہماری بھابی کا ہی تو گھر ہے نا۔ پھر بھلا ہم کیوں مائنڈ کرنے لگے ایسی اسٹوپڈ باتوں کو۔" مگر باقی تینوں لڑکیاں منہ پھلائے ہی بیٹھی رہیں۔ اور زینت ان کے آگے بچھی جارہی تھیں۔ ان کی خاطر تواضع کرنے کا ارادہ ہی کررہی تھیں کہ تبھی اسفندیار دونوں ہاتھوں پر ابٹنے کے طشت اُٹھائے اپنے تین چار کزنز کے ساتھ اندر آگیا۔ لڑکیاں جو عمیرہ اور اسما کی زبانی اس کی درگت کا قصہ سن چکی تھیں اس کے کپڑے اور صورت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ اپنے اوپر لڑکیوں کو ہنستا دیکھ کر وہ کچھ خفیف سا ہوگیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے میں نے کسی ٹوتھ پیسٹ یا منجن کے ریڈ کا آفر تو نہیں دیا جو آپ سب مسلسل دانتوں کی نمائش کر رہی ہیں"۔ اور اس کی بات پر ہنسنے کے بجائے لڑکیاں کچھ جھینپ سی گئیں۔

"اجی رہنے بھی دیں۔ آخر آپ کیا دیں گے۔ آپ تو خود اس وقت ایملشن پینٹ کی کسی بوگس کمپنی کا اشتہار لگ رہے ہیں"۔ نازپرور کی ایک اور سہیلی بولی تو لڑکیوں نے شاید اپنی جھینپ مٹانے کو ایک قہقہہ لگایا۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ کان پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ذرا زور سے کہیے مجھے آپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی"۔

"ہونہہ۔ اب بات نہیں بنی تو یہ کہہ دیا"۔ وہی لڑکی ناک چڑھا کر بولی۔

"آپ کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ابٹنے کی ناند میں ڈبکی لگا کر آئے ہوں"۔ تانیہ بھی ہنس کر بولی۔

"جی، آپ نے مجھ سے کچھ کہا"۔ وہ جواب میں بولا تو زینت سمیت ساری خواتین جو ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہی تھیں، ہنسنے لگیں۔ زینت بیٹے کو اتنے اچھے موڈ میں دیکھ کر کھلی پڑ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا تعارف تانیہ وغیرہ سے کرایا۔

"احمد سروش کی بہن تانیہ ہیں اور یہ ان سے چھوٹی دانیہ۔ اور یہ دونوں"

"یہ ہماری فرسٹ کزنز نزہت اور نکہت ہیں"۔ تب اس نے گردن کو تھوڑا سا ان کی طرف موڑ کر سر کو ہلکے سے خم کیا اور پھر رخ پھیر لیا۔ ماں ۔۔ دونوں بہنیں ۔۔ خالہ ۔۔ چچی اور ممانی وغیرہ نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس کی ایک ایک بات پر ان کی نظر تھی۔ اشعر۔ ندیم زبیر اور بصیر اس کے دوسرے کزنز بھی اس کے قریب ہی کھڑے تھے مگر تقریباً ساری لڑکیاں اور خواتین اسی کی طرف متوجہ تھیں یا دوسرے معنوں میں اسے اس کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھیں مگر ہزار خامیوں کے باوجود اس میں ایک بہت بڑا وصف یہ بھی تھا کہ تکبر یا گھمنڈ اس میں نام کو نہ تھا۔ نہ وہ اتراتا ہی تھا۔ یوں بھی کسی ایسی بزم میں شریک ہونے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا اور اتنی ساری خواتین کے درمیان وہ تھوڑا نروس بھی ہو رہا تھا۔ بار بار پیچھے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زینت یہی سمجھیں کہ وہ اتنی بھیڑ سے گھبرا رہا ہے۔ انہوں نے زینب سے کہا۔

"چلو اب کسی طرح بسم اللہ بھی کر چکو۔ آخر انتظار کس بات کا ہے"۔

"اجی ظاہر ہے ہمارا ہی ہوگا۔ ہمارے آئے بغیر بھلا یہ بسم اللہ کر سکتی ہیں"۔ شعیب منصور نے جو اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے سالی کی بات کا جواب دیا تو زینب خوش ہو کر بولیں۔

"ارے ہاں ہاں، چشم ما روشن دلِ ماشاد۔ آئیے آئیے آپ کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا بھائی صاحب"۔ وہ چھوٹے بہنوئی کو بھائی صاحب ہی کہتی تھیں۔

"پہلے کچھ بھی نہیں ہو سکتا کی وضاحت کر دیں آپا۔ پھر ہم آگے بڑھیں گے"۔ شعیب منصور جہاں تک آئے تھے وہیں رک کر شوخ سی معنی خیزی کے ساتھ بولے تو سب ہنسنے لگے اور زینت تو ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔

"اے جائیں۔ بڑے بیہودہ ہیں آپ۔ ذرا بھی تو شرم نہیں آتی"۔ زینب بری طرح جھینپ کر قدرے خفگی سے بولیں اور جواب میں شعیب منصور کوئی اور شوخ سا فقرہ اچھالنا چاہ رہے تھے کہ زینت اشارے سے انہیں منع کرتی ہوئی بولیں۔

"آئیے۔ ادھر ہی آ جائیے شعیب۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے"۔ تو شعیب منصور قالین پر بیٹھی ہوئی خواتین کے درمیان میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے ان کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ زینت نے ان کے قریب آتے ہی سب سے پہلے آہستہ سے انہیں بتایا کہ دولہا کی بہن بھی آئی ہوئی ہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔

رسم بڑوں کو ادا کرنی تھی۔ اس لیے لڑکیاں پھر ڈھولک سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

"ذرا ٹھہرو بچیوں! پہلے سورۂ اخلاص کی تلاوت ہو جائے پھر گانا شروع کرنا"۔ سلمیٰ بیگم نے دیوان پر بیٹھے بیٹھے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"اچھا تو پھر آئیے۔ آپ ہی سورۂ اخلاص پڑھ دیجیے"۔ زینب سلمیٰ بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"نہیں اب میں کیا پڑھوں گی۔ یہ اپنا ننھا ہی پڑھ دے گا"۔ سلمیٰ بیگم نے کہا اور پھر اسفند سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"چلو بیٹے۔ تم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر بہن کی پیشانی پر دم کر دو مگر پہلے تین مرتبہ درود شریف ضرور پڑھ لینا"۔ تو وہ جو نازپرور کے بیڈ پر ہی پاپ کے ساتھ ایک طرف ٹک گیا تھا۔ اس نے چونک کر دادی کی طرف دیکھا۔

"میں پڑھ دوں اماں جان۔ اچھا ٹھیک ہے"۔ اور پھر کندھے اچکاتا ہوا اٹھ کر نازپرور کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تو زینت اس خیال سے کہ کہیں وہ غلط سلط نہ پڑھ دے یا اس سے کوئی سہو نہ ہو جائے اور اس کا مذاق بنے گھبرا سی اٹھیں۔ یوں بھی تقریباً سب ہی کے چہروں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی بلکہ لڑکیاں تو ہنس ہنس کر آپس میں کھسر پھسر بھی کرنے لگی تھیں۔ دادی کے کہنے پر وہ چونکہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اس لیے وہ اسے پڑھتے بازنہ رکھ سکی تھیں۔ ان کا دل ابھی دھک دھک ہی کر رہا تھا کہ تبھی اس نے باقاعدہ قرأت کے ساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد تین مرتبہ درود پڑھنے کے بعد تین بار ہی سورۂ اخلاص کی تلاوت کی تو ساری محفل کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تقریباً سب ہی کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی اور جوں ہی وہ تلاوت کے بعد بہن کی پیشانی پر پھونک مار کر اور اس کے بالوں کو چوم کر پیچھے ہٹا تو زینب نے بڑھ کر چٹ چٹ اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"ارے ماشاء اللہ چشم بد دور۔ ہزاری عمر ہو تمہاری۔ تم تو چھپے رستم ہی نکلے بیٹے۔ کیسی خوبصورت آواز میں سورۂ اخلاص پڑھی ہے تم نے"۔

"مگر اس کا سارا کریڈٹ اماں جان کو ہی جاتا ہے کیونکہ یہ سب ان کی اعلیٰ تربیت اور فیضِ صحبت کا ہی نتیجہ ہے"۔ شعیب منصور نے ستائشی انداز میں کہا۔

"ہاں واقعی۔ اماں جان نے تو دادی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہی ہوگی"۔ سہیل منصور کی بیوی نازش بولیں جو سوتیلی ساس کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔

"اے کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو بچوں۔ یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو سب سے پہلے دینی اور مذہبی تعلیم دے۔ سو میں نے بھی سب سے پہلے اپنے ننھے کو کلام مجید ہی پڑھوایا تھا اور یہ کوئی ایسی خاص یا انوکھی بات تو نہیں"۔ سلمیٰ بیگم انتہائی انکساری سے کام لے کر بولیں۔ زینت جو شوہر اور دیورانی کے ساس کی تعریف کرنے پر جزبز سی ہو رہی تھیں اور ماں ہو کے اپنے فرائض پورے نہ کرنے پر شرمندہ بھی۔ انہوں نے امداد طلب نظروں سے زینب کی طرف دیکھا تو زینب بات کا رخ موڑتی ہوئی بولیں۔

"بھئی، ہم تو دل سے اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کا نام لے کر جو کام بھی شروع کیا جاتا ہے اس میں خیر و برکت ہی نہیں بڑی کامیابی بھی ہوتی ہے۔ خیر اب تم کسی طرح بیٹی کو مایوں تو بٹھاؤ زینت"۔

"ہاں ہاں، اتنی دیر سے یہ بے چارے مرد بھی کھڑے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ آئیے اماں جان! آپ کم از کم پوتی کو مسند پر بٹھوا دیں۔ رسم بھی آپ ہی ادا کر دیجیے گا"۔ زینت نے شوہر کے سامنے ساس کی اہمیت جتاتے ہوئے ان سے کہا۔

"اے نوج بہو ۔۔ مجھ بیوہ کا اس وقت بھلا کیا کام۔ پہلے سات سہاگنوں کو کھڑا کرلو اور کشور میاں کی چھوٹی بہو روشن آرا سے رسم کی ابتدا کرا دو۔ خیر سے دسویں مہینے ماں بن گئی"۔

روشن آرا بھی جو ساس کی بات پر اٹھنے لگی تھی سلمیٰ بیگم کی بات پہ شرما کر پھر بیٹھ گئی ۔۔ کشور جہاں نے پھر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اے اب اٹھ بھی چکو بہو! یہاں تو باتوں میں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے"۔ تب شرماتی لجاتی سی روشن آرا جو ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود بڑی نازک اور خوبصورت سی تھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسفند نے اسے بڑی دلچسپی اور تعجب سے دیکھا کیونکہ چہرے مہرے اور قد و قامت سے وہ اسکول کی کوئی طالبہ ہی لگ رہی تھی۔

پھر زینت سمیت سات سہاگنوں نے نازپرور کو سہارا دے کر بیڈ سے اتارا اور اسی کھٹولے نما چوکی پر بٹھا دیا جس پر نگندوں کے کام کی پیلے رنگ کی سوزنی بچھی تھی اور پیلے رنگ کا گاؤ تکیہ اور تکینی بھی رکھی تھی اور جس پر پیلے رنگ کا زرکار چھتر بھی تنا ہوا تھا۔

پھر سب سے پہلے ماں نے نوٹوں کی موٹی سی گڈی کا صدقہ اتار کر اس کے آگے کھٹولے پر ہی ایک طرف ڈال دیا۔ اس کے بعد روشن آرا نے گویا رسم کی ابتدا کی۔ اس نے بھی سب سے پہلے نازپرور پر سے نوٹوں کا صدقہ اتارا اور ان نوٹوں کو زینت کے اتارے ہوئے نوٹوں کے پاس ڈال کر ابٹنے کے دونوں طشت اس کے آگے رکھ دیے۔ پھر اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر تھوڑا سا ابٹن رکھ کر اسے مہندی کی طرح جمایا۔ تھوڑا سا اس کی پیشانی پر لگایا پھر مصری کی چھوٹی سی ڈلی اس کے منہ میں ڈال کر ایک سوا ایک روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بعد زینت سمیت چھ سہاگنوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ زینب کا نمبر سب سے آخر میں آیا تھا۔ انہوں نے اس کی بائیں ہتھیلی پر بھی ابٹنا لگایا اور پھر اس کے بعد خواتین کا نمبر آیا جو صدقہ اتارنے کے بعد مایوں کی رسم کا نیگ نازپرور کی ہتھیلی پر رکھتی گئیں لیکن مردوں نے صرف نیگ ہی ہتھیلی پر رکھا اور شعیب منصور نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیہ کلمات بھی کہے اور جب لڑکیوں کی باری آئی تو سب سے پہلے نازی نے ابٹنا کھیلنے کی ابتدا کی۔ پھر تو وہ ہلڑ مچا کہ بڑی عمر کی خواتین گھبرا کر کمرے سے نکل گئیں۔

نازی نے سب سے پہلے اسفند کو ہی تاکا تھا۔ اس لیے اسفند کی تو جیسے شامت ہی آ گئی تھی۔ حتیٰ کہ شعیب منصور کو اور دولہا کی بہنوں کو بھی نہیں بخشا گیا تھا۔ شعیب منصور تو خیر خود ہی کھسک لیے تھے مگر تانیہ وغیرہ اپنے اتنے عمدہ کپڑوں کی بربادی پر بڑی جزبز ہو رہی تھیں۔ اصل میں بعض لڑکیوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ وہ چاروں مایوں کی رسم میں شرکت کرنے آئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب سارا ابٹنا ختم ہو گیا اور لڑکے بھی تھک ہار کر بیٹھ رہے تو لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال کر مانجھا گانا شروع کیا۔

نازو کا ماہیا　　ماہیے کا ساجھا
بولو کون ہے　　کون ہے؟
اوہو باوا ہے؟
اوہنوں
بھیّا ہے؟
نانا

چاچا ہے
نہیں نہیں　　وہ تو احمد سروش ہے۔ احمد سروش ہے
احمد بانکا سجیلا ہے؟　　کیا چھیل چھبیلا ہے؟
توبہ نہیں نہیں
اس کا بونے جیسا قد ہے　　ہاتھی جیسا ڈول ہے
کوّے جیسی رنگت ہے　　بیل جیسی صورت ہے
چوہے جیسی آنکھیں ہیں　　گدھے جیسے کان ہیں
طوطے جیسی ناک ہے　　اونٹ جیسے ہونٹ ہیں
ہاہاہا — واہ یہ احمد سروش ہے
یہ تو سبزی فروش ہے
آں ہاں　　میوہ فروش ہے
اوہنوں　　دوا فروش ہے۔
واہ بھئی دوا فروش ہے
یہ احمد سروش بھی دوا فروش ہے

گو یہ گیت ماہیے کا نہیں تھا بلکہ مہندی کے دن کے لیے ان لڑکیوں نے تیار کیا تھا اور اس کے ابتدائی بول کچھ اور ہی تھے۔ مگر پنجابی ٹپوں کی طرح ان لڑکیوں نے یہ گیت بڑی ترتیب اور سریلی آوازوں بلکہ خوبصورت دھن میں گایا تھا۔ کچھ لڑکیاں سوال کرتیں۔ کچھ جواب دیتیں اور آخری بند سب باہم آوازیں ملا کر گانے لگتیں۔ تانیہ اور اس کی بہنیں تو پہلے ہی لباس خراب ہو جانے پر جلی بیٹھی تھیں۔ اب جو گانے میں سروش کا نقشہ کھینچا گیا اور سب سے بڑھ کر اسے دوا فروش کہا گیا کہ تانیہ کے والد نے اپنے کاروبار کی ابتدا ہی دواؤں کی ایک کمپنی کھول کر کی تھی اور اتفاق سے کمپنی کا نام بھی اپنے اکلوتے بیٹے احمد سروش کے نام پر ہی رکھا تھا۔ تانیہ کا یہ شاید یہ کوئی ٹیک پوائنٹ تھا اس لیے گانا ختم ہوتے ہی وہ اپنی تینوں بہنوں سمیت اٹھ کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

"بھئی اگر ہمارا بھائی دوا فروش ہے تو یہ تو آپ لوگوں کو بات پکی کرنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔"

"ہاں اور ہمارے بھیا تو اتنے خوبصورت ہیں کہ آپ کے خاندان میں شاید کوئی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔" دانیہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ اس کے لہجے میں حقارت سی شامل تھی۔ فضیلہ ذرا تیز مزاج کی تھی اس حقارت آمیز لہجے کو برداشت نہ کر سکی اور چمک کر بولی۔

"ارے جائیں بہت دیکھے ہیں آپ کے بھیا جیسے خوبصورت۔ ارے ایسے خوبصورت لوگ تو ہمارے بھائیوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں پانی۔" اسفند نے جو لڑائی کے آثار دیکھے تو جلدی سے کمرے سے کھسک گیا۔

"اُف فار گوڈ سیک فضیلہ! خاموش ہو جاؤ۔ بھئی احمد بھائی جیسے بھی ہیں۔ ہیں تو ہمارے ہونے والے بہنوئی ہی۔ بالکل بھائیوں کی طرح۔" نیلوفر نے ناز پرور کے اشارے پر گویا بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو نیلو باجی۔ کیسا بھائی اور بہنوئی۔ ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ بھیا کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہیں۔"

"ہاں بھئی۔ ابھی وقت ہے۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ بعد میں یہ نہ ہو کہ تمہاری بہن منہ بسورتی نظر آئیں۔" تانیہ نے کہا۔ شاید کسی نے باہر جا کر زینت کو اطلاع دے دی کہ اندر کچھ تکرار ہو رہی ہے۔ یا پھر وہ خود ہی اندر کی خیر خیریت لینے آئی تھیں۔ انہوں نے آتے آتے تانیہ کی بات سن لی تھی۔ برا تو بہت لگا لیکن بیٹی کی ماں تھیں۔ اور بیٹی بھی وہ جو مایوں بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر لڑکیوں سے پوچھا۔

"کیوں بھئی بچیوں، کیا تھک گئیں تم جو گانا بند کر دیا۔ خیر چلو باہر کھانا لگ چکا ہے۔ کھانے کے بعد جب تک دل چاہے گا لینا۔" اور پھر تانیہ

کے قریب آ کر انہوں نے عمیرہ سے کہا جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ان چاروں بچیوں کو میں یہیں اپنے اور نازو کے ساتھ کھانا کھلواؤں گی۔ ورنہ یہ باہر گئیں تو تکلف اور شرم میں آدھا پیٹ بھی نہ کھا سکیں گی۔ عمیرہ تم پہلے ہمارا کھانا یہاں بھجوا دو۔"

"جی اچھا پھوپھو بیگم۔" عمیرہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ تب انہوں نے تانیہ کو بہت ہی محبت اور پیار سے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اے کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا بیٹی۔ میں تو کام میں ایسی لگی کہ ڈھنگ سے تمہاری خاطر تواضع بھی نہ کر سکی۔" مگر تانیہ سے زیادہ اس کی بہن اور کزنز کا منہ پھولا رہا۔

"نہیں آنٹی! اس وقت تو ہم جا رہے ہیں۔ دیر بھی بہت ہو گئی ہے۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" تانیہ نے کہا۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

"ارے کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔ دیر ہو یا کچھ میں تمہیں بغیر کھانا کھلائے تو ہرگز جانے نہ دوں گی۔ چلو بیٹھو جلدی سے شاباش۔" زینت نے بڑے دلار سے کہا۔

"کھانے کا کیا ہے۔ کھانا تو گھر میں بھی پکا ہے آنٹی۔ ہم وہاں جا کر کھا لیں گے۔"

"ہاں اور کیا۔ ہم کھانا کھانے تو نہیں آئے تھے۔" دانیہ بھی بہن کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔ پھر زینت نے بہت رد کا مگر وہ رکی ہی نہیں اور انہیں سلام کر کے چلی گئیں۔ ان کے چلے جانے سے رنگ میں بھنگ سی پڑ گئی تھی۔ ناز پرور بھی بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ اسی کی زبانی زینت کو حقیقتِ حال کا علم ہوا تھا۔ کیسا کھانا اور کیسا کچھ۔ انہوں نے لڑکیوں کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ انہوں نے ایسا بیہودہ گانا ان کے سامنے کیوں گایا تھا جسے انہوں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اب عین وقت کے وقت انکار ہو گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں گے۔ اب تو تمہاری بیہودگی کی وجہ سے مجھے بھی ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پیر جوڑنے پڑیں گے۔ تم لوگوں نے اصل معنوں میں انہیں نہیں مجھے ذلیل و خوار کیا ہے۔

"اُف تو یہ لڑکے والے تقریباً سارے کے سارے ہی ایسے ذلیل ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں جب لڑکی لینی ہوتی ہے تو کیسے گڑگڑاتے اور خوشامدیں کرتے ہیں اور جب بات پکی ہو جاتی ہے اور رسمیں شروع ہونے لگتی ہیں تو اپنی ساری اوقات دکھا دیتے ہیں۔" درخشاں جلے کٹے انداز میں بولی۔

"ارے زینت یہ تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو باہر تمہاری ملنے والیاں تمہیں پوچھ رہی ہیں۔ یہ کہاں کی معقولیت ہے بھلا کہ میزبان تو غائب اور مہمان بے چارے اکیلے کھڑے۔" یکایک زینب نے کمرے میں داخل ہو کر کہا مگر وہ اپنی بات کہتے کہتے یکایک خاموش ہو گئیں۔

"کیوں خیر تو ہے یہ تم سب کے چہروں پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟" وہ باہر تھیں اسی لیے انہیں کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے آپا۔" زینت تھوڑا سا منہ بسور کے بولیں اور پھر انہیں دولہا کی بہنوں کے بگڑ کر — چلے جانے کی تفصیل بتا دی۔

"اوہو یہ تو بُرا ہوا۔ اب کیا کرو گی؟" پوری بات سننے کے بعد زینب نے تردد سے پوچھا۔

"کروں گی کیا آپا۔ ان لڑکیوں کی بے ہودگی کی وجہ سے اب مجھے خود جا کر سمدھن کے سامنے ناک سے سات لکیریں کھینچنی پڑیں گی۔" زینت بے حد جلے کٹے انداز میں اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"اے ہاں بھلا دیکھو تو یہ بیٹھے بٹھائے اور سر پر پڑی۔ ورنہ ایسے موقعوں پر تو اس سے کہیں زیادہ بے ہودہ مذاق ہوتے ہیں آج کل تو خیر دستور ہی ختم ہو گیا۔ ورنہ تو پہلے ڈومنیاں اور میراثنیں گانے ہی گانے میں ایسی پنج پنج بسیری گالیاں دیتی تھیں سمدھنوں کو سننے والا شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔ دولہا کی بہنیں بہت خرد ماغ معلوم ہوتی ہیں جبھی تو اتنے سے مذاق کو بھی نہ سہار سکیں۔" عائشہ بیگم نے کہا جو زینت کے پاس کھڑی تھیں۔

"ہاں یہ تانیہ ہے ہی کچھ چپکی ٹائپ۔ کالج میں بھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتی ہے۔" نیلوفر نے کہا۔

"اے یہی کیا مجھے تو وہ تینوں ہی ایسی ہی لگیں فائٹر کوک قسم کی۔ اب نا معلوم گھر والے کیسے ہوں۔" کوثر نے رلائے زنی کرتے کے سے انداز میں کہا۔

"ارے بیٹی۔ دیگ میں تو ایک چاول ہی دیکھا جاتا ہے جو اگر کچا تو جانو سارے چاول ہی کچے ہوتے ہیں۔" زینب نے طنز بھرے انداز میں ہنس کر کہا۔

"ارے نہیں خالہ جان۔ احمد بھائی کی ساری فیملی بہت ایجوکیٹڈ اور ایڈوانس ہے میرے خیال میں تو وہ لوگ اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیں گے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔" نیلوفر بولی۔

"نہیں خیر یہ تو نہ کہو۔ یہ لڑکے والے خواہ کتنے ہی روشن خیال اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں ان معاملات میں وہی لکیر کے فقیر ہوتے ہی ہیں بس ذرا سی کوئی خلاف مرضی بات ہو جانی شرط ہوتی ہے ان کے لیے پھر تو یہ ایسی آنکھیں پھیرتے ہیں کہ تو کون اور میں کون۔" عائشہ بیگم نے کہا۔

"جی ہاں۔ اور مجھے تو خالہ بیگم یہ سب کے سب اپ اسٹارٹس (لو ذو لیتے) ہی لگتے ہیں۔ شاید آپ نے بھی نوٹ کیا ہو اس روز جب تاریخ مقرر ہونے کی خوشی میں انہوں نے ہمیں چائے پر اپنے گھر مدعو کیا تھا تو کیسی شو آف کر رہی تھیں وہ سب کی سب اپنے زیور اور کپڑوں کی۔ بھلا سمدھنوں کے سامنے اپنی کاروں، بزنس اور بینک بیلنس کا ذکر بھی کہیں کیا جاتا ہے۔ لگتا ہے سب کچھ زندگی میں پہلی بار نصیب ہوا ہے تبھی تو اتنی چھچھوری حرکتیں کر رہے تھے۔" درخشاں شاید سب سے زیادہ جل بیٹھی تھی اس لیے ایک طرح لڑکے والوں کے عیب گنوائے۔

"ارے بچی! اب ساتھ کھا کر ذات کیا پوچھنی۔ یہ سب تو اس وقت معلوم کرنا چاہیے تھا جب بات پکی ہو رہی تھی۔" زینب نے کہا۔

"خیر اپنے طور پر تو ہم نے اچھی طرح چھان بین کر لی تھی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ قسمت میں اگر خواری لکھی ہوتی ہے تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ اب ایک اتنی سی بات پر مجھے ہی ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پیر جوڑنے پڑیں گے۔"

"ارے خدا نہ کرے آپ کیوں جوڑیں ہاتھ پاؤں۔ میری مانیں تو شعیب بھائی کو بلا کر ساری بات بتا دیں وہ خود ہی نمٹ لیں گے ان لوگوں سے۔" عائشہ بیگم نے مشورہ دیا۔

"اے لو جی۔ کیا سر پھٹول کرانا چاہتی ہو مردوں ہی مردوں میں جو یہ بے تُکا مشورہ دے رہی ہو عائشہ بیگم۔ ایسی باتوں کی تو ہوا تک نہیں دی جاتی مردوں کو۔ ہاں البتہ اگر معاملہ بالکل ہی ختم کرانے کا ارادہ ہے تو اور بات ہے کیونکہ مردوں کو بتانے کا مطلب تو یہی ہے کہ اتنی سی بات کا بتنگڑ بن کر وہی مثل ہوگی کہ سارا جھگڑا ٹنٹا ختم کر کے تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر چین سے۔" زینب عائشہ بیگم کے مشورے پر بھڑک کر بولیں۔

"خدا نہ کرے آپا! شیطان کے کان بہرے۔ ایسی بدفالیں منہ سے نہ نکالیے۔ عائشہ آپا نے اگر غلط مشورہ بھی دیا ہے تو ذہن تو سب ہی کے ماؤف ہیں اس پریشانی میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے۔" زینت نے اپنی بہن اور نند کے رشتے کی نزاکت کے پیش نظر بہن کی کھری کھری بات کو اس طرح لیا۔

"اے چھوڑیں بھابھی جان۔ یہ سارا کیا دھرا تو زینب آپا کا ہی ہے۔ میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا جب اُبٹنے کے تھال گرے تھے۔ اب دیکھ لیں پڑ گئی نا رنگ میں بھنگ۔" عائشہ بیگم بھی خاموش بیٹھنے والی نہ تھیں انہوں نے فوراً ہی بدلہ اُتارا۔

"اے یوں دوشالے میں لپیٹ کر کیوں مار رہی ہو بہن۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں نے جان بوجھ کر اپنی بھانجی کے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔" زینب برامان کر بولیں۔ اور تب زینت کا دل چاہا کہ کہیں عائشہ آپا کچھ غلط تو نہیں کہہ رہیں آپا میں تو پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ مگر کچھ کہہ کر بہن کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتی تھیں اس لیے سخت عاجزی سے بولیں۔

"قسم سے آپا اس وقت میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں خدارا آپ ہی خاموش ہو جائیں۔" زینب خود بھی بہت معاملہ فہم اور زیرک تھیں انہوں نے جلدی سے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔

"پریشانی اٹھانے سے فائدہ۔ ابھی تو لڑکیاں گھر بھی نہ پہنچی ہوں گی تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔"

"نہیں ممی! میں آپ کو ہرگز جانے نہیں دوں گی۔" نازپرور جو اب تک خاموش بیٹھی تھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"واہ کیوں نہیں جانے دو گی کیا تم چاہتی ہو کہ سچ مچ ہی سب لوگوں کے سامنے میری ناک کٹ جائے۔" زینت نے بیٹی کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

"ہاں نازو بیٹی ان کا جانا اس وقت بہت ضروری ہے کیونکہ اگر یہ نہ گئیں اور بات مردوں تک پہنچ گئی تو اور بھی بُرا ہو گا۔" خالہ نے بھی نازو کو سمجھایا۔

"نہیں! یہ تو ممی کی سخت توہین ہو گی وہاں جا کر ان لوگوں سے بیگ کرنا۔ آپ ٹھہریں ممی۔ میں خود فون پر احمد سے بات کرتی ہوں۔" نازپرور نے خالہ کی بات کا نوٹس لیے بغیر کہا۔

"ارے نہیں۔ ایسا تو غضب بھی نہ کرنا نازو کہ لڑکے سے خود بات کرو۔ لاکھ اس سے تمہاری انڈراسٹینڈنگ سہی لیکن جب مرد شوہر بن جاتا ہے تو عورت کی ایک معمولی سی کمزوری کو بھی رائی کا پہاڑ بنا لیتا ہے اور کسی نہ کسی موقع پر اسے طعنہ ضرور دے بیٹھتا ہے۔" زینت نے گویا ایک طرح مرد کی فطرت اور خصلت سے بیٹی کو خبردار کیا۔

"اُف آپ بھی نمعلوم کس زمانے کی بات کر رہی ہیں ممی۔ آج کل کا زمانہ کچھ اور ہی ہے۔ آج کل تو لڑکی والے ان ساری باتوں کو گردانتے ہی نہیں۔ ممی سچ میں آپ سے کہتی ہوں کہ اگر وہ لوگ زیادہ اکڑ مکڑ دکھائیں تو آپ بھی صاف صاف انکار ہی کر دیجئے۔ ہونہہ۔ آئی کیئر فور موڈز۔" ناز پرور جو سخت غصے میں تھی گویا دو ٹوک فیصلہ کرتی ہوئی بولی۔

"تم اپنا منہ بند ہی رکھو ناز و ایکساں ہو کر پٹر پٹر بولے ہی جا رہی ہو۔ لو بھلا کسی کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ لڑکی انکار کرنے کے لیے بضد ہے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ پہلے ہی کیا کم میرے دم پہ بنی ہوئی ہے۔ بس خدا عزت رکھ لے۔" ماں نے بُری طرح لتاڑا تو ناز پرور گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی۔

"اے چھوڑو تم کہاں بچی کے لتے لینے بیٹھ گئیں۔ چلو اب جا بھی جا کو سمدھیانے ورنہ بات بڑھ گئی تو نبھانی مشکل ہو جائے گی۔" زینب نے بہن سے کہا۔ اور پھر بھانجی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اس خوشی کے موقع پر روؤ تو نہیں بیٹی۔ بڑی بدشگونی کی بات ہوتی ہے یہ رونا دھونا۔"

"اونہہ! بدشگونی کی ابتدا تو خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے اور چلی ہیں بدشگونی کا احساس دلانے۔" عائشہ خاتون نے جلے کٹے انداز میں سہیل منصور کی بیوی نازش سے کہا تو انہوں نے ہاتھ دبا کر اشارے سے انہیں منع کرتے ہوئے زینت سے کہا۔

"مگر آپ کو وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے بھابھی جان۔ بیچ والی تو وہ آپ کی دوست نگار آپا ہیں آپ ان سے کہیئے کہ وہ جا کر بات کریں۔ خود جائیں گی تو تکلف اور مصلحت کی وجہ سے کھل کر کچھ کہہ بھی نہیں سکیں گی ان لوگوں سے۔"

"ارے واہ چھوٹی دلہن تم تو بڑی دُور کی کوڑی لائی ہو۔ اے ہماری تو پریشانی میں واقعی عقلوں پہ پتھر پڑ گئے تھے۔ کہاں ہیں یہ نگار زینت ذرا انہیں بلاؤ تو سہی۔" زینب نازش کے مشورے پر جیسے پھڑک ہی اٹھیں اور ان کی پیٹھ پر تھپکی دینے کے بعد زینت کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ساری مصیبت تو یہی ہے کہ نگار آج آئی ہی نہیں۔ ان کے میاں کو بھی آج ہی جانا رہ گیا تھا جاپان۔" زینت بولیں۔

"مگر انکل تو شام کے پلین سے کب کے چلے بھی گئے ہوں گے ممی۔ اب تو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ آپ انہیں فون پر کونٹیکٹ کرنے کی کوشش تو کیجیے۔" نیلوفر نے کہا۔

"ہاں ہاں نیلوفر ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ نگار آپا کو فون کر کے ساری بات بتا دیجیے۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہیں۔" نازش نے کہا تو تھوڑے سے تامل کے بعد زینت نگار کو فون کرنے چل دیں۔ مگر جاتے جاتے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں درخشاں نازلی اور عمیرہ سے کہا جو کچھ دیر پہلے ہی تانیہ وغیرہ کے لیے کھانا لے کر اندر آئی تھیں۔

"دیکھو بچیوں خبردار جو یہ بات میرے آنے تک کمرے سے باہر نکلی تم سب اندر سے دروازہ بند کر کے یہیں بیٹھ جاؤ۔ دلہن آپ بھی ذرا خیال رکھیں اور آپا آپ ذرا باہر جا کر مہمانوں کی خاطر تواضع کریں۔ اگر نگار نے مجھے ساتھ لے جانے کو کہا تو میں بالا ہی بالا چلی جاؤں گی۔" پھر وہ عائشہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر فون کرنے اپنے کمرے میں اس مصلحت سے لے گئیں کہ ان کا پیٹ ذرا ہلکا تھا اور ان کو اپنے ساتھ لے جا کر یہ جتانا مقصود تھا کہ تم سے بڑھ کر قابل اعتماد یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ نگار فرزند علی ان کی بہت گہری سہیلیوں میں سے تھیں۔ شعیب منصور اور فرزند علی کی یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں ہی بزنس مین تھے۔ اس لیے بیویوں میں گاڑھی چھننے کی وجہ سے شوہروں کا بھی آپس میں دوستانہ ہو گیا تھا۔ نگار کا حلقۂ احباب زینت سے کہیں زیادہ وسیع تھا جس میں تقریباً تمام ہی احباب ہائی جنٹری (اعلیٰ طبقے) سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد سروش کی فیملی بھی ان احباب میں شامل تھی خصوصاً احمد سروش کی چھوٹی خالہ نورین سے ان لوگوں کے بہت گہرے مراسم تھے اور نگار نے ہی بیچ میں پڑ کر یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ نگار سے سب یوں بھی دبتے تھے کہ ہم عصروں میں پلاٹینم اور ڈائمنڈ کی نمائش میں وہ سب سے پیش پیش بلکہ ممتاز ہوتیں۔ اس پر کھرّ تل اور حاضر جواب بھی بہت تھیں۔ فون پر زینت کی زبانی تانیہ کے بگڑ کر چلے جانے کا تمام قصہ سُنا تو ایک دم ہی جلال میں آ گئیں حالانکہ میاں کو ایئرپورٹ چھوڑ کر تھکی ہاری آئی تھیں کیونکہ میاں کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی پھر بھی احمد سروش کے یہاں جانے کے لیے فوراً ہی کمربستہ ہو گئیں۔ پہلے زینت کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا پھر فوراً ہی ملتوی کر کے بولیں۔

"نہیں! تمہارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ میں خود جا کر ان سے بات کرتی ہوں۔ اور اگر انہوں نے زیادہ سات پانچ کی تو پھر یہ قصہ ہی ختم کر کے آؤں گی تاکہ وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ ان کا بیٹا عرش سے اُترا ہے۔ ہماری نازو کو اس سے بھی کہیں بڑھ کر ایک سے ایک لڑکے مل سکتے ہیں۔"

"اف! نہیں نہیں نگار بہن یہ تو نہ کہیے۔ یہاں تو بچی کو مایوں بھی بٹھا دیا۔ مہمان داری بھی شروع ہو گئی۔ اب خدانخواستہ کوئی ایسی

ویسی بات ہو گئی تو خاندان تو کیا کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے یوں بھی بھلا شریفوں میں کہیں ایسا ——— بھی ہوتا ہے؟" زینت گھبرا کر بولیں۔

"ارے چھوڑو تم جیسے لوگ خاندان اور شرافت کی وجہ سے ہمیشہ خسارے ہی میں رہتے ہو ورنہ آج کل کا زمانہ ٹٹ فور ٹیٹ کا ہے سمجھیں۔ بس ایک ذرا سا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو تو یہ ساری نزاکتیں اور احتیاطیں سب کی سب خود ہی پھر سے اُڑ جائیں گی — یوں بھی ڈیئر فرینڈ اپنی ڈفلی اپنا راگ کا زمانہ ہے یہ۔"

"ہاں وہ ٹھیک ہے مگر میرے خیال میں بات اتنی بھی نہیں بگڑی ہو گی۔ آپ جا کر بات تو کریں، وہ تو میرے خیال میں آپ کی شکل دیکھتے ہی بلوں میں گھس جائیں گے۔" زینت نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا۔

"واہ کیا خوب یعنی میں تمہارے خیال میں کوئی جنگلی بلی ہوں۔" نگار نے ہنس کر کہا اور پھر بولیں۔

"اچھا خیر تم بالکل مطمئن رہو میں جا کر سب سنبھال لوں گی۔ ہاں اتنا ضرور کرو کہ تھوڑا سا کھانا وہاں ابھی ابھی بھجوا دو — میں ان لوگوں کو تھوڑی سی نفسیاتی چوٹ دینا چاہتی ہوں۔"

"تو اچھا" کہہ زینت ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور باہر جا کر جلدی جلدی بڑی بڑی پتیلیوں میں کھانا نکلوایا اور پھر اپنی کار میں رکھوا کر ڈرائیور کے ہاتھ سمدھیانے بھجوا دیا۔

شادی کا گھر تھا اور تقریباً تمام عزیز و اقارب آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ دن بھر گپ شپ لڑانے کے بعد تھک تھکا کر سو گئے تھے اور کچھ لونگ روم (نشست گاہ) میں تانیہ کی والدہ نسرین اور چھوٹی خالہ نوین سمیت وی سی آر پر چلتی ایک انگریزی فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے کہ تانیہ، دانیہ اور دونوں کزنز کے ساتھ دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی — دوپٹہ ایک طرف پھینکا اور پرس ایک طرف اچھالا اور ماں کے پاس دیوان پر دھپ سے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"پتا نہیں کیا خوبی نظر آئی تھی آپ کو اس لڑکی میں جو بھیا کی قسمت وہاں پھوڑ دی۔ توبہ اتنے ذلیل لوگ ہیں کہ شاید ہی کوئی ہو—"

اسی کی نہیں بلکہ دانیہ وغیرہ کی بگڑی بگڑی صورتیں دیکھ کر ہی سب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ نوین نے اٹھ کر پکچر اسٹاپ کر دی۔

"کیوں کیوں کیا ہوا تانیہ۔ کیا کچھ کہا ان لوگوں نے تمہیں؟" نسرین نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کہنا تو بہت چھوٹی بات ہے ممی انہوں نے تو باقاعدہ ہمیں گالیاں دی ہیں۔" تانیہ نے گلوگیر لہجے میں کہا اور رونے لگی۔

"ہائے گالیاں دی ہیں ان کمینوں نے تمہیں؟" نسرین بیٹی کی بات اور پھر اس کے رونے پر تلملا کر بولیں۔

"بھئی صاف صاف بتاؤ نا کہ بات کیا ہوئی ہے تاکہ ہم بھی انہیں ایسا مزہ چکھائیں کہ وہ بھی یاد کریں۔" تانیہ کی چھوٹی پھوپھی شاداب نے بہت غصے میں پوچھا۔ تو دانیہ نے خوب نمک مرچ لگا کر انہیں ساری بات بتا دی۔

"ارے یہی کیا ان لوگوں نے شروع ہی سے ہمیں دیکھ کر منہ بنا لیا تھا۔" تانیہ کی کزن نزہت بولی۔

"منہ کیا بنا لیا تھا بلکہ صاف صاف منہ پر کہہ دیا کہ یہ دولہا کی بہنیں مایوں کی رسم میں کیوں آئی ہیں۔ ان کا بھلا کیا موقع تھا یہاں آنے کا۔"

"ہاں اور پتا ہے جب وہ ساری کی ساری اُبٹنا کھیل رہی تھیں تو نازو کی آنٹی کے منع کرنے کے باوجود نازو کی کزنز نے یہ کہہ کر کہ اگر ایسے ہی کپڑے بچانے تھے تو یہاں آئی ہی کیوں تھیں، جان جان کر ہمارے کپڑوں پر اُبٹنا ملا۔ ورنہ منہ اور سر پر بھی مل سکتی تھیں اسٹوپڈ لڑکیاں۔" نکہت بولی۔

"ہاں اور وہ جو آپ نے پھول بھیجے تھے نا ان پر بھی نازو کی ممی نے بہت اعتراض کیا تھا کہ کیوں بھیجے ہیں اور کس کے لیے بھیجے ہیں؟" تانیہ نے مزید شتابہ لگایا۔

"ہاں اور نازو کا بھائی تو لگ رہا تھا جیسے کسی لارڈ گورنر کا بچہ ہو۔ ایسا اکڑفوں اور خرد ماغ کہ سیدھے منہ کسی سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔" نزہت بولی۔

"پتا ہے وہ جان کر اسے اونچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے سب کے سب۔ لیکن مر کر دوبارہ بھی پیدا ہو جائے تو میرے بھیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" دانیہ بولی۔

"ہاں مگر بعد میں تو اس نے بھی اپنی ساری اوقات دکھا دی تھی اُبٹنا کھیلتے وقت۔ اس نے اپنے سارے کزنز کو بلا لیا تھا اور

سارے کے سارے ہی بڑے چھچھورے اور لوفر سے لگ رہے تھے لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر اُبٹن مل رہے تھے انہوں نے تو ہمیں بھی نہیں چھوڑا۔" نکہت نے جھوٹ بولنے کی انتہا کر دی۔

"ہائے یہ تو بڑے ذلیل نکلے سارے کے سارے، حالانکہ اوپر سے تو بڑے ڈیسینٹ لگتے ہیں۔" تانیہ کے ماموں زاد بھائی کی بیوی صدف نے کہا۔

"اوپر سے تو سبھی ڈیسینٹ لگتے ہیں لیکن اندر کا حال واسطہ پڑنے کے بعد ہی کھلتا ہے۔" تانیہ کی تایا زاد زریں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ یہ سب کی سب زیادہ انگریزی ہی بول رہی تھیں۔

"دیکھا نوین تم نے، بڑی تعریفیں کرتی تھیں تم ان لوگوں کی اور وہ کیسے ذلیل نکلے۔" تانیہ کی امی نسرین نے سب کچھ سننے کے بعد اپنی چھوٹی بہن نوین کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھئی، میں نے تو پہلے ہی ان لڑکیوں کو کتنا منع کیا تھا کہ وہاں مت جاؤ۔ اب جانے کا نتیجہ بھی بھگت لیا نا؟" نوین نے ساری بات اپنے اوپر آتے دیکھی تو لڑکیوں کو الزام دینے لگیں۔

"واہ خوب کہا کہ آپ نے کہ نتیجہ بھگت لیا۔ کوئی یہ کسی راہ چلتے کا معاملہ تو نہیں، سمدھیانے کی بات ہے۔ کیا کہیں ایسا بھی کیا جاتا ہے لڑکے والوں سے؟" زریں نوین کی بات پر جل کر بولی۔

"ہاں، اور بھلا لڑکی والے بھی کہیں ایسے تیر ہوتے ہیں۔ ایسا اندھیر تو کہیں بھی نہیں دیکھا۔ جب ابھی سے ان لوگوں کی دلہن کا یہ عالم ہے تو بعد میں تو نہ جانے کیا ہوگا۔" صدف بھی بڑے غصے سے بولی۔

"امی ہوگا کیا۔ ہم تو لڑکے والے ہیں دبنا تو ان لوگوں کو چاہیے کہ ان کی لڑکی ہمارے گھر آرہی ہے بعد میں ہم اسے کیسا ٹریٹ کریں۔ ٹھہریں میں ابھی نازو کی ممی سے فون پر بات کرتی ہوں۔ ایسی کھری کھری سُناؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے ان کے۔" شاداب نے کہا جو بہت تنک مزاج تھی۔

"ارے نہیں! شاداب اس طرح فون پہ بات نہیں کرتے آخر تو سمدھیانے کا معاملہ ہے۔" تانیہ کی بڑی خالہ مہ جبین نے شاداب کو سمجھانا چاہا تو تانیہ اپنے آنسو پونچھ کر نہایت جذب کے عالم میں بولی۔

"امی کس کا سمدھیانہ وِدھیانہ۔ ہمیں نہیں کرنی اپنے بھیا کی شادی وہاں۔"

"ہائیں ہائیں تانیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اب بھلا ایک اتنی سی بات پر بھائی کا رشتہ ہی تڑوانے بیٹھ گئیں۔" مہ جبین نے اسے فوراً ہی ٹوکا۔

"ہاں بھئی ایسا تو نہ کہو۔ کل دو روز تو نکاح میں رہ گئے ہیں۔ کل مہندی ہے پرسوں رلیسٹ ڈے اور اترسوں شادی۔ اور شادی کی ساری تیاریاں بھی مکمل ہو گئی ہیں اب بھلا بات کیسے توڑی جا سکتی ہے۔" صدف نے دبی زبان سے کہا کہ وہ اس گھر کی بہو تھی۔

"اچھا اگر نہیں توڑی جا سکتی تو نہ توڑیں میں بھی قسم کھا سکتی ہوں کہ کسی رسم میں شریک ہوں گی نہ اس گھر میں جا کر کبھی تھوکوں گی۔" تانیہ بولی۔

"ارے نہیں بات توڑنے کا تو نہ کہو۔ عین وقت کے وقت باراتیں تک اُٹھ جاتی ہیں ذرا سی مرضی کے خلاف بات پر۔" تانیہ کی والدہ نسرین نے کہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تانیہ کی پشتی لے رہی تھیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ایسی باتوں سے آپا۔" مارے کوفت کے نوین نے بڑے بےتکے پن سے پوچھا۔

"مطلب کیا ہوگا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں یہ ان لوگوں کے ہاتھوں ہماری بچیوں کی بےعزتی ہے میں تو ابھی سردار صاحب کو بلا کر اس بات کا تصفیہ کراتی ہوں۔ ہم لوگ کوئی گرے پڑے تو نہیں ہیں لڑکے والے ہیں لڑکے والے۔ ہمارا پلّہ تو بھاری رہنا چاہیے۔" اور ابھی ان کی بات پر نوین کھول کر کچھ کہنا چاہ رہی تھیں کہ ملازم نے آکر نگار کے آنے کی اطلاع دی تو ان کے اچانک آجانے کی نوعیت جاننے میں کسی کو دیر نہ لگی۔ نسرین نے نوین کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھا اپنی غلطی تھی نا اس لیے صفائی پیش کرنے کے لیے انہیں ہی بھیجا گیا ہوگا۔"

پھر انہوں نے بڑے نخوت بھرے انداز میں ملازم سے کہا۔

"جاؤ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو انہیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھاؤ ہم بھی ابھی آتے ہیں۔"

"پر بیگم صاحب! میں نے بھی یہی بولا تھا کہ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں پر وہ بولے کہ ہمارے پاس ٹیم نہیں ہے ہمیں ادھر ہی لے چلو۔ اور وہ ادھر ہی آرہی ہیں۔" ملازم نے کہا تو جیسے کمرے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ دو تین عزیزائیں صدف سمیت اُٹھ کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ تانیہ اور راتیہ بھی اپنی دونوں کزنز سمیت کمرے سے بھاگ گئیں۔ نورین اور شاداب جلدی جلدی کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں اور نوین نسرین بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور نوین سب کا فضیحتہ کرتی ہوئی بولی۔

"اُف توبہ پھوہڑپن کی بھی انتہا ہے۔ ایک سے ایک قیمتی فرنیچر اور ڈیکوریشنز مگر معلوم ہو رہا ہے جیسے گدے لوٹتے ہوئے ہوں یہاں۔ کسی سے اتنا بھی نہیں ہوتا یہاں کہ ہاتھ پیروں کو تکلیف دے کر تھوڑی سی صفائی ہی کر دیا کرے۔"

"ارے بھئی شادی کا گھر ہے اس پر ماشاء اللہ اتنی مہمانداری بھلا کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ صفائی ستھرائی کی طرف توجہ دے۔" مہ جبین بولیں۔

"لیکن صفائی تو روز ہی ہوتی ہے البتہ شام تک یہ حشر ہو جاتا ہے۔ سوائے میرے اور تو کسی کو توفیق ہی نہیں ہوتی اس طرف توجہ دینے کی۔" شاداب تیکھے لہجے میں بولی۔

"معلوم بھی ہے پوری سیٹھانی ہیں وہ۔" ان کا گھر کیا پورا محل ہے محل ہے اور ٹوائیلٹس اور کچن سے لے کر ایک ایک کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور صفائی ستھرائی ایسی کہ آنکھ میں میل آجائے تو آجائے مگر گھر میں نظر نہیں آ سکتا۔" نوین نے بتایا۔

"بھئی غلطی تو ساری ان کی ہی ہے جو وہ سیدھی ادھر آرہی ہیں ورنہ کسی کے پرائیویٹ روم میں گھس آنا بھی بھلا کوئی اخلاق ہے۔" زریں جلد جلد کشنز وغیرہ قرینے سے رکھتی ہوئی بولی۔

"بھئی ویری سوری۔ اصل میں اس وقت میں بہت عجلت میں ہوں اس لیے مجھے اس بداخلاقی کا مرتکب ہونا ہی پڑ رہا ہے۔" نگار نے جو اس اثنا میں اندر آگئی تھیں زریں کی بات سن کر کہا تو اس سمیت سب ہی شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

"ارے نہیں مسز فرزند علی آپ کے لیے تو اس گھر کا ہر دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اصل میں یہ لوگ اپنے پھوہڑپن پر شرمندہ ہو کر کہہ رہے ہیں۔ ذرا کمرے کی حالت بھی تو دیکھیں ایک دم کباڑخانہ ہی لگ رہا ہے۔" نسرین نے یہ کہہ کر گویا اپنی جھینپ مٹائی۔

"لیجیے، آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں نسرین جیسے میں کسی ڈیزرٹ یا جنگل میں رہتی ہوں۔ بھئی کیا مجھے معلوم نہیں کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر خصوصاً مہمانداری میں ہر چیز ہی اپ سیٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔" نگار ہنس کر بولیں۔

"خیر آیئے آپ بیٹھیے تو نگار، کہیے آج ہماری یاد کیسے آگئی؟" نوین نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دیوان پر بٹھاتے ہوئے پوچھا تو نگار دیوان پر ٹکنے کے سے انداز میں بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"یاد تو خیر تم ہمیشہ ہی رہتی ہو لیکن اس وقت تو تم نے خود ہی مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔" اور چونکہ نوین ان کے آنے کی غرض و غایت جان گئی تھی اسی لیے اس نے ہنس کر صرف "اچھا" ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

"چلیں کسی نہ کسی بہانے ہی سہی آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت تو گوارا کی۔" نسرین نے کہا تو مسکرا کر ہی تھا لیکن لہجہ چبھتا سا تھا۔

"نہیں تیر نوین جب بھی یہاں ہوتی ہیں میں ان سے ملنے تو آتی رہتی ہوں۔" نگار نے ان کے لہجے میں چھپے طنز کو نظرانداز کر کے کہا۔

"اچھا تو انہیں سے تمام تر تعلق ہے آپ کا ہم سے کچھ بھی نہیں۔" مہ جبین نے گلہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ایسے کیوں نہیں، مگر نوین کے توسط سے ہی ہے اور میں ان کی طرح آپ کو بھی اپنی بڑی بہن سمجھتی ہوں۔" نگار نے نوین کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی اور مہ جبین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"زریں جاؤ آنٹی کے لیے کولڈ ڈرنکس وغیرہ تو لے آؤ۔ یا پھر آپ کافی لیں گی۔" نسرین کو ان کی خاطر تواضع کا خیال آیا تو انہوں نے زریں سے کہنے کے ساتھ ساتھ ان سے بھی پوچھ لیا۔

"نہیں شکریہ! کسی تکلف کی ضرورت نہیں کھانے کے بعد میں کچھ بھی نہیں پیتی۔" نگار نے معذرت کی تو زریں اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ نگار چاہ رہی تھیں کہ بات کی ابتدا ان لوگوں کی طرف سے ہو مگر وہ سب کی سب جیسے ایکا کر کے بیٹھ گئی تھیں کہ کچھ کہیں گی نہیں۔ آخر نگار کو خود ہی کہنا پڑا۔

"یوں بھی اس وقت میں کسی خوش وقتی میں نہیں آئی ہوں ڈیئر فرینڈز۔ فزی اپنے بزنس ٹرپ پر جاپان جا رہے تھے سارا دن ان کی تیاری میں مصروف رہی اور اب انہیں سی آف کر کے ایئرپورٹ سے واپس لوٹ ہی رہی تھی کہ خیال آیا ذرا بیگم شعیب

سے بھی ملتی چلوں لے جا رہی تھی۔ مایوں کی رسم میں کتنے اصرار سے بلایا تھا۔ مگر فرزی کی وجہ سے جا ہی نہیں سکی تھی۔" نگار کی بات پر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر بولا کوئی نہیں۔

"افسوس تو اس بات پر ہے کہ ہم لوگ خواہ کتنے ہی ایجوکیٹڈ اور ایڈوانس کیوں نہ ہوں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو اپنی پرسٹیج (وقار) کا مسئلہ بنا کر خود اپنے لیے ہی ڈیفیکلٹیز (مشکلات) پیدا کر لیتے ہیں، وہاں پہنچی تو یوں محسوس ہوا جیسے سارے گھر پر ہی صفِ ماتم بچھی ہو۔ کیونکہ سارا ماحول ہی ڈسٹربڈ (منتشر) سا لگ رہا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ تمہاری بھانجیاں وہاں کوئی سین کری ایٹ (فتنہ جگا کر) کر کے آئی ہیں۔" نگار نے جس طرح اصل مسئلہ اٹھایا، سب ہی اپنی اپنی جگہ بل بھر کر رہ گئے۔

"واہ آنٹی! آپ بھی ان ہی کی سائیڈ لے رہی ہیں، بٹ دیٹ از ناٹ فیئر (لیکن یہ انصاف نہیں ہے)" شاداب چمک کر بولی۔

"ہاں واقعی۔ ون سائڈ اسٹوری سن کر یقین کر لینا کوئی انصاف تو نہیں ہے جبکہ آپ کی اور نوین آنٹی کی اتنی پرانی فرینڈ شپ بھی ہے۔" نورین نے بھی شاداب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو نورین یہ آنٹی ان کی سکھائی ہوئی آئی ہیں۔ ان سے کچھ کہنا بیکار ہی ہوگا۔"

شاداب جلے کٹے سے انداز میں بولی۔

"دیکھو بچیوں، میں تمہارے بڑوں سے بات کرنے آئی ہوں۔ تم سب مجھے چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش نہ کرو۔ بیٹر کیپ کوائٹ (بہتر ہے کہ خاموش رہو)" نگار نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا تو مہ جبیں بولیں۔

"ہاں مسز فرزند علی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ تم خاموش بیٹھ کر سنو۔ زیادہ چپڑ چپڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ایک تو زریں اور شاداب سے نسرین کا سسرالی رشتہ ہوتا تھا۔ دوسرے نسرین خود بھی بھری بیٹھی تھیں۔ بڑی بہن کا نندا اور شوہر کی بھتیجی کو ڈانٹنا انہیں سخت ناگوار گزرا۔ انہوں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"باجی! آپ بلا سوچے سمجھے ہی سب کو ڈانٹنے لگتی ہیں۔ ورنہ ان دونوں کی ایسی غلطی بھی نہیں ہے۔ نگار بہن واقعی صرف ایک طرف کی سن کر کہہ رہی ہیں۔ اور ہمیں ہی قصوروار گردان رہی ہیں جب کہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہماری بھی کچھ سنتیں، ہم سے بھی کچھ پوچھتیں اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتیں تو کچھ بات بھی ہوتی۔"

"مگر کسی نتیجے پر پہنچنا یا نہ پہنچنا تو آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ کیونکہ میری حیثیت تو اس وقت ایک ثالث کی سی ہے۔ جو کچھ انہوں نے کہا میں نے خاموشی سے سن لیا اور جو آپ کہیں گی وہ بھی اسی طرح سن لوں گی لیکن سننے سے پہلے یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گی کہ آپ کے ارادے کیا ہیں۔ یعنی آپ اس بات کو سیریس لیں گی یا پھر سمدھیانے والوں کی ایک گرداٹ سمجھ کر نظر انداز کر دیں گی۔" نگار نے ایک بار پھر نسرین کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ آپ کے کان کچھ زیادہ ہی بھر دیے ہیں ان لوگوں نے۔ خیر تو بی دیری فرینک میں یہی کہوں گی کہ ہم بہت غلط لوگوں میں پھنس گئے۔ بھلا یہ اندھیر بھی کہیں دیکھا ہے کہ لڑکے کی بہنوں کی اس قدر توہین کی جائے کہ ان کا بیٹھنا دوبھر ہو جائے — جب کہ وہ بھی لڑکی والے ہو کر۔ لڑکی والے تو الٹی جوتیاں ہی سیدھی کرتے نظر آتے ہیں۔ لڑکے والوں کی۔" نسرین بڑے برہم انداز میں بولیں۔

"ہاں یہی ایک کمزوری ہی ہوتی ہے لڑکی والوں کی۔ آخر بیٹی بھی تو دیتے ہیں نا مگر صاف گوئی معاف نسرین! یہ بڑی فرسودہ سوچ ہے آپ کی۔ بہرحال، ایسی کیا نامعقول باتیں کی تھیں انہوں نے جو آپ کی بچیوں کی توہین کا سبب بنیں۔"

نگار بھی کچھ کم کائیاں نہیں تھیں۔ انہوں نے آنے میں توضیح دینے کے بعد ہی یہ سوال اٹھایا تھا۔ نسرین خود بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ جلد از جلد سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیں لیکن نوین نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپا! ایسا کیوں نہ کریں کہ ان چاروں کو یہیں بلوا لیں۔ وہ خود انہیں سب کچھ بتا دیں گی۔ کیونکہ بھگت کر بھی وہی آئی ہیں۔ ہم تو وہاں موجود نہیں تھے نا۔"

"چلو خیر ان کو بھی بلوا کر دیکھ لو مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میرا مطلب ہے مسز فرزند علی ان کی باتوں پر یقین کر لیں تبھی نا۔" نسرین نے پھر نگار پر طنز کیا۔

"بھئی میں کوئی ان لوگوں کی سگی تو نہیں، ایجنٹ بن کر تو نہیں آئی نہ ان کا دیا ہی کھاتی ہوں۔ ہاں، البتہ میرا قصور یہ ہے کہ میں نے آپ دونوں کے بیچ میں پڑ کر یہ رشتہ طے کرایا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ فضول باتوں سے گریز کریں اور اگر مناسب سمجھیں تو لڑکیوں کو بلوا لیں۔"

نگار نے بھی کوئی رواداری برتنی ضروری نہیں سمجھی اور روکھے سے انداز میں کہہ دیا۔ نسرین سے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن سکا تو انہوں نے شاداب سے کہا کہ وہ چاروں لڑکیوں کو بلا لائے اور وہ فوراً ہی اٹھ کر ان چاروں کو بلا لائی۔

"ہاں بھئی تم چاروں میں جس کا نام ثانیہ ہے وہ ذرا یہ بتلائے کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی جو تم بچیوں کی توہین کا سبب بنی اور سبب ہی نہیں بلکہ اس حد تک بگڑ گئی کہ اب تمہاری ممی کو بین وقت کے وقت غلط لوگوں میں پھنس جانے کا ملال ہو رہا ہے۔"

ان سوال کرنے کا انداز بھی ایسا کاٹ دار تھا کہ ثانیہ سے جواب نہ بن سکا تو اس نے بگڑ کر کہا۔

"ملال بھی ہو رہا ہے آنٹی تو کچھ غلط تو نہیں ہو رہا۔ وہ لوگ ہیں ہی ایسے لوئر ڈاؤن (نچلے طبقے کے) ردرین۔"

"واہ۔ ماشاء اللہ بڑی حاضر جواب ہے تمہاری بھانجی تو نوین مگر پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں پھر کسی کو برا بھلا کہتے ہیں بچی۔ اور یہ میری بات کا جواب تو نہ تھا جو تم نے دیا ہے۔" نگار نے نوین سے کہہ کر اسے مخاطب کیا تو ثانیہ ماں سے مخاطب ہو کر بڑی بدتمیزی سے بولی۔

"بس جو ہو گیا سو ہو گیا ممی۔ اب میں کسی کے سامنے دکھڑے نہیں روؤں گی۔ پہلے ہی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ آپ کو صفائی پیش کرنی ہے تو خود ہی کر دیں۔" مگر ماں نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ نظریں جھکا لیں۔ نوین کی فطرت اور مزاج بہن سے بہت مختلف تھے۔ اس سے پہلے نگار کچھ بولتیں۔ انہوں نے ثانیہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی ہیو یور سیلف (تمیز سے رہو) ثانیہ! یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کوئی معمولی بات نہیں اور پھر کیا تم نے جھوٹ بولا تھا جو بتلاتے ہوئے کترا رہی ہو۔"

"ہاں یہی سمجھ لیں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور نوین اس کی گستاخی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

"چلیں یہ نہیں بتاتیں تو میں بتائے دیتی ہوں۔" دانیہ نے کچھ ایسے تمسخرانہ سے انداز میں ہنس کر کہا۔ جیسے اس فتنہ فساد پر بہت خوش ہو۔ نگار نوٹ تو سب کر رہی تھیں مگر بولیں کچھ نہیں۔ پھر دانیہ نے شروع سے لے کر آخر تک بلکہ اپنی طرف سے جھوٹ بیچ جوڑ کر انہیں ساری بات بتا دی۔ نگار نہایت غور اور خاموشی سے سب سنتی رہیں پھر کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"ہوں۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے اس گانے سے جو نازو کی کزنز نے گایا تھا۔ تمہاری فیلنگس ہرٹ (احساسات مجروح) ہوئی ہیں ورنہ اُبٹنا کھیلنے میں تو تقریباً سب جگہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جو دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اسے ہی سب سے زیادہ نشانہ بنایا جاتا ہے اور آپس میں ہم عمر لڑکیاں بالیاں ہی کھیلتی ہیں اُبٹنا جس میں بھائی اور کزنز بھی شریک ہوتے ہیں اور کیا تمہیں کبھی ایسی کسی رسم میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"نہیں ہوا کیوں نہیں۔ دسیوں بار ہوا ہے مگر ہمارے منع کرنے پر انہوں نے ہمیں پکڑ کر یہ بھی کہا تھا کہ اگر کپڑے خراب ہو جانے کا ہی خیال تھا تو پھر مایوں کی رسم میں شرکت کرنے کیوں آ گئیں آپ۔ بھلا کہیں ایسے بھی کہتے ہیں لڑکے والوں کو آنٹی!" دانیہ بولی۔

"ہاں کہتے ہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اُبٹنا کھیلنے کی رسم ہی ہنسی مذاق پر محمول ہوتی ہے اور میرے خیال میں تو یہ اتنی معمولی سی بات اس قدر قابلِ گرفت تو نہیں تھی کہ تم نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اس قدر نازک احساسات رکھتی ہو تو تمہیں مایوں کی رسم میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ رسم تو اُبٹنا کھیلنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔" نگار نے سمجھانے کا انداز ضرور اپنایا تھا مگر وہ اپنی صاف گو فطرت سے نام لے کر ساتھ کے ساتھ ان کی اچھی طرح کھنچائی بھی کرتی جا رہی تھیں۔

"ہاں اور کیا میں نے خود بھی ان لوگوں کو کتنا منع کیا تھا کہ مایوں کی رسم میں جانا ٹھیک نہیں ہے مگر یہ سنتی ہی کس کی ہیں۔" نورین بھی نگار کی باتوں پر قائل سی ہو کر بولیں۔

"لیکن آنٹی اگر ہم چلے بھی گئے تھے تو انہیں اسی طرح بی ہیو تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کی شاید کوئی رشتے دار ہی تھیں جنہوں نے ہمارے سر پر ہی ہمیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ دولہا کی بہنوں کا بھلا مایوں کی رسم میں کیا کام۔ یہ تو ہماری ایک بچی سی رسم ہے۔ انہیں زینت بیگم نے آنے ہی کیوں دیا اور اگر آ بھی گئی تھیں تو رسم سے پہلے ہی چلتا کر دیا ہوتا۔" دانیہ سے کوئی جواب نہ بن سکا تو نزہت نے ایک اور شکایت پیش کی۔

"جی ہاں اور مزے کی بات یہ کہ زینت آنٹی نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے الٹا ہم سے کہا کہ ہم ان کی باتوں کا برا نہ مانیں۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر بعض لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" نکہت نے گویا لقمہ دیا۔

"ہاں تو کہنے والے کی زبان تو نہیں پکڑی جا سکتی نا۔ البتہ ٹوکا ضرور جا سکتا ہے۔ وہ بھی اگر خود اپنے کانوں سے سن لیا جائے۔" نگار نے اس بات کو بھی عزائم ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، تبھی تو اپنے کانوں سے سن کر انہیں ٹوکنے کے بجائے زینت آنٹی نے الٹا ہمیں ٹوک دیا تھا۔" دانیہ نے ان کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس کر کہا تو دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔ نگار کو غصہ تو بہت آیا مگر انہوں نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "خیر یہ ٹوکنا تو نہیں سمجھانا ہوا۔"

"ہم یہ سب نہیں جانتے۔ آنٹی ان کے دلوں میں ہماری طرف سے کھوٹ تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمارے اتنے پیارے بھیا کو بھی نہیں بخشا اور نہ صرف ان کی صورت کا مذاق اڑایا بلکہ میوہ فروش اور دوا فروش تک کہہ دیا۔ یہ ساری ان کی چالیں تھیں، ہمیں ذلیل کرنے کی۔" ثانیہ جو اتنی دیر سے منہ پھلائے اور بگڑے ہوئے تیور لیے بیٹھی تھی۔ اس نے نگار کی مصالحانہ گفتگو پر جل کر کہا۔

"لیکن میوہ فروش اور دوا فروش کہنے سے کوئی میوہ اور دوا فروش بن تو نہیں جاتا اور پھر تمہیں اس بات کو اپنا ویک پوائنٹ تو نہیں بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہو گئی کہ جو نہیں جلتے وہ بھی تمہارے اس طرح بھڑک اٹھنے سے جان جائیں۔ اب میرے شوہر کو ہی دیکھ لو جن کے پاس آج اتنی دولت ہے کہ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں کو خرید کر پھینک دیں۔ انہوں نے بھی اپنا کاروبار نیلام میں بولی دے کر اسکریپ کا ایک چھوٹا سا لوٹ (LOT) خرید کر کیا تھا۔ تجارت میں اتار اور چڑھاؤ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اصل میں تو ساری بات قسمت اور مہارت پر منحصر ہے۔ کوئی ایکدم ہی ترقی کر کے بادشاہ بن جاتا ہے اور کوئی محنت کر کے آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ تمہارے دادا میوے کی تجارت کرتے تھے۔ ان کا وہ بزنس ٹھپ ہونے لگا تو انہوں نے کریانے کی دکان کھول لی۔ اور جب اس میں بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو تمہارے والد نے اسے ڈرگ اسٹور میں تبدیل کر لیا۔ جس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ قسمت نے یاوری کی۔ کاروبار بڑھایا اور آج اعلیٰ پیمانے پر بزنس کر رہے ہیں۔ پھر بھلا اگر انہوں نے مذاق میں تمہارے بھائی کو دوا فروش بھی کہہ دیا تو اس میں اس قدر مائنڈ کرنے کی کیا بات تھی کہ آپس میں دل برے ہو گئے۔" نگار نے ایک تسلسل بات تو سمجھانے کی غرض سے کہی تھی مگر دوشالے میں لپیٹ کر کہی تھی یا پھر ساتھ کے ساتھ ان لوگوں کی اصلیت ان پر جتا دی تھی۔ ثانیہ تنک کر بولی۔

"ہونہہ۔ بڑا مذاق میں کہہ دیا۔ آپ سے کریں وہ ایسا مذاق اور آپ برا نہ مانیں تب میں دیکھوں۔" ثانیہ کا لہجہ بہت گستاخانہ تھا۔ نگار کو پہ سچ مچ تاؤ آگیا۔ انہوں نے نوین کو مخاطب کر کے کہا۔

"نوین! یہ تمہاری بھانجی تو بڑی گستاخ اور منہ زور ہے۔ کیا تم لوگوں نے اسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟"

"نہیں، تمیز تو ایسی سکھائی ہے کہ یہ دوسروں کو بھی سکھا دے۔ لیکن چونکہ یہ غلط بات برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے۔ اس لیے ایک دم ہی ریش (بھڑک) اٹھنا ہو جاتی ہے۔" نوین کے بجائے نسرین بیٹی کی حمایت میں بولیں جو نگار کی باتوں پر پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"مگر یہ تو بڑی تباہ کن عادت ہے۔ نسرین یہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دم ہی ریش ہو جانا۔ اور مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ آپ اسے باز رکھنے کے بجائے الٹی شہ دے رہی ہیں۔ گویا دوسرے معنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کے حق میں کانٹے بونا ہوا یہ تو۔ یہ بیٹی ذات ہے اور اسے پرائے گھر بھی جانا ہے۔ اگر اس کی بدزبانی اور خود دماغی کا یہی عالم رہا تو اس کا نباہ کسی سے بھی نہیں ہو سکے گا۔ اور ابھی تک تو میں یہی سمجھتی رہی تھی کہ ان لڑکیوں نے ضرور کوئی بیہودگی کی ہوگی جو بگاڑ کی نوبت آگئی۔ مگر آپ کی بیٹی کی چرب زبانی سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس نے دانستہ آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان تلخیاں گھولنے کی کوشش کی ہے۔" نگار نے بھی انہیں اچھی طرح لتاڑ دیا۔

"خیر، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میری بیٹی جیسی بھی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے واقعی بڑی کمینگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایسے پنچ لوگوں سے کوئی رشتہ جوڑنا مجھے بالکل گوارا نہیں۔" نسرین اپنی چہیتی بیٹی کے بارے میں نگار کی لتاڑ سن کر طیش میں آگئیں اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بولیں۔

"ہائیں۔ آخر کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" نگار بھی غضبناک ہو کر بولیں۔

"مطلب یہی ہے کہ آنکھوں دیکھی مکھی کم از کم ہم تو نہیں کھا سکتے۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ ان کی اوقات ہم پر پہلے سے ہی کھل گئی۔ اور اب ہم اپنے بیٹے کی شادی وہاں نہیں کریں گے۔" نسرین اپنے لڑکے کی ماں ہونے کے زعم میں بڑی

نخوت سے بولیں۔

"تو نبھا۔ کم از کم بات تو صاف ہو گئی۔" نگار نے جذب میں آکر اٹھتے ہوئے کہا۔ اور نوین سے بولیں۔

"تم اپنے بہنوئی میاں اور لڑکے کو بلاؤ۔ میں ابھی اور اسی وقت ان سے دو ٹوک گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

اور نسرین جو لڑکے کی ماں ہونے کے زعم میں یہ سمجھ رہی تھیں کہ چونکہ وہ لڑکے کی ماں ہیں اس لیے نگار ان کی باتوں سے مرعوب ہو جائیں گی۔ نگار کے تیور دیکھ کر اور سب سے بڑھ کر اپنے شوہر، بہنوئی اور بیٹے کو ان کے بلوانے کے خیال سے ہی ان کے چھکے چھوٹ گئے کہ ان کے مردوں کو تو ابھی تک کسی بات کا علم ہی نہیں ہوا تھا اور نگار انہیں بلوا کر ان سے اچانک یہ کہتیں کہ تمہاری بیوی، سالی اور ماں نے یہ رشتہ توڑ دیا ہے تو بہنوئی تو خیر رشتے کی مناسبت سے حیران ہی رہ جاتے مگر میاں اور بیٹا اس بات کو کبھی برداشت نہیں کرتے اور یوں بھی ان کے میاں مزاج کے بڑے تیز تھے اور غصے میں موقع محل کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ نوین بھی اس خیال سے سخت ہراساں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نگار سے کہے تو کیا کہے۔ اور مہ جبین جنہیں بہن کی حماقت پر سخت غصہ آرہا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں انہیں برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ آخر نگار سے بولیں۔

نہیں۔ نہیں نگار بہن۔ یہ نسرین تو محض غصے میں کہہ گئیں۔ آپ ہی سوچیے بیٹیاں اپنے بھائی کی سسرال سے روتی پیٹتی آئیں تو کون سی ماں ایسی ہو گی جسے غصہ نہیں آئے گا۔ آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجیے۔ بھلا ایسی معمولی معمولی باتوں پر بھی خدا نہ کرے کہیں رشتہ توڑا جا سکتا ہے۔ وہ بھی عین شادی کے وقت۔"

"نہیں مہ جبین آپا! پرائی بیٹی کا معاملہ ہے دلوں میں پہلے ہی کھنڈت پڑ گئی ہے۔ کل کلاں کو اسے آپ لوگوں سے کوئی تکلیف پہنچی تو وہ مجھے ہی کوسے گی۔ اور پھر میرے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کسی مظلوم کی آہ نہیں لینا چاہتی۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی مردوں کے سامنے معاملہ صاف ہو جائے۔" نگار اپنے اسی تہیے میں بولیں۔

"دیکھا آپا! اور سر چڑھاؤ اس ثانیہ کی بچی کو۔ یہ تو ابھی نہ معلوم کس کس کا گھر تباہ کرے گی اپنی ان حرکتوں سے۔ لو بھلا ابھی بھائی کا گھر بسا بھی نہیں کہ اس نے اجڑوا کر رکھ دیا۔" نوین نے نگار کی بات سن کر چپکے سے بہن کا فضیحتہ کیا۔ تو نسرین گھبرا کر بولیں۔

نہیں، نہیں۔ خدا نہ کرے جو میرے بیٹے کا گھر اجڑے۔ تم بھی کیسی منحوس زبان بول رہی ہو۔"

"ہاں۔ میں تو منحوس زبان بول رہی ہوں اور تم جو چپکی کھڑی سب کچھ ختم کر دینے پہ تلی ہوئی ہو تو یہ کچھ بات ہی نہیں۔ اب کہو نا ان سے کچھ ورنہ بھائی جان اور احمد اندر آگئے تو ایک حشر مچا کر رکھ دیں گے۔" نوین نے بہن کو جھٹکاتے ہوئے کہا۔ تو نسرین کی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو گھبرا کر رونے لگیں۔

"اب رو کر کیا اپنا کچھ زیادہ ہی تماشا بنواؤ گی ان کے سامنے۔" مہ جبین نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔ دونوں بہنوں کے درمیان وہ واقعی سینڈوچ بن گئی تھیں۔ جبکہ نگار سالم ہڑپ کرنے کو تیار کھڑی تھیں۔ آخر جلدی سے آنسو پونچھ کر انہوں نے نگار سے کہا۔

"آئی ایم ویری ساری مسز فرزند علی! میں نے تو بس غصے میں کہہ دیا تھا کہ چاروں طرف سے کور ہو گئی تھی۔ ورنہ شریفوں میں بھی خدا نہ کرے رشتے ٹوٹا کرتے ہیں۔"

"نہیں نہیں، نسرین! آپ اپنی بات پر شرمندہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔ یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں بڑا ہی سیریس معاملہ ہے۔ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے کوئی آپ کو مجبور بھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ نازو کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ آپ کے یہاں بات طے ہو گئی تھی۔ ورنہ میں تو نزہی کے بھتیجے کے لیے اسے لینا چاہ رہی تھی۔ خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مگر اس وقت تو آپ مردوں کو بلوائیے۔"

نگار کسی طرح قابو میں ہی نہیں آرہی تھیں۔ نسرین نے ان کی بات ہیٹی ہی نہیں کی تھی بلکہ بیٹی کو بھی ان کے منہ لگوایا تھا اور وہ ان لوگوں کی ساری اکڑ مکڑ نکال دینا چاہتی تھیں۔ ورنہ دل میں تو بہت خوش ہو رہی تھیں کہ شکر ہے رشتہ ٹوٹا نہیں۔ ورنہ عین وقت کے وقت انکار نازو جیسی متمول گھرانے کی لڑکی کا مستقبل اگر تاریک نہیں کرتا تو بہت سی الجھنوں اور مشکلات ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ کہ لڑکی خواہ امیر گھرانے کی ہو یا غریب گھرانے کی، اس معاملے میں سیل کیا ہوا مال ہی بن کر رہ جاتی ہے کہ جسے قسمت کی ہی کوئی کل توڑ سکتی ہے۔ نگار کا جواب سن کر نسرین کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مزید کیا کہیں تو انہوں نے نوین سے کہا۔

"تم ہی انہیں سمجھاؤ نوین! آخر یہ تمہاری اتنی پرانی دوست ہیں۔"

"میں کیا سمجھاؤں انہیں۔ تم نے تو اپنے بیٹے کے گھمنڈ میں آکر کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس لانگ رار کی چھوکری کو بھی ان کے سر چڑھا دیا۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ وہ کیا شے ہیں۔ اور میری دوستی کے بل بوتے پر ہی تو وہ صلح صفائی کرانے آئی تھیں۔ تم نے تو میری دوستی کو بھی ختم کرا دیا۔" نوین جیسے انہیں کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ تب مہ جبین نے نگار کا ہاتھ پکڑ کر عاجزانہ سے لہجے

میں کہا۔

"احمد بہت خود مختار ہے وہ ماں کی باتوں کو گوارا تا بھی نہیں اور پھر نازو اس کی پسند ہے۔ نسرین اور تانیہ نے جو بدتمیزی کی ہے، اس کی میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ نسرین کو ایک موقع اور دے دیں۔ آئندہ کبھی کسی کو بھی اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔" اور تب نگار نے قدرے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے مہ جبین آپا آپ مجھے کیوں شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ آپ سے تو مجھے کوئی شکوہ ہی نہیں۔ نہ نسرین سے ہی کوئی شکایت تھی کیونکہ میں تو بیچ والی ہوں۔ نسرین نے رشتہ توڑنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ابھی کے ابھی فیصلہ ہو جائے، تاکہ ان لوگوں کو بھی انتظار کی سولی پر لٹکنا نہ پڑے اور بس۔" نگار سے بھلا کوئی جیت سکتا تھا۔ مہ جبیں قائل سی ہو کر بولیں۔

"ہاں۔ یہ تو آپ سولہ آنے درست ہی کہہ رہی ہیں۔ لیکن نسرین نے آپ سے معذرت تو کر لی ہے۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ نسرین میری بہن تو ہے لیکن مجھ سے اور نوین سے بہت مختلف فطرت پائی ہے۔ یہ عقل سے کم کام لیتی ہے اور لوگوں کے مشوروں سے زیادہ۔ اس کی نندا ور سہیلیوں نے اسے بھڑ کایا تو بلا سوچے سمجھے اتنی بڑی بات کہہ گئی مگر اب پچھتا رہی ہے، بے چاری۔"

"خیر چلیں چھوڑیں۔ لیکن ان سے یہ ضرور کہہ دیجیے گا کہ آئندہ عقل سے ہی کام لیں۔ کیونکہ پرائی بیٹی کو بیاہ کر لانا بڑی ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔"

نگار نے یہ بات کہہ کر گویا بات رفت گزشت کی۔ نسرین بھی خاموش اور نادم کھڑی یہ سب سن رہی تھیں اور وہ فطرتاً اتنی بری بھی نہیں تھیں۔ اصل میں میاں کی بدمزاجی کی وجہ سے ان کی قوت فیصلہ کمزور ہو گئی تھی۔ اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ایک پچھتاوا بن کر لوٹ رہا تھا۔ اس لیے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے انہوں نے نگار سے کہا۔

"اب اس سلسلے میں کچھ کہوں گی تو آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ ورنہ نازو تو مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔ وہ تو شیطان نے نہ معلوم کان میں کیسی شر پھونکی تھی جو میں ان جبیوں کی باتوں میں آ گئی۔"

"خیر، شیطان نے تو کیا اس تانیہ نے پھونکی ہوگی۔" نوین جل کر بولیں۔

"یہ تانیہ تو ہے ہی سدا کی شری۔ باپ کی خصلت آئی ہے ساری اس میں۔" مہ جبین شاداب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بولیں تو ہر طرف سے پھٹکار کے ڈونگرے برستے دیکھ کر تانیہ نے رونا شروع کر دیا۔

"چلو زیادہ ٹسوے نہ بہاؤ۔ یہ سارا فتنہ تمہارا ہی جگایا ہوا ہے۔ اٹھ کر آنٹی کو سوری کہو۔ بڑی زبان ہو گئی ہے تمہاری مجھے اب اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا۔ چلو اٹھو کسی طرح اور آنٹی کو سوری کہو۔" نسرین نے آخری فقرہ بہت غصے میں کہا۔ تو قدرے تامل کے بعد تانیہ اٹھ کر نگار کے قریب آ گئی اور چہرہ جھکا کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"آنٹی ویری سوری۔ ٹیریبلی سوری آنٹی!" تو نگار نے بھی محض مروتاً اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اٹس آل رائٹ تانیہ! چلو کوئی بات نہیں۔" اور نگار کا اتنا کہنا تھا کہ تانیہ ان سے لپٹ گئی۔

"نہیں آنٹی! سچ میں بہت روڈ (گستاخ) ہو گئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا جو میں نے آپ سے آپ سے" باقی فقرہ اس کی سسکیوں میں گھل مل گیا۔ "اف، تو گھر کے ماحول میں تضاد کے باعث اس گھر کے بچے بھی ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ورنہ تانیہ اپنی ذات سے اتنی بری نہیں ہے۔ امیر ہو یا غریب یا پھر بیچ کا طبقہ۔ یہ المیہ تو تقریباً ہر تیسرے گھر کا نصیب ہے۔" نگار نے تانیہ کی باتوں سے متاثر ہو کر دکھ سے سوچا۔ اور پھر ہنس کر بولیں۔

"بھئی سوری تو مجھے نہیں زینت کو کہو۔ کیونکہ تم ان کے اچھے خاصے ہنستے بستے گھر کو ڈسٹرب کر کے آئی ہو۔" نگار کا دل چاہا ساتھ کے ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ ان لوگوں نے تو اس پریشانی میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ مگر مصلحتاً بات روک گئیں۔

"نہیں بھلا یہ کس منہ سے ان سے کچھ کہے گی۔ میں خود ان سے معذرت کروں گی۔" نسرین بولیں۔

"نہیں۔ آپ کو معذرت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" نگار نے کہا۔ تو ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے نسرین نے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا میں اب اس قابل بھی نہیں کہ۔" تو نگار نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ انہیں کچھ علم ہی نہیں کہ یہاں کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے کیا پوچھا اور آپ نے کیا بتایا تو پھر معذرت وغیرہ کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" مہ جبیں بولیں تو نگار نے کچھ سوچ کر کہا۔

"آپ ایسا نہ کریں نسرین! کہ فون پر ان کا شکریہ ادا کر دیں۔ وہ اصل میں اس پریشانی میں مجھے تو خیال ہی نہ رہا۔ آپ کی بچیاں چونکہ بغیر کچھ کھائے پیے ہی آ گئی تھیں۔ اس لیے زینت نے میرے ساتھ ان کا کھانا۔ بھیجا تھا جو میں نے آتے ہی آپ کے ملازم سے کہہ کر کچن میں رکھوا دیا تھا۔ بس آپ اسی بات پر ان کا شکریہ ادا کر دیں۔"

"اوہ ونڈرفل۔ یہ تو آپ نے بڑی اچھی ترکیب بتائی۔" ان کے مشورے پر نوین نے خوش ہو کر کہا۔ قریب سامنے ہی کونے میں رکھے فون کی طرف لپکیں اور جلد جلد زینت کا نمبر ڈائل کر کے ریسیور کان سے لگا لیا۔ اور سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہیلو! کہیے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"اچھا اچھا خدا ٹھیک ہی رکھے۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس قدر تکلیف کیوں کی یہ کھانا بھیج کر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں بھی جو دال دلیا پکا تھا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ پھر یہ تکلف برتنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ اصل میں یہ چونکہ آج کل ماشاء اللہ ہمارا گھر بھی مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اس لیے تقریباً سارا دن ہی سخت مصروف گزرتا ہے۔ تانیہ کے سر میں بھی درد ہو گیا تھا۔ وہ تینوں بھی دن بھر کی تھکی ہوئی تھیں آتے ہی پڑ کر جو سوئیں تو اب میرے خیال میں تو صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گی۔"

"جی نہیں، مجھ سے تو انہوں نے بات ہی نہیں کی۔ اصل میں تانیہ کو اکثر درد سر کی شکایت رہتی ہے اور جب درد ہوتا ہے تو وہ کھاتی پیتی بھی نہیں۔ کمرے میں جا کر سو جاتی ہے۔" پھر نسرین نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر نگار سے پوچھا۔

"آپ کو پوچھ رہی ہیں۔"

"کہہ دیں کہ آئی تو تھیں مگر تھوڑی دیر پہلے ہی چلی گئی ہیں۔" نگار نے کہا۔ تو نسرین ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر بولیں۔

"وہ تو کب کی جا چکیں۔ بہت جلدی میں تھیں شاید۔ میں نے بہت روکا مگر رکی نہیں اور کھانا دے کر چلی گئیں۔ سچ۔ آپ نے تو شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"اچھا۔ اچھا بے حد شکریہ۔ بڑی نوازش۔ آپ نے ہمیں یاد تو رکھا۔"

"نہیں نہیں شرمندہ کرتی ہیں آپ۔ اچھا خدا حافظ۔"

"آج تو نسرین نے کچھ زیادہ ہی عقل سے کام لے ڈالا۔ ورنہ آپ نے تو پہلے ادھر ہی بتایا تھا۔" نگار نے ہنس کر مہ جبین سے کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ پھر نگار اجازت لے کر اٹھیں تو سب انہیں باہر تک چھوڑنے آئے۔ تو پیچھے کہیں سے انہیں مہ جبین کی آواز سنائی دی۔

"ارے میں کچن میں جا کر دیکھتی ہوں کہیں وہ کم بخت مارا چھانٹ چھانٹ کر بڑی بڑی بوٹیاں نہ نگل گیا ہو۔" تو انہوں نے گھر کا رخ کرتے کرتے دل میں سوچا۔ ایسی ذہنیت کا اظہار تقریباً ہر گھر میں ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ پیٹ میں جانے کے بعد سب کا کھایا پیا کھاد ہی بن جاتا ہے۔ اور پھر اپنی اس سوچ پر آپ ہی آپ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب آپ کل تو بالکل ہی مصروف نہیں ہوں گی۔ کیونکہ سیٹھ صاحب جاپان تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس لیے میں ابھی سے کہے دے رہی ہوں کہ کل آپ کے آئے بغیر ہم دلہن والوں کے یہاں مہندی لے کر نہیں جاؤں گی۔" نسرین نے ان کے کار میں بیٹھنے سے پہلے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"اوہو۔ یہ تو بلاوا نہیں گویا الٹی میٹم ہوا لیکن اس تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کے انویٹیشن کارڈز تو پہلے ہی مل چکے ہیں۔ میں خود ہی آ جاتی۔" نگار ان کے بلاوا دینے کے انداز پر ہنس کر بولیں۔

"تکلف نہیں اپنائیت رہی ہے نگار! اور صرف آپ کا ہی نہیں مہندی، بارات اور ولیمے کا بھی سب ہی کا بلاوا ہے۔ آپ کو کل شام کے سات بجے تک یہاں موجود ہونا چاہیے۔" نوین نے کہا۔ تو نگار ہنس کر بولیں۔

"اوہو۔ ہو۔ یہ تو نسرین سے بھی بڑی ہتھ چھٹ ہو گئیں۔ پھر تو آدھ گھنٹے قبل ہی مجھے یہاں حاضر ہونا پڑے گا۔ اچھا بھئی ضرور آؤں گی۔ تم لوگوں کے محبت بھرے انویٹیشن کا شکریہ۔ او۔کے خدا حافظ۔" پھر وہ دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولیں اور کار اسٹارٹ کر کے انہوں نے زینت کے گھر کا رخ کیا۔

"گل بہار" میں کہ یہ شعیب منصور کے بنگلے کا نام تھا۔

رات کے اولین پہر میں

اس سے چراغاں کا سا گمان ہو رہا تھا۔
کو گزشتہ تین روز سے پوری عمارت ہی دلہن کی طرح برقی قمقموں سے سجی جگمگ کر رہی تھی مگر آج اس جگمگاہٹ میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ کہ درخت اور پودے حتیٰ کہ باؤنڈری وال تک ننھے ننھے رنگ برنگے برقی قمقمے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔
کہ آج مہندی کی رسم تھی اور دولہا والے کچھ دیر قبل ہی مہندی لائے تھے۔
گو یہ رسم خالصتاً خواتین کی ہی ہوتی ہے مگر ادھر سے لڑکیوں کے ساتھ دولہا کے کچھ کزنز بھی آئے تھے اور ادھر سے بھی دلہن کے بھائی اور کزنز وغیرہ اس رسم میں موجود تھے اور اس لیے اس قدر شور شرابا ہو رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کیونکہ دونوں طرف سے ہی گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔
تانیہ وغیرہ پوری تیاری سے آئی تھیں۔ اور ایک سے ایک گانے والی لڑکیاں ساتھ لائی تھیں اور ادھر بھی گو لڑکیاں کم ہی تو تھیں مگر ان میں نازپرور، نیلوفر اور نیلما کی چند سہیلیوں کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔ یہ سارا اودھم ہال میں ہو رہا تھا۔
گویا مقابلہ سخت تھا اور کوئی بھی پارٹی ہار ماننے پر تیار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور اس تکرار میں گانا کم ہو رہا تھا اور ڈھولک، تالیوں اور چھوٹی حتیٰ کہ سیٹیوں کی آوازیں زیادہ نمایاں تھیں۔ اس پر قہقہے اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار۔ کم از کم اسفند کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔
وہ تو یوں بھی ماں کے اصرار پر مہندی کی رسم دیکھنے چلا آیا تھا۔ ورنہ اسے ایسی ہنگامہ خیز محفل میں شریک ہونے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ اور زینت بھی اسے کسی مقصد سے ہی لائی تھیں یعنی ایک تو تانیہ وغیرہ کے ساتھ رونائش بھی آئی تھی۔ دوسرے دولہا والوں کے ساتھ اور بھی نئی صورتوں کی لڑکیاں آئی تھیں جو رونائش سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت، طرح دار اور متمول تھیں۔ اور چونکہ زینت کی خواہش تھی کہ اسی کی نظرِ انتخاب کسی ایک پر تو پڑ جائے۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر وہ باقاعدہ طور پر بیٹے کو آہستہ آہستہ ان کے بارے میں بتاتی بھی رہی تھیں کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ مگر اسفند حسبِ عادت بس ایک ہی نظر ڈال کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا۔ اور وہ شروع شروع جب آپس کے مقابلے میں کچھ شائستگی اور باقاعدگی تھی۔ بڑے شوق اور دلچسپی سے سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا تھا۔ مگر جب اودھم سا مچنے لگا اور سب آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ کچھ لڑکوں نے اٹھ کر بھونڈے پن سے ناچنا بھی شروع کر دیا تو اسے وحشت سی ہونے لگی جب تک ماں قریب کھڑی رہیں وہ دل پر جبر کیے خاموش کھڑا رہا۔ مگر وہ جو نہی اس کے پاس سے ہٹیں وہ لڑکیوں اور عورتوں کے اژدہام میں سے اپنی جگہ بناتا ہال سے باہر نکل آیا۔ اور اس خیال سے کہ اسے چپکے سے کھسکتا دیکھ کر کہیں کوئی پھر اسے زبردستی اندر نہ لے جائے۔ وہ لاؤنج یا باہر کی طرف سے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کچن سے ملحق پینٹری میں آ گیا کہ ایک تو پیاس بھی لگ رہی تھی۔ دوسرے پینٹری سے بھی ایک راستہ باہر کی طرف جاتا تھا۔ جس کا دروازہ ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ مگر اسے کھولا تو جا سکتا تھا۔ لیکن پینٹری میں قدم رکھتے ہی جیسے اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم یکلخت کسی نے جکڑ سے لیے۔ اور وہ جہاں تک آیا تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔
کیونکہ سامنے ہی سلوٹ کھڑی تھی۔
سبز کاہی رنگ کے ہلکے ہلکے کام کے تنگ پاجامہ سوٹ میں ملبوس۔ کانوں میں سبز نگینوں کے جڑاؤ آویزے پہنے ہلکے پھلکے میک اپ میں وہ کچھ ایسی قیامت لگ رہی تھی کہ اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ وہ کچھ دیر تک پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ جو فرج کھولے کھولتے اس پر نظر پڑتے ہی گم سی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کچھ ایسی سٹپٹائی کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ فرج کو کس غرض سے کھول رہی تھی۔ پھر کچھ دیر تک اسی گم صم سی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتی وہ اندر جانے لگی تو اس نے بڑھ کر پوچھا۔
"وہ پھپھو کیوں نہیں آئیں؟" اور وہ جاتے جاتے رک تو گئی مگر بولی کچھ نہیں۔
"سب خیریت تو ہے نا؟" اور جواب پھر نداردی تھا۔
"تت ۔ تم ۔ آپ یہاں کیسے نظر آ رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو بھی سب کے ساتھ اندر ہونا چاہیے تھا۔ آج تو مہندی کی رسم ہے۔" اپنے دونوں سوالوں کا جواب نہ ملنے کے باوجود بھی اس نے پھر پوچھا۔ مگر وہ ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگائے بڑی بے نیازی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
"اے سنو۔ میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں یعنی کہ سردار محمد اسفند۔ سمجھیں آپ۔" وہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے

ہوئے بولا۔ انداز بھی برہم سا تھا۔ تب اس نے ایک تیکھی سی نظر اس پر ڈال کر بڑی متانت سے کہا۔
"اوہ بڑی نوازش ہے آپ کی کہ آپ مجھ سے مخاطب ہیں لیکن میں اس بات کی پابند تو نہیں کہ آپ کی بات کا جواب دینا ضروری سمجھوں۔"
"خیر، آپ ضروری سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ صرف ناسمجھی کی بنا پر میں نے آپ سے اتنا غلط رویہ اختیار کیا تھا جس پر مجھے بہت افسوس ہے۔" اس کے اس قدر کڑوے کسیلے جواب کے باوجود وہ معذرتی سے لہجے میں بولا۔
"لیکن مجھے تو کسی کے غلط یا صحیح رویے کی بالکل پروا نہیں۔ آئی کیئر فور ہورڈوز۔" اس نے نخوت سے کہا اور پھر اس کے قریب سے راستہ بنا کر پینٹری سے باہر نکل گئی اور اس کے جواب پر وہ اپنا سا منہ لیے پیچ و تاب کھاتا رہ گیا کہ اس کے جواب نہ دینے پر پہلے ہی تاؤ کھا رہا تھا۔ پھر بھی سگی اور اکلوتی پھوپھی کے تعلق خاطر سے وہ اخلاق برت گیا تھا۔ ویسے بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے اس قدر جارحانہ رویے پر اس سے اتنی بدظن ہو گئی ہے کہ جواب نہیں دے رہی۔ تبھی تو اس نے اپنی فطرت اور عادت کے برخلاف اس سے اتنی رعایت برتی تھی کہ معذرت بھی کر بیٹھا تھا۔ مگر اس کے نخوت بھرے جواب نے تو اس کے سارے بدن میں جیسے چنگاریاں سی بھر دیں۔
اس ستائیس اٹھائیس سالہ زندگی میں اس کا واسطہ بہت سی لڑکیوں سے تو پڑا تھا مگر شناسائی کی حد تک ہی۔ کیونکہ وطن کے تعلیمی دور اور کیمبرج میں رہائش کے دوران بہت سی لڑکیاں جو اس کی ہم جماعت تھیں ان سے وہ ہنس بول بھی لیتا تھا۔ اور ان کے ساتھ کبھی کبھی گھوم پھر بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اس نے کسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا جتنا کہ اس لڑکی کو سمجھا اور اب اس کے ٹکے سے جواب پر اسے غصہ اس پر نہیں بلکہ اپنے اوپر آ رہا تھا کہ اس نے کیوں اس لڑکی کو اتنا منہ لگایا۔ کہ اس کے جواب نہ دینے پر بھی سوال پہ سوال کرتا رہا۔ جب اس نے پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی تو اسے وہیں چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا۔ مگر ایک تو اپنے ناروا سلوک پر معذرت کرنا اور پھر اس کا راستہ بھی روکنا۔ یہ اس کی حماقت نہیں تھی تو اور کیا تھی۔ وہ پینٹری سے نکل کر اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی دیر تک بگڑا ہوا موڈ لیے یہی سب سوچتا رہا۔
گانوں کا مقابلہ ختم ہوا جو برابر ہی رہا تھا۔ تو مہندی کی رسم ادا کی جانے لگی اور نازپرور کو ہال میں لا کر مسند پر بٹھایا گیا اور انہیں پیلے کپڑوں پر زردوزی کے کام کا بھاری دوپٹہ اوڑھایا گیا۔ پھر اس کی ہونے والی نندوں اور دولہا کے رشتے کی بہنوں اور بھاوجوں نے اس کی ہتھیلیوں پر مہندی جمائی۔ پھولوں کا گہنا اور جو سیٹ بری میں ساتھ لے گئے تھے۔ ان ہی میں سے دو بھاری سیٹ پہنائے گئے۔ پھر ساس نے پھولوں کا گہنا بھی پہنایا۔ چاندی کا ورق لگی ہوئی مصری کھلائی اور نورین نے بھی چاندی کا ورق لگا ہوا پان کا بیڑہ کھلایا۔ اس کے ساتھ ساتھ گود بھرائی کی رسم بھی ادا کی گئی۔ گود کا میوہ جو ساچق کے ساتھ لایا گیا تھا چونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے اس کا ایک چوتھائی ایک زرکار کسنے، میں بھر کر دلہن کی گود میں رکھا گیا۔ اس کے بعد نظر گزر کا صدقہ اتار کر جان کا صدقہ اتارا گیا۔ تب نگار نے سب سے پہلے دلہن کی دودھ پلائی کی رسم کے طور پر سو سو کے کئی نوٹ اس کی گود میں رکھ دیے۔ ان کے بعد نسرین مہ جبین اور قرین نے اور ان کے بعد دوسری معمر خواتین نے یہ رسم ادا کی۔
اس کے بعد دولہا کی ساری بہنیں، بھاوجیں اور بھانجیاں بھتیجیاں نازپرور کو گھیرے بیٹھی تھیں اور تانیہ جھک جھک کر نازو کو دیکھے جا رہی تھی اور اتنی خوش اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی کہ گزشتہ روز کی ساری کدورت نازپرور کی ساری بہنوں اور کزنز کے دل سے چھٹ گئی تھی۔
"ہائے دیکھیں ذرا ممی! ہماری بھابھی بغیر میک اپ کے بھی کتنی حسین لگ رہی ہیں جیسے سبز پتوں میں گلاب کی کوئی نوخیز کلی۔ سچ ممی بھیا تو انہیں دیکھ دیکھ کر پاگل ہی ہو جائیں گے۔"
"ہاں تو یہ ہے ہی ماشاءاللہ اتنی خوبصورت اور پیاری پیاری سی تبھی تو ہم نے اسے اپنی بیٹی بنایا ہے۔" نسرین نازو کی طرف دیکھ کر بڑے دلار سے بولیں۔
"ممی میں ان کی ایک جھلک دکھانے کیا بھیا کو تھوڑی دیر کے لیے یہاں بلا لوں؟" تانیہ نے ماں سے پوچھا۔
"شش ۔ کیا دیوانی ہوئی ہو۔ وہ بھلا اس وقت یہاں کیسے آ سکتا ہے۔ وہ تو بس کل اکٹھا ہی اس کا عروسی جلوہ دیکھے گا۔" نسرین نے پیار بھرے انداز میں اسے گھرکتے ہوئے کہا۔
"اوہ نو ممی! یہ تو سخت زیادتی ہوئی بھیا کے ساتھ۔ پتہ بھی ہے وہ ان کو دیکھنے کے لیے کتنے بے تاب ہو رہے تھے۔ بھلا کل تک انہیں چین کیسے پڑے گا بلا انہیں دیکھے۔" تانیہ بولی۔

"یہ بیٹھے بٹھائے نئی کیا مائی ہے تمہارے دماغ میں تانیہ بہتر ہے کہ خاموش رہو" نوین اسے ڈانٹنے کے انداز میں بولیں اور وہ چڑ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ تبھی اس کی نظر سامنے کھڑی سلوط پر پڑی۔ تو سب کچھ بھول بھال کر اس نے پاس بیٹھی نزہت کا شانہ ہلا کر آہستہ سے کہا۔

"ہلائے ذرا دیکھنا یہ مس یونیورس (حسینہ عالم) یہاں کیسے ٹپک پڑی؟" تو نزہت نے بھی سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی سلوط کی طرف دیکھا اور بولی۔

"ہاں واقعی۔ مگر یہ ہے کون؟" تو اسے جواب دینے کے بجائے تانیہ نے نیلوفر سے پوچھا۔

"اے سنو نیلوفر یہ سامنے جو ایک آفت سی شے کھڑی ہے یہ کون ہے؟"

"یہ ـــ یہ سلوط ہیں" نیلوفر نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

"کون سلوط؟ کیا تمہاری کوئی کزن ہیں؟" تانیہ نے سوال کیا۔ تو نیلوفر قدرے سٹپٹا کر بولی

"نہیں ـــ کزن تو نہیں ہیں۔ بس ان سے ہمارا کچھ ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے تمہارا شاہین رضا سے"۔ اصل میں شاہین تانیہ کی بڑی پھوپھی کی نند تھی۔

"او ـــ اچھا اچھا ـــ یعنی سمدھیانے کا رشتہ ہوتا ہے تمہارا ان سے۔ مگر اب تک تم نے انہیں کہاں چھپا رکھا تھا" تانیہ مسلسل سلوط کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ نیلوفر کو تانیہ کا سلوط میں دلچسپی لینا کچھ اچھا نہ لگا۔

"بھئی میں کیوں چھپاتی انہیں۔ یہ خود ہی کچھ آدم بیزار سی شے ہیں کسی کے سامنے آتی ہی نہیں ہیں"۔

"اصل میں ان کے ساتھ کچھ ٹریجڈی ہو گئی ہے اس لیے یہ سب سے الگ تھلگ ہی رہتی ہیں"۔ نیلما بولی۔

"ہائے ویری سیڈ۔ مگر ایسی کیا ٹریجڈی ہوئی ہے"۔ تانیہ نے افسوس کرتے ہوئے بہت تجسس سے پوچھا۔

"اچھی طرح تو معلوم نہیں لیکن شاید ان کے منگیتر نے کچھ بے وفائی کی ہے۔ یا پھر وہ مر وہ گیا ہے۔ بس اسی کے غم میں دنیا تیاگ بیٹھی ہیں"۔ نیلما کے بجائے نیلوفر نے بتایا۔

"اف ہائے دیکھو تو ذرا۔ گلاب کا نو شگفتہ پھول لگ رہی ہیں یہ تمہاری پھوپھی کی ان لاز میں سے جو ہیں؟" تانیہ نے ان لاز میں سے جو ہیں کچھ اس طرح کہا کہ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں کو ہنسی آ گئی۔

"سچ مجھے تو افسوس اس بات پر ہے کہ میں ـــ نے انہیں بہت دیر میں دیکھا۔ پہلے دیکھ لیتی تو اپنے بھیا کے لیے انہیں ہی سلیکٹ کرتی"۔ تانیہ نے نزہت کے کان کے قریب سرگوشی کی تو نزہت اسے گھور کر بولی۔

"چلو فضول باتیں نہ کرو کسی نے سن لیا تو خواہ مخواہ ہی"۔

"سن لیا تو سن لے لیکن میں نے ایسی اوریجنل بیوٹی نہیں دیکھی۔ سچ لگتا ہے اللہ میاں نے اسے اپنے ہاتھ سے گھڑا ہے"۔ تانیہ حسب عادت اونچی آواز میں بولی اور اوریجنل بیوٹی کہنے پر تو نزہت لوٹ لوٹ گئی۔ "لیجیے ابھی نازو کی تعریف میں منہ خشک ہو رہا تھا اور اب سلوط کے آگے انہیں سب ہیچ نظر آ رہے ہیں"۔ درخشاں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں اور ذرا تشبیہات ملاحظہ ہوں"۔ عمیرہ ہنس کر بولی۔

"تشبیہات کیسی۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔ میری بھابی تو بالکل ایسی کلی لگ رہی ہیں جو کسی دم بھی کھلنے والی ہو۔ جس میں نوخیزی بھی ہو اور بانکپن بھی۔ اور یہ آپ کی سلوط یہ واقعی کسی نو شگفتہ پھول کی طرح ہیں۔ جس میں نزاکت، مہک اور رعنائی ہوتی ہے۔ جیسے کچھ دیر پہلے ہی کھلا ہو۔ بلکہ پورا ہی کھل گیا ہو"۔

اور تانیہ کی بے تکی تشبیہہ دینے پر سب بری طرح ہنسنے لگے۔

"اے یہ اپنی نازو کی نند تو بڑی پٹاخہ ہے۔ کیسی قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی"۔ تھوڑے فاصلے پر بیٹھی شعیب کے رشتے کی ایک پھوپھی سردار جہاں بیگم نے کشور جہاں سے کہا۔

"اے ہاں آپا سردار جہاں بیگم آج کل کی لڑکیوں کی زبانوں کے تو تانتوے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں"۔ کشور جہاں بولیں۔

"اے ٹوٹے کیا بلکہ بنائے ہی نہیں گئے تانتوے۔ بے تانتوں کے بچے پیدا ہو رہے ہیں آج کل"۔ ایک اور عزیزہ کلثوم نے گردن کو شانوں میں دباتے ہوئے دہلنے کو پھیلا کر کہا تو بزرگ خواتین ہنسنے لگیں۔

"اے پھپھو بیگم کروڑوں اربوں سالوں سے بھی زیادہ عرصے سے آسمان پر جو روحیں جمع ہیں وہ اب بوڑھی ہو کر تو زمین پر اتر رہی ہیں نا۔ آج کل تو چھٹی کے اندر اندر ہی نومولود بچے آنکھیں ملتے ہی مسکرانے لگتے ہیں۔ جبکہ ہمارے زمانے میں پانچویں چھٹے مہینے کہیں جا کر بچہ صورتیں پہچانتا تھا"۔ ایک اور خاتون بولیں۔

"اے ہاں بہن۔ اصل میں قرب قیامت ہے۔ ہمارے بڑے کہتے تھے کہ قرب قیامت میں گائے ڈوبیں گے پتھر تیریں گے جنگل میں منگل ہوگا۔ نمک میں نمک نہ رہے گا مٹھاس میں مٹھاس نہ رہے گی۔ گائے گو کھائے گی اور کنواری بر مانگے گی۔ یہ سات نشانیاں ہیں قرب قیامت کی۔ اور جب کنواری بر مانگنے لگی ہے تو وہ بھیانکی ہی تو کہلائے گی۔ اور دیکھ لو آج کل کی لڑکیاں کیسی بے حجابی کی باتیں کرتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں کا لحاظ اور نہ موقع محل کا خیال۔ زبان کے آگے کنواں آئے یا کھائی بس بولے ہی چلی جائیں گی"۔ کشور جہاں نکتہ چینی کرنے کے انداز میں بولیں۔

"اے ہاں آج کل کا تو واقعی باوا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے۔ لڑکوں کی تو خیر بات ہی دوسری ہے مگر لڑکیوں کی آنکھوں کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ اے ذرا یہ اندھیر تو دیکھو۔ کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں لڑکوں کے ساتھ مل کر گاتی اور ناچتی ہیں اور ایسا ہڑدنگا مچاتی ہیں کہ شیطان بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہوگا۔ اے ہمارے زمانے میں اگر لڑکیوں کے یہی طور چلن ہوتے تو اماں باوا انہیں زمین کھود کر گاڑ دیتے"۔ سردار جہاں بیگم نے کہا۔

"اے پھپھو بیگم! جیسا زمانے کا چلن ہوتا ہے اس کے مطابق تو چلنا پڑتا ہے۔ اب یہ زمانہ ہماری تیسری نسل کا ہے۔ اور پہلے سے بہت زیادہ ترقی بھی کر گیا ہے۔ اب اس زمانے کی بچیاں آپ کے زمانے کے رواج اور دستور اپنا کر بیٹھ جائیں تو موجودہ زمانے کے ہاتھوں نکو ہی بن کر رہ جائیں گی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی تو کچھ غلط تو نہیں کہتے۔ انسان کو زمانے کے ساتھ تو چلنا ہی پڑتا ہے"۔ عائشہ بیگم ان لوگوں کے اعتراضات سے اکتا کر بولیں۔ اور تبھی زینب اور نازش نے آکر سب کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو دولہا والوں سمیت سب ہی نے کھانا کھانے کی غرض سے لانز میں تنے شامیانوں کا رخ کیا۔

باہر شامیانوں کے نیچے مکس حساب کتاب ـــ تھا۔ یعنی خواتین کے ساتھ کھڑے مرد اور سمدھیانے سے آئے ہوئے لڑکے بھی کھانے میں شریک تھے۔ کہ یکایک زینت کو بیٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے پہلے سارے مہمانوں میں اسے ادھر ادھر تلاش کیا پھر عائشہ بیگم کے لڑکے اسد سے پوچھا۔

"یہ بابا نظر نہیں آ رہے اسد بیٹے! کیا تم نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو اندر ہال میں ہی تھے ممانی جان۔ کہیں اپنے کمرے میں نہ چلے گئے ہوں یا پھر اندر ہی کہیں رہ گئے ہوں"۔ اسد بولا۔

"اے تو ذرا دیکھو تو جا کر آخر چلے کہاں گئے۔ یہاں تو کھانا بھی شروع ہو گیا اور مجھے مصروفیت میں خیال ہی نہ رہا"۔ اسد پلیٹ ہاتھ میں لیے کھانا کھا رہا تھا۔ نوالہ منہ میں رکھ کر بولا۔

"جی اچھا ممانی جان، بس ابھی جا کر دیکھتا ہوں"۔

"نہیں تم اطمینان سے کھانا کھاؤ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں"۔ زینت نے اسد کو کھانا چھڑوا کر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا اور خود بیٹے کو دیکھنے اندر چل دیں۔

ان کا خیال درست ہی نکلا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی موجود تھا اور اپنے بیڈ پر تکیے سے لگا ٹانگیں پھیلائے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ماں کو آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اسے اطمینان سے کتاب پڑھتا دیکھ کر زینت جز بز سی ہو کر بولیں۔

"یہ بھی بھلا کمرے میں بند ہو کر کتاب پڑھنے کا موقع ہے سنی۔ تم بھی حد کر دیتے ہو بد اخلاقی کی۔ وہاں سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

"لیکن میں کوئی چیف گیسٹ (مہمانِ خصوصی) تو نہیں ہوں ممی جو میرے جائے بغیر کوئی نوالہ نہیں توڑے گا"۔ وہ ناگواری سے بولا۔

"چیف گیسٹ تو نہیں ہو لیکن لڑکی کے بڑے اور اکلوتے بھائی تو ہو۔ اسی لیے لڑکے والے بھی تمہیں پوچھ رہے ہیں"۔ زینت کو مجبوراً غلط بیانی سے کام لینا پڑا۔

"پوچھ رہے ہیں تو آپ بھی ان سے کہہ دیجیے ممی کہ لڑکی کے بڑے اور اکلوتے بھائی کا اس وقت کمرے سے باہر جانے کا بالکل موڈ نہیں ہے بلا تکلف کھانا کھا لیں"۔ وہ قدرے بدتمیزی سے بولا۔

"واہ اب سمدھیانے والوں سے جاکر بھلا میں یہ کہوں گی کہ لڑکی کے بھائی کا کمرے سے نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ یہ تم کیسی طفلانہ باتیں کرتے ہو بیٹے۔ کیا یہ چاہتے ہو کہ بہن کو اس کی سسرال والوں کی نظروں میں بالکل ہی گرا دو۔ سب کو تجسس پیدا ہو کہ لڑکی کا بھائی گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ لڑکی کا معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ اور لڑکے والے ایک ذرا سی بات کی بھی کس طرح گرفت کرتے ہیں۔"

"اگر یہ لوگ ایسے ہی نیرو مائنڈڈ کوتاہ نظر ہیں تو پھر نازو کا رشتہ ان کے ہاں کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"ارے بھی لوگ کیا ساری دنیا کے لڑکے والے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا تو کیا جب آپ بھی لڑکے والی بننے کی پوزیشن میں ہوں گی تو ایسی ہی ثابت ہوں گی جیسے ساری دنیا کے لڑکے والے ہوتے ہیں۔" وہ ہمیشہ ماں کی باتوں کی گرفت کچھ اسی طرح کرتا تھا۔ زینت کو اس کی بات پر دکھ تو بہت ہوا مگر وہ جواب گول کر کے بولیں۔

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مگر تم کسی طرح اٹھو تو سہی۔ وہاں تو کھانا بھی کب کا شروع ہو چکا۔"

"کھانا شروع ہو چکا تو آج کل تو لوگ کچھ اتنی تیز رفتاری سے کھانا کھاتے ہیں کہ کب کا ختم بھی ہو چکا ہوگا۔ پھر میرے باہر جانے کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی۔" اُف کتنا ہٹیلا اور ہٹ دھرم تھا وہ۔ زینت اس کی باتوں پر زچ سی ہو کر بولیں۔

"اچھا جب تم نے سوچ ہی لیا ہے کہ تم جاؤ گے ہی نہیں تو پھر میں نے یہاں آکر محض جھک ہی مارا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اماں جان کو تمہارے پاس بھیج دیتی۔ ان کی بات ماننا تو تم اپنا ایمان سمجھتے ہو نا۔ پھر بھلا میری کیا حیثیت کیا اوقات۔" زینت کو سچ مچ ہی غصہ آ گیا تھا اور شاید پہلی بار آیا تھا۔ وہ مڑ کر جانے لگیں تو اس نے انہیں پکارا۔

"ممی!"

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" انہوں نے وہیں رک کر پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ ماں کا رُتبہ کیا ہے۔" اس کے منہ سے انہوں نے پہلی بار ایک انوکھی سی بات سنی تھی۔ انہیں سخت اچنبھا ہوا۔

"اچھا معلوم ہے پھر بھی دوسروں کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو۔" وہ اس کے نزدیک آتی ہوئی بولیں۔

"نہیں یہ بات نہیں ممی۔ ماں کے مرتبے کے لحاظ سے اماں جان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے بحمداللہ باقاعدہ ترجمے کے ساتھ قرآن شریف پڑھا ہے۔ اور اس نے ہی مجھے ماں کی عظمت اور مرتبے سے روشناس کرایا ہے۔ لیکن اماں جان کے مجھ پر بہت سے وہ احسانات ہیں جو آپ کو مجھ پر کرنے چاہیے تھے اور وہ فرائض بھی جو آپ کو ادا کرنے چاہیے تھے انہوں نے ادا کیے ہیں۔ یوں بھی ممی اگر وہ سوتیلی بھی ہیں تو ڈیڈی چچا اور پھوپھو کے لیے ہی ہوں گی۔ آپ کو تو انہیں سوتیلا نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ہی بڑے شوق ولگن سے آپ کی شادی ڈیڈی سے کرائی تھی۔" اف زینت تو سمجھ رہی تھیں کہ ان کے خفا ہو جانے پر اگر وہ ان کو منائے گا تو ہیں تو اپنی معذرت ضرور پیش کرے گا۔ مگر وہ تو اپنی دادی کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ وہ جل کر بولیں۔

"اچھا تو تم نے کیا یہی سب کچھ کہنے کے لیے مجھے روکا تھا۔"

"نہیں ممی بلکہ آپ کو آپ کے رُتبے سے آگاہ کرنے کے لیے روکا تھا۔ جو میرے دل میں آپ کے لیے ہے۔" وہ پہلی بار مسکرایا اور کھسک کر پیر نیچے فرش پر ٹکا لیے۔

"ہونہہ جبھی تو میری ہر بات رَد کر دیتے ہو۔ بات بات میں دل توڑ دیتے ہو۔" وہ شاکی سے لہجے میں آزردگی سے بولیں۔

"اونو ممی۔ میں نے آپ کی بات رد نہیں کی۔ بلکہ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں زیادہ شور و غل اور لوگوں کے ہجوم میں رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ پلیز ممی۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" وہ کتنی لجاجت سے کہہ رہا تھا جبکہ اس سے پہلے تو کبھی ایسے لب و لہجے میں ان سے بات ہی نہیں کی تھی۔ ہزار اس سے شاکی سہی لیکن آخر تو وہ ماں تھیں اور وہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ ان کو بھی معلوم تھا کہ ان کا بیٹا شور و غل کا بالکل عادی نہیں۔ ان کی ممتا نے ایک دم ہی جوش مارا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"بیٹے تمہارے سر میں درد تھا تو تم نے مجھ سے آتے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ چلو آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی فون کر کے کرنل حئی کو بلوا لیتی ہوں۔ وہی آکر تمہارے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں گے۔"

"نہیں نہیں ممی اب ایسا بھی سیریس کیس نہیں ہے کہ ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا جائے۔" وہ ڈاکٹر کے نام سے بدک کر بولا۔

"نہیں خدا نہ کرے۔ چلو خیر سر درد کی گولی کھا لو۔ میں ابھی گولیاں اور چائے لے کر آتی ہوں۔ پھر تمہارا سر بھی دبا دوں گی۔"

"اوہ نو ممی۔ میں دوا کھانے کا قائل ہی نہیں۔ جبھی تو آج تک اپنی زندگی میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ یہ دیکھیں کیسا ہٹا کٹا ہوں ایک دم باڈی بلڈرز کی طرح۔"

"اے ماشاءاللہ چشم بد دور خدا تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ اس طرح منہ بھر کر تو نہ کہو۔ ٹوک لگ جاتی ہے۔"

"واہ کیا خوب لاجک ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا تھوڑا سا کچھ کھا ہی لو پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے بھی سر میں درد ہو جاتا ہے۔ یہاں کراچی میں تو السڈیٹی بڑھنے کی شکایت عام ہے۔" زینت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح بیٹے کے سر سے درد بھگا دیں۔

"ٹھیک ہے آپ کہہ رہی ہیں تو کھانا ضرور کھا لوں گا۔" اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ تبھی نیلما بھاگتی ہوئی اندر آگئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا پھر بھی بھائی کو دیکھ کر معذرتی لہجے میں بولی۔

"سوری بھائی جان میں بغیر اجازت کے اندر آگئی ہوں لیکن ایمرجنسی ہی کچھ ایسی ہے۔"

"کیوں خیریت تو ہے۔" زینت نے گھبرا کر پوچھا۔

"ممی آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سارا گھر چھان مارا۔ وہ سلوط آپا بری طرح جل گئی ہیں نا۔" نیلما نے قدرے ہانپتے ہوئے بتایا۔

"ہائیں کون؟" وہ جو ماں کے کہنے پر لیٹ گیا تھا اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سلوط آپا۔ وہی جنہوں نے آپ کو اُبٹنے میں نہلایا تھا۔" نیلما نے بتایا۔

اور بیٹی کے اس سے اس طرح سلوط کا تعارف کرانے پر زینت چڑ کر بولیں۔

"مگر جل کیسے گئی وہ؟"

"وہ خانساماں اسٹو سے کیتلی اتار رہا تھا۔ ہینڈل بہت گرم تھا اس پر گرپ نہ رکھ سکا کیتلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلوط آپا کے پیروں پر جا پڑی جو قریب ہی کھڑی پیالیاں سیٹ کر رہی تھیں۔ سچ پنڈلیوں تک آبلے پڑ گئے ہیں گھٹنے بھی سخت متاثر ہوئے ہیں۔" نیلما نے اس کے جلنے کی وجہ بیان کی تو زینت نہایت ناگواری سے بولیں۔

"اف تو یہ لڑکی جب سے آئی ہے ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔"

"مگر ممی یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہی ہے۔ کوئی جان بوجھ کر تو نہیں جلائے انھوں نے اپنے پیر۔"

"اے ایسا ہی اتفاقی حادثہ کل بھی تو ہوا تھا اس کے ساتھ معلوم بھی ہے حالات کس حد تک خراب ہو گئے تھے وہ تو نگار کو خدا خوش رکھے وہ صلح صفائی نہ کرتیں جا کر تو اس وقت اس گھر میں الو ہی بول رہا ہوتا۔"

"پھر بھی ممی چل کر دیکھ تو لیں انہیں۔" نیلما ماں کی بے حسی پر جز بز سی ہو کر بولی۔

"ہاں چل رہی ہوں مگر کھانے کا کیا رہا۔ میں تو کھانا سرو ہوتے ہی یہاں آگئی تھی۔ یہ بابا کے سر میں درد ہو رہا تھا نا۔ اب پتا نہیں باہر کا حشر کیا ہوا ہوگا۔" زینت بولیں۔

"حشر تو کچھ نہیں ہوا سب اطمینان سے کھانا کھا رہے ہیں۔ بلکہ اب تو ختم کرنے والے ہیں۔ اچھا خیر اگر بھائی جان کے سر میں درد ہو رہا ہے تو آپ بھیں ان کے پاس رہیں میں چلی جاتی ہوں سلوط آپا کے پاس۔" نیلما بولی۔

"ارے نہیں تم جا کر اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ میں بھی بس ابھی آتی ہوں۔" زینت نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ممی کیسے کھا سکتی ہوں کھانا۔ ڈیڈی نے مجھے آپ کو بلانے بھیجا تھا وہ سلوط آپا کے کمرے میں بیٹھے کرنل حئی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں بس آپ جلدی سے آجائیں۔" نیلما نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اور شوہر کا نام سن کر زینت بیگم گھبرا سی اٹھیں اور باہر کا رخ کرتے کرتے کوئی خیال آیا تو بیٹے سے بولیں۔

"دیکھا بعض گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ جو منہ سے نکل جائے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہو کر رہتا ہے۔ اب میں تو تمہیں دکھانے کی غرض سے کرنل حئی کو بلوانا چاہ رہی تھی مگر تمہارے ڈیڈی نے سلوط کے لیے بلوا لیا۔ مگر شکر ہے تم پہلے تو بلا ٹلی۔" اور پھر وہ شوہر کی خفگی کے خیال سے فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اور وہ سلوط کے معاملے میں ماں کے تاثرات، رویّے... بیزاری اور گفتگو پر غور کرتا رہ گیا۔

کیونکہ گزشتہ روز بھی اس کے بارے میں اُن کے خیالات اور گفتگو وہ خود اپنے کانوں سے سن چکا تھا اور کل تک تو اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ وہ اس کے آنے پر خوش نہیں ہیں جبکہ اسے سلوط کی آمد کی غرض و غایت کا بھی قطعاً علم نہ تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ دوسرے عزیزوں یا عزیزاؤں کی طرح وہ بھی اس کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے آئی ہے۔ حتیٰ کہ اُسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس کی پھوپھی کس وجہ سے نہیں آسکی ہیں اور بقول زینت انھوں نے سلوط کو اپنا نمائندہ ـــــ بنا کر بھیجا ہے۔

وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ مہمانوں سے ایسا ناروا سلوک تو روا نہیں رکھا جاتا۔ وہ بھی پھوپھی کی اکلوتی نند سے۔ گزشتہ روز ہی تو دوسرے انکشافات کے ساتھ ساتھ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ سلوط اس کی پھوپھی کی اکلوتی نند ہے۔

اور اس کی ممی سلوط کی حیثیت اور اہمیت کو جاننے کے باوجود بھی اس سے اس قدر متنفر اور بیزار کیوں نظر آتی تھیں۔ یہ گتھی بڑی کوشش کے باوجود اس سے سلجھائی ہی نہیں جا رہی تھی۔ جبکہ اس کے اندر جستجو اور کھوج کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس پر ماں کے رویے پر تعجب بھی ہو رہا تھا اور سخت کوفت بھی.. اس پر وہ کسی بھی مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کا عادی نہ تھا۔

ابھی تھوڑی دیر قبل سلوط کے اہانت آمیز رویے پر بھی سخت غضبناک ہونے کے باوجود اپنے کمرے میں آکر وہ کچھ دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر ایک کتاب کھولی اور اس کے مطالعے میں گم ہو گیا۔ مگر اس وقت تو تعجب سے زیادہ تجسس اس پر اس درجہ غالب تھا کہ اس نے بھی بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی تہیہ کر لیا کہ ماں سے ان کی اس زیادتی کا سبب پوچھ کر رہے گا۔ اخلاق اور انسانیت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ کم از کم ایک نظر اسے دیکھ ہی آئے لیکن اس کے اور سلوط کے درمیان کوئی ایسا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ اسے دیکھنے ہی چلا جاتا... یوں بھی کسی کی تکلیف وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس رات بھی سلوط کی آنکھوں پر بندھی پٹی کو اس بری طرح ستا رہے پر اس کی تکلیف کا تصوّر کر کے وہ کافی دیر تک بے چین سا رہا تھا۔

اگلا دن اس قدر مصروف گزرا تھا کہ کسی اور کو تو کیا خود اسفند کو بھی سر اُٹھانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ایک تو مہمان اور بارات اتنی کثرت سے آئے تھے کہ اتنے بڑے گھر میں بلکہ باہر تک۔ کہ سڑک سے دونوں جانب اور ارد گرد کی گلیوں تک کاروں کا ایک ہجوم کھڑا تھا تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ مہمانوں کی تعداد کوئی ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی اور اسی تعداد کے پیشِ نظر زینت نے شوہر کے بہت کہنے کے باوجود کسی بڑے ہوٹل میں کوئی بڑا گوشہ ریزرو نہیں کرایا تھا کہ آخر اتنے سارے مہمان کسی ہوٹل میں کیسے سما سکتے تھے۔

کچھ ماں نے اور باقی دادی نے گزشتہ روز اسے اس کی اہمیت اور فرائض کا احساس دلایا تھا اس لیے خلافِ توقع اس نے بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یوں بھی آخر نازیہ اس کی ماں جائی تھی۔ اس کا خون تھی۔ جسے اب تک وہ ایک چاہنے والے بھائی کا پیار نہیں دے سکا تھا گو وہ اسے عزیز تو بہت تھی لیکن اپنی بڑائی کے زعم میں اور کچھ اپنی لااُبالی فطرت کی وجہ سے وہ اپنی محبت کو اس پر ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ اور اب وہ پرائی ہو کر گھر سے رخصت ہو رہی تھی تو اپنی کوتاہیوں کا خیال اسے بُری طرح تڑپا رہا تھا۔

..یوں بھی لڑکی امیر کی ہو یا غریب کی۔ اسے رخصت کرنے کا خیال ہر خاص و عام کے دلوں پر ایک گرانی سی پیدا کر دیتا ہے۔

جو لڑکیوں کو موتیوں میں تول کر اور سونے میں پیلا کر کے دیتے ہیں وہ بھی اور جو خون پسینہ ایک کر کے جمع کی ہوئی رقم یا اپنا پیٹ کاٹ کر جمع کی ہوئی یا پھر قرض مانگ کر لی ہوئی رقم سے چند جوڑوں اور چھوٹے بڑے دو گہنوں میں رخصت کرتے ہیں وہ بھی اشکوں کی جھلاّہٹ اور لبوں سے نکلتی ہوئی دعاؤں کے ساتھ ہی بیٹی کو رخصت کرتے ہیں۔ کہ لڑکی کا نصیب بھی لاٹری کی طرح ہوتا ہے۔

جو نکل آئے تو بادری ہی بادری۔

اور نہ نکلے تو دلدر ہی دلدر۔

خیر غریب اور اوسط طبقے کی لڑکیاں تو دنیا کے سرد و گرم سے بلکہ زیادہ تر گرم ہی گرم سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن رئیسوں کی لڑکیاں پیسے ہی سے تو دنیا کی تمام تر خوشیاں نہیں خرید سکتیں یوں بھی روپے پیسے سے اور سب تو خریدا جا سکتا ہے مگر خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں نہ مستعار ہی لی جا سکتی ہیں۔ ہاں البتہ جھوٹی خوشیاں ضرور خریدی جا سکتی ہیں جو کرائے کی ہوتی ہیں۔

اور پیسے کی عوض خود کو بہلاوا دینے کے لیے۔

اپنا غم بھلانے اور دھیان بٹانے کے لیے انسان یہ مہنگی تفریح مہیا کر کے دوسرے معنوں میں کرائے کی خوشیاں ہی تو خرید لیتا ہے۔

دادی ماں اور دوسری بزرگ خواتین کی دعائیں سن سن کر ہی تو یہ سارے احساسات بھی بہن کی رخصتی کے وقت ہی جاگے تھے۔ اور اس کا دل اندر ہی اندر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ بہن کو رخصت کرتے سمے اس کی آنکھوں میں بھی آنسو چمکتے دیکھے گئے تھے اور ماں اور دادی کو

سب سے زیادہ تعجب ہوا تھا۔

گو لڑکی کی رخصتی کے بعد ولیمہ، چوتھی چالوں اور دعوتوں کا سلسلہ خاصے عرصے تک چلتا رہتا ہے.. مگر جب وہ رخصت ہو جاتی ہے تو بہت سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود گھر یوں لگتا ہے جیسے راہزنوں کی ٹولی نے کسی کا بھرا گھر لوٹ لیا ہو۔ اور ہر طرف دلوں کو ویران کر دینے والا سناٹا طاری ہو۔ اپنا مال و متاع لٹ جانے کے بعد اہل کارواں دھواں دھواں ہوتی صورتیں لیے بیٹھے ہوں۔

بہن چلی گئی تو ماں باپ بہنوں اور اتنے سارے عزیزوں کی موجودگی کے باوجود گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا لگ رہا تھا۔

سوچا تو یہی تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں باہر گھوم پھر آئے گا مگر باہر جانے کا بھی موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارے اور لباس تبدیل کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

پھر اس کے طائرِ خیال نے ایک نئی اڑان لی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کس وجہ سے ہوتا ہے؟ کہ لڑکیاں اپنی زندگی کے ابتدائی بیس بائیس سال گزار کر اور والدین کی اتنے سال کی محنت اور مشقت پر پانی پھیر کر ایک غیر گھر میں چلی جاتی ہیں اور انھیں کو کیسا دکھی دکھی سا کر کے رکھ دیتی ہیں۔

کیا یہ لڑکیاں اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں رہ کر زندگی نہیں گزار سکتیں۔ والدین تو ان کے لیے دنیا کا ہر سکھ فراہم کرتے ہیں۔

اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا پیٹ بھرتے اور تن ڈھکتے ہیں۔

ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ تڑپ اُٹھتے ہیں۔

اور اپنی تمام تر محبت اور شفقت ان پر نچھاور کر دیتے ہیں۔

حتیٰ کہ پڑھاتے لکھاتے بھی ہیں۔ اور دوسرے تمام کاموں میں بھی طاق کر دیتے ہیں۔

کیا یہ ساری محنت اور مشقت اس لیے کرتے ہیں کہ ایک دن وہ انھیں چھوڑ کر غیر کا گھر بسا لیں آخر اس کی وجہ؟

ہر اس بات کی وجہ جاننا بھی اس کی عادت تھی... جو اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی یا پھر اس کے تجسس کا باعث بنتی تھی۔ وہ دیر تک اس بے ثباتی کی وجہ معلوم کرنے میں کوشاں رہا کہ زندگی میں پہلی بار آج وہ ایک سمجھدار اور ذمہ دار مرد کی طرح سوچ رہا تھا۔ اور وہ کوئی اتنا نا سمجھ اور ناخواندہ تو نہ تھا کہ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آتی۔ کہ لڑکیاں اگر ساری زندگی والدین کے در پر ہی بیٹھی رہیں تو بوڑھی ہو کر مر کھپ جائیں۔ اور پھر ابتدائے آفرینش سے نسلِ انسانی کا جو ایک سلسلہ یکے بعد دیگرے چلا آ رہا ہے۔ وہ بالکل ختم ہی ہو کر رہ جائے تو پھر دنیا میں شجر حجر اور حیوانات ہی باقی رہ جائیں۔

اسے خود ہی اپنے خیالات پر بڑے زور کی ہنسی آگئی۔

وہ تو چونکہ بہن کے جانے کے بعد وہ دل اور ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اُلٹے سیدھے خیالات کے تانے بانے میں اُلجھ گیا تھا۔ اچانک آجانے والی ہنسی نے جس کی گرہیں کھول دی تھیں۔ یا پھر پیر پر مچھر نے کاٹا تھا اس لیے خیالات کے تانے بانے ایک دم ہی ٹوٹ گئے۔ باہر لان میں لگی گھاس اور پودوں کی وجہ سے پورے گھر میں اسپرے کروانے کے باوجود دو چار مچھر کمروں میں ضرور در آتے تھے۔ مچھر کے کاٹنے کی وجہ سے پیر پر ننھا سا دُودڑا پڑ گیا تھا۔ جسے کھجلاتے ہوئے اس کی نظر اس دُودڑے پر پڑی تو جم سی گئی۔ اور کچھ دیر بعد دودڑے کے بجائے اسے اپنے پیر پر ایک آبلہ سا نظر آنے لگا۔ اور پھر ٹخنے کے اوپر تک جہاں تک پیر کھلا ہوا تھا آبلے ہی آبلے۔

جن کے ساتھ ہی ساتھ ذہن کی چرخی گھومی۔

وہ گھٹنے فرش پر ٹکائے رُخِ تاباں اٹھائے۔ سہمی سہمی.. فریاد کرتی.. بڑی بڑی ہیروں کی کنیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔

اور پھر۔ اپنے سرو قد پر بے طرح کھلتے سبز رنگ کے لباس میں چہرہ جھکائے اور بڑے ہنگامہ خیز انداز میں نچلے ہونٹ کو تھوڑا سا دانتوں میں دبانے کی قاتل ادا۔ اور وہ دل کی ہر اُمنگ کو مٹا دینے والا سا متکبر سا رویہ۔

آپ ہی آپ چلتی ہوئی فلم کی کسی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے اترتا رہا۔ تو وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت سا اس دلفریب نظارے میں گم رہا۔

مگر پھر دفعتاً کانوں میں ایک جھنجھناہٹ کے ساتھ ساتھ.. ماں کی باتوں کی بازگشت گونجی تو یکلخت وہ تاثر ہی ٹوٹ گیا جو ابھی سلوط کی ادائیں یاد کر کے بندھا تھا اور جس کے ساتھ ہی دل میں اس کی احوال پرسی کرنے کی خواہش جاگی تھی۔ لیکن اب وہ تاثر ٹوٹا تھا تو وہ سوچ رہا تھا۔

بھلا میرا اس سے کیا واسطہ کیا سروکار جو میں اس کی احوال پرسی کو جاؤں۔ وہ بھی اس وقت رات کو۔

اور اگر دن بھی ہوتا تب بھی میرا اس کی احوال پرسی کو جانا کسی طور پر بھی مناسب نہ ہوتا۔ کیونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھوں میری کیا کم عزت افزائی ہوئی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے مائی ڈیر اسفند کہ لائٹ بند کر کے آنکھیں بند کر لو۔ اور خوابوں کے کسی خوبصورت جزیرے کی سیر کو نکل جاؤ۔ ناؤ یو کام اینڈ کوائٹ۔ اینڈ شب بخیر۔

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے لگا لیمپ آف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

شادی کے تیسرے روز دعوتِ ولیمہ تھی۔

لڑکے والوں نے ہوٹل شیریٹن میں ڈنر دیا تھا۔

مہمان وہاں بھی بہت بڑی تعداد میں مدعو کیے گئے تھے۔

ایک سے ایک بڑھ کر حسین۔ متمول اور طرح دار لڑکی موجود تھی۔

جو اپنے لباس اور زیورات کی نمائش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی پوری پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی فیشن پریڈ ہو رہی ہو۔

یا پریوں کا کوئی جھرمٹ کسی طلسم زار میں بھٹکتے بھٹکتے شیریٹن کے بینکوئٹ ہال لا بیز اور لاؤنج میں نکل آیا ہو۔

زینت کبھی کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس آتیں اور اس سے اس کا تعارف کراتیں۔ تو کبھی اس کا ہاتھ پکڑ لڑکیوں کے کسی جھرمٹ میں جا پہنچتیں اور فرداً فرداً ہر لڑکی سے اس کا تعارف کراتیں۔۔ کیونکہ رش ہی اتنا زبردست تھا۔ کہ کوئی ایک پاس کھڑا ہوتا تو پلک جھپکتے ہی بھیڑ میں گھستا رستا آگے نکل جاتا اور دوسری نئی صورت پاس آ کھڑی ہوتی۔ گو زینت نے اس پر اپنا لڑکیاں دکھانے کا مقصد واضح نہیں کیا تھا۔

نہ خود اس نے بھی معلوم کرنے کی کوشش ہی کی تھی۔

پھر بھی وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ماں کیا چاہتی ہیں۔

اب یہ بھی نہیں تھا کہ اس کی پسند بہت اعلیٰ اور ارفع تھی۔

اور معیار بہت اونچا۔ کہ وہ کسی تخیلاتی آئیڈیل قسم کی شبیہ کا یا پھر پریوں کی شہزادی کا متمنی ہوتا۔

چنانچہ لڑکیاں تو وہاں موجود مہ جبینوں میں بعض بعض انتہائی حسین تھیں جن سے ماں تعارف کرا چکی تھیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی۔ جن میں سے جس کو بھی وہ پسند کرتا شریکِ زندگی کی حیثیت دے سکتا تھا۔ لیکن ابھی دور دور تک بھی زندگی کی رفاقت میں کسی کا ہاتھ تھام کر چلنے کی وہ ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔

کیونکہ صرف اعلیٰ تعلیم کی ڈگری ہاتھ میں لے کر اور اپنی جائیداد اور روپے پیسے کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کا وہ بالکل قائل نہ تھا۔ بلکہ خود اپنے زورِ بازو سے اپنا مستقبل سنوارنے کا مصمم عزم رکھتا تھا۔

جبکہ عزم ہی عمل کا دروازہ ہوتا ہے جس سے گزر کر ہی انسان تسخیرِ کائنات کی مہم کا آغاز تک کر لیتا ہے۔ اور اس کے ارادے بہت بلند اور نیک تھے، وہ اپنا مستقبل بھی سنوارنا چاہتا تھا تو اس نیت اور ارادے سے کہ اس کی ذات سے خلقِ خدا کو فیض حاصل ہو یا اس کے فن یا پیشے سے ہر خاص و عام استفادہ حاصل کر سکے اور اس کے ارادوں اور خیالات سے زینت یکسر لاعلم تھیں۔

ہوٹلوں میں گھر کا سا حساب کتاب تو نہیں ہوتا کہ مہمان کا جب دل چاہے چلا آئے اور جب منہ اٹھے چلا جائے۔ بلکہ ایک قاعدہ اور اصول ہوتا ہے کہ محدود اور مقررہ وقت میں ہی سب آ جا سکتے ہیں۔ ڈنر کے بعد گو آئس کریم پیش کی جانے والی تھی۔ مگر چونکہ سلمیٰ بیگم— جوڑوں کے درد میں اضافے کے باعث دعوتِ ولیمہ میں شرکت نہیں کر سکی تھیں اور گھر پر نوکروں کی نگہداشت میں رہ گئی تھیں کچھ اس لیے بھی وہ کھانا کھاتے ہی نسرین سے اجازت لے کر سب سے پہلے گھر واپس لوٹ آیا تھا۔ اور آتے ہی اس نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا تھا جو ان دنوں سلمیٰ بیگم کے تصرف میں تھا۔ سلمیٰ بیگم اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں اور ان کے سرہانے بیڈ کی پٹی پر ٹکی، دونوں پیر بیڈ کے آگے پڑی تپائی پر رکھے ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس سلوطا آہستہ آہستہ ان کا سر دبا رہی تھی۔

وہ ایک دم ہی اندر داخل ہوا تو سلوطا نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور یوں دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔ وہ چند لمحے بڑے متعجب اور سراسیمہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اور بے دھیانی میں پیر تپائی سے ہٹا کر نیچے قالین پر رکھے تو درد کی شدت کو ضبط کرنے کی کوشش میں چہرہ سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔ اور جانے کیوں کر اور کیسے۔۔ وہ بھاگ کر اس کے نزدیک آ گیا۔ اور بے حد غیر ارادی طور پر جھک کر اس نے بڑی احتیاط سے سلوطا کے دونوں پیر پھر تپائی پر رکھ دیے اور یہ سب کچھ

اس قدر اچانک اور غیر متوقع ہوا کہ سلوطا سے باز بھی نہ رکھ سکی۔ اس نے جھکے جھکے ہی چہرہ اونچا کر کے اس کی طرف دیکھا ایک بار پھر نگاہوں کا تصادم ہوا تب وہ خود ہی نظریں کترا کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

پیروں کا یہ عالم ہے کہ بلبلا سے ہوئے شکرقند کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ فرش پر ٹکائے بھی نہیں جا رہے۔ پھر کیا سر کے بل چل کر یہاں آئی تھیں آپ۔۔ اور آنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ انداز نستار ملے کا سا تھا مگر لہجے سے ہمدردی عیاں تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینا پڑا۔

"وہ پھپھو (دیکھا رہ) ہو جانے کی وجہ سے اماں جان کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا اس لیے۔" اس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیتے دیتے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کمال ہے۔ کیا ٹیلی پیتھی کے علم سے واقف ہیں جو اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کو اماں جان کے سر درد اور بخار کا علم ہو گیا تھا۔ ورنہ اماں جان خود اٹھ کر آپ کو یہاں لانے سے تو رہی تھیں!" وہ بھنویں اچکا کر چبھتے سے لہجے میں بولا۔ اس کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا اس سے بات کرنے کو مگر سلمیٰ بیگم کی موجودگی کے خیال سے جواب دینا ہی پڑا۔

"مہمان داری کی وجہ سے آج کل اماں جان بھی اسی کمرہ میں رہ رہی ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے زیادہ بات کرنے سے اس کی انرجی ضائع ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ کچھ بخار کی وجہ سے اور کچھ سلوطا کے نرم اور نازک ہاتھوں سے سر دبانے کی وجہ سے سلمیٰ بیگم کی آنکھ لگ گئی تھی گو وہ دھیمی آواز میں ہی بول رہا تھا پھر بھی اس کی آواز پر ان کی آنکھ کھل گئی۔

"ارے کون ہے سلوطا بیٹی۔؟" انھوں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔ وہ۔ یہ۔"

"وہ، وہ، یہ یہ کیا سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ اسفند ہے۔ اب میرا آپ سے کوئی قانونی رشتہ تو نہیں جو میرا نام لیتے آپ کو شرم آئے۔" وہ اس کے ہکلانے پر چڑ کر تیز و تند لہجے میں بولا۔ وہ اپنی روانی میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ دوسرے پر اس کی بات کیا اثر کرے گی۔ وہ بھی اس کے آخری فقرے پر کٹ کر رہ گئی۔ اور اندر ہی اندر کھول ہی اٹھی۔

"میں اسفند ہوں اماں جان آپ کا تھا۔" وہ اس کے احساسات کی پروا کیے بغیر دوسری طرف سے آ کر دادی پر جھک کر بولا۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اُن کی پیشانی کو چھو کر دیکھا پھر نبض پر ہاتھ رکھ کر شاید اُن کی دھڑکنیں گنتا رہا۔ بیگم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ نبض دیکھنے کے بعد آہستہ سے ان کی کلائی چھوڑ کر پُر تشویش سے لہجے میں بولا۔

"انھیں تو خاصا تیز بخار ہے۔ کوئی دوا بھی دی گئی ہے انھیں۔" براہِ راست نہ سہی مگر وہ سلوطا سے ہی مخاطب تھا۔

"جی ہاں۔ صرف جوڑوں کے درد کی۔" اس نے مختصراً کہا۔

"بخار کی کیوں نہیں۔" تھوڑا سا غرا کر اس نے پوچھا۔

"کیونکہ بخار ابھی دو تین گھنٹہ قبل چڑھا ہے۔" وہ بھی درشتی سے بولی۔

"ہاں ہماری ممی کو تو اپنے فیشن اور ایکٹیویٹیز سے فرصت ہی نہیں، مگر ڈیڈی کو تو پلٹ کر دیکھنا چاہیے تھا مگر وہ بھی۔" وہ نہایت طنز سے اپنی بات کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"لیکن وہ بھی کیا کرتے۔ دعوتِ ولیمہ میں ان کی شرکت بھی تو بہت ضروری تھی۔" اس نے شعیب منصور کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہی۔

"میں نے آپ سے تو جواب طلب نہیں کیا تھا۔" وہ چٹخے ہوئے انداز میں بولا۔ تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

"یہ پھپھے پھوند رہے ہو بیٹا اس بچی سے بات کر رہے ہو۔" سلمیٰ بیگم نے آنکھیں کھول کر اسے ٹوکا۔

"تو کیا کروں۔۔ بے حسی کی انتہا ہے۔ سب مزے سے اپنے اپنے چکروں میں مصروف ہیں اور آپ یہاں تنہا پڑی بخار میں تپ رہی ہیں۔ کم از کم ڈیڈی ہی آپ کے پاس رُک جاتے یا پھر ممی اپنی لاڈلی بہنوں میں سے کسی کو آپ کے پاس چھوڑ دیتیں۔ مگر سوتیلی پن کے نہ رہنے۔"

"ارے ارے۔ یہ تم سوچتے ہو نہ سمجھتے ہو جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ شعیب نے تو خود ہی میری وجہ سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ زینت بھی بہت پریشان ہو رہی تھیں وہ سلطانہ کو میرے پاس چھوڑ کر جا رہی تھیں کیونکہ ان کی شرکت ضروری تھی۔ بلکہ نازش تو جانا ہی نہیں رہی تھیں مگر میں نے خود زبردستی ان سب کو بھیجا ہے۔ گھر میں ہی تو پڑی ہوں کسی سڑک کی فٹ پاتھ پر تو نہیں اور خدا خوش رکھے اس بچی کو یہ بھی تو میرے پاس موجود ہے۔ پھر خواہ مخواہ ہی اچھے دل سے برے دل کرنے۔" سلمیٰ بیگم نے دھیمی آواز میں اسے سمجھایا۔

"مگر یہ بچی بیچاری تو خود معذور ہے پھر آپ کی تیمارداری کیسے کر سکتی ہے۔" دادی کے سمجھانے کے باوجود بھی اسے تاؤ آتا رہا۔

"اے ہے خدا نہ کرے معذور کیوں ہونے لگی۔ اور پھر میں آخری دموں پر تو نہیں ہوں جو تیمارداری کراؤں گی۔ بیٹا بولنے سے

پہلے بات کو تول ضرور لیا کرو۔ سلوط نے تو مجھے دوا بھی پلائی ہے اور چائے بھی۔ کیونکہ خانساماں تو سب کے جانے کے بعد نہ معلوم کہاں غائب ہوگیا تھا اور نوکر چاکر باہر ہی کہیں ہوں گے۔ اصل میں تو سلوط کی ہی وجہ سے میں نے کسی کو نہیں روکا۔" درد اور بخار کی وجہ سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی پھر بھی سلمیٰ بیگم آہستہ آہستہ بولے ہی جا رہی تھیں۔ تب اس نے سلوط کی طرف دیکھا جو محض اس کی وجہ سے رُخ موڑے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی فطری شوخی عود کر آئی۔

"خیر یہ تو شاید ان کی عادت ہی ہے۔۔ یہ بھاگ بھاگ کر سب کی خدمت بجا لانا۔ سچ کہتا ہوں اماں جان پہلی مرتبہ انھیں دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ کام بڑھ جانے کی وجہ سے ممی نے کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے۔" گو اس کا لہجہ بھی شوخ سا تھا مگر اس کا شوخ سا فقرہ سلوط کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگیا۔ اس نے تیزی سے گردن موڑ کر شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ تلخ سا جواب دینا ہی چاہ رہی تھی کہ سلمیٰ بیگم نے اس سے کہا۔

"اے سلوط بیٹی تم اس نگوڑے کی کسی بات کا برا نہ ماننا۔ اس کی تو ہنسی میں بھدرک ہے نہ رونے میں۔ یہ تمھیں چھیڑنے کی غرض سے ہی کہہ رہا ہے۔ تاکہ تم چمک کر کوئی تیکھا سا جواب دو۔ چپکی بھی تو بیٹھی ہو نا اس قدر۔" تو وہ دادی کی بات پر وہ ہنس کر بولا۔

پھوپھا نے کہیں خاموشی کے مہر سے سیل پیکڈ تو نہیں کر کے بھیجا ان کا منہ۔ وہ خود بھی ہر وقت منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

"اے بس اب بند بھی کرو یہ چھیڑ چھاڑ۔ یہ بیچاری اگر میری وجہ سے خاموش بیٹھی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس پر چڑھ دوڑو۔" دادی نے ڈھکے ڈھکے انداز میں اسے تنبیہ کی۔ "نہیں اماں جان۔ ان پر چڑھ کر کیا پھسلنا ہے مجھے۔ دیکھ نہیں رہیں ان کا سر کتنا چکنا اور پھسلواں ہے۔" اس نے کچھ اس طرح سہمنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا کہ سلمیٰ بیگم کو اتنی بیماری میں بھی ہنسی آگئی۔ خود اس نے بھی رُخ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"اماں جان وہ۔ خیر آپ کی تو طبیعت ہی ناساز ہے۔۔ پھر۔ چھوڑیں جانے دیں۔" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر سر اور گدی پر کچھ اس طرح ہاتھ پھیرتا ہوا بولا جیسے کوئی بہت ہی خاص اور اہم بات ہو جسے کہنے سے وہ ہچکچا رہا ہو۔

"نہیں نہیں کیا بات ہے بتاؤ تو۔" سلمیٰ بیگم نے سر کا درد بھول کر انتہائی متجسس انداز میں پوچھا۔

"وہ کچھ زیادہ کھا لیا ہے نا اس لیے اوور سا ہو رہا ہوں۔ وہ کافی پینے سے معدہ میں رطوبت پیدا نہیں ہوتی نا مگر خیر چھوڑیں۔ اس وقت تو خانساماں بھی غائب ہے۔ پھر کون بنائے گا میرے لیے کافی۔"

"ارے اگر مجھ میں ذرا سی بھی ہمت ہوتی تو میں خود اُٹھ کر بنا دیتی۔ تم ایسا کرو کہ فرج سے کوک یا آئس کریم سوڈا نکال کر پی لو۔ دو چار ڈکاریں آکر طبیعت صاف ہو جائے گی تمھاری۔" دادی کو فوراً اس کی بات پر یقین بھی آگیا۔

"اجی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کوک وغیرہ سے تو سخت الرجک ہوں میں ویسے بھی سوڈا رطوبت کو بڑھاتا ہے۔" وہ دادی کے مشورے پر بدک سا اُٹھا۔ کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ شاید سلوط خود ہی اس کے لیے کافی بنانے پر آمادہ ہو جائے مگر وہ خاموش ہی بیٹھی رہی تو اس نے دادی کو ہی مخاطب کر کے کہا۔

"انھوں نے آپ کے لیے چائے بنائی تھی تو کیا یہ سر کے بل کچن تک گئی تھیں اب اتنی دیر سے کافی کے لیے تڑپ رہا ہوں تو ان کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اٹھ کر میرے لیے کافی ہی بنا لیتیں۔" لہجہ بھی جھاڑ پلانے کا سا تھا۔

"اے دیوانے تو نہیں ہوگئے تم۔ اتنی مشکل سے تو بیچاری کچن تک گئی تھی۔ اب خواہ مخواہ ہی اس کے سر ہو رہے ہو۔ پہلے تو کبھی کافی نہیں پیتے تھے تم پھر یہ آج کیا نئی سوجھی۔۔ اگر یہ تمھارے یہاں چند روز رہنے کے لیے آئی ہے تو ایسی کیا قیامت آگئی جو تم سب کے سب خوار کرنے پر تلے رہتے ہو۔" سلمیٰ بیگم کو بھی اس کی باتوں پر غصہ آگیا۔ انھوں نے اسے بُری طرح پھٹکارا تو وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوگیا۔

"ارے نہیں۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں اماں جان۔ میں تو انھیں اتنا خاموش دیکھ کر محض مذاقاً کہہ رہا تھا۔" اور پھر اس نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آئی ایم ویری سوری۔۔ سِل بیل وط۔۔" اور پھر باہر جانے لگا تو سلوط نے اسے پکارا۔

"سنیے۔" اس نے دروازے پر ہی رُک کر اس کی طرف دیکھا۔

"فرمائیے۔"

"وہ۔ میں ابھی آپ کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔ بس دو منٹ میں۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ اس کا دل تو چاہا کہ انکار کر دے لیکن وہ اس کے تیور دیکھ چکا تھا جو جلنے سے محفوظ رہ گئے تھے اس پر وہ اٹھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ پیر فرش پر رکھنے کی وجہ سے جسم کا سارا زور پیروں پر ہی پڑ رہا تھا اور اس کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے سرخ ہوگیا تھا۔ وہ اس کے قریب آکر بولا۔

"نہیں تھینکس اے لوٹ۔ بے حد شکریہ، مجھے کافی پینے کی بالکل خواہش نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں اور یہیں بیٹھی رہیں۔" اور اس اچانک تبدیلی پر اس نے تعجب سے اسفند کی طرف دیکھا، نگاہیں پھر چار ہوئیں تو چند لمحے ایک دوسرے میں اُلجھی رہیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"اس دل میں بڑا احترام ہے آپ کا بھی۔" لہجہ بھی بھاری سا ہو گیا تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو کر پیچھے ہٹا اور اُسے یوں ہی حیران و پریشان سا چھوڑ کر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

دعوتِ ولیمہ کے بعد تقریباً دو ہفتوں تک چالوں اور دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا تھا پھر نازپرور اپنے شوہر احمد سرور کے ساتھ ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ چلی گئی تو اس کے جانے کے بعد گویا حالات پھر معمول پر آگئے تھے۔

مہمان تو شادی کے چند روز بعد ہی اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے۔

گل بہار میں صرف سہیل منصور، ان کی بیوی نازش اور بیٹی کوثر ہی رہ گئے تھے لیکن سہیل منصور کا قیام بھی عارضی ہی تھا اصل میں وہ کراچی میں سیٹل ہونے کی غرض سے پورے سترہ برس بعد وطن واپس لوٹے تھے۔ اور اپنے لیے کراچی کے کسی معزز علاقے میں مکان خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بلکہ کوشاں تھے۔ جبکہ شعیب منصور کی خواہش تھی کہ وہ انہی کے گھر اقامت اختیار کریں لیکن سہیل منصور بھائی اور بھاوج پر اپنی رہائش کا بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے بہرکیف۔ ابھی تو وہ بھائی کے یہاں ہی قیام پذیر تھے۔ ان کے علاوہ سلمیٰ بیگم بھی جو بھائی کے پاس واپس جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں لیکن کچھ اس وجہ سے کہ غذا میں بدپرہیزی کی وجہ سے چونکہ ان کے جوڑوں کے درد میں اضافہ ہوگیا تھا اور اس عرصے میں وہ کافی علیل رہی تھیں اور کچھ اس لیے کہ اسفند ان کے بھائی کے یہاں واپس جانے کے حق میں نہ تھا۔ بلکہ کسی طور پر انھیں جانے ہی نہیں دیتا تھا اور اس کی خاطر سلمیٰ بیگم کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لیے انھیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی خوشی کی خاطر رکنا ہی پڑا تھا۔

اب ان کے لیے دے کے سلوٹ ہی رہ جاتی تھی۔

جسے گل بہار میں اس طرح دھرنا دے کر بیٹھنے کا کوئی حق تھا نہ خود اس کی طبیعت ہی گوارا کرتی تھی۔ لیکن اس کی مجبوری ہی کچھ ایسی تھی کہ یہ سارے احساسات رکھنے کے باوجود اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہیں رہنا پڑ رہا تھا۔

لیکن یہ مجبوری صرف اس لیے نہیں تھی کہ اس کے بھائی اور بھاوج ورلڈ ٹور پر گئے ہوئے تھے یا ان کے ورلڈ ٹور پر جانے کی وجہ سے چونکہ وہ گھر پر تنہا رہ جاتی اس لیے اسے کراچی بھیج دیا گیا تھا اور ان کے واپس لوٹتے ہی وہ بھی واپس چلی جاتی۔ بلکہ وہ تو کراچی میں مستقل اقامت کی غرض سے آئی تھی۔ اور یہی سوچ کر آئی تھی کہ کوئی معقول ملازمت ملتے ہی اپنی رہائش کا بھی بندوبست کرے گی۔ لیکن سروس ملنا تو کجا اسے تو ابھی تک ملازمت تلاش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا جس کی وجہ ایک تو اس کے پیروں کے زخم اور دوسری سلمیٰ بیگم کی علالت تھی۔

کیونکہ اپنے دکھتے ہوئے فگار پیروں کے ساتھ پوری تندہی سے سلمیٰ بیگم کی تیمارداری بھی کی تھی۔

یوں تو نازش، کوثر اور نیلما بھی سلمیٰ بیگم کا بہت خیال رکھتی تھیں اور ظاہرداری یا دکھاوے کے طور پر ہی سہی زینت اور نیلوفر بھی ان کی پوری پوری خبرگیری رکھتی تھیں۔ مگر ان کے پاس زیادہ دیر تک ٹکتا کوئی بھی نہ تھا۔

نازش اور کوثر گھر کی تلاش کے ساتھ ساتھ گھر کی زیبائش کے لیے نئی نئی چیزیں مہیا کرنے اور رشتہ داروں اور واقف کاروں سے ملنے ملانے کے سلسلے میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھیں۔ اور نیلوفر اور نیلما کالج چلی جاتی تھیں۔

سہیل منصور بھی بھائی کے ساتھ ان کے آفس اور کبھی اپنے کسی کام کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔

زینت کی بھی اپنی مصروفیات تھیں۔ صبح سے دن کے کھانے کے وقت تک گھریلو امور انجام دیتی ہیں۔

دوپہر سے سہ پہر تک آرام کرنے اور سہ پہر سے رات تک کا وقت بیرونی مصروفیات میں۔

شعیب منصور اور زینت کراچی جم خانہ کے ہی نہیں کراچی روٹری اور لائنز کلب کے ممبر بھی تھے اور دونوں میاں بیوی ہفتے میں ایک بار جم خانہ ضرور جاتے تھے اور خاص خاص موقعوں یا تقریبات پر تینوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

شعیب منصور گو کہ بہت روشن خیال اور ایڈوانس قسم کے انسان تھے۔ لیکن چونکہ اعتدال پسند تھے۔ اس لیے انھوں نے ان ساری بڑی تفریحات یا ایکٹیوٹیز کے لیے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ ایک کاروباری آدمی تھے اس لیے وہ ہر بات پر اپنی کاروباری مصروفیات کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

یعنی جس کلب میں بھی جاتے تھے اپنی کاروباری مصلحتوں کو ہی مدِنظر رکھ کر جاتے تھے اس لیے خصوصاً بیٹیوں کو کم ہی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

یوں بھی انھوں نے بیٹیوں کو ایک حد تک ہی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے تنہا کہیں نہیں بھیجتے تھے۔ البتہ سہیلیوں کے یہاں تقریبات میں شریک ہونے کی اجازت دے رکھی تھی باقی تو تمام معاملات اور تربیت کی ذمہ داری انھوں نے زینت کو ہی سونپ رکھی تھی۔ کہ ان کے خیال میں ماں ہونے کی حیثیت سے بیٹیوں کی تربیت وہی اچھی طرح کر سکتی تھیں۔ اس پر زینت کو ہمیشہ سے ان سے یہی شکوہ رہا تھا کہ انھوں نے ان کے ہوتے ان کے پہلوٹی کے بیٹے کو دادا اور دادی کی تحویل میں دے کر نہ صرف ناانصافی کا ثبوت دیا تھا بلکہ بیٹے کے سامنے ان کی اہمیت کو بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی وہ زینت کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ جوان سے کچھ زیادہ ہی روشن خیال تھیں اور یہی وجہ تھی کہ نازپرور جسے گھر میں بڑی اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ اور جو ماں کی دستِ راست تھی اس نے ماں ہی کے خیالات ذہنیت بلکہ عادات و مزاج جیسے دیگر ماں کی ہی صحبت کا گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اور نیلوفر جو نازپرور سے دو برس چھوٹی تھی بڑی بہن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔ ۔۔۔ اور ماں کے اشاروں پر چلتی تھی تاکہ گھر والوں کی نظروں میں بڑی بہن کی طرح اپنی حیثیت منوا سکے۔

اور ایسا شخص جو دوسرے کی ریس کرتا ہو یا دوسرے کے زیرِاثر رہتا ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔

نیلوفر کے مزاج میں گو طنطنہ بھی تھا اور زعم بھی۔ لیکن شخصیت میں جو ہلکا پن تھا وہ اس کی عادات اور خصلت کو نمایاں کرتا تھا۔

ماں اور بہن نے کسی کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا بس وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتی تھی۔ اونچا دیکھنے کی عادی تھی اس لیے اپنے سے اونچی حیثیت کے لوگوں سے مرعوب ہو جاتی تھی۔ بلکہ خود بھی بہت اونچا اڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ دوسرے معنوں میں خود پسند بھی تھی، یہی وجہ تھی کہ فیشن کی بھی بہت دلدادہ تھی اور بہت موڈرن بھی۔

ملبوسات بھی ایسے پہنتی تھی جو لیٹسٹ ڈیزائن کے ہوتے تھے اس کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ اور سہیلیاں بھی وہ دیکھ دیکھ کر یعنی متمول اور باحیثیت طبقے کی لڑکیوں کو ہی بناتی تھی۔ اور کالج کے بعد اس کا اکثر و بیشتر وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا گو ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے خود کو ایک پرتعیش اور آسودہ حال ماحول میں سانس لیتے دیکھا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں اولاد کے درمیان میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی تھی سب کے لاڈ و پیار ایک ہی پیمانے میں تول کر کیے جاتے تھے۔ یعنی کسی اولاد کے لیے یہ تاثر نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ دوسری اولادوں سے بہت منفرد، خوبصورت، نیک سیرت اور سعادت مند ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ سب کو اپنی انفرادیت کا احساس دلانے میں کوشاں رہتی تھی۔ جبکہ نیلما سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے خاص طور پر باپ کی بہت لاڈلی تھی دوسری بہنوں کے مقابلے میں خود اسفند بھی اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ زینت تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح اس سے پیش آتی تھیں اسے چونکہ ہر طرف سے لاڈ و پیار ہی ملا تھا اس لیے حد درجہ لاابالی ہونے کے باوجود خوداعتمادی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اس نے طبیعت بھی بہت سلجھی ہوئی پائی تھی اور دل بھی نرم، دادی سے بھی اسے دلی انسیت تھی۔ اسے آنکھ کھول کر ہر طرف سے

بیار راہی پیار ملا تھا اس لیے وہ بھی سب سے خلوص و محبت سے پیش آتی تھی اس پر مستزاد گھر کا ماحول بہت سلجھا ہوا تھا اور عمدہ تھا۔ ماں سے زیادہ وہ باپ سے متاثر تھی۔ اور انہی کا سا مزاج اور طبیعت پائی تھی۔ اس کے مزاج میں سادگی بہت تھی گویا مزاج اور خیالات میں وہ نیلوفر کی ضد ثابت ہوئی تھی۔

اس کے باوجود بھی چونکہ گھر کے ماحول میں ایک دوسرے سے محبت کرنی سکھائی گئی تھی اور نیلوفر اسے چاہتی بھی بہت تھی۔ اس لیے آپس کی کشاکشی اور ضد بحث کا دور تک گزر نہ تھا۔

بہرحال اب تو دونوں بہنیں اپنے اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروفِ عمل تھیں کیونکہ نازپرور کی شادی کی وجہ سے ان کی پڑھائی کا خاصا حرج ہوا تھا۔ ادھر سمسٹرز بھی سر پر آ گئے تھے۔ نیلوفر کا یہ بی اے کا فائنل ایر تھا وہ پڑھائی کے معاملے میں بھی خاصی ذہین تھی۔ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی پوزیشن بھی لاتی تھی جبکہ نیلما ایک دو مضامین میں کمزور تھی اور اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑ رہی تھی کچھ اس لیے بھی دادی سے اتنی انسیت ہونے کے باوجود اسے اُن کی تیمارداری کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اور نیلوفر کی تو بات ہی اور تھی اسے تو اگر موقع بھی ملتا تو چونکہ ماں کی طرح سوتیلے پن کے جراثیم اس کے ذہن میں بھی سرایت کر گئے تھے وہ دادی کی تیمارداری تو کیا خبر گیری تک رکھنے کی روادار نہ ہوتی۔

شعیب اور سہیل منصور نے تو کتنا چاہا بھی تھا کہ سلمیٰ بیگم کی دیکھ بھال اور خدمت انجام دینے کے لیے ایک نرس مقرر کر دیں لیکن خود سلمیٰ بیگم نے انہیں سختی سے ممانعت کر دی تھی۔

سلوط کسی کی زرخرید تو تھی نہ غلامانہ فطرت ہی رکھتی تھی وہ تو ایک انسانی فریضہ تھا دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے اور مدد کرنے کا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ جب مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے گھر میں کوئی کمرہ باقی نہیں رہا تھا تو زینت نے نازش سے کہہ کر سلوط کو اس کے سامان سمیت سلمیٰ بیگم کے کمرے میں منتقل کرا دیا تھا۔ اور چونکہ سلمیٰ بیگم اور وہ ایک ہی کمرے میں رہ رہی تھیں ——— وہ سلمیٰ بیگم کا خیال رکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور سلمیٰ بیگم کچھ اس وجہ سے بھی اس پر بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ اور ہر آئے گئے کے سامنے اس کی تعریفوں کے پل باندھتی رہتی تھیں اور یہ بات زینت کو بہت کھلتی تھی لیکن وہ ساس کو اس کی تعریف کرنے سے باز رکھ سکتی تھیں نہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ کہہ ہی سکتی تھیں ماسوا نیلوفر کے۔ کیونکہ شوہر اور دیورانی بھی سلمیٰ بیگم پر بہت مہربان تھیں۔ یوں بھی نازش بہت تعلیم یافتہ اور فراخ دل کی مالک تھیں۔ اس پر خوبصورت بھی بہت تھیں کچھ اس لیے بھی زینت ان سے مرعوب تھیں۔

یوں تو زینت کی سلوط سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔ البتہ چونکہ وہ ان کی نند کی نند تھی اس لیے اس سے ان کا کوئی رشتہ تھا نہ واسطہ۔ اور اسے اپنے گھر میں رکھ کر اپنی بہت سی گھریلو اور نجی باتیں اس پر عیاں کرنا انہیں بالکل گوارا نہ تھا۔ یا بصد مجبوراً اس کے گھر میں رہنے کی وجہ سے ان کی پرائیویسی میں خلل پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت محتاط رہتی تھیں۔ اس پر وہ قدرے وہمی بھی تھیں۔

نازپرور کی شادی پر جو تلخ واقعات رونما ہوئے تھے اس کا سبب وہ اسے ہی گردانتی تھیں۔ لیکن شوہر دیور اور ساس کی وجہ سے برملا کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ دل پر جبر کر کے انہیں سلوط سے خندہ پیشانی سے بات بھی کرنی پڑتی تھی اور اس کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا لیکن وہ مروتاً ہی اس سے بات کرتی تھیں۔

صبح کا ناشتہ تو عام تعطیل کے دن بھی سب علیحدہ علیحدہ ہی کرتے تھے اور یہی معمول کچھ دوپہر کے کھانے کا بھی تھا کیونکہ شعیب منصور اپنے پرائیویٹ آفس سے ڈھائی بجے کے قریب لوٹتے تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں کالج سے تین ساڑھے تین بجے کے قریب سہیل منصور بھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں تیسرے پہر تک لوٹتے تھے۔ البتہ نازش اور کوثر گھر میں موجود ہوتیں تو زینت ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتی تھیں ورنہ شوہر کے ساتھ ہی کھاتی تھیں۔ سلمیٰ بیگم کا پرہیزی کھانا پونے بارہ بجے ہی اُن کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا اور یوں سلوط کو بھی دوپہر کا کھانا زیادہ تر تنہا ہی کھانا پڑتا تھا۔ البتہ رات کے کھانے پر گھر کے تقریباً تمام افراد موجود ہوتے تھے۔ جس میں سلوط بھی شریک ہوتی تھی اور اسفند بھی جو نہ معلوم سارا دن کہاں غائب رہتا تھا۔ اور شام کو ہی واپس لوٹتا تھا۔

اس روز بھی سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

شعیب اور سہیل منصور آپس میں اپنے کاروبار کے متعلق کوئی گفتگو کر رہے تھے جس سے اوب کر زینت نے شوہر سے کہا۔

"یوں تو ماشاء اللہ گھر میں سب ہی موجود ہیں لیکن میری نازو کے جانے سے کتنی بے رونقی ہو گئی ہے کبھی یہ بھی نوٹ کیا آپ نے شعیب؟" بہت ہی اہم بزنس ٹاک (بات) انھوں نے قطع کی تھی۔ اس لیے شعیب منصور قدرے بیزاری سے جس میں لاپروائی بھی شامل تھی بولے۔

"ہاں کیا کیوں نہیں مگر یہ بھی ایک ریت ہی ہے اس لیے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"ہائیں کیا مطلب؟" اپنی بات کو یوں بے قدر ہوتے دیکھا تو زینت چمک کر بولیں۔

"مطلب یہی کہ لڑکیاں تو پیدا ہی اس لیے ہوتی ہیں کہ والدین کی بیس بائیس سالہ محنت پر پانی پھیر کر پرائی ہو جائیں والدین کو دکھ تو بہت ہوتا ہے لیکن اپنے ایک فرض کے پیشِ نظر دل پر صبر کی سِل رکھنی ہی پڑتی ہے۔"

"بھابی جان آپ صرف نازو کے جانے پر اتنا لونلی فیل (تنہائی محسوس) کر رہی ہیں ابھی تو آپ کو ان دونوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے۔ ان کے جانے کے بعد تو آپ بالکل ہی تنہا رہ جائیں گی۔" نازش بولیں۔

"ہاں واقعی، یہ خیال تو ابھی سے میرے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔" زینت نے دیورانی کی بات پر متفکر سے انداز میں کہا۔

"خیر پہلے سے پریشانی میں مبتلا ہونے سے سوائے ذہنی سکون برباد کرنے کے حاصل ہی کیا ہوگا جبکہ ابھی تو ان دونوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے میں بھی ایک مدت ہی درکار ہوگی۔" شعیب منصور بولے۔

"لیکن منجھلے ابا آپ کو کیسے معلوم کہ کتنی مدت درکار ہوگی، لڑکیوں کی قسمت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کہ کب نکل جائیں۔ یہ تو خواب دیکھتی بند آنکھوں کی طرح ہوتی ہے۔" نازش نے کہا تو شعیب منصور ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولے۔

"واہ۔ بہت خوب بڑی منطقانہ مثال دی ہے آپ نے نازش۔" تو سہیل منصور بھی ہنسنے لگے اور نیلوفر اور نیلما ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"لیکن چھوٹی دلہن کچھ غلط تو نہیں کہہ رہیں۔ واقعی لڑکیوں کی قسمت کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہوتا۔ اب نازو کی مثال تو سامنے ہی ہے۔ ایک دم ہی پیغام آیا منظور ہوا اور دو ماہ کے اندر اندر شادی بھی ہو گئی۔ جبکہ نازو کا ارادہ تو بہت کچھ پڑھنے کا تھا۔" زینت دیورانی کی بات کی تائید میں بولیں۔

"خیر خیر۔ یہ تو میں مانتا ہوں کہ شادی کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں ابھی کچھ سوچنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ ابھی تو انھیں آرام سے پڑھنے ہی دو۔"

شعیب منصور کو بیٹیوں کی موجودگی میں ایسی قیاس آرائیاں مناسب نہیں لگیں اس لیے انھوں نے یہ قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے کہا۔

"خیر یہ مسئلہ تو اپنی جگہ بھابی جان۔ آپ اسفند کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں گھر میں بہو کے آنے سے رونق ہی رونق ہو جائے گی۔" نازش اپنی دانست میں بہت دور کی کوڑی لائیں۔

"ہاں۔ واقعی رونق ہی رونق یعنی دو سے تین۔ تین سے چار گویا دیکھتے ہی دیکھتے ایک گلزار سا کھل اٹھے گا۔ گل بہار کی اس مہکتی ہوئی پھلواری میں۔" سہیل منصور نے ہنس کر لقمہ دیا تو اسفند کے سوا سب ہی ہنسنے لگے۔

"ارے بھیا ہماری تو یہ دلی تمنا ہے۔ ارمان ہے مگر ہمارے یہ بابا صاحب ہماری بات مانیں تب ہی نا۔" زینت حسرت زدہ سے لہجے میں بولیں۔

"ہوں۔ بات جب ماننے کی ہو رہی ہے تو آپ نے یقیناً انہیں کوئی لڑکی بھی دکھائی ہوگی۔" نازش نے قدرے معنی خیزی سے پوچھا۔

"ارے ایک دکھائی ہے۔ میں نے تو انہیں سینکڑوں لڑکیاں دکھا دیں مگر نہ معلوم ان کی پسند کیسی ہے جو ایک سے ایک بڑھ کر قابل حسین اور دولت مند لڑکی ان کے معیار پر پوری ہی نہیں اتری۔" زینت بولیں تو سہیل منصور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا جو لاتعلق سا بیٹھا نہایت خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔

"کیوں میاں صاحبزادے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" سہیل منصور نے رعب جھاڑنے کے سے انداز میں مذاق سا کیا۔

"درست ہی سن رہے ہیں چاچا میاں!" اس نے پلیٹ پر جھک کر آہستہ سے کہا تو نیلوفر، نیلما اور کوثر ہنسنے لگیں جبکہ شعیب منصور کو یہ جوابی فقرہ ذرا نہ بھایا۔ انھوں نے کانٹے میں تلی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا اٹکاتے اٹکاتے فہمائشی سی نظروں سے زینت کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں جبکہ سہیل منصور لاڈلے بھتیجے کے مذاق پر مسکراتے ہی رہے سہیل منصور سے وہ شروع ہی سے بہت بے تکلف تھا اور دادا کی گود میں پرورش پانے کی وجہ سے فاخرہ کی طرح وہ انھیں چھوٹے ابا ہی کہتا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی سہیل منصور اس کا کچھ زیادہ ہی لاڈ کرتے تھے۔

"اصل میں چھوٹے ابا۔ ممی اپنے معیار کے پیمانے میں میری پسند کو تولنا چاہتی ہیں۔ نازو کی دعوتِ ولیمہ میں جو بھی خوبصورت بلکہ قبول

لڑکی نظر آتی تھی اس کی طرف میری توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتیں۔ حد تو یہ تھی کہ مجھے حسینوں مہ جبینوں کے جھرمٹوں میں بھی کھینچ کر لے گئیں جبکہ یقین جانیے حرم رکھنے کا مجھ میں بوتا نہ تھا نہ ارادہ۔" اور سب جو نہایت خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سُن رہے تھے آخری فقرے پر انھیں بے ساختہ ہنسی آگئی۔ حتیٰ کہ شعیب منصور بھی جو اپنے سامنے اس کے اس قدر بے باکی سے بات کرنے پر جز بز ہو رہے تھے مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

"ہونہہ: میں اچھی طرح جانتی ہوں یہ تمھارے سارے عذر بہانے ہیں۔" زینت فوراً ہی سنجیدہ سی شکل بنا کر بولیں۔

"چلیے اگر آپ کو معلوم بھی ہے تو پھر کسی نہ کسی نہج پر پہنچنے کی کوشش کیجیے ممی یعنی دولت کی ریل پیل میں کھیلتی حسین تعلیم یافتہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کیجیے۔ کیونکہ یہ ساری صفات کسی ایک ہستی میں تو جمع ہو نہیں سکتیں۔ اور ہوں بھی تو پھر اس کے دماغ اونچے ہوں گے یا اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے پس ماندہ ہوگی۔ یوں بھی ٹوبی ویری فرینک ممی مجھے نمائشی چیز نہیں چاہیے۔ بلکہ اور بخل ہوتی ماتھا اینڈ دومائی اپولوجیز سر (اور معذرت کے ساتھ جناب) میں آپ سے یہ کہوں گا کہ ان لوگوں کے مجبور کردینے پر ہی میں آپ کے سامنے اتنا بول گیا ہوں۔" اس نے آخر میں باپ سے اپنی بے باکانہ گفتگو پر معذرت کی۔

تو شعیب منصور بولے "لیکن مجھے تمھاری صاف گوئی سے زیادہ تمھارے خیالات سن کر خوشی ہوئی ہے۔"

"شکریہ ڈیڈی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"لیکن بھائی جان کے خیالات سن کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود اپنا لائف پارٹنر (جیون ساتھی) سلیکٹ (منتخب) کریں گے۔" نیلوفر بولی۔

"خیر، لائف پارٹنر تو انسان کو خود ہی سلیکٹ کرنا چاہیے کیونکہ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔" نیلما بولی۔ بیٹیوں نے اس معاملے میں دخل دینا شروع کردیا تھا اس لیے شعیب منصور نے موضوع بدلنے کی غرض سے سلوط سے پوچھا۔

"کہو اب تمھارے زخم کا کیا حال ہے سلوط۔ کرنل حسن کے علاج سے کچھ افاقہ بھی ہوا۔"

تو وہ جو اپنے ہی کسی خیال میں گم چپ چاپ کھانا کھا رہی تھی چونک کر بولی۔

"جی۔ جی ہاں۔ افاقہ تو بہت ہوا ہے بس سیدھے پیر میں تھوڑا سا زخم رہ گیا ہے۔"

"بھئی تم کچھ کھاؤ تو سہی۔ بہت تکلف سے کام لیتی ہو۔" نازش نے اسے کھانا کھاتے نہیں بلکہ چکھتے دیکھ کر اس کی طرف مٹر پلاؤ کی ڈش بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے شکریہ کہہ کر تھوڑا سا پلاؤ اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

"تکلف نہیں کرتیں بلکہ شرماتی ہیں یہ سلوط آپا۔ جب بھی اندر جا کر کھانا لگ جانے کی اطلاع دو تو یہ شرما کر کچھ ایسا ظاہر کرتی ہیں جیسے انھیں کھانے کے لیے نہیں بلکہ کسی کو دکھانے کی غرض سے بلایا جا رہا ہو۔" نیلما بولی تو ایک قہقہہ پڑا اور شرم کی سرخی نے اس کے رخساروں پر گلال سا چھڑک دیا۔

"بھئی، شرمانے کی کیوں، نہیں سیدھے سادے ماحول کی پروردہ بچی ہے لیکن ہم بھی تمھارے لیے غیر نہیں۔ تمھاری بھابی کے بھائی ہی ہیں۔ تم کسی قسم کا بھی کوئی تکلف نہ برتا کرو۔" شعیب منصور نے اسے جھینپتا اور شرماتا دیکھ کر گویا حوصلہ دیا۔

"اصل میں یہ تکلف سے نہیں غیریت سے کام لیتی ہیں، حالانکہ ہمارے ساتھ ہی رہنے کے ارادے سے آئی ہیں۔ انھیں تو اس ایک ماہ کے عرصے میں سب سے گھل مل جانا چاہیے تھا مگر یہ تو ڈھنگ سے کسی سے بات ہی نہیں کرتیں۔" زینت کا لہجہ گلہ آمیز ضرور تھا مگر اس میں جو گہرا طنز چھپا ہوا تھا اسے تقریباً سب ہی نے محسوس کیا۔ اور شعیب منصور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ سلوط خود بول اٹھی۔

"نہیں خیر، میں غیریت تو بالکل نہیں برتتی بھابی جان! اور جہاں تک یہاں رہنے کا سوال ہے تو میں آپ کے یہاں مستقل رہنے کی غرض سے تو نہیں آئی۔"

"اچھا۔ مگر میں نے تو سنا تھا کہ تم یہاں کراچی میں سروس کرنے کے ارادے سے آئی ہو۔" نازش نے پوچھا۔ تو مٹھاس پلیٹ میں ڈالتے ہاتھ روک کر شعیب منصور نے پوچھا۔

"یہ آپ نے کس سے سنا چھوٹی دلہن۔" تو نازش کچھ سٹپٹا سی گئیں۔ اور گلاس سے ایک دو گھونٹ پانی پینے کے بعد انھوں نے کہا۔

"وہ شاید اماں جان اس روز کچھ ذکر کر رہی تھیں۔" صاف ظاہر تھا کہ بات بنائی گئی ہے۔ شعیب منصور زینت کی طرف دیکھ کر خاموش سے ہوگئے۔

"لیکن آپ نے کچھ غلط تو نہیں سنا بھابی دلہن!" فاخرہ اپنے رشتہ داروں کو جن ناموں سے پکارتی تھیں سلوط بھی وہی نام لیتی تھی۔ "میں سروس کرنے کی غرض سے ہی کراچی آئی ہوں۔ رہائش کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے بھابی جان نے مجھے یہاں بھیج دیا لیکن مجھے سروس ملتے ہی میں اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کرلوں گی۔" سلوط نے یہ کہہ کر گویا زینت کو اپنی رہائش کے بارے میں اطمینان دلایا۔

"آ۔ اچھا۔ گویا کہیں علیحدہ رہنے کا ارادہ ہے تمھارا۔ مگر جانتی بھی ہو کہ علیحدہ رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یا کیسی ابتری چھائی ہوئی ہے چاروں طرف۔ کہ اچھے اچھے اپنی جانوں اور عزتوں کی حفاظت کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں اور تم تو ایک کمزور سی لڑکی ہو۔" شعیب منصور کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور نصیحت بھی۔

"لیکن تنہا رہنے کا تو میں بھی تصور نہیں کرسکتی منجھلے ابا۔ البتہ کسی ہوسٹل یا بورڈنگ میں تو جگہ مل ہی جائے گی۔ وہاں تو تنہائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔" شعیب منصور کے اونچ نیچ سمجھانے کے باوجود اس نے کہا۔

"تم چونکہ یہاں رہ رہی ہو تو ایک طرح سے میری ذمہ داری بن گئی ہو لہٰذا جب تک غائب ورلڈ ٹور سے نہیں لوٹتے تم اپنے سروس کے ارادے کو ترک ہی کردو۔" شعیب منصور اس کے جواب پر برا مان کر بولے۔

"لیکن منجھلے ابا۔ بھائی جان کی اجازت کے بغیر تو میں گھر سے بھی قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ اُن سے سروس کرنے کی اجازت لے کر ہی آئی ہوں۔" سب کے سامنے بالخصوص اسفند کے سامنے وہ اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے جھینپ رہی تھی پھر بھی اسے کہنا ہی پڑا تھا۔

"خیر۔ خیر۔ سروس بھی کرلینا ایسی جلدی کیا ہے۔ یوں بھی سروس ملنی اتنی آسان نہیں جتنی تم سمجھ رہی ہو۔" شعیب منصور نے ٹالنے کا سا انداز اپنایا۔

"لیکن کس قسم کی سروس چاہتی ہیں آپ۔ آئی مین۔ آپ کے پاس کسی کام کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے یا کوئی تجربہ بھی رکھتی ہیں آپ۔" نیلوفر نے پوچھا۔

"نہیں، تجربہ تو نہیں رکھتی کیونکہ پہلے کبھی کام کرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ البتہ سرٹیفکیٹ ضرور ہے میرے پاس ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ میں مہارت رکھنے کا۔" سلوط نے نہایت سادگی سے بتایا تو نیلوفر چہرہ جھکا کر ہنسنے لگی۔ کوثر اور نیلما کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

"کیوں تم نے کیا تعلیم حاصل نہیں کی؟" زینت نے کسیلے سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، بس انٹر سائنس ہی کیا ہے مگر اسے میں تعلیم نہیں سمجھتی۔" سلوط نے بتایا۔

"لیکن آگے کیوں نہیں پڑھا تم نے؟" سہیل منصور نے پوچھا تو اس نے ایک نظر زینت پر ڈال کر آہستہ سے کہا۔

"بھائی جان نے مزید کچھ پڑھنے کی اجازت ہی نہیں دی اور کالج سے اٹھوا لیا۔"

"اوہ یہ تو بڑی زیادتی کی تم پر انھوں نے۔" سہیل منصور بولے۔

"پھر کسی ڈیسنٹ جاب کا تو خیال ہی چھوڑ دیجیے۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ اسٹینوگرافر کی جاب مل سکتی ہے لیکن یہ اسٹینو اور ٹائپسٹ کی جابس تو بڑی چیپ (گھٹیا) ہوتی ہیں۔" نیلوفر نے قدرے حقارت سے کہا۔

"خیر خیر یہ جاب واب کے معاملے میں ابھی سے کریٹیسائز کرنے کی کیا ضرورت ہے جب اس کا موقع آئے گا تبھی دیکھا جائے گا۔" سہیل منصور نے کہا۔

کھانا تقریباً سب کھا ہی چکے تھے مٹھاس کا دور چل رہا تھا۔ بلکہ مٹھاس بھی کھالی گئی تھی لیکن چونکہ بڑے ابھی تک بیٹھے ہی تھے اس لیے لڑکیاں بھی ـــ ایٹی کیٹ نباہ رہی تھیں کہ ادب و آداب اور اخلاق کی رو سے جب تک بڑے کھانا کھا کر نہیں اٹھتے کھانا کھا چکنے کے باوجود چھوٹوں پر ان کا ساتھ دینا لازم ہوتا ہے۔ البتہ کوئی جلدی میں ہو یا میز سے اُٹھنا چاہ رہا ہو تو معذرت کرکے اُٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ اسفند نے بھی یہی کیا۔ وہ ایکسکیوزمی کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شعیب منصور بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اُٹھتے ہی اور سب بھی اٹھ گئے۔

سلوط اپنے رہائشی کمرے میں آئی تو سلمیٰ بیگم سو چکی تھیں۔ وہ اب روبصحت تو ہوگئی تھیں لیکن کمزوری باقی تھی اس لیے جلد ہی سو جاتی تھیں۔ جبکہ اس وقت تو نو بھی بج چکے تھے۔

آتے ہی وہ ان کی وجہ سے دبے پاؤں چلتی ہاتھ دھونے کی غرض سے غسلخانے میں گھس گئی تھی۔ واپس پلٹی تو اس کی نظر اسفند پر پڑی جو سلمیٰ بیگم پر جھکا شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہیں یا سچ مچ سو رہی ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر دروازے کی دہلیز پر ہی ٹھٹک گئی تھی۔

گو اس روز کے بعد سے متعدد بار اس سے سامنا ہوا تھا اور وہ اس کی موجودگی میں اس کمرے میں بھی آیا تھا۔

مگر اس وقت جب گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کمرے میں موجود ہوتا۔ وہ بھی دن کے وقت۔ اوّل تو وہ دادی کے پاس زیادہ ٹکتا ہی نہ تھا۔ اور جو اگر تھوڑی دیر کے لیے تک بھی جاتا تو سلوط خود اٹھ کر کسی نہ کسی بہانے کمرے سے نکل جاتی تھی، جانے کس وجہ سے اور کیوں وہ اندر ہی اندر اس سے خوفزدہ سی رہتی تھی۔

جبکہ وہ اسے یہ بھی باور کرا چکا تھا کہ اس کے دل میں اس کا بہت احترام ہے۔

پھر بھی وہ اس سے کتراتی۔ اجتناب احتراز برتتی تھی حالانکہ وہ خود بھی سامنا ہو جانے پر اس کی طرف رُخ نہ دیتا بلکہ دوسرے معنوں میں اس کی موجودگی کو نظرانداز کر دیتا تھا۔ کہ یوں بھی سلوط سے اس کا کوئی ایسا رشتہ تھا نہ تعلق جس کی بنا پر وہ اس سے کوئی بات کہتا یا نبھاتا۔ اور اسی خیال کے تحت وہ اس کی بے رُخی اور لاتعلقی کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اور آج وہ نہایت خاموشی سے اندر آگیا تھا۔ جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کی دادی کے کمرے میں ہی رہتی ہے۔ اسے کم از کم بتا کر تو آنا چاہیے تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب سے پہلے یہی ناخوشگوار سا خیال سلوط کے ذہن میں سرسرایا تھا۔ اور کچھ کھانے کی میز پر کچھ دیر قبل جو گفتگو ہوئی تھی اس کی وجہ سے بھی وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اور غسل خانے میں واپس جانے کے لیے گھومی ہی تھی کہ جھکے جھکے اس نے کہا۔

"چھپنے کی کوشش بے سود ہوگی کیونکہ میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔" تو وہ وہیں ساکت سی ہو کر رہ گئی۔

"اصل میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اندر موجود ہیں ورنہ کم از کم کھنکار کر ہی اپنی آمد سے آپ کو باخبر کر دیتا۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا مگر سلوط جواب میں خاموش ہی رہی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ قدم بڑھا کر اپنے بیڈ کے قریب جا کھڑی ہوئی جو کمرے کی دوسری سمت میں پڑا تھا۔

"ویسے بائی دی وے کیا پھوپھا کا دیوالیہ تو نہیں نکل گیا جو اپنا نقصان پورا کرانے کے لیے انھیں آپ سے سروس کرانے کی ضرورت پڑ گئی۔" اس نے قدم بڑھا کر اس سے تھوڑے فاصلے پر رُک کر پوچھا۔ لہجہ کٹیلا ہی نہیں بہت اہانت آمیز سا بھی تھا۔ اس نے گھوم کر برہم سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔

"نہیں، خدا نہ کرے بھائی جان کا دیوالیہ کیوں نکلنے لگا۔ وہ تو میں خود اپنے شوق اور مرضی سے سروس کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟ آخر آپ پر ایسی کیا اُفتاد پڑ گئی ہے جو آپ ایک حقیر سی جاب کرنا چاہتی ہیں۔" اس کے جواب پر وہ تلملا کر بولا۔ تو اس نے تیوری چڑھا کر انتہائی تیکھے انداز میں پوچھا۔

"اور کیا میں بھی یہ پوچھ سکتی ہوں کہ انٹی ہارش لینگویج (بُری زبان) بولنے کا حق آپ کو کس نے دیا۔"

"اسی احترام نے جو آپ کے لیے میرے دل میں ہے۔" وہ یوں بولا جیسے پہلے سے ہی اس کے سوال کا جواب تیار کر رکھا ہو۔ اس جواب پر سلوط نے متعجب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر پلکوں کے ساتھ ساتھ چہرہ تھوڑا سا جھکا کر بولی۔

"اگر یہ آپ کا کوئی مذاق بھی ہے تو میں خود کو اس کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔"

"ہائیں کیا مطلب ہے تمھارا؟ یعنی آپ کا کیسا مذاق۔" اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر متعجب سے انداز میں پوچھا۔

"مطلب یہی کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچائی ہے نہ کوئی مذاق ہی کیا ہے۔ وہ تو محض اتفاق ہی تھا۔ میں اپنی دھن میں نیچے آرہی تھی کہ اچانک میرا پیر رپٹ گیا اور... اور..."

"مگر یہ اچانک پیر رپٹ جانے کا حادثہ کیسے وقوع پذیر ہوا تھا؟" اس نے اس کی بات کاٹ کر رعونت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اب وہ صاف صاف یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمھیں دیکھ کر یا تم سے ڈر کر۔ جواب سوچ کر بولی۔

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم مگر ہوا کچھ ایسا ہی تھا۔"

"سچی بات کہتے ہوئے ڈرتی ہیں نا آپ کہ مجھ سے خوفزدہ ہو گئی تھیں۔" وہ کھٹکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ خوفزدہ کیوں ہونے لگی تھی آپ سے۔" وہ سپٹا کر بولی۔

"اچھا تو پھر مجھے دیکھ کر وہ ہی انگلیاں کاٹنے کا محاورہ صادق آگیا ہوگا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کے اچانک لہجہ بدل لینے پر اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ کہنا چاہ رہی تھی "نہیں۔ لیکن لفظ میں چاہ رہی ہوں تو بُری طرح بوکھلا اٹھی۔

"اب تو کہہ دیں کہ ہاں۔" وہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو کر بولا۔ مگر جواب میں وہ ہونٹ بھینچے کھڑی رہی۔

"وہ جو کہتے ہیں شاعر لوگ کہ خاموشی خود ایک جواب ہوتی ہے تو کیا میں یہی سمجھ لوں۔" وہ تھوڑا سا اس کے نزدیک ہو کر بولا تب قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"اگر سمجھ لیں تو فرق ہی کیا پڑے گا۔"

"یہ فرق ورق کی بات آپ کی نہیں میرے سوچنے کی ہے۔ اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس وقت بھی مجھ سے خوفزدہ نظر آرہی ہیں۔" تو اس کا دل چاہا کہے کہ میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ جانے کیوں تمھیں دیکھ کر مجھ پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہے۔ اور کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ بھی دیتی لیکن کہنے کے بعد اس کے طرح طرح کے سوالوں کا جواب دینا اس کے لیے مشکل ہی ہو جاتا۔

"ارے یہ تم کس بات پر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو اس بے چاری بچی کے۔" سلمیٰ بیگم جو شاید اس کی آواز سے جاگ گئی تھیں اور کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔ انھوں نے سیدھا ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش میں سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"افوہ تھوڑی دیر اور سو لیتیں۔ یہ عین کلائمکس پر آکر ہی آپ کی آنکھ کھلنی رہ گئی تھی۔" وہ کوفت کے عالم میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا ان کے بیڈ کی طرف بڑھا تو انتہائی سنجیدہ ہونے کے باوجود سلوط کو ہنسی آگئی جسے اس نے فوراً ہی ضبط کر لیا۔

"ہائیں کیا کہہ رہے ہو میاں؟" سلمیٰ بیگم نے اس کے بڑبڑانے پر پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں جان۔ میں ان سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے ہوتے ڈیڈی نے آپ کا علاج دوسرے ڈاکٹر سے کرا لیا ہے۔ وہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے نا شاید اسی لیے۔" وہ سلمیٰ بیگم کے قریب جا کر بولا۔

"ارے نہیں۔ تم چار برس ولایت میں گھاس کاٹ کر تو نہیں آئے وہ تو تم چونکہ سوات گئے ہوئے تھے اور تمھارے پیچھے میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اسی لیے شعیب نے کرنل حسیٰ کو بلا کر دکھا دیا تھا۔ اس لیے انہی کا علاج ہوتا رہا۔" سلمیٰ بیگم سمجھیں کہ وہ ان سے شکوہ کر رہا ہے۔

"لیکن میں ان کا علاج تو کر سکتا تھا نا اور یہ شرطیہ کہتا ہوں کہ ان کے پیر کا زخم کب کا بھر چکا ہوتا۔ اور یہ کرنل حسیٰ سے علاج کرا کے اب تک طوطا نہ پالتیں۔"

"اے تو اس بے چاری کی اس میں کیا خطا۔ کرنل حسیٰ کو تو تمھارے باوا نے بلا کر دکھایا تھا۔" سلمیٰ بیگم اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"یہ لفظ بے چاری ان کی کنیت ہے یا عرفیت یا پھر ولدیت اماں جان۔" اس نے ان کے سلوط کو بے چاری کہنے پر کچھ چڑ کر پوچھا۔

"اے تمھیں ایسی کیا پرخاش ہے اس غریب بچی سے جو تم ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔" سلمیٰ بیگم تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔

"اچھا تو یہ غریب بھی ہیں چلیے ایک صفت اور معلوم ہو گئی ان کی بے چاری اور غریب شاید اسی لیے نوکری کر کے دولت مند بننا چاہتی ہیں مگر پھر بھی انگور کھٹے ہی رہیں گے۔ کیونکہ نوکری سے جو حاصل کیا جاتا ہے وہ جیب خرچ کے برابر ہی ہوتا ہے لاٹری کا جیتا ہوا ٹکٹ نہیں۔" وہ چونکہ اپنے بیڈ کے پاس کھڑی تھی ——— اس لیے اسے سنانے کو اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ تو سلمیٰ بیگم اسے آنکھیں دکھاتی ہوئی بولیں۔

"اے واہ جس کا معاملہ ہے وہ خود جانے تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔"

"ایک خیرخواہ۔" وہ دادی کی خفگی کو نظرانداز کر کے متانت سے بولا۔

"ہونہہ! بڑا آیا ہے نکل کے خیرخواہ۔ وہی مثل ہوئی کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔" سلمیٰ بیگم جل کر بولیں۔

"بڑی خالہ نہیں چھوٹی پھپھو کی ڈپلیکیٹ آخر یہ میری پھپھو کی نند ہی تو ہیں نا۔" اس نے کچھ اتنی برجستگی سے کہا کہ سلمیٰ بیگم کو بھی ہنسی آگئی۔

"اچھا بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھ کر بات کرو۔ یہ کھڑے کھڑے منہ چھوانے کیوں آجاتے ہو۔ اور آج کیا خاص بات ہو گئی جو اس وقت رات کو نکل کے آئے ہو۔" سلمیٰ بیگم نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔

"لیجیے اب آپ کی خیریت پوچھنے رات کو آگیا تو پوچھا جا رہا ہے کہ کیا خاص بات ہے۔ یوں بھی چھٹا انا ہونے کے بجائے شاید آپ نے بے دھیانی میں منہ چھوانے کا محاورہ استعمال کیا ہے۔" وہ بھی ایک چالاک تھا۔ ان کی اصل بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے بات ہی گھما دی۔

"اے چل زیادہ باتیں نہ بنا۔ میں خوب جانتی ہوں تجھے یہ ساری مجھے بے وقوف بنانے کی باتیں ہیں۔ ورنہ دل ہی کب چاہتا ہوگا تیرا میرے پاس آکر گھڑی دو گھڑی بیٹھنے کو۔" سلمیٰ بیگم بھی آخر اس کی دادی ہی تھیں اور اس کے رگ و ریشے سے واقف انھوں نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"نہیں خیر دل تو بہت کچھ چاہتا ہے میرا۔ لیکن آجکل مصروفیت ہی کچھ ایسی ہے کہ سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔" وہ دادی کے پاس بیٹھتا ہوا مسمسی سی صورت بنا کر بولا۔

"کیوں ایسے کیا ہل جوتنے پڑنے ہیں تمھیں آجکل۔ اور اگر ایسی ہی مصروفیت تھی تمھاری تو کیا میرا اچار ڈالنے کے لیے تم نے

مجھے روکا تھا۔" سلمیٰ بیگم اس کے عذر تراشنے پر چمک کر بولیں۔

"لیجئے بھلا کہیں کسی انسان کا بھی اچار پڑتے سنا ہے آج تک۔ شاید اتنا بڑا تو مرتبان بھی کسی نے ایجاد نہیں کیا ہوگا آج تک۔" وہ ان کی بات ہنسی میں اُڑاتا ہوا بولا۔

"ہونہہ بھاڑ میں جائے یہ آج تک اور کل تک۔ تم تو بس مجھے اشرف کے یہاں پہنچا آؤ۔ یوں بھی ابھی اتنی معذور نہیں ہوئی ہوں کہ اپنے پیروں سے چل پھر نہ سکوں۔"

"پیروں سے تو خیر ہر انسان خود ہی چلتا ہے لیکن آپ کو آخر تکلیف کیا ہے جبکہ میں نے اپنے طور پر آپ کو ہر طرح کا آرام مہیا کر رکھا ہے۔ ڈیڈی ممی بھی آپ کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں پھر آخر آپ چھوٹے نانا کے یہاں جانے پر بضد کیوں ہیں؟"

"کیونکہ تمہارے گھر کے اصولوں اور قاعدوں سے میرا دم گھٹتا ہے۔ اور بقول تمہارے خیال تو میرا سب ہی رکھتے ہیں مگر جیسے لگے ہیں وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ یوں بھی ایک طرف پڑے پڑے تو چیز بھی جل جاتی ہے میں تو پھر انسان ہوں اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرا دل کیسا وا ہی ہے۔ تنہائی تو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔" سلمیٰ بیگم یوں بولیں جیسے سخت عاجز ہوں۔

"لیکن یہ سلوط بھی تو آپ کے کمرے میں ہی رہتی ہیں اماں جان پھر تنہائی کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔" وہ انہیں کسی طرح قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"اے یہ غریب تو کچھ فطرتاً ہی کم گو اور بے زبان ہے۔ اور پھر میری ہم عمر تو نہیں ہے کہ میرے پاس بیٹھ کر باتیں بناتی رہے۔"

"او ہو صرف باتیں بنانا ہی تو تنہائی کا علاج نہیں اماں جان، بس دوسراہٹ کا احساس ہی بہت ہوتا ہے۔ لیکن آپ تو کسی نہ کسی طرح بھائی کے یہاں جانے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہیں۔ اصل میں سگے رشتوں کے سامنے باقی رشتے ہیچ ہی ہوتے ہیں۔ خیر آپ اطمینان رکھیں میں کل ہی کریم کے ساتھ آپ کو ملتان بھیج دوں گا۔" وہ دادی کو قائل نہ کر سکا۔ بلکہ انہیں جانے سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو منہ پھلا کر بولا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو اب بات نہیں بن سکی تو تیہا دکھانے لگے۔ ورنہ میں تمہاری ہی خوشی خاطر کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو یہاں آئی تھی اور اب تمہارے ہی اصرار پر یہاں رُک بھی گئی ہوں تو اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ تم مجھے کباڑ کا مال سمجھ کر بھول ہی جاؤ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی بھی یہاں میرے رہنے سے خوش نہیں۔" سلمیٰ بیگم اصل بات آخر زبان پر لے ہی آئیں۔

"کوئی خوش نہیں تو آپ کو کسی کی پرواہ کرنے کی کیا ضرورت ہے اماں جان۔ آپ یہاں میرے منہ اور میرے دم سے رہ رہی ہیں اور یہ "گل بہار" میرا ہے۔ سردار محمد اسفند کی ذاتی ملکیت۔ اور آپ کے سوا میرا اور کس کا ہو سکتا ہے۔ آپ تو ٹھاٹھ سے سب پر حکم چلایا کریں اور پیر پسار کر آرام سے سویا کریں اور بس۔ اور یوں بھی بیٹے کا گھر چھوڑ کر بھائی کے گھر میں رہنا تو مناسب نہیں۔" پھر دادی کو ایک مدلل جواب دے کر وہ سلوط سے مخاطب ہو کر بولا۔ جو ابھی تک اس کی طرف پشت کیے نہ جانے کیا کر رہی تھی۔

"پلیز سلوط ذرا آپ بھی اس بات کا خیال رکھا کریں کہ اماں جان کو تنہائی کا احساس نہ ہونے پائے۔" مگر اس کی طرف مڑنا تو کجا سلوط نے اس کی بات کا جواب تک نہ دیا۔

"کیا سنا نہیں آپ نے میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"ہائیں ہائیں یہ کیا معقولیت ہے۔ اگر اس نے سن بھی لیا ہے تو جواب دینا کوئی ضروری تو نہیں۔" سلمیٰ بیگم نے فوراً اسے ٹوکا۔

"واہ یہ بھی خوب ہے سوال ان سے کروں اور جواب آپ دیتی ہیں کیا ان کی زبان کٹی ہوئی ہے جو خود بول نہیں سکتیں۔" وہ تُرخ کر بولا۔ تو سلوط جسے اس کے لب و لہجے پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ تیزی سے اس کی طرف گھومی۔

"دیکھیں بہت ہو گیا اب میں مزید آپ کی ــ" تو نہایت بے باکی سے اس نے اس کی غصے سے تپتی آنکھوں میں دیکھ کر اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر آپ نے سروس کر لی تو بہت کچھ ہو جائے گا۔"

"ہیں وہاٹ ڈُو یُو مین بائی آل دِس (یہ سب کہنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟)"

وہ سخت برہمی کے عالم میں اس سے نگاہیں ملاتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ آپ سروس کرنے کا خیال بالکل ترک کر دیں۔" وہ اس کے غصے کا نوٹس لیے بغیر متانت سے بولا۔ اس کی نگاہیں بھی عجیب سا تاثر سمیٹے ہوئے تھیں۔ اس نے پلکیں جھکا کر حیرت زدہ سی کیفیت میں پوچھا۔

"مگر کیوں ترک کر دوں۔؟"

"کیونکہ یہ میری خواہش ہے۔ بلکہ۔ درخواست ہے۔"

"درخواست؟" اس نے بلا آواز نکالے اس لفظ کو دہرایا۔ تو وہ اس کے لبوں کی ـــــ جنبش پر نگاہیں مرکوز کر کے بولا۔

"ہاں یہ میری درخواست ہی ہے۔" اور وہ اس کے اس جملے میں ہی اُلجھ کر رہ گئی۔

"دیکھیں انٹر سائنس کر لینے کے بعد آپ کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا نا۔ تو چلیے میں کل ہی آپ کو کسی اچھے سے کالج میں داخلہ دلوا دیتا ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" وہ اس کے خوبصورت اور روشن چہرے کو اپنی جوشیلی سی نظروں کے حصار میں لیتا ہوا بولا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی جواب سوچتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

"اس کا فیصلہ بھی بھائی جان کی واپسی کے بعد ہی ہو سکے گا۔" ایک تو چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ اس پر کہنے کا انداز بھی تانے کا سا تھا جبکہ وہ اس سے مثبت جواب کا متوقع تھا اور بہت ہی پُرامید نظر آ رہا تھا۔ جواب میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"ہاں ہاں، خواہ مخواہ کیوں اس کی جان کو آ گئے ہو۔ مشرقی ماحول کی دبی دبائی بچی ہے۔ بھائی کی اجازت کے بغیر بھلا کچھ کر سکے گی۔" تو اسفند نے جھرجھری لینے کے سے انداز میں آہستہ سے کہا۔

"افوہ! یہ اماں جان کی قوتِ سامعہ تو کچھ غیر معمولی حد تک اسٹرانگ ہے۔ ورنہ میں تو یہی کچھ سمجھ رہا تھا کہ میری گفتگو کا ایک لفظ بھی ان کے پلے نہ پڑ رہا ہوگا۔" تو سلوط کا دل چاہا کہ کہے اتنی اونچی آواز میں بولنے پر تو برابر والے کمرے میں بیٹھ کر بھی آپ کی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ یہ تو ایک ہی کمرہ ہے۔ مگر اس سمے اس کا ذہن کچھ ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ کوئی خیال بھی ذہن میں جگہ نہیں پا رہا تھا۔

"لیکن آپ ہی بتائیے اماں جان یہ مشرقی ماحول کی دبی دبائی بچی گھر سے باہر نکل کر مردوں کے ساتھ کام کرتی کیا اچھی لگے گی۔ میں تو بس اسی وجہ سے منع کر رہا ہوں انہیں۔" وہ قدم بڑھا کر دادی کے قریب پہنچ کر بولا۔

"اچھی لگے گی یا بُری یہ سوچنا تو اس کے بھائی کی ذمہ داری ہے تمہاری تو نہیں۔ جو تم خواہ مخواہ ہمدردی کر کے بُرے بن رہے ہو۔" دادی نے ڈھکے ڈھکے انداز میں سمجھایا اور رشتے داری کی نزاکت کا احساس دلایا۔ تو جواب میں اس نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"اچھا اب چلتا ہوں اماں جان، بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔"

"اچھا جاؤ تمہیں اللہ کی امان میں دیا۔" دادی نے دلار سے کہا۔ تو وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا اور دہلیز پر رُک کر اس نے خاموش کھڑی سلوط کو گھوم کر دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے شب بخیر کہتا ہوا دہلیز پار کر گیا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو آتے ہی اس نے حسبِ معمول لباس تبدیل نہیں کیا بلکہ سرہانے لگے لیمپ کا بٹن دبایا اور بک شیلف سے ایک موٹی سی کتاب اُٹھا کر بیڈ پر سرہانے کی طرف لیمپ کی روشنی میں کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

مگر ذہن اُلجھا ہوا تھا۔

کانوں میں دادی کے کہے الفاظ۔ کہ تم خواہ مخواہ ہمدردی کر کے کیوں بُرے بن رہے ہو۔ ابھی تک گونج رہے تھے۔ اور ایک بے کلی سی رگ و پے میں سرایت کرتی لگ رہی تھی۔

اس لیے کتاب میں درج عبارت پڑھ تو رہا تھا لیکن مفہوم سمجھنے سے قاصر سا لگ رہا تھا۔

کہ عبارت کے ہر حرف پر کبھی روشن اور بڑی بڑی متحیر اور کچھ برہم سی خوبصورت آنکھیں۔

تو کبھی سرو قد اور اپنے حسین ترین سراپا مجسم وہ خود اتر آتی۔

اور وہ جھنجلا جھنجلا اُٹھتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔؟

آخر کس وجہ سے ہو رہا ہے؟

آج سے پہلے تو کبھی اس حد تک میرے احساسات اتنے شدید نہیں ہوئے۔

پھر آخر کیا بات ہے؟ کیا وجہ ہے؟

وہ کس وجہ سے میرے خیالات پر حاوی ہو رہی ہے۔؟

جبکہ میں نے اب تک اپنا کوئی آئیڈیل ہی نہیں بنایا۔ کیونکہ میں تصورات کو آئیڈیل کی شکل دینے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ نہ اب تک اپنی پسند اور معیار کا کوئی تعین ہی کر سکا ہوں۔

جو چیز من کو بھا جائے یا اچھی لگے یا پھر انسان کی خواہشات اور مرضی کے مطابق ہو۔

خواہ وہ کوئی جاندار چیز ہو یا ڈیکوریشن پیس۔ کپڑے کا کوئی ڈیزائن یا کوالٹی یا کھانے کی کوئی شے۔ وہی پسند کہلاتی ہے۔ اور معیار

اپنے معیار کا تعین انسان اپنے ذوق، ذہنیت، مزاج اور پسند کے مطابق ہی کرتا ہے۔ اور یوں تو میرا ذوق اور پسند بہت اعلیٰ ہے لیکن زندگی کے سفر میں کسی ہم سفر ساتھی کے بارے میں اب تک سنجیدگی سے میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ جبکہ اس کا احساس ممی بار بار مجھے دلا بھی چکی ہیں۔

پھر زندگی میں پہلی بار اس نے واقعی سنجیدہ ہو کر سوچا۔

کہ کس مزاج اور عادات و خصائل کی اور کیسی لڑکی اس کے معیار پہ پوری اُتر سکتی ہے۔

ایسا تو نہ تھا کہ اس نے کبھی حسین اور طرح دار لڑکی کو نہ دیکھا ہو۔

بلکہ اس نے تو ایک سے ایک حسین اور مہ جبین لڑکیوں کو دیکھا تھا۔

اور ماں نے بہن کی شادی کے موقع پر جو لڑکیاں دکھائی تھیں۔

ان میں سے بعض تو ایسی حسین و جمیل تھیں کہ ایک بار جو نظر اٹھتی تو جم کر ہی رہ جاتی مگر اس کے خیال میں دولت کی طرح صرف لائف پارٹنر کی خوبصورتی ہی کافی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صورت کے ساتھ سیرت، مزاجوں کی ہم آہنگی، ایک دوسرے کا احترام، آپس کی انڈراسٹینڈنگ، نباہ کرنے کا حوصلہ، مہر و وفا کا ہونا از حد ضروری ہوتا ہے۔

ورنہ ازدواجی زندگی ایک ایسی سیج بن جاتی ہے جس کے پھول سوکھ کر چبھن کا احساس دلانے لگتے ہیں اور تشنگی کا احساس ساری امنگوں اور خوشبوؤں کو جھلسا کر رکھ دیتا ہے۔

جیسے گرم بھاپ سے چھالا تو نہیں پڑتا لیکن جلن اور تپش محسوس ہوتی ہے۔

لیکن ازدواجی زندگی کی اس سارے اونچ نیچ یا نزاکتوں سے بےخبر لاعلم تھا البتہ وہ اپنی رفیقِ حیات میں یہ ساری صفات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بہت سی خوبیوں کی مالک ہو۔ متحمل اور اس کی خوشی کو مقدم رکھنے والی ہو۔ مگر جو لڑکیاں اس کی ممی نے اسے دکھائی تھیں ان کا ظاہری حسن بہت دل موہ لینے والا بلکہ بھٹکا دینے والا تھا۔

لیکن اپنی دولت اور حیثیت کی نمائش کرنے کی وجہ سے اندر سے وہ بہت کھوکھلی نظر آ رہی تھیں اور اس کا خیال کچھ غلط نہ تھا کہ دولت، خوبصورتی، تعلیم اور اخلاق کی ایک شخصیت میں یکجا نہیں ہو سکتے کوئی نہ کوئی خامی تو ہوتی ہی ہے انسان میں۔

یعنی اگر اس کی حلیمی یا رحم دلی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ بھی ایک خامی بن جاتی ہے کیونکہ اس فریبی دنیا کے باسی اس کی حلیمی سے فائدہ اٹھا کر اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

بہرحال۔ رفیقِ سفر کے بارے میں یہ سب کچھ اس نے ماں کے شادی کے معاملے کو ہوا دینے کے بعد ہی سوچا تھا۔

مگر اب کچھ روز سے اس کے دل میں ایک انجانا سا جذبہ ہمک رہا تھا۔ کیسا جذبہ تھا یہ اور کیا تھا؟

کس وجہ سے اچانک ہی دل کے پاتال میں سے ابھرا تھا؟

اور اب اس نے بلا محنت اور تحقیق اس کا کھوج لگا لیا تھا۔

کہ وہ شروع دن سے ہی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد، کافی دیر تک وہ اپنے ناروا سلوک پر پچھتاتا رہا تھا اور چاہ تو یہی رہا تھا کہ اس سے کسی طرح سامنا ہو تو وہ اس سے معذرت کرے مگر اگلے روز اس سے سامنا بھی ہوا تو وہ کسی بلائے بے درماں کی طرح اپنے ایک ڈیڑھ من وزن سمیت اُلٹی اس پر آگری تھی۔

پہلے تو اس نے اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ بھی کوئی مہمان ہے جو شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے آئی ہے۔

لیکن اگلے روز اسے سادہ سے لباس میں ملبوس طشت ہاتھ میں تھامے دیکھا تو یہی سمجھا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کی ماں نے اسے عارضی طور پر ملازم رکھا ہے حالانکہ دل اس خیال کی نفی ہی کرتا رہا تھا۔

اور حقیقت کھلنے پر اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر ہی نہ آیا تھا کہ اس سے معذرت کر لی جائے لیکن معذرت کرنے کے بعد دل پہ پڑا ندامت اور پچھتاوے کا بوجھ کچھ سوا ہی ہو گیا تھا۔ اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ چونکہ اس نے اسے بُری طرح دھتکار دیا ہے یا پھر اس کے ساتھ بہت تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا ہے اس لیے اس کے دل میں پھانس سی چبھ گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود ممی ماں اور پھوپی وغیرہ کے رویے کے پیشِ نظر اسے اس سے کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی اور جس وقت اس نے اس کے پیر جلنے کی خبر سنی تھی تو اسی ہمدردی کے تحت وہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ جا کر اسے دیکھ آئے یا کم از کم پرسشِ احوال ہی کرے لیکن طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری خودداری اور انا پرستی نے دل کے ہر مشورے کو رد کر دیا تھا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس نے اس کی توہین کی تھی بلکہ اس خیال سے کہ بھلا اس سے اس کا تعلق ہی کیا تھا۔

مگر کتنا گہرا اور اٹوٹ تعلق تھا یہ بھید آج ہی اس پر کھلا۔

درحقیقت وہ لاکھوں میں نہ سہی مگر ہزاروں میں ایک تھی۔

حد درجہ حسین، بردبار، غیور، باحیا اور دوسروں کا دکھ بانٹنے والی۔

بہت زیادہ نہیں تو انٹر تک تو تعلیم پائی تھی اس نے۔

بس ایک دولت مند ہی نہیں تھی۔ کیونکہ اگر دولت مند ہوتی تو کراچی سروس کرنے کے ارادے سے کبھی نہ آتی۔

تو وہ اس کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہی ایک معمہ تھی۔

مگر جب پیار کی طوفانی لہروں کے پاتال سے اٹھ کر کناروں سے اونچی ہو جاتی ہے تو وہ پیار کے سوا اپنے ساتھ ہر خامی، ہر کمزوری کے خاشاک کو بہا کر لے جاتی ہے۔ اور دل پیار کے ساگر کا غسل لے کر پریت کا نگار خانہ بن جاتا ہے جس کے آئینوں پر ہر سمت تصویرِ یار ہی جلوہ گر رہتی ہے وہ عبارت کے حروف پر، اس کی آنکھیں، ہونٹ اس کے سراپا کو یکجا کر کے اس کی تصویر بناتا اور مٹاتا رہا۔

پھر بڑی بے دلی سے کتاب بند کر کے اس نے لیمپ کے پاس تپائی پر رکھی اور اپنی خوابگاہ کے کھلے دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

باہر سیاہ گھور سی رات میں زندگی کے ہنگامے ابھی سرد نہیں پڑے تھے۔

پونے دس کا عمل تھا اور شاہراہِ فیصل اپنی مرکری ٹیوبس کی اسٹریٹ لائٹس میں جگمگ کر رہی تھی۔ ٹریفک کا ایک دریا سا بہہ رہا تھا اور شروع تاریخوں کا پیلا سا چاند مغربی افق کی پنہائیوں میں تیزی سے کہیں اترتا جا رہا تھا۔

اور یہ سب اسے کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

ایکدم دل میں اتر جانے والا۔

کسی دلفریب منظر سے بھی کہیں بھلا۔

کہ جذبے جب جوان تازہ نوخیز اور شوق اور امنگ کے پیرہن میں ملبوس ہوتے ہیں۔

کیف و مستی کے سمندر میں کچھ اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ سطح پر اُبھرنا گوارا ہی نہیں کرتے بس اندر ہی اندر ایک ہلچل سی مچاتے رہتے ہیں۔

گو اس کے جذبے میں ابھی اتنی حدت اور شدت نہیں آئی تھی۔

وہ تو کسی نوزائیدہ بچے کی طرح دنیا میں وارد ہوتے ہی آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا۔

پھر بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر جائے اور سلوط کو یہ چونکا دینے والی خوش خبری سنا آئے کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

لیکن اس سمے، وہ اپنے اس نئے اور اچھوتے سے جذبے کے سحر میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ۔ اسی مسحور کن سی کیفیت میں دریچے سے ہٹ کر اپنے بیڈ تک آیا اور پھر لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ کر اسی مسحور کن سی کیفیت میں ڈوبا ڈوبا کچھ ہی دیر بعد بے خود و غش سا ہو کر سو گیا۔

ان دنوں مستقبل کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے اس کے ذہن میں کئی منصوبے تھے۔ بہترین اور اعلیٰ سند نہیں ہنر بھی ہاتھ میں تھا اور اب تو اسے وطن واپس آئے چار پانچ ماہ ہو گئے تھے اور اتنے عرصے تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا اسے بالکل گوارا نہ تھا۔ یوں بھی واپسی سے بہت پہلے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وطن پہنچتے ہی وقت ضائع کیے بغیر اپنا کام شروع کر دے گا لیکن وطن آنے کے بعد اس نے اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اصل میں اس کا ارادہ تو اپنا ذاتی کلینک کھولنے کا تھا لیکن باپ اور چچا کی خواہش تھی کہ پہلے وہ کسی بڑے ہسپتال میں ملازمت کر کے تجربہ حاصل کرے بلکہ نام پیدا کرے اس کے بعد کلینک کھولنے کا سوچے۔ مشورہ مناسب ہی تھا کہ یوں بھی ابھی کلینک تعمیر کرانے میں کچھ عرصہ لگتا۔ اور پھر وہ کراچی میں اپنے کام کی ابتدا کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وطن کے کسی دور دراز اور پس ماندہ علاقے میں جہاں کے باشندوں کو طبی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں اپنا کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ جبکہ شعیب منصور اس بات کو محض اس کی جذباتیت تصور کرتے تھے۔ وہ اسے اس کے اس ارادے پر عمل پیرا ہونے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ اس کی خودسری اور من مانی کرنے کی عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔

یوں بھی اسے باپ کی تحویل میں دے دینے کا انھیں اب اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ خمیازہ بھی بھگت رہے تھے۔ اور اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے سلسلے میں کچھ کہہ کر اپنی بات کھوٹی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے چھوٹے بھائی سے اس معاملے پر مشورہ لیا تھا کیونکہ وہ سہیل منصور کی بات بہت مانتا تھا۔ کچھ قدرتی طور پر بھی اسے اپنے چھوٹے چچا سے بڑی اُنسیت تھی اس کی وجہ کچھ

یہ بھی تھی کہ سہیل منصور نے اپنے اور اس کے درمیان حائل طویل تر فاصلوں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ لندن میں تو وہ اسے ہر دوسرے تیسرے دن مونٹریال سے فون پر رابطہ قائم کرتے تھے اور دو تین بار خود بھی اس سے آ کر مل گئے تھے۔ اصل میں تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شعیب منصور بھی اولادِ نرینہ سے محروم ہی تھے ان کی صرف دو لڑکیاں ہی تھیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد وہ امریکہ چلے گئے تھے اور وہاں ایک مقامی بیوہ سے شادی کر لی تھی اور فاخرہ تو لاولد ہی تھیں۔ گویا منصور خاندان کا واحد نسل بردار بھی اسفند ہی تھا۔ اس لیے سہیل منصور اسے بیٹوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔

بہرکیف۔ باپ اور چچا کے مشورے پر فی الوقت اس نے اپنا پرائیویٹ کلینک تعمیر کرانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور کراچی کے ایک بڑے ہسپتال میں ملازمت حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہ دفعتاً بہت اچانک اور غیر متوقع طور پر سلوط کے عشق نے اس کے دل و دماغ پر ہلہ بول دیا۔

وہ سو کر اٹھا تو وہ صبح اسے بہت اچھوتی بہت مسرور کن سی لگی۔ کم از کم ان ساری صبحوں سے کہیں زیادہ حسین اور لطیف جو اب تک وہ گزار چکا تھا۔ ذہن بھی بہت تازگی محسوس کر رہا تھا۔

اور دل انبساط کی لہروں پر بہت سرشاری سے محوِ خرام تھا اور وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا ہو کر دھنکی ہوئی روئی کی طرح سفید سفید بادلوں کے ٹکڑوں کی مانند نیلے گگن کی وسعتوں میں پرواز کرتا محسوس کر رہا تھا۔

اس حقیقت سے بے خبر کہ مرحلۂ عشق میں بعض ایسے تلخ اذیت ناک اور مایوس کن مقامات بھی آتے ہیں کہ ایک عاشقِ نامراد اپنی جان سے گزر جانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

یا فنا ہونے سے بھی نہیں چوکتا۔

مگر جذبہ چونکہ بالکل نیا اور تازہ تازہ تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جس کے ہاتھ اچانک فضاؤں میں بلند ہونے والا کوئی رنگین غبارہ آ جائے اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے۔

دادی کے کمرے میں جانے کی خواہش کو سختی سے کچل کر اس نے ناشتہ تو کسی نہ کسی طرح دل پر جبر کر کے حلق سے اتار لیا تھا لیکن ناشتے کے بعد۔ لاکھ دبانے اور سختی کرنے کے باوجود دل جب بری طرح مچلنے لگا تو اس نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح اتنے سویرے دادی کے کمرے میں جانے کا جواز ڈھونڈ ہی لیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ دادی کے کمرے میں جا پہنچا۔ اور انہیں سلام کرنے کے بعد اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں جان۔ بے چاری غریب اور جانور تمثال بے زبان بچی کہاں ہیں؟" حالانکہ وہ اسے بیڈ کے سرہانے کونے میں کھڑا دیکھ چکا تھا۔

"ہائیں ہائیں، یہ کیا بے ہودگی ہے ننھے۔ یہ تم کیا بک رہے ہو؟" سلمیٰ بیگم نے۔ بھنچی بھنچی آواز میں اسے جھڑکتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے سلوط کی موجودگی کا احساس دلایا۔

"خیر، بک تو بالکل نہیں رہا، البتہ انہیں آج سویرے سویرے ایک بہت ہی بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑے ایک تہہ شدہ کاغذ کو دادی کے سامنے لہراتا ہوا بولا۔ اور وہ جو اس کے بے چاری غریب وغیرہ کہنے پر بھڑک سی اٹھی تھی اور اپنے بستر کی چادر جھاڑنے کی غرض سے بیڈ کے سرہانے کھڑی ٹیڑھی ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے منہ سے خوش خبری کا لفظ سن کر اس کا غصہ اور تپیا ایک تجسس میں بدل گیا۔

"اچھا جب ہی تو میں کہوں کہ یہ آج اتنے سویرے تمہارا نزول کیسے ہو گیا۔ مگر ایسی کیا خوشخبری لائے ہو کچھ بتاؤ بھی تو۔" سلمیٰ بیگم نے محض اس تاثر کو بدلنے کی غرض سے جو اس کے بے چاری اور غریب کہنے پر بندھ گیا تھا تھوڑا سا ہنس کر پوچھا۔

"خوش خبری یہ ہے کہ پھوپھی اور پھوپھا جان بخیر و عافیت اپنے ٹور سے واپس آ گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ہیں کیا سچ؟" بہت بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر تھوڑی سی آگے بڑھ آئی۔

"تو کیا آپ کے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ تنک کر بولا۔

"میرے خیال میں تو یہ ان دونوں کی آمد کی اطلاع ہو گی جو انہوں نے اس تار کے ذریعے دی ہو گی۔" سلمیٰ بیگم کا اشارہ اس کاغذ کی طرف تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔

"جی نہیں، یہ تار ان کی طرف سے ضرور آیا ہے لیکن ان کی آمد کا نہیں بلکہ نازو کی شادی کی مبارک باد کا ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنس کر بولا۔

"ہیں نازو کی شادی کی مبارک باد اب دو ماہ بعد دی ہے انہوں نے کیا اتنے عرصے سے سو رہے تھے دونوں؟" سلمیٰ بیگم تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔

"جی ہاں، دیکھیے بھلا اتنی باسی تباسی مبارکباد دینے کی ضرورت ہی کیا تھی انہیں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ بھابی اور بھائی جان اپنے ٹور سے واپس آ گئے ہیں تو پھر بھلا انہیں یہ تار بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔"

سلوط کو شاید اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"اب یہ تو وہی جانیں کہ کیا ضرورت تھی البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں واپس آ گئے ہیں اور ریڈ کارپٹ ریسپشن کے ساتھ آئے ہیں۔ بالکل وی آئی پیز کی طرح۔ جبھی تو اخبارات میں ان کی تصویر بھی شائع ہوئی ہے۔" اس نے کہا اور جیب سے کسی اخبار کا پہلا صفحہ نکالنے لگا۔

"اچھا تصویر بھی چھپی ہے ان کی۔" سلمیٰ بیگم تعجب سے بولیں۔

"جی ہاں، یہ دیکھیے۔ یہ ان دونوں کی ہی تصویر ہے۔" وہ اخبار ان کے سامنے کر کے ایک تصویر پر انگلی رکھ کر بتانے لگا۔

"لیکن ان دونوں نے تو اپنے چہرے ڈھانپ رکھے ہیں۔" سلمیٰ بیگم بینائی کی کمزوری کی وجہ سے آنکھیں چندھیا کر تصویر کو غور سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

"ہاں تو اتنی زیادہ تاخیر سے مبارک باد کا تار بھیجا ہے۔ شرما رہے ہوں گے دونوں تبھی تو چہرے ڈھانپ رکھے ہیں۔" وہ اخبار کو رول کر کے جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

"اے چل مجھے بنانے چلا ہے۔ نہ معلوم کس کی تصویر اٹھا لایا۔ ورنہ چور لٹیرے اور مجرم ہی اپنے کرتوت دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے منہ چھپاتے ہیں۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"ہاں تو کیا اتنی تاخیر سے تار دے کر انہوں نے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تبھی تو انہیں اپنے منہ چھپانے پڑے۔"

"اے بس رہنے بھی دو ننھے شرم تو نہیں آتی ایسی بے ہودہ باتیں کرتے۔ جبکہ وہ دونوں بھی تمہارے پھوپھی پھوپھا ہیں۔ بزرگ ہیں کیا انہی کے ساتھ یہ اونگی بونگی باتیں کرنی رہ گئی ہیں تمہیں۔" سلمیٰ بیگم نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں دھمکایا۔

"لیجیے بھلا میں نے ایسی کیا بات کہہ دی جو آپ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کھانے کے لیے تیار ہیں۔" وہ تھوڑا سا ہنس کر بولا

"لیکن بھائی اور بھابی اترے کہاں ہیں؟" سلوط کو صرف بھائی بھاوج کی واپسی کی ہی پڑی تھی۔

"زمین پر۔" اس نے برجستگی سے کہا۔

"خیر زمین پر تو سب ہی اترتے ہیں، میرا مطلب تھا کہ کیا وہ یہیں کراچی میں اترے ہیں۔" سلوط زچ سی ہو کر بولی۔

"نہیں۔ کراچی میں اترے ضرور تھے مگر بالا ہی بالا۔ ڈومیسٹک فلائٹ سے ملتان چلے گئے ہیں۔"

"ہیں یعنی واپسی پر کھڑے کھڑے مبارکباد دینے تک نہ آئے۔" سلمیٰ بیگم چمک کر بولیں۔

"جی نہیں، کیسی بھتیجی، کس کی بھتیجی آج کل تو سارے ہی رشتے بودے اور ناقص ثابت ہو رہے ہیں۔"

"میں ذرا یہ تار دیکھ سکتی ہوں۔" سلوط نے جو بڑی مضطرب سی نظر آ رہی تھی کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جی ہاں ضرور۔ یہ دیکھیے۔" وہ کاغذ والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔

"اُفوہ نہیں میرا مطلب تھا کہ میں تار پر درج عبارت پڑھنا چاہتی ہوں۔" سلوط نے تار کی عبارت پڑھنے کی غرض و غایت بیان کی۔

"اچھا تو کیا میرا پڑھ دینا کافی نہیں۔"

"اُفوہ دے دو نا اسے تار۔ اتنی حجت کیوں کرتے ہو۔" سلمیٰ بھی عاجز آ گئیں۔

تب وہ قدم بڑھا کر اس کے نزدیک ہی کھڑا ہو گیا اور نہایت خاموشی سے تار اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیا لکھا ہے سلوط بیٹی۔" سلمیٰ بیگم نے سلوط کو تار پڑھتا دیکھ کر پوچھا۔

"لکھا کیا ہے بیسٹ آف لک۔ گڈ وشز اور پارٹی گریٹنگ وغیرہ یعنی بہت رسمی سے جملے۔" اس کے جواب دینے کے بجائے خود بولا۔

"لیکن اس تار میں تاریخ تو کہیں بھی درج نہیں کی گئی۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے مٹا دی گئی ہے۔" سلوط تار کو غور

سے پڑھنے کے بعد بولی۔

"ہاں ہاں اب اتنی جھینپ مٹانے کو یہ کہہ دیجئیے کہ تاریخ لکھی ہی نہیں گئی بلکہ مٹا دی گئی ہے۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

"لے تو اس میں اس بے بے سلوط کا کیا قصور جو وہ جھینپے اور شرمائے۔ یہ سب کیا دھرا تو تمہاری پھپھو کا ہے۔ انہوں نے اپنے میکے والوں کی طرف سے میاں کو جیسا تاثر دیا اسی طرح وہ پیش آتے ہیں۔" مگر سلمیٰ بیگم نے جس طرح بے چاری کہتے کہتے بے بے سلوط کہا تو اپنے قہقہوں میں اس نے ان کی پوری بات سنی ہی کب۔

"واہ یہ بے بے سلوط بھی ان کا کوئی القاب ہے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"اے نجے! پہلے تو کبھی تم نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ پھر یہ اب اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" سلمیٰ بیگم بڑے سخت اچنبے کی لپیٹ میں آ کر بولیں۔ تو وہ ایک دم ہی سنجیدہ سا ہو کر بولا۔

"ہوا تو کچھ بھی نہیں اماں جان! وہ اصل میں وقت کے ساتھ انسان کے اندر بھی انقلابات اور تبدیلیاں آتی رہتی ہیں یعنی وہ بچپنے سے لڑکپن کے دور میں آ جاتا ہے پھر جوانی کا دور عبور کرتا ہوا بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے اپنی زندگی کے ان ادوار سے گزرتے ہوئے اس کے مزاج اور خیالات میں بھی ردو بدل ہوتی رہتی ہے۔" اور پھر دادی کو یونہی حیران اور متعجب سا چھوڑ کر وہ ایک دم ہی اس کی طرف گھوم گیا۔

"لائیے اب کسی طرح یہ تار تو واپس کر دیں اب اس کا تعویذ بنا کر گلے میں تو ڈالنے سے رہیں آپ۔" لہجہ بھی انتہائی تند تھا اور کرخت تھا جس سے گھبرا کر سلوط نے فوراً ہی تار کا کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو کاغذ نہایت مضبوطی سے پکڑ کر سرگوشیانہ سے انداز میں کہا۔

"میں اس وقت آپ کو محض یہ بتانے آیا تھا کہ میں دل کی تمام تر گہرائیوں سے آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ سمجھیں آپ؟" وہ جو اس کے لب و لہجے پر چبھتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ انہیں آنکھوں کو دیکھ کر بولا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے جڑ بنیاد وں سمیت کسی نے ہلا کر کہہ دیا ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ احساس مزید اس کی جان پر بنا گیا کہ سلمیٰ بیگم بھی کمرے میں موجود ہیں اور سامنے ہی بیٹھی ہیں وہ سخت وحشت زدہ اور گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی۔

"اچھا۔ آپ کاغذ تو چھوڑیے۔" آواز گھٹی گھٹی تھی اور لہجے سے خوف و پریشانی سی ہویدا تھی۔ اس نے بھی بلا کچھ کہے جلدی تار کے کاغذ ———— چھوڑ دیا۔ اور دادی کی طرف گھوم کر ناراضگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے اگر میری بات کا یقین نہیں آیا تو میں اس کی تصدیق کرا کے ہی چھوڑوں گا۔"

اسے اس قدر متحیر اور ہراساں دیکھ کر اسفند نے یہ ذو معنی بات کہی۔ اور پھر دادی کو نظر انداز کرتا کمرے سے نکل گیا۔ اور اس کے جانے کے بعد انتہا کو پہنچتے ہوئے تعجب اور تجسس کے بوجھ میں دبی سلمیٰ بیگم۔ کچھ دیر تک تو وہ کچھ اسی عالم میں ساکت سی بیٹھی اسفند کی فطرت اور مزاج میں اتنی زبردست تبدیلی کے مخفی پہلوؤں پر غور کرتی رہیں۔ کیونکہ وہ زینت سے زیادہ اس کی فطرت مزاج اور عادات حتیٰ کہ خصلت سے واقف تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کچھ شروع ہی سے لڑکیوں میں ملنے کا عادی نہ تھا اسی وجہ سے بہنوں سے بھی بہت لیا دیا رہتا تھا۔ اور چونکہ اس کی فطرت تنہائی پسند تھی اس لیے اس کا حلقہ احباب بھی بہت محدود تھا اس کے کل تین دوست تھے دو اسکول کے زمانے سے اس کے ساتھ پڑھتے پڑھتے اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کر گئے تھے جن میں سے ایک اسٹیٹس میں تھا اور دوسرا کویت میں۔ اور تیسرا ابھی گو تعلیمی دور میں کالج تک ہی اس کا ساتھ دے سکا لیکن اس سے اس کی دُور کی رشتے داری بھی ہوتی تھی اور ایک عرصے تک اس کے ساتھ بھی رہ چکا تھا۔ پھر کمیشن حاصل کر کے آرمی میں چلا گیا تھا۔ بہرکیف جو کچھ بھی تھا۔ وہ کچھ فطرتاً اکھل کھرا اور تنہائی پسند تھا اور بہت ریزرو سا رہتا تھا۔ اگر اس کی کسی سے دوستی یا انسیت تھی تو وہ خود ان سے ہی تھی۔ ہمیشہ تو نہیں مگر کبھی کبھی وہ انہیں اپنی نجی باتیں بھی بتا دیتا تھا۔ اپنا کوئی دکھ اپنے احساسات تک ان پر ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اور چونکہ عہد طفولیت سے ہی ہوسٹل میں زندگی گزارتا آیا تھا اس لیے اسے بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا نہ سلیقہ ہی۔ اس لیے صاف گو اور منہ پھٹ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اور مذاق وزاق کے بارے میں تو وہ جانتا ہی نہ تھا کہ کس چڑیا کا نام ہوتا ہے البتہ اپنی من مانی اور خودسری کرنا اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اصل میں اپنی عمر کے اس حصے میں جو انسان کا تربیتی دور ہوتا ہے وہ دادا کی گود میں پروان چڑھتا رہا تھا انہی کی محبت میں رہا تھا۔ اس لیے انہی کی سی بزرگانہ عادتوں اور خصلتوں کو اپنایا تھا۔ لیکن یہ سب عادتیں، خصلتیں فطرت اور مزاج تو اس وقت تک ہی تھے جب وہ لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ انگلینڈ جانے کے بعد اس چار سال کے عرصے میں ہی سلمیٰ بیگم کے خیال میں اس کے اندر یہ زبردست انقلاب

آیا تھا۔ لیکن ان کے اس خیال میں بھی کوئی پائیداری نہ تھی۔

یہ باتوں میں مزاح بھی۔

چھیڑ کا انداز بھی۔

اخلاق اور اخلاص بھی۔

مٹھاس اور یگانگت بھی۔

لحاظ اور احترام بھی۔

آخر یہ سب اس نے کہاں سے سیکھا؟ یا پھر یہ ساری باتیں کرنی اسے کیسے آئیں۔؟

جبکہ گھر میں اس کی سگی بہنیں بھی موجود ہیں اور چچازاد بہن بھی مگر ان سے تو وہ کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔

مگر سلوط سے یہ اس قدر وابستگی آخر کس وجہ سے ہے۔؟

وہ کیوں اس کے نجی معاملات میں دلچسپی لیتا ہے۔ بلکہ باقاعدہ طور پر دخل بھی دیتا ہے۔ اگر اسے چھیڑ چھاڑ یا مذاق پر بھی محمول کیا جائے تو بھی اس کا آخر اس سے کیا تعلق۔؟ کیا وابستگی؟

پھر یہی۔ سب سوچتے سوچتے انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے بھی اب تک گم صم سا کھڑا پایا۔ اسے اسی عالم میں دیکھ کر ان کے دل میں کچھ کھٹکنے سا لگا۔ کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی وہ اس کی طرف گھوما تھا اور آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہتا بھی رہا تھا اور اس کے جانے کے بعد۔ اس کا یوں گم صم سا کھڑا ہونا بہت کچھ معنے بھی رکھتا تھا۔ پر وہ نہ صرف جہاندیدہ تھیں بلکہ پکی عمر تک سینکڑوں بچوں کو تعلیم بھی دیتی رہی تھیں۔ خود اسفند کی پرورش بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ سلوط سے پوچھنا تو بہت کچھ چاہ رہی تھیں مگر بہت مصلحت کوش تھیں۔ چنانچہ احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اسے پکارا۔

"سلوط بیٹی!" تو سلوط پر چھایا سکوت یوں ٹوٹا جیسے گہری اور گمبھیر خاموشی میں اچانک کوئی زور کا چھناکا ہونے سے ماحول پر چھایا ہوا سناٹا ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس نے بری طرح چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی اماں جان!" بری طرح چونک اٹھنے کی وجہ سے ہی شاید اس کی آواز بھی مرتعش سی ہو گئی تھی۔ جسے سلمیٰ بیگم نے بڑے واضح طور پر محسوس کیا۔

"بھئی وہاں کھڑی کھڑی جواب کیوں دے رہی ہو۔ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو تو کچھ کہوں بھی۔" ان کے لہجے میں ناراضگی نہیں شگفتگی تھی۔ سلوط نہایت خاموشی سے قدم بڑھا کر ان کے قریب آ گئی۔ انہوں نے بڑی محبت سے ہاتھ پکڑ کر جو بُری طرح سرد ہو رہا تھا اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کس بات پر اتنی پریشان ہو؟ کیا بھائی بھاوج کی آمد کی متوقع نہیں تھیں یا پھر ان دونوں کی طرف سے تمہیں کوئی خدشہ لاحق ہے؟" حالانکہ وہ پوچھنا یہ چاہ رہی تھیں کہ یہ ابھی ابھی نجا آہستہ سے تم سے کیا کہہ کر گیا ہے۔ مگر انہیں بات کرنے کا ڈھنگ کچھ زیادہ ہی آتا تھا۔ اور ان کی بات کے سوال پر متحیر سے انداز میں بولی۔

"نہیں اماں جان۔ بھلا بھائی اور بھاوج کی طرف سے بھی کسی بہن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جبکہ۔ جبکہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُکی تو سلمیٰ بیگم جلدی سے بولیں۔

"ہاں ہاں کہو کہو۔ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو کہ تمہاری پریشانی کا سبب کیا ہے اور کیا تم مجھے اب بھی غیر سمجھتی ہو۔ ارے بچی رشتے باہمی محبت اور خلوص سے ہی استوار ہوتے ہیں اور صداقت ان کی روح ہوتی ہے ورنہ اگر یہ نہ ہو تو سگے بھی غیروں سے بدتر ثابت ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر گویا سلمیٰ بیگم نے اسے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی۔

"اوہ نہیں اماں جان۔ یہ بات نہیں۔ پہلے نہ سہی لیکن اب تو میں آپ کو اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ آپ ہیں بھی تو کس قدر مہربان اور مشفق۔ اصل میں، میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ اسفند کسی قسم کا مذاق ہی کر رہے تھے ورنہ بھابی اور بھائی جان ابھی اپنے ٹور سے واپس نہیں لوٹے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ واپس ہی لوٹتے تو کم از کم اپنی آمد کی اطلاع تو دیتے اور یہاں سب سے مل کر ہی جاتے۔ اور اگر واپس بھی آ گئے ہیں تو بھلا انہیں مہینوں بعد مبارکباد کا تار دینے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ اس تار پر سے تاریخ بھی مٹا دی گئی ہے۔" اس کے دل میں کوئی کھوٹ، کوئی آلودگی نہ تھی اس لیے اس نے پوری صداقت سے انہیں اصل بات بتا دی۔ سلمیٰ بیگم بھی اس کی بات کی صداقت پر یقین لے آئیں۔ اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کے بعد بولیں۔

"ہاں واقعی، یہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مگر ــــ اس نینی کو تم سے ہی ایسا مذاق کرنے کی آخر کیا سوجھی؟ جب بھی آتا ہے کوئی نیا چٹکلہ چھوڑ کر جاتا ہے اب کل رات تمہارے پیچھے پڑ رہا تھا کہ تم سروس کرنے کا خیال ترک کر دو۔ بھلا یہ بھی کوئی معقولیت ہے اور اسے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی ذاتیات میں دخل دینے کا؟" اور جواب میں وہ بھلا کیا کہتی۔

اور انہیں کیسے بتاتی کہ وہ کس برتے پر اپنا حق جتانا چاہ رہا ہے۔

یا اس کے کانوں میں ایک ایسی فتنہ خیز بات پھونک کر گیا ہے کہ اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو کر رہ گئی ہے۔

"خیر اگر یہ اس کا مذاق بھی ہے تو بیٹی! تم اس کی باتوں کا برا نہ ماننا۔" سلطے بیگم بھی اسے خاموش دیکھ کر اس کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہیں سکیں۔

"نہیں برا ماننے کی بات نہیں اماں جان البتہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی میری ذاتیات میں دخل دے۔" وہ قدرے ناگواری کا اظہار کرتی ہوئی بولی تب بھی سلطے کے دل میں اک کھٹک سی باقی رہی۔

"اے تمہیں ہی کیا یہ بات تو کسی کو بھی پسند نہیں ہوتی کیونکہ سب اپنی اپنی مرضی کے مختار ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس بات پر سخت تعجب ہو رہا ہے کہ تم سے ایسے مذاق کیوں کرتا ہے جبکہ سگی بہنوں اور کزنز تک کو منہ نہیں لگاتا۔" سلطے بیگم کسی خیال کے تحت بولیں ان کے لہجے میں طنز یا معنے خیزی نہیں تھی اس کے باوجود بھی سلوط کچھ سٹ پٹا سی گئی۔

"مو۔ مجھے خود نہیں معلوم اماں جان۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس کی وجہ ــ شاید یہی ہے کہ اس روز اٹھنے کا طشت اچانک میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ان پر گر پڑا تھا ان کا نیا سوٹ خراب ہو گیا تھا۔" وہ سوچ سوچ کر بولی۔

"مگر وہ تو محض اتفاق تھا کہ سنا ہے تمہارا پیر رپٹ گیا تھا سیڑھی سے۔ کوئی تم نے جان بوجھ کر تو اس کے کپڑوں کو اٹھنے میں نہیں لتھیڑا ہے۔ اے ہاں جتنے منہ اتنی باتیں۔ مجھے اصل بات بتاؤ کہ آخر ہوا کیا تھا؟" سلطے بیگم بڑی چالاکی سے کام لے کر بولیں۔ تو وہ تھوک نگل کر بولی۔

"وہ۔ وہ دراصل یہ تیزی سے زینہ چڑھتے ایک دم ہی سامنے آ گئے تھے۔ اور میں دونوں ہاتھوں میں طشت تھامے نیچے اُتر رہی تھی۔ انہیں راستہ دینے کے لیے جلدی سے ایک طرف ہٹی تو بے دھیانی میں میرا پیر رپٹ گیا اور میں لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر آ گری۔" اس نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ وہ تو محض ایک اتفاق تھا۔ کوئی تم نے جان بوجھ کر تو اس پر ابٹنا نہیں گرایا تھا۔ جو یہ نینا تم سے چُن چُن کر بدلے لے رہا ہے اور وہ ایسی خصلت کا ہے بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو از راہ ہمدردی اور مروّت تم سے ہنس بول لیتا ہے۔ کہ ایک تو تم مہمان ہو دوسرے تم سے بہت نزدیکی سمدھیانہ بھی تو ہوتا ہے نا۔" سلطے بیگم نے اظہار خیال کے طور پر کہا تو جواب میں خاموش ہی رہی۔

"ہاں یقیناً یہی بات ہو گی ورنہ اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ نینا ابھی ابھی آہستہ آہستہ ــــ جو تم سے کچھ کہہ رہا تھا اس کا بھی کچھ خیال نہ کرنا۔ میں موقع دیکھ کر خود اسے سمجھا دوں گی کہ تم سے مذاق نہیں کیا کرے۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے اس نے تم سے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی ہو گی جو تمہاری دل آزاری کا سبب بنی ہو۔ کیوں میرا خیال کچھ غلط تو نہیں؟" سلطے بیگم دیر سے دل میں کھٹکتی بات کو آخر زبان پر لے ہی آئیں لہجہ جتانے والا نہ سہی مگر تھوڑا تھوڑا معنی خیز ضرور تھا جو ان آخری دو فقروں میں سمٹ آیا تھا۔

ان جیسے اقبالِ جرم کرانے کے لیے کسی سخت ترین کراس ایگزامن مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی۔

اسے یوں لگا جیسے انہوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

جبکہ دُور دُور تک اس کی کوئی خطا تھی نہ غلطی۔

پھر بھی وہ کچھ اتنی سراسیمہ ہو گئی کہ سردی کے موسم میں بھی اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ حتٰی کہ سرد ہاتھوں میں بھی نمی کا احساس ہونے لگا۔

اب جواب میں ان سے کیا کہے۔؟

کیا اصل بات انہیں بتا دے؟

یا پھر انتہائی صفائی سے جھوٹ بول کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دے۔ لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جھوٹ جو بڑی آسانی سے بولا جا سکتا ہے یا پھر انسان بولنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ بھی بولا نہیں جا سکتا۔ جبکہ سچ جو کہ ایک

عظیم وصف ہوتا ہے۔ آسانی سے بولا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اس کے بولنے میں ہمت اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ مصلحتوں کو پسِ پشت ڈالنا اور مروّت اور رواداری کو بالائے طاق رکھ دینا لازمی ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر سچ بولا جا سکتا ہے۔

گو اس پر کسی کا زور تھا۔

نہ دھونس۔ نہ خوف ہی غالب تھا۔

اور نہ کوئی مصلحت ہی درپیش تھی۔

رواداری اور مروّت کا بھی کوئی پاس نہ تھا۔

البتہ ہمت اور حوصلے کا فقدان ضرور تھا اس لیے وہ سچ بھی نہیں بول سکتی تھی۔ سوال کرنے کے بعد جواب دینے کا درمیانی وقفہ بڑھتا جا رہا تھا اور مزید تاخیر اس کے حق میں کوئی اچھی بات نہ تھی۔ لہٰذا اسے بحالتِ مجبوری جھوٹ کا سہارا ہی لینا پڑا۔

"اماں جان۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ بالکل بے تکی سی بات تھی جس پر افسوس کرنے کے سوا میں اور کیا کر سکتی ہوں۔" خاصے توقف کے بعد اس نے افسردگی سے کہا تو سلمیٰ بیگم نے تھوڑا سا اچک کر پوچھا۔

"آ۔ چھا ایسا کیا کہا تھا اس نے؟" وہ حد درجہ متجسس دکھائی دے رہی تھیں۔

"یہی کہ اب تمہارے بھائی جان آ گئے ہیں تو تم ان کی دھونس میں آ کر کہیں سروس نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا۔

"اے واہ! کیا دیوانہ ہو گیا ہے وہ یا تمہارا والی وارث ہے جو یوں دھونس جما رہا ہے۔ ٹھہرو اب کے آ لینے دو اسے پھر دیکھنا میں اس کی کیسی خبر لیتی ہوں۔" سلمیٰ بیگم کے دل سے اس کے جواب پر ایک بوجھ سا ہٹا تو وہ اسفند کو بُرا بھلا کہتی ہوئی بولیں۔

"نہیں اماں جان! خدارا ان سے کچھ نہ کہیے گا۔ ورنہ وہ مجھے چغلخور اور نہ معلوم کن کن القابات سے نوازیں گے۔ دیکھیں نا میں یہاں ساری زندگی گزارنے کی غرض سے تو نہیں آئی۔ صرف ایک دو ماہ کی بات اور ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میں یہاں بالکل ہی بے وقعت ہو کر رہ جاؤں۔" اس کے لہجے میں کرب بھی تھا اور التجا بھی۔ سلمیٰ بیگم بھی کسی حد تک اس کے دُکھ سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے بھی دُکھی ہو کر کہا۔

"اچھا اچھا بیٹی۔ تم اطمینان رکھو میں اس سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میرا تو پہلے ہی یہ تمہاری پیاری پیاری صورت دیکھ کر دل کٹتا ہے یہ قدرت کے کھیل بھی کیسے نیارے ہوتے ہیں۔ کسی کو صورت سیرت اور تمام تر خوبیوں سے نوازتی بھی ہے تو بہت سی نعمتوں سے محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔ کاش اس نے تمہاری قسمت اچھی بنائی ہوتی تو آج تم شہزادیوں کی طرح راج کر رہی ہوتیں۔" اور جواب میں اس نے ایک سرد آہ بھری۔

جانے کیوں آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

اور دل بھرا چلا آ رہا تھا۔

"منجھلی بہو تو کچھ ایسا ظاہر کرتی ہیں جیسے میں ان کی ساس نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہوں وہ بھی ظالم اور جلّاد قسم کی۔ جبکہ طرفہ یہ ہے کہ میں نے ہی ان کی شادی شعیب سے کرائی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں میرے بڑے اچھے واقف کاروں میں سے تھیں اور خدا گواہ ہے کہ آج تک میں نے خود ان بچّوں کو کبھی سوتیلا نہیں سمجھا۔ خیر میرے بچے کو خدا ہزاری عمر دے مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ اب منجھلی بہو تو ناخرہ کے متعلق مجھے کچھ پوچھنا مناسب نہیں لگا۔ کیا ناخرہ واقعی میاں کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئی ہیں یا نازو کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا کوئی عذر تراشا گیا ہے۔ کیونکہ ملازمت چھوٹے تو عاقب کو عرصہ ہوا۔ اور کاروبار بھی سنا ہے کہ بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا ان کا۔ پھر کیا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا جو تمہیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ دنیا کا دورہ کرنے کے لیے چل دیے۔" سلمیٰ بیگم نے بڑی خوبصورتی اور ترکیب سے ناخرہ اور عاقب کے معاملات کو کریدا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ نے جو سُنا تھا ٹھیک ہی سُنا تھا۔ مگر آج کل قارون کا خزانہ نہیں ناجائز کاروبار کا بازار گرم ہے اماں جان اور۔ اور بھائی جان بے چارے ایک معاملے میں بری طرح پھنس گئے تھے اس قدر کہ بحالتِ مجبوری انہیں ترکِ وطن کر کے بھابی جان کے ساتھ کسی بیرونِ ملک میں پناہ لینی پڑی۔ اور میری عزت و جان خود خطرے میں تھی اس لیے بھابی جان نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اب آپ ہی بتائیے میں ان لوگوں پر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے سروس ہی کروں گی۔ بھائی جان نے بھی مجھے سروس کرنے کی اجازت دے دی

تھی۔ بھلا سروس کیے بغیر میرا گزارہ کیسے کہیں ہو سکے گا۔ سروس مل گئی تو پھر میں کسی بورڈنگ یا ہوسٹل میں چلی جاؤں گی۔ لیکن یہاں رہنا کسی قیمت پر گوارا نہ کروں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا رویّہ بہت معاندانہ ہے۔ زینت بھابی مجھے شروع دن سے ہی منحوس سمجھتی ہیں اور نیلوفر کی نگاہوں میں میرے لیے حقارت ہوتی ہے۔ اماں جان آپ ہی بتائیے میں یہاں سے نہ جاؤں تو پھر کیا کروں۔"

اور پھر وہ سلمیٰ بیگم کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلمیٰ بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ ان کے دل میں ایک حسرت بھری خواہش اُبھری۔ اے کاش میرا اپنا کوئی گھر کوئی ٹھکانہ ہوتا تو میں اس اتنی پیاری۔ دکھی ہمدرد اور دردمند لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔ مگر شوہر کے انتقال کے بعد تو وہ خود بھی بے ٹھکانے ہو گئی تھیں۔ ایک آسرا تھا تو خدا کا یا پھر اسفند کا۔ مگر اسفند کا سہارا ابھی بہت بودا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چپ چاپ آنسو بہاتی اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی رہیں۔ پھر اسے دلاسا دیتی ہوئی بولیں۔

"مجھے تو تمہارے خیالات سُن کر بڑی خوشی ہوئی ہے بیٹی۔ کہ تم بہت غیور اور خوددار ہو۔ کسی کی دست نگر بن کر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ تمہارا یہ جذبہ قابلِ ستائش ہے سلوط۔ جو کسی کا محتاج بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ خدا خوش ہو کر اسے خود ہی سرفراز کر دیتا ہے۔ کیا کروں بڑی مجبور ہوں ورنہ میرا اپنا کوئی ٹھیا ٹھکانا ہوتا تو تم کو کبھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی۔ چلو اٹھو اپنا دل سنبھالو۔ اور جا کر تھوڑا سا پانی پی لو۔ طبیعت بھی سنبھل جائے گی اور دل بھی ٹھہر جائے گا۔" مگر اس نے ان کی گود سے سر اٹھایا تو آنسو پونچھنے کے باوجود آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہی رہے۔

"دیکھو بیٹی! یہ رونا دھونا بزدلوں اور کمزوروں کا کام ہوتا ہے جب کہ تم خاصی دلیری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہو۔ اگر اسی طرح حالات کے سامنے ڈٹی رہیں تو انشاءاللہ اس پانی کا ہر قطرہ پھول بن جائے گا جو تمہاری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ یاد رکھنا میری یہ بات اگر میں زندہ رہی تو پھر خود تم سے پوچھ لوں گی اور اگر مر گئی تو تمہاری یادداشت کے کسی کونے میں تو پڑی ہی رہے گی پھر تم اسے کھوج کر نکال لینا کہ حالات کے سامنے سینہ سپر ہو کر ڈٹے رہنے والے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہ پریشانیاں اور مصیبتیں تو ہر انسان کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ جنہیں خوشیوں کی طرح وہ ان کو بھی اپنے اُوپر سے گزار لیتا ہے۔ اری بیٹی! یہ زندگی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا تاریک پہلو سامنے آ گیا تو اندھیرا ہی اندھیرا اور روشن پہلو سامنے آ گیا تو اجالا ہی اجالا۔ کبھی ایک سی کیفیت تو نہیں رہتی اس کی۔ خدا نے اس میں بھی اپنے بندوں کے لیے ایک حکمت رکھی ہے۔ چلو شاباش۔ اب روک لو یہ آنسو اور اُٹھ کر منہ دھو آؤ۔"

انہوں نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پچکارتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اُٹھ کر غسل خانے کا رُخ کرنے لگی تو موتی اور گلوگیر آواز میں اس نے سلمیٰ بیگم سے کہا۔

"اماں جان۔ ماں سمجھتے ہوئے میں نے آپ کو بھائی جان کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ خدارا آپ اس بات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیجیئے گا۔"

اور سلمیٰ بیگم جن کا دل اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ انہوں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میرا سینہ تو ایک گہرے کنویں کے مانند ہے جس میں جھانک کر دیکھنے پر بھی کسی کو یہ نظر نہیں آ سکتا ہے کہ بہت گہرائی میں چمکتے پانی کی سطح پر کچھ تیر بھی رہا ہے۔ تم میری طرف سے تو بالکل اطمینان ہی رکھو۔"

اور تب وہ اپنے آنسو پونچھتی غسل خانے میں گھس گئی۔

دن کے چار بجے کا عمل تھا۔

دھوپ کی آب و تاب ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔

"گل بہار" سناٹوں کی زد میں تھا کہ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ نیلما بند دروازے کو زور سے بجاتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ممی۔ ممی" بھاگ کر آنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ زینت جو آنکھیں بند کیے اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں اس کے ممی ممی کہنے پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

"کیوں خیر تو ہے کیا ہوا؟" انھوں نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

"ممی! وہ پپا اور احمد بھائی آئے ہیں۔" نیلما نے مسرور سے انداز میں بتایا۔

"ہیں میری نازو آئی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" انھوں نے آگے سرک کر جوتی میں پیر ڈالتے ہوئے بے یقینی کے سے انداز

میں پوچھا۔ اور پھر بولیں۔

"ابھی کل شام کو ہی تو میں نے نسرین سے فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ پھر یہ دونوں کیسے آگئے؟" وہ اٹھ کر سنگار میز کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"اب یہ تو پتا نہیں مگر وہ دونوں آگئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں کار سے اترتے دیکھا ہے۔ میں تو آپ کو فوراً اطلاع دینے چلی آئی۔" نیلما باہر جانے کی جلدی میں بولی۔

"تعجب ہے۔" زینت آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کنگھے سے اپنے بال سنوارتی ہوئی بولیں۔ ان کے لہجے سے اب بھی بے یقینی سی عیاں تھی۔ لیکن نیلما انھیں وہیں چھوڑ کر جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ زینت بھی جلدی سے کنگھا ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر باہر آگئیں اور ان کے باہر آتے ہی نازپرور جو اپنے شوہر کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی ان پر نظر پڑتے ہی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی جبکہ اس کا شوہر کچھ پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

ماں نے بیٹی کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے سے لگانے کے بعد علیحدہ ہو کر بھرپور نظروں سے بیٹی کا جائزہ لیا۔ وہ شائننگ پنک کلر کی ہلکے ہلکے کام کی ساڑھی اور نفیس سے جڑاؤ سیٹ میں اپنی قابلِ رشک صحت کے ساتھ بڑی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

"ماشاءاللہ چشمِ بد دور۔" انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لے کر کہا۔ اور پھر داماد کی طرف متوجہ ہو گئیں جو اس اثنا میں ان کے نزدیک آگیا تھا۔

اس نے جھک کر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے بہترین دعاؤں سے نوازا اور پھر بیٹی سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"یہ اچانک تم کیسے آگئیں جبکہ کل شام تک تو تمھارے آنے کا دور دور تک گمان نہ تھا۔"

"اصل میں ہم کل رات کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے ممی!" نازو نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ کل رات کی آئی ہوئی ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔" زینت کے لہجے میں تحیر سے زیادہ گلہ سا شامل تھا۔

"وہ اصل میں ممی یہ آپ کو سرپرائز دینا چاہ رہی تھیں۔ ورنہ میں نے تو ایئرپورٹ پر اترتے ہی آپ کو فون کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے منع کر دیا۔" نازو کے بجائے احمد سروش نے وضاحت کی۔ مگر زینت کو یہ سرپرائز دینے والی بات اچھی نہ لگی۔ کہنا تو یہی چاہ رہی تھیں کہ کل رات کو نہ سہی صبح کو ہی مجھے مطلع کر دیا ہوتا یا صبح کو ہی آجاتیں مگر داماد کی موجودگی کے پیشِ نظر انھوں نے موضوع بدلتے ہوئے بیٹی سے پوچھا۔

"اچھا خیر یہ بتاؤ کہ تمھارا ٹرپ کیسا رہا انجوائے تو خوب کیا ہوگا تم دونوں نے۔" تو نازو شوہر پر ایک شوخ سی نظر ڈال کر بولی۔

"او۔ ممی ایسا ویسا۔ اتنا زبردست کہ تین ماہ کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے کل ہی کی بات ہو۔" نازو پر ایک سرشاری کا عالم طاری تھا۔ خوشی سے وہ کھلی پڑ رہی تھی۔

"جی ہاں، ممی ہمارا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا واپس آنے کو مگر۔" احمد سروش نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں بیٹے! یہ وقت یا عرصہ زندگی کی تمام تر مسرتوں اور لطافتوں سے ہمکنار ہونے کا ہی ہوتا ہے۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ اسی طرح خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے۔ ماشاءاللہ تمھاری صحت بھی قابلِ رشک ہو رہی ہے۔ آؤ چلو لونگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" زینت نے داماد کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر بیٹی اور داماد کے ساتھ لونگ روم کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"اصل میں ہم مشرقی لوگوں کے یہاں ہنی مون وغیرہ منانے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہ تو مغرب کی ایک ریت ہے جسے ہم نے (اپنانا) کر لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ ریت یا دستور کچھ اتنا برا نہیں بلکہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے یعنی ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور کی خوشیاں لوٹنے کے ساتھ ساتھ صرف نئے شادی شدہ جوڑے کا تمام وقت سیاحت اور تفریح ہی میں نہیں گزرتا بلکہ اپنے خاندان والوں یا اپنے گرد و پیش میں رہنے والوں سے علیحدہ ہو کر انھیں اس عرصے میں ایک دوسرے کی عادات و مزاج حتیٰ کہ فطرت اور پسند ناپسند یا پھر ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اور اس عرصہ میں وہ ایک طرح آپس کی ناموافقت سے سمجھوتہ بھی کر لیتے ہیں۔ کہ بیوی کے اندر اگر کوئی خامی یا کمزوری ہے یا پھر خلافِ مزاج کوئی عادت ہو تو شوہر اس سے مطابقت رکھنے کا تہیہ کر لیتا ہے اور اگر شوہر میں کوئی خامی یا خرابی ہو تو بیوی اپنے خیالات اور مزاج کو اس کے مطابق ڈھال کر اس سے نباہ کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔" انھوں نے بیٹی اور داماد کے ساتھ لونگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اوگاڈ معلوم ہوتا ہے کہ ممی نے باقاعدہ ہنی مون کے فارمولے پر ریسرچ کی ہے بہت ہی ڈیپ معلومات رکھتی ہیں۔" احمد سروش نے نازپرور کے کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے کہا۔

"ہاں تو ممی کا تجربہ ہی نہیں مشاہدہ بھی بہت گہرا ہے۔" نازپرور جواب میں قدرے فخر سے بولی۔

لونگ روم۔ گھریلو قسم کی بیٹھک ہوتی ہے یا دوسرے معنوں میں افرادِ خانہ کی نشست گاہ۔ اور یہ لونگ روم بہت آراستہ تھا۔ پورا فرش دبیز اور خوشنما قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ دائیں بائیں مقابل کی دیواروں کے آگے جوڑے چپکے دیوان رکھے تھے جن پر بچھے خوشنما غالیچوں پر گاؤ تکیے سجے تھے اور سامنے کی دیوار کے آگے صوفے رکھے تھے۔ قالین اور فرنیچر کی مناسبت سے دروازے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ نیلما اس دوران کہیں اندر چلی گئی تھی۔ جونہی یہ تینوں لونگ روم میں آکر بیٹھے وہ بھی آکر نازو سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔

زینت نے نشست گاہ میں بیٹھتے ہی ملازم کو بلا کر چائے کے متعلق ہدایات دیں۔

"ہاں آپیا! اور سنائیے کہاں کہاں گھومیں اور کیا کیا دیکھا۔" نیلما نے بدستور بہن سے لپٹے لپٹے پوچھا۔

"ارے بس کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھو کہ آدھا یورپ گھومے ہیں حتیٰ کہ لندن بھی ہو آئے۔ مگر زیادہ قیام سوئٹزرلینڈ میں ہی رہا۔ کمال ہے سوئٹزرلینڈ تو بس بہشت کا ایک ٹکڑا ہی معلوم ہوتا ہے۔ صناعیِ قدرت کی ہی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں سے سنواری ہوئی ایک ایسی دلفریب جگہ جس کی نظیر پورے یورپ میں بھی کہیں نہیں مل سکتی۔" پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔

"سچ ممی! مجھے تو کراچی آنے کے خیال سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے ایک دم لوگس اور پوری۔ کوئی قاعدہ نہ ڈھنگ نہ وہ آسائشیں اور مراعات جو یورپ والوں کو میسر ہیں۔ میں نے تو احمد سے کہہ دیا ہے کہ اگر گھر بنواؤں گی تو سوئٹزرلینڈ ہی میں ورنہ کم از کم یہاں اس پچھڑے اور پسماندہ سے ملک میں تو میں کبھی نہیں رہوں گی۔"

"ہاں یوں تو میں خود بھی پاکستان میں رہنے کا شروع سے ہی قائل نہیں ہوں۔ لیکن ممی! گھر، گھر والے اور بزنس تو سارا یہیں ہے۔ گو ہماری کمپنی کی ایک برانچ لندن اور ایک جاپان میں بھی قائم ہے لیکن موسم کی وجہ سے لندن انھیں پسند نہیں آیا ورنہ لندن جا کر رہنا کچھ مشکل نہ ہوتا۔" احمد سروش نے ساس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اونہہ۔ لندن کیا سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں تو مجھے پیرس بھی پسند نہیں آیا۔ کیونکہ دونوں ہی شہر بہت گنجان اور ہنگامہ خیز سے ہیں جبکہ کنٹری سائڈ لائف اور نیچرل بیوٹی پر تو میری جان جاتی ہے اگر جاؤں گی تو سوئٹزرلینڈ ہی جاؤں گی سمجھے احمد آپ!" نازپرور بڑے ناز سے بولی۔

"ایسا کیوں نہ کریں دولہا بھائی کہ سوئٹزرلینڈ میں بھی اپنی کمپنی کی ایک برانچ کھول لیں اور پھر انکل سے کہہ کر وہاں کا چارج لے لیں۔" نیلما نے اپنی دانست میں نہایت مناسب مشورہ دیا۔

"ہوں مشورہ تو بہت نیک ہے چھوٹی بیگم آپ کا۔ لیکن پلیز آپ مجھے دولہا بھائی نہ کہا کریں۔ مجھے یہ دولہا بھائی کا لفظ بہت اوڈ سا لگتا ہے۔"

لیکن نیلما نے اس کی پوری بات نہ سنی اور بگڑ کر بولی۔

"واہ میں آپ کو چھوٹی کدھر سے لگ رہی ہوں اتنی تو اسٹرانگ اور ہیلدی (صحت مند) ہوں۔"

"ہوگی لیکن مجھے تو تم بالکل ایک چھوٹی سی چوہیا ہی نظر آتی ہو۔" احمد نے مسکرا کر کہا۔

"پھر تو آپ کی آنکھوں میں یقیناً کوئی خرابی ہوگی بہتر یہی ہے کہ فوراً اپنی بینائی چیک کرا لیں۔" احمد کے مسکرانے پر وہ کچھ زیادہ ہی بگڑ کر بولی۔

"ہائیں ہائیں نیلما! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم یہ کیا بک رہی ہو۔" زینت نے داماد کے نازک رشتے کے خیال سے فوراً ہی اسے جھڑک دیا۔

"ارے نہیں ممی! یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے آپ انھیں نہ ڈانٹیے۔" احمد ہنس کر بولا۔ جبکہ نازپرور خاموش بیٹھی مسکراتی رہی۔

"ہاں تو کیا مشورہ دے رہی تھیں چوہیا بیگم آپ۔" احمد نے نیلما کو مخاطب کر کے پوچھا۔ جو ماں کے گھرکنے پر منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"دیکھیں پھر وہی چوہیا بیگم! مجھے تو آپ نے ڈانٹ دیا کیا ان کو نہیں ڈانٹ سکتیں آپ ممی۔" نیلما پھر بگڑ اٹھی۔

"ارے تو تم اتنی اوٹ کیوں ہو رہی ہو۔ یہ تو تم سے مذاق کر رہے ہیں۔ آخر بڑے بہنوئی ہیں تمھارے۔" زینت نے ہنستے ہوئے

اُسے سمجھایا۔

"جی ہاں بڑے۔ اگر بہنوئی بھی ہیں تو انسلٹ ہی کر رہے ہیں میری کیونکہ ہیں شکل سے بھی چوہا نہیں لگتی"

"او۔ نو۔ انسلٹ کیسی، میں تو تمھیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ جب تک تم مجھے دولہا بھائی کہہ کر پکارو گی میں تمھیں چوہیا بیگم کہتا رہوں گا۔ کیونکہ دولہا بھائی کہنے سے مجھے سخت چڑ ہے۔" احمد نے دیکھا کہ سالی اس کے مذاق پر سنجیدہ ہوگئی ہے تو فوراً ہی اس نے بات سنبھالی۔

"اچھا تو پھر کیا کہہ کر پکاروں آپ کو۔" نیلما جلے کٹے سے انداز میں بولی۔

"بھئی ـــــ سیدھی طرح احمد بھائی ہی کہہ لیا کرو۔" احمد بولا۔

"اچھا چلیں احمد بھائی ہی سہی۔" نیلما نے زچ ہونے کے انداز میں کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے بے بی نیلما۔ بس تم مجھے احمد بھائی ہی کہا کرو۔" احمد نے مسکرا کر کہا۔ انداز اب بھی چھیڑ کا سا تھا۔ نیلما نے اس کے بے بی کہنے پر جز بز سی ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔ تو وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر بولیں۔

"خیر بے بی ہی سہی، لیکن رائے بڑی مناسب دی ہے انھوں نے تمھیں۔"

"جی ہاں جی ہاں اس بات کا اعتراف تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔" احمد خوش دلی سے بولا۔

"اچھا صرف اعتراف ہی کر چکے ہیں یا عمل کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔" نازو نے پوچھا۔

"ہائیں عمل۔ عمل تو بعد کی چیز ہے۔ پہلے تو اس مسئلے پر کچھ عرصے غور کرنا پڑے گا۔ پھر کچھ عرصہ ارادہ کرنے میں گزر جائے گا اس کے بعد کہیں جا کر عمل درآمد کرنے کا مرحلہ آئے گا۔" احمد نے یہ کہہ کر بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

"پھر تو ابیا آپ سوئٹزرلینڈ میں مکان بنوا کر رہنے کا خیال ہی ترک کر دیں۔" نیلما بہنوئی کی بات سن کر بولی۔

"واہ کیسے ترک کر دوں۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ایک بار جس بات کا قصد کر لیتی ہوں اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔" نازو چہک کر بولی تو احمد سروش کے چہرے کا تاثر تھوڑا سا بدل گیا۔ یہی دیکھ کر زینت نے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے اس کا فیصلہ بھی تم بعد میں کر لینا۔ ابھی تو تمھیں یہاں آئے ایک دن ہی ہوا ہے۔ اور ایک دن میں یہ سارے مراحل طے نہیں ہو سکتے نا۔"

"نہیں ممی۔ سوال ایک دن یا ایک سال کا نہیں ہے۔ اصل سبب تو میری مجبوری ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور دوسرے معنوں میں پاپا کا دست راست ہوں، میرے سوا ان کا ہاتھ بٹانے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ تایا کا انتقال تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹے چچا ہی بچے تھے سو وہ لندن کا آفس سنبھالے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی محض کرلیتی ہیں کہ دس گیارہ سال سے وہیں مقیم تھے۔ وہیں انھوں نے شادی بھی کرلی تھی۔ اب پاپا نے ان پر بہت زور ڈالا تو انھوں نے ہم پر احسان کرتے ہوئے آفس کا چارج سنبھال لیا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں میرا کہیں اور جا کر رہنا ممکن ہے۔" احمد سروش نے اپنی مجبوری بیان کی تو زینت قائل سی ہو کر بولیں۔

"ہاں بیٹے! یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہر ایک کی اپنی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہوتی ہے۔ اور پھر خواہ دل چاہے یا نہ چاہے جہاں سے روزی ملتی ہے وہیں انسان کو رہنا بھی پڑتا ہے۔ تم تو ایسا کرو کہ یہیں کراچی میں ہی کوئی بنگلہ خرید لو۔"

"لیجیے بھلا یہاں کراچی میں بنگلہ خریدنے کی بھی کوئی تک ہے ممی۔ اور پھر لو بھی تو کس علاقے میں۔ ڈیفنس میں تو تمام نو دولتیے (اسٹارلٹ دنیٹے دو لیتیے) رہتے ہیں۔ اور کلفٹن ایریا میں بھی تقریباً ایسے لوگوں کی آبادی ہے۔ اب لے دے کے ڈی اے ایریا ہی رہ جاتا ہے تو وہ تو اس قدر کنجسٹیڈ (گنجان) ـــــ ہو کر رہ گیا ہے کہ وہاں کوئی بنگلہ خرید کر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شوہر کے کچھ کہنے سے پہلے نازو منہ بنا کر بولی۔

"لیکن میرے خیال میں تو سرے سے کہیں بنگلہ خرید کر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے کلفٹن والے بنگلے میں کوئی ایسی برائی بھی نہیں ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہے ممی کہ کتنا وسیع ہے۔ ایک تو ڈھائی ہزار گز پر بنا ہوا ہے دوسرے پاپا نے آدھا حصہ ہمارے لیے مختص کر دیا ہے۔ انہیں وغیرہ اپر (بالائی) پورشن میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ اور میرے خیال میں ہمارے لیے تو فی الحال یہی بہت کافی ہے۔" احمد سروش باتوں ہی باتوں میں دل کی بات کہہ گیا۔

"اصل میں ممی یہ احمد جوائنٹ فیملی سسٹم کے حامی ہیں یا پھر اتنی استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے کہ بیوی کے لیے دوسرا بنگلہ خرید کر اس میں رہ سکیں۔"

شوہر کے خیالات سن کر نازو نے تیوری چڑھا کر اس پر طنز کیا۔ تو زینت اس کے طنز کو پینے کی کوشش میں جلدی سے بولیں۔

"نہیں، خیر اگر استطاعت بھی رکھتے ہیں تو بنگلہ خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے مل جل کر رہنے سے انسان تجربے کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا قرینہ بھی تو سیکھتا ہے اور پھر یہ ایک دم ہی تو اپنے گھر والوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے نا۔"

"جی۔ جی۔ بس یہی بات تو ان کی سمجھ میں نہیں آئی ممی۔ یوں بھی تو بقول آپ کے ہم کل ہی تو یہاں پہنچے ہیں۔ اتنے جلد بھلا کیسے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔" ساس کی بات پر احمد سروش خوش ہو کر بولا۔ نازو کو ماں کا اس کی حمایت میں بولنا ناگوار تو بہت گزرا لیکن اس نے شوہر کی بات کی تردید نہیں کی بلکہ یہ موضوع ہی پلٹ دیا۔

"ڈیڈی تو خیر ساڑھے پانچ تک ہی آتے ہیں باقی سب کہاں ہیں ممی؟" اس نے ماں سے پوچھا۔

"نیلوفر ڈیزی کے یہاں گئی ہوئی ہیں آج اس کی سالگرہ ہے نا۔"

"واہ! آج ہی جانا بھی رہ گیا تھا نیلوفر کو۔" نازو نے کہا۔

"تو انھیں یہ کب معلوم تھا کہ آج ہی آپ بھی آجائیں گی۔" نیلما نے جواب میں جس برجستگی سے کہا۔ احمد سروش ہنسنے لگا۔

"اچھا، وہ ہمارے بھائی جان کہاں ہیں۔؟" نازو نے ایک تیکھی سی نظر شوہر پر ڈال کر ماں سے پوچھا۔

"وہ آجکل پاکستان کے دور افتادہ پسماندہ علاقوں کے دورے پر ہیں۔" زینت کے بجائے نیلما نے بتایا۔

"کیوں خیر تو ہے بھلا وہاں کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت پیش آگئی انھیں۔؟" نازو نے جلے کٹے انداز میں پوچھا۔

"تم کو تو معلوم ہی ہے کہ وہ بالکل الگ دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں اس لیے کراچی میں اپنا ذاتی کلینک کھول کر پریکٹس شروع کرنے کے بجائے ایسے علاقے میں ڈسپنسری کھولنا چاہتے ہیں جہاں طبی سہولتیں مفقود ہیں۔ اب بھلا ایسا خفقان نہیں تو اور کیا ہے۔ اچھی بھلی یہاں کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال سے بھاری آفر آئی تھی لیکن بابا نے اپنے خدمتِ خلق کے جذبے میں اسے بھی ٹھکرا دیا۔" زینت یوں بولیں جیسے بیٹے کی جنونی حرکتوں سے سخت نالاں ہوں۔

"لیکن ممی! اسفند بھائی کا یہ جذبہ تو بہت قابل ستائش ہے۔ ورنہ آجکل تو ڈاکٹرز اور سرجنز کا یہ عالم ہے کہ پہلے تو اپنی تعلیم پر صرف ہونے والی رقم کو حاصل کرنے کی غرض سے مریضوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں پھر اس کے بعد جب پوری رقم حاصل ہو جاتی ہے تو اپنا کیریر، اپنی زندگی بنانے کے لیے مریضوں کی جیبیں خالی کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ سے شرطیہ کہتا ہوں ممی کہ آج کے دور میں کوئی ایک ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کے جذبے سے زیر ہو کر کام کر رہا ہو۔"

"ہاں بیٹے! اصل میں یہ بے ثباتی اور خود غرضی کا دور ہے ورنہ ڈاکٹرز پیشوں سے جو بھاری بھاری فیسیں ہتھیاتے ہیں انھیں کم از کم اتنی کرلیتی تو برتنی چاہیے کہ مفلوک الحال اور غریب لوگوں کا مفت علاج کر دیا کریں۔ یوں بھی بیٹا انسان کی قسمت میں جس قدر لکھ دیا جاتا ہے وہ اتنا ہی کما سکتا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ نہیں۔" زینت بولیں۔

"اگر آپ کے یہی خیالات ہیں ممی تو پھر تو آپ کو اسفند بھائی کے جذبے کی قدر کرنی چاہیے بلکہ سراہنا چاہیے۔" احمد مسکرا کر بولا۔ تو زینت کچھ گڑبڑا سی گئیں۔

"بھئی یہ آپ بھائی جان کو اسفند بھائی کیوں کہتے ہیں احمد۔ جبکہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔" نازو پر ورنے ماں کو بغلیں جھانکتے دیکھا تو فوراً ہی بات پلٹی۔

"بھئی، وہ آپ سے ضرور بڑے ہیں مگر مجھ سے تو عمر میں پورے دو برس چھوٹے ہیں۔" احمد سروش بدستور مسکراتا رہا اور نازو جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ زینت بولیں۔

"چلو اگر یہ بابا کو اسفند بھائی کہتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ خود بابا بھی تو انھیں احمد بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔" اور ابھی زینت نے بات ختم ہی کی تھی کہ کریم نے اندر آ کر ان سے پوچھا۔

"بیگم صاحب! چائے اور ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔ کھانے کی میز پر لگاؤں یا یہیں لے آؤں۔" تو زینت نے بیٹی اور داماد سے پوچھا۔

"کیوں بھئی تم چائے یہیں پیو گے یا کھانے کی میز پر بیٹھ کر۔"

"نہیں کوئی ہم مہمان تو نہیں ہیں ـــ بس یہیں منگا لیجیے ممی۔" نازو بولی۔ کریم گھر کا پرانا ملازم تھا اور نازو کو دیکھ کر خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"ٹھیک تو ہو کریم۔" نازو کو بالآخر اس کا دل رکھنا ہی پڑا۔

"جی۔ جی مہربانی بی بی۔ میں تو خوب بھلا چنگا ہوں۔" وہ بے طرح خوش ہو کر بولا۔

"بیٹے تم چائے ہی پیو گے یا تمہارے لیے کولڈ ڈرنک منگواؤں۔" زینت نے داماد سے پوچھا۔ احمد سروش کچھ دیر تو ہچکچاتا رہا پھر سر کے پیچھے ہاتھ پھیر کر بولا۔

"ایسا کریں ممی! کہ پہلے چائے منگوا لیں پھر اس کے بعد کولڈ ڈرنک کا نمبر بھی آجائے گا۔" اس نے جس طرح دبی دبی مسکراہٹ اور شرمیلے سے انداز میں بات کی تھی زینت سمیت نازو اور نیلما نے ایک قہقہہ لگایا۔

"دیکھو یہ ہوئی ہے نا بیٹوں کی سی بات۔ میرے بچے نے میرا دل خوش کر دیا۔ ورنہ یہ تکلف سے کام لیتا تو مجھے اپنے اور اس کے درمیان ایک غیریت سی محسوس ہونے لگتی۔" زینت واقعی بڑی خوش ہو رہی تھیں۔

"اصل میں سخت ندیدے ہیں یہ آپ کے داماد اور پیٹو بھی اس قدر کہ کوئی چیز چھوڑتے ہی نہیں۔ اگر کھانے کے ساتھ بھر اور تھوڑا سا بھی مل جائے تو خوشی خوشی کھا لیتے ہیں۔" نازو ہنس کر بولی تو زینت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھور کر اسے تنبیہ کی اور بڑے دلار سے بولیں۔

"چلو۔ چلو میرے بیٹے کو نظر نہ لگاؤ۔ یہی دن تو کھانے پینے کے ہوتے ہیں اور مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں جو نخرہ کر کر کے کھا تو سب کچھ جاتے ہیں مگر ظاہر یہی کرتے ہیں کہ کچھ کھایا ہی نہیں ہے اور تبھی کریم طرح طرح کے لوازمات سے سجی ٹرالی لیے اندر آگیا۔

"بھئی خوب تم نے تو کچھ زیادہ ہی اہتمام کر ڈالا۔" زینت نے اشارے سے ٹرالی کو نازو کے سامنے رکھوانے کے بعد کہا۔

"جی۔ یہ بی بی اور دولہا میاں جو آئے ہیں بیگم صاب۔ کچھ پلیٹیں ابھی اور رہ گئی ہیں وہ بھی لے آتا ہوں۔" کریم دانت نکال کر بولا۔ اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"لو ابھی کچھ کسر اور رہ گئی ہے۔" زینت نے ہنس کر کہا۔ نیلما اٹھ کر بہنوئی کو چیزیں سرو کرنے لگی۔

"آپ بیٹھ جائیے بے بی! کیونکہ میں تکلف سے کام لینے کا بالکل عادی نہیں ہوں۔" احمد سروش نے نیلما سے کہا تو نازو اس کی طرف جھک کر آہستہ سے بولی۔

"بس زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کیجیے۔"

"واہ۔ ایک تو میرا بچہ اپنائیت برت رہا ہے اس پر تم ہو کہ اسے ٹوکے جا رہی ہو۔ چلو جلدی سے اس کے لیے چائے بناؤ۔" زینت نے فوراً ہی بیٹی کو ٹوکا۔

"پانچ تو بج رہے ہیں اگر ڈیڈی بھی آ کر ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔" نازو نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو شاید آج دیر سے آئیں گے کیونکہ چار بجے تو شیئر ہولڈرز کی میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے انھیں۔ خیر چلو ڈنر پر تو موجود ہی ہوں گے۔" زینت بولیں تو احمد سروش نے قدرے سراسیمگی سے نازو کی طرف دیکھا۔

"لیکن ممی ڈنر تک تو ہم نہیں ٹھہریں گے۔" نازو نے کہا۔

"ہائیں یعنی لنچ تو کھایا نہیں اب ڈنر بھی نہیں لو گی ہمارے ساتھ۔ اے بچی میکے آئی ہو یا کسی ایرے غیرے کے یہاں۔" زینت تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔

"اوہو ممی۔ آپ نے پہلے پوری بات تو سن لی ہوتی۔ وہ اصل میں اپنے بزنس کے سلسلے میں ان کا بھی ایک ضروری اپائنٹمنٹ ہے جس کی وجہ سے ہمیں بغیر اطلاع ہی اچانک آنا پڑا تھا۔ ویسے ڈنر کھلانا اگر بہت ضروری ہے تو میں نہیں رک جاتی ہوں یہ واپسی میں مجھے پک کر لیں گے۔" لاڈلی بیٹی تین ماہ کے قلیل عرصے میں کس قدر بدل گئی تھی۔ تعجب کے ساتھ ساتھ انھیں دکھ تو بہت ہوا لیکن داماد کے سامنے اسے ٹوکنا یا اس تبدیلی کا احساس دلانا انھیں مناسب نہ لگا۔ اس لیے وہ خاموش ہی رہیں۔

احمد سروش اٹھا اٹھا کر بڑی بے تکلفی سے کیک پیسٹری اور چکن پیٹیز کھاتا رہا۔ وہ خاصا خوش خوراک تھا۔ زینت اس کی اس بے تکلفی پر دل ہی دل میں خوش ہوتی رہیں۔ کہ ساسیں عموماً ایسے دامادوں کی خواہش کرتی ہیں جو ان سے اپنائیت سے پیش آئیں۔ چائے کے تھوڑی دیر بعد لیموں پانی کا فل سائز گلاس بھی آگیا۔ جسے ختم کر کے احمد سروش نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور اٹھ کر ساس سے جانے کی اجازت چاہی۔ جبکہ نازیہ دربھی اس کے ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

نازیہ درکو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ تھی اس لیے وہ اسے کار تک چھوڑنے بھی نہیں آئی۔ البتہ لونگ روم سے نکل کر وہ لاؤنج میں آگئی تھی۔ لیکن ایک ٹرے میں چائے دانی اور پیالیاں سجائے اس نے کریم کو اندر کا رخ کرتے دیکھا تو معاً اسے دادی

کا خیال آیا لیکن اس سمے اس کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا اور وہ میکے آکر پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ احمد سروش کا اپائنٹمنٹ ساڑھے سات بجے تھا اور وہ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ یوں تو گھر جا کر اسے لباس بھی تبدیل کرنا تھا اور کچھ تیاری بھی کرنی تھی لیکن تین ماہ کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ وہ یوں بیگانوں کی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

جبکہ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرتا۔ یا کم از کم جھوٹے منہ کہہ دیتا کہ چلو میرے ساتھ میں تیار ہونے کے بعد تمھیں یہاں ڈراپ کرتا چلا جاؤں گا۔

لیکن اس نے اس کے کان کے پاس جھک کر صرف اتنا ہی کہا۔

"بائے۔ جان۔"

زینت داماد کو رخصت کر کے شعیب منصور کو فون کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں واپس آئیں تو بیٹی کو عجیب سے موڈ میں لاؤنج میں کھڑا دیکھ کر انھوں نے کہا۔

"ارے تم یہاں کیوں رک گئیں کم از کم میاں کو کار تک تو چھوڑ آتیں۔"

"ہونہہ میں کیوں چھوڑتی جب انھوں نے جھوٹے منہ پوچھا تک نہیں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" نازو غصے سے بولی۔

"مگر تم نے خود ہی تو اس سے کہا تھا کہ تم یہاں رک رہی ہو اور وہ واپس آتے ہوئے تمھیں پک کرے۔" زینت بیٹی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں بولیں۔

"اگر کہا بھی تھا تو تب بھی انھیں کہنا تو چاہیے تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے سے تیار بیٹھے تھے یا خدا سے چاہ رہے تھے کہ میں یہاں رک جاؤں۔" نازو تیز لہجے میں بولی۔

"اچھا تو کیا تمھارا بھی اس کے ساتھ جانے کا پروگرام تھا؟" زینت نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تو خالص کوئی جینٹس (مردانی) میٹنگ تھی۔ اصل میں ایک اسائنمنٹ پر بات ہو رہی ہے جس کے لیے احمد کو اپائنٹ کیا گیا تھا۔ پھر بھلا میرے جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔" نازو اپنے اسی بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ بولی۔

"پھر تو ٹھیک ہے اس نے یہی سوچا ہوگا کہ گھر چھوڑنے کے بجائے تمھیں تھوڑی دیر کے لیے یہیں چھوڑ چلے۔" زینت لاؤنج میں پڑی کوچ پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"نہیں ممی یہ بات نہیں وہ جان کر مجھے یہاں چھوڑ گئے ہیں تاکہ ماں بہنوں سے انھیں کھل کر بات کرنے کا موقع مل سکے۔" نازو بولی۔

"لیکن چھ تو بج رہے ہیں اس کے پاس کسی سے بات کرنے کا وقت ہی کہاں ہوگا۔ یوں بھی بیٹی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی گرفت کر کے تلخیاں پیدا کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اور ابھی تمھاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں بالکل نیا نیا معاملہ ہے۔ ایسی باتوں سے پرہیز کیا کرو جو شکر رنجی کی صورت پیدا کریں۔" زینت نے رسانیت سے بیٹی کو سمجھایا۔

"نہیں ممی! آپ نہیں جانتیں کہ یہ کتنے اسٹوپڈ اور مین سے لوگ ہیں اگر چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتی رہی تو پھر یہ میرے سر ہی چڑھ جائیں گے۔" نازو بولی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا رویہ تم سے ٹھیک نہیں ہے۔ مگر تعجب ہے تم کل رات کو ہی تو واپس آئی ہو۔" زینت نے بیٹی کی گفتگو سے اندازہ لگا کر کہا۔

"لیکن کل رات سے پہلے بھی میں پورا ایک ڈیڑھ ماہ ان لوگوں کے ساتھ گزار چکی ہوں ممی۔" نازو تڑختے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں ہاں تو کیا اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں ہی۔"

"اب کچھ کہوں گی تو آپ یہ نہ کہیے گا کہ شریف لڑکیاں سسرال والوں کی برائیاں نہیں کرتیں اور خود میں بھی پسند نہیں کرتی کہ دوسروں کے سامنے سسرال والوں کی عیب جوئی کروں مگر آپ میری ماں ہیں اور ماں سے اپنی نجی اور غیر نجی ہر بات کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔" نازو بات کاٹ کر بولی۔

"ہاں ہاں بالکل۔ ماں سے نہیں کہو گی تو کس سے کہو گی۔" زینت نے فوراً ہی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"جی ہاں۔ اب طریقہ تو یہی ہوتا ہے کہ کوئی بات کرنی ہو تو سامنے بیٹھ کر ہی کی جاتی ہے۔ مگر وہاں تو ماں بیٹیاں بیٹے کو بلا کر کمرہ بند کر لیتی ہیں اور گھنٹوں اس سے کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں اور اگر لاؤنج وغیرہ میں بیٹھ کر بھی کرتی ہیں تو مجھے دیکھتے ہی سب کے ہونٹ سل جاتے ہیں۔ کل رات کو بھی اتنی دور دراز کا سفر طے کر کے آئے تو باپ کے سوا سب کے سب میرے کمرے میں جمع ہو گئے اور میرا سارا سامان کھنگالنے کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ بجے تک بیٹھے ہنسی مذاق کرتے رہے اور ادھر جمائیاں لیتے میرے جبڑے چٹخنے لگے مگر کسی نے

پروا تک نہ کی۔ خود احمد بھی ماں بہنوں کے سامنے مجھے بھلا بیٹھتے ہیں۔"

"اصل میں تم دونوں اتنے دن بعد آئے تھے نا اس لیے ماں بہنوں نے سارے دنوں کی کسر پوری کر دی ہوگی۔ آخر تو اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔" دل میں اس بات پر پشیمان سی ہونے کے باوجود کہ غلط لوگوں میں پھنس گئی ہیں۔ زینت نے بظاہر اظہار خیال کے طور پر کہا۔

"اگر یہی بات تھی تو پھر انھیں اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی ڈبہ میں بند کر کے یا شوکیس میں سجا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" نازو چمک کر بولی۔

"تعجب ہے میں ان لوگوں کو اس قدر گرا ہوا تو نہیں سمجھتی تھی۔" زینت دل ہی دل میں افسردہ ہو کر بولیں۔

"گرے ہوئے تو ہوں گے ہی اپ اسٹارٹس (نودولیتے) جو ہیں باتیں ہی کیا حرکتیں بھی سخت اوچھی ہوتی ہیں ان کی جبکہ خود کو ظاہر تو یہی کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی دولت مند ہی نہیں زمانے میں لیکن دوسروں کی دولت اور ثروت دیکھ کر نہ ہرے شق ہو جاتے ہیں ان کے۔ فلاں کے پاس اتنی ساری گاڑیاں ہیں۔ اتنا زیادہ زیور ہے۔ فلاں نے اتنا زبردست ڈنر دیا تھا۔ ہزاروں مہمان بلائے تھے وہ بھی شیرٹن میں۔ اتنی وائٹیز (ڈشیں) تھیں کھانوں کی کہ شاید ہی کسی کے یہاں ہوں گی۔ فلاں لڑکی کو اتنا بھاری جہیز ملا ہے اے سی سے لے کر وی سی آر اور بنگلہ تک لائی ہے اپنے ساتھ۔ داماد کو بھی مالا مال کر دیا ہے لڑکی والوں نے۔ اس پر ہر بات میں ہم ہی ہم۔ گھر کا ماحول بھی کچھ عجیب ہی سا ہے ممی۔ ایک تو بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ اس پر یوں لگتا ہے جیسے سب ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔ خاص طور پر وہ احمد کی پھوپی شاداب پوری فائٹر کوک (لڑاکا) ہے گالیوں میں اتو کی ولدیت اور بوی بہن اور بھائی یعنی سالی اور سالے۔ لڑکیاں تک میٹھے بول سمجھ کر ادا کرتی رہتی ہیں اور وہ ہمارے سسر صاحب تو لگتا ہے جیسے عرصے تک جلاد کے عہدے پر فائز رہے ہوں۔ کہ ان کے آتے ہی سب یوں کونوں کھدروں میں دبک جاتے ہیں جیسے سر تن سے جدا کرنے کی غرض سے ننگی تلوار لہراتے چلے آ رہے ہوں۔ اور حد تو یہ ہے کہ ان کی بیوی بھی انھیں دیکھ کر کچھ ایسا امپریشن دیتی ہیں جیسے قربانی کی بکری قصائی کو دیکھ کر۔ اف ایک بات ہو تو بتاؤں ممی۔" نازو کے کہنے کا جلا کٹا سا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ زینت کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"ہنسنے کی بات نہیں ممی۔ سچ مجھے تو اپنی قسمت پر رونا ہی آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اجڈ اور گنوار لوگوں میں آ پھنسی ہوں۔ اَن کلچرڈ ہیں یہ لوگ کیا بتاؤں۔ کھانے کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں ہر وقت چرتے ہی نظر آتے ہیں۔ اس پر ایک تو کھانا چپڑ چپڑ کر کے کھاتے ہیں جیسے وار فیلڈ (میدانِ جنگ) میں پہنچنے کی جلدی ہو اور سر پر خطرے کا سائرن بج رہا ہو۔ کھانے پر بڑوں کا انتظار کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی بس کھانا سامنے آیا اور ٹوٹ پڑے۔ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ کھانا ختم کر کے بڑوں کا انتظار ہی کر لیں یا پھر میز سے اٹھیں تو معذرت کر کے اٹھیں۔ اور خاص طور پر وہ ہمارے سسر صاحب کھانے کے بعد ڈھور ڈنگروں کی طرح کچھ اتنے زبردست طریقے سے ڈکار لیتے ہیں کہ بے دھیانی میں پاس بیٹھا انسان دہل کر اچھل ہی پڑے۔ اس پر موصوف ایک روز اتنے بے تکلف ہوئے کہ تہبند اور بنیان ہی میں میرے سامنے چلے آئے وہ تو احمد جلدی سے انھیں باہر لے گئے ورنہ ہمیشہ کے لیے فری ہی ہو جاتے۔ بھلا آپ ہی بتائیے ممی۔ ڈیڈی۔ بھائی جان یا ہمارے دادا اور چچاؤں نے کبھی تہبند باندھا ہے یا اتنی فلک شگاف ڈکاریں بھی لی ہیں اور آپس میں تو تکار کر کے ہی کبھی بات کی ہے۔ ان لوگوں نے تو ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر اپنی ساری اوقات دکھا دی آئندہ تو پتا نہیں اور کیا کیا دکھائیں گے۔" بات کے اختتام پر نازپرور دل گرفتہ سی ہو کر بولی۔

"ہاں بیٹی۔ یہ لڑکی کی شادی کا معاملہ بھی واقعی ایک جوا ہی ہوتا ہے۔ کہ پانسہ چت پڑ گیا تو جیت ہی جیت اور پٹ پڑ گیا تو مات ہی مات۔ خیر تم تو صرف اپنے شوہر سے واسطہ رکھو۔ سسرال والوں کو زیادہ منہ ہی نہ لگاؤ۔ حالانکہ اصولاً تو ہر ماں بیٹی کو یہی نصیحت کرتی ہے کہ وہ سسرال والوں سے ادب و اخلاق سے پیش آئے لیکن جب تمھاری سسرال والے تمھارے اسٹینڈرڈ کے ہی نہیں تو میں اس کے سوا تمھیں اور کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔" زینت نے دل ہی دل میں آزردہ ہو کر کہا۔

"اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا ممی۔ کیونکہ۔ ایک جگہ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر اگر میں ان سے کوئی واسطہ نہ بھی رکھوں گی تو بھی ان کا واسطہ تو مجھ سے پڑتا ہی رہے گا۔ اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ ان لوگوں سے الگ ہی ہو جاؤں۔" نازو بولی۔

"لیکن اتنے جلد یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بیٹی۔ آخر وہ اسی ماں کی گود میں پروان چڑھا ہے اسی باپ کے سائے میں پرورش پاتا رہا ہے جس سے تمھاری طبیعت میل نہیں کھاتی۔ وہ ایک دم ہی تو اپنے سگے چاہنے والوں کو چھوڑ کر علیحدہ تو نہیں ہو سکتا نا۔ بس تم تو احمد کو اپنی گرفت میں رکھو۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ سوسائٹی موو کرتی ہے اس لیے اٹی کیٹس (علم مجلسی) سے بھی واقف ہے۔" زینت سمجھانے کے سے انداز میں بولیں۔

"جی ہاں ممی۔ واقعی ان سب میں احمد ہی اچھے ہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھے ہیں شکر ہے باپ پر نہیں گئے۔ بلکہ باپ کی ضد ہی واقع ہوئے ہیں۔ مگر سمپل (سادہ) بہت ہیں اور کچھ خامیاں بھی ہیں ان میں۔ ایک تو چونکہ کھانے کے معاملے میں یہ لوگ بہت ہی بے تکلف ہیں بس ذرا سا اشارہ بھی کر دو تو فوراً ہی کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی عادت احمد کی بھی ہے۔ آپ نے نوٹ نہیں کیا احمد کی بے تکلفی کو کیسے مزے سے آدھی چیزیں چٹ کر گئے۔"

"خیر، چیزیں کھانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اور وہ واقعی بہت سیدھا اور سادہ لوح ہے۔ اس نے جس اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔" زینت بولیں۔

"اب آپ تو داماد کی حیثیت سے انھیں کھلا کر خوش ہو رہی ہیں مگر ہر ایک کے ساتھ تو یہ بے تکلفی ٹھیک نہیں نا۔ خیر میں ان کو جلد ہی سب کچھ سکھا دوں گی۔ پتا ہے ممی جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ان کو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ جو اب اتنے پولشڈ نظر آتے ہیں تو یہ میری ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے تو مجھ سے بہت امپریس ہیں۔ ویسے بھی میرا بہت لحاظ (احترام) کرتے ہیں اور میری ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔" شوہر کے ذکر کے ساتھ ہی نازپر تو اس کی محبت غالب ہونے لگی تھی اور وہ اس کے تصور میں ڈوبی ڈوبی کہہ رہی تھی۔

"بس پھر تو پھر فکر کس بات کی۔ شوہر اپنا ہو تو پھر کس کی مجال جو ٹیڑھی نگاہ سے تمھاری طرف دیکھ بھی لے۔" زینت کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹا تو وہ چہک کر بولیں۔

"جی ہاں ممی۔ اصل میں اس تین ماہ کے عرصے میں ہماری انڈر اسٹینڈنگ بھی تو بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اور ہمارے درمیان یہ طے پایا ہے کہ ہم اپنی اپنی آپس کی ناپسندیدہ باتیں یا عادتیں ترک کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی ناپسندیدہ عادتوں کو ٹالریٹ (برداشت) کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام بھی کریں گے اور کسی اختلاف کو اپنے درمیان حائل نہیں ہونے دیں گے۔" نازپرور شاید اپنے ہنی مون کی رنگین دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ جو بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"ہاں یہ آپس کا اتفاق اور التفات ہی تو نباہ کی کڑیوں کو مضبوطی سے جکڑتا ہے۔" زینت خوش ہو کر بولیں۔

"اس کے باوجود بھی ممی میں وہاں اسٹینڈ نہیں کر سکوں گی۔ وہ لوگ ہی نہیں بلکہ وہاں کا ماحول بھی مجھے سوٹ نہیں کرتا یوں بھی کراچی مجھے بالکل پسند نہیں۔" نازپرور بیزار کن سے لہجے میں بولی۔

"تو بھلا ایک کراچی ہی تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ عروس البلاد بھی کہلاتا ہے اور پھر یہاں کی رہائش چھوڑ کر آخر رہو گی کہاں۔" زینت بیٹی کی باتوں پر چڑ کر بولیں۔

"خدا کی زمین بہت وسیع ہے ممی۔ کسی فورن کنٹری میں اپنا آشیانہ بنا لیں گے۔ سچ مجھے تو یہاں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔" نازو قدرے نخوت بھرے لہجے میں بولی۔

"کمال ہے بیٹی تم اپنے میاں کے سامنے بھی ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں مگر میں نے اس کے سامنے تمھیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ تو بھلا پیدا یہاں ہوئیں اسی سرزمین کا آب و دانہ کھا کر پروان چڑھیں۔ یہیں اپنے سگوں کی ہمراہی میں تم نے جینے کا قرینہ سیکھا اور اب صرف تین ماہ باہر گزار کر آئی ہو تو تمھارے دماغ ہی نہیں مل رہے۔ بیٹی یہ تو اوچھے اور بے ضمیر لوگوں کی باتیں ہیں جو تم کہہ رہی ہو ورنہ یاد رکھو جس طرح بچہ باپ کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک انسان کی شناخت اس کے ملک اور قومیت سے ہی ہوتی ہے۔ اب یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ تم اگر سوئٹزرلینڈ یا لندن میں رہائش اختیار کر لو تو برٹش یا سوئس ہی کہلانے لگو۔ جہاں بھی رہو گی پاکستانی ہی تو کہلاؤ گی نا اور اپنا ملک اور زبان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔"

"اُفوہ ممی آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ مجھے میرا ملک عزیز نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ ترقی میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اور میں اپنی اس نئی زندگی کو کسی ایسی جگہ گزارنا چاہتی ہوں جہاں مجھے زندگی کی تمام آسانیاں اور خوشیاں مل سکیں۔ ماں کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے نازپرور عاجز سی ہو کر بولی۔

"زندگی کی بہت سی آسانیاں اور خوشیاں تمھیں یہاں رہ کر بھی نصیب ہو سکتی ہیں۔ یہیں اپنا ایک چمن بناؤ۔ کچھ اصول وضع کرو شوہر کی محبت اور التفات تو تمھیں میسر ہی ہے۔ یوں بھی بیٹی ازدواجی زندگی بند کتاب کی مانند ہوتی ہے جسے کھولنے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے سمجھ میں آنے والی عبارت درج ہے یا سر سے گزر جانے والی۔ یاد رکھو شوہر کا دل جیتنے کے لیے عورت کو اپنی بیشتر خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم فی الحال انھی لوگوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر لو۔"

زینت کے ناصحانہ انداز میں تنبیہ سی شامل تھی۔ نازپرور کوئی جواب ہی دینے والی تھی کہ تبھی آذان مغرب کی حیات بخش آواز سماعت سے ٹکرائی۔ زینت نے جل شانہٗ جل جلالہٗ کہتے ہوئے ساڑھی کا پلّو سر پر ڈال لیا۔ بیٹی نے بھی ماں کی تقلید کی اور اُٹھ کر لاؤنج کی لائٹس جلا دیں۔ ماں نے جو نصیحت کی تھی اس کے جواب میں مزید کچھ کہنے کی نازو نے گنجائش نہیں دیکھی تو اذان ختم ہوتے ہی لاؤنج میں رکھے کلر ٹی وی کا بٹن دبانے کے بعد ماں کے پاس کوچ پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر چلتے ہوئے اشتہارات پر نظریں جما کر پوچھا۔ اس نے بے دھیانی میں ٹی وی کی آواز اونچی نہیں کی تھی۔

"کمال ہے مغرب کی اذان بھی ہو گئی اور ابھی تک ڈیڈی نہیں آئے۔ کیا آجکل دیر سے آتے ہیں؟"

"نہیں روز تو نہیں البتہ کبھی کبھی انھیں ضرور دیر ہو جاتی ہے اور میں نے تو احمد کے جاتے ہی ان کے سیکرٹری کے ذریعے فون پر انھیں تمھارے آنے کی اطلاع کرا دی تھی۔ شاید میٹنگ طول کھینچ گئی ہو گی۔ جو ابھی تک نہیں آئے۔" زینت نے بتایا۔

"مگر یہ شیئر ہولڈرز کا کیا چکر ہے ممی جبکہ ڈیڈی کی کسی کے ساتھ پارٹنر شپ بھی نہیں ہے؟" نازو نے پوچھا۔

"ہاں پارٹنر شپ تو نہیں ہے لیکن بزنس کو وسعت دینے کی غرض سے باسٹھ لاکھ روپے کا ایک ٹینڈر جاری ہوا ہے جسے ایک پارٹی کے ساتھ شعیب بھی شیئر کر رہے ہیں۔"

"او گاڈ۔" نازو نے صرف اتنا ہی کہا۔ اُسے واقعی گھر پر طاری سناٹے سے وحشت سی ہو رہی تھی۔

"یہ نیلما کہاں غائب ہو گئی۔ احمد کو کار تک چھوڑنے گئی تھی نا؟" کچھ توقف کے بعد اس نے اس بوریت زدہ ماحول سے اُکتا کر پوچھا۔

"ہاں چھوڑنے تو گئی تھی مگر اس پر آجکل طرح طرح کی ڈشز بنانے کا خبط سوار ہے۔ باقاعدہ ایک کوکنگ سینٹر میں داخلہ بھی لے رکھا ہے اور اب تمھارے لیے کوئی چائنیز ڈش تیار کرنے میں مصروف ہے۔"

"او ہاؤ سویٹ۔ یہ نیلما شروع ہی سے بڑی ٹیلنٹیڈ ہے ممی۔" نازو خوش ہو کر بولی مگر اُس کا لہجہ شگفتہ نہ تھا۔

"ہاں لیکن پڑھائی میں بہت کمزور ہے۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے اُسے تعلیم سے اتنا شغف نہیں جتنا گھریلو کاموں سے ہے۔" زینت بولیں۔

"تو گھریلو کام بھی تو زندگی میں سب سے اہم ہوتے ہیں ممی۔ آپ لوگوں نے اُسے فزکس پڑھوا کر واقعی اس پر بہت زیادتی کی ہے۔ اس کے رجحان کے پیش نظر آپ کو اُسے ہوم اکنامکس کالج میں ایڈمیشن دلوا دینا چاہیے تھا۔" نازو بولی۔

"ہاں غلطی ہو گئی اب کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔" زینت نے یوں کہا جیسے اس موضوع کو ٹالنا چاہ رہی ہوں۔

"یہ نیلوفر کی واپسی آخر کب تک ہو گی ممی۔ پونے سات تو بج رہے ہیں۔ کیا رات کا کھانا کھا کر لوٹے گی؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں، رات کا کھانا کیوں کھانے لگی۔ برتھ ڈے پارٹی میں گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات بجے تک واپس آجائے گی۔" زینت نے کہا۔

"ہوں لگتا ہے نیلوفر کی ایکٹیوٹیز کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔" نازو جھُنجھلائے سے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ ایکٹیوٹیز تو نہیں بڑھیں۔ البتہ تمھارے جانے کے بعد چونکہ بے رونقی ہو گئی ہے اس لیے وہ یہاں کی بوریت سے گھبرا کر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ تمھاری کار تمھارے ڈیڈی نے اُسے دے دی ہے۔" زینت نے کہا۔ تو نازو یوں اُچھلی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"ہیں، میری کار ڈیڈی نے نیلوفر کو بخش دی ہے۔ لیکن میں مر تو نہیں گئی تھی جو میرے جاتے ہی میری چیزوں کا بٹوارہ بھی کر دیا گیا۔ اور نیلوفر کو اتنی آزادی کیسے دے دی ڈیڈی نے کہ وہ تنہا شام تک آوارہ گردی کرتی رہتی ہے۔"

"ارے ارے تم ٹھیک ٹھاک تو ہو بیٹی۔ یہ آج کیسی لچر قسم کی گفتگو کر رہی ہو۔ اگر تمھارے خیال میں نیلوفر آوارگی بھی کرتی ہے تو تنہا نہیں کرتی نیلما ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ تو آج بھی نیلما کو ساتھ لے جانے کے لیے مصر تھی مگر نیلما کسی طرح تیار ہی نہیں ہوئی۔" زینت نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

"خیر جو کچھ بھی سہی لیکن ڈیڈی کو میری کار نیلوفر کو نہیں بخشنی چاہیے تھی۔ جبکہ میں نے تو یورپ سے واپسی پر سوچا تھا کہ اپنی کار آپ سے لے لوں گی۔" نازو بگڑے بگڑے سے انداز میں بولی۔

"کیوں کیا کاروں کا ہار بنا کر ڈالو گی گلے میں۔ خیر سے تمھارے میاں کے پاس تو چار چار گاڑیاں ہیں۔" زینت نے متعجب سے انداز میں پوچھا۔

"اُن کے پاس ہیں میرے پاس تو نہیں۔ بس اسی لیے لے جانا چاہتی ہوں۔" نازو تڑخنے ہوئے لہجے میں بولی۔ تو زینت چُپ سی ہو گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے میں تمھارے ڈیڈی سے بات کروں گی۔ اگر انھوں نے" تو نازو ان کی بات قطع کر کے قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"یہ آپ ڈیڈی کی اُنگلی پکڑ کر کب تک چلیں گی ممی۔ آخر آپ کا بھی کچھ اختیار کچھ مرضی ہو گی۔ پھر آپ ہر معاملے میں ڈیڈی کی مرضی کو کیوں مقدم رکھتی ہیں۔" زینت کو بیٹی کا لب و لہجہ سخت ناگوار گزرا۔ وہ بھی قدرے تیز لہجے میں بولیں۔

"اگر تم میرے اختیار اور مرضی ہی کی بات کرتی ہو تو پھر میں یہ کہوں گی کہ میں وہ کار تمھیں ہرگز نہیں دوں گی۔"

"مگر کیوں؟ آخر کس وجہ سے ممی۔" نازو نے جز بز سی ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ اب وہ کار نیلوفر کو دے دی گئی ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ اُس سے چھین کر اُس کی دل آزاری کا سبب بنوں۔" زینت نے وجہ بیان کی۔

"تو پھر یوں کیجئے کہ اپنی شیراڈ میرے حوالے کر دیجئے۔ آپ تو یوں بھی کم ہی اُسے استعمال کرتی ہیں۔ گیراج میں پڑے پڑے یقیناً اس میں زنگ لگ جائے گا۔" نازپرور نے کہا تو ایک بار پھر زینت چپ سی ہو گئیں۔

"کیوں ممی۔ کیا اب چند ہزار کی کار بھی مجھ سے عزیز ہو گئی آپ کو۔ کیا شادی کے بعد بیٹیاں اس قدر غیر ہو جاتی ہیں؟" نازپرور نے شاکی سے انداز میں دوسرا سوال کیا۔

"نہیں۔ یہ تو تمھاری سمجھ کا پھیر ہے جو تم ایسا کہہ رہی ہو ورنہ کہیں ایسی بے جان چیزیں بھی ایک ماں کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہو سکتی ہیں۔" زینت نے کہا۔ انداز تسلّی دینے کا سا تھا۔

"اچھا تو پھر آپ اپنی شیراڈ۔" نازو نے کہنا چاہا تو زینت اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولیں۔

"پھر وہی شیراڈ شیراڈ۔ اچھی طرح سن لو میں تمھیں اپنی شیراڈ ہرگز نہیں دوں گی۔ کیونکہ کار کے سوا جو کچھ مجھے دینا تھا میں اپنی بساط سے بڑھ کر دے چکی ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تمھارے لیے جو کچھ کرے اب احمد ہی کرے۔ کیونکہ اب تم ہماری نہیں اس کی ذمہ داری ہو۔ آج میکے سے کار لے کر جاؤ گی تو کل تمھیں مزید کسی چیز کی ضرورت پڑی تو وہ یہی کہے گا کہ اپنے ماں باپ سے جا کر لے آؤ۔ تمھیں معلوم نہیں بیٹی داماد وں کی قوم بڑی بدذات اور حریص ہوتی ہے۔ اُسے ایک مرتبہ بیوی کے میکے سے چیزیں اینٹھنے کا چسکا پڑ جاتا ہے تو پھر ساری عمر بیوی کے میکے والوں کو ہی لوٹتی کھسوٹتی رہتی ہے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تو بیوی کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرتی رہتی ہے۔ ورنہ ایک شیراڈ تو کیا میں تم پر گھر کی چاروں گاڑیاں قربان کر دیتی۔" زینت نے بات کا آغاز تو بڑے غصّے میں کیا تھا۔ مگر آخر میں وہ نرم پڑ گئیں۔

"کمال ہے ممی۔ آپ نے نہ معلوم داماد وں کی قوم کو ہوّا کیوں بنا رکھا ہے۔ ورنہ کم از کم احمد تو دور تک ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن بے چارے کو تو فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ میں اپنی کار لے جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ یہ تو کچھ میری خواہش تھی اور کچھ ان کی ماں بہنوں کی باتیں سن کر میں نے ایسا سوچا تھا۔ تاکہ بعد میں وہ منہ در منہ یہ نہ کہہ دیں کہ تم تو ایک معمولی سی کار بھی نہیں لائیں اور پھر میکے سے ملی ہوئی چیز سسرال میں لڑکی کی قدر و منزلت ہی بڑھاتی ہے۔"

نازپرور ماں کے سمجھانے پر قدرے ٹھنڈی پڑ کر بولی۔ یوں بھی شوہر کے نظر انداز کر دینے پر اس سمے اس پر سخت جھنجھلاہٹ سی طاری تھی۔ کچھ اس وجہ سے بھی ماں سے اُلجھ پڑی تھی۔ ماں بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں کہ اس کا موڈ اس قدر آف کیوں ہو رہا ہے۔ اس کی بات پر ہنس کر بولیں۔

"ہاں بیٹی کی شادی کرنے کے بعد وہی مثل ہو جاتی ہے کہ بوٹی لے کر بکرا دینا پڑتا ہے مگر تم اطمینان رکھو۔ میں نے تمھیں اور تمھارے میاں کو کچھ نہ کچھ دینے کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا ہے خالی ہاتھ تو جانے نہیں دوں گی تمھارے سوئٹزرلینڈ جانے سے پہلے بھی جب بھی تم میکے آتی رہیں میں نے کبھی تمھیں اور اُسے خالی ہاتھ بھیجا؟ بیٹی بجائے اس کے کہ شادی کے بعد میکے والے بری الذمہ ہو جائیں اُن کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ بڑے نازک معاملات ہوتے ہیں یہ مجھے تو افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس قدر روایتی اور پست ذہنیت ہو جاتے ہیں۔ خیر میں نے تو تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے بیٹے کے معاملے میں بالکل ہی دوسری ثابت ہوں گی۔" ماں کی گفتگو سن کر نازو خاموش ہی رہی یا شاید اس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

زینت خود بھی اس موضوع سے کترانا چاہ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد آواز ٹی وی پر نظریں مرکوز کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

"ارے اس کی آواز تو اونچی کر دو شاید کوئی ڈرامہ ہو رہا ہے۔" نازو نے اُٹھ کر آواز اونچی کرنے کے بجائے ٹی وی ہی بند کر دیا۔

"ممی! کچھ بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا یہاں کی بوریت سے مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔" اس نے پلٹ کر ماں کے پاس کمرے میں ہوتے کہا تو زینت بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ارے اپنے کمرے کو کیا بھول گئیں بیٹی جو ابھی تک اس کا خیال ہی نہیں آیا اور ادھر میں ہوں کہ روز ہی اس کی جھاڑ پونچھ کرواتی ہوں۔" زینت موضوع بدل کر بولی۔

"چھوڑیں ممی اب اس کمرے سے میرا واسطہ ہی کیا رہا۔ رہنا تو مجھے دوسرے گھر میں ہی ہوگا نا۔" ناز پرور بے دلی سے بولی۔

"ہاں ہاں۔ خدا تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ اصل گھر تو اب وہی ہے تمہارا۔ لیکن میں نے تو اس خیال سے کہ کبھی آؤ تو تمہیں اور تمہارے میاں کو کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو، تمہارا کمرہ خوب سجا سنوار دیا ہے آؤ چل کر ذرا دیکھ تو لو۔" زینت بیٹی پر دل ہی دل میں ملول سی ہو کر بولیں۔

"اچھا دیکھ لوں گی ممی۔ مگر یہ آپ نے میرے کمرے پر اتنی محنت کیوں کی کیونکہ کبھی آنے کا اتفاق بھی ہوا تو ایک دو روز کے لیے ہی آؤں گی۔ کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں۔ میرا مطلب ہے اتنا اہتمام کرنے سے فائدہ ہی کیا ہوگا آپ کو۔"

"اے تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے بیٹی۔ خدا نہ کرے جو تم ہمیشہ کے لیے یہاں آؤ۔ میں برابر نوٹ کر رہی ہوں کہ تم حد سے زیادہ جذباتیت کا شکار ہو گئی ہو۔ ارے اگر وہ چپ چاپ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا تو یہ بھی اس کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس نے تمہارے یہاں ٹھہرنے کی خواہش کا احترام ہی تو کیا ہے۔ ورنہ کوئی آڑے ترچھے دماغ کا ہوتا تو ہم پر اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے ساتھ لے جانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تم سے بار بار کہلواتا اور الٹا ہم پر چھدا رکھ کر ہی تمہیں یہاں چھوڑتا۔ دیکھو بیٹی ازدواجی زندگی میں جذباتیت سے نہیں بلکہ عقل اور صلاحیت سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ تبھی جا کر ایک کامیاب زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی گرفت نہیں کرتے۔ تمہارا تو ابھی نیا نیا معاملہ ہے اس پر ساس نندوں کا ساتھ بھی ہے اگر ابھی سے ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لوگی تو تمہارا میاں تمہاری مٹھی میں آ جائے گا۔ مرد کی جبلت اگر شیطانی نہیں تو بدمزور ہوتی ہے اور شروع شروع میں تو تقریباً سارے مرد یونہی اپنی بیویوں پر صدقے واری جاتے ہیں اور ان کے سامنے اپنی محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر بعد میں۔"

"او اچھا اچھا ممی خوب سمجھ گئی ہوں۔ بلکہ آپ کی باتیں گرہ میں باندھ لی ہیں مگر پلیز ممی اب مزید کچھ نہ کہیں۔ میں نے واقعی اپنی خوشی کو کرکرا کر دیا ہے اپنی حماقت سے۔" ناز پرور ماں کی تقریر نما نصیحت سے اکتا کر بولی۔ تو زینت اس کے کہنے کے انداز پر مسکرائیں کیونکہ اس سمے سات بج چکے تھے۔ نازو نے جلدی سے ٹاپک بدلتے ہوئے ماں سے کہا۔

"اپنے کمرے میں تو بعد میں چلی جاؤں گی پہلے ذرا جا کر بیلما کو دیکھوں کہ کچن میں کیا کارگزاری کر رہی ہے۔ مائی سویٹ لٹل سسٹر (میری پیاری چھوٹی بہن)۔"

"اچھا جاؤ چلی جاؤ۔ میں بھی ذرا تمہارے ڈیڈی کو فون کر کے ابھی آتی ہوں۔ آخر کچھ معلوم تو ہو کہ اتنی دیر کیوں لگا دی۔" زینت نے کہا اور پلٹ کر جانے لگیں تو ناز پرور کو معاً کوئی خیال آیا اس نے ماں سے پوچھا۔

"کیا اماں جان ابھی یہیں ہیں ممی۔"

"ہاں یہیں ہیں۔" زینت نے رک کر بہاٹ سے لہجے میں بتایا۔

"او ویری اسٹرینج۔ (تعجب کی بات ہے)"

"ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا۔" زبانی طور پر تعجب کا اظہار کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کیوں اپنے والوں کی یاد نہیں آئی انھیں؟" نازو نے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں آئی تو بہت تھی مگر وہ ہمارے بابا صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ان پر مہربان ہیں جو ان کے کہنے سننے کے باوجود کسی طرح انھیں جانے نہیں دیا۔" زینت کے چہرے سے ہی نہیں گفتگو کے بھی ایک ایک لفظ سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کمال ہے اتنی دیر سے آئی ہوئی ہوں مگر وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلیں آخر کیا کرتی رہتی ہیں پڑے پڑے۔" نازو نے ماں کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ تر تو لیٹی ہی رہتی ہیں۔ یا پھر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اصل میں یہ سب حیلے بہانے ہیں ان کے یہ جوڑوں کے درد کی شکایت وغیرہ ورنہ بابا کے ساتھ تو دیر تک لان میں ٹہلتی رہتی ہیں۔ اب خیر سے وہ گئے ہیں تو پھر بستر سنبھال لیا ہے۔ اس پر سلوط نے ان کی ٹہلیں کر کر کے انھیں بالکل ہی معذور کر دیا ہے۔"

"ہائیں سلوطنے کیا وہ بھی ابھی یہیں موجود ہے ممی؟" نازو نے یوں پوچھا جیسے ماں نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہو۔
"ہاں وہ ابھی تک یہیں براجمان ہیں مفت کے ہمدردی کرنے والے ملیں گے تو اور کہاں جائیں گی۔" زینت بولیں۔
"کیوں کیا پھپھو بیگم نے نہیں بلایا انھیں۔" نازو پر اب بھی حیرت طاری تھی۔
"وہ ابھی تک واپس ہی کہاں لوٹی ہیں جو اسے بلوانے کا سوال پیدا ہوتا۔ اور وہ واپسی کے خیال سے آئی ہی کب تھیں وہ تو سروس کرنے کے ارادے سے یہیں ڈیرے جمانے آئی تھیں۔" زینت جلے پھپھولے پھوڑنے کے سے انداز میں بولیں۔

"اچھا تو کہیں سروس کر لی ہے سلوط نے؟" نازو نے پوچھا۔
"نہیں۔ اول تو اتنی تعلیم اور قابلیت ہی نہیں ہے جو کہیں اچھی سی سروس مل سکے دوسرے وہ تمہارے ڈیڈی اور چچا ان کے سروس کرنے کے حق میں ہی کہاں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ یہ سب مجھے دکھانے اور سنانے کی باتیں ہیں ورنہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔" زینت نے آخری فقرہ بڑی معنی خیزی سے کہا۔

"معاملہ؟ اوہ ہاں ممی آپ نے اس روز کچھ بتایا تو تھا۔" نازو کچھ یاد کر کے بولی۔
"اے کیا خاک بتایا تھا۔ بڑے گھنے اور شاطر لوگ ہیں خصوصاً وہ تمہاری پھپھو۔ بلی کے گو کی طرح اپنے عیبوں کو چھپانے کی عادت ہے انھیں مگر تعجب ہے ان جیسی فطرت کی عورت نے اپنی نند کے معاملے کو اچھالنے کے بجائے اس قدر لیپا کیوں۔ کسی نہ کسی بات میں ان کی کوئی مجبوری ہوگی تبھی تو چھپا گئیں سب۔" زینت نند کا تصور کر کے کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئیں۔
"لیکن وہ تو سنا تھا کہ سلوط کو اغوا کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔" نازو نے سوالیہ انداز میں اپنی بات کہی۔
"اے سب کہنے سننے کی باتیں ہیں بیٹی کہیں تم سلوط سے الٹا سیدھا کوئی سوال نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ سمجھ لو شامت میری ہی آئے گی۔ یہ جو تمہارے ڈیڈی ہیں نا جو بظاہر بہت نرم خو۔ مہربان اور شیریں کلام نظر آتے ہیں۔ ایک دم شوگر کوٹڈ شخصیت ہے ان کی۔ یہ اندر سے چلتے پرزے اور بددماغ ہیں یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ جہاں بہن کا سوال آتا ہے ایسی کینچلی بدلتے ہیں کہ پھر تو کون اور میں کون سمجھیں تم۔" اور زینت کی بات پر ماں کی ہم خیال ہونے کے بجائے نازو ہنس کر بولی۔
"اونو ممی۔ میرے ڈیڈی ہرگز ایسے نہیں ہو سکتے۔ وہ بہت گریٹ ہیں ممی۔ اصل میں وہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ پھپھو بیگم کو چاہتے ہیں۔ یوں بھی وہ ان کی اکلوتی بہن ہیں اس لیے آپ کے اور ان کے درمیان کچھ اختلافات ہو جاتے ہوں گے۔ ورنہ آپ کا مقام تو بالکل الگ ہی ہے۔ بہت ہی بلند اور منفرد۔" ناز پرور نے ماں کے خیالات کی نفی کرتے ہوئے انھیں سمجھایا تو وہ آزردہ سی ہو کر بولیں۔

"ہاں بیٹی! گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ آخر تو تمہاری رگوں میں باپ کا خون ہی دوڑ رہا ہے نا۔ تو تم انہی کی بولو گی۔ ورنہ میں نے تو تمہیں بیٹی ہونے کے ناتے اپنا ایک دکھ بتایا تھا۔"
"تو ممی کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔ او مائی سویٹ ممی۔ آپ تو مجھے دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ اتنی محبت تو میں احمد سے بھی نہیں کرتی جتنی آپ سے کرتی ہوں۔" نازو ماں کے آزردہ ہو جانے پر ان کے گلے سے لگ کر بولی۔
"نہیں بیٹی۔ احمد تو خیر سے تمہارا سہاگ ہے اور اپنا سہاگ تو عورت کو ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔" بیٹی کے لپٹنے پر زینت خوش ہو کر بولیں۔
"اچھا تم جا کر اپنی دادی جان سے تو مل آؤ ورنہ تمہارے ڈیڈی آ گئے تو اپنے پاس سے تمہیں ہلنے نہ دیں گے۔" انھیں معاً شوہر کو فون کرنے کا خیال آیا تو انھوں نے کہا۔
"جی ہاں، واقعی یوں بھی ساڑھے سات بجنے والے ہیں اگر ڈیڈی آ گئے تو پھر مجھے اماں جان سے ملنے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔" نازو نے کہا۔ اور دادی کے رہائشی کمرے کی طرف چل دی۔
سلمیٰ بیگم تکیے سے ٹیک لگائے بیڈ پر نیم دراز تھیں اور ان سے چند بالشت پر سلوط پیر نیچے لٹکائے اپنے بیڈ کے سرے پر بیٹھی ایک کتاب میں سے انھیں کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ جب ناز پرور نے کمرے میں قدم رکھا۔ سلمیٰ بیگم کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا۔ اور توجہ سلوط کی طرف مگر دروازے پر ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ خوشبو کا ایک زبردست بھبکا آیا تو ان کی نظر ___ غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف ہی اٹھ گئی۔ اور ناز پرور کو دیکھتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولیں۔
"ارے میری نازو۔ آؤ آؤ تم کب آئیں بیٹی۔" اور اس کے ساتھ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ وا کر دیے خوشی سے ان کا نورانی چہرہ کھل سا اٹھا تھا۔ نازو بھاگ کر ان سے لپٹ گئی اور گلے سے لپٹے لپٹے ہی انھیں سلام کیا تو جواب میں انھوں نے اتنی بے شمار دعاؤں سے

نوازا کہ اسے نئی دا ماں کا خدشہ ہونے لگا۔ پھر وہ ان سے علیحدہ ہوئی تو کچھ دیر تک وہ اس سے اس کے یورپ کے ٹرپ کے بارے میں پوچھتی رہیں اور پوتے داماد کے بارے میں بہت کچھ پوچھا۔ نازو اطمینان سے ان کے پاس بیٹھی ہر بات کا جواب دیتی رہی۔ اس نے سلوط کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ دادی سے اجازت لے کر اٹھی تو انھوں نے ہی اسے اس کی موجودگی کا احساس دلایا۔

"اوہ آئی ایم ویری سوری سلوط۔ سچ اماں جان کی پیاری پیاری باتوں نے مجھے تمھاری احوال پرسی کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔" اس نے الٹا دادی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ تو وہ ہنسنے لگیں۔

"کوئی بات نہیں، میں نے بھی بالکل مائنڈ نہیں کیا۔" سلوط مسکرا کر بولی۔ تو نازبہ رو نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"بھئی، دادی جان سمیت سب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لائی ہوں تمھارے لیے بھی اس میں سے کچھ نکال لوں گی۔ گزشتہ رات ہی تو پہنچی ہوں۔ صبح سے دوپہر تک سسرالیوں کا ایک تانتا سا بندھا رہا تھا اس لیے اپنا سوٹ کیس کھولنے کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔" نازبہ رو کہہ رہی تھی وہ بھی سلوط سے۔ سلمٰی بیگم کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

"نہیں بس تم نے محبت سے بات کر لی میرے لیے یہی بہت ہے یہی سب سے قیمتی سوغات ہے۔" سلوط جواب میں بولی۔ تو نازبہ رو خوش ہو کر ہنسنے لگی۔

پھر دادی اور سلوط سے رخصت ہو کر جونہی باہر نکلی شعیب منصور سامنے سے آتے نظر آئے۔ شاید وہ اس سے ملنے سلمٰی بیگم کے کمرے ہی آ رہے تھے۔ نازو بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ بڑی دیر تک اسے سینے سے لگائے کھڑے رہے۔ پھر زینت کے کہنے پر اسے لے کر اس کے کمرے میں آ گئے۔ زینت نے واقعی اس کے کمرے کی نہ صرف سیٹنگ بدل دی تھی بلکہ قالین، پردے اور فرنیچر بھی نیا اور بہت قیمتی ڈالا تھا اور اتنی خوبصورتی سے سجایا تھا کہ کمرہ منہ سے بول رہا تھا۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اے سی بھی آن کر دیا تھا مگر نازو باپ کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ گو اس نے ستائشی نظروں سے کمرے کو دیکھا تو ضرور تھا لیکن زیادہ تعریف نہیں کی تھی۔ بس ماں کا دل رکھنے کو واہ کا نعرہ لگا کر اتنا ہی کہا تھا کہ ممی آپ نے تو میرے کمرے کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔

بہرحال باپ سے باتیں کرنے میں اسے وقت کا خیال بھی نہ رہا حتیٰ کہ کھانے کا بھی نہیں کہ اس دوران میں نیلوفر بھی آ گئی تھی اور اس سے لگی بیٹھی باپ کے ساتھ ساتھ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھی۔ اور جب نیلما نے دوسری بار آ کر کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو یہ سب کے سب کھانے کے کمرے میں چلے آئے۔ لیکن ابھی کھانا ختم کر کے میز سے اٹھی بھی نہ تھی کہ احمد سر دش اسے لینے آ گئے۔ شعیب منصور اس سے بھی بہت شفقت اور محبت سے ملے اور بیٹھ گئے اور اسے زبردستی آئس کریم بھی کھلوائی۔ پھر جب دونوں واپسی کے ارادے سے اٹھے تو ڈرائنگ روم میں آتے ہی زینت نے کریم کو آواز دی۔ کچھ ہی دیر بعد کریم لدی پھندی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا اور ٹرالی زینت کے آگے رکھ دی۔ زینت نے پہلے بیٹی داماد کو پاس بلا کر انھیں ہار پھول پہنائے پھر جھک کر ٹرالی میں رکھی ہوئی چیزیں نکال نکال کر بیٹی اور داماد کے سامنے رکھنی شروع کیں۔

"یہ سوٹ کا کپڑا، شرٹس، ٹائیاں اور کف لنکس تمھارے لیے ہیں اور یہ کتان کی ساڑھی اور رسٹ لڑا میری نازو کا ہے۔" انھوں نے داماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر کریم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"کریم تم مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بٹیا کی کار کی ڈکی میں رکھوا دو جا کر۔"

"ممی یہ اتنے تکلفات برتنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو ہم تو آپ کے ہی بچے ہیں۔ ہم تو ہر دوسرے تیسرے روز قدم بوسی کے لیے آتے ہی رہیں گے تو کیا آپ ہمیشہ۔" تو زینت جو فخر و خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں اس کی بات کاٹ کر بڑے دلارے بولیں۔

"ہاں ہمیشہ ہی دیں گے بیٹے۔ تمھارا تو حق بنتا ہے ہم پر خواہ تم دوسرے تیسرے کیا روز ہی آؤ۔"

"پھر تو یہاں سے بڑے فائدے میں رہیں گے آپ احمد بھائی۔" نیلما ہنس کر بولی۔

"ہاں واقعی اس طرح کم از کم آپ دونوں کے کپڑے لتے کا پرابلم تو سولو (حل) ہو ہی ہو جائے گا۔" نیلوفر نے لقمہ دیا تو نازو اور احمد زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور شعیب منصور نے بھی ہنسی میں ان کا ساتھ دیا۔

"اچھا اگر یہی بات ہے تو پھر ہم سیزنل وزٹ پہ ہی آیا کریں گے۔ یعنی سال میں دو مرتبہ۔ ایک بار گرمیوں میں اور دوسری بار سردیوں میں کیوں نازو ہر موسم کا ایک ایک جوڑا کافی ہو گا نا ہمارے لیے۔" احمد نے ہنس لینے کے بعد نازو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں پھر تو آپ جلدی سے پولیس لائن جوائن کر لیں کیونکہ پولیس والوں کو سال میں کل دو وردیاں ہی ملتی ہیں وہ بھی موسم گزر جانے کے بعد۔" شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نازبہ رو نے کچھ اتنی برجستگی سے یہ بات کہی کہ ایک قہقہہ پڑا پھر دونوں یونہی ہنستے مسکراتے سب سے رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہوئے تو زینت نے ہاتھ اٹھا کر ان کے سدا یونہی خوش و خرم رہنے کی دعا کی۔

بیٹی اور داماد کے جانے کے بعد نہا دھو کر اور تازہ دم ہو کر جب شعیب منصور اپنا پائپ سلگا کر بیڈ پر بیٹھے تو زینت بھی رات کا لباس تبدیل کر کے آ چکی تھیں وہ اس سمے بڑی مگن تھیں۔

بیٹی کا مسرور، خوبصورت اور چمکتا ہوا چہرہ بار بار ان کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور وہ خود کو خوشیوں کے جھولے میں جھولتا محسوس کر رہی تھیں۔

عجب کھویا کھویا پن سا ان پر طاری تھا۔ جو بیٹی کی ساس نندوں کا خیال آتے ہی اچانک ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔ کیونکہ بیٹی کی گفتگو کے پیش نظر وہ بہت شری اور فسادی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن پھر فوراً۔ داماد کی نیک۔ سادہ فطرت خوش مزاجی اور بیٹی سے اس کی محبت کا خیال آتا تو وہ پھر خوش کن خیالات میں مگن ہو جاتیں۔ اور کھلی آنکھوں سے بیٹی کی مسرور اور شادماں زندگی کے خواب دیکھنے لگتیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" آخر شعیب منصور نے انہیں اس قدر گم صم سا دیکھ کر پوچھا۔

"ہائیں کچھ بھی نہیں۔" وہ اپنی محویت سے بری طرح چونک کر بولیں۔

"نہیں خیر کچھ تو سوچ ہی رہی ہو۔" شعیب منصور نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ کیا اپنی نازو کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے شادی کے بعد کیسی نکھر آئی ہے جسم پر تھوڑا سا پانی بھی پھر گیا۔ اور صحت تو ماشاء اللہ اتنی اچھی ہو رہی ہے کہ نظر لگ جانے کے ڈر سے میں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا تک نہیں۔"

"کمال ہے تم نے تو اسے جنم دیا ہے اس کی ماں ہو پھر بھلا اسے تمہاری نظر لگ سکتی تھی۔" شعیب منصور ہنستے ہوئے لہجے میں بولے۔

"نہیں یہ تو نہ کہیے۔ نظر سب سے پہلے اپنوں کی ہی لگتی ہے۔ اور میری بیٹی تو ہے ہی ماشاء اللہ حسین۔"

"ہاں۔ خدا اسے ہمیشہ خوش ہی رکھے۔" شعیب منصور نے جمائی لے کر کہا۔

"آپ نے بھی تو آج حد ہی کر دی اتنی دیر سے آئے کہ بچی انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔"

"ہاں کچھ مصروفیت ہی اتنی رہی آج کہ پورا دن ہی گزر گیا۔۔۔ وہ تو میں نازو کی وجہ سے جلدی اٹھ آیا ورنہ نامعلوم کب گھر آنے کی مہلت ملتی۔" شعیب منصور نے مزید ایک لمبی جمائی لے کر اپنی تھکن کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ مگر ایسی کیا مصروفیت تھی آج کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔" زینت نے پوچھا۔ انداز چبھتا سا تھا۔ شعیب منصور کو برا تو لگا مگر وہ واقعی بہت تھک گئے تھے اور انہیں جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں ورنہ اس انداز میں کیے سوال کے جواب میں چڑ کر یہی کہتے کہ میں ناچ گانا سننے تو نہیں گیا تھا۔ یا سارا دن عیاشی تو نہیں کرتا رہا تھا مگر انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"بس وہ کچھ کاروباری معاملات طے کرنے تھے۔ سہ پہر کو اسی سلسلے میں میٹنگ بھی تھی اسی میں الجھا رہا۔" زینت جواب میں کچھ نہیں بولیں تکیہ درست کر کے لیٹ گئیں۔ شعیب منصور نے بھی لیٹنے کے ارادے سے کمر کے نیچے سے تکیہ نکالا تبھی کوئی خیال آیا تو لیٹتے لیٹتے رک کر انہوں نے کہا۔

"عجب اتفاق ہے آج میں اماں جان کی احوال پرسی کرنا بھی بھول گیا۔ لیکن بیٹی داماد آئے تھے تو تم نے کم از کم انہیں کھانے پر تو بلوا لیا ہوتا اب تو وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گئی ہیں۔"

"ہاں، قابل تو ہو گئی ہیں مگر انہیں پلنگ پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا ربط سا پڑ گیا ہے اور پھر وہ تو سر شام ہی اپنا پرہیزی کھانا کھا لیتی ہیں۔" زینت نے بڑی بیزاری سے کہا۔

"اچھا تو کیا تم نے بیٹی داماد کو ان سے ملوایا بھی نہیں؟" شعیب منصور نے ان کی بیزاری کا نوٹس لیے بغیر پوچھا۔

"نہیں، نازو تو خود جا کر انہیں سلام کر آئی تھی البتہ احمد نہیں جا سکا ان کے پاس۔" زینت کھردرے سے لہجے میں بولیں۔

"کیوں؟"

"اسے موقع ہی کہاں ملا۔ بیوی کو چھوڑنے آیا تھا تو میٹنگ میں جانے کی عجلت سوار تھی۔ تو چل میں آیا کے انداز میں اس نے چائے کے ساتھ سنیکس کھائے تھے اور نازو کو لینے آیا تھا تو آپ کے سامنے ہی آیا تھا۔" زینت شوہر کے ایک ہی

بات کے پیچھے پڑ جانے پر چڑ کر بولیں۔

"میرے سامنے بھی آیا تھا تو تم پر یہ لازم تھا کہ تم اسے اماں جان کے پاس لے جاتیں۔" شعیب منصور نے کہا۔

"ہاں، لازم تو تھا مگر اس کی خاطر تواضع میں کچھ خیال ہی نہیں رہا۔" زینت نے اس موضوع سے جان چھڑانے کو قصہ کوتاہ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"لیکن یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی، تمہیں کم از کم اماں جان کے رشتے کی نزاکت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔" شعیب منصور سچ مچ ایک ہی موضوع کے پیچھے پڑے تھے۔

"اگر ایسی ہی بات تھی تو آپ ہی خیال رکھ لیتے۔ ساری باتوں کا ذمہ دار مجھے ہی کیوں ٹھہراتے ہیں آخر آپ کی بھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں۔" زینت جل کر بولیں۔

"نہیں، ہماری ذمہ داری تو صرف یہی ہے کہ ہم آپ کو کما کر دیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارے بیوی بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ورنہ باقی جملہ خاص طور پر گھریلو معاملات کی ذمہ دار تو آپ ہی ہیں۔ اصل میں سوتیلی ماں کا معاملہ ہے نا اس لیے آپ اس قدر تیہا دکھا رہی ہیں ورنہ سگی ساس کا معاملہ ہوتا تو آپ کبھی اس لب ولہجے میں بات کرنے کی جرأت نہ کرتیں۔" شعیب منصور درشت سے لہجے میں بولے۔

"شکر ہے آج اصل حقیقت آپ کی زبان پر آ ہی گئی۔ یوں بھی لاکھ انسان چھپائے حقیقت کسی نہ کسی طرح اپنا آپ منوا کر ہی رہتی ہے۔" زینت طنز بھرے انداز میں ہنس کر بولیں۔

"کیسی حقیقت؟" شعیب منصور نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"یہی سگے اور سوتیلے کے فرق کی۔" زینت نے ایک زہر خند سے کہا۔

"لاحول ولا۔ کیسی گری ہوئی بات کرتی ہو۔ سوتیلی تو وہ تمہارے لیے ہیں ورنہ میں تو انہیں اپنی سگی ماں ہی سمجھتا ہوں۔" شعیب منصور بگڑے بگڑے انداز میں بولے۔

"ہاں ضرور تبھی تو سگی اور سوتیلی کا لفظ آپ کی زبان پر آ گیا۔ لیکن پلیز اب اس ذکر کو ختم کر دیں۔ میں آج اپنی بچی کو اس قدر شاداں اور فرحاں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ آپ خواہ مخواہ ہی میری خوشی میں کھنڈت ڈالنے کی کوشش نہ کیجیے۔" زینت زچ سی ہو کر سخت بیزاری سے بولیں۔

"خوش تو میں بھی ہوں کہ وہ میرے جگر کا ٹکڑا بھی ہے۔ مگر خوش ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاؤں۔ اماں جان کو نہیں تو کم از کم تم نے سلوط کو ہی کھانے پر بلوا لیا ہوتا آخر وہ مہمان کی حیثیت سے ہی تو یہاں آئی ہے۔" شعیب منصور نے ترش لہجے میں کہا۔

"او ہو تو یہ کہیے کہ یہ سارا قضیہ آپ نے سلوط کی وجہ سے کھڑا کیا ہے۔ ورنہ بھلا میں بھی تو کہوں کہ یہ آج آپ کے احساسات اماں جان کے لیے اتنے رقیق کیوں ہو رہے ہیں۔" زینت نے طنز بھرے لہجے میں قدرے معنی خیزی سے کہا۔

"تم اگر یہی سمجھ رہی ہو تو چلو یہی سہی۔ لیکن تمہیں اس سے ایسی پرخاش نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اگر تمہاری نند بھی ہے تو بھی ایک تھرڈ پرسن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کسے معلوم کہ فاخرہ بی کا اٹیٹیوڈ (سلوک) اس بے چاری کے ساتھ ہے مگر تم تو صرف اس بات پر اس سے خار کھاتی ہو کہ وہ فاخرہ بی بی کی نند ہے۔"

شعیب منصور تیوری پر بل ڈال کر بولے تو زینت تلملا کر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"کمال ہے آپ تو اس وقت عین یہ عین بری ساس نندوں کے انداز میں بات کر رہے ہیں۔ وہ بردبار شعیب منصور کسی طرف سے بھی نہیں لگ رہے ورنہ آپ ہی سوچیے مجھے اس بے چاری عمر وہ لڑکی سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے۔ وہ تو کچھ اتنی نروٹھا سی فطرت کی مالک ہے کہ پانچ ماہ سے یہاں رہ رہی ہے مگر کسی سے گھلی ملی ہی نہیں۔"

"گھلی ملی نہیں تو اس کا سبب خود تمہارا معاندانہ رویہ بھی تو ہو سکتا ہے تم اس سے خلوص و اپنائیت سے پیش آتیں تو..."

"ہونہہ! جیسے ساری دنیا میں صرف میں ایک ہی فالتو رہ گئی ہوں ایرے غیروں پر خلوص اپنائیت کے خزانے لٹانے کے لیے جبکہ آپ کی نظر میں خود میری یہ حیثیت ہے کہ مجھے معتبر سمجھتے ہیں نہ کسی قابل ہی۔ بہن تو خیر بہت ہی بلند مرتبہ ہیں آپ کی مگر میں لیکن بہن کی نند کی باتیں بھی مجھ سے چھپاتے ہیں جس سے آپ کی کوئی رشتہ داری ہے نہ تعلق۔ لیکن آپ لاکھ چھپا لیں لیجیے — میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ سمجھے آپ۔" زینت ان کی بات کاٹ کر نہایت تیز و تند لہجے میں بولیں۔

"اچھا۔ آخر کیا کیا جانتی ہیں آپ۔ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔" شعیب منصور نے ان کے تلملانے پر مسکرا کر پوچھا۔

"میں آپ کو کیوں بتاؤں جبکہ آپ تو ہر بات مجھ سے چھپاتے ہیں۔" زینت چمک کر بولیں۔

"کیوں۔ تم اتنا طویل عرصہ میرے ساتھ گزار کر بھی میری فطرت اور مزاج کو نہیں سمجھ سکیں۔ ورنہ میری عادت ہے کہ میں کسی کی پرسنل اور سیکریٹ باتوں کو اچھالنے کا عادی ہوں نہ ڈھنڈورا پیٹنے کا۔ خاص طور پر ایسی بات جس کا میری یا تمہاری ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ سنو زینت، اللہ تعالیٰ نے بندے کو نیکی اور بدی کی راہوں کا تعین کرنے کا اختیار دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں۔ جن میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کے عیبوں، اور رازوں پر پردہ ڈھکے رکھے اس میں جہاں قدرت کی ایک مصلحت پوشیدہ ہے وہاں خود انسان کے لیے بھی ایک تنبیہہ ایک بھلائی ہے۔ لیکن تم نے جو معلومات حاصل کی ہیں ظاہر ہے دوسروں سے ہی کی ہیں۔ اور دوسرے جو بات بھی کہتے ہیں رائی کا پہاڑ بنا کر ہی کہتے ہیں بس۔ اسی خیال سے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ تم کو کیا بتایا گیا ہے ورنہ مجھے معلوم کرنے کی ایسی جستجو بھی نہیں ہے۔"

شعیب منصور نے بہت تدبر اور رسانیت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ زینت بھی ان کی فطرت اور مزاج سے بخوبی واقف تھیں کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے۔ کچھ دیر تک تو ایک گومگوں سی کیفیت میں رہیں کہ کہیں یا نہ کہیں۔ پھر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"خیر جستجو تو اس لیے نہیں ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب خود اس نے سلوط کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا تو پھر اسے اغوا کرانے کی کوشش کیوں کی؟"

"ہیں! کس نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا اور کس نے اغوا کرانے کی کوشش کی؟ یہ تم کیا اونگی بونگی بول رہی ہو۔" شعیب منصور بیوی کی بات پر اچھل سے پڑے۔

"اب اتنے بھولے بھی نہیں بنیے آپ۔ سب کچھ جانتے ہیں مگر ظاہر ایسا کر رہے ہیں جیسے۔"

"نہیں حاشا وکلا۔ مجھے تو تمہارے منہ سے ایسی خرافات سننے کا پہلی بار ہی اتفاق ہو رہا ہے۔" شعیب منصور نے جس انداز میں یقین دہانی کرائی زینت کو بھی ان کی فطرت کے بموجب یقین کرنا ہی پڑا۔

"اچھا تو واقعی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔ تو پھر کسی بدخواہ نے یونہی بے پر کی اڑائی ہو گی۔" وہ بھی اسی خیال سے کہ ایک غلط بات پر شوہر ان کے لتے لینے نہ بیٹھ جائیں بات کو ٹالتی ہوئی بولیں۔

"اگر بے پر کی اڑائی ہے تو کس نے اڑائی؟ کون تھا ایسی لغو باتیں کہنے والا؟" شعیب منصور کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل سے گئے۔ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بھئی! جتنے منہ اتنی باتیں۔ خواہ غلط ہو یا صحیح بس کہنے والے بلا سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں۔ کہنے والے کی زبان تو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ وہ تو پیٹھ پیچھے بادشاہ کو بھی برا بھلا کہتے ہیں۔"

زینت اب ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آپ کی فرسٹ کزن عائشہ آپا نے مجھے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ پھر صحیح سہاوے ہوتے۔ اور اسی طرح وہ سسرال والوں سے بری بنتیں۔ شعیب منصور بھی سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے بات بنائی ہے۔ وہ خود بھی اس ذکر سے بچنا چاہ رہے تھے۔ بات ٹالنے کی غرض سے بولے۔

"ہاں واقعی کہنے والوں کی زبان تو کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن یہ جو خرافات بھی تم نے سنی ہیں سراسر بہتان ہی ہیں اس معصوم لڑکی پر۔ ورنہ معاملہ بالکل دوسرا ہی ہے جس میں اس کی ذات دور تک ملوث نہیں ہے۔"

"اچھا تو وہ دوسرا معاملہ کیا تھا؟" زینت نے حد درجے متجسس ہو کر پوچھا۔

"اچھی طرح تو معلوم نہیں شاید پرانی عداوت کا کوئی چکر تھا۔" اب وہ یہ تو بیوی کو بتانے سے رہے تھے کہ ان کے بہنوئی نے ایک غلط راستہ اپنا کر اپنے کتنے دشمن پیدا کر لیے تھے۔

"کمال ہے ایمان سے آپ جیسا شوہر شاید ہی کوئی ہو۔ بیوی تو زندگی کی رفیق اور رازداں ہوتی ہے۔ مگر آپ نے مجھے بیوی سمجھا ہی کب۔ خیر اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کوئی مقدمہ چل رہا تھا جو وہ ہار گئے تھے۔ اور نے پونے کوٹھی بیچی اور بیوی کو لے کر ورلڈ ٹور کے بہانے ملک سے کہیں باہر چلے گئے اور بے چاری اس بچی کو یہاں بھیج دیا۔ ورنہ بھلا میں بھی کہوں کہ عاقب اور اتنا دل کریں گے کہ بیوی کو ورلڈ ٹور پر لے جائیں جبکہ آج تک بے چارے پاکستان کے ٹور پر تو جا نہیں سکے۔"

زینت آزردہ اور کچھ طنزیہ سے انداز میں بولیں۔ تو شعیب منصور نے بہت چونک کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر یہ تو تم نے ٹھیک ہی سُنا کہ وہ ورلڈ ٹور کا بہانہ کر کے گئے ہیں لیکن وہ مقدمہ وقدمہ نہیں ہارے بلکہ خیر چھوڑو۔ قصّے کو انسان جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ اور پھر یہ ہمارا مسئلہ بھی نہیں ہے۔" پھر انہوں نے سائڈ ٹیبل پر پڑی ایش ٹرے میں اپنا پائپ رکھ کر تکیہ درست کر کے اپنی طرف کا لیمپ بجھایا اور لیٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب تم اطمینان سے صبح تک اپنی بیٹی کی خوشی کا جشن مناؤ مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے اس لیے شب بخیر۔" اور زینت جوان کی باتوں سے دل گرفتہ سی ہو گئی تھیں۔ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولیں۔

"ہونہہ۔ کیا خاک جشن مناؤں۔ ساری خوشی تو ایرے غیروں کی خاطر ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔ پتا نہیں کیسے باپ ہیں آپ۔" اور پھر لیمپ آف کر کے خود بھی لیٹ گئیں۔

"ارے ارے باپ کیسا شوہر کہو ورنہ نکاح فسق ہو جائے گا تمہیں سالہ۔" شعیب منصور نے سوتے سوتے بھی ہنس کر کہا مگر زینت نے کوئی جواب نہیں دیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

تیسرا ہارن بجا تو کریم سے مٹھائی کا ٹوکرا اور پھولوں کا دونا اٹھوانی ہوئی زینت بولا کر بولیں۔

"افوہ۔ یہ بابا نے تو میرے ہاتھ پیر پھلا دیے۔ چلو کریم جلدی سے جا کر یہ ٹوکرا اور پھول ڈکی میں رکھ آؤ اور بابا سے کہنا کہ میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔" زینت واقعی بہت عجلت میں تھیں۔

سہیل منصور نے اپنے نئے بنگلے میں جانے کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یوں تو بنگلے میں جانے سے پہلے ہی انھوں نے قرآن خوانی بھی کرائی تھی اور چار بکرے بھی اللہ کے نام پر ذبح کرائے تھے اور غریبوں میں تقسیم کرا دیے تھے۔ مگر اس روز بعد نماز ظہر انھوں نے محفل میلاد رسول مقبول منعقد کی تھی۔ اور اس سمے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ گویا میلاد مبارکہ شریف کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی زینت کو یقین تھا کہ کیونکہ ہمارے یہاں وقت کی پابندی کوئی نہیں کرتا اس لیے مہمان خواتین اور خود میلاد پڑھنے والی خاتون عصر کے وقت ہی نکل کر آئی ہوں گی۔ جبکہ یہ احساس بھی انھیں تھوڑا تھوڑا پریشان کر رہا تھا کہ وہ کافی لیٹ ہو چکی ہیں۔

کریم کے باہر جاتے ہی وہ پینٹری سے نکل کر لاؤنج میں آ گئیں اور اپنی خواب گاہ کا رُخ کرنے کے بجائے مخالف سمت میں چند قدم بڑھا کر انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے نیلوفر کو پکارا۔

"تمھاری تیاری کب ختم ہو گی نیلو؟ ایسے کونسے سولہ سنگھار میں مصروف ہو۔ بھلا ساڑھے پانچ بج گئے۔ چلو جلدی سے جا کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں بھی ابھی اپنا کمرہ لاک کر کے آتی ہوں۔"

"ممی میں تو کب کی تیار ہوں۔ دیر تو خود آپ نے کی ہے اور یہ بھائی جان کے ساتھ جانے کی کیا تک تھی بھلا۔ میری کار میں ہی چلتیں۔" ان کے پکارنے پر نیلوفر جلدی سے اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آتی ہوئی بولی۔

"نہیں بھئی کار کی شان ہی اور ہوتی ہے۔ وہ بھی ہونڈا اکوڈ کی۔" زینت عجلت میں اپنے کمرے کے رُخ مڑتی ہوئی بولیں۔

"تمہارا بابا کو اگر یہی شیرا اُڑے دی تھی تو نئی گاڑی تو آپ بھی خرید سکتی تھیں۔" نیلوفر بولی۔

"اچھا اچھا۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ اور جا کر کار میں بیٹھو۔ ورنہ بابا سچ مچ ہمیں چھوڑ کر چل دیں گے۔" تیزی سے اپنے کمرے کا رُخ کرتی زینت نے بیٹی سے کہا۔ تو وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر زینت نے الماری کا پٹ کھول کر اپنا پرس اٹھایا۔ اور الماری مقفل کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے برش اٹھا کر آہستہ سے بالوں پر پھیرا اور اسپرے کر کے

وہیں رکھا چابیوں کا گچھا اٹھا کر باہر آگئیں۔ اس اثناء میں دو ہارن اور بجائے جا چکے تھے۔ انھوں نے پیچھے سے خواب گاہ کی چابی لے کر اسے مقفل کیا اور باہر نکل آئیں۔

باہر پورچ کے بجائے ایگزٹ (یا باہر جانے کا راستہ) میں پورچ سے کچھ فاصلے پر کھڑی اسفند کی بالکل نئی ہونڈا کورولا بات کا کھلا اظہار تھی کہ اس سمے وہ بہت عجلت میں ہے۔ نیلوفر بھی ماں کے انتظار میں پچھلی نشست کا دروازہ کھولے کھڑی تھی جبکہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بیٹھا تھا۔

"افوہ بنی ایسی کیا عجلت سوار تھی تم پر جو ہارن بجا بجا کر میرے اوسان خطا کر دیے۔" چند فٹ کا فاصلہ نہایت سرعت سے طے کر کے انھوں نے کار میں بیٹھتے ہوئے سخت جھلائے ہوئے انداز میں بیٹے سے کہا۔

"مجھ سے نہیں یہ آپ ان سے پوچھیے ممی۔ ہارن بجانے کا حکم یہی صادر کرتے رہے تھے۔"

اسفند نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شعیب منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو زینت جنھیں کار میں بیٹھتے سمے انھیں دیکھ کر سخت تعجب ہوا تھا کہ ایک تو وہ اپنی کار کے بجائے بیٹے کی کار میں بیٹھے نظر آ رہے تھے دوسرے یہ ان کی ایک بہت ہی اہم میٹنگ کا دن تھا جس کی وجہ سے انھوں نے صبح ہی زینت سے کہہ دیا تھا کہ شام تک فارغ ہو سکیں گے لہٰذا وہ بیٹے کے ساتھ چلی جائیں۔ انھوں نے شوہر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ادھو آج یہ کیا غیر معمولی بات ہو گئی جو آپ بابا کی کار میں بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔" بیٹے کے سامنے صاف پوچھنے کے بجائے انھوں نے جس انداز میں پوچھا تھا اسے سمجھتے ہوئے شعیب منصور نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"بس آج ذرا اپنے بیٹے کی ڈرائیونگ کا لطف اٹھانے کو جی چاہ رہا تھا اس لیے ان کی کار میں بیٹھ گئے۔" زینت بھی سمجھ گئیں کہ اصل جواب گول کر دیا گیا ہے۔

"مگر آپ کی تو شاید اس وقت کوئی اہم میٹنگ تھی۔" ان سے نہ رہا گیا تو انھوں نے بتا ہی دیا۔

"ممی! ڈیڈی وہ میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد ہی آئے ہیں۔" اسفند نے ماں کے تجسس کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"اچھا اچھا۔" زینت کا تجسس پھر بھی برقرار رہا کیونکہ اُن کے خیال میں اول تو یہ بات ہی غلط تھی کہ وہ میٹنگ اٹینڈ کر کے آئے ہیں۔ دوسری وہ اپنی کار کے بجائے بیٹے کی کار میں کیسے آگئے تھے۔ اور اپنی کار کہاں چھوڑ آئے تھے جبکہ اپنی کار کے سوا وہ کسی دوسری کار میں بیٹھنے کے عادی ہی نہ تھے۔ زینت انھی خیالات میں الجھی ہوئی تھیں اور ادھر اسفند نے انجن تو بہت پہلے سے اسٹارٹ کر رکھا تھا مگر ابھی تک کار آگے نہیں بڑھائی تھی جبکہ نیلوفر بھی کب کی بیٹھ چکی تھی اور اتنی عجلت بھی سوار تھی۔

"اب چلتے کیوں نہیں بیٹے یا تو اتنی عجلت دکھا رہے تھے یا۔" زینت نے کہا۔ تو اس نے پوچھا۔

"کیا سب آگئے یا کسی اور کو بھی چلنا ہے؟"

"نہیں۔ اور کون باقی رہ گیا ہے۔ بٹیا تو صبح سے وہیں ہیں۔ اب میں کریم کو تو لے جانے سے رہی۔" زینت نے آخری فقرہ مزاح کے طور پر ہنس کر کہا۔

"لیکن وہ ایک بھیجی قسم کی چیز بھی تو موجود ہیں گھر میں کیا انھیں گھر میں مقفل کر کے جائیں گی۔" اسفند بولا۔

"ہاہاہا یہ بھیجی قسم کی چیز سلوط کو کہہ رہے ہو نا۔" شعیب منصور نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"سلوط کو تو نازش اماں جان کے ساتھ کل شام ہی لے گئی تھیں۔" زینت نے بتایا تو اسفند نے خاموشی سے کار آگے بڑھا لی۔

"میلاد شریف تو کب کا شروع ہو چکا ہوگا بلکہ ختم بھی ہو گیا ہوگا اور آپ اب تشریف لے جا رہی ہیں۔" شعیب منصور نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"دیر ضرور ہو گئی ہے لیکن میں آپ سے شرطیہ کہتی ہوں کہ میلاد شریف چار بجے کے بعد ہی جا کر شروع ہوا ہوگا کیونکہ عام طور پہ خواتین ظہر کے وقت بلاؤ تو عصر کے وقت ہی نکل کر آتی ہیں۔" زینت نے کہا۔

"لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جب میں اپنی کار سہیل کو دینے گیا تھا تو مستورات خاصی تعداد میں آ چکی تھیں۔ اور پھر چھوٹی دلہن بڑی پنکچول ہیں اِن معاملات میں۔ انھوں نے زیادہ کسی کا انتظار نہیں کیا ہوگا۔ اور میلاد شروع کرا دیا ہوگا۔" شعیب منصور بولے۔

"خیر اگر کچھ دیر بھی ہو گئی ہے تو سہیل اور نازش کوئی غیر تو نہیں ہیں جو برا مان جائیں گے۔" شوہر کی بات پر زینت چڑ کر بولیں۔

"مشکل تو یہی ہے کہ وہ غیر نہیں ہیں اپنے ہیں۔ اور بڑی بھاوج ہونے کے لحاظ سے آپ کو صبح سے ہی وہیں ہونا چاہیے تھا۔" شعیب منصور نے کہا تو زینت چڑ کر بولیں۔

"لیکن مجھے گھر کے بھی بہت سے کام انجام دینے تھے۔ ادھر نیلوفر کے سر میں درد تھا اس لیے یہ سو رہی تھیں اور بابا بھی گھر پر اکیلے تھے میرے جانے سے انھیں بھی تکلیف ہوتی۔" زینت نے عذر پیش کیا۔

"لیجیے ممی میں بچہ تو نہیں تھا جو مجھے تکلیف ہوتی۔ آپ بے فکر ہو کر چلی گئی ہوتیں۔" اسفند ہنس کر بولا۔

"لیکن میری کچھ عادت ہی ایسی ہے بنی کہ جب تک سب کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے میں کہیں آجا ہی نہیں سکتی۔" زینت کو بیٹے کی بات اچھی نہ لگی تو انھوں نے کڑوے کسیلے سے لہجے میں کہا۔

"چلو خیر۔ میں تو صرف نازش کا ہاتھ بٹانے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ بے چاری اکیلی ہی سب کچھ کر رہی ہیں۔" شعیب منصور نے بیوی کا موڈ آف ہو جانے کے ڈر سے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن نازش کا ہاتھ بٹانے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔ تین دموں پر چھ چھ ملازم ہیں۔ اس پر سلوط بھی کل شام سے وہیں ہیں۔ نازش انھیں ہاتھ بٹانے کی غرض سے ہی لے گئی تھیں۔" زینت شوہر کی بات پر چمک کر بولیں۔

"اچھا تو کیا آپ کی طرح چچی جان بھی انھیں ملازمہ کی حیثیت دیتی ہیں ممی؟" اسفند نے سوال کیا۔ گو اس کا لہجہ سپاٹ تھا لیکن پھر بھی زینت سلوط کے معاملے میں اس کے بولنے کی متوقع نہ تھیں اور پھر اس نے سوال بھی کیسا کیا تھا وہ بھی شعیب منصور کے سامنے۔ انھوں نے ایک نظر نیلوفر کو دیکھا اور جز بز سی ہو کر بولیں۔

"اے تم نے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے بنی کہ میں سلوط کو ملازمہ کی حیثیت دیتی ہوں۔ یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔"

"الزام کی بات نہیں ممی۔ اصل میں اس روز جب بہت اتفاقاً ان کے ہاتھ سے کوئی ٹیکوڈسی چیز مجھ پر آگری تھی تو آپ کی باتوں سے میں نے کچھ یہی امپریشن لیا تھا۔" اسفند بولا۔ اسے ٹنے کا نام یاد نہیں رہا تھا اس لیے اس نے ٹیکوڈسی چیز کہا تھا جس پر نیلوفر کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ بہت بے موقع ہنسی تھی۔ زینت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔

"ارے نہیں بنی۔ اس وقت تو کچھ سچویشن ہی ایسی ہو گئی تھی تمھیں دیکھ کر۔ میں ایک دم ہی حواس باختہ سی ہو گئی تھی۔ اگر اس موقع پر نیلوفر بھی ہوتیں تو میں انھیں بھی نہ بخشتی۔" تو اسفند کا دل تو چاہا کہ کہے ہاں ضرور جیسے میں بہرہ اور اندھا تھا اس وقت جو آپ کی باتیں نہ سن سکا نہ وہ حقارت آمیز برہم سا تاثر ہی دیکھ سکا جو آپ کے چہرے سے ہویدا تھا۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

"لیکن اس بات پر تو مجھے تعجب ہی نہیں سخت افسوس بھی ہو رہا ہے کہ نازش نے سلوط کی یہاں رہائش سے بڑا غلط فائدہ اٹھایا جبکہ بظاہر وہ ایسی دوہری فطرت کی نظر نہیں آتیں۔" شعیب منصور نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں نہیں چھوٹی دلہن بھلا ناجائز فائدہ کیوں اٹھانے لگیں۔ وہ تو بڑا اعلیٰ ظرف رکھتی ہیں۔ سلوط کو تو اماں جان زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ نازش نے بھی ان کا اصرار دیکھ کر سلوط کو زبردستی اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اگر سلوط نے ان کا تھوڑا بہت ہاتھ بھی بٹا دیا ہوگا تو اس میں ایسی کونسی بری بات ہو گئی۔ آخر بٹیا بھی تو اسی خیال سے گئی ہے۔" زینت نے اس ڈر سے کہ کہیں شوہر نازش سے کچھ نہ کہہ دیں جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔ شعیب منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ٹریفک سگنل پر گاڑی رکنے کی وجہ سے وہ باہر کچھ دیکھنے لگے تھے۔ ٹریفک کھلا تو انھوں نے کچھ یاد کر کے پوچھا۔

"وہ نازو اور احمد سے بھی کہہ دیا تھا تم نے؟"

"نہیں میرے کچھ کہنے کا موقع تھا بھلا۔ جن کی تقریب ہے انھوں نے خود ہی بلاوا دے دیا ہوگا۔" زینت تڑخنے تڑخنے سے انداز میں بولیں۔

"لیکن ممی۔ ایپا اور احمد بھائی زرین کی شادی اٹینڈ کر کے کل رات ہی تو لاہور سے آئے ہیں وہ اتنے ان ٹائم بلاوے پر بھلا کیسے آسکتے ہیں۔" نیلوفر بولی۔

"یہ ان ٹائم اور آؤٹ سے تمھاری کیا مراد ہے۔ سگے چچا کا معاملہ ہے۔ نازو کو تو بلا نوٹس بھی آنا چاہیے۔" شعیب منصور نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"نہیں خیر، نازو اور احمد آئیں گے تو ضرور بلکہ شاید ان کی ساس اور نندیں بھی آئیں۔" زینت بولیں۔

"ڈنر کے بعد کچھ میوزیکل پروگرام بھی تو ہے نا ممی۔" نیلوفر نے پوچھا۔

"ہاں۔ سنا تو میں نے بھی ہے اب یہ تو ڈنر کے بعد ہی معلوم ہوگا۔" زینت بولیں۔

"کمال ہے سارا پروگرام تو تمھارے سامنے ہی سیٹ ہوا ہے۔ اور ظاہر ایسا کر رہی ہو کہ تمھیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔" شعیب منصور

نے کہا۔

"نہیں علم تو ہے لیکن میوزیکل پروگرام کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ نازش کوثر کی وجہ سے لیٹ نائٹ پروگرام رکھنے کے حق میں نہیں تھیں اس روز سہیل بھی چپ سے ہوگئے تھے۔ اب بعد میں کچھ طے ہوا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔" زینت نے [illegible] بل ڈال کر کہا۔

"کوثر کی وجہ سے کیوں ممی؟ کیا چچی جان کوثر کا میوزیکل گیدرنگز میں بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔" نیلوفر نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں، یہ بات نہیں بلکہ کوثر نیند کی ذرا کچی ہے۔ زیادہ سے زیادہ نو دس بجے تک سو جاتی ہے بس اسی کی تکلیف کے خیال سے چھوٹی دلہن میوزیکل پروگرام کے حق میں نہیں تھیں۔" زینت نے بتایا۔

"ہاں ایک ہی تو بچی ہے ان کی۔ خدا اسے عمر دے بہت ہی خوبیوں کی مالک ہے۔" شعیب منصور بھتیجی کی محبت سے لبریز لہجے کے ساتھ بولے۔

"چچا جان نے تو بھائی جان ہائی لیول پر یہ پارٹی دی ہے۔ ورنہ نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں اتنی بڑی پارٹیز تو نہیں دی جاتیں۔ پورے ایک ہفتے سے تیاریاں ہو رہی تھیں اس دعوت کی۔ میں آج نہیں گئی تو کیا روز ہی جا کر دیکھتی رہی ہوں۔" باپ کو کزن کی تعریف کرتے دیکھ کر نیلوفر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بھائی کو مخاطب کرکے کہا تو زینت بیٹے یا شوہر کے کچھ کہنے سے پہلے جلدی سے بولیں۔

"ہاں وہ بھی چاہیے بیٹی۔ جب سے یہ لوگ آئے ہیں مسلسل دعوتیں اور پارٹیاں اٹینڈ کرتے رہے ہیں۔ اب انھوں نے اپنے گھر میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے تو دعوتیں کھانے کی جوابی کارروائی کے سلسلے میں انھوں نے بھی اتنے اعلیٰ پیمانے پر دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ اور پھر یہ تو کچھ دستورِ دنیا ہے کہ اپنے ذاتی اور نئے گھر میں جانے کے بعد سبھی دعوت دے کر اپنی خوشی میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔"

"ہاں خدا مبارک کرے میرے بھائی اور بھاوج کو زندگی کی تمام مسرتوں سے نوازے۔" شعیب منصور کے دل میں بھائی کی محبت امڈی تو انھوں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"اُف توبہ، یہ پوری شیطان کی آنت ہے سہیل کے گھر کا راستہ تو۔ چلتے چلتے آدھا آگئی مگر کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیا۔ اس طرح تو ہمارے پہنچنے تک میلاد شریف سچ مچ ختم ہو جائے گا۔" زینت نے جس طرح راستے کی طوالت کا گلہ کیا شعیب منصور بھی سمجھ گئے کہ انھیں ان کے دعائیہ کلمات ناگوار گزرے ہیں۔

"میلاد تو خیر یوں بھی کب کا ختم ہو چکا ہوگا لیکن میرے خیال میں پہلی مرتبہ تو سہیل کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہو رہا آپ کو اور نہ پا پیادہ ہی جا رہی ہیں۔ اولڈ کلفٹن میں ہی تو ہے سہیل کا بنگلہ اور کار میں بیٹھ کر تو فاصلے سمٹ ہی آتے ہیں۔"

شعیب منصور نے گویا اُن کی بات کی تردید کی۔ اسفند جو باپ کی وجہ سے ابھی تک چالیس کی رفتار سے کار چلا رہا تھا۔ ماں کے کہنے پر رفتار ایک دم ہی بڑھا کر ساٹھ پر کر دی۔ ۔ موجود ہیں

"بس بیٹے زیادہ دوڑ کر نہ چلو۔ یہاں کراچی ہے، ہونا یہ احتیاط کو مدِنظر رکھنا۔ یہاں کراچی میں اسپیڈ کا کوئی تعین نہیں۔ اسکوٹر یا موٹر سائیکل ہو یا ٹرک ہو یا ٹیکسی یا پرائیویٹ کار۔ سب اپنی اپنی مرضی کی رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں احتیاط یا قانون کے احترام کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر میں وہیکل سے ہونے والے حادثات کی شرح میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور یوں بھی بیٹے ڈرائیونگ کے قاعدوں اور ضابطوں میں یہ ہدایت سرِفہرست آتی ہے کہ اچھے اور ماہرانہ نظر رکھنے والے ڈرائیور کو دوسرے کی نہیں ہمیشہ اپنی غلطی پر نظر رکھنی چاہیے۔ یعنی یہ ایک انتباہی اشارہ ہے محتاط ہو کر گاڑی چلانے کا سمجھے۔" شعیب منصور نے بیٹے کو کار کی اسپیڈ بڑھا دینے پر ایک طرح کی تنبیہہ کی تو زینت اُن کی تقریر نما گفتگو یا نصیحت سے اُکتا کر بولیں۔

"اوہو، آپ تو میرے بیٹے کو اس طرح سمجھا رہے ہیں جیسے اس نے آج پہلی مرتبہ اسٹیئرنگ سنبھالا ہو۔ اسے چودہ پندرہ برس کی عمر سے کار چلا رہے ہیں یہ بابا۔ اب تو ماشاء اللہ ایکسپرٹ ہوگئے ہیں۔" ایکسپرٹ" اور اسفند کو ماں کے ایکسپرٹ کہنے پر ہنسی آگئی۔

"بھئی باپ کی حیثیت اپنی اولاد کے لیے میرِ کارواں کی سی ہوتی ہے۔ اب باپ اگر اپنی معلومات اور تجربوں سے اپنی اولاد کو آگاہ کردے تو اولاد کے تجربوں میں اضافہ ہی ہوگا کمی تو نہیں۔" شعیب منصور نے بیوی کی بات پر کہا۔

"جی ہاں جی ہاں ڈیڈی۔ میں نے آپ کی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔" باپ کی بات پر اسفند مسکرا کر بولا۔

"جیو جیو بیٹے۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔" شعیب منصور نے ایک رٹا رٹایا مکالمہ بولا تو سب کو ہنسی آگئی۔

سہیل منصور کے گھر کے راستے کے آخری راؤنڈ اباؤٹ سے گزر کر جونہی مین روڈ کا موڑ کاٹ کر گاڑی سروس روڈ پر آئی۔ تبھی برقی قمقموں اور ڈیکو لائٹس سے جگمگاتا سہیل منصور کا بنگلہ "الکوثر" دور ہی سے نظر آنے لگا۔ گو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ مغربی افق پر سمندر سے اٹھنے والے ابخرات گہرے بادلوں کی صورت میں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس لیے تھوڑی سی تاریکی ضرور چھا گئی تھی پھر بھی تھوڑا تھوڑا اُجالا باقی تھا اور اس دھیمے دھیمے سے اُجالے میں سہیل منصور کا قمقموں سے سجا بنگلہ یوں لگ رہا تھا جیسے دودھیا ململی اوڑھنی پر کسی نے رنگ برنگی افشاں چھڑک دی ہو۔ زینت کچھ تبصرہ ہی کرنا چاہ رہی تھیں کہ اسفند نے ایک چھوٹی سڑک نما گلی میں کار موڑ دی۔ جہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دو رویہ قطاروں میں کھڑی کاریں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ تقریباً سارے ہی مہمان آچکے ہیں۔ یہ دیکھ کر زینت کو چپ سی لگ گئی۔ کہ سگی جٹھانی ہوکر اتنی دیر سے آنے پر وہ اندر ہی اندر خجل سی ہو رہی تھیں۔

"کمال ہے ڈنر کا بلاوا ہے اور ابھی سے اتنے سارے مہمان آنے شروع ہوگئے ممی۔ ڈنر کے مہمان اتنی جلدی تو نہیں آتے۔" نیلوفر نے کاروں کی تعداد دیکھ کر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تو اصل بات کو زبان پر روک کر زینت جلدی سے بولیں۔

"بھئی میلاد کا بھی تو بلاوا تھا نا۔ اور میلاد میں تو لیڈیز کو ہی مدعو کیا جاتا ہے۔ انہی کی کاریں ہوں گی۔"

اس اثنا میں اسفند خاموشی سے اپنی کار کو دو رویہ قطاروں کے بیچ میں گزارتا اگلے گیٹ سے جہاں بہت سے ڈرائیور چوکیدار اور ملازم نما آدمی کھڑے تھے اندر لے آئے اور بنگلے کے پورچ میں جا کر کار روک دی۔ اور زینت روشنی کے دائیں بائیں دونوں اطراف میں دور تک پھیلے لانز میں بچھے خوشنما قالینوں، صوفوں اور درختوں اور پودوں میں سجے رنگ برنگے قمقموں کی بہار دیکھنے میں محو رہیں۔

"بھئی کیا ارادہ ہے اتریں گی نہیں آپ۔" شوہر کی آواز نے ان کی محویت کو توڑا۔ تو انھوں نے چونک کر دیکھا سہیل کا پرانا ملازم شکور اپنی وردی میں ملبوس ان کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ نیلوفر بھی اتر کر باہر کھڑی ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ شعیب منصور بھی صرف اسفند ہی اب تک کار میں بیٹھا تھا۔ زینت بھی کچھ ہڑبڑا کر کار سے اُتر آئیں۔ سہیل منصور اس سے لان کے آخری کونے میں کھڑے کسی ملازم کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ بھائی بھاوج کو دیکھتے ہی سب کچھ چھوڑ کر ان کے پاس آگئے۔

"اوہو ماشاء اللہ گھر کو تو آپ نے دلہن کی طرح سجا رکھا ہے سہیل بھائی۔" زینت نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کریں بھابی جان مزید کسی کو دلہن بنانے کی عمر سے تو گزر چکے ہیں اس لیے سوچا کہ گھر کو ہی دلہن بنا کر اپنی یہ حسرت پوری کرلیں۔" سہیل نے مسکرا کر کہا تو سب ہنسنے لگے۔

"ارے خدا رکھے آپ کے آگے تو ایک بیٹی بھی ہے اسے دلہن بنا کر یہ حسرت پوری کرلیجیے۔" زینت ہنس کر بولیں۔

"وہ تو بعد کی بات ہے پہلے تو ہم اپنی فکر کر رہے ہیں۔" سہیل نے کہا تو زینت نے ہنستے ہوئے ان کی پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا۔

"اچھا اچھا تو یہ ارادے ہیں۔ نازش کہاں ہیں ان سے کہوں گی کہ ذرا اپنے میاں کو قابو میں رکھیں۔"

"ارے ان کی فکر تو چھوڑ ہی دیں وہ تو خوشی خوشی اجازت دے دیں گی۔ یوں بھی اسلام میں چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے کیوں بھائی جان۔" سہیل منصور نے اپنی بات کہہ کر شعیب منصور سے اس کی تائید چاہی تو شعیب منصور نے ہنس کر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی علیٰ ہذا القیاس۔" کہنے کا انداز ذومعنی تھا۔ زینت سمجھ گئیں۔

"بس آپ اپنی تو رہنے دیجیے کیونکہ عنقریب آپ نانا بننے والے ہیں۔ یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔" اور ان کے انکشاف پر مسرت اور حیرت کی ملی جلی سی کیفیت میں شعیب منصور نے بھنویں اُچکا کر ان سے کہا۔

"اچھا کیا واقعی ہم نانا بننے والے ہیں۔ مگر یہ انکشاف یہاں کھلی فضاؤں میں کرنے کے بجائے آپ کو بیڈروم میں کرنا چاہیے تھا۔" اور شعیب منصور کی بات پر سہیل منصور نے قہقہہ لگایا تو زینت فہمائشی انداز میں شوہر سے بولیں۔

"آپ مردوں میں واقعی ذرا شرم نہیں ہوتی۔ بھلا کہیں ایسی باتیں اس طرح سرِعام بچوں کے سامنے بھی کی جاتی ہیں۔" ان کا اشارہ نیلوفر اور اسفند کی طرف تھا جو کار سے اُتر کر باہر کھڑا ہوگیا تھا۔

"لیجیے خود ہی تو اس قدر علی الاعلان کھلی فضاؤں میں موقع کی نزاکت کی پروا کیے بغیر سب کے سامنے نانی بن جانے کا انکشاف کیا گیا ہے اور شرم ہم مردوں کو دلائی جا رہی ہے۔" شعیب منصور بولے تو سہیل منصور نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"اصل میں بھائی جان اس مسئلے میں خواتین "مسئلے میں حیا نہیں" کے مقولے پر عمل کرتی ہیں۔ یوں بھی یہ ان کا خالص نجی مسئلہ ہی ہوتا ہے نا اس لیے۔"

"اے لو بس۔ آپ تو نئے گھر میں آکر بہت ہی چل نکلے ہیں سہیل بھائی۔ بھلا یہ بتیے کیا سوچ رہے ہوں گے۔" اور ان کے چل نکلنے پر دونوں بھائیوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا تو زینت نے جھینپ کر نیلوفر سے کہا۔

"اے تم یہاں کیوں کھڑی ہو نیلو جاؤ اندر چلی جاؤ۔" اور پھر انھوں نے سہیل سے پوچھا۔

"یہ نازش کہاں ہیں؟"

"اندر ہی ہوں گی۔" سہیل نے بتایا۔

"اچھا اچھا میلاد شریف ہو رہا ہوگا نا۔؟"

"نہیں میلاد تو ابھی آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ختم ہوا ہے۔ اس وقت تو مٹھائی بانٹی جا رہی ہوگی۔" سہیل نے کہا۔

"میں مٹھائی بانٹی جا رہی ہوگی۔" زینت نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"وہ اصل میں چونکہ رات کو ڈنر ہے اس لیے ہم نے میلاد کے بعد چائے ناشتے کا جھنجٹ نہیں رکھا صرف مٹھائی بانٹنے پر اکتفا کیا ہے۔"

"ہاں یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔" زینت بولیں۔

"سنی بیٹے ذرا ڈکی کھول دیں تو شکور سے چیزیں نکلوا لوں۔" انھوں نے اسفند سے مخاطب ہو کر کہا تو اسفند نے بڑھ کر فوراً ڈکی کا قفل کھولا۔

"کیسی چیزیں نکلوا رہی ہیں بھابی جان؟" سہیل منصور نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس تھوڑی سی مٹھائی اور پھل وغیرہ ہیں۔" زینت نے کہا۔

"لیکن مٹھائی تو آپ پہلے بھی لا چکی ہیں۔" سہیل بولے۔

"وہ تو میں پہلی مرتبہ نئے گھر میں آئی تھی اس لیے شگون کے طور پر لائی تھی۔" اس اثنا میں شکور پھل اور مٹھائی کے ٹوکرے مع پھولوں کے بڑے دونے کے ساتھ نکال کر فرش پر رکھ چکا تھا۔

"اف خدا کی پناہ یہ تھوڑی سی مٹھائی ہے یا پوری نہیں تو آدھی حلوائی کی دوکان۔ اور کیا کسی فروٹ والے کا ٹھیلا لوٹ کر آئے ہیں؟ مہماں صاحبزادے جو اس طرح کے پھل اسی ٹوکرے میں نظر آ رہے ہیں۔"

"بھابی جان اتنا تکلف بلکہ تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" سہیل منصور نے بھاوج سے کہتے کہتے بھتیجے کو بھی رگید لیا تھا مگر وہ خاموش کھڑا مسکراتا ہی رہا۔ البتہ زینت بڑے ٹھسکے سے بولیں۔

"اب غیریت کی باتیں تو نہ کیجیے دیور صاحب۔ میں نے کوئی تکلف کیا ہے نہ تکلیف بس آپ کی خوشی میں اپنی تھوڑی سی خوشی شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری چیزیں کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں جو آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یعنی کہ شرمندہ کر رہا ہوں کمال ہے۔ یہ کہیے کہ الٹا شرمندہ ہو رہا ہوں بلکہ دوسروں کی شرمندگی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔" پھر بھائی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ایک تو میری یہ سمجھ میں نہیں آتا بھائی جان کہ ہم ایسی بے جا رسموں میں پڑ کر پیسے کا زیاں کیوں کرتے ہیں جبکہ مہنگائی کا ہی نہیں ترقی کا دور ہے۔ شاید ایسی رسموں اور رواجوں کی وجہ سے ہم دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"اے چھوڑیے سہیل۔ جیسا دیس ویسا بھیس، ہمارا معاشرہ الگ ہے رواج مختلف ہیں نظریات اور خیالات بھی جداگانہ حتیٰ کہ مذہب بھی منفرد۔ اب آباؤ اجداد سے جو رواج چلے آ رہے ہیں انھیں ہم چھوڑ تو نہیں سکتے۔ اور پھر ان باتوں سے بھلا ترقی کا کیا تعلق۔" "بہت بڑا تعلق ہے بلکہ وجہ بس مانگی ہی یہی ہے بھابی جان کیونکہ ان رسموں رواجوں کے پابند ہو کر ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں گے تو ترقی کیا خاک کر سکیں گے اور ایسی رسموں کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ جو رشتے دار اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اتنی مقدار میں کچھ دے سکیں وہ شرمندہ بھی ہوتے ہیں کمپلکسڈ بھی۔" سہیل منصور نے کہا۔

"اے چھوڑیں سہیل۔ آپ کے تمام رشتے داروں میں اس وقت میں ہی سب سے قریبی رشتہ دار ہوں۔ یعنی بھاوج ہوں بڑی اور میری محترمہ کا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ نے تو اتنا کچھ کہہ کر میری خوشی بھی ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔" زینت کھسیانی سی ہو کر بولیں۔

"ارے نہیں بھابی جان میں تو ایسی رسموں کو ختم کر دینے کی غرض سے کہہ رہا تھا جن سے تکلیف ہی نہیں بلکہ نقصان بھی پہنچتا ہے اور کسی چیز کے خلاف کوئی آوازہ بلند کیا جائے تو وہ سب سے پہلے اپنے گھر سے ہی کیا جاتا ہے۔" سہیل منصور نے بھاوج کے برا مان جانے پر اپنی صفائی پیش کی۔

"مگر یہ آوازہ بلند کرنے کا کیا موقع ہے بھلا۔ تم اگر رسموں اور رواجوں کے خلاف آوازہ ہی بلند کرنا چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ باقاعدہ ایک منظم جماعت بناؤ، جلسے کرو، جلوس نکالو مگر اپنی بھاوج کی دل آزاری تو نہ کرو۔" شعیب منصور نے بیوی کی حمایت میں کہا۔ تو سہیل ہنس کر بولے۔

"اوکے چیف۔ آپ کے گراں بہا مشورے پر یہ عاجز جلد ہی عمل درآمد کرے گا۔" اصل میں سہیل کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ انھوں نے بات کو طول دے کر ناحق ہی بھاوج کو آزردہ کر دیا ہے۔

"چلو بھئی شکور۔ ادھر آکر یہ ٹوکرے اٹھاؤ اور اندر لے چلو۔" شعیب منصور نے ملازم شکور سے کہا۔ جو ان لوگوں کے پاس سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا تھا۔

شوہر کو اپنی حمایت میں بولتا دیکھ کر زینت کا بگڑا ہوا موڈ قدرے بحال ہو گیا تھا اور پھر موقع بھی کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار نہیں کر سکتی تھیں شکور ایک دوسرے ملازم کے ساتھ آکر ٹوکرے اٹھانے لگا۔ تو پھلوں کے ٹوکرے پر رکھا ہوا پھولوں کا دونا اٹھانے کی غرض سے جونہی وہ آگے بڑھیں۔ اسفند نے جھک کر ان سے پہلے ہی وہ دونا اٹھا لیا۔

"ارے نہیں سنی تم اسے لے کر چلتے ہوئے کیا اچھے لگو گے۔ لاؤ یہ مجھے دے دو۔" زینت بولیں۔

"نہیں ممی یہ آپ کی شایان شان نہیں ہوگا کہ دونا ہاتھ میں لے کر چلیں۔ اسے تو بس میرے ہی پاس رہنے دیجیے۔" بیٹے کی اس بات پر تو ماں کے دل میں بھرا رہا سہا غبار بھی مسرت اور فخر کے احساس میں کہیں رل مل کر بھک سے اڑ گیا۔

"بھابی جان ایمان سے اگر آپ کی خفگی کا یہی عالم رہا تو یہ ساری روشنیاں ابھی ابھی بجھوا دوں گا۔" سہیل منصور نے بھاوج کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔

"ارے نہیں کیسی بدشگونی کی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا تم سے خفا کیوں ہونے لگی۔" زینت حسب عادت ان کے بازو پر ہلکے سے ہاتھ مار کر بولیں۔ اصل میں تو سہیل پوچھنا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ پھول کس سلسلے میں لائے گئے ہیں۔ مگر بھاوج کے برا ماننے کے خیال سے محض راہ ہموار کرنے کو انھوں نے یہ بات کہہ دی تھی لیکن ان کا جواب سن کر بھی وہ پھولوں کے بارے میں استفسار نہ کر سکے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دونوں ملازم ٹوکرے اٹھا کر آگے بڑھتے زینت جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ تاکہ نازش کے سامنے وہ ٹوکرے پیش کر سکیں۔ یوں بھی انھیں یہ بات بہت ناگوار گزری تھی کہ نازش ان کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھیں لیکن چونکہ وہ خود دیر سے آئی تھیں اس لیے انھوں نے زیادہ خیال نہیں رکھا تھا مگر جونہی وہ اور ان کے پیچھے شعیب منصور، اسفند، کہ نیلوفر تو ان کے ٹوکنے پر پہلے ہی اندر چلی گئی تھی، اور سہیل منصور بالائی سیڑھی پر پہنچے، اندر سے نازش کی معیت میں میلاد شریف میں شرکت کرنے والی خواتین ایک غول کی صورت میں داخلی دروازے پر نمودار ہوئیں۔ جیٹھانی کو دیکھتے ہی نازش انھیں سلام کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور ان سے بغل گیر ہو گئیں۔ اور ان کی وجہ سے دوسری تمام خواتین کو بھی رکنا پڑا۔ زینت کسی ایسے ہی موقع کی خواہاں تھیں۔ انھوں نے کسی اور کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے مڑ کر اسفند کے ہاتھ سے پھولوں کا دونا لیا۔ اور اسے جلد جلد کھول کر سہیل کو قریب بلاتے ہوئے دو نہایت موٹے موٹے موتیا اور گلاب میں گندھے ہار نکالے۔ سہیل بھی فوراً ہی قریب آ گئے تھے۔ زینت نے پہلے سہیل کو ہار پہنایا اور پھر نازش کو۔ نازش ہلکا ہلکا میک اپ کیے اور بادلے کے نفیس کام کی آف وہائٹ ساڑھی پر اصلی موتیوں کی چار لڑی کی مالا اور کانوں میں ڈائمنڈ اور موتیوں کے جڑاؤ ٹاپس میں پھولوں کے ہار کے ساتھ اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ ماشاء اللہ کہہ کر زینت نے ان کا رخسار چوم لیا۔

"ہم نے کیا قصور کیا ہے بھابی جان۔" سہیل منصور ان کے آگے جھک کر بولے تو زینت بری طرح جھینپ کر ان کے سر پر ایک دھپ لگاتی ہوئی بولیں۔

"اے چلو شرم تو نہیں آتی۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"بھئی اس میں شرم دلانے کی کیا بات ہے۔ آخر یہ تمھارے چھوٹے بھائی کی طرح تو ہیں۔" شعیب منصور بولے۔

"جی ہاں، اور یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔" سہیل نے سیدھا ہو کر ہنستے ہوئے کہا تو ان کے مذاق پر ایک بار پھر زینت کٹ کر رہ گئیں۔

"اے چھوٹی دلہن یہ آپ کے میاں تو کینیڈا میں رہ کر بہت ہی بے کینڈے ہو گئے۔" انھوں نے نازش سے کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔

"واہ بھابی جان کینیڈا میں رہ کر بے کینڈے ہونے کا کیا خوب قافیہ ملایا ہے آپ نے۔" انھوں نے کہا تو زینت ہنس کر بولیں۔

"واہ اسکا تو جو بھی نکلا وہ یاد رکھ گا۔" لو اب یہ بھی میاں کا ہی ساتھ دے رہی ہیں۔" نازش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ہنستی ہی رہیں۔ زینت خواتین کے اس غول میں سے اپنی شناساؤں سے سلام دعا کرنے لگیں۔ باقی جو غیر شناسا تھیں ان سے نازش نے ان کا تعارف کرایا۔ دونوں ملازم ٹوکروں کا بوجھ شانوں پر اٹھائے پیچھے کھڑے تھے۔ ملنے ملانے میں شاید زینت ان کو بھول گئی تھیں شعیب منصور نے یاد دلایا تو انھوں نے نازش کو سنانے کی غرض سے باآواز بلند ان سے کہا۔

"بھئی یہ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے تم اندر کیوں نہیں لے جاتے جو یہاں کھڑے اُن کی نمائش کر رہے ہو" مگر نازش اُن خواتین سے جو صرف محفلِ میلاد میں شرکت کرنے آئی تھیں اور واپسی کے لیے پر تول رہی تھیں شکریہ ادا کرنے میں لگ گئی تھیں بلکہ رخصت کرنے لگی تھیں اس لیے جٹھانی کی بات سننے کے باوجود انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بہرحال زینت کا مقصد حل ہو گیا تھا اس لیے وہ دیورانی کو چھوڑ کر شوہر اور بیٹے کے ساتھ اندر چلی آئیں۔ اندر طویل سے کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کشادہ سا کمرہ تھا جس میں تین طرف تو دیواریں تھے اور ایک طرف شیشے کی بڑی سی دیوار جس سے بنگلے کے پہلو کا بیرونی منظر صاف نظر آتا تھا۔ اور جس کے آگے ماربل استونوں کے ستونوں والا برآمدہ سا بنا ہوا تھا اور جسے لاؤنج کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لاؤنج میں بہت ہی قیمتی اور خوشنما وال ٹو وال قالین اور اعلیٰ درجہ کا فرنیچر پڑا تھا۔ اور کچھ خواتین وہاں بھی صوفوں اور کوچوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ زینت میاں اور بیٹے کے ساتھ اس لاؤنج میں آئیں تو دوسری طرف کے دروازے سے جو کہ ایک پیسج کا تھا۔ نازو نیلما کے ساتھ آتی نظر آئی۔ اور ماں کو دیکھتے ہی بھاگ کر اُن سے لپٹ گئی۔

"ارے تم کب آئیں نازو" ماں نے اس کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

"میں تو دوپہر کو ہی آگئی تھی ممی۔ میلاد کا بلاوا تھا نا" نازو نے بتایا۔

"کمال ہے مجھے تو بتا دیا ہوتا کہ تم بھی میلاد میں شرکت کرنے آ رہی ہو" زینت نے کہا۔ انداز گلہ آمیز سا تھا۔

"ممی میں نے سوچا کہ آپ یہاں موجود ہی ہوں گی پھر آپ کو بتا کر کیا کروں گی" اور بیٹی کے جواب پر ماں نے دل میں سوچا معلوم نہیں آجکل کی لڑکیاں شادی کے بعد اس قدر کیوں بدل جاتی ہیں۔ نازو نے مجھے بتایا تک نہیں کہ میں بھی چچا کے یہاں جا رہی ہوں یا یہ عالم تھا کہ خواہ کوئی بات ہو مجھے بتائے بغیر اُسے چین ہی نہ پڑتا تھا۔

"اچھا کیا احمد بھی آئے ہیں۔؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں۔ احمد کا زنانے بلاوے میں بھلا کیا کام تھا ممی۔ وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے تھے۔ اب رات کو ہی آئیں گے" نازو نے کہا۔ زینت کا دل تو چاہا پوچھیں کہ تم خود کیوں نہیں آگئیں جو احمد تمھیں ڈراپ کر کے گئے ہیں۔ بیٹی سے انکار کرنے کے باوجود چونکہ ماں تھیں دل نہیں مانا تھا اس لیے بیٹی کو اپنی ٹیبرا ڈے دی تھی مگر اب ہمت نہیں پڑ رہی تھی اس سے کچھ پوچھنے کی۔

"ہائے بھائی جان۔ آپ نے تو اپنی صورت کو ترسا ہی دیا۔ پورے ڈیڑھ ماہ سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ دو تین مرتبہ محفل کی وجہ سے گھر بھی گئی مگر آپ ملے ہی نہیں۔ کب واپس آئے آپ" ماں سے الگ ہو کر نازو بھائی کے بازو پر جھول کر بولی۔ تو یہ مسرت آمیز اور لطیف سا خیال کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ بھائی کے دل میں بہن کی محبت کو دو چند کر گیا اسفند نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"بس تمھارے ساتھ ساتھ ہی آیا ہوں یعنی گزشتہ شب۔"

"اوہ۔ اچھا اچھا۔ پھر کیسا رہا یہ آپ کا ٹرپ۔؟" نازو نے بھائی کے یگانگت بھرے رویے سے حوصلہ پا کر ایک نجی سا سوال کیا۔

"بس ٹھیک ہی رہا۔ احمد کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے تم خوش تو ہو نا۔" اسفند نے سرسری سے انداز میں اس کی بات کا جواب دے کر پوچھا۔

"بہت خوش ہوں بھائی جان۔ احمد اپنی ذات سے تو بہت اچھے ہیں" نازو نے مسرور لہجہ میں بتایا۔

"بس یہی ہونا بھی چاہیے۔" اسفند بولا تو اس خیال سے کہ کہیں کہ نازو اپنی سسرال والوں کے متعلق بھائی سے کچھ نہ کہہ دے۔ زینت نے جن کے کان اس گفتگو پر لگے تھے دخل اندازی کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمھاری سسرال میں سے کوئی نہیں آیا کیا؟"

"نہیں۔ بس احمد کی امی ہی آئی ہیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں" نازو نے بتایا۔

"اچھا اچھا تو آؤ چلو میرے ساتھ میں ذرا ان سے بھی مل لوں" زینت بولیں۔

"آپ خود چلی جایئے نا یا پھر نیلما یا کوثر کو لے جایئے۔ میں ذرا اپنے بھائی جان سے تھوڑی سی باتیں تو کر لوں۔ پورے پانچ مہینے بعد ملاقات ہوئی ہے ان سے" نازو نے جواب میں کہا۔ تو زینت اکیلی ہی اس کی ساس سے ملنے چل دیں۔

"باپ کو بھول گئی ہو کیا جو صرف بھائی سے ہی باتیں کیے جاؤ گی؟" شعیب منصور نے جو پیچھے ہی کسی سے بات کرنے کے لیے رک گئے تھے۔ پیچھے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ پلٹ کر اُن سے لپٹ گئی اور اُن کا حال احوال پوچھنے لگی۔ اصل میں وہ احمد کی چچازاد بہن کی شادی میں پورے ایک ماہ لاہور رہ کر گزشتہ شب ہی آئی تھی اور باپ سے بھی نہیں مل سکی تھی جب کہ ماں سے تو آتے ہی فون پر بات ہو گئی تھی۔ وہ شعیب منصور سے باتیں کرنے لگی تو اسفند نے نیلما سے پوچھا۔

"یہ کوثر کہاں غائب ہے گڑیا۔؟" وہ بہت لاڈ میں نیلما کو گڑیا ہی کہتا تھا۔

"کوثر تو اس وقت شاید اماں جان کے کمرے میں ہیں بھائی جان۔ پتا ہے چچا اور چچی جان نے ان کے لیے ایک علیحدہ بیڈ روم بنوایا ہے اور اب وہ وہیں رہا کریں گی" نیلما نے بڑی مشیخت سے بتا کر بھائی کی طرف دیکھا تو اسفند نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"اچھا تو کیا اماں جان بھی یہاں رہنے پر رضامند ہو گئی ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں بھائی جان" نیلما بھائی کے تیکھے انداز پر سہم کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔ کہاں ہے ان کا کمرہ۔ مجھے بھی وہاں لے چلو" اسفند نے کہا۔ لہجہ اب بھی تڑخا تڑخا سا تھا۔ وہ نیلما کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔

"جی اچھا بھائی جان۔ مگر وہ تو کوثر کہہ رہی تھیں کہ وہ اماں جان کو اب اپنے پاس ہی رکھیں گی۔ ورنہ اماں جان نے تھوڑی کہا تھا رہنے کو۔ اب آپ ان سے پوچھیں گے تو — تو—"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ میں ان سے کچھ پوچھوں گا۔ بس آئی وانٹ ٹو سی ہر۔ چلو کہاں ہیں وہ" اسفند نے گویا یہ کہہ کر گنگناتی ہوئی بہن کو جھڑکا۔ تو نیلما اسی پیسج سے جس سے وہ نازو کے ساتھ ہو کر آئی تھی اسے اندر لے گئی اور ایک چھوٹا سا لاؤنج اور پیسج عبور کر کے۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک کمرے میں لے آئی۔

یہ ایک خوابگاہ تھی۔ بہت نفاست مگر سادگی سے آراستہ۔ روشن اور ہوادار بھی بہت تھی اور خاصی کشادہ بھی۔ یعنی سلمیٰ بیگم کی عین مرضی کے مطابق۔ اور سلمیٰ بیگم بیڈ پر تکیے سے لگی سوپ کا پیالہ ہاتھ میں لیے کوثر سے باتیں کر رہی تھیں جو ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی سلمیٰ بیگم نے خوشی سے بے قابو ہو کر کہا۔

"ارے ننھے تو کب آیا — میرے چاند!" اور وہ جو خوابگاہ میں قدم رکھتے ہی ان کی طرف دیکھنے کے بجائے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا، اپنے بگڑے بگڑے موڈ کے ساتھ نہایت بے دلی سے انہیں سلام کر کے بیڈ کے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کوثر اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے سلام کر کے بولی۔

"بھائی جان تو صبح بھی یہاں آئے تھے اماں جان!"

"اچھا۔ یہ صبح آیا تھا اور مجھ سے ملے بغیر ہی چلا بھی گیا۔ ارے یہ تو ہے ہی میری طرف سے سدا کا لاپروا۔ خود ہی زبردستی مجھے روکا اور چھوڑ کر ایسا گیا کہ آج ڈیڑھ ماہ بعد شکل دکھائی ہے۔ لے میں تو کب کی اپنے بھائی کے ہاں چلی گئی ہوتی مگر اس کی ناراضگی کے خیال سے دل پر جبر کر کے رکنا ہی پڑا" سلمیٰ بیگم اپنی بات کہہ کر خاموش ہوئیں تو اُس نے کہا۔

"اور جتنے بھی گلے شکوے رہ گئے ہیں وہ بھی اس بچی کے سامنے کر ڈالیے۔ اس کے بعد ہی میں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے سوچوں گا۔"

"ہونہہ! بڑا لاٹ صاحب کہیں کا بعد میں سوچے گا۔ خود تو مجھے اس قیدِ تنہائی میں ڈال کر — بھول بھال گیا اور اب اُلٹا گرمی بھی دکھا رہا ہے۔ وہی مثل ہو گئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" سلمیٰ بیگم اس کی بات پر جل ہی اٹھیں۔

"مثال بہت عام سی ہے مگر خیر وہ کہاں ہیں آپ کی ایڈی کا تنگ نظر نہیں آ رہیں" اُس نے یہ بات ذرا چبا کر کہی تھی۔ سلمیٰ بیگم کی سمجھ میں نہ آئی تو انہوں نے پوچھا۔

"ہیں کون نظر نہیں آ رہا۔ کیا کہہ رہے ہو تم" مگر کوثر نے سن ہی نہیں لی تھی بلکہ سمجھ بھی گئی تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"لے ایسی کیا بات کہہ دی اس نے جو تم ہنس رہی ہو بیٹی۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ" سلمیٰ بیگم نے سوپ کا خالی پیالہ کوثر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"یہ غالباً سلوط آپا کو پوچھ رہے ہیں۔ ہے نا بھائی جان؟" کوثر نے اسے مخاطب کر کے اپنی بات کی تائید چاہی۔

"لے ہے توبہ اسے میری ایڈی کا تنگ کہہ رہا ہے کتنی بری بات ہے ننھے۔ اگر وہ سن لے تو بھلا کیا سوچے" سلمیٰ بیگم نے فہمائشی انداز میں کہا۔

"لو دیکھا تم نے کوثر۔ سب کچھ سن لیا تھا مگر جان بوجھ کر تجاہل برت رہی تھیں یہ اماں جان" وہ مسکرا کر بولا تو کوثر پھر ہنسنے لگی۔ تو سلمیٰ بیگم جز بز سی ہو کر کوثر سے بولیں۔

"کوثر بھئی ذرا میرے لیے ایک پان تو بنوا لاؤ۔ سوپ پینے سے منہ کا مزا خراب ہو گیا ہے۔ بس تم پان پر کتھا اور چونا لگوا چھالیہ اور زردہ تو میرے بٹوے میں موجود ہے۔ جاؤ بیٹی شاباش خدا تمہاری ہزاری عمر کرے۔" صاف ظاہر تھا کہ پان کے بہ انہوں نے کوثر کو ٹالا تھا۔ کوثر کے جاتے ہی اس نے کہا۔

"اماں جان یہ جو آپ بزرگوں کے پاس دعاؤں کی صورت میں ایک مسکہ پالش ہوتا ہے نا اس کا اگر غنیم پر تجربہ کرے دیکھیں تو وہ فوراً ہی آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ جب کہ یہ بے چاری کوثر تو ہے ہی بہت بھولی اور معصوم۔"

"اے اگر بھولی اور معصوم بھی ہے تو دیکھ لو آج کل کی رفتارِ زمانہ۔ فوراً ہی سمجھ گئی کہ تم کس کو ایڈی کا نگ کہہ رہے ہو۔ نے اسی لیے تو اسے یہاں سے ٹالا ہے کہ تم نے کچھ اور الٹی سیدھی ہانک دی تو سلوط کی پوزیشن ان لوگوں کی نظروں میں کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"دو کوڑی کی تو آپ لوگوں نے خود ہی نہیں رکھی۔ ہماری ممی صاحبہ انہیں حقیر اور فقیر سمجھتی ہیں تو آپ نے اپنی ٹہلیں کرا کرا کے انہیں بے داموں کی لونڈی بنا لیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چچی جان بھی انہیں اسی مقصد سے یہاں لے کر آئی ہیں کہ خوب کس کس کر کام لیں۔ تو پھر میرے کچھ کہنے سے ان کی رہی سہی عزت میں ایسا کون سا بٹہ لگ جائے گا۔" اس کے منہ سے ایسے ثقیل الفاظ سن کر سلمیٰ بیگم نے پل بھر کو اسے تعجب سے دیکھا اور بولیں۔

"نہیں۔ نہیں جہاں تک چھوٹی دلہن کا تعلق ہے وہ بہت ہی نفیس اور مخلص طبیعت کی مالک ہیں۔ انہوں نے سلوط سے خود کوئی کام نہیں لیا بلکہ خود سلوط نے زبردستی کر کر کے ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔ رہ گئی میں تو میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے بھی اسے کام کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا ہے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تمہاری ماں بھی اس سے کوئی کام نہیں لیتیں۔"

"ارے چھوڑیں اماں جان، چچی جان کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن ممی جس طرح ان سے پیش آتی ہیں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں سلوط کی جگہ ہوتا تو ایک دن بھی ان کے گھر میں نہ رہتا۔ پتا نہیں کیوں اتنی خوار ہو کر رہ رہی ہیں۔ چلی کیوں نہیں جاتیں۔" وہ کڑوا سا منہ بنا کر بولا۔

"مگر جائے تو کہاں جائے وہ بے چاری۔ تمہاری پھپھی اور پھوپھا تو اسے یہاں بھیج کر بھول ہی گئے ہیں کہ ایک بڑی ذمہ داری اور بھی ہے ان کے سر پر۔" سلمیٰ بیگم سلوط کی ہمدردی سے لبریز دل کے ساتھ بولیں۔ دل تو چاہا کہ اس کی مجبوری اور تھوڑے بہت حالات سے جن سے واقف تھیں پوتے کو آگاہ کر دیں لیکن سلوط سے وعدہ کر چکی تھیں اور پھر کسی کا راز افشا کرنا ان کی عادت نہ تھی۔ اس لیے یہی کہہ سکیں۔

"تو کیا اور سارے رشتے دار مر کھپ گئے ہیں ان کے؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"ارے جب اپنے سگے بھائی بھاوج کو ہی اس کی پروا نہیں تو دوسرے رشتے داروں کو کیا دکھ ہو گا اس کا۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے سگا رشتے دار تو کوئی ہے ہی نہیں۔ لیکن بیٹے، تم پر ایسا کون سا بوجھ ہے اس کا۔ اگر تمہاری دو روٹیاں کھاتی بھی ہے تو بلا ہاتھ پیر چلائے تو نہیں کھاتی۔ تمہارے گھر کے بہت سے کام بھی تو کر دیتی ہے۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"اُفوہ! یہی تو مجھے پسند نہیں۔ یہ ان کا خود کو اس قدر گرا کر رہنا۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ اپنی کوئی حیثیت بنا کر رہیں۔ وقت کو دوسروں کی خدمت کر کے نہ گزاریں بلکہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔" وہ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر بولا تو سلمیٰ بیگم کچھ دیر بڑے غور سے اس کی شکل دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔

"ایک بات پوچھوں ننھے۔"

"ضرور پوچھیے۔"

"کہیں تو۔ کہیں تو۔؟"

"لیجیے یہ کیا بات ہوئی۔ کہیں تو کہیں تو۔ میں تو اصل میں اس وقت بڑے خونخوار موڈ میں یہاں آیا تھا۔" وہ بھی سمجھ گیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ اس نے نہایت خوبصورتی سے بات گھما دی۔

"کیوں خیر تو ہے؟" سلمیٰ بیگم سچ مچ وہ سوال بھول گئیں جو وہ اس سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے متجسس انداز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے یہاں آتے ہی کسی سے اطلاع ملی کہ آپ یہاں مستقل طور پر ڈیرے خیمے ڈالنے کی غرض سے آئی ہیں تو میرا خون کھول کر رہ گیا۔"

"ہائیں ہائیں ننھے۔ تمہارے منہ میں تو زبان نہیں تھی۔ پھر یہ مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کہاں سے ہونے لگی۔ کیا تمہاری نظر میں اب اس بڑھیا دادی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔" سلمیٰ بیگم نے نرم لہجے میں ملامت کی تو وہ بولا۔

"اچھا تو پھر حضور اماں جان قبلہ بہت معتبر ذرائع سے یہ بات اس عاجز کے علم میں آئی ہے کہ آپ کی ذاتِ بابرکات گل بہار کو خیر باد کہہ کر الکوثر میں مستقل طور پر قدم رنجہ فرمانے کی غرض سے آئی ہے۔" اس نے بہت سوچ سوچ کر اور جما جما کر یہ بات کہی تو اس کے قدم رنجہ فرمانا کہنے پر سلمیٰ بیگم کو ہنسی آ گئی۔

"واہ۔ یوں نہیں تو یوں۔ اے میں کہتی ہوں تجھے اتنی باتیں بنانی کیسے آ گئیں؟"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں اماں جان۔" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔

"جواب کیا دوں۔ میاں بیوی اور بچی تینوں ہی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہاں آ کر رہوں۔ چھوٹی دلہن کا کہنا ہے کہ بزرگوں کے دم سے دل کو بڑی ڈھارس رہتی ہے۔ سہیل کہتے ہیں کہ انہیں بھی خدمت کا موقع دوں۔ اور بچی خدا اسے عمر دے جب سے یہاں آئی ہوں رات کو سوتی بھی میرے پاس ہی ہے۔ کبھی سوپ لا رہی ہے، کبھی چائے اور کبھی دودھ۔ اب سوچتی ہوں کہ اتنی ساری محبتوں کو کیسے ٹھکرا دوں۔ مگر دل نہیں مانتا ننھے۔ تجھے چھوڑ کر کہیں رہنے کو۔ اب زندگی رہ بھی کتنی گئی ہے جو تجھ سے دور رہ کر گزار دوں۔ تو اگر گھر میں نہیں رہتا تب بھی مجھے یہ انتظار تو رہتا ہے کہ تو کسی وقت بھی آ جائے گا۔ بیٹا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ پیٹ سے زیادہ پالے کی ہوتی ہے تو کچھ غلط نہیں کہتے۔" سلمیٰ بیگم نے سمجھانے کے سے انداز میں ضرور کہا تھا مگر ان کا لہجہ آزردہ اور دلگیر تھا جو ڈائریکٹ اس کے دل پر اثر انداز ہوا۔ وہ کچھ دیر تک تو ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"ہوں چچی جان خوش قسمت اور کھلے دل کی مالک ہیں جو بزرگوں کی اہمیت کا احساس رکھتی ہیں لیکن میری ماں ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ پھر بھی دل کی بری نہیں ہیں اور آپ سے انہیں سوتیل پن کی وجہ سے پرخاش نہیں ہے بلکہ میری وجہ سے ہے۔"

"ہائیں تمہاری وجہ سے۔ وہ کیوں؟" سلمیٰ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ ممی کو اس کا بہت ملال ہے بلکہ وہ ڈیڈی سے سخت شاکی بھی رہتی ہیں کہ انہوں نے مجھے بچپن میں ابا جان اور آپ کو کیوں سونپ دیا تھا۔ بھلا دیکھیے ان کا خیال ہے کہ میں انہیں اپنی ماں نہیں سمجھتا یعنی ان کا اکلوتا بیٹا ہو کر ان کے لیے غیر بن گیا ہوں۔ کیونکہ ان کے خیال میں آپ نے مجھ پر جھوٹی سچی ممتا نچھاور کر کے مجھے ان سے منحرف کر دیا ہے۔ سچ اماں جان کبھی کبھی تو مجھے سخت کوفت ہوتی ہے اور کبھی ہنسی بھی آتی ہے ان کے ایسے بے بنیاد خیالات پر۔"

"مگر کوفت کھانے یا ہنسنے کی کیا بات ہے بیٹا۔ تم اپنے رویے اور سلوک سے ان کے یہ خیالات بدلنے کی کوشش کرو۔ یوں بھی ماں کو ناخوش رکھنا گناہ ہے۔ دیکھو پیٹ میں رکھ کر اور جنم بھی تو اس نے ہی تمہیں دیا تھا۔ اس کا تم پر بڑا حق ہے۔ میں تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ اور پھر ہواؤں کی زد پر رکھا ہوا چراغ ہوں۔ کسی وقت بھی ایک ہی جھونکے میں بجھ جاؤں گی تو پھر واسطہ تو تمہیں اس سے ہی پڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں جان۔ مگر ممی کی طبیعت اور طور طریق سے میری طبیعت میل ہی نہیں کھاتی۔ اس پر میرے اور ان کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ادھر ڈیڈی ہیں جو باپ کم، باپ کے دوست زیادہ لگتے ہیں کہ بات بھی کریں گے تو اس قدر ناپ تول کر جیسے سچ مچ کسی گہرے یارِ غار کے بیٹے سے مخاطب ہوں۔ ہمیشہ یہی آرزو کرتا رہا کہ مجھے سینے سے لگائیں۔ چومیں۔ لپٹائیں۔ مگر ہمیشہ۔

"کیسے ہو سنی؟"

"یا ٹرپ انجوائے کیا سنی؟" وغیرہ سے آگے ہی نہیں بڑھتے۔" اس نے باپ کی آواز بنا کر کہا۔

"ارے تو جب بیٹے جوان ہو جاتے ہیں ننھے تو برابر کی اولاد ہی سمجھے جاتے ہیں اور تم ان سے دور بھی تو رہتے ہو۔ قریب رہو گے تو وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" سلمیٰ بیگم دل ہی دل میں اس کی والدین کی طرف سے دی گئی محرومیوں پر کڑھ کر بولیں۔

"نہیں اماں جان۔ مجھے کسی کے ٹھیک ویک ہونے کی تمنا نہیں۔ میں تو اب ان باتوں کا عادی ہو گیا ہوں۔" پھر وہ

ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔

"معلوم ہے باتوں ہی باتوں میں ساڑھے سات بج گئے ہیں اماں جان۔ کیا آپ باہر نہیں چلیں گی۔" اُس نے دیوار پر آویزاں گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ بکس پارٹی ہے۔ میں باہر جا کر کیا کروں گی۔ میں تو اب وضو کر کے عشا کی نماز پڑھوں گی۔ وقت ہونے والا ہے۔ البتہ تم ضرور چلے جاؤ ورنہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہاری ڈھنڈیا مچ جائے گی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا تو اُس نے "اچھا" کہنے کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں تو نماز پڑھنے سے پہلے آپ کھانا کھا لیں۔ یوں بھی آپ سرِ شام ہی کھانے کی عادی ہیں۔"

"نہیں بیٹے۔ سہ پہر کو چائے کے ساتھ منہ جھٹال لیا تھا۔ اس پر سوپ پی لیا۔ ابھی تک سینے پر رکھا ہوا ہے۔ پر کچھ۔" سلمیٰ بیگم آگے سرک کر جوتی میں پیر ڈالتے ہوئے بولیں تو پھر وہ چپ چاپ اُن کے کمرے سے نکل آیا۔

لیکن ابھی خواب گاہ کے آگے بنی آخری سیڑھی پر ہی آیا تھا کہ اپنا ڈبل پاٹ کا کامدانی کی پھوار پڑا آسمانی رنگ کا دوپٹہ سنبھالتی سلوط اپنی ہی کسی دُھن میں پسیج سے نکلی وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو اُس پر نظر پڑتے ہی "اوہ" کی آواز کے ساتھ تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ جو اُس کی تلاش میں سلمیٰ بیگم کے کمرے میں آیا تھا اور اُسے نہ پا کر بجھا بجھا سا دل لیے باہر نکلا تھا اُسے اچانک دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"اب اس قدر بھی ہیبت ناک اور دہشتناک نہیں ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔" مگر وہ واقعی بری طرح ڈر گئی تھی اور خوف سے اچھلتے دل کو قابو میں کرنے میں کوشاں تھی۔ اس سے جواب میں کچھ کہا بھی نہ جا سکا۔ نچلا ہونٹ بڑے ہنگامہ خیز انداز میں دانتوں میں بھینچے بس اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ بھی سر سے پیر تک کچھ دیر اس پر نظریں جما کر دیکھتا رہا۔ آسمانی رنگ کے تنگ پاجامہ سوٹ پر سفید نگینوں کا ہلکا سا آرٹیفیشل سیٹ پہنے۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے اپنے پورے وجود کے ساتھ آنکھوں کی راہ وہ اُسے اپنے دل میں اُترتی لگی۔

"بہت تڑپایا ہے آپ نے مجھے پورے ڈیڑھ ماہ۔ ایک تو اپنا تصور میرے ساتھ کر دیا اور خود مزے سے یہاں موج کرتی رہیں۔ بتائیے کیا سزا دوں میں اس کی آپ کو۔" وہ وہیں کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں میں ایک وارفتہ سی چمک لیے بولا۔

وہ خود بھی تو اُس کے جانے سے کیسی اُداس اُداس سی رہنے لگی تھی۔

کتنی ہی بار اُس کے دل نے مچل مچل کر تمنا کی تھی کہ کاش وہ واپس لوٹ آئے تاکہ ایک بار چپکے سے ہی اُسے دیکھ لے کہ وہ بھی اُسے کتنا اچھا اور اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ شاید اُسی روز سے اس قدر عزیز ہو گیا تھا جس روز آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اُس نے انتہائی غیض کے عالم میں پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔

اور آج وہ اُس کے اتنے قریب کھڑا اُس سے کیا پوچھ رہا تھا؟

اُس کی آنکھوں میں یہ کیسی ہوشربا چمک تھی؟

کمزور لمحوں نے سلوط جیسی ٹھوس طبیعت کی لڑکی کو بُری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

بس انہی کمزور لمحوں میں سے کوئی ایک لمحہ اُسے ڈگمگا ہی دینے والا تھا کہ غسلخانے میں سے آخ آخ کی آواز آئی (شاید سلمیٰ بیگم کھنکار کر گلا صاف کر رہی تھیں)

تو وہ یوں چونکی جیسے بند پلکوں سے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے کسی شور شرابے یا دھمک سے یکلخت انسان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور آنکھ کھلتے ہی وہ سُندر سپنا نقشِ برآب کی طرح خیالات کی سرکش لہروں میں کہیں رَل مل جاتا ہے۔

آنکھ کھل گئی تھی تو نزاکت کا احساس یک دم ہی جاگ اُٹھا تھا۔

"مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں اسفند صاحب۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اگر اماں جان نے دیکھ لیا تو یہ آپ کے لیے نہ سہی لیکن میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا۔" زبان سے سنگ باری اور چہرے سے جذبات کی پہلی پھوار۔

اور ابھی ابھی اُس کی آنکھوں میں بھی تو وہ جذبے کی تصدیق کرنے والے سارے عکس دیکھ چکا تھا۔ پھر اس زبان پر کیسے یقین کر لیتا جو نزاکتوں اور احتیاط کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اور پھر چچا کے گھر کا رُخ کرتے ہوئے کار ہی میں اس انکشاف

پر کہ وہ اُس کے چچا کے ہاں گئی ہوئی ہے اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسپیڈ کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر کسی طرح اس تک پہنچ جائے۔ اسی وجہ سے تو وہ اس قدر گم صم سا نظر آ رہا تھا۔ ماں باپ کے مابین جو باتیں ہوئی تھیں اسی انبساط اور اشتیاق میں وہ بھی ڈھنگ سے نہ سن سکا تھا۔ اس پر مستزاد چچا کے ہاں آ کر بھی کافی دیر تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ اس پر وہ کہہ رہی تھی کہ چلے جاؤ۔

مگر کیسے اور کس دل سے جاتا وہ؟

جب کہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اُسے کھینچ کر کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں کسی کے آنے کا احتمال ہو نہ دیکھ لیے جانے کا دھڑکا۔

دل میں یہ لگن تھی اور نگاہوں میں وہی وارفتہ سی چمک۔

جو اُس کے نزاکتوں اور اندیشوں بلکہ رسوائی کے احساس سے متغیر سے ہوتے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ خود بھی تو اپنے جذبے کی تشہیر نہیں چاہتا تھا۔ وہ اماں جان جیسی مونس، رفیق، ہمدرد اور ہمراز ہستی کے سامنے بھی نہیں۔

"ٹھیک ہے چلا تو جاتا ہوں مگر صرف ایک شرط پر۔" اُس کی آنکھوں کی وارفتہ سی چمک کچھ سوا ہو گئی۔ مگر اُس کی نگاہیں تو غسلخانے کے دروازے پر لگی تھیں۔

"کک۔ کیسی شرط؟" اُس نے بدستور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

بشرطیکہ آپ ایمان داری سے کام لیں گی۔" اُس نے یہ کہہ کر گویا اُس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ کیا۔

"اچھا اچھا آپ بتائیے تو سہی۔ میں۔ میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔" اندر غسلخانے میں پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ اس لیے اُس نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔

"اچھا تو صرف اتنا بتا دیجیے کہ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں لیکن پوری صداقت کے ساتھ۔"

اس سوال پر اتنی سراسیمگی کے عالم میں بھی اُس کے پھیکے پھیکے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

"بہت اچھے۔ بے حد ڈیسنٹ۔" اُس نے پست سی آواز میں کہا۔ یوں بھی سلمیٰ بیگم کے غسلخانے سے برآمد ہونے کا کسی لمحے بھی امکان تھا۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر بلا سوچے سمجھے وہ اُس کی ہر شرط ماننے پر تیار ہو گئی تھی۔

"بھئی، یہ بہت اچھے۔ بے حد ڈیسنٹ سے کیا مراد ہے آپ کی؟ اچھے اور ڈیسنٹ تو ڈیڈی اور چھوٹے آغا بھی ہوں گے آپ کی نظر میں۔ اب اپنے سوال کی وضاحت کرنے بیٹھوں گا تو پھر تو یقیناً اماں جان باہر آ جائیں گی۔" اُس نے جڑ کر اُسے اماں جان کا ڈراوا دیا اور وہ جس کی نظریں برابر غسلخانے کے ہینڈل پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے اندر کا لاک کھلنے کی آواز بھی سن لی تھی۔ انتہائی عجلت، گھبراہٹ اور بے چارگی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

"وہ۔ وہ۔ فور گوڈ سیک۔ اسفند صاحب آپ پلیز چلے جائیں۔ میں اس وقت کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ میں اپنے سوال کا جواب لیے بغیر تو جاؤں گا نہیں۔ خواہ اماں جان کے علاوہ بھی کوئی یہاں آ جائے۔" وہ اُس کی بیچارگی سے فائدہ اُٹھا کر ہٹیلے سے لہجے میں بولا۔ مگر آواز اس کی دھیمی ہی تھی۔

"اچھا۔ اچھا۔ یو آر ویری ڈیر ٹو می۔ آئی سوئر اپ آن گوڈ۔ (میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ مجھے بہت ہی پیارے ہیں) دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز۔" اُس نے اعتراف بھی کیا تو جیسے گن پوائنٹ پر کھڑے ہو کر۔ اُس کے دل نے بھی پورے یقین کے ساتھ تسلیم نہیں کیا۔ وہ کمرے کے داخلی دروازے کی طرف کھسک کر بولا۔

"اوہ تھینکس فور دا کمپلیمنٹ لیکن اگر اس قدر عزیز ہوں تو آج ڈنر کے بعد موقع فراہم کر کے مجھ سے علیحدگی میں ضرور ملیں گی آپ سمجھیں۔" اُف غسلخانے کے دروازے کا ہینڈل گھومنے لگا تھا۔ اُس کی جان جیسے سولی پر لٹک کر رہ گئی۔

"ہاں ہاں سمجھ گئی۔ بلکہ وعدہ کرتی ہوں للہ اب تو چلے جائیے۔" وہ رونے کے سے انداز میں بولی۔ تب کہیں جا کر وہ ٹلا اور تبھی غسلخانے کا دروازہ کھول کر سلمیٰ بیگم نے کمرے میں قدم رکھا۔

وہ اُس کے جاتے ہی جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر جس عجلت میں اُن کے بستر تک آئی تھی۔ حواس باختہ سی۔ پسینے سے تر پیشانی اور پریشان سی رنگ اُڑی صورت لیے لڑکھڑاتے انداز اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ سلمیٰ بیگم کی جہاں دیدہ نظروں سے اُس کی یہ اُتھل پتھل سی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ کچھ دیر تک غسلخانے کے دروازے کے آگے ساکت سی رہنے کے انہوں نے پوچھا۔

"کیوں، خیر تو ہے سلوط!" اُن کے لہجے میں تشویش نہیں کھنک سی تھی جیسے وہ اپنی حالت کے پیش نظر محسوس نہ کر سکی ہوں۔

"وہ بس امّاں جان۔ نہ معلوم کیوں ایک دم ہی تھکن کا احساس ہونے لگا۔ اس لیے یہاں آ گئی۔ آج کل گرمی بھی تو بڑی پڑ رہی ہے۔" وہ اُن کے بستر پر ٹِک کر ان کی نظروں سے اپنی متغیر سی کیفیت چھپانے کی غرض سے چہرہ اونچا کر کے دوپٹے کے آنچل سے اپنی گردن کو ہوا دینے لگی۔ حالانکہ چھت کا پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ سلمیٰ بیگم دوسرے کونے میں رکھی نماز کی چوکی کی طرف بڑھنے کے بجائے اس کے قریب آ گئیں۔

"مگر تم کس سے باتیں کر رہی تھیں بیٹی؟" اب اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے لاکھ چھپانے اور احتیاط کرنے کے باوجود وہ اسفند کی ایک جھلک دیکھ چکی تھیں۔ اُس نے اپنی دانست میں اُن کی لاعلمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کک کسی سے بھی نہیں امّاں جان۔ وہ تو میں خود جل کر گرمی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔" سلمیٰ بیگم چند ثانیے بڑی جانچتی اور کریدتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی رہیں۔ کیونکہ آنچل سے گردن اور چہرے کو ہوا دیتے ہاتھ اُن کے اس سوال پر خود بخود رک گئے تھے اور چہرہ بھی اُن کی طرف مُڑ گیا تھا۔ مگر اُن کے دیکھنے کے انداز پر اُس نے پھر چہرہ اونچا کر کے گویا پنکھے کی ہوا سے لطف اُٹھانا شروع کر دیا۔ سلمیٰ بیگم بھی خاموشی سے گھوم کر نماز کی چوکی کی طرف بڑھ گئیں۔

"چھوٹی دلہن نے تمہیں کتنا منع بھی کیا تھا مگر تم مانیں ہی نہیں۔ بھلا اتنا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی جو تھک کر چور ہو گئیں۔ خیر تھوڑی دیر کے لیے میرے بستر پہ لیٹ کر سُستا لو۔ تھکن خود بخود دور ہو جائے گی۔" سلمیٰ بیگم نے چوکی پر بچھی جانماز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مگر اُن کا لہجہ خالی خالی سا تھا۔

"جی اچھا امّاں جان!" سلوط نہایت تابعداری سے بولی اور بیڈ کی پائینتی کی طرف آڑی ہو کر لیٹ گئی۔

اسفند نے کیا کہا تھا اور اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ اُسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

کچھ سچویشن ہی ایسی تھی کہ اوسان خطا ہو گئے تھے۔

اب تک اپنے منتشر سے حواسوں کو یکجا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

مگر تھوڑی دیر — آنکھیں بند کرنے سے تھوڑا سا ذہنی سکون نصیب ہوا تو ہر بات یاد آ گئی۔

"اُف کس قدر ہٹ دھرم اور غیر محتاط سا انسان ہے یہ اسفند بھی کہ دوسرے کی عزت کا بھی خیال نہیں۔ یوں ہی خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ گویا زبردستی کا سودا ہوا یہ تو۔ ورنہ میں تو — میں تو —

"نہیں نہیں، میں غلط بیانی سے کبھی کام نہیں لوں گی اسفند۔ میں واقعی تمہیں دل سے پسند کرتی ہوں۔ مگر یہ میری اپنی مرضی اور اپنی خوشی کی بات ہے۔ بلکہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر بہت عام سی بات بھی ہے کیونکہ عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو پسند کر کے ہی ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یعنی ماں، باپ، چچا، بہن بھائی، بیٹی بیٹا اور خالہ وغیرہ — یہ سب رشتے رشتے داری ہوتے ہوئے بھی آپس کی پسندیدگی کے بل بوتے پر ہی استوار ہوتے ہیں اور کس قدر پاکیزہ اور مقدس بن جاتے ہیں۔ مگر اپنی اور تمہاری پسندیدگی کو کیا نام دوں اسفند۔ تم نے مجھ سے اعتراف بھی کرا یا تو بھلا کس طرح کہ میری مرضی نہیں مجبوری کو ڈھال بنا کر۔ اب تم اس انتظار اس اُمید میں ہو گے کہ میں اسی مجبوری کی حالت میں کیا اپنا وعدہ نبھاؤں گی۔ تم سے ڈنر کے بعد کسی علیحدہ گوشے میں ملوں گی۔

تو میرے نادان پرستار، میں مر کر بھی ایسا نہیں کروں گی۔

کیونکہ تمہاری آنکھیں تو تمہارے جنونی جذبے نے پٹ کر رکھی ہیں اور عقل ناکارہ۔ لیکن میری عقل کی آنکھیں میری چشمِ بینا سے بھی تیز ہیں۔"

اور پھر یہ حقیقی زندگی کا ایک لہولہان کر دینے والا خارزار ہے۔

کوئی فلمی یا افسانوی سچوئیشن نہیں کہ ہیرو ایک شہر میں ہے اور ہیروئن کسی دوسرے شہر میں۔ رات کا پہر ہے۔ سارا عالم محوِ خواب ہے۔

اِدھر سے ہیرو صاحب کوئی فراقیہ گیت شروع کرتے ہیں تو دوسرے شہر سے کوسوں دور بیٹھی ہیروئن جوابی کارروائی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ پس منظر میں کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا میوزک بھی بجتا ہے۔ پھر بھی محلّے والوں کی بات تو دوسری، گھر والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یوں لگتا ہے جیسے طبعی نہیں سب ابدی نیند سو رہے ہوں۔ اور یہاں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں عاشق و معشوق کا چھپ چھپ کر ملنا۔

اور پارکوں اور سڑکوں پہ لہک لہک کر بلکہ گلا پھاڑ کر میوزک کے ساتھ گانا، ناچنا اور تھرکنا۔

تو کیا تم بھی کچھ ایسی ہی غیر حقیقی اور غیر معقول باتوں کے مجھ سے متوقع ہو سردار محمد اسفند۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں درد کے جلتے ہوئے صحرا کو عبور کرتے کرتے خود بھی صحرا کا ایک حصہ ایک جزو بن چکی ہوں۔

آبلہ پا ہی نہیں مجسم آبلہ ہوں۔

میں کیسی کیسی اذیتوں سے گزر کر تلخ حقیقتوں کے پُل صراط کو کس قدر جی جان سے کمر باندھ کر اپنے فگار پیروں سے عبور کرنا چاہ رہی ہوں۔

میرے پائے ثبات میں جنبش آ گئی تو دو ٹکڑوں میں بٹ کر اتنی گہرائیوں میں جا گروں گی کہ کھیل کھیل ہو کر رہ جاؤں گی۔ پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ میری دُھول بھی نہیں۔

نہیں نہیں اسفند۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

مجھ سے ایسی اُمیدیں اور توقعات وابستہ نہ کرو جو مجھے کہیں کا نہ رکھیں۔ میں بہت ہی دکھی ہوں۔ بے حد غمزدہ اور فگار ہوں۔

تم خدارا مجھ سے اپنی محبت واپس لے لو۔

خیالات کی رو میں جانے کہاں بہہ نکلی تھی وہ۔

بند آنکھوں کے باوجود اشکوں کا ریلا پلکوں کی رکاوٹیں توڑ کر بہہ نکلا تھا مگر اُسے روکنا تو کجا پونچھنے کا خیال بھی نہ آیا۔

بس یوں ہی بیڈ کی پائینتی آڑی لیٹی بے دریغ یہ حزن و ملال کے موتی لٹاتی رہی۔

جانے کب تک اور کتنی دیر۔

سلمیٰ بیگم نوافل، نماز اور دعا سے فارغ ہوئیں تو اُٹھ کر اُس کے جاگ جانے کے خیال سے بہت آہستگی اور احتیاط سے بیڈ پر بیٹھیں تو بیڈ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہونے کی وجہ سے اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور سلمیٰ بیگم کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے خود بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اوہو۔ میں تو تمہارے خیال سے کہ تمہاری نیند ٹوٹ نہ جائے احتیاط سے بیٹھی تھی مگر پھر بھی تم؟"

"نہیں۔ میں سوئی تو نہیں تھی امّاں جان، بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ اُن کی بات کاٹ کر بولی۔

"عام طور پر تو عشا کی نماز میں گیارہ رکعتیں ہی پڑھی جاتی ہیں مگر میں پندرہ پڑھتی ہوں۔ اور دو رکعتیں تحیۃ الوضو اُن کے علاوہ پھر وظیفہ اور اس کے بعد دعا یعنی نماز، وظیفے اور دعا کا دورانیہ کم و بیش سوا گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اور اس دوران میں بھی تم نہیں سو سکیں۔ معلوم بھی ہے اس وقت نو بج رہے ہیں۔ نو۔" سلمیٰ بیگم نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ عجیب سے انداز میں اُسے وقت کا احساس دلایا تو اُس نے چونک کر دیوار پر آویزاں ٹائم واچ کی طرف دیکھا۔ واقعی نو بج رہے تھے۔

"اُفوہ! واقعی کافی ٹائم گزر گیا امّاں جان۔" اُس نے متحیر سے انداز میں کہا۔

"ہاں اور اب تو تمہاری تھکن بھی دور ہو گئی ہو گی۔ جاؤ اب باہر چلی جاؤ۔ ورنہ چھوٹی دلہن کیا سوچیں گی بھلا کہ تم وقت کے وقت کہاں غائب ہو گئیں۔" سلمیٰ بیگم نے کہا تو وہ بے دلی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"نہیں امّاں جان! اب جانے سے کیا فائدہ۔ ڈنر تو کب کا ختم ہو چکا ہو گا۔ ویسے بھی میری ہمت نہیں ہو رہی کہیں جانے کی۔" تو اُس نے ہمت کا لفظ کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ کسلمندی کے اظہار کے طور پر استعمال کیا تھا مگر سلمیٰ بیگم نے اُس کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔

"ارے بیٹی! ہمت تو کبھی ہارنی ہی نہیں چاہیے۔ خواہ انسان پر کیسے سے کیسا کڑا وقت ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ کیونکہ وقت تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی گرم اور کبھی نرم۔ ایک سا تو کبھی رہتا ہی نہیں۔ گویا یہ بھی زندگی کا ایک دائرہ کار ہے یہ وقت کا اچھا اور بُرا ہونا۔" سلمیٰ بیگم نے ہمت بندھانے کے انداز میں کہا۔

"لیکن امّاں جان۔ میری تو شاید پیدائش ہی بُری ساعتوں میں ہوئی ہے۔ یوں بھی میرا ستارہ زحل ہے اور زحل تو عام طور پر نحس ہی خیال کیا جاتا ہے۔" وہ چہرہ موڑ کر دوپٹے کے آنچل میں اپنی آنکھوں کی نمی کو جذب کرتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں۔ یہ پڑھے لکھے جاہلوں کی باتیں ہیں بیٹی، ورنہ کوئی ستارہ بھی کسی کی قسمت میں رخنہ ڈالنے کا باعث نہیں بن سکتا۔" سلمیٰ بیگم نے گویا اُس کے خیال کی تردید کی۔

"لیکن اماں جان — یہ نجومی وغیرہ جو ستاروں کا علم جانتے ہیں اور اتنی ٹھیک ٹھیک باتیں بتاتے ہیں بلکہ ایسے زائچے دیتے ہیں کہ جن کے مطابق عمل کرنے سے ہر بات بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی بات تو ہے اماں جان۔"

"ہاں اگر ستاروں کے علم کے بارے میں پوچھتی ہو تو اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مگر صرف اس قدر کہ ہم نے چاند اور ستارے بنائے اور ان میں ایک علم رکھا سمجھنے والوں کے لیے۔ اور اگر کوئی ستارہ کسی کی زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے تو اس کی قسمت کو بگاڑنے اور بنانے کی قدرت بالکل نہیں رکھتا۔ یہ قدرت تو بس اس قادرِ مطلق ہی کو حاصل ہے جس کی ہم بندگی کرتے ہیں اور جو خالقِ کون و مکاں ہے۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"ہونہہ! خالقِ کون و مکاں تو ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے پیدا کرنے کے بعد بالکل ہی بھول گیا۔ یا پھر اس نے مجھے بالکل ہی ناکارہ اور سڑی بساندھی مٹی سے ڈھالا ہے۔"

"اُف توبہ توبہ۔ نعوذ باللہ کیسی کفر — کی باتیں کر رہی ہو تم — بیٹی خدا کی عظمت، وسعت اور قدرت کا کوئی ٹھکانہ ہے نہ انتہا۔ تم نے دیکھا نہیں بیٹی کہ کائنات کا قدرتی نظام کس قدر انضباط اور انصرام سے چل رہا ہے۔ ایک معمول شامل ہے لو کہ کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ سورج اپنی مرضی سے جب چاہے نکلا ہو اور چاند ستارے زمین پر اتر آتے ہوں یا آپس میں ٹکراتے ہوں۔ چنانچہ وقت پر بھی اس قادرِ مطلق کی گرفت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ یہ بھی ہے کہ وقت کو بُرا نہ کہو کیونکہ وقت بھی میری مرضی اور حکم کے تابع ہے۔ اللہ معاف کرے مجھے حرف بہ حرف معنی تو یاد نہیں لیکن ان معنوں کا مطلب کچھ یہی ہے بیٹی۔ انسان ایک ذرہ حقیر ہو کر بلا سوچے سمجھے اس ذات بزرگ و برتر کی شان میں اتنی بڑی بات کہہ کر اپنے گناہوں میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ اس کا تو نعوذ باللہ کچھ نہیں بگاڑتا۔ سمجھیں تم۔ اور یہ جو دو فرشتے کراماً کاتبین انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کے دائیں بائیں تعینات کر دیے جاتے ہیں یہ انسان کی ایک ایک حرکت — ایک ایک بات — اس کی نیت — قول و فعل حتیٰ کہ عقائد اور خیالات تک کو ہمہ وقت رقم کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ بعد از رحلت انسان کی ہسٹری شیٹ کے طور پر اس کے سامنے پیش کریں۔ میرے تو اس تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میری بھی ہر بات رقم کی جا رہی ہوگی۔ تو بیٹی نفس کی طرح زبان کو مار کر رکھنا چاہیے کیونکہ زبان انسان کی جتنی دشمن ہوتی ہے اتنا غنیم بھی نہیں ہوتا۔"

اُف ایک ذرا سی بات پر پورا لیکچر جھاڑ دیا تھا سلمیٰ بیگم نے کہ یوں بھی وہ طویل پیرائے میں گفتگو کرنے کی عادی تھیں لیکن وہ ہمدرد اور نیک دل خاتون جو کچھ کہہ رہی تھیں اس کے بھلے کو کہہ رہی تھیں۔

"اللہ میری توبہ۔" اس نے منہ ہی منہ میں اپنے معبود سے توبہ مانگی اور دل شکستہ سے لہجے میں بولی۔

"کیا کروں اماں جان۔ کچھ لوگوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کا ماضی تلخ اور تکلیف دہ ہوتا ہے تو وہ حال میں بیٹھ کر اس کے تصور سے بھی گریزاں رہتے ہیں۔ کبھی بھول کر بھی شرر ریز یادوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ کیونکہ حال ان کی ماضی کی تمام تلخیوں اور کٹھنائیوں کی تلافی اور ازالہ کر دیتا ہے لیکن اماں جان میرا تو حال بھی ماضی ہی ہے اور شاید مستقبل بھی ہو۔ اگر آپ میری پیدائش سے لے کر اب تک کی بپتا سنیں نا تو — تو — خیر بیکار ہی ہوگا کچھ سنانا۔ کوئی ازالہ تو نہیں ہو سکے گا کسی بات کا۔"

"نہیں خیر ہو بھی سکتا ہے بیٹی۔ اگر ازالے کی بات ہی کر رہی ہو تو — اور کچھ نہیں تو اپنے غم میں کسی کو شریک کر کے دل پہ پڑا ایک بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔" سلمیٰ بیگم نے کچھ اور کہتے کہتے اتنی خوبصورتی سے بات پلٹی تھی کہ اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

"خیر، کسی اور کا تو سوال ہی نہیں البتہ کبھی آپ کو ضرور سناؤں گی اپنی داستانِ رنج و الم۔ سچ آپ کے مشفق اور مہربان وجود سے کبھی کبھی مجھے ممتا کی مہک سی آنے لگتی ہے۔ تب دل میں اک تمنا سی مچلتی ہے کہ اے کاش آپ میری سگی ماں ہوتیں اماں جان۔"

"خیر، سگی ماں تو میں ننھے کی کیا اس کے باپ کی بھی نہیں ہوں بچی۔ مگر دیکھ لو ننھا مجھے اپنے پیٹ کی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ پیٹ سے زیادہ پالے کی ہوتی ہے تو سچ ہی کہتے ہیں۔ اصل میں ہر عورت ایک ماں کا دل اور اس دل میں ممتا کی تڑپ رکھتی ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میری اپنی کوئی اولاد نہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرا دل بنجر زمین کی طرح سخت ہے اور اس میں ممتا کے جذبے کی کوئی رمق تک موجود نہیں۔ ارے بچی میرا دل تو ممتا کے جذبے سے مالا مال ہے۔ جانے کیا مصلحت اور مرضی تھی اس ذاتِ بے نیاز کی کہ اس نے مجھے پیٹ کی اولاد سے محروم ہی رکھا اور میں یہ لازوال دولت سینے میں ہی گھونٹے رہی۔ وہ تو اگر میرا ننھا نہ ہوتا تو میں اسے اندر ہی اندر گھونٹے گھونٹے مر جاتی۔" اور سلمیٰ بیگم کے جواب پر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

"ہاں تو آپ کی ممتا تو صرف آپ کے ننھے کے لیے ہی وقف ہے نا اماں جان اور میں بھی کتنی پاگل ہوں کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک انہونی سی تمنا کر بیٹھی۔"

"ارے نہیں میری بچی۔ میری ممتا میں بڑی وسعت ہے۔ تو بھی مجھے اولاد کی طرح ہی عزیز ہے مگر چونکہ ہمارا آپس میں کبھی ایک دوسرے سے واسطہ نہیں پڑا۔ نہ مجھے اپنی ممتا کو ٹٹولنے کا موقع ملا اور نہ تجھے اپنی اس منہ بولی ماں کو پرکھنے کی نوبت آئی۔ مگر آج سے تم مجھے اپنی سگی ماں ہی سمجھنا۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔ اور تبھی ان کا دل چاہا۔ اس سے ان آنسوؤں کا سبب پوچھیں جو وہ پورے سوا گھنٹے تک چپکے چپکے بہاتی رہی تھی اور جو پونچھنے کے باوجود اس کے رخساروں پر اپنا نشان چھوڑ گئے تھے۔ مگر وہ بے حد سلجھے ہوئے مزاج اور طبیعت کی بڑی بردبار اور موقع شناس خاتون تھیں۔ خدا نے انہیں علم و ہنر کی دولت سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ گو پیرانہ سالی کے اس زمانے میں اپنے علم اور ہنر دونوں سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ پھر بھی پڑھی لکھی تو تھیں۔ جہاندیدہ، تجربے کار اور دانشمند تھیں۔ بات بھی ایسی باون تولے پاؤ رتی کرتیں جو سیدھی دل میں اتر جاتی۔ اور یہ سب وہ اپنی علمیت اور قابلیت کے بل بوتے پر ہی تو کرتی تھیں۔ سلوط نے ایک ایسی بات کو جو ان کے علم میں آ چکی تھی۔ اپنی لاعلمی میں ان سے چھپایا تھا۔ اب وہ اس کی محبت بھری بے ریا گفتگو سے ناجائز فائدہ تو اٹھانا نہیں چاہتی تھیں۔ فوراً ہی بات کو دوسری سمت موڑ کر بولیں۔

"ارے تم تو باقاعدہ باتیں ہی مٹھارنے بیٹھ گئیں۔ چلو اُٹھو۔ اگر ڈنر ختم ہو گیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ گھر والے تو عموماً بعد میں ہی کھاتے ہیں۔ خوشی کے موقع پر کمرے میں بند ہو کر بیٹھنا کوئی مناسب بات نہیں۔ جاؤ شاباش۔" سلمیٰ بیگم نے آخری فقرہ اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا تو بادلِ ناخواستہ اسے کہنا ہی پڑا۔

"جی بہتر ہے اماں جان!" اور پھر فوراً ہی اُٹھ کر دوپٹہ قرینے سے اوڑھنے لگی۔

"دوپٹہ بعد میں ٹھیک کر لینا پہلے منہ پر دو چار چھپکے مار کر تھوڑا لپ وغیرہ لگا لو۔ یہ اُتری اُتری صورت اور سوجی آنکھیں لے کر جاؤ گی تو سب کیا سوچیں گے۔ اصل میں زیادہ حساس پن انسان کو جذباتی بنا دیتا ہے۔ کہ ایک معمولی سی بات بھی دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگا دیتی ہے اور یہ آنکھوں کی راہ چھلک پڑتے ہیں۔ ورنہ ایسا کیا کہہ دیا ہو گا اس نے تمہیں۔"

"کک۔ کس نے اماں جان۔" اس نے فق ہوتی رنگت کے ساتھ ہچکی لینے کے سے انداز میں پوچھا۔ دل تو فوراً ہی ان کے ایک ذرا سے لفظ "اس نے" کہتے ہی کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگا تھا۔ اس پر ان کے مشفق اور نورانی چہرے پر کھیلتی پُراسرار سی مسکراہٹ۔

"مو۔ مجھ سے تو کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔" اور ابھی وہ اسی قدر کہنے پائی تھی کہ تبھی شعیب منصور، زینت اور نیلوفر سمیت اندر آ گئے۔ تو اس نے موقع غنیمت جانا اور شعیب منصور اور زینت کو سلام کر کے جلدی سے اس کمرے سے نکل آئی۔ حلیہ واقعی خراب ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بال بھی بے ترتیب ہو گئے تھے اور وہ سب کے سامنے اس حلیے میں جا کر اپنا تماشہ نہیں بنوانا چاہتی تھی اس لیے سیدھی کوثر کے کمرے میں چلی آئی جو بالائی منزل پر تھا۔

اتفاق سے کوثر اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"ارے اب کہاں غائب ہو گئی تھیں سلوط آپا۔ ممانے تو آپ کو ہر جگہ ڈھنڈوا لیا۔"

"لو میں کہاں غائب ہو سکتی تھی بھلا۔ اماں جان کے کمرے میں ہی تھی۔ شاید میری تلاش میں وہاں تک کسی نے جانے کی زحمت نہیں کی۔" اس نے جان کر اپنے لہجے کو شگفتہ بناتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ اچھا اچھا سمجھ گئی۔ سمجھ گئی۔" کوثر نے ہنس کر معنی خیز سے انداز سے کہا۔

"بھئی، کیا سمجھ گئیں تم۔ کچھ مجھے بھی تو سمجھا دو۔" وہ اس کے ہنسنے پر قدرے اُلجھ کر بولی۔

"بس کچھ نہیں۔ وہ اماں جان کے کمرے میں آپ کے اس قدر جم کر بیٹھ جانے کو۔" کوثر نے بتا تو دیا مگر مقصد پھر بھی واضح نہ ہوا۔

"تو جم کر بیٹھنا کیسا۔ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ اماں جان جب بات کرنے پر آتی ہیں تو نان اسٹاپ طریقے سے بولے ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر ان کی گفتگو بہت دلچسپ بلکہ کارآمد ہوتی ہے۔ بس میں بھی ان سے باتوں میں لگ گئی تھی۔ کوثر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی الماری کھول کر کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

"کیا میں تمہارا ٹائیلٹ استعمال کر سکتی ہوں کوثر؟" اس نے پوچھا۔

"او یس۔" تو اجازت پاتے ہی وہ جلدی سے غسلخانے میں گھس گئی۔

جلد جلد بیسن کا نل کھول کر منہ دھویا اور وہیں پڑا کنگھا بالوں پر پھیر کر باہر آئی تو کوثر کو اپنے انتظار میں کھڑا پایا۔

"بھئی، وہ اصل میں اماں جان کے کمرے میں چونکہ منجھلے آغا اور بھائی جان وغیرہ بیٹھے تھے اس لیے مجھے اپنا حلیہ درست کرنے یہاں آنا پڑا۔ یہ غالباً بلش آن ہے نا؟" وہ باتیں کرتے کرتے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس پہ رکھی

ایک ڈبیا اُٹھاتے ہوئے اُس نے کوثر سے پوچھا۔
"غالباً کیا یقیناً ہے ــــ" کوثر بولی۔
"پھر تو آج ذرا میں بھی ٹرائی کروں۔ دیکھوں تو کیسا لگتا ہے۔ کیوں؟ اجازت ہے نا" اُس نے گویا بڑی ترکیب سے پوچھا۔
"کمال ہے۔ چیز استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ پھر اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر کیا واقعی آپ نے کبھی بلش آن استعمال نہیں کیا؟" کوثر نے سر کو قدرے نیہوڑا کر پوچھا۔
"نہیں"
"مگر کیوں؟"
"کیونکہ سوائے لپ اسٹک اور کریم کے میں کوئی میک اپ استعمال نہیں کرتی"
"مگر کیوں؟ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" کوثر سمجھی کہ شاید وہ میک آپ کا سامان مینٹین نہیں کر سکتی۔
"نہیں۔ کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ بس پسند نہیں کرتی تو پھر رکھ کر کیا کروں"
"ہاں بھئی، آپ کو میک اپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدائی عطیہ ہے آپ کا حُسن تو" کوثر ستائشی انداز میں بولی۔
"ارے نہیں۔ اب اتنی بھی حسین نہیں ہوں۔ خیر تو۔ چلو خوش ہو جاؤ۔ آج میں میک اپ بھی کیے لیتی ہوں" اُس نے بلش آن استعمال کرنے کے بعد آئی لائنر اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"مہارت تو ایسی ہے آپ کو۔ جیسے آپ میک اپ کرنے کی عادی ہوں" کوثر نزدیک آ کر بولی۔ اور میک اپ کرنے میں اُسے مدد دینے لگی۔ اور پھر جونہی اس نے ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک اپنے گداز ہونٹوں پر رچائی کوثر اُس کا میک اپ سے چمک اُٹھنے والا حُسن دیکھ کر بولی۔
"ہائے سچ۔ آپ تو اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ اگر بھائی جان نے ــــ" بے ساختگی میں ایک غلط بات منہ سے نکل جانے پر کوثر نے بقیہ فقرہ اپنی زبان کو دانتوں میں دبا کر روکا اور ادھر سلوط کا ہاتھ کچھ اس بری طرح کانپا کہ لپ اسٹک اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس نے گھبرا کر کوثر کی طرف دیکھا تو زبان دانتوں میں دباتی کوثر جلدی سے بولی۔
"آئی ایم سوری سلوط آپا!" تو اُس نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر تھوڑا سا قابو پا کر پوچھا۔
"کس بات پر سوری کہہ رہی ہو۔ میں سمجھی نہیں کوثر"
"بھائی جان کے کہنے پر" کوثر دبی دبی مُسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"اُف تو کیا کوثر نے بھی تاڑ لیا ہے یا پھر خود اسفند نے اُسے بتایا ہے" اُس نے دہل کر دل میں سوچا اور بظاہر لاپرواہی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔
"مگر یہ کوئی ایسی بُری بات تو نہیں۔ اگر تمہارے منہ سے غلطی سے بھائی جان نکل گیا تو۔؟"
"پتا نہیں غلط ہے یا صحیح لیکن آپ کے ہاتھ سے لپ اسٹک کیوں چھوٹ گئی تھی"
کوثر بھی ایک چالاک تھی اُس نے فوراً ہی اُس کی چوری پکڑ لی۔
"ارے نہیں۔ وہ تو محض اتفاق ہی تھا۔ اصل میں لپ اسٹک کا ڈھکنا سیٹ کر رہی تھی نا۔ اناڑی پن میں وہ ہاتھ سے سلپ ہو گیا" اُس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔
"خدا بہتر جانتا ہے یا پھر آپ" کوثر شوخ سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر بولی۔
"ارے نہیں کسی غلط خیال کو دل میں جگہ نہ دو کوثر۔ جو اصل بات تھی وہی میں نے تم سے کہہ دی" اس کا دل اندر ہی اندر لرزا جا رہا تھا۔
"کس سلسلے میں؟" کوثر اس کی گھبراہٹ سے حظ اُٹھا رہی تھی۔
"یہ ــ یہ ہی ــ ہاتھ سے اچانک لپ اسٹک کا کور گر جانے پر" وہ اٹک اٹک کر بولی تو کوثر کچھ دیر خاموش کھڑی اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ پھر بولی۔
"اگر مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں سلوط آپا؟"
"ارے ہاں ضرور۔ تم دس باتیں بھی پوچھ لو تو میں بُرا نہیں مانوں گی۔ ڈیئر ــ" یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہے اس نے لاپرواہی کا اظہار کیا۔

"بھائی جان آپ کو کیسے لگتے ہیں؟" اُف سوال تھا یا زلزلے کا شدید جھٹکا جس نے یکبارگی اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے یہی تو ابھی کچھ دیر پہلے کچھ یہی پوچھا تھا۔ اور اب یہی کوثر پوچھ رہی تھی۔ اس سے تو اس کا جواب شاید مر کر بھی نہیں بن سکتا تھا۔ مگر کوثر کو جواب دینا مصلحت کا ایک تقاضا بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کی خاموشی بہت سے معنی پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے وہی کیا جو اس سے بن سکتی تھی۔
"وہ بس ایسے ہی جیسے منجھلے آکا یا چھوٹے آکا لگتے ہیں یا پھر تم"
"مگر بھائی جان تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں" کوثر بولی۔ کہ اس کا جواب گھما سا تھا اور اس کے پلے نہ پڑا تھا۔
"ہائیں کیا مطلب۔ کیا سمجھتے ہیں وہ مجھے؟" اس نے بے طرح دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا
"وہ ۔ وہ آپ کو جو کچھ بھی سمجھتے ہیں آئی کین فیل اِٹ بٹ کانٹ ایکسپلین اِٹ (وہ میں محسوس تو کر سکتی ہوں مگر بیان نہیں کر سکتی)" کوثر شوخ سی مُسکان کے ساتھ بولی۔
"اچھا۔ کمال ہے" اس نے پست سی آواز میں کہا۔
"کمال کی بات نہیں تعجب کی بات ہے کہ آپ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ورنہ اگر میں یہ کہتی کہ ۔ ہی لوز یو اے لوٹ (وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں) تو پھر آپ یقیناً بُرا مان جاتیں" کوثر اس کے بننے پہ صاف گوئی پر اتر آئی تو اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل سی ہو کر رہ گئیں۔ ایک ایسی بات جو ایک سربستہ راز کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں دفن تھی۔ وہ ایک سترہ سالہ امیچور لڑکی کی زبانی افشا ہو رہی تھی۔ پریشان ہو اُٹھنا کچھ عجب تو نہ تھا۔
"پھر بھی تم نے کہہ تو دیا ہے نا اور اب میں سچ مچ تم سے ناراض ہو گئی ہوں" وہ اپنی پریشانی سے اُبھر کر بولی۔
"ہائے کیوں، کیا سچ مچ آپ نے مائنڈ کیا ہے؟" کوثر نے پوچھا
"ہاں۔ کیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میرے آس پاس تو کیا دور تک بھی کوئی ایسا خیال ہو کر نہیں گزرا۔ اور پھر ذرا سوچو تو کوثر۔ یہ بات جو تم نے مذاق ہی مذاق میں اتنی آسانی سے کہہ دی ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ تمہارا اپنا کوئی اندازہ ہے یا حقیقت۔ لیکن جب یہی بات دوسروں تک پہنچے گی تو پھر ــ دوسروں کی نظر میں میری کیا حیثیت رہے گی۔ جب کہ میں تم لوگوں کے پاس کچھ عرصہ گزارنے آئی ہوں۔ ساری زندگی نہیں۔ اور تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی جو اس اتنی سی بات کے نتیجے میں مجھے سہنی پڑیں گی۔ تو پلیز میری چھوٹی سی دوست۔ اگر تمہیں کچھ معلوم بھی ہو گیا ہے تو اس بات کا ذکر آئندہ کبھی زبان پر نہ لانا۔ یہ دھونس یا تنبیہ نہیں بلکہ میری ایک پُرزور درخواست ہے تم سے۔ کیا تم اسے قبول کر لو گی؟"
"اُف توبہ۔ ایک ذرا سی بات۔ وہ بھی ایک خوشی کی بات کہہ دینے کے نتیجے میں کوثر کو کیا کیا سُننا پڑا تھا۔ اسے تو احساس تک نہ تھا کہ ایک اتنی سی بات کے اتنے سنگین نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ تو سچ مچ یہ خوشخبری نیلوفر اور نیلما کو بھی سنانے والی تھی کہ اس کے نزدیک تو یہ ایک بہت ہی دلچسپ کھیل تھا۔ بہت ہی لطیف سا مذاق۔ مگر اس دلچسپ کھیل اور لطیف مذاق کو سلوط نے جس قدر سیریس لیا تھا وہ کچھ گھبرا سی اُٹھی تھی۔ پھر بھی نازش جیسی ذمہ دار اور فرض شناس ماں کی ـــــ تربیت یافتہ تھی۔ جنہوں نے کنیڈا جیسے آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی مشرقی اقدار کو اولیت دی تھی اور اکلوتی بیٹی کو بھی ایک حد (لیمیٹیشن) کے اندر رکھ کر پروان چڑھایا تھا۔ باپ بھی ـــــ مرنجاں مرنج قسم کے انسان ثابت ہوئے تھے۔ گویا ساری خصلتیں ماں کی ہی پائی تھیں جس میں سب سے بڑی خوبی دوسرے کے دُکھ درد کا احساس تھا۔ اور اسی احساس کے پیشِ نظر کوثر نے اسے اطمینان دلا دیا۔
"اوہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک اتنی اچھی سی بات کو لوگ اتنا زیادہ سیریس لیں گے کہ آپ کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ پھر تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد کبھی کسی کے بھی سامنے اس بات کو زبان پر نہیں لاؤں گی۔ حتیٰ کہ آپ کے سامنے بھی نہیں۔
"کیا سچ" وہ خوش ہو کر تو بولی مگر اس کے لہجے سے بے یقینی صاف عیاں تھی۔
"مما کہتی ہیں کہ جب کوئی کسی سے وعدہ کرتا ہے تو وعدہ کرنے والے کا ہاتھ اس وقت خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یعنی وعدہ کرتے وقت دونوں بندوں کے درمیان خدا گواہ کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔ اسی لیے تو پر ڈس کرنا آسان نہیں

ہوتا۔ کوثر قدرے جذباتی انداز میں بولی تو سلوط نے خوش ہو کر اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔
"تم واقعی بہت ہی اچھی ہو۔ بڑی ہی پیاری۔ آخر ہو نا بھابھی دلہن کی بیٹی۔"
تو کوثر خوش ہو کر بولی۔
"اور آپ بھی تو کتنی اچھی اور پیاری ہیں سلوط آپا۔ سچ آئی لو یو۔ آئی اڈور یو ویری مچ۔"
"اینڈ می ٹو۔" سلوط نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر کوثر کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ نیچے چلی آئی۔

دن کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔
شعیب منصور خلاف دستور آج گھر میں ہی نظر آ رہے تھے۔
دن کا کھانا بھی انہوں نے گھر میں ہی کھایا تھا۔ اور اس وقت اپنی خوابگاہ میں بیڈ پر بیٹھے بریف کیس کھولے اس میں رکھے چند اہم کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ زینت بھی خواب گاہ میں موجود تھیں اور ایک چوکور اونچی میز پر رکھے سوٹ کیس میں اپنی الماری کے ہینگر پر لٹکی ہوئی ساڑھیوں کا انتخاب کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے مسرت اور انبساط اور تھوڑا تھوڑا جذباتی پن سا جھلک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی شاید اسی کیفیت کے زیر اثر تھے جو وہ بڑے چاؤ سے سوٹ کیس میں اپنی ساڑھیاں جما رہی تھیں۔
وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر آئی تھیں۔ شوہر آتے ہی کاغذات کا مطالعہ کرنے میں غرق ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنے کپڑوں کی پیکنگ میں۔ وہ تھوڑی دیر تو نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتی رہیں پھر جب انبساط کی کیفیت حد سے تجاوز کرنے لگی تو وہ خود کلامی کے سے انداز میں قدرے اونچی آواز میں بولیں۔
"واہ میرے مولا! صدقے جاؤں تیرے کتنی بڑی سعادت کا تو مجھے شرف بخش رہا ہے۔ ورنہ میں کس قابل تھی اور مجھے تو افسوس ان کم نصیبوں پر ہوتا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھاگے بھاگے امریکہ چلے جاتے ہیں۔ یورپ کی سیر کر آتے ہیں اور لاکھوں روپیہ فضول باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کی زیارت ہی کر آئے۔ جب کہ یہاں تو ہمیشہ سے یہی خواہش رہی کہ کہیں جاؤں یا نہ جاؤں مگر طیبہ کی خاک ضرور چاٹ آؤں۔ تو دیکھو میرے مولا کا کرم کہ اس نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔"
اپنی بات کہہ کر کام کرتے کرتے زینت نے شوہر پر ایک نظر ڈالی۔ مگر وہ کاغذات کے مطالعے میں کچھ اس درجہ مستغرق تھے کہ انہوں نے بیوی کی بات سنی ہی نہیں۔ آخر کچھ دیر مزید انتظار کر کے زینت نے سوٹ کیس کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے براہ راست انہیں مخاطب کیا۔
"آپ نے اپنا سامان چیک بھی کر لیا ہے؟ ورنہ بعد میں یہ نہ کہیں کہ تم نے فلاں چیز تو رکھی ہی نہیں۔"
"ایں، ہاں ہاں، چیک بھی کر لوں گا۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے۔" شعیب منصور نے کاغذات پر نظریں مرکوز کیے کیے کہا۔
"لیجئے جلدی کیوں نہیں۔ رات کی فلائیٹ سے تو جا رہے ہیں ہم۔" زینت بولیں۔

"ہیں ہوں ہوں۔ رات کی فلائیٹ سے۔ بس ذرا ان کاغذات پر نظرثانی کر لوں پھر پیک بھی کر لوں گا۔"

"افوہ! ابھی پیک نہیں ہے جیک۔ سامان تو کب کا پیک کر چکی ہوں میں۔" زینت شوہر کی غیر حاضر دماغی پر چڑ کر بولیں۔

"او ہو بھئی۔ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا پہلے ذرا ایسے یہ بہت ضروری بلکہ آفیشل قسم کے کاغذات تو چیک کر لوں۔" شعیب منصور بیوی کے بار بار مخل ہونے پر تندہی سے چمک کر بولے۔ تو زینت جز بز سی ہو کر خاموش ہو گئیں اور اپنا سوٹ کیس کھول کر پھر اسے چیک کرنے لگیں۔ مبادا اگر ضرورت کی کوئی چیز رکھنا بھول گئی ہوں۔

اصل میں رات کی فلائیٹ سے شعیب منصور اپنے کسی بزنس ٹور پر مڈل ایسٹ کے دورے پر جا رہے تھے۔

ان کا پروگرام جدہ سے آگے جانے کا بھی تھا۔ اور وہ دو تین روز ریاض میں بھی قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور چونکہ زندگی میں پہلی بار انہیں مشرق وسطیٰ جانے کا اتفاق ہو رہا تھا اور چونکہ جدہ اور ریاض جانے کا بھی پروگرام تھا۔ اس لیے شعیب منصور بیت اللہ شریف کی زیارت کرنے کے ساتھ ساتھ عمرہ ادا کرنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے اور ان کے اسی ارادے سے باخبر ہو کر زینت بھی ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ شعیب منصور بھی کافی عرصے سے بیوی کو کہیں نہیں لے گئے تھے۔ بس تین سال قبل ہانگ کانگ اور بنکاک کے ٹور پر گئے تو بیوی کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ ورنہ وہ خود تو بارہا جاپان اور یورپ کے دورے پر جا چکے تھے۔ کچھ اس لیے بھی اور کچھ بیوی کے عمرہ کرنے کے انتہائی شوق کے پیش نظر وہ ـــ بیوی کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ ماں عمرہ ادا کرنے جا رہی تھیں تو نیلوفر کو بھی شوق ہوا اور وہ بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد کر بیٹھی تو مجبوراً زینت کو اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا پڑا۔

ضرورت کی استعمالی اشیاء سوٹ کیس میں رکھنے کے بعد اسے بند کر کے زینت نے الماری کے پٹ بند کیے اور چابیاں الماری میں ہی لگی چھوڑ کر بیڈ پر پائینتی کی طرف آ بیٹھیں۔

شعیب منصور بدستور کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھے۔

اصل میں جدہ کی ہی ایک شپنگ کمپنی میں باہمی اشتراک پر مال بردار جہازوں پر دونوں طرف سے مال لدوانے کی کوئی بہت اعلیٰ پیمانے کی اسکیم تھی۔ جس کے سلسلے میں معاملات طے کرنے وہ خود جا رہے تھے۔ یعنی زینت کو بھی معلوم تھا کہ ان کے اس قدر انہماک کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے مزید کوئی بات کر کے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اسی بات پر غور کرتی رہیں کہ کون کونسی چیزیں ساتھ لے جانی ہیں۔ یوں تو انہوں نے کپڑوں سمیت ضرورت کی بہت سی چیزیں رکھ لی تھیں پھر بھی شاید تشفی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ یہی سوچ رہی تھیں بلکہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ مزید کوئی چیز تو رکھنے کو باقی نہیں رہ گئی کہ تبھی شعیب منصور نے کاغذات کو بریف کیس میں ترتیب سے جمانے کے بعد اسے بند کر کے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ہاں، تو اب بتائیے کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" وہ زیادہ تر بلکہ خاص طور پر جب اچھے موڈ میں ہوتے تو انہیں آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

"اے کہہ کیا رہی تھی بلکہ پوچھ رہی تھی کہ آپ نے اپنا سامان بھی چیک کیا۔ کیونکہ میں نے ضرورت کی ساری چیزیں ہی پیک کر دی ہیں پھر بھی اگر ایک آدھ چیز رہ گئی ہو تو" شعیب منصور نے ان کی بات قطع کر کے کہا۔

"خیر! ایک آدھ چیز رہ بھی گئی تو ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں مگر یہ آپ نے ایک بیٹی کو ساتھ لے کر دوسری کے ساتھ اس قدر ناانصافی کیوں کی ہے؟"

"نہیں ناانصافی کیسی۔ ایک ہی بیٹی ساتھ جا سکتی تھی تو میں نے سوچا نیلوفر کو ہی کیوں نہ لے جاؤں۔ نیلما ویسے بھی پڑھائی میں مگن ہے اور پھر اس نے نیلوفر کی طرح میرے ساتھ جانے کا اشتیاق بھی ظاہر نہیں کیا۔ یوں بھی اگر نیلما کو ساتھ لے جاتی تو پھر گھر پر بابا کو کمپنی دینے کے لیے رہتا ہی کون ہے؟" زینت نے کہا۔

"خیر بابا کو کمپنی دینے کا تو نہ کہیں۔ وہ گھر میں ٹکتے ہی کب ہیں۔ ان کے لیے تو یہ گھر کسی سرائے خانے سے کم نہیں۔ رات گئے آتے ہیں۔ آتے ہی کھایا پیا سو گئے اور صبح ناشتہ کر کے بالا ہی بالا چل دیے۔" شعیب منصور نے کڑوے کسیلے سے لہجے میں کہا۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ انسان کسی حالت میں بھی خوش نہیں رہتا تو سچ ہی کہتے ہیں۔ اب بابا دن بھر کوئی آوارہ گردی کرتے تو نہیں پھرتے۔ نہ فضول دھندوں میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ نیا نیا تقرر ہوا ہے۔ صبح دس بجے سے دوپہر کے ڈھائی بجے تک وہاں کی ڈیوٹی نمٹاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے پلاٹ پر چلے جاتے ہیں۔ یہ کوئی بری بات تو نہیں کہ وہ اپنی نگرانی میں اپنا کلینک تعمیر کرا رہے ہیں۔" زینت بیٹے کی حمایت میں بولیں۔

۔ خیر، بات اسفند کی نہیں ہو رہی بلکہ نیلوفر کو ساتھ لے جانے کی ہو رہی ہے۔ اصل میں میں آپ کے سوا کسی کو ساتھ لے جانا ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر آپ اسے ساتھ لے جانے کی ضد کر بیٹھیں تو مجھے خاموش ہونا پڑا۔" شعیب منصور بیزارگی سے لہجے میں بولے۔

۔ اے ضد میں کر بیٹھی یا عمرے کے شوق میں اس نے کی تھی۔ میں نے بھی آج کل کی رفتار زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہی سوچا کہ چلو وہ بھی اس سعادت سے مشرف ہو جائے گی۔ ورنہ آج کل تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہماری نئی پود مذہب سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہے۔" زینت شوہر کی بات پر چمک کر بولیں۔ بصورت ترین دن ۹۵۔ شدید تکان نے

"لیکن اس دوری کی ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔ ورنہ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں مجھ پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں ان کو تو میں شروع سے ہی پورا کرتا آیا ہوں۔" زینت کو شوہر کی بات کھلی تو بہت لیکن وہ اس وقت کوئی تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں ہلکے سے پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"افوہ! میں آپ کو یا خود کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا رہی میں تو ایک عام سی بات کہہ رہی ہوں۔ یعنی نئی پود کا جو غلط رجحان ہے اسے دیکھ کر اور خدا کے فضل و کرم سے ہماری بیٹی کے دل میں اتنا ایمان تو ہے کہ عمرہ ادا کرنے کے لیے مچل ہی اٹھی۔"

"ہاں یہ بھی اس کا بڑا کرم ہے۔ لیکن ہر کام وقت پر ہی کرنا مناسب ہوتا ہے۔ یوں بھی نیلوفر پر فرض تو نہیں عمرہ ادا کرنا۔ اور میں اسے ساتھ لے جانے کے حق میں اس لیے نہیں ہوں کہ بہت ممکن ہے کہ وہاں سے پیرس اور انگلینڈ جانے کا بھی پروگرام بن جائے اور ہمارا وہاں قیام طویل ہو جائے۔"

"اوہو۔ تو اس میں ایسی فکر کی کیا بات ہے۔ ہم نیلوفر کو واپس یہاں بھیج دیں گے۔ اور اگر آپ مجھے پہلے ہی یہ بات بتا دیتے تو میں نیلوفر کو ساتھ ہی نہیں لے جاتی۔ مگر اب تو اسے چھوڑ کر جانا ظلم ہی ہوگا۔ بے چاری ساری تیاری کر چکی ہے حتیٰ کہ اب سیٹ بھی بک ہو گئی ہے۔" زینت یہ سن کر دل ہی دل میں کھل اٹھی تھیں کہ ان کے میاں کا ارادہ یورپ کے بعض ممالک ـــ جانے کا بھی ہے۔ انہوں نے بڑے مصالحانہ سے لہجے میں کہا۔

"ہاں تو میں خود کب اسے چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں تو محض نیلما کے تنہا رہ جانے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔" شعیب منصور بولے۔

"لیکن نیلما تنہا کیوں رہنے لگی۔ سب سے بڑھ کر تو بابا یہیں موجود ہوں گے۔ دوسرے اماں جان اور سلوط بھی ہوں گی اور میں بابا کو مزید تاکید کر جاؤں گی کہ بہن کا خیال رکھیں اور اسے تنہائی کا احساس نہ ہونے دیں۔"

"آپ نے اماں جان اور سلوط کو بلوانے کے بجائے نیلما کو بھی سہیل کے یہاں ہی بھیج دیا ہوتا۔ وہ کتنا کہہ بھی رہے تھے۔" شعیب منصور اٹھنے کے ارادے سے پیر نیچے لٹکاتے ہوئے بولے۔

"ارے واہ تو کیا گھر کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بالکل صفایا ہی کرا دیتی۔ اور پھر بابا کا مسئلہ کیسے حل ہوتا وہ کہیں اور رہنے کے عادی بھی نہیں ہیں۔ ویسے میں نے نازو سے بھی کہہ دیا ہے کہ ہر دوسرے تیسرے آ کر بہن کی خیر خبر لے لیا کرنا۔" زینت نے کہا اور پھر میاں کو اٹھتا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"اب جا کہاں رہے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام ہی کر لیں۔ پھر تو انشاء اللہ جدہ پہنچ کر ہی آرام کرنے کی مہلت ملے گی۔"

"نہیں۔ بس اب تو سفر سوار ہو گیا ہے۔ مجھ پر۔ آپ ذرا فون یہاں منگوا دیں چند ضروری کالز کرنی ہیں اور ہاں زیادہ سامان لے جانے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک ہی سوٹ کیس کافی ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ روز میں ہماری نہیں تو اس کی واپسی تو ہو ہی جائے گی۔"

"ارے واہ! ایک سوٹ کیس میں ہم دونوں کا سامان کیونکر سما سکتا ہے اور پھر ایک سوٹ کیس سے کام بھی کیسے چلے گا۔ وہاں شاپنگ بھی تو کرنی ہوگی۔ بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں کہ وہاں سے دو تین سوٹ کیس خرید لوں گی۔ لسٹ بھی بہت طویل ہو گئی ہے فرمائشوں کی۔" تو شعیب منصور اٹھتے اٹھتے ایک دم ہی بیٹھ کر بولے۔

"کیسی فرمائشیں؟"

"یہی دوست احباب کی فرمائشیں۔ کسی نے موتیوں کی لڑیاں منگوائی ہیں، کسی نے بروکیڈ اور اطلس وغیرہ اور کسی نے کچھ۔" زینت نے مسکرا کر بتایا۔

"لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کے حلقۂ احباب میں ہائی جینٹری (اعلیٰ طبقے) کے ایسے لوگ یعنی خواتین شامل ہیں۔ جن کے لیے اوورسیز دمند پار کا ٹرپ ایسا ہوتا ہے جیسے شہر کے ایک بازار سے دوسرے تک جانا۔ یعنی انہیں کسی چیز کی ایسی احتیاج نہیں

پھر بھی...

"مافوہ! آپ تو ایک ذرا سی بات کو اتنا بڑھا دیتے ہیں۔ ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ ضرورت کی ہزار چیزیں میسر ہوتے ہوئے بھی انسان کو کسی نہ کسی چیز کی ضرورت تو پڑتی ہی رہتی ہے اور وہاں خاص طور پر حرم شریف میں بعض ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو کہیں بھی نہیں ملتیں۔" زینت نے شوہر کی گفتگو سے زچ ہو کر کہا۔

"ملیں یا نہ ملیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں لیکن میں ابھی سے تم سے کہے دیتا ہوں کہ حرم شریف سے تمہیں شاپنگ نہیں کرنی۔ ورنہ میں یہی سمجھوں گا کہ تم عمرے کے نہیں بلکہ شاپنگ کے شوق میں وہاں جا رہی ہو اور کچھ ہے بھی یہی بات۔" شعیب منصور کے اچھے خاصے موڈ میں ایک دم تموّج سا پیدا ہو گیا۔ اور ادھر زینت بھی ان کی الزام تراشی پر کھول ہی اٹھیں کہ ان کا جذبہ صادق تھا۔ پھر بھی انہوں نے بڑے تحمل سے کام لے کر کہا۔

"خیر دلوں کا حال تو وہی اچھی طرح جانتا ہے جس کی محبت میں، میں وہاں کھنچی کھنچی چلی جا رہی ہوں۔ تو پھر آپ کے سامنے صفائی پیش کرنی ہی بے سود ہے۔ البتہ شاپنگ کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ کوئی کسی دوسرے ملک میں جاتا ہے تو وہاں کی بنی ہوئی چیزیں اور نوادرات وغیرہ ضرور خریدتا ہے اور یہ کوئی بری یا گناہ کی بات نہیں ہے۔ یہ رواج تو زمانہ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ تو باقاعدہ تجارتی قافلوں کی صورت میں جا کر خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ ہاں البتہ ناجائز اور مضرت رساں چیزیں نہیں خریدنی چاہئیں۔"

"خیر، خیر اگر جائز بھی ہوں تب بھی میں اس بات کی تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ تم وہاں سے کچھ خریدو۔ لو بھلا۔ یہاں تو یہ عالم کہ ہمیشہ ان لوگوں کو برا بھلا کہتا رہا ہوں جو حج جیسے متبرک اور مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں اور واپسی میں اتنی بے شمار چیزیں خرید کر لاتے ہیں۔ جیسے حج پر نہیں تجارت کا مال و اسباب خریدنے گئے ہوں اور طرفہ یہ کہ یہاں لا کر دس گنی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے یہ حج پر جانے کی سعادت تو نہیں ہوتی۔ بلکہ پیسہ کمانے کا لالچ ہوتا ہے۔ اس طرح تو حج کا ثواب اور تکریم ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ کم از کم میں تو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ خود میری فیملی وہاں سے خریداری کرے۔" شعیب منصور نہائی ناگواری سے بولے۔

"چلیں اگر آپ کو پسند نہیں تو پھر ہم جدہ اور ریاض وغیرہ سے شاپنگ کر لیں گے۔ اور کوئی سارا بازار لوٹنے کا ارادہ نہیں بس کام کی چند چیزیں ہی خریدیں گے۔ یوں بھی خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" زینت نے شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے پھر مصالحانہ لہجہ اختیار کیا۔

شعیب منصور کو ایک دم ہی فون یاد آ گیا۔

"بھئی، ابھی تک آپ نے فون نہیں منگوایا۔ کتنا کہا ہے کہ ایک سیٹ یہاں کمرے میں رہنے دیا کریں۔" انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر بیزاری سے کہا۔

"یہاں رکھتی ہوں تو سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ خیر ابھی آ جاتا ہے فون بھی۔" زینت بھی بیزار کن لہجے میں بولیں اور اٹھ کر سامنے دیوار کی سائڈ پر لگے انٹرکام پر ملازم سے فون کمرے میں پہنچانے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فون بھی آ گیا تو شعیب منصور اس میں مگن ہو گئے۔

رات کو گیارہ بجے جہاز کی روانگی تھی۔

شام ہی سے دوست احباب ملنے جلنے والے اور رشتہ دار کافی تعداد میں گھر پر جمع ہو گئے تھے۔ اور چونکہ عمرہ ادا کرنے جا رہے تھے اس لیے پھولوں اور مٹھائیوں کا ایک ڈھیر سا لگ گیا تھا۔ سہیل منصور کی فیملی سمیت کچھ قریبی دوست بمعہ ناز و اور سروش انہیں ایئرپورٹ پر سی آف کرنے جا رہے تھے۔ نیلما اور کوثر نے تو سلوط سے بھی اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ایئرپورٹ چلے لیکن اس نے سلمیٰ بیگم کے تنہا رہ جانے کا عذر پیش کر کے ایئرپورٹ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

اصل میں تو وہ اسفند کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی جو اس سے سخت ناراض تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ موقع ملنے کے باوجود اس رات وہ اس سے نہیں ملی تھی اور کچھ اس لیے کہ بہت اصرار کرنے کے باوجود بھی سلمیٰ بیگم، نازش اور سہیل کی دل آزاری کے خیال سے اس کے ساتھ گھر واپس نہیں آئی تھیں۔ جب کہ اصل میں تو وہ یہی چاہ رہا تھا کہ اگر اماں جان نہیں تو سلوط ہی اس کی فیملی کے ساتھ گھر چلی چلے۔ مگر بھلا وہ سلمیٰ بیگم کو چھوڑ کر کیسے اس کے ساتھ جاتی۔ جب کہ تنہا جانے کے خیال سے ہی وہ خوف زدہ تھی۔

وہ خفا ہو گیا تھا۔ اس لیے پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔

گو اس کے روٹھ جانے کا احساس سلمیٰ بیگم کو بھی تھا۔ لیکن وہ اس کی خصلت اور مزاج سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے زیادہ پروا نہیں کی تھی۔ یوں بھی سلمیٰ بیگم ہی نہیں خود سلوط کو بھی سہیل منصور کے یہاں رہ کر بہت سکون و آرام ملا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر بہت کی جاتی تھی۔ اس کی ایک ایک بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ گو کوثر کچھ نظر تاً ہی بہت لاابالی طبیعت کی واقع ہوئی تھی۔ پھر بھی اپنے معمولات اور مصروفیات میں سے وقت نکال کر کچھ وقت اس کے ساتھ ضرور گزارتی تھی۔ کوثر کو سوئمنگ، رائڈنگ ڈرائیونگ وغیرہ تو بخوبی آتی تھی۔ اور اس نے ایک سوئمنگ کلب میں داخلہ بھی لے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جوڈو اور کراٹے کا فن بھی سیکھ رہی تھی۔ اور ڈیکوریشن کورس بھی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہوم اکنامکس کالج میں بھی داخلہ لے رکھا تھا۔ یعنی دن کا تین چوتھائی حصہ ایسی ہی بامصرف غیر نصابی اور نصابی سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ البتہ شام کو وہ فرصت سے ہوتی تھی اور سلوط اس کے یہاں صرف ایک ہفتہ ہی تو رہ سکی تھی۔

اچانک ہی شعیب منصور اور زینت کا مشرق وسطیٰ کے دورے پر جانے کا پروگرام بن گیا اور زینت زبردستی سلمیٰ بیگم کو اپنے ساتھ لے آئیں تو وہ بھی ان کے دم چھلے کی طرح ان کے ساتھ لگی لگی زینت کے گھر آ گئی اور اس روز صبح کو ہی تو آئی تھی وہ۔ اور اس سے ایک دو بار سامنا بھی ہوا تو بالکل کانٹے پردے کی طرح۔

کہ کبھی وہ اسے دیکھ کر کترا گئی۔

اور کبھی اسفند نے اس پر نظر پڑتے ہی رخ موڑ لیا۔

یا انجان سا بن گیا۔ اور ایئرپورٹ جانے کا مطلب یہ تھا کہ باقاعدہ اس سے آمنا سامنا ہوتا۔ یوں بھی بھلا اس کے ایئرپورٹ جانے کا موقع ہی کیا تھا۔

زینت اپنے پیاروں اور چاہنے والوں کے جلو میں جا رہی تھیں۔ اس کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں۔

پھر بھلا وہ کیا کرتی ایئرپورٹ جا کر۔

سوائے ان لوگوں کی بے رخی سے، اپنے احساسات کو مزید چھلنی کرنے کے اسے حاصل ہی کیا ہوتا۔

گو گھر کے کل تین افراد گئے تھے پھر بھی گھر پر کچھ ایسا سناٹا طاری ہو گیا تھا جیسے وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ اور اس نے تو اپنے حالات کے تحت خود کو ہر ماحول میں رہنے کا عادی بنا لیا تھا۔ مگر نیلما کو تو اس تنہائی اور سناٹے سے کچھ ایسی وحشت ہوئی تھی کہ اس کا زیادہ وقت چچا کے یہاں ہی گزرتا تھا۔ البتہ رات کو وہ ضرور گھر آ جاتی تھی۔

اور ادھر اسفند تھا کہ ماں کی اس تاکید کے باوجود کہ چھوٹی بہن کا خیال رکھنا اور اسے تنہائی کا احساس نہ ہونے دینا۔ حسب دستور تمام تمام دن گھر سے غائب ہی رہتا تھا۔ چار روز ہو گئے تھے شعیب اور زینت وغیرہ کو گئے لیکن اس دوران میں وہ ایک بار بھی سلمیٰ بیگم سے ملنے نہیں آیا تھا۔ جن کے ہاتھ میں ان دنوں گھر کا پورا کنٹرول تھا اور وہ اس کی روٹھی ہوئی ادا کو اس کے طفلانہ پن پر محمول کر کے ہمیشہ یہی کہتی تھیں۔

"ذرا دیکھو، ابھی تک ننھے کا بچپنا نہیں گیا۔ ارے اگر میں وہاں بھی رک گئی تو اس میں اس قدر خفا ہونے کی ایسی کون سی بات تھی۔ بے وقوف وہاں بھی آ کر مجھ سے مل سکتا تھا۔ ویسے یہاں بھی وہ کونسا ہر وقت گھر میں رہتا ہے۔ دنوں تو آ کر صورت نہیں دکھاتا اسی پر طنطنہ یہ کہ میں وہاں کیوں رہ رہی ہوں ہے نا بالکل طفلانہ سی حرکت۔ اب جو نہی بھوت اترے گا تو خود ہی آ کر میرے ہاتھ پاؤں دبانے بیٹھ جائے گا۔ احمق کہیں کا۔"

سلمیٰ بیگم اس کے بارے میں جو تبصرہ اور تاثرات پیش کرتیں۔ کبھی کبھی تو وہ حیرت سے ان کا منہ ہی دیکھتی رہ جاتی۔ لو بھلا ایک پورا اور مکمل شخص جو قسمت سے ڈاکٹریٹ بھی کر کے آیا ہے۔ اسے یہ اماں جان ابھی تک جیسے بردار ہی سمجھتی ہیں۔ یوں جیسے کوئی معصوم بچہ دودھ کی بوتل منہ سے لگائے پھر رہا ہو۔ ہاں اب ان کا بھی کیا قصور، ان کی نظر کے عدسے ممتا کی عینک میں اتنی تنگی سے فٹ ہیں کہ وہ انہیں چھوٹا ہی نظر آتا ہے اور پھر انہیں کیا معلوم کہ وہ ان سے نہیں بلکہ مجھ سے خفا ہے۔

بہرکیف ۔ وہ فراق یا دوری کا روگ پالنے تو کراچی نہیں آئی تھی۔

بلکہ سخت مجبوری کے عالم میں گویا جبراً بھیجی گئی تھی۔

سب کچھ تو وہیں چھوڑ آئی تھی جو بچپن سے اس کا مسکن رہا تھا۔ ماسوا چند جوڑے کپڑوں اور دو چار استعمالی چیزوں کے۔

بھائی نے بوقتِ رخصت کل پانچ سو کی رقم ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔
یا پھر اس کی اپنی پس انداز کی ہوئی تھوڑی رقم اور گنتی کے زیورات ہی اس کی کل پونجی تھے۔ گو اس گھر میں رہ کر اس کی یہ پونجی محفوظ تو رہ سکتی تھی کہ طعام اور قیام کا ادا کرنا نہیں پڑتا تھا۔
لیکن اس کی غیرت کو یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ وہ مستقلاً اس گھر پر بار بن کر رہے۔
یوں بھی گھر کے مکینوں کا رویہ اس کے ساتھ متکبرانہ ہی نہیں بلکہ حقارت آمیز بھی تھا۔ اور اگر نیلما اپنی خلیق فطرت کی وجہ سے اس سے مروت بھی برت لیتی تھی تو بھی وہ اس ماں کی بیٹی ہی تو تھی جو ہمیشہ اس سے بے رخی اور بے اعتنائی سے پیش آتی تھیں۔ وہ تو اپنی ساس کو نہیں گانٹھتی تھیں تو پھر سلمیٰ بیگم کے سامنے اس کی کیا حیثیت اور کیا اوقات تھی۔
رہ گئے شعیب منصور تو اوّل تو وہ گھریلو معاملات میں دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسرے اپنی کاروباری معروفیات سے انہیں مہلت ہی کہاں ملتی تھی جو وہ کسی اور طرف دیکھ سکتے یوں بھی اسے اپنے گھر میں پناہ دے کر جیسے وہ اس کے ہر معاملے سے بری الذمہ ہی ہو گئے تھے۔ یا پھر اسے بھول گئے تھے۔ اور اسفند۔ اسے تو وہ ایک جذباتی سا لاڈ پیار میں بگڑا ہوا انسان سمجھتی تھی۔
جو اس کے خیال میں بے حد لاابالی۔ لاپروا ہی نہیں بلکہ حد درجہ موڈی بھی تھا۔
تبھی تو اپنے موڈ سے اس کی تو کیا سلمیٰ بیگم کی خیر خبر پوچھنے آجاتا تھا۔
وہ تو اس کی فطرت اور مزاج سے بھی واقف نہیں تھی۔ اس لیے اس کی جھٹکا دینے والی باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی تھی۔
کہ وہ واقعی عشق کے معاملے میں سیریس ہی ہے یا پھر۔ تفننِ طبع کی خاطر ایسا ظاہر کر رہا ہے کہ ایک تو وہ شروع ہی سے عدم اعتمادی کا شکار رہی تھی۔
دوسرے یہ بھی درست تھا کہ وہ اسفند کے دیوانگی کی حد تک ایک دم ہی امڈ آنے والے جذبے کا کیونکر اعتبار کر سکتی تھی۔
یعنی ایسے انسان کی جذباتی سی باتوں اور اداؤں کا کیسے اعتبار کر سکتی تھی۔ جو اچانک ہی وارد ہوتا تو اس طرح جیسے کوئی سرکش سی لہر محض اتفاقاً اسے اس تک بہا کر لے آئی ہو۔
ماں باپ اور بہن کے جانے کے بعد۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ سلمیٰ بیگم کے ساتھ وہ بھی اسی گھر میں رہ رہی ہے۔ بلکہ خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی چکا تھا پھر بھی چار روز کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا اور کمرے پر ہی کیا موقوف کہ وہ کمرہ بند ہو کر تو نہیں بیٹھ رہی تھی۔ بلکہ وہ تو سلمیٰ بیگم کی ہدایات کے مطابق خانساماں سے اپنی نگرانی میں کھانا پکوائی تھی۔ اور ایک آدھ ڈش خود بھی تیار کر لیا کرتی تھی حتیٰ کہ اسفند کا ناشتہ بھی کریم سے اس کے کمرے میں خود ہی بھجوائی تھی۔ کیونکہ ان چار دنوں میں دن اور رات کا کھانا تو اس نے گھر میں کھایا ہی نہیں تھا۔ گھر سے نکلتا تو وہ ناشتے کے بعد ہی تھا مگر کب لوٹ کر آتا تھا، یہ سلوط کو معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔
بہرحال۔ وہ چاہتا تو کمرے کے علاوہ کسی اور جگہ بھی اس سے مل سکتا تھا۔
مگر اس نے ایسی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔
صاف ظاہر تھا وہ سب کچھ اپنے موڈ سے ہی کرتا تھا۔
یا پھر اس نے جو کچھ بھی کیا تھا محض وقتی تاثر سے زیر ہو کر ہی کیا تھا۔
ورنہ اس کے لیے اس کے دل میں کوئی طوفانی اور طولانی جذبہ موجزن نہیں تھا۔
گو سلوط تو خود ہی ایسی باتوں سے دور بھاگتی تھی۔
بلکہ اسفند کے خیال کے ساتھ ہی ایک عجب سا ہراس پر طاری ہونے لگتا تھا اور وہ خود کو اس کی نظروں سے اوجھل ہی رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ واقعی اس کے من کو بھا گیا تھا۔
وہ اسے اس قدر اچھا لگا تھا کہ پسندیدگی کا سارا جذبہ اسی پر ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ جب کہ چاہت کا یہ جذبہ اسفند نے ہی اس کے دل میں جگایا تھا۔
محبت کی یہ چنگاری اسی نے فروزاں کی تھی۔ ورنہ یہ پسندیدگی محض سلوط کی ذات تک ہی محدود ہوتی۔
یعنی پسندیدگی کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔
مگر اب تو ایک کسک سی شاملِ حالات ہو گئی تھی۔

جب کہ اس کی یہ کیفیت تھی۔ جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا ہو کہ وہ دیکھ اور سن تو سکتی ہو مگر منہ سے آواز نکال سکتی ہو نہ جنبش ہی کر سکتی ہو۔
بالکل کسی بے بس اور بے بال و پر کی طرح اس نے خود کو حالات کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔
خود کو اس درجہ بے حس اور بے غرض بنا لیا تھا جیسے پتھر کی بے جان مورتی ہو کہ اسفند کی ڈالی ہوئی اس نئی افتاد نے اس کا رہا سہا چین و قرار بھی لوٹ لیا۔ گو بظاہر وہ بہت پُرسکون اور بے پروا سی نظر آتی تھی۔
لیکن اندر ہی اندر دل کے پاتال میں کچھ ایسا تلاطم سا برپا رہتا تھا۔ جسے خلش اور کسک کا نام ہی دیا جا سکتا تھا۔
کیونکہ اگر وہ اس معاملے میں سیریس اور سچا بھی ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی کرنا تو بڑی بات وہ اس پر ایک نگاہِ التفات تک ڈالنے سے بھی گریز کرتی۔
پھر بھی اسے اس بات پر سخت ملال تھا کہ مذاق یا دل لگی کے طور پر ہی سہی۔
اسفند نے اس کے دل میں یہ آگ سی کیوں بھڑکائی اور بس۔ ورنہ ان دنوں وہ کسی معقول ملازمت کی فکر میں غلطاں اور پیچاں رہتی تھی۔ کہ ایک تو موقع بہت اچھا کہ شعیب منصور اور زرینت ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دوسرے شعیب منصور کے سختی سے منع کرنے کے باوجود ملازمت کے سوا اسے اپنے حالات درست کرنے کا اور کوئی چارہ کار ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔
لیکن ملازمتیں یا اپائنٹمنٹ لیٹرز کوئی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر فی سبیل اللہ تو نہیں بانٹے جاتے۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے تو بڑی بھاگ دوڑ اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ جب کہ عالم یہ تھا کہ کوئی معاون تھا نہ مددگار اور ادھر اس کے مطلب کی ملازمت ڈھونڈے نہیں مل رہی تھی۔ اس جستجو میں وہ ہر روز صبح کا اخبار لاؤنج سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتی تھی اور اشتہارات کے کالم کا بغور مطالعہ کرتی۔ اسی امید میں کہ کبھی تو اسے کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا۔
اس روز بھی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اخبار لینے لاؤنج میں گئی تھی کہ وہیں سینٹر ٹیبل پر اخبار کے پاس ہی "میگ" کا تازہ ایشو پڑا نظر آیا۔ تو وہ اسے کھول کر اس کی تصویریں دیکھنے لگی کہ دفعتاً عقب سے اس کی حیات بخش آواز ابھری۔
"او تو آج ہمارا مجرم آخر رنگے ہاتھوں پکڑا ہی گیا۔" وہ اس کی لاعلمی میں اچانک پیچھے آ کر بولا تھا۔ ڈر کر اچھل پڑنا قدرتی بات تھی۔ دل میں بھی جیسے پنکھے لگ گئے تھے۔ اور بدن میں ایک ناخوشگوار سی جھنجھناہٹ۔
"معلوم بھی ہے میں وعدہ خلافی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔" وہ اپنا منہ اس کے کان کے قریب لا کر بولا تو وہ جو یکلخت منتشر ہو جانے والی دھڑکنوں کی یورش میں ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔ تھوڑا سا پیچھے سرک کر اس کی طرف گھومی۔ کیسا خود غرض انسان تھا۔ اپنا دل چاہا تو اس سے بات کرنے چلا آیا تھا۔ الٹا اسے قصوروار گردانتا ہوا۔ ورنہ اتنے دنوں سے پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔
بڑی ہی کاٹتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کوئی تیکھا سا جواب ہی دینے والی تھی مگر سفید قمیص اور سفید پتلون میں تازہ تازہ شیو کیے چہرے کے ساتھ صبح کی سہانی اور اجلی اجلی ساعتوں میں کچھ اتنا دلکش لگا کہ کوئی سخت سی بات کہنے کے لیے وا ہوتے لب ساکت رہ گئے۔ اور وہ اسے ایک ٹک دیکھتی ہی رہ گئی۔
"محض دیکھنے سے ہی کام نہیں چلے گا بلکہ آپ کو میری بات کا جواب بھی دینا ہو گا۔" وہ اپنی وارفتہ سی نظروں کو بڑی بے باکیت اس کی کٹیلی سی نظروں میں اتار کر بولا۔
"کس بات کا؟" اس نے اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر نگاہیں کتراتے ہوئے تیکھے سے لہجے میں پوچھا۔
"عہد شکنی کے ارتکاب کا۔" وہ اس کے آنکھیں کترا جانے پر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"لیکن میں نے تو کوئی وعدہ خلافی یا عہد شکنی نہیں کی کیونکہ میں وعدہ وعید کرنے کی سرے سے قائل ہی نہیں تو پھر عہد شکنی کا کیا سوال۔" وہ درشت لہجے میں بولی۔
"ہوں تو بڑی سنجیدگی سے خفا ہیں آپ۔ مگر یہ الٹی گنگا کس سلسلے میں بہائی جا رہی ہے۔ خفا تو اصل میں مجھے ہونا چاہیے تھا۔" وہ تھوڑا سا ہنس کر بولا۔ وہ خاموش ہی رہی۔ یوں بھی اس کے پاس اس کی باتوں کا جواب ہی کہاں تھا۔ کیونکہ ابھی تک وہ اسے سمجھ نہ سکی تھی۔
"معلوم بھی ہے اس روز سے اب تک میں کتنی شدید کوفت میں مبتلا رہا ہوں اور میں نے آپ کو اس روز کسی غلط خیال سے تو

نہیں بلایا تھا بلکہ صرف تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔

پھر آپ اتنا ڈر کیوں گئیں کیا مجھ پر ذرا بھی اعتماد نہیں تھا؟" اس کی خاموشی پر وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔ نوال کا دل چاہا صاف صاف کہہ دے۔

"مجھے تم پر ذرا سا بھی اعتماد نہیں۔ کیونکہ میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں نہ خصلت سے اور پھر تم پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میری اور تمہاری راہیں مختلف اور جداگانہ ہیں۔ پھر تم بہانے بہانے میرا راستہ کیوں روکتے ہو؟ کیوں مجھے بھٹکا دینے کے درپے ہو۔ جب کہ میں تو ابھی تک اپنی زندگی کی صحیح راہ تک متعین نہیں کر سکی ہوں۔" مگر وہ یہ سب کس زبان اور کس دل سے کہہ دیتی بھلا۔ اتنا کوتاہ دل اور کٹھور کیونکر بن جاتی کہ اپنے نیشتر الفاظ سے اس کے احساسات کا جگر پارہ پارہ کر دیتی۔ وہ تو اگر چاہتی بھی تو اس سے اس قدر غیر رواداری سے پیش نہیں آ سکتی تھی۔ کہ یہ اس کے لیے دل کا معاملہ بھی تھا۔ اس لیے اس نے اصل جواب گول کرتے ہوئے کہا۔

"اگر احتیاط اور نزاکتوں کے احساس کو آپ ڈر اور خوف پر ہی محمول کرتے ہیں تو پھر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہاں واقعی میں ڈر گئی تھی۔ کیونکہ میرے پاس جو کچھ بچا ہے وہ میری عزت ہے اور عزت مجھے اپنی جان سے پیاری ہے اور مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ دوسروں کی انگشت نمائی کا نشانہ بنوں۔"

"اوہ تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے ان نزاکتوں کا بالکل احساس نہیں یا میں خود ہی اپنی محبت کو طشت ازبام کرنے کے درپے ہوں؟" اس نے حد درجہ کبیدہ ہو کر کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر۔"

"اگر مگر کی بات نہیں سلوط! یہ پہلے آپ کی عزت کا معاملہ ہے بعد میں کچھ اور جو مجھے اماں جان پر بھی ظاہر کرنا گوارا نہیں اور اس وجہ سے کہ چونکہ پچھلی مرتبہ اماں جان کچھ متجسس سی ہو گئی تھیں۔ میں اتنے دن سے ان کی احوال پرسی کو بھی نہیں گیا۔ کیونکہ آپ کو دیکھ کر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا کسی کو کیا میں خود کو بھی بھول جاتا ہوں۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیں یا جذبے کی شوریدہ سری مگر آپ کو دیکھ کر میں واقعی بالکل بے بس ہو جاتا ہوں۔" اُف ایک طرف مصلحتوں و نزاکتوں کا پاس اور احساس اور دوسری طرف یہ دیوانگی اور جنوں خیزی۔ وہ تو پہلے ہی اس کی محبت میں سرتاپا غرق ہو چکی تھی۔

اور یہ سب کہہ کر تو اس نے گویا سلوط کے دل میں اعتماد کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔

پھر بھی وہ ڈھلمل یقین سی تھی۔

بڑی بے بس اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی

وہ واقعی سیریس ہو گیا ہے۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا۔

کیونکہ وہ تو اگر چاہتی بھی تو اس کی چاہت میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔

پھر بھلا اسے دھوکے میں رکھنے سے حاصل ہی کیا ہو گا۔

پہلے کی طرح ایک بار پھر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آتے آتے وہ بچ کر نکل آئی۔

وہ دل جو اس کی طرف جھکا چلا جا رہا تھا۔

اس کی باتوں کے سحر میں پھر کہیں کھو سا گیا تھا۔

اسے سختی سے سرزنش کر کے اس نے اپنی ساری امنگوں کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

"آپ۔ آپ اگر اس معاملے میں سیریس بھی ہیں تو خدارا میری ذات کو اس میں ملوث نہ کیجیے۔ میں۔" مگر وہ اس کی عاجزانہ سے لہجے میں کہی بات کو کاٹ کر یوں چونک کر بولا جیسے یکایک کسی نے اس کے چٹکی بھر لی ہو۔

ہائیں کیا مطلب۔ کیوں نہ کروں آپ کی ذات کو ملوث۔ آخر کس وجہ سے نہ کروں؟" تب اس کا دل چاہا اپنے بارے میں سب کچھ اسے صاف صاف بتا کر اسے اپنی تمام مجبوریوں سے آگاہ کر دے۔

کہ اندھیرے میں رکھنے سے بہتر تو یہی تھا۔

مگر سب کچھ کہہ ڈالنے اور اپنی مجبوریوں سے آگاہ کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔

کہ وہ اتنی سی بات تو نہ تھی کہ دو لفظوں میں تمام کر دی جاتی۔

اور پھر یہ اس کی انا اور وقار کا معاملہ تھا۔

یہ سب تو اتنی مہربان مشفق اور اس پر بے دریغ اپنی ممتا کو لٹانے والی سلمیٰ بیگم کو بھی نہیں بتا سکی تھی۔

"کیونکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔" بہت سوچ سمجھ کر اسے یہی کہنا مناسب لگا۔

"لیکن میں تو سمجھتا ہوں، قابل ہی نہیں بلکہ مستحق بھی۔" یہ کہہ کر تو اسفند نے اسے مزید کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔ پھر بھی وہ اپنی بات پر جمی رہی۔

"آپ سمجھتے ہیں مگر۔ مگر۔ پلیز آپ میرا خیال چھوڑ ہی دیں۔"

"کیوں چھوڑ دوں۔ یہ کوئی ہنسی کھیل تو نہیں، نہ ہی ٹائم پاس کرنے کی وجہ سے میں آپ کی محبت کا دم بھر رہا ہوں۔ یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ واہ یہ خوب کہا کہ میرا خیال چھوڑ دیں۔ جب کہ میں نے تو آپ کو لائف پارٹنر کے طور پر سلیکٹ کیا ہے۔" اس نے بگڑے بگڑے انداز میں اپنی بات کہہ کر اسے اپنے ارادوں کی پختگی سے آگاہ کیا۔ تو وہ اندر ہی اندر دہل اٹھی۔

اف تو معاملہ اسقدر کے لگے اتنی گہرائی تک پہنچ چکا ہے۔ اس خیال سے ہراساں ہو کر اس نے کہا۔

"اف نہیں۔ نہیں۔ اس بات کو کبھی بھول کر بھی منہ سے نہ نکالیے گا۔"

"کیوں نہیں نکالوں۔ کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں یا کسی کا دبیل ہوں؟ اور یہ تو میرا خالص نجی معاملہ ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس میں دخل دے یا نکتہ چینی کرنے کی جرأت کر سکے۔ میں تو بانگِ دہل سب سے کہوں گا کہ دیکھو میری چوائس کتنی اعلیٰ اور ارفع ہے بلکہ کم از کم ممی کو تو یہ باور کرا دوں گا کہ ان کے منتخب کردہ میک اپ زدہ چہروں سے میری چوائس کا معیار کس قدر بلند ہے۔"

اف تو یہ۔ اس کے ارادوں سے باخبر ہو کر اور خاص طور پر زینت کا نام سن کر اس کی جان ہی نکل گئی۔ اف اب کہے تو کیا کہے۔

کہ وہ تو اس کے کسی جواز کسی تاویل اور کسی بھی عذر معذرت کو سننے کا روادار ہی نہ تھا۔

اس کے ہر عذر کا جواب گویا اس کے پاس پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔

اور اس ضمن میں مزید کچھ کہنے کے لیے ذخیرہ الفاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔

اور جب کسی شنوائی کا امکان ہی نہ تھا تو پھر مزید کچھ کہنے سے حاصل ہی کیا ہوتا۔

جب کہ وہ اس کی باتوں سے اخذ ہونے والے ہولناک نتائج کا تصور کر کے پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

کہ ذلت و خواری گویا مقدر بننے والی تھی۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیا کہے اور کیونکر اسے اس کے ارادوں سے باز رکھے۔ حالانکہ وہ اتنی ناسمجھ اور معصوم بھی نہیں تھی۔

بلکہ بچپن ہی سے زندگی کے تلخ تجربات کے سانچے میں ڈھل کر بہت پختہ اور سمجھدار ہو گئی تھی۔

حد درجہ باشعور اور زمانہ شناس۔

مگر زندگی کے اس نازک ترین معاملے کو نمٹانے میں خود کو بالکل بے بس پا رہی تھی۔

کیوں کہ ایسے موقعوں پر نہ تو کوئی کسی کو جھٹلانے کے قابل رہتا ہے۔ نہ سمجھانے اور باز رکھنے کے۔

اسے صرف رام ہو جانے کی ترکیب سمجھ میں آئی۔

حالانکہ اس کے سامنے سپر ڈال دینا بھی خود اسی کی ذلت اور خواری کا پیش خیمہ تھا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس سمے وہ اس کے لیے مجبور کر دی گئی تھی۔ چنانچہ میگ کے تازہ پرچے کو جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھا میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ اماں جان کے لیے جو سوپ اسٹو پر رکھ کر آئی تھی وہ تو اتنی دیر میں جل کر سوکھ بھی گیا ہو گا۔" پھر۔ اسے کچھ کہنے کی مہلت دیے بغیر جھک کر صبح کا اخبار اٹھاتے ہوئے اس نے شکست خوردہ سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ اپنے ارادوں میں اٹل ہی ہیں تو کم از کم مجھے تو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دیں۔ دیکھیں نا۔ آخر یہ تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ آپس میں انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو یک طرفہ جذبہ بھی محض ریت کی دیوار ہی ثابت ہوتا ہے۔ اتنی جلد بازی سے کام لینا تو کسی طرح بھی درست نہیں۔" یہ کہہ کر گویا اس نے اپنی محبت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ زندگی بھر اس کا ساتھ دینے کا اقرار بھی کر لیا تھا۔

اسفند کے دل میں اترتی طمانیت کے احساس نے اس کے رگ و پے میں مسرت کی لہر سی دوڑا دی۔

"ہاں ہاں، جلد بازی سے کام لینا عقلمندی بھی نہیں، ایک دوسرے کو سمجھے بغیر واقعی زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی اور آپ کے لیے تو میں برسوں تک انتظار کر سکتا ہوں۔" اُف وہ اس کی بہلاوے کے طور پر کہی بات کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔

وہ اس کے ہاتھوں کس بری طرح سے اسیر ہو گئی تھی۔

ان ساری باتوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس تکلیف دہ خیال نے اسے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔

اندر ہوتی اتھل پتھل سے اس کا چہرہ بھی دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ وہ اب مزید اس کے سامنے ڈٹی رہنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔

مبادا کہ اس کے چہرے سے ہویدا تاثرات اس کے جھوٹ یا غلط بیانی کا بھانڈا پھوڑ دیں۔ اس نے دل میں ہوتی ناخوشگوار سی دھڑکنوں کے شور سے ابھر کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اف اس وقت تک تو سب کچھ جل کر یقیناً راکھ ہو چکا ہوگا۔"

"اوہ ہاں اور ادھر میرے کولیگ اور سب آرڈی نینٹ (میرے ساتھ کام کرنے والے اور ماتحت) بھی اب تک میرے انتظار میں سوکھ کر کانٹا ہو چکے ہوں گے۔"

"اوکے دین سولانگ۔" اس نے بھی معذرت کے سے انداز میں کہا۔ ورنہ عام طور پر وہ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جاتا تھا اور اس کے سولانگ کہنے پر سلوط کی بھی جان میں جان آئی۔ وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ جاتے جاتے بولا۔

"خدا حافظ یوں خالی خولی تو نہیں کہا کرتے۔" اپنی بات کہہ کر وہ اپنی کسی بے ساختگی کا مظاہرہ کرنے والا ہی تھا کہ اس نے گھبرا کر کہا۔

"ہر بات انسان آہستہ آہستہ ہی سیکھتا ہے جلد بازی سے کام لے کر نہیں۔" اور اس کے تیکھے سے جواب پر جھینپ کر وہ ہنستا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

وہ تو اپنے جذبوں اور خوشی میں سرشار ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔

مگر وہ کسی کام کی بھی نہیں رہی تھی۔

وہ پورا دن اس نے اپنی حماقت پر ماتم کناں رہنے اور طرح طرح کے اندیشوں سے اپنا خون سکھانے میں گزرا تھا۔

میں نے اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول دیا؟

کیوں اس کی آنکھوں پر بہلاوے اور فریب کی پٹی باندھ دی۔

وہ تو اپنے جذبوں کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ خود بھی سچا ہے۔

میں اب اگر سچ بھی بولوں گی تو وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔

بلکہ اس کے جذبوں میں مزید شدت آئے گی۔

جس سے مجبور ہو کر وہ میرے حصول کی تمنا کرے گا۔

بات کھلے گی تو پھر کیا ہوگا؟

سوائے دوسروں کی نظروں میں میری ذلت و خواری کے۔

اور اس کی نظروں میں میری تباہی کے مجھے حاصل ہی کیا ہوگا۔

اس گھر سے بھی نکالا مل جائے گا۔

تو پھر میں کون سی جائے پناہ تلاش کروں گی؟

کس کا آسرا ڈھونڈوں گی؟

پھر تو در بدر کی ٹھوکریں ہی میرا مقدر ہوں گی۔

اُف توبہ ایک جھوٹ کے کارن مجھے کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔

کیسی کیسی اذیتیں جھیلنی ہوں گی۔

کیا تھا اگر میں سچ کا زہر پینے کی ہمت کر جاتی۔

ایک صرف اس کی نظروں میں ہی تو خوار ہوتی اور اس طرح کم از کم میرے ماتھے پر رسوائی کا داغ تو نہیں لگتا۔

اتنا ہی تو ہوتا کہ ایک سرکش سے جذبے کی ابھرنے سے پہلے ہی موت واقع ہو جاتی۔ یا وہ ابھرتے ہی مسل اور کچل جاتا۔

پھر میں نے اتنی بزدلی سے کیوں کام لیا؟

اتنی کمزوری کیوں دکھائی؟

نہیں۔ نہیں، اب بھی کچھ نہیں گیا میں اس سے ہر بات صاف صاف کہہ دوں گی۔ اسے بتا دوں گی کہ جیسے وہ سمندر کی تہہ میں پڑی سیپ میں بند گوہر آبدار سمجھ رہا ہے۔ اس کی حیثیت کیچڑ میں اُگے کنول کے پھول سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنی اتنی۔ زیادہ خودی اور غیرت کے باوجود کچھ بھی نہیں ہے۔

بس حالات کا شکار ایک عام سی لڑکی۔

مگر ایسی لڑکی جو اپنے حالات کی کم اور دوسروں کے حالات کی زیادہ شکار رہی ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اسفند کے جذبات مجروح ہوں یا دل پر قیامت ٹوٹ پڑے۔ وہ اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا کر ہی دم لے گی۔ اور خواہ کوئی اس کے بارے میں کیسی ہی رائے کیوں نہ قائم کرے وہ خود اس کے کمرے میں ہی جا کر آج رات ہی کو بتا دے گی۔

ساری نزاکتوں اور نتائج پر غور کرنے کے بعد آخر اس نے تہیہ ہی کر لیا کہ وہ اس کے مزید آگے بڑھنے سے پہلے ہی سب کچھ اسے بتا دے گی۔

اس روز شام کو جب سلمیٰ بیگم مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز کی چوکی سے اٹھ رہی تھیں۔ وہ ہوا کے کسی تیز جھونکے کی طرح اندر آ گیا۔

"السلام علیکم اماں جان!" وہ ان کے بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"اوہ تو گویا بھوت اتر گیا ہے۔ تمہارے سر سے مگر خیر کہو اتنے دنوں کیسے رہے؟" سلمیٰ بیگم بھی اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے شکوہ شکایت کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ کیوں کہ ان کے خیال میں بزرگوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ایک دم بھلا چنگا۔" وہ بھی یوں بولا جیسے اسے اپنی اتنے دنوں کی غیر حاضری پر ذرا ندامت نہ ہو۔

"ہاں خدا بھلا چنگا ہی رکھے۔ ڈیوٹی تو تمہاری کافی سخت ہوتی ہے۔ صبح سے تین بجے تک ہسپتال میں رہتے ہو اور پھر کلینک کا کام دیکھنے چلے جاتے ہو۔ ہاں بیٹا یہی عمر تو ہے خود کو کچھ بنانے کی۔ وہی مثل ہے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ مگر تھوڑا سا آرام بھی کر لیا کرو۔ صحت کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔" سلمیٰ بیگم کا یہی تو کمال تھا کہ وہ باتیں ایسی کرتیں — جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھیں ورنہ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ کمرے میں گھستے ہی اس کی خوب خبر لیں گی۔ خوب لتاڑیں گی اور برا بھلا کہیں گی۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف وہ اس پر اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھیں۔ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"بس اماں جان اب تو میدانِ عمل میں قدم رکھ ہی لیا ہے اب آرام کیسا۔ اب تو کچھ بننے کے بعد ہی آرام کریں گے۔" وہ ایک جمائی لے کر تکیہ بغل کے نیچے دبا کر وہیں ڈھیر ہوتا ہوا بولا۔

"اے لو تم تو ماشاءاللہ ماں کے پیٹ سے بنے بنائے پیدا ہوئے ہو۔ دولت، جائیداد، آسائشیں کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس۔ اگر ہاتھ پیر نہ بھی ہلاؤ تب بھی یہ ساری دولت تمہارے سر آئے گی اور پیر جائے گی۔ البتہ بیٹھے بیٹھے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اور حرکت میں ہی برکت ہوتی ہے۔ میں تو اسی خیال سے کہہ رہی تھی۔"

سلمیٰ بیگم سرہانے تپائی پر رکھا پاندان اپنے آگے رکھتے ہوئے بولیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان کی محاوراتی زبان میں گفتگو پر ہنس کر جوابی کارروائی ضرور کرتا۔ لیکن اس سمے وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"مگر یہ خزانے خالی ہو جانے اور حرکت میں برکت کے علاوہ بھی بادی النظر میں ایک شدید احساس میرے اندر پرورش پاتا رہا ہے اماں جان! بلکہ یہ احساس لڑکپن سے ہی ڈیڈی نے میرے دل میں پیدا کیا تھا کہ دوسرے پر ڈیپینڈ کر کے نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ انسان کو اپنی ضروریات اپنے زورِ بازو سے پوری کرنی چاہئیں۔ معلوم بھی ہے اماں جان! ڈیڈی میرے اخراجات کے لیے اتنی قلیل رقم بھیجتے تھے۔ جس میں میرے تعلیمی اخراجات بھی مشکل سے ہی پورے ہوتے تھے۔ شروع شروع میں صرف ایک مرتبہ ان سے شکایت کی تھی۔ تب انہوں نے کہہ دیا تھا کہ یہاں تو میری اتنی ہی استطاعت ہے تمہاری ضروریات اگر اس میں پوری نہیں ہوتیں تو خود محنت و مشقت کر کے پوری کر لو۔ یوں بھی میں تمہیں ایک دم اِن ڈیپنڈنٹ دیکھنا چاہتا

ہوں۔ باوا جان کی بخشی ہوئی جائیداد کا رہین منت نہیں۔ اسی وقت سے میں نے بھی تہیہ کر لیا اماں جان کہ میں خود کو کچھ بنا کر رہوں گا۔"

"ہاں اب دیکھ لو باپ نے تھوڑی سی سختی بھی کی تھی تو تمہیں آدمی تو بنا دیا۔ اب خیر سے تم ڈاکٹر بن گئے ہو۔ انشاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ اور اپنے اس پیشے میں تم جلد ہی آسمان کا تارا بن کر چمکو گے۔" سلمیٰ بیگم دعائیہ انداز میں بولیں۔

"ہاں بس آپ کی دعائیں ہی چاہئیں اماں جان!" وہ سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا بولا۔

"وہ آپ کی لیڈی کانگ نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کہیں آپ نے انہیں ریٹائرمنٹ تو نہیں دے دی؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور سلمیٰ بیگم کا اچھا بھلا موڈ تھوڑا سا آف ہو گیا۔

"دیکھو پھر آ گئے نا تم اپنی خصلت پر۔ اب ڈاکٹر بن گئے ہو تو اپنے اندر بردباری پیدا کرو۔ ورنہ مریضوں سے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کیں تو پھر چل چکی تمہاری ڈاکٹری۔" انہوں نے قدرے جھک کر کہا۔

"واہ یہ کیا بات ہوئی اماں جان! بھلا اس بات سے میرے پیشے کا کیا تعلق ہے؟ میں نے تو سیدھے سادے انداز میں ایک بات پوچھی تھی آپ سے۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"لیکن وہ میری لیڈی کانگ کیوں ہونے لگی۔ تمہاری ماں بہنوں نے بے چاری کو دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال کر ایک طرف پھینک رکھا ہے۔ اس لیے وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ کوئی کسی کی لونڈی یا باندی تو نہیں ہے وہ۔ میں نے تو تمہاری چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے اس سے کوئی کام لینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ البتہ تمہارے گھر کے کام وہ ضرور کر رہی ہے آج کل۔ وہ بھی اس لیے کہ مفت کی روٹیاں توڑنی اسے اچھی نہیں لگتیں۔ ملازمت کے لیے کوشاں ہے مل جائے گی تو ٹھکانہ بھی الگ کر لے گی۔ مگر جب تک یہاں ہے کم از کم اس کی تحقیر تو نہ کیا کرو۔" سلمیٰ بیگم نے لتاڑا تو وہ نہ معلوم کس موڈ میں تھا۔ ایک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے لگا جیسے وہ خانساماں سے رات کا کھانا تیار کرانے کے ساتھ ساتھ پینٹری میں کھڑی — سلاد بنا رہی تھی۔ وہ بندوق کے نکلے ہوئے کی طرح گولی بنا سیدھا وہاں پہنچ گیا۔

"یہ ملازم کس مرض کی دوا ہیں جو آپ نوکروں کی طرح یہ سارے کام کرتی ہیں۔ چلیے پھینکیے اسے اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجیے۔ آئندہ میں نے آپ کو کام کرتے دیکھا تو ٹھیک نہ ہوگا۔" اپنی بات کہتے کہتے نہایت جذبے کے عالم میں اس نے سلاد کی ڈش اٹھائی اور فرش پر پھینک دی۔ اور جس انداز میں آندھی اور طوفان بنا آیا تھا۔ اسی انداز میں باہر نکل گیا۔ اور وہ ششدر سی کھسیانی سی کبھی دروازے کی طرف جس سے وہ ہو کر گیا تھا اور کبھی فرش پر بکھری سبزی کو دیکھتی رہی۔ اس کی اونچی آواز کے ساتھ پلیٹ گرنے کی آواز آئی۔ تو کچن میں کام کرتا ہوا خانساماں گھبرا کر پینٹری میں آ گیا۔

"کیا ہوا بی بی صاحب؟ کیا گر گیا؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہ سلاد کی پلیٹ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔" خانساماں کے استفسار پر وہ ندامت بھرے لہجے میں بولی۔ گو خانساماں نے ایک تو اسفند کی گرج اور کڑک سنی تھی۔ دوسرے پلیٹ اس کے قریب نہیں بلکہ فرش پر خاصے فاصلے پر گری ہوئی تھی۔ وہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں جھک کر فرش پر بکھری کٹی ہوئی سبزی چننے لگا۔

مگر اس کے دل و دماغ میں تو جیسے زلزلے سے ہو رہے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عتاب کی وجہ کیا ہے؟

کانوں میں ابھی تک اس کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"اگر میں نے آپ کو کام کرتے دیکھا تو ٹھیک نہ ہوگا۔" زبانی دھمکی دینے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے بھی قہر کر غصے میں سلاد کی پلیٹ ہی پھینک دی۔

یہ سمجھنے کا تو اس وقت موقع تھا نہ خواہش کہ یہ غصہ اور رعب کس وجہ سے دکھایا تھا۔

آخر کیا غلطی سرزد ہو گئی تھی اس سے۔

بلکہ اس کی اس غیر اخلاقی اور بے ہودہ حرکت پر اس کا دل بری طرح بھرا چلا آ رہا تھا۔ کہ اس کے نزدیک اس کی کھلی توہین تھی۔ اس لیے وہ سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر سیدھی اپنے رہائشی کمرے میں آ گئی۔ اور سلمیٰ بیگم کی موجودگی کی وجہ سے آتے ہی سیدھی غسل خانے میں گھس گئی۔ اور پھر دیر تک اس کے اہانت آمیز رویے پر آنسو بہاتی رہی۔ اور جب دل پر بڑھتا بوجھ قدرے کم ہو

گیا تبھی باہر نکلی۔

"آج میری طبیعت کچھ بھاری بھاری سی ہو رہی ہے، اس لیے صرف سوپ ہی پیوں گی۔ اصل میں دوپہر کو اشتہا سے زیادہ کھا لیا تھا، اس لیے شاید ہضم نہیں ہوا۔"

ہر بات اور اس کی کیفیت سے لاعلم سلمیٰ بیگم غسل خانے سے اس کے باہر آتے ہی بولیں۔ جی تو چاہا کہ صاف صاف کہہ دے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اب کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ مگر ایسی کسی بات کا اسے جواب وہ ضرور ہونا پڑتا۔ یوں بھی کم از کم سلمیٰ بیگم کے کسی کام کے لیے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس وقت تو وہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ وہ سلمیٰ بیگم کو اتنی روتی شکل نہ دکھائے۔ اس لیے بلا جواب دیے جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر خانساماں سے کہہ کر کریم کے ہاتھ اس نے سلمیٰ بیگم کو سوپ بھجوایا۔ اور تھوڑی دیر باہر ٹھہر کر پھر کمرے میں آ گئی۔ اس روز اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اور چونکہ سلمیٰ بیگم نے صرف سوپ ہی پیا تھا۔ اس لیے ان کے علم میں یہ بات نہیں آ سکی کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ ورنہ وہ پوچھتیں ضرور۔ یوں بھی اس روز وہ کچھ چپ سی تھیں اور عشاء کی نماز پڑھ کر جلدی ہی سو گئی تھیں۔ مگر بستر میں سویرے گھس جانے کے باوجود وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتی رہی تھی۔

اُف آخر اسے ایک دم ہی کیا ہو گیا تھا؟

وہ کیوں اس قدر غصے میں بھرا پینٹری میں چلا آیا تھا؟

اور سلاد کی پلیٹ کیوں پھینک دی تھی؟

اس پر دھاڑنے کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ خانساماں نے یقیناً اس کی آواز سن لی تھی۔ تبھی تو وہ اس قدر متجسس نظر آ رہا تھا۔

گویا یہاں رہ کر اب نوکروں کی نظروں میں بھی میری وقعت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔ آج خانساماں کے سامنے ڈانٹا ہے تو کل سب کے سامنے بھی بے عزت کر سکتا ہے۔

مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟

سب طرف سے ہو کر بات پھر اس نقطے پر آ ٹھہری۔

اگر ہمدردی کے طور پر بھی کہا تھا تو بھلا یہ بھی کوئی انداز یا طریقہ تھا ہمدردی جتانے کا۔ نہیں نہیں بات کچھ اور ہی تھی۔

شاید یہ اس کی صبح کی گفتگو کا ردِعمل ہوگا۔

سکون سے سوچنے سمجھنے کا موقع ملا ہوگا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ میں واقعی کسی لحاظ سے بھی اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا۔

خیر اگر میرا یہ اندازہ درست بھی ہے تو پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے۔

میں تو خود یہ تہیہ کر چکی تھی کہ اپنے بارے میں اسے ہر بات بتا کر کسی نہ کسی طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑا لوں گی۔ تو اس نے ایسا اہانت آمیز رویہ اختیار کر کے خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ واقعی یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ اس طرح کم از کم میں خود کو اس کی نظروں میں مزید گرانے سے بچ گئی۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر بڑی مضطرب سی کیفیت میں بڑی دیر تک یہ سوچتی رہی۔

حالانکہ بہت پہلے ہی وہ یہ تہیہ کر چکی تھی کہ اسے سب کچھ بتا کر اس سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑا لے گی۔ اس کے باوجود بھی وہ سخت بے کلی کا شکار رہی تھی۔ اصل میں وہ بھی تو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔

شاید اس پہلے شخص کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو پہلی ہی عورت کے دل پر پیار کی دستک دیتا ہے۔

جب کہ اس نے تو دھاندلی کی انتہا ہی کر دی تھی۔ کہ بلا دستک دیے ہی بہت دراز اندر گھس آیا تھا۔

گویا اس کی اس میں سلوط کی لگن بھی شامل تھی۔

اور سلوط جو شروع ہی سے مجبوریوں کا زہر پیتے پیتے خود بھی مجسم مجبوری و لاچاری بن گئی تھی۔

اس کو اپنے دل اور جذبات سے بے دخل کرنے کی کوشش میں خود بھی لہولہان ہوئی جا رہی تھی۔

مگر وہ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک تھی۔

اس نے تو اور بھی بہت سے کاری وار دل پر سہے تھے۔

اور اس سب سے شدید درد کو بھی سینے کا بوتا رکھتی تھی۔

والدین اور بہن کے جانے کے بعد نیلما گھر میں کم ہی ٹکتی تھی۔

وہ صبح کالج جاتی تھی تو کبھی کالج سے سیدھی گھر آجاتی یا پھر سہیل منصور کے یہاں چلی جاتی اور وہاں سے شام کو اس کی واپسی ہوتی تھی۔ کبھی کھانا کھا کر آتی اور کبھی بغیر کھائے۔ اور وہ بھی اس روز ہی آتی تھی جس روز نازو کے آنے کا امکان ہوتا تھا کہ نازو تیسرے چوتھے ہی آجاتی تھی۔ وہ بھی تنہا اور تھوڑی دیر بہن کے ساتھ گپ شپ کر کے چلی جاتی تھی۔ بہت ہوا تو کھڑے کھڑے دادی سے ملنے آگئی ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ تقریباً دونوں ہی بہنیں بھائی کی گھر سے اس لاتعلقی پر سخت شاکی تھیں کہ وہ تو صبح کا گیا رات گیارہ بجے ہی لوٹتا تھا۔ اور جیسا کہ ماں اسے تاکید کر گئی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد چھوٹی بہن کا خیال رکھے تو خیال رکھنا تو کجا اس نے کبھی پلٹ کر بھی چھوٹی بہن کو نہیں پوچھا تھا۔ چچا کے یہاں بھی وہ ایک دو بار ہی گیا تھا۔ وہ بھی کھڑے کھڑے مگر اس شام خلافِ دستور وہ گھر میں ہی نظر آ رہا تھا۔

شاید عام تعطیل کا دن تھا اس لیے۔

نازو بھی کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی۔ نیلما بھی گھر پر ہی موجود تھی اور کوثر آج اس کے یہاں ٹِرے اسپینڈ دن گزارنے کی غرض سے آئی ہوئی تھی اور وہ بھی خلافِ دستور اور اصول۔ ان تینوں کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا اور بہت ہی اچھے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

اور اس کے اتنے اچھے موڈ کے پیشِ نظر ہی بہنوں نے اس کی لاتعلقی اور لاپروائی پر شدید شکوہ کیا تھا۔

سلمیٰ بیگم اب مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھیں۔

نازو جب بھی آتی اتنی عجلت میں آتی کہ دادی کے سلام یا مزاج پرسی کرنے کا بھی اسے موقع نہ ملتا تھا۔ اس لیے سلمیٰ بیگم خود ہی اٹھ کر اس سے ملنے چلی آتیں۔ اس روز بھی وہ اپنے بستر سے اٹھ کر اس کمرے میں آگئی تھیں جس میں یہ سب بیٹھے تھے اور شاید اسفند کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں بیٹھا تھا۔ سلمیٰ بیگم کے آنے کے بعد کچھ دیر تو وہیں بیٹھا رہا پھر رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر فون کرنے کا بہانہ کر کے اٹھا اور سیدھا اس کے رہائشی کمرے میں چلا آیا۔

وہ کچھ دیر قبل ہی مغرب کی نماز ادا کر کے باہر جانے کا قصد کر رہی تھی کہ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے گھومی اور اپنے بیڈ کی طرف پلٹ گئی۔

"ہلو سویٹ ہارٹ!" وہ اس کے کترا جانے کے باوجود سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آیا۔

"کہیے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" اس نے اس کے نزدیک آ کر کہا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے کل شام کے رویے کو اس پر جتانا چاہ رہا ہو۔ اپنی تحقیر کے احساس سے اس کے پورے جسم میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ جی تو چاہا کہ اسے ایسی بے نقط سنائے کہ وہ بھی تمام عمر یاد ہی رکھے۔ لیکن برداشت اور ضبط کے خمیر سے گوندھی گئی تھی۔ اس لیے لبوں پر خاموشی اور ضبط کی مہریں لگائے اس نے تیزی سے پلٹ کر دروازے کا رخ کیا۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے کل کے رویے پر اس سے سخت ناراض ہے۔

اسے احساس تھا کہ اس سے زیادتی ہو گئی ہے۔ بلکہ وہ خود بھی حیران تھا کہ ایکدم ہی اسے کیا ہو گیا تھا۔

ورنہ اماں جان نے تو ایسی کوئی شائبہ لگانے والی بات نہیں کہی تھی۔ جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً ہی جا کر اس بے چاری پر برس پڑا۔

اور اپنی اس غلطی یا زیادتی کی وجہ سے ہی اس روز وہ گھر میں نظر آ رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بھی تمام رات بے چین سا رہا تھا۔

اور اب اسے منانے بلکہ اپنے غیر مناسب رویے پر اس سے معذرت کرنے ہی آیا تھا۔

مگر وہ تو اس کی کوئی بات سننے کی روادار ہی نہ تھی۔

اور بہت تیہا دکھاتی باہر کا رخ کر رہی تھی۔

اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم ویری سوری سویٹ ہارٹ۔ میں اپنے اس رویے پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔" اف پھر وہی سویٹ ہارٹ۔ وہ اس کے بار بار سویٹ ہارٹ کہنے پر کھول ہی اٹھی۔

"آپ ایک ڈیسینٹ انسان ہیں۔ بار بار مجھے ایسے غلیظ القابات سے نواز کر اپنی شرافت کو داغدار نہ کیجیے۔" مگر اس نے اس کی اتنی سخت و سست بات کا ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا اور بڑے مصالحانہ سے انداز میں بولا۔

"اچھا میری قابلِ صد احترام دوست۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ تو کہنے کا موقع دے دیجیے۔"

"میں کچھ سننے کی ضرورت سمجھتی ہوں نہ صفائی ستھرائی کی بلکہ میں تو آپ کے کل کے رویے سے پہلے ہی اپنے آپ کو باور کرا چکی ہوں کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ پلیز آپ میرے راستے سے ہٹ جایئے میں کچھ بھی کہنا یا سننا نہیں چاہتی۔" وہ اس کی بات پر کچھ زیادہ بھڑک کر بولی۔

"اونو۔ یہ کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ جب تک میں اپنے کل کے رویے کی وضاحت نہیں کر لوں گا۔ آپ کے راستے سے نہیں ہٹوں گا نازو بلکہ اب سلیے) اگر اس سلسلے میں مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی تو پھر مجھے میری شرافت کا طعنہ نہ دیجیے گا۔" اس نے اس کے شانے پکڑ کر کچھ اس قدر دھونس سے کہا کہ وہ بھی اس خیال سے ہراساں ہو اٹھی کہ کہیں وہ سچ مچ ہی اپنی کسی بے ساختگی یا بے باکی کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔

"ٹھیک ہے چھوڑیے مجھے اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں جلدی سے کہہ ڈالیے۔" وہ اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹاتی تھوڑا سا پیچھے سرک کر بڑے غیر روادارانہ لہجے میں بولی۔ تو اس نے بھی خود کو تھوڑا سا قابو میں کر کے کہا۔

" میں کل شام اماں جان کے پاس گیا تو ان سے معلوم ہوا کہ آپ کچن میں کام کر رہی ہیں بلکہ آج کل آپ ہی گھر کے بیشتر کام انجام دیتی ہیں۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ نیلما وغیرہ تو ٹھاٹھ سے عیش کرتی رہیں اور آپ مہمان ہونے کے باوجود سب کی خدمت انجام دیں۔ میں ہینڈری میں تھا تو آپ کو کام میں جُتا دیکھ کر معلوم کیوں میرا پارہ ایکدم ہی چڑھ گیا اور بس۔ بہرحال ایک بار پھر میں اپنے رویے پر معذرت پیش کرتا ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ کو قبول کرنی ہوگی۔"

" واہ یہ بھی اچھی زبردستی ہے پہلے جوتے لگالو اور پھر ہاتھ پیر جوڑ کر معافی طلب کرنے لگو۔ اور جوتے بھی ضروری نہیں کہ ہاتھ سے ہی مارے جائیں بلکہ زبانی طور پر بھی مارے جاتے ہیں اور ان کی چوٹ اصل جوتوں کی چوٹ سے بہت کاری ہوتی ہے۔" اس کی نہایت سادگی و صداقت سے کی گئی وضاحت پر اس نے جل کر دل میں سوچا۔ وہی مثل ہوگئی تھی کہ ہمدردی بھی کی تھی تو بالکل نادان دوست کی طرح۔

بہرکیف وہ اس کا راستہ روکے بغیر اس کے جواب کا منتظر کھڑا تھا۔

ادھر کسی بھی لمحے کسی کے آجانے کا احتمال بھی تھا۔

" لیکن ۔ میں ۔ مجھے تو آپ سے کوئی ایسی شکایت نہیں جو معذرت طلب ہو۔" آخر اسے کہنا ہی پڑا۔ اب یہ کہنا کہ جائیے میں نے آپ کو معاف کیا یا میرے دل میں آپ کے رویے کا ذرا بھی ملال باقی نہیں رہا۔ یا ایسی ہی کوئی بات کہنی تو اسے بالکل مناسب ہی نہیں لگی۔

" اچھا اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ کے رُخِ روشن پر یہ اس قدر غیر معمولی صحت مندی کے آثار کیوں نظر آرہے ہیں اور آپ کا رویہ اس قدر بیزار کن سا کیوں ہے؟" اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے قدرے چمک کر پوچھا۔

" نہیں ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔ میرا چہرہ تو کچھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔" وہ مزید تھوڑا سا پیچھے سرک کر بولی کیونکہ وہ بات کی رو میں اس کے کچھ زیادہ ہی نزدیک ہوگیا تھا۔

" نہیں پہلے اپنے منہ سے کہیں کہ میں نے تمہاری معذرت قبول کرلی ہے۔ یا تمہیں معاف کر دیا ہے تبھی مجھے اطمینان ہوگا۔" اس نے ہٹیلے سے انداز کا مظاہرہ کر کے بچوں کو بھی مات کر دیا۔ وہ بھی تنگ آگئی تھی آخر اسے کہنا ہی پڑا۔

" اچھا ٹھیک ہے مجھے آپ کے کل کے رویے پر ذرا سا بھی ملال نہیں اور میں آپ کی معذرت قبول کرتی ہوں۔"

" او گڈ۔ اصل میں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اندر سے یہ ڈر، خوف اور جھجک دور ہو جائے آپ اس گھر میں اپنا ایک مقام بنائیں۔ بہت با رُعب اونچا اور مضبوط۔ اور خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھیں۔ کیونکہ مستقبل قریب میں آپ اس گھر کے وارث کی پراپرٹی بننے والی ہیں اور جانتی ہیں اس گھر کا وارث کتنی زبردست پرسنیلٹی کا مالک ہے۔ کتنا بارعب، ٹھوس اور خود مختار ہے کہ اس کے باپ کی بھی ہمت نہیں پڑتی اس کے کسی معاملے میں بولنے کی۔ اینڈ یُو نو مائی لو (اور جانتی ہو میری محبت) آپ کا یہ خادم ـــ جو چاہتا ہے وہ کرا کے رہتا ہے اور جو کہتا ہے وہ کر کے چھوڑتا ہے اور وہ اپنی نصف بہتر سے بھی یہی ایکسپیکٹ (توقع) کرتا ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح مضبوط اور بہادر بنے۔ آیئے میرے اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ آئندہ آپ میری توقعات پر پوری اُتر کر دکھائیں گی۔" اپنی بات کہہ کر اس نے اس کے آگے اپنا ہاتھ بھی پھیلا دیا۔ اُف! ایک تو وہ باتیں ہی ایسی کرتا تھا کہ اچھے سے اچھا مضبوط قویٰ کا انسان بھی بہک جائے۔ اس پہ اس سے کوئی عہد لینے کے لیے ہاتھ بھی پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ بھی بہت سی مخفی باتوں کا علم اور تجربہ رکھتی تھی۔ اگر اس سے ہاتھ ملایا اور اس نے چھوڑا نہیں بلکہ کھینچ کر اپنے نزدیک کر لیا تو۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس خیال کے آتے ہی وہ بڑی چالاکی سے کام لے کر بولی۔

" مگر قول دیتے وقت ضروری تو نہیں کہ ہاتھ ہی ملایا جائے، میرا مطلب ہے کسی بات کا عہد یا وعدہ کرتے وقت تو انسان کی زبان ہی اس کی سب سے بڑی گواہ ہوتی ہے۔ مگر میں آج آپ کو بہت صاف صاف۔"

" اوہ بھئی یہ اگر مگر تو میرے ساتھ چلے گا ہی نہیں ـــ بس میں انکار سُننے کا عادی ہی نہیں ہوں۔ صرف اقرار اور اثبات میں سُننا پسند کرتا ہوں اور بات کو بار بار دہرانا بھی مجھے زہر لگتا ہے۔ خیر اگر آپ ہاتھ ملانا نہیں چاہتی تو زبان سے ہی اقرار کر لیجیے کہ آئندہ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ بس میرے لیے یہی کافی ہوگا۔"

وہ تو ابھی ابھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دینے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور وہ تھا کہ اپنے آگے کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ کہنے کی اجازت ہی نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ اُلٹا اس سے وعدہ لینے کے درپے ہو رہا تھا۔ کس مشکل میں پھنس گئی تھی وہ۔

جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی وہ۔

کہ ادھر وہ اس سے قول لینے کے لیے ڈٹا کھڑا تھا۔

اور ادھر ہر لمحے کسی کے نہیں تو سلمیٰ بیگم کے آجانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اف بے بسی کی انتہا تھی۔

" اچھا اچھا۔ آئندہ آپ کے حکم کی بجا آوری کو میں اپنا ایمان سمجھوں گی۔" اس نے کہا بھی تو کچھ اس کیفیت میں جیسے سخت چڑ اور عاجز ہو کر

کہا ہے۔

" ہائیں۔ حکم کیسا۔ حکم چلانے کے لیے تو آپ پیدا ہوئی ہیں مجھ پر۔ پھر آپ نے یہ کیا کہہ دیا۔ یوں جیسے میں آپ کو مجبور کر کے کہلوا رہا ہوں۔ دی از نوٹ فیئر (یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے) سویٹ ہارٹ۔"

" اچھا اچھا۔ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ مگر پلیز اب مجھے جانے دیجیے۔ ورنہ کوئی آگیا تو۔" وہ مزید پیچھے سرک کر زچ ہو جانے کے سے انداز میں بولی۔

" اوہ کوئی آگیا تو۔" اس نے مسکرا کر کہا پھر فوراً ہی ایک طرف ہٹ کر بولا۔

" اچھا ٹھیک ہے جائیے چلی جائیے۔" مگر وہ بھی اتنی معصوم نادان نہیں تھی۔ اس کے ارادوں کو بھانپ کر وہ جزبز سی ہو کر بولی۔

" نہیں پہلے آپ جائیے اس کے بعد میں بھی چلی جاؤں گی۔"

" ہاہاہا ـــ جانے کیوں اتنا ڈرتی ہو۔" اس نے شوخ سے معنی خیز انداز میں کہا اور ہنستا ہوا فوراً ہی باہر نکل گیا۔

تب اس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

مگر وہ باہر نہیں گئی۔ کیونکہ وہ تو محض اس سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے باہر جا رہی تھی۔ ورنہ گزشتہ رات سے وہ باہر نکلی تھی نہ اس نے کسی کام کو ہاتھ ہی لگایا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے جب کوثر اس سے ملنے آئی تھی تو اس نے اس سے نازو کے کمرے میں چلنے کے لیے کتنا کہا بھی تھا۔ مگر چونکہ وہ نازو کے سامنے کم ہی جاتی تھی اس لیے اس نے کوئی معقول سا عذر پیش کر کے کوثر کو ٹال دیا تھا۔ تب وہ زبردستی سلمیٰ بیگم کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

وہ چلا گیا تھا تو آج بھی ایک اور موقع کھو دینے پر اسے سخت افسوس ہو رہا تھا۔

آخر اسے اتنی باتیں کرنے کا موقع ہی کیوں دیا۔

کیوں نہ چھوٹتے ہی سب کچھ بتا دیا؟

آخر وہ اس کے سامنے اتنی کمزور کیوں ہو جاتی ہے؟

اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیوں کرتی ہے؟

کیا اس کی چاہت میں واقعی اندھی اور گونگی ہوگئی ہے؟

آخر کیوں اس معاملے کی سنگینی کے بارے میں نہیں سوچتی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اور اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔

مگر جب حقیقت کی آندھی چلے گی تو ان مضبوط جڑوں کو ہی نہیں بلکہ اس کی بھی پوری ہستی کو جڑ اور بنیادوں سمیت اُکھاڑ کر پھینک دے گی۔ اور ذلت و خواری بلکہ رسوائی تمہارا مقدر بن جائے گی تو پھر تم کہاں کی رہو گی۔ لہٰذا دفن کر دو اس کی چاہت کو دل کے ہی کسی نہاں خانے میں۔ اور اس سے پہلے کہ بات مزید آگے بڑھے اسے اپنے کھوکھلے ماضی سے آگاہ کر دو۔

یوں بھی اس کی محبت کا امتحان ہو جائے گا جس کے وہ بڑے دعوے کرتا ہے اور یہ تمہارے حق میں اور بھی اچھی بات ہوگی۔

کیونکہ یہ تو خدا ہی جانتا ہے یا پھر وہ۔ کہ تم پر اپنے سچے جذبوں کے ساتھ مائل ہے یا محض وقت گزاری کے لیے ایک لطیف سا کھیل کھیل رہا ہے ویسے بھی قرین از قیاس تو یہی ہے۔ بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔

ورنہ ایک انگلینڈ ریٹرن اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص وہ بھی ڈاکٹر کو تو ایک سے ایک بڑھ کر حسین۔ دولت مند اور تعلیم یافتہ لڑکی مل سکتی ہے مگر اس کی پسند اور معیار بھی اس کی اعلیٰ شخصیت اور حیثیت کے مطابق ہی ہوگا۔ پھر بھلا وہ مجھ جیسی بے مایہ۔ بے سہارا اور صرف انٹر پاس لڑکی پر بھی فریفتہ ہو سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میری صورت میں اس کے ہاتھ وقت گزاری کا ایک مشغلہ آگیا ہے۔

یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا ہو۔ اور وہ میرے بارے میں غلط رائے قائم کر کے مجھ سے غلط توقعات وابستہ کر بیٹھا ہو۔ اور اپنی جھوٹی محبت کا جال مجھ پر پھینکا ہو۔

اُف نہیں نہیں۔ اب میں اس کی چکنی چپڑی اور پیار کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی باتوں میں نہیں آؤں گی۔ میرے لیے تو وہی ایک ٹھوکر کافی ہے، جس نے میری پوری زندگی پر ہی سیاہیاں پھیر دی ہیں۔ میں کل ہی کسی وقت موقع نکال کر اس سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ وہ میرے راستے سے ہٹ جائے اسے اپنے ماضی کی ایک ایک بات بتا دوں گی۔ بڑی دیر تک ایسی نزاکتوں پر غور کرنے کے بعد اس نے سب کچھ کہہ ڈالنے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر لیا۔

اگلے روز صبح ہی صبح سلوط کو اس سے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ کیونکہ ایک تو وہ آٹھ بجے سو کر اٹھتا تھا پھر اپنی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری میں لگ جاتا تھا۔ اور ایسی الٹی سیدھی حالت میں ہوتا تھا کہ سلوط کو اس کے کمرے میں جانا مناسب نہیں لگا۔ نو سوا نو بجے کے قریب وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلتا اور ناشتہ کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ ماں باپ کی موجودگی میں تو اس کا کچھ یہی معمول تھا لیکن جب سے وہ دونوں عمرہ ادا کرنے گئے تھے وہ ناشتہ اپنے کمرے میں ہی منگوانے لگا تھا۔ اس صورت میں بھلا وہ اس سے بات کرنے کا موقع کیونکر فراہم کر سکتی تھی۔ اب تو اس کی واپسی پر ہی بات ہو سکتی تھی۔

لیکن ادھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ چند روز پیشتر اس نے ایک اخبار میں کسی تجارتی فرم کا اشتہار دیکھا تھا جس میں فرم کو ایک ٹائپسٹ کی ضرورت تھی۔ جو فرم کے کاروباری خطوط اور ڈوکیومنٹس (دستاویز) کو ٹائپ کر سکے۔ ٹائپسٹ کا گریجویٹ ہونا اور انگریزی زبان پر عبور رکھنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اور وہ گریجویٹ تھی نہ انگریزی زبان پر عبور ہی رکھتی تھی۔ پھر بھی ایک امید موہوم کے سہارے۔ اللہ کا نام لے کر اس نے اپنے کوائف سمیت اپنی درخواست اس فرم کو بذریعہ ڈاک بھیج دی۔ اور اس روز اس فرم سے اس کا انٹرویو لیٹر آیا تھا۔ وہ بھی اتنی جلدی۔ یعنی درخواست بھیجنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر۔ جسے دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ گو انٹرویو اگلے روز دن کے دس بجے تھا مگر اپنی اس خوشی میں وہ یہ بات بھول گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے کچھ کہنا سننا بھی۔ بس وہ تو تصور ہی تصور میں اسی فرم میں پہنچ پہنچ جاتی جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا، نہ اس کی لوکیشن (محل وقوع) ہی معلوم تھی تصور ہی تصور میں کبھی خود کو انٹرویو دیتے ہوئے دیکھنے لگتی۔

کبھی انٹرویو کے سلسلے میں جو سوالات کیے جانے والے تھے ان کے بارے میں سوچنے لگتی۔

کبھی انٹرویو پر جانے کے لیے اپنے لباس کا انتخاب کرنے لگتی کہ کیا پہن کر جانا چاہیے۔ کونسا لباس موزوں رہے گا۔

بس سارا دن اس نے کچھ یہی سوچ سوچ کر گزارا۔

رات کو ہی انٹرویو کے موقع پر پہننے کے لیے کپڑے نکال کر استری بھی کر کے رکھ لیے تھے اور لوکیشن کے بارے میں کریم سے معلومات حاصل بھی کر لی تھیں۔ کہ فرم جس جگہ اور علاقے میں واقع ہے وہ کہاں ہے اور وہ فرم صدر کے علاقے میں وکٹوریہ روڈ پر کہیں واقع تھی۔ پتا تو زیر اشتہار کے ذریعے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ مگر کریم سے یہی معلوم ہو سکا تھا کہ وکٹوریہ روڈ صدر کے علاقے میں واقع ہے اور کریم کو چونکہ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس وجہ سے وکٹوریہ روڈ کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ بلکہ اس نے صدر اور بوہری بازار کا نام زینت اور نازش سے بار بار سن رکھا تھا اس لیے اگلے روز وہ جلد جلد تیار ہو کر ساڑھے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور اس نے سلمیٰ بیگم کو رازداری برتنے کی تاکید کر کے عین وقت کے وقت بتایا تھا کہ ٹائپسٹ کی آسامی کے لیے انٹرویو دینے جا رہی ہے۔ سلمیٰ بیگم خود بھی اس کے ملازمت کرنے کے حق میں تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

مین ڈرگ روڈ یا شاہراہِ فیصل گو شہر کراچی کی سب سے زیادہ مصروف ترین سڑک تھی جس پر چوبیس گھنٹے ٹریفک رواں دواں رہتی تھی مگر اس سڑک پر سواری کا حصول بڑا دشوار گزار ثابت ہوتا ہے۔ وہ بھی صبح کے وقت کیونکہ ایک تو زیادہ تر پرائیویٹ گاڑیاں اور بسیں ہی آتی اور جاتی نظر آتی۔ دوسرے اگر ٹیکسیاں یا رکشے بھی گزرتے ہیں تو سب ہی۔ مسافروں سے بھرے ہوئے۔ یہی کچھ حال پبلک بسوں اور ویگنز کا بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی رکشہ پکڑ کر جلد سے جلد اپنی جائے مقصود پر پہنچ جائے کہ وکٹوریہ روڈ پہنچ کر اسے فرم کو بھی تلاش کرنا تھا۔ اور تلاش کرنے میں بھی خاصا وقت درکار ہو سکتا تھا۔ مگر وہاں رکشہ تو کجا کوئی ٹیکسی بھی خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پبلک بس سے چلی جائے اور صدر میں اتر کر کوئی دوسری سواری پکڑ لے۔ کیونکہ بس اسے عین فرم کے آفس تک تو لے جانے سے رہی تھی۔

وہ شعیب منصور کی کوٹھی سے نکل کر سواری پکڑنے گھر سے کچھ فاصلے پر شہر کی سمت آ کھڑی ہوئی تھی اور بس اسٹینڈ وہاں سے کوئی چار فرلانگ کے فاصلے پر ایئرپورٹ کی سمت تھا۔ اور ابھی وہ بس اسٹینڈ تک جانے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ اسفند کی کار گیٹ سے نکلی اور مین روڈ پر آ گئی۔ اس لمحے سوا نو بج رہے تھے اور اسفند کو ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں جلدی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ اصل میں ڈائریکٹر بورڈ کی میٹنگ تھی۔ مین روڈ پر آ کر وہ میٹنگ کے ہی بارے میں سوچتا ہوا پہلے تو اپنی دھن میں آگے نکل گیا۔ مگر پھر اسے ایک عجیب سے احساس نے اپنی محویت سے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے کار کی اسپیڈ ہلکی کر کے ایک لحظے کو پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر کار کو ریورس کر کے سڑک کے کنارے پر کرتا ہوا عین اس کے قریب آ کر رکا اور وہ جو وقت کو اتنی تیزی سے آگے نکلتا ہوا دیکھ کر سخت ہراساں ہو رہی تھی۔ اور اپنی پریشانی میں اس کی کار کو اپنے آگے سے گزرتا دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ ایک کار کو آگے جانے کے بجائے پیچھے کے رخ چلتے ہوئے دیکھا عین اپنے آگے رکتے ہوئے تو بری طرح چونک کر پیچھے ہٹی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر کار میں بیٹھے ہوئے اسفند پر پڑی تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

اور نوکری تو بڑی چیز، اسے اپنے انٹرویو کی بھی چھٹی ہوتی نظر آئی۔ اُف یہ ایکدم ہی کیسے ٹپک پڑا، کیا کچھ دیر بعد یہاں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ وہ سخت کھسیاہٹ کے عالم میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس نے اس کی طرف کی کھڑکی پر جھک کر کہا۔

"آیئے بیٹھیے۔ جہاں جانا چاہ رہی ہیں میں وہیں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر گھر واپس چلی جائے کیونکہ انٹرویو کے لیے جانا اب بے سود ہی تھا کیونکہ ایک تو۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے، دوسرے گھبراہٹ اور پریشانی میں لے دے کر کوئی معقول عذر بھی تو نہیں سوجھ رہا تھا۔ اپنے اسقدر اہتمام سے تیار ہو کر لبِ سڑک کھڑے ہونے کا۔ وہ متامل اور متذبذب سی یونہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بھئی اب یہاں لبِ سڑک کیا کوئی فلمی سچویشن کری ایٹ (پیدا) کرنا چاہ رہی ہیں آپ کہ میں آپ کو زبردستی اندر کھینچوں اور آپ چیخیں چلائیں اب کسی طرح بیٹھ بھی چکیے۔"

اس کی خاموشی پر وہ قدرے چڑ کر بولا۔ گو اس وقت بھی وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ نہیں شکریہ مجھے جہاں جانا ہے میں خود ہی چلی جاؤں گی، یا پھر میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ مگر اس سمے تو اس کی حالت کچھ ایسی تھی جیسے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن تو الگ۔ منہ سے ایک لفظ نکالنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی ہچکچاہٹ کا اظہار کرتی۔ چپ چاپ اس کے قریب بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس نے بھی بڑی خاموشی سے کار آگے بڑھا لی۔ اور پھر کچھ آگے جا کر اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"ہاں تو بتایا نہیں آپ نے کہ آپ کو کہاں ڈراپ کرنا ہوگا؟" تب اس نے اپنی گھبراہٹ پر کسی قدر قابو پا کر آہستہ سے بتایا۔

"وکٹوریہ روڈ۔"

"لیکن وکٹوریہ روڈ تو بہت بڑی ہے۔ میرا مطلب ہے جس جگہ جانا چاہ رہی ہیں اس کا کچھ تیا پتا نشان بھی معلوم ہے آپ کو۔" گو سوال بہت ٹیڑھا تھا لیکن اس نے سوچا جب وکٹوریہ روڈ کا نام لے ہی دیا ہے تو تیا پتا بتا دینے میں مضائقہ بھی کیا ہوگا۔

"ہوٹل جبیں کے قریب ہی کہیں شان ٹریڈنگ کارپوریشن ہے میں وہیں اتر دوں گی۔" آخر اس نے بتا ہی دیا۔ بلکہ دوسرے معنوں میں چونکہ اس پر غصہ اور کھسیاہٹ طاری تھی بس اس لیے وہ کہہ گئی۔

"شان ٹریڈنگ کارپوریشن؟ مگر وہاں کس سلسلے میں زحمت کر رہی ہیں آپ۔" اس نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔ اور وہ جو سخت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ اس کے چبھتے لہجے کو برداشت نہ کر سکی تو صاف گوئی سے کام لے کر بولی۔

"وہاں دس بجے میرا انٹرویو ہے ٹائپسٹ کی آسامی کے لیے۔"

"اچھا تو کیا اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی انٹرویو لیٹر بھی آیا ہوگا؟" اس نے بلا کوئی تاثر دیے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ بغیر انٹرویو لیٹر ریسیو کیے میں انٹرویو دینے کیسے جا سکتی تھی۔"

"اچھا کیا مجھے وہ لیٹر دکھا سکتی ہیں آپ؟" اس نے کہا تو سلوط نے چپ چاپ اپنے پرس سے انٹرویو لیٹر نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دل ہی دل میں اس نے اس بات پر شکر ادا کیا کہ وہ بھی اس کی سروس کے معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اور ادھر اس نے ایک ہاتھ میں اسٹیرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے انٹرویو لیٹر کے لفافے کو اپنے آگے اسٹیرنگ پر رکھ کر لفافے کے کونے پر درج کمپنی کے پتے پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر ہونہہ کہہ کر دوسرا ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹایا اور لفافے کو کئی ٹکڑوں میں چاک کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"ہیں ہیں اوہ یہ کیا غضب کیا آپ نے۔" اس کی اس جنونانہ حرکت پر تلملا کر وہ اپنی جگہ اچک کر بولی۔ رنج و تاسف کے مارے اس کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا۔

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اور میں نے تو صرف انٹرویو لیٹر ہی پھاڑا ہے ورنہ آپ کی جگہ میری کوئی بہن ہوتی تو اس حرکت پر اس کے کان کھینچنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔" وہ بھی نہایت خفگی کے عالم میں بولا۔ تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ واہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک تو چوری اس پر سینہ زوری، وہ بھی تیز و تند لہجے میں بولی۔

"اگر آپ کی بہن ہوتی تو بھائی ہونے کے ناتے آپ کو یہ حق ہوتا کہ آپ اس کے کان کھینچتے یا اسے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتے لیکن میرے کسی معاملے میں آپ کو دخل دینے کا تو کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔"

دل تو بھرا چلا آ رہا تھا۔ آواز بھی رندھ گئی تھی اس لیے چاہنے کے باوجود وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"آپ کے خیال میں مجھے کوئی حق نہ پہنچتا ہوگا مگر میرے اپنے خیال میں تو سارا حق مجھے ہی پہنچتا ہے۔ اور میں نے تو آپ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ آپ سروس نہیں کریں گی۔ پھر آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ آپ نے بالا ہی بالا درخواست بھی دے دی اور انٹرویو دینے بھی چپکے سے گھر سے نکل

کھڑی ہوئیں۔ معلوم بھی ہے یہ کراچی ہے اور یہاں آپ جیسی حسین لڑکیاں منٹوں میں غائب کر دی جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں بھی کی جاتیں تو [illegible] کو پہنچا دی جاتی ہیں کہ پھر وہ گھروں کا رُخ کرنے کے بجائے کوٹھوں کا رُخ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اور آپ کو تو یہاں کے راستوں کا علم [illegible] علاقوں کا۔ پھر بھی آپ تنہا ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ کمال ہے میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اتنی خود سر اور ضدی بھی ہو سکتی ہیں۔ اسفند کو بھی اس کی خود سری پر غصہ آ رہا تھا اس نے اسے بُری طرح لتاڑ کر رکھ دیا۔ مگر اسے تو اس سمے صرف اور صرف اپنے [illegible] ہاتھ سے نکل جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ تو اسے اس کی انٹرویو لیٹر پھاڑ دینے کی حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ واقعی [illegible] وقت کھسیانی بلی ہی بنی بیٹھی تھی۔

"ہونہہ اب اپنی اس مجنونانہ حرکت پر اور کچھ نہیں کہا جا سکا تو اپنی جھینپ مٹانے کو مجھے زمانے کے نشیب و فراز سمجھائے جا رہے ہیں۔ کراچی کے گھناؤنے اور خطرات سے پُر ماحول کا ڈراوا دیا جا رہا ہے۔ یوں جیسے میں بالکل ہی الہڑ، جاہل اور اُجڈ ہوں اور زمانے کی اونچ نیچ سے واقف ہی نہیں، اور اگر کراچی میں لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی اندھیر مچا ہوتا تو پھر عورتوں کے سروس کرنے کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا جبکہ [illegible] کراچی میں تو پچاس نہیں تو چالیس فیصد عورتیں سروس ہی کرتی ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔ اور پھر اسے کیا حق پہنچتا ہے یہ کہنے کا کہ آپ سروس نہیں کریں گی۔ جبکہ میرے ماں جائے نے تو اتنی زیادہ بندشوں اور پابندیوں کے باوجود کھلے دل سے مجھے سروس کرنے کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر فاخرہ کے میکے والوں کے ساتھ تمہارا گزارہ نہ ہو سکے تو کسی ہوسٹل وغیرہ میں رہائش اختیار کر لینا۔ پھر یہ تو میرے لیے بالکل ہی غیر ہے۔ چند روز کی جان پہچان والا۔" یہی سب سوچ کر اس نے چٹختے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں اتنی بے وقوف نہیں نہ جاہل اور اُجڈ کہ اپنی حفاظت بھی نہ کر سکوں اور پھر میرا تو صرف انٹرویو ہی تھا کوئی چارج تو نہیں لینے جا رہی تھی نوکری کا۔ یوں بھی مجھے کسی پر بار بن کر رہنا بالکل گوارا نہیں، خیر یہ ملازمت نہ سہی میں کسی دوسری ملازمت کے لیے کوشش کروں گی۔"

اس کی گفتگو کے ایک ایک لفظ سے اس کے ارادے کی پختگی کا اظہار ہو رہا تھا جسے اسفند نے اس کی سرکشی پر محمول کیا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر بڑے تحمل سے کام لے کر بولا۔

"ہوں تو گویا آپ تہیہ کر چکی ہیں کہ آپ سروس کر کے رہیں گی۔"

"جی بالکل۔" اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔ تو وہ چپ سا ہو گیا۔

"آپ ہی سوچیں میرا اسی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کے بیٹھنا بھی کوئی مناسب بات ہے۔" وہ اس کی خاموشی کو اس کے قائل ہو جانے پر محمول کر کے بولی۔

"نہیں نہیں، بالکل مناسب نہیں۔" اس نے اس کی بات کی تائید میں، مگر عجیب سے انداز میں کہا، اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر کسی خیال سے ایکدم ہی اس کے چہرے پر شگفتگی سی عود کر آئی۔ جس پر سنجیدگی کا خول چڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا اگر آپ سروس کرنے کا تہیہ کر ہی چکی ہیں تو پھر میرے پاس آپ کے لیے ایک بہت ہی ڈلینٹ اور عمدہ کام موجود ہے۔ جس میں رہائش سے لے کر کپڑا لتا اور کھانا پینا بلکہ دیگر ضروریات بھی فری ہی ہوں گی۔"

اور وہ اس کے منہ سے اتنے ڈلینٹ اور اتنی زیادہ مراعات کے ساتھ کسی کام کا سُن کر اندر ہی اندر کھل اُٹھی۔

"اچھا! مگر وہ کس نوعیت کا کام ہے۔" اس نے اشتیاق آمیز تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"اب کام تو کام ہی ہوتا ہے۔ اور انسان جب کام کرنے کی ٹھان ہی لیتا ہے تو کام خواہ کسی نوعیت کا بھی ہو یعنی کٹھن اور محنت طلب ہو یا آسان، اسے کر کے ہی چھوڑتا ہے۔" اس نے قدرے چمک کر کہا۔

"لیکن پھر بھی۔ انسان کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہوتا ہے کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔"

"اسی لیے معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ جس کام کا ذکر کر رہے ہیں وہ کس قسم کا ہے۔" وہ اس کے پہیلیاں بجھوانے کے انداز پر چڑ کر بولی۔

"میرے ساتھ مل کر زندگی کی گاڑی کھینچنے کا۔"

اس نے کہا بھی تو کیا کہ تلملا اٹھنے کے باوجود وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ جبکہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ جس ہسپتال میں وہ کام کرتا ہے شاید وہیں کوئی ایسا کام ہوگا جو یہ میرے لیے مناسب سمجھ رہا ہے۔ مگر اس نے کام کی نوعیت بھی بتائی تو کیسی۔ کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

"کیوں یہ کام کچھ اتنا کٹھن تو نہ ہوگا۔ آپ کے مزید اطمینان کو یہ بھی بتا دوں کہ بیسک اور اسکیل پے کا بھی کوئی جھنجھٹ نہ ہوگا۔ بلکہ تمام روپے پیسے کی مالک آپ ہی ہوں گی۔"

اس نے اسے خاموش سا دیکھ کر ـــ مزید تپایا۔ اُف مذاق بھی حد ہوتی ہے اور پھر بھلا یہ مذاق کا کونسا موقع ہے۔ یہاں دل جلا جا رہا ہے اور یہ ہے کہ جیسے میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے۔ اس نے سخت جزبز ہو کر بڑی جلتی سلگتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ چہرے پر گہری سنجیدگی لیے سامنے ٹریفک کو ہی دیکھتا نظر آیا۔

"ایسے معاملات جن پر دو انسانوں کی زندگی کا انحصار ہو غیر سنجیدگی یا مذاق کی بھینٹ نہیں چڑھائے جاتے۔ بلکہ سنجیدگی اور باہمی اتفاق رائے سے ہی طے ہوتے ہیں۔ اور میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی حد درجے سنجیدگی سے بولا۔ اوہ تو گویا مجھے پرپوز کیا جا رہا ہے۔ اس نے اس کی سنجیدگی سے خائف ہو کر دل میں سوچا مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ یہ تو جو کچھ بھی کہہ رہا ہے۔ اپنی لاعلمی میں ہی کہہ رہا ہے۔ جب اس کے سامنے حقیقت کا پردہ چاک ہوگا تو پھر میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔

"دیکھیں اب تک تو یہی ہوتا رہا ہے کہ میں آپ کی زبان سے جو کہلواتا رہا آپ جبراً یا شرماً حضوری میں کہتی رہیں لیکن یہ معاملہ میں آپ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں مگر ایک اُمید افزا اور مثبت جواب کی توقع کے ساتھ اور میں کوئی اتنی لمبی چوڑی بات بھی آپ سے نہیں پوچھوں گا۔ بس بغیر کسی دباؤ اور ہچکچاہٹ کے صرف اتنا بتا دیجیے کہ آپ زندگی کی رفاقت میں میرا ساتھ دینا پسند کریں گی؟"

اس کی خاموشی اسفند کے لیے بڑی صبر آزما تھی۔ اس لیے وہ اس سے صاف صاف جواب مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ اوہ تو آخر اس نے تمہیں پرپوز ہی کر ڈالا۔ جبکہ تم اس معاملے کو اس نوبت تک پہنچانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ خیر اب بھی وقت ہے سوط! اسے ابھی ابھی سب کچھ بتا دو۔ سوط نے اس کی بات سُن کر دل ہی دل میں خوف کھاتے ہوئے خود سے کہا۔ اور پھر پست سی آواز میں بولی۔

"مجھے سخت افسوس ہے اسفند صاحب کہ اگر میں پسند بھی کروں تب بھی یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا جو آپ چاہ رہے ہیں۔" اور وہ یوں اچھلا جیسے ڈرائیونگ سیٹ میں لگے کسی آٹومیٹک اسپرنگ نے اسے اوپر اچھال دیا ہو۔

"ہائیں کیوں۔ بھلا کس وجہ سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ کیا میرے اندر کوئی خرابی ہے جو آپ مجھے کسی قابل نہیں سمجھتیں۔ ورنہ اس کے علاوہ تو میرے خیال میں کوئی اور وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر آپ اپنی حیثیت سے کمپلکس میں کہہ رہی ہیں تو ـــ"

"نہیں نہیں ایسی تو سرے سے کوئی بات ہی نہیں۔" وہ اس کے تیز لہجے میں کہی بات کو قطع کر کے بولی۔

"تو پھر کیا بات ہے۔ کہیں ممی کے رویے نے تو آپ کو اس قدر بددل اور بدظن نہیں کر دیا۔ یا پھر آپ پھوپھا اور پھوپھی سے خائف تو نہیں۔" وہ بڑے تڑختے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں یہ بات بھی نہیں۔ بلکہ۔ بلکہ اصل میں میں خود اس قابل نہیں ہوں۔"

"یہ بات تو پہلے بھی کئی بار آپ مجھ سے کہہ چکی ہیں۔" اس نے اپنی جھلاہٹ میں اسے آگے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

"نہیں صرف یہی کہہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ میں نے پہلے بھی کئی بار یہ کوشش کی تھی کہ آپ کے مزید آگے بڑھنے سے قبل ہی اپنے تمام حالات سے آگاہ کر دوں۔ مگر موقع ہی نہ مل سکا۔ خیر آج میں آپ کو سب کچھ بتا کر رہوں گی۔"

اپنی بات کہہ کر وہ اسے سب کچھ بتا دینے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ جبکہ اپنے بدنما ماضی کو اس کے سامنے کھولنا اسے ایک کار دارد ہی لگ رہا تھا۔ یوں بھی انسان خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ رہا ہو یا ہو۔ خود اپنے منہ سے اپنی برائیاں بیان کرنا اسے کسی طور پر بھی گوارا نہیں ہوتا۔۔ جبکہ وہ تو من کا سچا تھا۔ سچ مچ ہی اسے بہت محبوب ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اپنی داستان سنائے تو کس منہ سے سنائے، اور کہاں سے شروع کرے کہ تبھی اس نے کہا۔

"لیکن مجھے تو آپ کے تمام حالات کا اچھی طرح علم ہے پھر آپ مجھے مزید کچھ بتا کر کیا کریں گی؟" اُف تو اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اس پر بھی یہ مجھے ـــ نہیں نہیں یہ غلط کہہ رہا ہے اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس کے منہ سے یہ نیا انکشاف سن کر کچھ دیر تک وہ وہم سی کیفیت میں بیٹھی یہی سوچتی رہی۔ اس سمے تعجب، شرمندگی اور بے یقینی نے اسے بُری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"اچھا کیا واقعی آپ میرے تمام حالات سے واقف ہیں؟" اس نے مشکوک لگتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں یا پھر آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بے حد چڑ کر بولا۔

"نہیں نہیں، میرا یہ مطلب تو نہیں۔ بلکہ میں تو یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ میرے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں۔" اسے پھر بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"آخر آپ کا مقصد کیا ہے۔ یہ انتہائی فضول بات پوچھنے سے۔" وہ کچھ بُرا مان کر بولا۔

"کوئی خاص مقصد تو نہیں بس یونہی۔ چونکہ یہ میرا معاملہ ہے نا اس لیے پوچھنا چاہ رہی تھی۔" وہ منمنانے کے سے انداز میں بولی۔

"لیکن نہ تو میرا اس وقت کچھ بتلانے کا موڈ ہو رہا ہے اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے۔ معلوم بھی ہے ٹھیک دس بجے مجھے اپنے بورڈ کی میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے اور صرف دس منٹ رہ گئے ہیں میٹنگ شروع ہونے میں۔ ورنہ اگر اس وقت میٹنگ نہ ہوتی تو پھر یہ پورا دن آپ کے ساتھ ہی گزرتا" اس نے کہا مگر انداز ٹالنے کا نہ تھا بلکہ عاجلانہ سا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتے کرتے صدر کو بھی کراس ـــــ کر گیا تھا۔ مگر جونہی اس کو وقت بتلاتے بتاتے میٹنگ کے اوقات کا احساس ہوا۔ اس نے فوراً ہی کار کو یو ٹرن دے کر گھمایا، اور بہت تیز رفتاری میں گھر کا رخ کیا۔

مگر اس کے دل کو تو ایک دھکڑ پکڑ سی لگ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کس حد تک درست ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے اصل باتوں کا علم ہی نہ ہو۔ اور وہ محض بھائی جان کے حالات کے پیش نظر اتنے دعوے سے کہہ رہا ہو کہ مجھے تمام حالات کا علم ہے۔ لیکن ایک تو وہ بہت عجلت میں تھا۔ دوسرے اگر وہ اس سے اس معاملے میں مزید کوئی سوال کرتی تو سچ مچ بھڑک ہی اٹھتا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ جو اصل اور خاص بات ہے۔ وہ اسے صاف صاف کیوں نہ بتا دے کہ تبھی وہ بولا۔

"حالات بُرے رہے ہوں یا بھلے میرے نزدیک انہیں دہرانا تکلیف کا باعث ہی ہوتا ہے۔ اور پھر میں نے آپ کو صرف پسند ہی نہیں کیا بلکہ پوری صداقت سے چاہا بھی ہے۔ تو پھر اپنے بارے میں آپ کا کچھ کہنا بے سود ہی ہوگا۔"

"لیکن ایک دو باتوں سے شاید آپ اب بھی لاعلم ہیں اور میں..."

"اُفوہ۔ آپ نے تو آج میرا سارا موڈ غارت ہی کر کے رکھ دیا۔ بڑی بے رحم ہیں آپ۔ یا پھر آپ کو مجھ سے۔ اوہ۔ ہاں یہ سب سے اہم بات تو میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ کیا آپ کو بھی مجھ سے کسی قسم کا لگاؤ یا انسیت ہے یا پھر کہیں یہ میرا یک طرفہ جذبہ ہی ہے۔ اب میرے خیال میں تو اتنی سی بات بتانے میں تو آپ کو تامل نہ ہوگا۔ کیوں؟" اس نے اپنی بات کو ایک سوال کی صورت دے ڈالی۔ سوال بھی ایسا مشکل کہ ٹیڑھی کھیر ہی ثابت ہوا۔ اتنا اچھا موقع ملا تھا۔ یعنی کہنے کو تو وہ صاف صاف کہہ سکتی تھی کہ ہاں آپ کا جذبہ یکطرفہ ہی ہے۔ یا پھر اس سے نجات حاصل کرنے کو کوئی ایسی بات کہہ سکتی تھی مگر برا ہو اس دل ناصبور کا جس نے ایسی کوئی دل شکن بات کہنے کی اجازت ہی نہیں دی۔

"وہ جو کہتے ہیں ناکہ خاموشی بھی رضامندی کا ایک اظہار ہوتی ہے تو کیا میں آپ کی خاموشی سے یہی مطلب اخذ کر لوں۔" اس نے اپنے سوال کا جواب طلب کرنے کی غرض سے اتنی تیز رفتاری سے کار چلاتے چلاتے اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی تو اس ڈر سے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے سب کچھ بھول کر اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھیں دیکھیں کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔"

"خدا کرے ہو ہی جائے، وہ بھی میرا مگر آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد ہی ہو۔ تاکہ کسی طرح اس خلش سے تو نجات ملے جو آپ کی بے اعتنائیوں کے نتیجے میں بھگت رہا ہوں۔" وہ اس کے جواب گول کر جانے پر جل کر بولا۔ اور وہ اس کی بات پر ہول اٹھی۔

"اُف توبہ۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا نہ کرے جو آپ کا ایکسیڈنٹ ہو۔ آپ۔ آپ تو منجھلے آقا کے نسل بردار ہیں۔ میری تو یہ دعا ہے کہ میری عمر بھی آپ کو ہی لگ جائے۔" اور جواب میں اس نے ایک قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ہا ہا ہا۔ بس اب مجھے کوئی غم نہیں۔ مجھے میری بات کا جواب مل گیا ہے۔" تو وہ خود اپنی ہی بات پر بری طرح جھینپ کر رہ گئی۔

"ویسے آج میں اتنا خوش ہوں کہ شاید ہی کبھی ہوا ہوں گا۔" اس نے کہا تو سلوط نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ کیونکہ اس کے اس فقرے کا مطلب کچھ وہ سمجھ گئی تھی۔

"معلوم بھی ہے کہ کیوں؟" اسفند نے خود ہی پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" اس نے کہا۔

"کیونکہ میری زندگی میرے ساتھ ہے۔ اب اسے چھوڑ کر واپس جاؤں گا تو ہمیشہ کی طرح خود کو تنہا تنہا نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ اپنی زندگی کا تصور سائے کی طرح میرے ساتھ رہے گا۔" وہ بڑی سرشاری کے عالم میں بولا۔ اب ایسی بات کا جواب یا سوال ہی اس کے پاس کہاں تھا۔ جو وہ کچھ دیتی یا پوچھتی۔ پلکوں کی چلمن گرائے خاموش ہی بیٹھی رہی۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے کسی خیال کے تحت اس پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"پوچھیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"کیا کبھی میرا تصور بھی آپ کے ساتھ رہا ہے؟"

اب بھلا وہ کیسے کہہ دیتی کہ ہاں تصور ہی کیا تم تو میرے خوابوں میں بھی میرے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہو۔ تم تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے جتنا میں تمہیں چاہتی ہوں۔ مگر۔ مگر۔ یہ چاہت صرف میرے دل اور ذات تک ہی محدود ہے۔ تم مجھ سے ایسے سوالات کر کے مجھے بھٹکانے کی کوشش نہ کرو۔ میں تو تم سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔ بہت دور۔ اور تم ہو کہ میرے لیے کوئی

آزمائش ہی کھڑی کر دیتے ہو۔ لیکن یہ سب وہ اس سے کہنے کی ہمت نہ کر سکی کہ یہی تو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور پھر اس نے کتنے چاؤ سے یہ سوال کیا تھا۔ آخر بہت سوچ سمجھ کر بولی۔

"میں نے آج تک اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔ اصل میں سروس کرنے کی دھن کچھ ایسی سوار ہے کہ ہر وقت بس اسی میں الجھی رہتی ہوں۔" اور وہ نجانے کیوں ہنسنے لگا۔

"ہا ہا ہا۔ ٹالنے کا یہ انداز بھی بہت خوب ہے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے ناکہ صورت سائل خود سوال ہوتی ہے، تو آپ کے چہرے کے تاثرات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے رہی سہی کسر آپ کی آنکھیں پوری کر دیتی ہیں۔"

اپنی بات کہنے کے بعد بھی وہ ہنستا رہا۔ اور وہ چور سی بنی خاموش بیٹھی رہی۔ چونکہ گھر نزدیک آ گیا تھا اس لیے پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ اور جب اس نے گھر میں داخل ہو کر کار کو پورچ میں روکا تو اس کا شکریہ ادا کر کے اُترتی ہوئی بولی۔

"دیر تو آپ کو ہو ہی جائے گی لیکن ذرا احتیاط سے گاڑی چلائیے گا۔ یہاں کراچی میں تیز رفتاری بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔"

"اچھا اچھا آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" اور پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر کار کو ایک زبردست اسکریچ دے کر زن سے ہوا ہو گیا اور وہ اس کے خیریت سے اسپتال پہنچ جانے کی دعائیں مانگتی اندر آ گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت باہر مالی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور مالی بھی لان کے کونے میں دور بیٹھا کیاریوں کو گود رہا تھا۔ کریم شاید بازار گیا ہوا تھا اور نیلما کالج۔ ورنہ اسے اس کی کار سے اُترتا دیکھ کر متجسس ہوئے بغیر نہ رہتا۔

وہ اپنے رہائشی کمرے میں آئی تو اس کی اس قدر جلد واپسی پر سلمیٰ بیگم متعجب ہوئے بغیر نہ رہیں۔

"کیوں کیسا رہا تمہارا انٹرویو؟" انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا اور وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ اندر کمرے میں ایک ہستی بھی موجود ہے جو اس کے اس قدر جلد لوٹ آنے پر استفسار ضرور کرے گی۔ اس سے جھوٹ بھی نہ بولا جا سکا۔

"میں انٹرویو دینے جا ہی کہاں سکی اماں جان۔ مجھے تو آدھے راستے سے ہی لوٹا دیا گیا۔"

"ہائیں کیا مطلب۔ تمہیں آدھے راستے سے کیوں لوٹا دیا گیا؟" اور تب اسے اپنے اتنے زیادہ سچ بولنے کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔

"میرا مطلب ہے کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئیں مگر کوئی سواری ہی نصیب نہیں ہوئی تو پھر انٹرویو دینے کیسے جا سکتی تھی۔ آخر تھک ہار کر گھر واپس آ گئی۔"

"اے لو حد کر دی تم نے بیوقوفی کی بھلا کریم سے سواری کیوں نہ منگوا لی۔ وہ تو چھلاوے کی طرح جاتا اور پلک جھپکتے ہی سواری لے آتا۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

جی ہاں ضرور میں اگر کریم سے سواری منگواتی تو وہ آپ کے منظور نظر پہلے ہی سے کر نیوٹا ند کر دیتے میرے باہر جانے پر۔ اس نے جل کر دل میں سوچا۔ اور بولی۔

"جی ہاں۔ بس کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ اصل میں جو چیز نصیب میں نہیں ہوتی وہ کبھی ملتی ہی نہیں۔" وہ ایک شکست خوردگی کے عالم میں اپنے بیڈ پر بیٹھتی ہوئی آزردہ سے لہجے میں بولی۔

"ہاں بیٹے بجا القیاس۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ناکہ ایک در بند تو ستر کھلے تو بس تم اپنی کوشش جاری رکھو۔ اگر یہ نصیب میں نہیں تھی تو اور کوئی نہ کوئی تو ہو ہی جائے گی۔" سلمیٰ بیگم اس کے دل گرفتہ سے لہجے پر اسے ڈھارس بندھاتی ہوئی بولیں۔

"لیکن اماں جان میں نے تو انٹرویو کے لیے جانے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اگر میں اس انٹرویو میں کامیاب نہ ہوئی تو نرسنگ کورس کر کے نرسنگ کا پیشہ اختیار کر لوں گی۔ سنا ہے کہ بڑے اسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کو رہائشی سہولتیں بھی دی جاتی ہیں۔ ورنہ آپ ہی سوچیے۔ انٹر سائنس بھی بھلا کوئی تعلیم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی میں نے اپنے شوق و لگن سے ہی حاصل کی ہے ورنہ ہمارے بھائی جان تو سرے سے پڑھانے لکھانے کے قائل ہی نہ تھے۔" وہ بڑی بے دلی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"تعجب ہے تمہارے بھائی اس قدر قدامت پرست اور غیر ذمہ دار کیوں ہیں جبکہ تم ان کی اکلوتی بہن ہو۔ لیکن یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں دنیا میں ایسا بھی ہوتا آیا ہے۔ یہی شکر کرو کہ تم نے انٹر تک تو پڑھ لیا اور ٹائپنگ شارٹ ہینڈ سیکھ لیا مگر یہ جو نرسنگ کی ٹریننگ کا کہہ رہی ہو تو نرسنگ کا پیشہ ہے تو اچھا اس میں درد مندی اور خدمت خلق کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے لیکن اس میں اسکوپ بالکل نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ نرس سے سسٹر اور ہیڈ سسٹر تک تو ترقی ہو جاتی ہے سب کا درجہ برابر ہی ہوتا ہے اور تم رہائش کے مسئلے پر اتنا زور کیوں دیتی ہو۔ یہ تو مجھ سے لکھوا لو کہ تم لاکھ چاہو بھی تو وہ تم کو کہیں اور رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اے تم کو سمجھانے کے رشتوں کی نزاکت کا تو احساس ہو گا کہ تم ان کی لاڈلی بہن کی نند ہو۔"

"ہونہہ دیکھا جائے گا۔" اس نے بڑی اکتاہٹ سے منہ ہی منہ میں کہا اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے غسل خانہ میں گھس گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اسے انٹرویو نہ دے سکنے پر بہت رنج ہو رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس پر ایک سرشاری کا سا عالم طاری تھا۔

محبت کا نشہ سا طاری تھا۔ یہ احساس کہ وہ اس کی تمام برائیوں یا خامیوں سمیت اسے اس قدر ٹوٹ کر چاہتا ہے کہ اسے اپنا لینے کا تہیہ کر بیٹھا ہے اسے خوشی سے دیوانہ کیے دے رہا تھا گو دل اس بات کو ماننے کے لیے کسی طور پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سچ مچ ہی اس کے تمام حالات سے واقف ہے۔ لیکن اس کے یہ الفاظ۔

"حالات برے رہے ہوں یا بھلے میرے نزدیک انہیں دہرانا تکلیف کا باعث ہی ہوتا ہے اور پھر میں نے تو آپ کو پسند ہی نہیں کیا بلکہ پوری صداقت سے چاہا بھی ہے تو پھر اپنے بارے میں آپ کا کچھ کہنا بے سود ہی ہو گا۔" وقفے وقفے سے اس کے کانوں میں کسی بازگشت کی طرح گونج رہے تھے۔ اور وہ حیرت زدہ ہو کر سوچ رہی تھی۔

تو کیا واقعی وہ اتنا اونچا ظرف رکھتا ہے۔ اس قدر فراخ دل کا مالک ہے۔ پھر بھی اسے کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ جن بندشوں یا مجبوریوں میں وہ جکڑی ہوئی تھی ان کا تو اس نے اشارتاً تو کیا کنایتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ صرف اور صرف اس کا ہاتھ مانگا تھا۔

اس کا ساتھ طلب کیا تھا۔

گو سلوط کے نزدیک یہ بالکل ناممکن ہی تھا۔

پھر بھی کس قدر مسرور اور شاداں تھی۔

سرتاپا اسی کے تصور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اصل میں عمر کا یہ دور جس سے وہ گزر رہی تھی کچھ ایسا ہی جولانی ہوتا ہے۔ اس دور میں دل کو کوئی بھا جائے تو وہ من کا میت ہی بن جاتا ہے۔

اور وہ تو روز اول ہی اس کے من کو بھا گیا تھا۔ جبکہ بہت غلط تاثر کے ساتھ اس کے سامنے آیا تھا۔

اور وہ تو اپنے حالات اور مجبوریوں کی وجہ سے اب تک اس سے ڈرتی ہی رہی تھی۔ اور ہمیشہ احتراز اور گریز سے ہی کام لیتی آئی تھی کیونکہ وہ اس پر ذرا سا بھی اعتماد نہیں کرتی تھی۔ اور آج کی گفتگو کے بعد اگر اعتماد تھوڑا سا بحال بھی ہوا تھا تو بھی وہ محتاط اور گریزاں رہنے پر ہی مجبور تھی۔ یہ تو محض اس کا اپنا جذبہ تھا جو اس کے جذبے کی سچائی سے مات کھا گیا تھا۔ اور جس نے اسے یہ مسرت اور سرشاری بخشی تھی۔

اور خوشی کی یہ کیفیت بھی اس کی اپنی ذات تک ہی محدود تھی۔ کیونکہ اس نے اسے کوئی قول دیا تھا نہ اس ہی بند ملاقات تھی۔ بلکہ معاملہ مبہم ہی چھوڑ دیا تھا۔

پچھلے دو روز سے کراچی کا مطلع ابر آلود تھا۔ یوں تو کراچی کا مطلع اکثر و بیشتر ابر آلود ہی رہتا ہے اور شام کے وقت تو مغربی سمت سے سیاہ سیاہ بادل سے اٹھتے ہیں جن سے ہواؤں میں نمی کا تناسب ضرور بڑھ جاتا ہے۔ مگر وہ بن برسے ہی گزر جاتے۔ یا تیز و تند ہوائیں انہیں اپنے دوش پر اڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد دیکھو تو مطلع بالکل صاف البتہ افق کے کنارے ضرور بادلوں سے ڈھکے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سال کے سارے کے سارے موسم ایک ہی دن میں سمٹ آتے ہیں کہ ابھی تیز دھوپ اور باد سموم اور تھوڑی دیر بعد جو دیکھا تو بارش ہو رہی ہے اور اس کے بعد اتنی ٹھنڈک کہ لحاف رضائی نہ سہی تو چادر ضرور استعمال کرنی پڑتی ہے۔

مگر اس روز کا موسم واقعی آفت سا ہو رہا تھا۔ نازو بھی صبح سے آئی ہوئی تھی کیونکہ احمد سروش اپنے کسی بزنس ٹور پر بنکاک گیا ہوا تھا۔ بہن کے آ جانے کی وجہ سے نیلما بھی اس روز کالج نہیں گئی تھی۔ موسم اتنا خوبصورت ہو رہا تھا اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد کمروں میں آرام کرنے کے بجائے دونوں بہنوں نے لابی میں بیٹھ کر موسم کی رنگینی سے لطف اٹھانے کو ترجیح دی تھی۔ دونوں بہنیں بڑی بوریت محسوس کر رہی تھیں اس لیے نیلما۔ لابی میں فون منگوا کر کوثر کو بلانے کی غرض سے اس سے فون پر بات کر رہی تھی کہ تبھی وہ بھی اسپتال سے اپنی ڈیوٹی انجام دے کر وقت سے ذرا پہلے ہی آ گیا۔ کیونکہ عام طور پر تو تین اور پونے تین بجے کے درمیان ہی لوٹتا تھا۔ مگر اس روز ڈھائی بجے سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ پہلے تو ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ اگر بہنیں کہیں بیٹھی نظر آ جاتیں تو وہ انہیں سلام دعا کر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آتا تھا مگر اس روز نازو کو گھر میں موجود دیکھ کر وہ کھل سا اٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"او ہو تو ہماری پیاری سی بہن بھی آئی ہوئی ہیں۔ مگر یہ کیا بات ہے وہ تمہارے جوڑی دار کبھی تمہارے ساتھ نہیں آتے۔ کیا وہ بہت ہی روایتی قسم کے داماد ثابت ہوئے ہیں؟"

"نہیں بھائی جان احمد تو بڑی ہی اچھی طبیعت اور مزاج کے حامل ہیں۔ وہ تو ہر وقت یہاں آنے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر ہمیشہ کچھ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جب بھی میں یہاں آتی ہوں وہ کہیں نہ کہیں گئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور آج کل بھی بزنس ٹور پر بنکاک گئے ہوئے ہیں۔" نازو بھائی کے اس قدر لگاوٹ سے بات کرنے پر دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ یوں بھی وہ دونوں بہنوں سے کچھ زیادہ ہی اسے چاہتی تھی۔

"ہوں تو یوں کہو کہ جب صاحب بہادر گھر پر نہیں ہوتے تو تم اپنی بوریت مٹانے یہاں چلی آتی ہو۔" وہ معنی خیز سے انداز میں سر ہلاتا ہوا کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھتا ہوا بولا۔

"ارے نہیں بھائی جان ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ گھر میرا میکہ ہے اور وہ گھر میرا اپنا ہے پھر بھلا اپنے گھر میں بوریت کا سوال۔ جب لڑکی ہاؤس وائف ہو جاتی ہے نا تو گھریلو ذمہ داریوں کی انجام دہی میں وقت اسے گزرتا محسوس ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر سچ پوچھیں۔ ——— تو بوریت ہی نہیں بلکہ وحشت تو مجھے یہاں آ کر محسوس ہوتی ہے۔ ممی ڈیڈی کے چلے جانے سے تو یوں لگتا ہے جیسے گھر میں چہار طرف الو بول رہا ہو۔" نازو کی بات کے جواب میں کہا تو اسفند ہنس کر بولا۔

"مگر اس وقت تو چہار طرف تم ہی بولتی نظر آ رہی ہو۔" فقرہ برجستہ تھا۔ نازو ہی نہیں فون کا سلسلہ منقطع کر کے ریسیور کو کریڈل پر رکھتی نیلما بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ اور وہ مسکراتا رہا۔

"ویسے بھی بیس روز تو ہو گئے اب سب کو گئے۔ ممی ڈیڈی تو نہ معلوم کب آئیں گے مگر نیلو باجی کو تو انہیں بھیج دینا چاہیے تھا۔" نیلما ہنس لینے کے بعد بولی۔

"اف وہ نیلو بھی آ ہی جائے گی۔ اب تم نہیں گئیں تو اسے کیوں بلانا چاہتی ہو۔ بار بار تو موقع نہیں آتا نا باہر جانے کا۔" نازو قدرے چڑ کر بولی۔

"ہمیں کوئی لے کر ہی نہیں گیا تو ہم کیسے جاتے۔ ہم تو ویسے بھی ایک فالتو سی شے ہیں۔ ہمارے لیے تو ایسا موقع شاید کبھی نہ آئے گا۔" نیلما قدرے آزردہ ہو کر بولی۔

"چچ چچ۔ ایسی باتیں نہیں کرتے گڑیا۔ اب کہیں باہر جانے کا موقع ملتا ہے تو ظاہر ہے۔ جلوس کی شکل میں تو کوئی نہیں جاتا اور ڈیڈی تو اکثر و بیشتر بیرونی ملکوں کے دوروں پر جاتے ہی رہتے ہیں آئندہ اگر کوئی ایسا موقع آیا تو ہم زبردستی تمہیں ان کے ساتھ بھیجیں گے۔" اسفند نے چھوٹی اور لاڈلی بہن کو آزردہ سا دیکھ کر بڑے دلار سے کہا تو نازو کو بھی چھوٹی بہن کے تنہا رہ جانے پر ترس آیا۔

"اصل میں بھائی جان یہ تنہا رہ جانے کی وجہ سے بور بھی تو بہت ہوتی ہے۔ ممی کبھی انہیں اتنے عرصے تک چھوڑ کر نہیں گئیں۔ اب اگر نیلو بھی آ گئیں تو ممی ڈیڈی تو بہت بعد میں ہی آئیں گے نا؟"

"تعجب ہے یہ تم لوگوں نے تنہائی اور بوریت کو ایک مسئلہ کیوں بنا لیا۔ یہ نیلما ہر وقت تو گھر میں نہیں رہتی۔ بلکہ ان کا زیادہ وقت تو کالج اور چھوٹے آکا کے یہاں ہی گزرتا ہے۔ اور پھر یہ گھر میں تنہا تو نہیں۔ اماں جان ہیں سلوط ہیں اور میں بھی تو موجود ہوں۔" اس نے جان کر دونوں بہنوں کو سلمیٰ بیگم اور سلوط کی موجودگی کا احساس دلایا۔

"اماں جان۔" نازو لپک کے اچکا کے مسکراتی نظروں سے نیلما کی طرف دیکھا لیکن نیلما نے تو اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسفند نے دیکھ لیا۔ اسے اس کی اس دوغلے پن کی حرکت پر غصّہ تو بہت آیا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ ماں کے زیر اثر ہے اس لیے اس نے بھی پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اسے مسکراتا ہوا دیکھ چکا ہے۔ بلکہ بہت ہی سنجیدہ لہجے میں گویا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اماں جان کے پاس کوئی بیٹھ جائے تو بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان کی شخصیت باغ و بہار ہے بلکہ اپنی ذات میں وہ داستانِ میر امن ضرور ثابت ہوتی ہیں۔" اور اس کے اس فقرے پر نازو نے اتنی دیر سے ضبط کی ہوئی ہنسی کو ایک قہقہے کی صورت میں چھوڑا۔ مگر نیلما یا تو اس کی بات کو سمجھی نہیں تھی یا کسی اور خیال میں مگن تھی۔ وہ خاموش ہی بیٹھی رہی اسفند نے نازو کو قدرے فہمائشی انداز میں دیکھا تو وہ اپنی ہنسی روک کر بولی۔

"مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ اتنے عرصے انگلینڈ میں رہ کر بھی آپ اتنی اچھی بلکہ بامحاورہ اردو بولتے ہیں۔" صاف ظاہر تھا اس نے یہ بات اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے کہی تھی جو اس کی ہنسی سے بھائی کے ذہن میں بندھ گیا تھا۔ اسفند بھی سمجھ گیا تھا وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"کیوں کیا انگلینڈ میں رہ کر میرے سینگ نکل آئے تھے جو میں اپنی مادری زبان ہی بھول جاتا۔ بلکہ مجھے تو وہ لوگ بہت ہی چھچھورے اور کم ظرف لگتے ہیں جو یو کے اور اسٹیٹس سے آکر یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے پیدائشی انگریز یا امریکی ہوں جو کھانے پینے میں لباس کے معاملے اور بات چیت کرنے میں تصنع اور دکھاوے سے کام لیتے ہیں۔ ارے بھئی جہاں کی مٹی سے تمہارا خمیر اٹھا جس سرزمین پر تم پیدا ہوئے اور جس گود میں پروان چڑھے اسے بھول کر تم دوسروں کی ریس میں لگ گئے۔ دراصل یہ سارا قصور غلامانہ ذہنیت کا ہی ہوتا ہے۔"

"واو بھائی جان یو آر ویری گریٹ۔ (آپ بہت عظیم ہیں)۔"

نیلما بھائی کے خیالات سُن کر خوشی میں تالی پیٹ کر بولی۔

"خیر گریٹ تو کیا البتہ چھچھورا نہیں ہوں۔" وہ انکسار سے کام لے کر بولا۔

"خدا نہ کرے آپ چھچھورے کیوں ہونے لگے۔ میں تو آپ کے خیالات سُن کر ایک فخر سا محسوس کر رہی ہوں۔" اصل میں نازو جو ذرا مختلف نظریات رکھتی تھی نیلما کے تعریف کرنے پر محض بھائی کو خوش کرنے کی غرض سے بولی۔ وہ بھی جانتا تھا وہ طبیعت مزاج حتیٰ کہ نظریات کے اعتبار سے اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ گمبھیر سے لہجے میں بولا۔

"کسی کی بڑائی یا اچھائی پر صرف فخر کرنے سے کام نہیں چلتا۔ بات تو جب بنتی ہے جب انسان خود بھی ایسی ہی صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میری تمام اچھائیوں کا کریڈٹ اماں جان کو جاتا ہے تو میں یہ کہنے میں ا[illegible] لیے حق بجانب ہوں گا کہ میں نے ان کی تعلیمات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے۔ اور تم نے ابھی جو میری اس بات کا تمسخر اڑایا تھا کہ اماں جان اپنی ذات میں داستانِ میر امن ہیں تو یہ تو خیر میں نے محاورتاً ہی کہہ دیا تھا۔ لیکن حقیقتاً اماں جان اپنی ذات میں ا[illegible] ہیں۔ ایک مکتب ہیں۔ ایک تو انہوں نے اس زمانے میں گریجویشن کیا تھا جب عام تو کیا سرے سے تعلیم نسواں کا کو[illegible] نہ تھا۔ ڈولیوں تانگوں اور سائیکلوں پر پھرنے کا زمانہ تھا۔ اور خواتین کا گھروں سے باہر قدم نکالنا گناہ کبیرہ [illegible] ہوتا تھا۔ اور ایسی ہی بندشوں میں بندھے دور میں انہوں نے بی ایڈ بھی کر لیا تھا۔ اور اس کے بعد تقریباً بیس سال [illegible] مدبگاران علم کو مسلسل درس دیتی رہیں لاکھوں نہ سہی لیکن ہزاروں طلبا اور طالبات کو انہوں نے پڑھایا ہے۔ یہ ہماری [illegible] صاحبہ بھی ان کی شاگرد رہی ہیں۔ اور کوئی نہیں تو کم از کم تم ہی نیلما تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس بیٹھ جایا کرو تو سب [illegible] سیکھ لو گی۔" اس نے نیلما کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات ختم کی تو نیلما جلدی سے بولی۔

"جی ہاں بھائی جان! جب کبھی بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو تھوڑی دیر کو کیا میں تو اماں جان کے پاس کئی کئی گھنٹوں تک بیٹھی رہتی ہوں۔ میں تو ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔" نیلما کی بات پر خوش ہونے یا سراہنے کے بجائے اس نے کہا۔

"ہاں کرنی بھی چاہیے کیونکہ انہوں نے بھی ہماری محبت میں اپنی زندگی تیاگ دی ہے۔ یہ ان کی محبت ہی تو ہے جو ان کا اپنا حق بننے کے باوجود اپنا حصّہ تک نہیں لیا اور ہمارے اتنے منافقانہ رویّے کے باوجود ہم پر اس قدر جان چھڑکتی ہیں۔

تو نازو جو بڑی بیزار سی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی اس نے دل میں سوچا اف یہ بھائی جان تو اماں جان کے چنگل میں اس بری طرح پھنسے ہیں کہ شاید ہی کبھی نکل سکیں۔ وہ بھی تاڑ گیا تھا کہ نازو کو اس کی سلمیٰ بیگم کی شان میں قصیدہ خوانی بڑی ناگوار گزر رہی ہے۔ وہ اسی سے مخاطب ہو کر بولا۔

نیلما تو ابھی خیر چھوٹی ہی ہے لیکن تم تو میری سب سے زیادہ باصلاحیت اور باشعور بہن ہو۔ اور اب تو ایک ذمّہ دار ہستی بھی بن چکی ہو اٹی کیٹس وغیرہ سے تو شروع ہی سے واقف ہو لیکن اب تو تمہیں ہر قسم کے لوگوں سے ڈیل کرنا بھی اچھی طرح آ گیا ہو گا میرا مطلب ہے میں تم سے کم از کم ایسپیکٹ (توقع) ہی نہیں کر سکتا کہ تم اماں جان یا سلوط سے غیریت برت سکتی ہو کیونکہ اخلاق ہی ایک ایسا جوہر ہے جو انسانیت کی معراج کہلاتا ہے۔" وہ بھائی جو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا ایک تو آج اس قدر گھل مل کر باتیں کر رہا تھا اس پر اس نے نازو کے اخلاق اور اوصاف کی تعریف بھی کر ڈالی تھی جس سے آن کی آن میں نازو کے دل میں سلمیٰ بیگم اور سلوط کی طرف سے ابھرا ہوا سارا تکدّر چھٹ گیا۔ یوں بھی انسان خواہ بردبار، باشعور جہاندیدہ اور تجربہ کار ہو۔ اپنی تعریف بھی اس کی ایک کمزوری ہوتی ہے۔ جس سے لاکھ پیچھا چھڑانا چاہے اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جائے اس کے باوجود بھی یہ کمزوری اس کے اندر ہی کسی تہہ میں چھپی رہتی ہے۔

اور نازو تو ایک نوشگفتہ پھول کی طرح تھی۔

کم از کم تعریف کے معاملے میں تو ایک عام سی لڑکی ہی ثابت ہوتی تھی۔ بھائی کی ناصحانہ گفتگو نے اس کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ تعریف نے۔ یوں بھی نیک اور اچھی باتوں کا اثر لینے کی صلاحیّت تو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اس صلاحیّت سے کام لینے کی کوشش نہ کرے۔

سو بھائی کی پُرستائش باتوں کی روشنی میں اس نے بھی سوچا کہ واقعی بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ غلطی ہماری ہی ہے کہ ہم نے خود ہی اماں جان اور سلوط کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ تو ہمارے گھر مہمان کی حیثیّت سے رہ رہی ہیں یہ فرض تو ہمارا ہے کہ ان سے اچھا سلوک روا رکھیں اور چونکہ بھائی نے اس کو ایک ذمّہ دار اور باصلاحیّت ہستی کہا اس لیے خود کو بہت اونچا اور مضبوط محسوس کر کے بولی۔

"نہیں بھائی جان! آپ مجھ سے تو کبھی ایسپیکٹ (توقع) کیجیے گا ہی نہیں کہ میں کسی کے ساتھ بداخلاقی اور بدلحاظی سے پیش آؤں گی۔ وہ اصل میں چونکہ میں اماں جان کا بہت زیادہ ریگارڈ (احترام) کرتی ہوں اس لیے ان کے سامنے زیادہ بات نہیں کرتی۔ اور یہ تو محض اتفاق ہی تھا جو آج میں صبح سے آ گئی ورنہ ہمیشہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ہی آتی ہوں۔ لیکن اماں جان سے ملے بغیر تو نہیں جاتی۔ آخر آل وہ میری دادی ہی تو ہیں۔ اپنی سگی دادی کو ہم نے دیکھا ہے نہ جانتے ہی ہیں۔"

"خیر میرے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ اور کوئی نہیں کم از کم تم تو اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرو جن پر میں فخر کر سکوں۔ گو اب تم پرائی ہو چکی ہو۔ لیکن اس گھر کی بڑی بیٹی اور ایک ذمّہ دار ہستی تو ہو تم حسنِ اخلاق برتو گی تو تمہاری دیکھا دیکھی یہ دونوں بھی بہت کچھ سیکھ جائیں گی۔" وہ ایک لمبی سی جماہی لے کر گویا قصہ کوتاہ کرتا ہوا بولا۔

"جی ہاں جی ہاں بھائی جان یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" نازو کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بولی۔ نیلما اب بھی چپ چپ اور گم صم سی بیٹھی تھی۔ وہ اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"بھئی ہماری یہ گڑیا واقعی سخت بوریت کا شکار معلوم ہوتی ہے۔ —————— کیوں نہ آج اسے لے کر آؤٹنگ پر کہیں چلا جائے کیوں نازو؟"

"ہاں ہاں بھائی جان جیسی آپ کی مرضی۔ مگر میں تو شام کو گھر واپس چلی جاؤں گی۔" نازو بولی۔

"کیوں تمہارے میاں تو بنکاک گئے ہوئے ہیں پھر تمہیں اتنی عجلت کیا ہے گھر جانے کی۔؟" اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"وہ اصل میں گیارہ بجے رات کو احمد کی کال آتی ہے۔ اور میری ساس بھی آج کل پنجاب گئی ہوئی ہیں۔ وہ رات کو میری دونوں نندوں کو گھر پر تنہا چھوڑنا پسند نہیں کرتیں۔" نازو نے بتایا تو وہ کچھ سوچ کر نیلما سے مخاطب ہوا۔

"خیر تم بتاؤ گڑیا تم کہاں جانا پسند کرو گی۔ ہاکس بے۔ سینڈز پٹ۔ کلفٹن بیچ یا پھر کیماڑی سے بوٹنگ پر۔" گو نیلما کا کہیں جاتے

کا موڈ نہیں ہو رہا تھا مگر زندگی میں پہلی بار کتنے دلار سے بڑا بھائی پوچھ رہا تھا اس لیے بوٹنگ کا سن کر وہ گھبرا کر بولی
"نہیں نہیں بھائی بوٹنگ کا تو سوچیے بھی نہیں پہلے ہی گہرے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بس آپ جہاں لے جائیں گے میں وہیں چلی چلوں گی۔"

"بھئی کوثر کو بھی تو ساتھ لے جانا وہ بھی تو شام کو یہیں آ رہی ہیں۔" نازو نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ کوثر کو ساتھ لے جانا تو ضروری ہوگا۔ میرے خیال میں تو سلوط کو بھی ساتھ لے چلو۔ کیونکہ یہ نازو تو نہیں رہیں۔ صرف تین آدمی پکنک کرتے کیا اچھے لگیں گے۔" وہ اتنی دیر سے جس بات کے لیے کوشاں تھا اور زندگی میں پہلی بار بہنوں کے سامنے اتنا بولا تھا آخر وہ بات زبان پر لے ہی آیا۔

"لیکن سلوط آپا جائیں گی ہی نہیں اور یہ بات میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں۔" نازو سلوط کا نام سن کر جلدی سے بولی۔

"کیوں بھئی یہ تم نے اس قدر مشروط طور پر سلوط کے نہ جانے کے بارے میں پیشن گوئی کیوں کر دی؟" اس نے جان کر اپنے سوال کو مزاح کا رنگ دے ڈالا۔

"کیونکہ وہ اماں جان کو تنہا چھوڑ کر جانا کبھی پسند ہی نہیں کریں گی۔ بلکہ جائیں گی ہی نہیں۔ نیپا شاید اسی خیال سے کہہ رہی ہیں۔" نازو کے بجائے نیلما نے بہن کی بات سے کچھ یہی مطلب اخذ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل، اسی خیال سے کہہ رہی ہوں۔ یوں بھی واقعی اماں جان بالکل تنہا رہ جائیں گی۔" نازو نے بہن کی بات کے بعد فوراً ہی اپنی بات سنبھالی۔

"خیر خیر، اماں جان کی فکر نہ کرو۔ ان کی تنہائی کا بھی انتظام ہو جائے گا۔" وہ اماں جان کے تنہا رہ جانے کے مسئلے کی طرف سے لاپروائی کا اظہار کرتا ہوا بولا تو نازو نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ کیسے بھائی جان؟"

"ارے بھئی، مسز رزاق کو ان کی چوکسی پر مامور کر کے جائیں گے ہم۔" وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"مسز رزاق، کون مسز رزاق بھائی جان؟" نازو نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔ تو نیلما جو خود بھی اس کے مسز رزاق کہنے پر الجھ سی گئی تھی، ہنستی ہوئی بولی۔

"یہ مالی کی بیوی کو کہہ رہے ہیں اپیا!"

نازو ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ "واہ بھئی یہ مسز رزاق بھی خوب کہا آپ نے۔" اس نے کہا۔

"او ہو معلوم بھی ہے ساڑھے چار بج رہے ہیں یعنی کہ باتوں میں وقت گزر جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا اب تم جلدی سے چائے لگواؤ۔ اتنے میں بھی ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر اٹھتا ہوا بولا۔ فریش کہنے سے اس کا مطلب نہا دھو کر لباس تبدیل کرنے سے تھا۔

"بھائی جان! بیچ پر شام تک ہی چلیں گے نا آپ؟" نیلما نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ ظاہر ہے۔ کوثر بھی تو شام کو ہی آ رہی ہیں نا۔ اتنے میں تم سلوط کو بھی تیار کر لو۔" اس نے کہا اور پھر سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس کا یہ مقصد جو سلوط کو اپنی فیملی میں ملوانے گھلوانے اور اس کی جھجک اور شرم دور کرانے کے سلسلے میں تھا کسی حد تک پورا ہو گیا تھا۔ کیونکہ نیلما کے بارے میں تو اسے معلوم تھا کہ وہ بہت سیدھی اور صاف دل لڑکی ہے مگر نازو پر ورش یافتہ تربیت یافتہ اور زیر اثر تھی اس کا برین واش کرنا ضروری تھا۔ اور یہ آؤٹنگ پر جانے کا پروگرام جو اس نے بیٹھے بیٹھے بنا لیا تھا۔ وہ چھوٹی بہن کی بوریت دور کرنے یا اسے خوش کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ سلوط پر چھائے ہوئے جمود کو توڑنے اور اس حصار سے جو اس نے اپنی مجبوریوں، اور حالات سے بد دل ہو کر اپنے گرد باندھ رکھا تھا نکالنے کی غرض سے ہی بنایا تھا تاکہ اس کے الجھے ہوئے ذہن اور پریشان خیالات کو سکون اور آشتی نصیب ہو سکے۔

وہ واقعی اسے پوری صداقت اور دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ گو اس نے بھی ایک دنیا دیکھی تھی۔ حسینوں کے درمیان رہ کر ایک عرصہ گزارا تھا اور اپنے وطن میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر مہ جبینوں کو دیکھا تھا۔ جن کے پاس دولت اور تعلیم کے تمغے اور ٹرافیاں بھی تھیں اور ان میں سے کچھ اسے بھا بھی گئی تھیں۔ مگر سلوط کے سامنے دل ہار دینے پر وہ مقولہ

نہیں بیٹھتا تھا کہ دل ہی تو ہے خواہ پری پر آئے یا گدھی پر۔ کیونکہ سلوط اگر لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ایک تھی اور ہزاروں میں ایک ہونے کا محاورہ تو اس کی حسن صورت پر بالکل ٹھیک ٹھیک صادق آتا تھا مگر وہ حسن سیرت میں بھی یکتا تھی۔

خوش سخن،

باوقار

بردبار اور خلیق

باحیا اور خوددار

اس پر وہ دوسروں کی ہمدرد بھی تھی اور مخلص بھی

زندگی میں ہی حالات کا شکار ہو گئی تھی۔ اس لیے بہت دبی دبی، ڈری ڈری اور افسردہ سی نظر آتی تھی اور بس اس کی یہی بات اسفند کو سخت کھلتی تھی کیونکہ ایک تو اس گھر سے اس کا رشتہ ہی ایسا تھا کہ اس گھر میں اسے بڑے ٹھسے سے رہنا چاہیے تھا۔ یا عادت دوسرے اگر ٹھسے سے نہیں بھی رہ سکتی تھی تو گھر والوں کی نظروں میں کچھ تو اپنی حیثیت بنانی چاہیے تھی۔ یہ کیا کہ ہر جا اور بے جا بات پر منہ میں گھنگھنیاں اور سر تسلیم خم۔ جب کہ وہ تو اسے اپنے لیول (برابر) پر لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ کسی ایسی ہی لڑکی کا خواہاں تھا جیسی وہ تھی۔ ہر لحاظ اور اعتبار سے اس کی مرضی کے مطابق۔ تبھی تو وہ پوری سنجیدگی اور سچائی سے اسے اپنانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

وہ بہنوں کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا تو بہت خوش اور مگن سا تھا کہ اس بات کی طرف سے تو اطمینان تھا کہ جب اس نے سلوط کو بھی آؤٹنگ پر جانے کے پروگرام میں شامل کر لیا ہے تو بڑی نہ سہی چھوٹی بہن سلوط کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کر دے گی۔ بلکہ لیے بغیر جائے گی ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہنوں کے ساتھ چائے میں شرکت بھی نہیں کی تھی بلکہ چائے اپنے کمرے میں ہی منگوالی تھی اور اس وقت اپنے کمرے سے نکلا تھا جب کوثر کے آ جانے کی اطلاع ملی تھی۔

اس سمے شام پوری کائنات پر اپنی سنولاہٹیں بکھیر چکی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر لان میں پہنچا تھا نازو اپنے گھر جانے کے لیے پر تول رہی تھی اور کوثر شاید اس ایکا ایکی بن جانے والے پروگرام کے بارے میں نیلما سے تبادلۂ خیال کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی علیک سلیک کے بعد بولی۔

"آپ نے اپنے پروگرام میں سلوط آپا کو شامل کر کے بہت ہی اچھا کیا بھائی جان ورنہ وہ بے چاری تو ہر وقت بوریت کا شکار ہی رہتی ہیں۔"

"نہیں خیر، میں نے تو صرف پروٹوکول (میزبانی کے آداب) نبھایا ہے اور یہ پروگرام میرا تو نہیں تم لوگوں کا ہے۔" وہ نازو کو دکھانے کے لیے یوں بولا جیسے سلوط کو پروگرام میں شامل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

"ہائے تو کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے بھائی جان!" نیلما نے اس کے آخری فقرے کا مطلب کچھ یہی لیا۔

"ہاں بھئی اب یہ ہماری نازو نہیں جا رہیں تو ہم کیا جائیں۔ تم دونوں خود ہی چلی جانا۔" وہ جواب میں روکھا سا منہ بنا کر بولا تو کوثر ہنسنے لگی۔

"ہائے یہ نیلما آپا تو واقعی بہت انوسنٹ (بھولی) ہیں۔" اس نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں یہ تو ہے سدا کی بدھو۔ جبھی تو آتنا بھی نہیں سوچا کہ بھائی جان کے بغیر اتنی دور اکیلی دو لڑکیاں ڈرائیو کر کے کیسے جا سکتی ہیں۔" نازو نے بڑے دلار بھرے انداز میں نیلما کی بے وقوفی کو جتایا تو اسفند ہنسنے لگا۔

"یہ تم پر جانے کی اس قدر عجلت کیوں سوار ہے نازو۔ ابھی تو صرف سات ہی بجے ہیں۔ اور ویسے بھی ہم وہاں سے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے تک لوٹ آئیں گے۔ یعنی صرف گیارہ تک۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلی چلو۔" وہ نازو سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اف نہیں نہیں۔ مجھے تو معاف ہی کر دیجیے۔ یوں بھی احمد کے بغیر انجوائے نہ کر سکوں گی۔" نازو یوں بدک کر بولی جیسے اس نے کوئی بہت ہی غیر ممکن بات کہہ دی ہو۔

"او ہو تم تو خاصی شوہر پرست ہو گئی ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔

"صرف شوہر پرست ہی نہیں بلکہ فرض شناس بھی۔" وہ بھی ہنس کر بولی۔ اور سب سے رخصت ہو کر جانے لگی تو کار میں بیٹھتے بیٹھتے کچھ یاد کر کے اس نے کہا۔

"اوہو میں تو بھول ہی گئی۔ وہ کل رات ممی کی کال آئی تھی ڈیڈی کسی بہت ہی ضروری کام کی وجہ سے اب تک جلّہ میں تھے۔ آج وہ وہاں سے مکہ معظمہ روانہ ہوگئے ہوں گے۔"

واہ بہت جلد یاد آیا آپ کو۔ یعنی اس کا مطلب ہے کہ ابھی ایک ماہ کا عرصہ اور لگے گا نیلو باجی کی واپسی میں۔"

"نہیں خیر۔ ایک ماہ تو نہیں مگر نصف ماہ ضرور لگے گا۔ مگر تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ ہفتے عشرے تک تو میں روزانہ آ کر بہلا جایا کروں گی۔" تازو نے کہا اور پھر کار میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

"ہاں تو بھئی ساری تیاری تو مکمل کر لی ہوگی تم دونوں نے۔" اس کے جانے کے بعد اسفند نے کوثر اور نیلما کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہائیں کیا کچھ تیاری بھی کرنی تھی مگر میں نے تو خانساماں سے کچھ بھی نہیں بنوایا۔" نیلما متردد سی ہو کر بولی۔

"یعنی آج جانے کی خوشی میں تم نے کچھ پکوایا بھی نہیں گھر میں۔" اسفند نے پوچھا۔

"نہیں خیر، کھانا تو پک رہا ہے مگر ساتھ لے جانے کے لیے تو کچھ بھی نہیں بنوایا میں نے۔" نیلما بولی۔

"اوہو تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ بھئی، ہم کسی ریسٹورنٹ یا سنیکس بار سے کھانے پینے کے لیے کچھ لیتے چلیں گے۔" کوثر نے رائے پیش کی۔

"ہاں بس یہی ٹھیک ہوگا۔" اسفند بولا۔

"تو پھر تیار ہو جاؤ۔ یوں بھی رات ہونے میں کسر کیا باقی رہ گئی ہے۔ شام تو ڈاکٹرز لفٹ دینے والے مہمان کی طرح ہی آتی ہے یعنی ایک گھنٹہ بارہ منٹ پر مشتمل ہوتی ہے۔" اسفند نے کہا۔

"ہم تو بالکل تیار ہیں۔ بس آپ کا انتظار تھا یا پھر۔" کوثر نے کچھ کہتے کہتے حسبِ عادت زبان دانتوں میں دبا لی۔ وہ سمجھ تو گیا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے مگر اس نے کوئی استفسار نہیں کیا۔

"پھر تو جاؤ کار میں جا کر بیٹھو۔ اتنے میں بھی ذرا یہ جیکٹ تبدیل کر کے آتا ہوں۔" اور اپنی بات کہتے کہتے وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو پچھلی سیٹ پر نظر پڑتے ہی یکبارگی اس کا دل اس بری طرح دھڑکا کہ ایک لمحے کو تو وہ اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ مگر پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کار میں آ بیٹھا۔ اس کی موجودگی کے احساس سے اس کے سینے میں انبساط اور جذبات کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ وہ عین اس کے پیچھے ہی بیٹھی تھی اور بیک ویو مرر میں سڑک پر رواں ٹریفک کی روشنیوں میں اس کا حسین سا مکھڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ نظر باز تو نہیں تھا لیکن جذبۂ بے اختیار بار بار اسے ویو مرر پر ایک نظر ڈالنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس لمحے وہ بالکل خاموش اور کھویا کھویا سا تھا جبکہ کوثر اور نیلما آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ نیلما اس کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور کوثر پچھلی سیٹ پر سلوط کے پاس اور نہ معلوم سلوط کے کان میں کیسے چٹکلے چھوڑ رہی تھی کہ وہ کبھی خفگی سے اس کی طرف دیکھتی اور کبھی مسکرانے لگتی۔ اسے کچھ کچھ احساس ہوگیا تھا کہ کوثر ان دونوں کے تعلق کو تاڑ گئی ہے۔

بہر حال راستے میں اس نے ایک بڑے ریسٹورانٹ سے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ لیمنیڈ اور کوک کی آدھی کریٹ بھی ڈکی میں رکھوائی اور کئی قسم کے پھل بھی اور پھر مختصر سا قافلہ سیدھا سینڈز پٹ جا پہنچا۔

چاندنی رات تھی۔ گو چودھویں کی شب نہ تھی مگر چاند کی گیارہ یا بارہ تاریخ ضرور تھی اور سمندر شیتل سی چاندنی کے پُر بہار ماحول میں پر مرمٹنے کی کوشش میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اڑا کر لے جانے والی بھیگی بھیگی مگر ٹھنڈی ہوائیں بلکہ تا حدِ نظر۔ کھلا اور روشن روشن سا آسمان اور پیروں کے نیچے گیلی گیلی ریت۔ ساحل سمندر تک دور دور پھیلی سیر بینوں کی ٹولیاں اور عقب میں دور تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہٹس کا سلسلہ۔ یہ سب بڑا کیف آگیں سا لگ رہا تھا۔

سمندر چونکہ رف (متلاطم) تھا اس لیے اسفند نے کوثر اور نیلما کو پانی میں آگے تک جانے کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ چاروں ان حدود میں کھڑے ہو گئے تھے۔ یہاں لہریں ان کے پیروں میں لوٹ لوٹ کر جا رہی تھیں۔ ان کے ٹخنوں کو چھو کر گزر رہی تھیں اور وہ اس بات پر خوش تھا کہ سلوط کی آج وہ بجھی بجھی سی کیفیت نہیں تھی۔ ایک سرے پر وہ کھڑا تھا اور دوسرے سرے پر سلوط اور بیچ میں کوثر اور نیلما اور وہ دھیمی دھیمی سی آواز میں مسلسل کوثر سے باتیں کیے جا رہی تھی۔

اس کے حسین چہرے پر مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔

وہ کوثر سے مخاطب ہونے کے بہانے گاہے گاہے اسے ضرور دیکھ لیتا تھا۔

پھر اسی ترتیب میں جس میں وہ چاروں کھڑے تھے وہ بڑی دیر کنارے ہی کنارے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چہل قدمی کرتے رہے۔ نیلما بھائی کی وجہ سے کم ہی بات کر رہی تھی مگر کوثر تو مسلسل ٹیپ کی طرح بجے چلی جا رہی تھی۔ وہ کینیڈا کے شہروں کے ساحلوں اور وہاں ہونے والی رونق اور گہما گہمی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے آٹھ یا نو سال کی عمر میں پیراکی کے ایک مقامی مقابلے میں میڈل جیتا تھا۔ اس کے بارے میں بتا رہی تھی اور نیلما اپنے پیراکی کے انتہائی شوق کا جواب ایک حسرت میں تبدیل ہو گیا تھا بار بار ذکر کر رہی تھی اور وہ دونوں کی باتیں سُن سُن کر صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔ جب کہ اسفند ذہنی طور پر اس لمحے وہاں سے غیر حاضر ہی تھا۔ اس کے سینے میں اس کے سچے جذبات کی شوریدہ سری اس بپھرے سمندر سے بھی کہیں زیادہ سرکشی دکھا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلوط کا ہاتھ پکڑ کر اسے کسی تنہا گوشے میں لے جائے اور پھر اپنا سینہ چاک کر کے اسے اپنے جذبے کی صداقت کا یقین دلائے کیونکہ اس روز کار میں سلوط نے اس کی باتوں کے جواب میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ اس قدر مبہم تھا کہ اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

یا اس کا جذبہ تشنہ ہی رہ گیا تھا اور جب وہ ٹہلتے ٹہلتے عاجز آ گیا تو اس نے رُک کر کہا۔

"بھئی، اب کچھ کھاؤ پیو گی بھی یا آج صرف سمندر کی اس گیلی اور کھاری ہوا سے ہی پیٹ بھرو گی۔ ویسے بھی نو بج چکے ہیں۔" اور تب دونوں لڑکیاں جو خود بھی بہت بھوک محسوس کر رہی تھیں مگر شرم و لحاظ میں اس سے نہیں کہہ سکی تھیں فوراً اپنی کار کی طرف بڑھ گئیں جو ہٹس کے عقب میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اصل میں ان لوگوں نے اب تک کھانے پینے کی اشیاء ڈکی سے نہیں نکالی تھیں۔

"میرے خیال میں تو میں کریٹ اٹھا لیتا ہوں اور تم دونوں یہ پھل اور سنیکس اٹھا لو۔ پھر آرام سے بیچ پر بیٹھ کر کھائیں گے۔"

"اوہ سپرب۔" کوثر نے اس کے مشورے کو سراہا اور پھر وہ ساری چیزیں لے کر سمندر کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ریت پر جا بیٹھے۔ بچھانے کے لیے بھی کوئی چیز لانا بھول گئے تھے۔ اس لیے تھیلیاں اور پیکٹس گود میں رکھ کر کھانے پینے لگے۔ کافی اسنیکس، پھل اور بوتلیں بچ گئی تھیں۔ اب انہیں پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جب کہ کوثر کا کہنا تھا کہ یہ باقی ماندہ چیزیں بھی ہم وقفے وقفے سے چٹ کر جائیں گے۔

وہ کھانے کے بعد اٹھ کر چہل قدمی کرتا ہوا دور نکل گیا۔ تو تھوڑی دیر بعد دونوں لڑکیوں کو بھی ادھر اُدھر پھر کر تفریح کرنے کا شوق چرایا۔ مگر چونکہ ساری چیزیں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور انہیں چھوڑ کر وہ تینوں کہیں گھوم پھر بھی نہیں سکتی تھیں۔ کیونکہ کریٹ اور بوتلیں کرائے پہ لی گئی تھیں۔ اگر کوئی لے کر چلتا بنتا تو۔ تو اسفند کے خفا ہونے کا خدشہ زیادہ تھا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر کوثر نے جب مشورہ دیا کہ یہ ساری چیزیں چل کر ڈکی میں رکھ آئیں تو سلوط بولی۔

"نہیں اب یہ ساری چیزیں لاد کر کار تک جانے کی کھکیڑ کیوں کرتی ہو۔ ایسا کرو تم دونوں گھوم پھر آؤ۔ میں تو ویسے بھی زیادہ گھومنے پھرنے کی عادی نہیں ہوں۔ اور آج تو تمہارے ساتھ واک کرتے کرتے بالکل تھک گئی ہوں۔" تو دونوں ہی تھوڑے سے تکلف کا مظاہرہ کرنے کے بعد اُٹھ کر گھومنے پھرنے چل دیں۔

"دیکھو بھئی زیادہ دور مت جانا۔ آج کل۔" اس نے ان دونوں کے تنہا ہونے کی وجہ سے تاکید کرنی چاہی تو نیلما بولی۔

"نہیں ہم تو خود سخت ڈرپوک ہیں۔ بس وہ سامنے تک جا رہے ہیں آپ اطمینان رکھیے۔" اور پھر وہ دونوں چلی گئیں۔ تو وہ اپنی شل ٹانگوں کو آرام پہنچانے کی خاطر ریت پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ خود اس پر بھی اس سمے ایک سرشاری کا سا عالم طاری تھا۔ وہ اس کی خاطر میں کیسا بچھا جا رہا تھا۔

کس طرح اصرار کر کر کے اسے چیزیں کھلوا تا رہا تھا۔

کس قدر امپورٹنس (اہمیت) دے رہا تھا کہ نیلما بھی اس کی خوشامد کرتی لگ رہی تھی۔ اور کوثر شوخ اور معنی خیز مسکراہٹیں اس کی طرف پھینک رہی تھی۔

اور پھر وہ ایسی نادان اور بھولی بھالی تو نہیں تھی۔ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ محض اس کو تفریح کرانے کی غرض سے اس نے یہ پروگرام بنایا ہے۔ اس نے جینز پہ کھلے گلے کی زرد نیم آستین کی ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ جس میں وہ اپنی اُجلی اُجلی رنگت اور کسرتی اور پرکشش سے جسم کے ساتھ سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔ اس کے دل میں اُترنے کو مچل رہا تھا۔

وہ اسی کے حسین سے تصوّر میں سر تا پا غرق سی بیٹھی تھی۔ کہ دفعتاً کان کے قریب ہی اس کی حیات بخش آواز گونجی۔

"نیلو۔ کیا ہو رہا ہے۔" تو وہ اپنی اتنی حسین سی محویت سے اس بری طرح چونکی تو بوکھلاہٹ میں اس کے منہ سے نکلا۔

"کو— کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں خیر کچھ تو—" وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب ہی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گیا۔ اور کہنی ریت پہ جما کر اپنی کنپٹی کو ہتھیلی پہ ٹکا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے کسی سوچ میں گم تھیں آپ۔" تو اُس کا دل چاہا کہے کہ تمہارے علاوہ اور کس کی سوچ میں گم ہو سکتی ہوں۔ مگر اس کی قربت سے پریشان ہو کر اُس نے تھوڑا پیچھے سرک کر پیر سمیٹ لیے اور پست سی آواز میں بولی۔

"نہیں تو—" مگر سمندر کی شوریدہ سر لہروں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہواؤں کے شور میں شاید اس نے سنا ہی نہیں۔ دانستہ اسے تنہا دیکھ کر یا موقع پا کر اس وقت اس کے پاس نہیں آیا تھا— بلکہ اس خیال سے آیا تھا کہ لڑکیاں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی ہوں گی۔ انہیں بھی گھومنے پھرنے کا موقع دینا چاہیے۔ اب یہ اس کے خیال میں اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ تنہا اُسے مل گئی تھی۔ یعنی جس بات کی وہ اتنی دیر سے شدید خواہش یا تمنا کر رہا تھا وہ پوری ہو گئی تھی۔

"یہ دونوں کہاں ہیں۔؟" اُس نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہاں سامنے کھڑی ہیں زیادہ دور نہیں گئیں۔"

"اگر نہ بھی جاتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔" وہ اُس کی بات کے کچھ اور ہی معنی لے کر بولا۔ اور وہ جواب دینے کے بجائے اس پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

وہ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا— نگاہوں میں کچھ ایسی تپش تھی کہ وہ اتنے ٹھنڈے ماحول میں بھی پسینے پسینے ہوئی جا رہی تھی۔

دھڑکنیں الگ بے طرح منتشر ہو گئی تھیں۔

اور وہ تھا کہ بالکل خاموش اور گنگ سا— شاید اُس پر سے نظریں ہی ہٹانا بھول گیا تھا۔ اور گھٹنے اونچے کیے۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے بت بنی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کا شمار کرنے میں کوشاں تھی۔

وہ اس قدر قریب تھا۔ اس لیے تشنہ جذبوں کی یورش نے اُسے ایک عجیب سی بے کلی میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور ادھر وہ بھی— اپنے جلتے سلگتے وجود کو ریت کی نم آلود ٹھنڈک سے آسودگی پہنچانے میں کوشاں تھا۔

دونوں کے لب سلے ہوئے تھے۔

مگر دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔

اور آنکھیں— جذبوں کی ترجمان بنی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دوسرے سے اُلجھ الجھ سی جاتیں۔

کہ— محبت میں کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں خاموشی زبان بن جاتی ہے اور آنکھیں جذبوں کی ترجمان۔ دل کی نامہ بر—

لیکن وہ اُس کی طرح جذبوں کی یورش سے پاگل نہیں ہوئی تھی—

بلکہ نزاکتوں کا تھوڑا بہت احساس ضرور تھا۔ پھر بھی وقتی تاثر اور موقع کی رنگینی کی وجہ سے وہ اس کی نگاہوں سے چھلکتے جذبوں کی لپیٹ میں بے طرح آ چکی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جونہی ارادی اور غیر ارادی طور پر نظر اس کی طرف اُٹھتی وہ یا تو فوراً پلکوں کی چلمن گرا لیتی یا پھر نگاہیں کترا کر کسی اور طرف دیکھنے لگتی۔

اور ادھر وہ تھا کہ—

نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے اس کے پورے وجود سمیت اپنے اندر اُتارنے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ اور جواب میں وہ نگاہوں کی زبان میں بات کرنے سے بھی گریز کر رہی تھی— اور نگاہیں جھکائے ریت پر اپنی سفید سفید مخروطی انگلیاں پھیرے جا رہی تھی۔

"میں آپ کے اس گریز کو کیا معنی دوں— کیا سمجھوں سلوط— سب کچھ تو آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اب کیا چہرے یا چاقو سے اپنا سینہ چاک کر کے اپنا دل بھی دکھا دوں— جس میں خون کے بجائے آپ کی محبت دوڑ رہی ہے۔ آخر کچھ تو کہیں کچھ تو بولیں مجھے یہ خاموشی کی مارکیوں دے رکھی ہے۔؟"

اف اس کے لہجے سے ایک کرب سا نمایاں تھا— مگر وہ جواب میں کیا کہتی— مجبوری کے شکنجے میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی— اُس کی باتوں سے دل کی جو حالت ہو رہی تھی وہ تو وہی بخوبی جانتی تھی— لبوں پہ خاموشی کی مہریں لگائے ریت پہ انگلیاں پھیرتی رہی کہ اگر لب کھولتی تو محبت کا سارا فسوں ہی ٹوٹ کر بکھر جاتا— البتہ نگاہوں میں ہزاروں شکوے مچلنے لگے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی خاموشی اور گریز کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے۔ تب اس نے ایک دم ہی ریت میں انگلیاں پھیرتے اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جیسا کہ آپ کے بقول آپ اس معاملے کو مذاق پر محمول کرتی آئی ہیں تو یہ ہرگز ہرگز کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے سچی اور ٹھوس— یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ سوئیٹ ہارٹ! میں آپ کو پوری سنجیدگی اور عقل و ہوش کے ساتھ اپنانے کا تہیہ کر چکا ہوں— اور میں ایک بار جس بات کا تہیہ کر لیتا ہوں—" تب دل میں اٹھتی درد کی شدید لہر کو دبا کر اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ قدرے تیکھے اور رشاکی سے انداز میں بولی۔

"تعجب ہے آپ میری مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس پر بھی آپ اُلٹا مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے اُس نے اُس کی گرفت سے اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا تھا۔

"اُفوہ— یہ مجبوریوں کا رونا آخر آپ کب تک روتی رہیں گی۔ دیکھیں انسان جتنا مجبوریوں کو اپنے اوپر حاوی کرتا رہتا ہے وہ اسی قدر اسے جکڑے چلی جاتی ہیں۔ ساری بات ہمت اور حوصلے پہ منحصر ہوتی ہے۔ آپ بہادر بنیے تو مجبوریوں کے شکنجے سے خود بخود ہی آزاد ہو جائیں گی۔" اُف تو کیا واقعی اُسے کچھ بھی نہیں معلوم— اُس کی باتوں کی روشنی میں اُس نے اندر ہی اندر ہراساں ہو کر سوچا— اور سوچ ہی رہی تھی کہ جواب میں کیا کہے کہ اس نے پھر کہا۔

"مگر آخر وہ ایسی کیا مجبوری یا مجبوریاں ہیں— بس یہی بات تو ہے نا کہ پھوپھا جان نے کوئی ناجائز کاروبار کیا تھا جسے ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا اور یوں اُن کے شریک کار اُن کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے انتقام کا نشانہ آپ کو بنایا اور آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کی— بلکہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ مگر پھوپھا جان نے اپنی جان پر کھیل کر آپ کو وقت سے پہلے ہی ان کے چنگل سے آزاد کرا لیا— یہی بات تھی— جسے میں محض آپ کی دل آزاری کے خیال سے آپ کے روبرو بیان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر آپ نے آج مجھے کچھ مجبور ہی اتنا کر دیا۔؟"

اُف تو اسے واقعی کچھ بھی نہیں معلوم جو معلوم بھی ہے تو وہ محض جھوٹ ہے۔ کینہ پرور اور حاسد لوگوں کی بنائی ہوئی ایک من گھڑت داستان ہے۔

"خیر اب تو ہر بات کلیئر (صاف) ہو چکی ہے— اب میں نہ آپ کی خاموشی کی پروا کروں گا— نہ شرم یا شرمندگی کی— بس ممی کے آتے ہی ان سے آپ کو مانگ لوں گا— سمجھیں آپ—"

اف یہ کہہ کر تو جیسے اُس نے اُس کے سر پہ ایک بھالا سا دے مارا تھا— اگر اُس نے واقعی اپنی ماں سے یہ کہہ دیا کہ میں سلوط سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں— یا شادی کر رہا ہوں تو سچ مچ ایک قیامت ہی آ جائے گی۔ جس سے اور کسی کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی— ایسی ذلیل و خوار ہوں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گی۔ اور اس گھر سے تو نکالا ہی مل جائے گا— تو پھر میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ کہاں جا سکوں گی میں—

کیا اسفند کے بقول کوٹھے پہ—

اُف نہیں نہیں— ایسی کوئی نوبت آنے سے تو بہتر یہی ہے کہ اپنی اس قدر شدت سے چاہنے والی محبوب ہستی کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں— اس طرح اتنا تو ہوگا کہ میں رسوائی سے بچ جاؤں گی اور کسی کی نظروں میں ذلیل و خوار نہیں ہوں گی— اتنا ہی تو ہوگا نا کہ یہ مجھ سے بدظن اور متنفر ہو جائے گا— اور ہمیشہ کے لیے میری محبت سے دستبردار بھی— اف اپنی محبت کو—

اپنی جان سے زیادہ عزیز شے کو کوئی اپنے ہاتھوں تو قتل نہیں کرتا—

مگر سانسوں کی زد سے گزرتی ہوئی سلوط اس سفاکی کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی— سچ بات کہنا اور حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا—

بلکہ مصلوب کیے جانے کے عمل کی طرح ہی سخت و دشوار گزار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ بڑی پر امید اور اشتیاق بھری

نظروں سے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں سے شروع کرے۔
کن الفاظ میں کہے۔
اور کس زبان سے کہے۔
کہ تبھی کوثر نے کھنکار کر اپنی اور نیلما کی آمد سے انہیں مطلع کیا۔
اور ایک بار پھر سنسناتی ہوئی گولی کان کے قریب سے گزر جانے پر وہ اپنی قسمت کو کوستی رہ گئی۔
مگر اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ اس بار یا اُس بار وہ ساری حقیقت اس پر عیاں کر کے رہے گی۔
اس طرح اس کے اتنے شدید جذبے اور ظرف کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اسی خیال اور تہیے کے تحت گھر آ کر بھی وہ اُسے سنانے کے لیے اپنے حالات اور واقعات کے اُلجھے اور بکھرے سرے جوڑتی رہی۔

دن کے پانچ بجے کا عمل ہے۔
پرانی طرزِ تعمیر پر بنے ہوئے ایک حویلی نما مکان کے عقبی صحن میں چھڑکاؤ کیے جانے کی وجہ سے جگہ جگہ پانی چمک رہا ہے۔ صحن بہت وسیع اور کشادہ ہے اور گرد و پیش بارہ فٹ اونچی دیوار جس کی منڈیر پر ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور کانچ کے ٹکڑے گرتی ہوئی دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ صحن کی عقبی سمت ایک بڑا سا لکڑی کا پھاٹک ہے جو عام طور پر بند ہی رہتا ہے۔ پھاٹک کے بائیں رُخ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک کیاریاں بنی ہوئی ہیں جن میں پھل دار درختوں کے ساتھ پھول دار پودے اور ترکاریاں بھی اُگی ہوئی ہیں۔ اور دائیں سمت چند فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر بالترتیب بیت الخلا، غسلخانہ اور باورچی خانہ بمعہ اسٹور روم بنا ہوا ہے۔ دروازے کے بالکل مقابل میں تین سیڑھیاں عبور کر کے چار ستونوں والا ایک طویل برآمدہ ہے۔ ستون کے تینوں دروں پر سرکنڈے کی چقیں پڑی ہیں جو گرمی کی وجہ سے لپیٹ دی گئی ہیں۔ ستونوں کے آگے نچلی سیڑھی تک پھولدار پودوں کے گملے رکھے ہیں۔ اس برآمدے میں سامنے کی دیوار میں تین دروازے بنے ہوئے ہیں جو غالباً کمروں کے ہیں۔
اور وہیں برآمدے کے انتہائی بائیں سمت تختوں کا بڑا سا چوکا پڑا ہے جس پر صاف ستھری چاندنی بچھی ہے اور بیچوں بیچ ساٹن کی خوشنما مسند پر گاؤ تکیے سے لگی مرحوم تعلقہ دار مقصود الحسن کی بیوہ شوکت جہاں اپنا تانبے کا جھلملاتا ہوا بڑا سا پاندان کھولے پان پر کتھا لگا رہی ہیں۔ انہوں نے انڈا بوسکی کے کرتے ڈی ون (D. ONE) کے لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ اور چھپیلیس کی ململ کا ڈبل پاٹ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر چشمِ آہو کی سنہری پمپک ٹکی ہے (چھپیلیس کی ململ بہت ملائم اور باریک ہوتی تھی) زیب تن کر رکھا ہے۔ کرتے کے گریبان میں پرانی وضع کے طلائی بھاری بٹن، کانوں میں تپتے بالیاں اور ہاتھوں میں موٹے موٹے طلائی کڑے پہن رکھے ہیں۔ ہیں تو وہ ساٹھ کے پیٹے میں مگر عمدہ صحت اور آسودہ حالی کی وجہ سے اپنی عمر سے چار پانچ برس کم ہی نظر آتی ہیں۔ ان کی دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر ایک کونے میں ایک بہت ہی پرانا ٹیبل فین ہے جو شاید اپنے موجد کی سب سے پہلی ایجاد تھا۔ کھڑ کھڑ اور کھڑ کھڑ کی ناخوشگوار سی آواز کے ساتھ پوری مستعدی سے چل رہا ہے۔
تخت کے پاس ہی ایک پیڑھی پر شوکت جہاں کی ملازمہ مائی رشیدن کسی فکر میں غلطاں اور پیچاں سی بیٹھی ہے۔ موسم کی

طرح شوکت جہاں کا مزاج بھی کچھ گرم سا ہے۔ انہوں نے پان کا بیڑا منہ میں رکھ کر تمباکو پھانکتے ہوئے کہا۔

"اے خدا کی مار اس موئی گرمی کو۔ روئیں روئیں سے عرق نچڑوا لیا اس نے تو۔ اتنا چھڑکاؤ کرانے کے بعد بھی زمین سے بھبکے اُٹھ رہے ہیں اور یہ نگوڑ مار پنکھا اس کی پھونک ہی نکل گئی ہے۔ موا چلتا بھی ہے تو رہٹ کی طرح چرخ چوں کر کر کے۔ اے یہ نامراد سجو کہاں مر گیا رشیدن۔ ذرا جا کر تو دیکھ تو سہی اس کم ذات مارے سجو کو۔ اس پنکھے میں کوک تو اسے نئی بھر نی آئی ہے۔" انہوں نے پاندان کا ڈھکنا زور سے بند کرتے ہوئے کہا۔ تو اپنا نام سننے سے زیادہ ڈھکنے کی آواز پر رشیدن بری طرح چونک کر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور قریب ہی بنے ہوئے دروازے سے اندر گھس گئی۔

شوکت جہاں نے تخت کے سرے تک سرک کر نیچے فرش پر رکھے اُگالدان میں پیک تھوکی اور اپنی جگہ سے سرک کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔ اس لمحے وہ کچھ مضطرب سی نظر آ رہی تھیں۔ اور یہ اضطراب گرمی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی فکر دامن گیر ہو۔ وہ کبھی پاندان کے کنڈے پر ہاتھ پھیرنے لگتیں اور کبھی اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتیں۔

دفعتاً برآمدے کے دائیں پہلو سے جدھر دیوار کے ساتھ ساتھ کیاریاں بنی ہوئی ہیں ایک چونتیس پینتیس سالہ مرد تنگ موری کے پاجامے اور کرتے پر کریم کلر کی اچکن پہنے سیڑھیاں عبور کرتا اچانک نمودار ہوتا ہے۔ وہ عام سے نقشے اور اچھے قد کاٹھ کا آدمی گندمی رنگت اور چہرے پر شرافت اور نجابت کی گہری چھاپ کے ساتھ اضمحلال سا نمایاں ہے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے تخت کے قریب آیا اور ہاتھ کے اشارے سے شوکت جہاں کو سلام کر کے تخت کے سرے پر ہی ایک طرف ٹک گیا۔

"کہو کیا خبر لائے، مگر اچھی خبر سنانا۔" شوکت جہاں نے بے چینی سے پہلو بدل کر تجسس اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔ اور جواب میں قدرے توقف کے بعد اس نے سنتے ہوئے افسردہ سے انداز میں کہا۔

"آماں۔ جب اچھی خبر میرے نصیب میں ہی نہیں تو پھر کیسے سناؤں؟"

"ہائیں۔ تو کیا پھر؟" شوکت جہاں نے کچھ ایسی آواز میں پوچھا جیسے ان کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو۔

"ہاں آماں لڑکی ہی ہوئی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں، میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی کہ وہ تمہاری چہیتی بیٹا تو جن ہی نہیں سکتی۔" شوکت جہاں نے جو پوتے کی آس لگائے بیٹھی تھیں پوتی کی پیدائش کی خبر سن کر جلے پھپھولے توڑے۔

"مگر آماں یہ تو خدا کی مرضی اور اختیار کی بات ہے میرے، آپ کے اور اس بے چاری کے تو نہیں۔" وہ ماں کو قائل کرنے کی غرض سے بولا۔

"خیر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کس کے اختیار کی بات ہے۔ مجھے تو تمہارا وارث چاہیے تھا اور بس یوں بھی۔ لڑکیوں کا کیا میں ہار بنا کر گلے میں ڈالوں گی۔ چار بیٹیاں، آٹھ نواسیاں اور اب یہ — لو بھلا پال پوس کر بڑا کرو تو ساری محنت کے ساتھ ساتھ دولت بھی سمیٹ کر لے جاتی ہیں پرائے گھروں میں۔ اور پھر بیٹوں کی بات تو دوسری ہی ہے۔ تم ہے تو اللہ رکھے تمہارے باپ دادا کی نسل چلے گی۔" شوکت جہاں کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بیٹے کی کوئی تاویل سننے پر تیار نہیں۔

"اوہو آماں۔ نسل چلانے والا بھی کبھی نہ کبھی پیدا ہو ہی جائے گا۔ کوئی اس لڑکی پر ہی تو ختم نہیں ہوا اولاد کا سلسلہ۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"مگر پہلوٹھی کی نرینہ اولاد کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ ولی عہد کا درجہ ہوتا ہے اس کا اور ہمیں ولی عہد ہی چاہیے۔" شوکت جہاں نخوت بھرے لہجے میں بولیں۔

"اُفوہ آماں! آخر آپ چاہتی کیا ہیں۔ اب میں اس لڑکی کی جنس تو بدلنے سے رہا۔" اس نے ماں کی باتوں سے تنگ آ کر ان کا لحاظ بھی نہ کیا۔

"دوسری شادی۔" وہ اس کی اتنی کھلی کھلی بات پر توجہ دیے بغیر متانت سے بولیں۔

"ہیں!" وہ اُچھل سا پڑا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"وہی جو ہمارے ہاں کا پرانا دستور ہے کہ اگر پہلی بیوی کے بطن سے پہلوٹھی کی اولاد نرینہ نہیں ہوتی تو اسے عقدِ ثانی۔"

"یہ بالکل جاہلانہ دستور ہے آماں۔ اور کونسا میں کوئی والیٔ تخت یا کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہوں۔ بس چند گاؤں پر مشتمل ایک چھوٹا سا تعلقہ ہی تو ہے جس کا ڈیوڑھا حصہ میری ملکیت رہ گیا ہے۔" اس نے ماں کی بات قطع کر کے برہم انداز میں کہا۔

"رہ گیا ہے تو کیا ہوا۔ وہی مثل ہے کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے بیٹے۔ کروڑوں نہ سہی تو لاکھوں کے تو مالک ہو اور میرے کون سے دس دس بیٹے ہیں۔ اللہ آمین کے ایک تم ہی تو ہو۔ یہ بھی بس میرے مولا کا کرم ہی تھا ورنہ بعد میں تو دواؤں، دعاؤں کے باوجود کسی کے نام چڑیا کا بچہ تک نہیں ہوا ماسوا ان چاروں لڑکیوں کے اور اب پھر لڑکی۔ پوتی ہی سہی مگر ہو گی تو لڑکی ہی نا۔" شوکت جہاں اپنا بیٹے کو قائل کرتی ہوئی بولیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے آماں کہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، مگر خدا کی ذات سے مجھے یقین ہے کہ بعد میں وہ مجھے بیٹا بھی دے دے گا۔" اس نے بڑے یقین سے کہا۔

"اے بعد کس نے دیکھا ہے یہاں تو کل کی بھی خبر نہیں۔" شوکت جہاں بولیں۔

"اب یہ بات تو میں اپنے لیے بھی کہہ سکتا ہوں آماں جان۔"

"اے خدا نہ کرے دشمن دو، یار لڑکے تو کیا بک رہا ہے۔ خدا میری عمر بھی تجھے لگا دے۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تیری ان باتوں میں آ کر تیری شادی کا خیال چھوڑ دوں گی تو یہ تیرا بچپنا ہی ہے۔"

شوکت جہاں نے بھی دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھیں کہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا یہ کہہ کر ان کی ایک کمزوری پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"اُفوہ۔ آماں! آپ نے اس بات کو ایک مسئلہ کیوں بنا لیا۔ اتنی خوبصورت پوتی سے نوازا ہے خدا نے آپ کو بالکل ماں پر گئی ہے اور پھر میری پہلی اولاد ہے۔ آپ کو تو —"

شوکت جہاں اس کی بات قطع کر کے بولیں۔ "ہاں بے شک وہ تمہاری پہلی اولاد ہے اور ماں پر گئی ہے مگر بہو کا انتخاب بھی میں نے کیا تھا۔ تم خود اسے آنکھ لڑا کر یا بھگا کر نہیں لائے تھے۔"

"استغفر اللہ۔ آماں آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں بھلا ان خرافات میں کیوں پڑنے لگا تھا۔ میں نے تو اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو آپ ہی کی پسند تھی۔" وہ سمجھا شاید ماں کو اس کے منہ سے بہو کی تعریف ناگوار گزری ہے۔

"ہاں میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ اگر بہو خوبصورت بھی ہے تو ساری خوبصورتی اسی پر تو ختم نہیں ہو گئی۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حسین لڑکیاں ہیں میری نظر میں خاص طور پھوپھی مکرم جہاں کی بیٹی — بدرالنساء۔"

"خیر خیر، خواہ پھوپھی مکرم جہاں کی پوتی ہو یا معظم جاہ کی نواسی۔ میں کسی قیمت پر بھی عقدِ ثانی نہیں کروں گا۔" وہ بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"واہ کیسے نہیں کرے گا۔ میں تو تیری گدی پکڑ کر زبردستی تیرا نکاح پڑھواؤں گی بدرالنساء سے۔ نام کی ہی نہیں وہ تو ہے ہی مجسم چودھویں کا چاند۔ ایک نظر دیکھ لے تو پلک جھپکنا ہی بھول جائے۔"

"خیر میں نظر باز ہوں نہ شوقین مزاج۔ اور یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہے میری نظر میں تو زہرہ ہی دنیا کی حسین ترین عورت ہے اور پھر اس بے گناہ اور معصوم کو کس بات کی اتنی کڑی سزا دوں۔ کیا صرف اس بات کی کہ اس کے بطن سے پہلوٹھی کی اولاد لڑکی پیدا ہوئی ہے؟ نہیں آماں۔ اگر آپ کے دل سے خوفِ خدا جاتا رہا ہے تو میرے دل میں تو ہے۔ میں مر کر بھی اس پر ایسا ظلم نہیں توڑ سکتا۔" وہ ماں کے اس قدر دھاندلی سے بات کرنے پر کھول ہی اُٹھا۔

"اے بچے کیسا ظلم اور کس کا خوفِ خدا۔ اے کیا تو سمجھتا ہے کہ میں جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوں خدا سے نہیں ڈرتی۔ ارے نادان یہ خدا کا حکم ہی تو ہے کہ مرد کو اس نے چار شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور میں تو صرف نرینہ اولاد کی خاطر تیری دوسری شادی کر رہی ہوں۔" شوکت جہاں سے اور وہ بھلا جیت سکتا تھا۔

"ہوں تو گویا آپ بہت پہلے سے یہ ارمان دل میں رچائے بیٹھی تھیں۔ آپ نے پہلے سے ہی یہ سارے انتظامات —"

"ارے کیا پہلے پیچھے لگا رکھی ہے۔ اگر ایمان کی پوچھو تو مجھے بدرالنساء شروع ہی سے پسند تھی۔ مگر وہ اس کا باپ خدا اس کی ارواح نہ شرمائے بڑا ناک چوٹی گرفتار آدمی تھا۔ کہتا تھا کہ خاندان سے باہر بیٹی نہیں جائے گی۔ بڑی بیٹی کو تو اپنی اسی اینچ میں بوڑھا کر کے رکھ دیا تھا۔ اب دیکھ لو اس کی آنکھ بند ہوتے ہی بیٹوں نے منجھلی بیٹی کو سنگھوں میں دے دیا اور یہ چھوٹی —"

"اچھا۔ اگر دوسری بیوی بھی پہلوٹھی کی نرینہ اولاد نہ پیدا کر سکی تو پھر دستور کے مطابق تیسری اور اس کے بعد چوتھی اور پانچویں۔ آپ تو گویا بہوؤں کا نمبر لگانے سے بھی دریغ نہ کریں گی اور اگر میری قسمت میں نرینہ اولاد ہی نہیں لکھی ہو گی تب؟" ماں کی باتوں سے اکتا کر اس نے پوچھا۔

"یہ تو خدا ہی جانے مگر انسان تو اپنی سی کوشش کرتا ہی ہے نا۔" شوکت جہاں قائل ہونے کی عادی ہی نہ تھیں۔

"واہ امّاں! آپ تو ہمیشہ چت بھی میری پٹ بھی میری کی ہی مثال پیش کرتی ہیں۔ مگر میرا فیصلہ بھی سن لیجیے کہ میں مر کر بھی عقدِ ثانی نہیں کروں گا۔" اسے پیچ پیچ تاؤ آ گیا۔

"اے مریں تیرے دشمن میں تو تیری سلامتی میں تیرے سر پر سہرا سجاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کیسے انکار کرے گا تو۔" شوکت جہاں پوری قطعیت کے ساتھ بولیں۔

"ہاں ہاں دیکھ لیجیے گا۔" وہ بھی چیلنج کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"دیکھ مسعود الحسن۔ مجھے ضد نہ دلا۔ ورنہ میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔" ماں نے دھمکی بھی دی تو کیسی کہ وہ جاتے جاتے رک سن سا کھڑا ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر ماں کی طرف پلٹا اور ایک زہر خند سے بولا۔

"یہ دودھ نہ بخشنے کی دھمکی نہ دیجیے امّاں بلکہ زہرہ کی حالت ٹھیک نہیں۔ قبلہ رو ہو کر دعا کیجیے کہ وہ مر جائے۔ اس کے بعد ہی آپ کو اپنے دل کے ارمان نکالنے کا موقع مل سکے گا۔" پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا جدھر سے آیا تھا اسی طرف سے واپس لوٹ گیا۔

وہ طنز کے زہر میں بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا لیکن شوکت جہاں نے اس کی بات کا کوئی خاص اثر نہیں لیا کہ ایک تو ان کے یہاں پشتوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ دوسرے وہ اپنی دھن کی پکی تھیں۔ اس پر ان کا اکلوتا بیٹا ان کی پسند زہرہ پر حد درجہ مہربان تھا بلکہ ان کے خیال میں والہ و شیدا تھا۔ اب اگر وہ بیٹے کو جنم دے دیتی تو وہ پھر بھی بیٹے کی اس چاہت برداشت کر لیتیں مگر اس نے تو بیٹی کو جنم دیا تھا۔ لہٰذا اب وہ اس کے شترِ غمزے برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ یوں بھی ان کی سسرال میں بیٹیوں کی بہتات تھی۔ دیور کے ہاں بھی چار بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا ہی ہوا تھا۔ نندوں کے یہاں بھی لڑکے کم اور لڑکیاں زیادہ تھیں۔ حتّیٰ کہ خود ان کی بیٹیوں کے یہاں بھی فی بیٹی دو دو اور تین تین بیٹیاں ہی تھیں۔ ان کی ساس نے دیور کو بھی دوسری شادی کے لیے بہت مجبور کیا تھا بلکہ پہلی بیوی کو طلاق دلوا کر دیور کا عقدِ ثانی کرا کے ہی رہی تھیں۔

گویا یہ ان کے خاندان کا دستور سا تھا۔

جسے وہ ظلم سمجھتی تھیں نہ زیادتی۔

اور تو اور خود ان کے میاں نے پہلوٹھی کی اولادِ نرینہ پیدا کرنے کے باوجود ان پر سوت لے آئے تھے کہ کچھ فطرتاً ہی شوقین مزاج اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ جو پوتے کی آرزو میں مری جا رہی تھیں ان کے نزدیک زہرہ کو طلاق اور بیٹے کا عقدِ ثانی کچھ ایسی معیوب بات نہ تھی۔

بیٹے کے جانے کے بعد کچھ دیر تو شوکت جہاں گم صم سی بیٹھی تدبیر اور حکمت کے خیالی گھوڑے دوڑاتی رہیں۔ پھر اپنے بڑھاپے کی طرف مائل ڈھلکے چہرے پر فتحمندی کا تاثر لیے انہوں نے پیچھے بائیں سمت گردن موڑ کر دیکھا۔ رشیدن دروازے کی چوکھٹ پکڑے پہلے سے موجود تھی۔

"اری کہاں ہے وہ موا بد بنا سجو کا بچہ۔" انہوں نے اپنے مالکانہ طرزِ تکلّم کے ساتھ بڑی رعونت سے پوچھا۔

"ابھی بلا کر تو لائی تھی اسے پر چھوٹے میاں کو دیکھ کر پھر چلا گیا۔" رشیدن نے بتایا۔ اس کی صورت اتری اتری لگ رہی تھی۔ شوکت جہاں سمجھ تو گئی تھیں کہ وہ بھی زہرہ کے گن گاتی تھی مگر انہوں نے کچھ پوچھا یا۔ ٹوکا نہیں۔

"اچھا خیر جا کر سجو سے کہہ دے کہ کہاروں کو بلا کر ڈولی پچھلے دروازے پر لگوا دے اور تو آ کر جلدی سے میری پاندان کا زرا میں پان بنا کر رکھ دے سمجھی۔"

"جی بہتر بڑی بیگم۔" رشیدن تعمیلِ حکم کے لیے فوراً ہی جانے کے لیے مڑی۔

"اور ہاں سن۔ میں متین صاحب کی حویلی جا رہی ہوں۔ اگر چھوٹے میاں آ جائیں تو کھانا کھلوا دیجیو۔"

"متین میاں کی حویلی ڈولی میں جا رہی ہیں بیگم اتی دور۔" رشیدن نے گویا تبصرہ کہا۔

"ہاں تو کیا پھر ہوائی جہاز میں جاؤں۔" شوکت جہاں چمک کر بولیں۔

"پر بیگم جاتے جاتے تو سانجھ ہو جائے گی۔ میں بگھی لگوا دوں دروجے (دروازے) پہ۔"

"نہیں۔ میں رات کو وہیں رہوں گی۔ جا اب دفعان بھی ہو کسی طرح۔" شوکت جہاں نے اس کے مشیخت دکھانے پر چڑ کر کہا تو رشیدن چپ چاپ اندر چلی گئی۔

"ہونہہ بگھی تو وہ لاٹ صاحب کا بچہ سا اپنی چہیتی کو دیکھنے کے لیے لے گیا ہے۔ خیر اب جا تو رہی ہوں پانسہ نہ پلٹا تو میرا نام شوکت جہاں نہیں رذالی بچوڑی ہی ہو گا۔" رشیدن کے جانے کے بعد وہ خود کلامی کی سی کیفیت میں بولیں۔

لباس تو انہوں نے بہت معقول پہن رکھا تھا۔ کہ وہ بیوہ ہونے کے باوجود ہمیشہ بنی سنوری ہی نظر آتی تھیں۔ نازک طبع بھی تھیں اور نفاست پسند بھی۔ ہمیشہ عمدہ اور قیمتی لباس ہی پہنتی تھیں مگر طبیعت بڑی شاطرانہ پائی تھی ہر معاملے میں اپنے مفاد کو ترجیح دیتی تھیں۔ یوں تو صوم و صلوٰۃ کی پابند بھی تھیں اور ہاتھ کی بھی کھلی تھیں۔

مگر ایسے انسان کی سخاوت اور عبادت کس کام کی جس کے عمل اچھے ہوں نہ اعمال۔

بلکہ نیت جس پر اعمال کا دارومدار ہوتا ہے جب وہی ٹھیک نہ ہو تو سخاوت محض پیسہ بہانے یا ضائع کرنے اور عبادت محض ٹکریں مارنے کے مترادف ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ نیت، اعمال اور عبادت ایک مثلث کی طرح آپس میں ایک دوسرے سے منتج ہیں۔ نیت ٹھیک ہو اور اعمال درست تو سب سے بڑی نیکی یہی ہوتی ہے۔ اور پھر نیکی کا دوسرا نام عبادت ہی ہوتا ہے۔

یہ تو نہیں کہ عیب جوئی کریں۔ غیبت کے مرتکب ہوں۔ جھگڑا اور فساد مچائیں۔ دوسروں سے بغض و عناد رکھیں۔ حسد کی آگ میں جلتے رہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہیں۔ لہو و لعب اور فضولیات میں اپنا وقت ضائع کریں۔ منافقت کو دل میں چھپائے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر ملیں۔

خود کو علیحدہ فرقوں میں بانٹ کر اپنی شناخت کرائیں۔

دوسروں کی تکلیف اور اہانت پر ہنسیں۔ خوشیاں منائیں۔

فحش اور غیر قانونی اُمور کو بہت فخریہ انجام دیں۔

ایک ذرا سی اختلافِ رائے اور چپقلش میں مروّت اور اخلاق کو پسِ پشت ڈال کر تلخ کلامی اور ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جائیں۔ جب کہ مروّت، رواداری اور اخلاق ہی انسانیت کے جوہر اور جان ہیں اور ان جوہروں کے بغیر انسانیت حیوانیت بلکہ درندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اور پھر کسی کو کوئی گزند پہنچا کر یا اس کی جان لے کر حاصل ہی کیا ہوتا ہے ماسوا دنیا میں ذلّت اور رسوائی مول لینے کے اور عقبیٰ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنانے کے اور یہ عمرِ عزیز ہے بھی کس قدر مختصر اور چھوٹی۔ کسے معلوم کہ کب، کس مقام اور کن حالات میں زندگی کی شام ہو جائے کہ واقعی انسان خود مثلِ صبا ہے کہ جب تک ابھر رہا ابھر رہا۔ بیٹھ گیا تو مٹی۔ پھر تو سارا ہنا ٹھاٹھ پیچھے ہی پڑا رہ جاتا ہے۔

پھر اتنے مختصر سے سفر میں وہ اپنی راہوں میں نفرت کے شعلے کیوں دہکاتا ہے۔ فتنہ و فساد کیوں بپا کرتا ہے۔

عمرِ عزیز کے مختصر سے کوزے میں محبت کا رس کیوں نہیں ٹپکاتا۔

محبت کی نغمگی کیوں نہیں بکھیرتا۔

وہ ایک دوسرے کے دل میں محبت کی جانفزا، مدھر اور الوہی تانیں کیوں نہیں اتارتا تاکہ زندگی کے مقصد اور مفہوم سے دوسرے کو روشناس کرا سکے۔

مگر کس قدر کوتاہ ظرف ہوتا ہے انسان بھی۔

صرف اپنے مفاد کے لیے ہی کوشاں رہتا ہے۔

اور اس پر نمازیں بھی پڑھتا ہے اور روزے بھی رکھتا ہے۔

تو یہ عبادت تو نہیں کھلی نافرمانی ہوئی اس ذاتِ بالا و برتر اور بابرکات کی، جس نے کتابِ مقدس قرآن الحکیم کو مخزنِ ہدایت بنا کر انسان کو اسلام کی صورت میں ایک اعلیٰ و ارفع، نہایت ٹھوس، جامع، مکمل اور مجمل بلکہ جواہرِ انسانیت سے مرصّع فارمولا اور ایک ضابطۂ حیات ودیعت کیا ہے اور ہر مسلمان کے لیے یہ بات کس قدر عزّ و شرف کا باعث ہے کہ وہ حضورِ پُرنور رسالت مآب آفتابِ رشد و ہدایت، دانائے سبل رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّتی اور پیروکار ہے۔ بالیقین یہ اعزاز کسی اور اُمّت کو نصیب نہیں۔ کاش اسی اعزاز کو فرزندانِ توحید اپنا سرمایۂ حیات بنا کر سینوں سے لگائے رکھتے۔ مگر وہ کلمہ گو ضرور ہیں حق گو نہیں — اس پر عاشقانِ رسول ہونے کا دعوا بھی کرتے ہیں۔ جیسے شوکت جہاں کرتی تھیں۔

یہ کیسی محبت تھی۔ کیسی اطاعت تھی اور کیسا عشق جب کہ عشق میں تو فنائیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور عشق بھی کس
ذاتِ اقدس سے جس کی محبت پر اولاد، بہن بھائیوں اور بیوی سب کی محبتیں قربان ہوتی ہیں۔

شوکت جہاں خود کو بہت اللہ والی اور عبادت گزار سمجھتی تھیں۔ سجدے کر کر کے ان کی پیشانی پر گٹے پڑ گئے تھے
خدا ترس اور سخی مانی جاتی تھیں مگر کیا فائدہ تھا اس ساری عبادت اور ریاضت کا۔

جب کہ دماغ تو ہمہ وقت دوسروں کے دلوں میں نفاق ڈالنے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی تدبیروں میں مصروف
نیت ٹھیک تھی نہ ارادے نیک۔ وہ اپنی ہی صنف کی ایک کمزور سی لڑکی کا جو قسمت سے ان کی بہو تھی گھر برباد کرنا چاہ رہی تھیں
وہ بھی صرف اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے ایک عدد لڑکی کو جنم دیا تھا۔

جب کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ پاک کے نزدیک جس عورت کی پہلوٹھی کی اولاد لڑکی ہو اس کا مقام بلند ہوتا ہے
اس مسئلے پر اپنی بیٹیوں کے ہاں نری لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہونے پر بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ انہوں نے بیٹیوں کی سسرال
والوں کو قائل بھی کیا تھا۔ بلکہ قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر سب کے منہ بھی بند کر دیے تھے۔

گو وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر قرآن اور ترجمہ پڑھنے کی وجہ سے تھوڑی شُد بُد ضرور رکھتی تھیں۔

اصل میں ان کے والد حافظِ قرآن بھی تھے اور دینیات کے ایک مدرسے میں معلّم بھی رہ چکے تھے۔ بس ان ہی کی زبانی کچھ
مسئلے مسائل انہوں نے بھی سن رکھے تھے۔ ذہانت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھیں۔ اس پر فطرت بھی بہت شاطرانہ پائی تھی

اصل میں ان کی رنگت دبتی ہوئی سانولی تھی اور ناک نقشہ بھی معمولی سے۔ جب کہ ان کے شوہر شکل و صورت رنگت اور
کے لحاظ سے ان سے کہیں بہتر تھے مگر پرانے زمانے میں ایک تو اپنے ہی خاندان کی لڑکی اور لڑکے کو ترجیح دی جاتی تھی
صورت شکل کو نہیں شرافت کو دیکھا جاتا تھا۔ اور شوکت جہاں کی اپنے شوہر سے دور پرے کی رشتہ داری بھی تھی۔ اس لیے
نے یہ سمبندھ کرا دیا تھا اور شوکت جہاں کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر کے ولی عہد کو جنم دیا تھا۔ جب
کی خواہش تھی کہ ایک دو لڑکے اور ہوں۔ اصل میں تو وہ حسن پرست بھی تھے اور شوقین مزاج بھی۔ ایک خاصے بڑے تعلقہ
تھے۔ دولت اور جاہ و حشم سبھی کچھ تو میسر تھا۔

اس لیے انہوں نے ایک متوسط گھرانے کی خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے گویا شوکت جہاں جیسی بے قصور اور نا کردہ
کو نہ معلوم کس جرم کی سزا دی تھی اور یہ خیال کہ مرد ایک دو نہیں دس شادیاں کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور بلا قصور اور وجہ بھی
کے دم پر سوت بٹھا سکتا ہے کچھ اتنی مضبوطی سے ان کے تحت الشعور میں جم کر رہ گیا تھا کہ انہوں نے دیور کی دوسری شادی کرانے میں
بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور اپنے شوہر کے اور بھی بھتیجے اور بھانجوں کی دوسری شادیاں کرا چکی تھیں۔

اب یہ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کا انتقامی جذبہ تھا یا اپنا کوئی نظریہ۔ بہرحال لباس تو ان کا معقول ہی تھا۔

بس رشیدن سے لوہے کی پیٹی سے سلکن چادر نکلوا کر انہوں نے اپنے شانوں پر پھیلا لی تھی۔ پانوں کی ڈبیہ بھی رشیدن
چھپا چھپ پان بنا کر چابیوں کے بھاری گچھے اور چھالیہ زردے کے بٹوے سمیت ان کے زرکار کسنے میں ڈال دی تھی۔

شام تیزی سے سر پر آ رہی تھی۔ اور راستہ بھی دور کا تھا وہ بھی ڈولی کے ذریعے۔ مگر ان کے خیال میں لوہا اتنا گرم ہو گیا تھا کہ
آسانی سے موڑا جا سکے۔ اس لیے ڈولی میں سوار ہو کر انہوں نے نیتن صاحب کی حویلی کا رُخ کیا۔

زہرہ کی زچگی قریبی شہر کے واحد میٹرنٹی ہوم میں ہوئی تھی جو ایک پارسی لیڈی ڈاکٹر نے کھولا تھا کیونکہ اس زمانے میں
کے لیے علیحدہ ہسپتال بنانے کا رواج نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عموماً عورت کی زچگی گھر پر ہی ہوتی تھی اور دائیوں کے
ہاتھوں ہی ہوتی تھی۔ البتہ بعض صاحبِ ثروت لوگ لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی یہ تخلیقی مرحلہ انجام دلوا لیا کرتے تھے
اس زمانے میں تقریباً سارے ہی کیس یا زچگیاں نارمل ہی ہوا کرتی تھیں۔ کیسا یورین ٹیسٹ اور کیسا بلڈ ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ
پھر نشتر زنی یعنی انجکشن وغیرہ۔ تابکاری اثرات اور ملاوٹ سے پاک زمانہ تھا اس لیے زچگی کے کیس میں شاذ ہی کوئی پیچیدگی
ہوتی تھی۔ البتہ احتیاط سخت کی جاتی تھی۔

ادھر بچے کی ولادت ہوئی اور ادھر کھانے پینے کی۔ ہر چیز بند ماسوائے چائے یا دودھ کے یا پھر صبح و شام شربت بزوری
والا جو ارگٹ مکسچر سے کہیں زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہے۔

پھر تیسرے روز صبح نہار منہ گرم دودھ کے ساتھ کیسٹر آئل یا لیکوئڈ پیرافین کا جلاب دے کر ہلکا پھلکا ناشتہ اور دوپہر کو

یخنی۔ چھٹی کا نہان نہلانے کے بعد البتہ نورتن (نو ترکاریاں) کھلایا جاتا تھا اور کچھ مٹھاس اور پھل بھی کہ ماں کا دودھ
پینے والا بچہ ان ساری چیزوں کا عادی ہو جائے۔ پیٹ اور کولھوں پر سوا مہینے تک کس کر پٹی باندھی جاتی تھی تاکہ پیٹ بڑھنے نہ پائے
پر مرغن غذائیں اور بس احتیاط ہی احتیاط۔

ٹھنڈی اور کھٹی کا پرہیز کہ دہی اور انار کا رس تو زچہ کے لیے سوا مہینے تک زہرِ قاتل ہی ثابت ہوتا ہے۔

پھر زچہ پلنگ سے یوں تھاڑی اٹھتی تھی جیسے موت کی وادی کو پھلانگ کر نہیں بلکہ آبِ حیات کا غسل لے کر آئی ہو۔ مگر زہرہ
چونکہ شوہر کے مقابلے میں خاصی کم عمر تھی اور کچھ شروع ہی سے کمزور تھی اس لیے اس کے کیس میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ شوہر اس کا
دیوانہ تھا۔ اس لیے اسے دائیوں اور بڑی بوڑھیوں کی دواؤں اور ٹوٹکوں پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ شہر لے جا کر باقاعدہ لیڈی ڈاکٹر
سے اس کا علاج کرواتا رہا تھا۔

اور اب فورسپ سے بچی کی پیدائش ہوئی تھی۔

وضعِ حمل کے بعد بھی ڈاکٹر اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے مسعود الحسن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ زچہ کی جان
خطرے میں ہے۔ اس لیے مسعود الحسن جو زہرہ کو دل و جان سے چاہتے تھے اس وقت سخت پریشان تھے۔ اور محض ماں کی پریشانی
کے خیال سے کہ گزشتہ دوپہر کو انہوں نے زہرہ کو میٹرنٹی ہوم میں داخل کرایا تھا اور بچی اگلی دوپہر کو تولد ہوئی تھی اتنی پریشانی میں بھی
وقت نکال کر سہ پہر کو ماں کو اطلاع دینے چلے آئے تھے اور کچھ اس خیال سے بھی آئے تھے کہ اگر نہ آتے تو ماں یہی سمجھتیں کہ چونکہ
لڑکی پیدا ہوئی ہے اس لیے شرمندگی کی وجہ سے بیٹے نے منہ چھپا لیا ہے۔ اور اسی جذبے کے تحت وہ خود کو پہلے سے ہی ان سے
بات کرنے کے لیے تیار کر کے آئے تھے۔ کہ انہوں نے عقدِ ثانی کا شوشا چھوڑ کر ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیونکہ وہ
اپنی ماں کی فطرت اور رگ و ریشے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ وہ جس بات کی ضد کر بیٹھتی ہیں اسے پورا کر کے ہی دم
لیتی ہیں اور اگر بات صرف عقدِ ثانی کے ذکر تک ہی ہوتی تو وہ کچھ عرصے تک اس ذکر کو ٹالتے بھی رہتے۔ حتیٰ کہ ان کا ولولہ ٹھنڈا
پڑ جاتا۔ مگر انہوں نے تو بدر النسا کی صورت میں اپنے ارادے کی پختگی بلکہ اپنے ارادے پر جلد از جلد عمل درآمد کرنے کا اعلان
بھی کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ دودھ نہ بخشنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔

مسعود الحسن جدی رئیسوں کی اولاد تھے۔

بہت زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر شعر و ادب سے شغف ضرور رکھتے تھے۔ گو اپنے آباؤ اجداد کی سی آن بان ان میں نہیں تھی
مگر بہت بردبار، خاموش طبع اور سادگی پسند تھے۔

بالکل ایسے مردوں کی طرح جو زیادہ سات پانچ کرنے کے عادی نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی سات پانچ کے پھیر میں جلد ہی
آ جاتے ہیں۔ اصل میں ایسے مردوں کی قوتِ فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی طبیعت میں ضعف ہوتا ہے اور بیٹے کی اس
کمزوری سے شوکت جہاں بخوبی واقف تھیں۔ زہرہ شوکت جہاں کی ہی پسند تھی۔ صورت و سیرت بلکہ ہر لحاظ سے لاجواب تین برس
قبل وہ اسے بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ نو مہینے ہی وہ ایک عدد پوتا ان کی گود میں ڈال دیتی مگر
ہوا یوں کہ کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے پورے ڈھائی برس تک تو امید ہی نہ ہوئی۔ اور وہ بہو کی طرف سے ناامید سی ہو گئیں
تھیں ایک روز بڑے غیر متوقع طور پر یہ مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ خیر سے بہو کا پیر بھاری ہو گیا ہے۔ ساس کے ارمانوں کی
مرجھائی ہوئی کلی کھل گئی۔ اب جوں جوں دن گزرتے جاتے۔ وہ یہی دیکھتی رہتیں کہ بہو کون سا پیر پہلے اٹھاتی ہے۔

کون سی چیز کو طبیعت قبول نہیں کرتی۔

کون سی چیز رغبت سے کھاتی ہے اور مزید بھی کئی بیٹا ہونے کی علامتیں۔

اور زہرہ کی ہر علامت ہی صدفی صد بیٹے کی نوید دے رہی تھی۔

مگر وقت آنے پر وہی مثل ہو گئی کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔

شوکت جہاں کے تو سارے اندازوں اور حساب پر پانی پھر گیا تھا۔

اس پر مستزاد یہ کہ وہ زہرہ کو اگرچہ خود بیاہ کر لائی تھیں۔ مگر ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا اس کے نام
کی مالا جپنے لگے اور اس کا غلام بن کر رہ جائے۔ جب کہ زہرہ کو بہو بنانے میں بھی ان کی ایک مصلحت کارفرما تھی اور وہ یہ تھی کہ زہرہ
کے میکے والے تو بہت شریف اور خاندانی لوگ تھے لیکن اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اوسط طبقہ بھی وہ جس کے منہ پر آسودگی

کی تھوڑی بہت چکناہٹ ہوتی ہے اور اپنے سے کم حیثیت خاندان کی لڑکی کو بہو بنانے سے ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ بہو ان کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار اور ان سے دبی رہے گی کیونکہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اگر کسی رئیس گھرانے کی لڑکی لاتیں تو اپنی بڑائی کے زعم میں ان سے ان کا بیٹا چھین لیتی۔ اور زہرہ تے اگر ان کا بیٹا ان سے چھینا نہیں تھا تو بیٹے پر قابض ضرور تھی اور یہ بات پھانس کی طرح ان کے سینے میں کھٹکتی تھی اور مسعود الحسن نے جو یہ کہا تھا کہ وہ ایسے ہی کسی موقع کے لیے تیار بیٹھی تھیں تو کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

شوکت جہاں نے تو اس وقت سے ہی جب سے بہو کا پیر بھاری ہوا تھا یہ طے کر لیا تھا کہ اگر بہو کے ہاں لڑکی ہوئی تو وہ بیٹے کا عقدِ ثانی کیے بغیر نہ رہیں گی۔ اور یہ بھی سچ ہی تھا کہ انہوں نے بدرالنساء کو بیٹے کے لیے بہت پہلے سے تاڑ رکھا تھا۔ اصل میں اس اجمال کا کچھ یوں تھا کہ پھوپھی مکرم جہاں سے ان کی دور کی نہیں بہت دور پرے کی رشتے داری ہوتی تھی اور میل جول بھی برائے نام خوشی اور غمی کے موقعوں پر یکجا ہونے کی حد تک ہی محدود تھا۔

مکرم جہاں کے شوہر سید احمد عرف پتن صاحب سادات سے تعلق رکھتے تھے اور خود کو دُرِّ نجیب یا نجیب الطرفین سید کہتے تھے اور اپنے شجرۂ نسب پر انہیں کچھ اتنا فخر تھا کہ اپنے خاندان میں لڑکا نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے بڑی بیٹی کو گھر بٹھائے بٹھائے بوڑھا کر دیا تھا۔ جب کہ مکرم جہاں کی ماں مغل تھیں اور خواجہ زادوں کی نسل سے تھیں۔ اور باپ اصل نسل سید۔

پُرانے رواج کے مطابق خوشی اور غمی کے موقعوں پر بھی ان کی بیٹیوں کو ایسے اجتماعات میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ تو مکرم جہاں بڑے بیٹے کی شادی کا بلاوا دینے بنفسِ نفیس خود چل کر آئی تھیں تو اس طرح میل جول کا ایک ذریعہ سا پیدا ہو گیا تھا اور اسی ذریعے کے تحت راہ و رسم بڑھی تھی اور آمد و رفت تو کیا بس رفت ہی رفت کہ شوکت جہاں کسی نہ کسی بہانے خود ہی ان کے یہاں چلی جاتی تھیں۔ اصل میں وہ ان دنوں بڑی سنجیدگی سے بیٹے کی شادی کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ کیونکہ بیٹا اٹھائیس برس کا ہو گیا تھا جب کہ دستور کے مطابق چوبیسویں برس ہی اسے بیاہ دینا چاہیے تھا مگر شوکت جہاں کچھ تو اتنے عرصے اسے دودھ پیتا بچہ ہی سمجھتی رہیں اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی لڑکی ان کے معیار اور مرضی پر پوری ہی نہیں اُترتی تھی مگر جب سے انہوں نے بدرالنساء کو دیکھا تھا اس کی گرویدہ ہی ہو گئی تھیں اور اسی لیے دوڑ دوڑ کر پھوپھی کے گھر جاتی تھیں مگر پھوپھا نے ذات ضمات کی کچھ ایسی رٹ لگائی تھی کہ وہ مکرم جہاں سے بھی دلی مدعا بیان نہ کر سکیں اور ایک طرح سے بدرالنساء کی طرف سے مایوس ہو کر ہی انہوں نے زہرہ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بھی بڑی چھان بین کے بعد۔

مگر اب جب سے پتن صاحب کا انتقال ہوا تھا اور ان کے بیٹوں نے منجھلی بہن کی جوانی کو زنگ لگانے سے بہتر یہی سمجھا کہ کسی شریف خاندان کے لڑکے سے اسے بیاہ دیا جائے کیونکہ بڑی بہن کی افسوسناک مثال سامنے تھی اور انہوں نے ایک ایسا بر دیکھ کر منجھلی بہن کا نکاح گویا خاندان سے باہر کر دیا تھا۔ شوکت جہاں کو پھر ایک آس سی بندھ گئی تھی مگر بہو کو بلا قصور بلاوجہ تو دھکا نہیں دے سکتی تھیں۔ مگر اب تو لڑکی کو جنم دینے کے بعد زہرہ کو گھر سے نکال لینے اور بدرالنساء کو اس کی جگہ لانے کا زرین موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ جب کہ انہیں بدرالنساء کی طرف سے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی بے خبری میں کسی اور سے اس کی بات نہ ٹھہرا دی جائے کیونکہ اس زمانے میں زبان کا نکلا پتھر کی لکیر ہی ثابت ہوتا تھا۔ یوں بھی سید گھرانے کے کسی بر کے انتظار میں اس کی عمر چوبیس سال کی ہو گئی تھی۔ لیکن اب تو بھائیوں نے ایک پرانی ریت کو توڑا تھا۔ کچھ اس لیے بھی اس کام کی انجام دہی میں وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں اور کچھ اس خیال سے بھی کہ زہرہ چلہ کاٹنے کی مدت تک تو شوہر سے دور ہی رہے گی۔ چنانچہ اسی مدت میں بیٹے کو رام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ انہوں نے وقت ناوقت کی پروا نہ کی اور پتن صاحب کی حویلی روانہ ہو گئیں۔

پتن صاحب کی حویلی ان کے گھر سے دو تین کوس دور واقع تھی اور انہیں وہاں جانے کا بارہا اتفاق ہوا تھا۔ اور وہ جب بھی وہاں جاتیں ان کی حیثیت اور ثروت کے پیشِ نظر وہاں ان کا ریڈ کارپٹ ریسپشن کیا جاتا۔ اور اس مرتبہ تو وہ وہاں بالکل غیر متوقع اور ناوقت پہنچی تھیں کہ شام کب کی ہو چکی تھی۔ پھر بھی سب دیدہ و دل فرشِ راہ کر کے ملے۔ کس کی مجال تھی جو پوچھتا کہ آپ نے ایسے ناوقت کیسے زحمت کی۔ وہ تو انہوں نے خود ہی موسمِ گرما پر چند بے نقط جملے کہہ کر اپنے ناوقت آنے کی وضاحت یوں کی۔

"اے بُرا ہو اس موئی گرمی کا۔ اس نے تو پگھلا کر ہی رکھ دیا ہے ورنہ میں تو دوپہر کو کھانا کھا کر ہی آ رہی تھی مگر باہر نکلی تو یوں لگا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ بس اسی انتظار میں کہ تپش کم ہو تو جاؤں شام ہو گئی۔"

"چلیں اگر شام بھی ہو گئی تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہی ہے۔" مکرم جہاں کے بڑے بیٹے نے کہا۔

"جی ہاں اب ہم آپ کو رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے ہی نہیں دیں گے۔" بڑی بیٹی بولی۔

"اے رات کا کھانا کھلانا کیسا۔ انہیں تو اب میں کل دوپہر سے پہلے جانے نہیں دوں گی۔" مکرم جہاں بڑی اپنائیت جتاتی ہوئی بولیں۔

"نہیں پھوپھی جان ـــ بہو کا جی ماندہ ہے۔ کیا پتا کب زچگی ہو جائے اس کے یہاں ـــ یوں بھی خیر سے پورے دنوں سے ہے۔ میں تو بس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔ آپ لوگوں سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا اس لیے اسی وقت ہی آ گئی۔" شوکت جہاں نے گویا تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ورنہ وہ رات کو وہیں قیام کرنے کے ارادے سے آئی تھیں

"زچگی بھی خیر سے ہو جائے گی اب بھابی جان کوئی اس انتظار میں تو نہیں بیٹھی ہوں گی کہ ادھر آپ گھر سے باہر قدم نکالیں اور ادھر وہ۔" منجھلی بہو نے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ فقرہ ادھورا چھوڑا تو سب ہنسنے لگے۔

"مگر اللہ کے گھر کی کس کو خبر۔ ویسے بھی بہو کا جی ماندہ تھا۔ میں نے اسے ـــ ڈاکٹرنی کو دکھانے شہر بھیجا ہے۔" شوکت جہاں بولیں۔

"بس تو پھر یہ بات طے ہے کہ آج کی شب آپ ہمارے ساتھ ہی گزاریں گی۔" بدرالنساء بولی۔ جس کی وہ ہمیشہ کلیاں بلیاں ہی لیتی رہتی تھیں۔

"اچھا چلو اگر ہماری بٹیا کی یہی خوشی ہے تو یونہی سہی۔" شوکت جہاں نے گویا اپنے ٹھہرنے کا جھنڈا بدرالنساء پر رکھتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ اور پھر اسے گلے سے لگا کر بولیں۔

"ارے تمہیں تو فرشتوں نے غلطی سے پھوپھی جان کی جھولی میں ڈال دیا ورنہ پیدا تو تم میرے یہاں ہو رہی تھیں۔" اور اس بات پر ایک قہقہہ پڑا ـ سب کے دل ان کے بدرالنساء سے اس قدر التفات برتنے پر شاد ہو گئے تھے۔ کیونکہ سب یہی سمجھتے تھے کہ ان کی یہ محبت بے لوث ہے۔ اب کسی کو کیا معلوم تھا ان کی محبت کے اندر کون سی غرض چھپی ہوئی تھی کہ بظاہر تو ان کا اکلوتا بیٹا بھی اپنے گھر بار والا تھا۔

"اے اگر میری جھولی میں بھی ڈال دیا تو فرق کون سا پڑ گیا۔ بیٹی تو یہ تمہاری ہی ہے۔" مکرم جہاں اتنی زیادہ یگانگت سے متاثر ہو کر بولیں۔

"اچھا اگر اسے میری بیٹی کہہ رہی ہیں تو اب اپنی بات سے پلٹیے گا نہیں پھوپھی جان!" انہوں نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہو کر مکرم جہاں کے ایک جذباتی سے فقرے کو گویا سنجیدگی میں بدلتے ہوئے کہا۔

"اے لو ـــ میں بھلا کیوں پلٹنے لگی۔ وہ بھی تم جیسی جان چھڑکنے والی بہن سے۔ اے ہاں رشتے میں تو تم بدرالنساء کی ماموں زاد بہن ہی ہو۔" مکرم جہاں صدقِ دلی سے بولیں۔

"لیکن میں تو اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں ـــ اور آپ کو بہن ـــ یوں بھی آپ عمر میں مجھ سے صرف تین چار سال ہی تو بڑی ہیں۔" شوکت جہاں دل ہی دل میں ان کی سادہ لوحی پر ہنس کر بولیں۔

"لیجیے اماں جان نے تو رشتے ہی بدل کر رکھ دیے۔" مکرم جہاں کا منجھلا بیٹا ہنس کر بولا۔ اور جواب میں سب کے ساتھ شوکت جہاں بھی ہنسنے لگیں۔

پھر موضوع بدلا تو ادھر ادھر کنبے برادری کی باتیں ہونے لگیں۔ اور پھر باتوں کی کمند ٹوٹی تو زہرہ پر جا کر ـــ جس کی تعریف میں مکرم جہاں اچھی خاصی رطب اللسان نظر آ رہی تھیں ـــ دونوں بہوئیں اور بڑی بیٹی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ اور چونکہ یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی ـ مگر بہت موقع شناس اور معاملہ فہم تھیں۔ برملا تو کچھ نہ کہہ سکیں البتہ پولا سا منہ بنا کر بولیں۔

"ہاں مگر صرف خوبصورتی اور ظاہرداری ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ انسان کی اصل خوبی تو اس کی سیرت اور اخلاق ہوتا ہے۔ اور پھر چونکہ اوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ادب اور آداب سے تو بالکل واقف ہی نہیں اور اخلاق بھی ہما شما سے ہی برتتی ہیں۔ وہ اللہ غریقِ رحمت کرے ہمارے ابا جان یہی کہا کرتے تھے کہ اگر انسان کی خصلتیں اور اخلاق دیکھنا ہو تو اس کے گھر میں جا کر دیکھو۔ کیونکہ گھر ہی انسان کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے۔ ورنہ باہر تو انسان خواہ چاہے یا نہ چاہے اسے سب سے مروت اور اخلاق برتنا ہی پڑتا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں آپا بیگم!" مکرم جہاں کے منجھلے بیٹے کامل نے ان کی باتوں کو سراہتے ہوئے کہا۔ مگر مکرم جہاں ان کی باتوں سے ان کا اصل مقصد اخذ کر کے بولیں۔

"تعجب ہے یہ تمہاری بہو تو بڑی چھپی رستم نکلیں۔ ورنہ بظاہر تو بڑی ہی بے زبان اور بے ضرر سی معلوم ہوتی ہیں۔"

"اے بس رہنے بھی دیں پھوپھی جان اب میرے منہ سے کچھ نہ کہلوائیں۔ وہ بے زبان اور بے ضرر نہیں — بڑی گھنی اور ہوشیار ہے۔ ایسا میرے بیٹے کو مٹھی میں لیا ہے وہ اس کے سامنے مجھے بھی نہیں گردانتا۔ اس پر اول درجے کی پھوہڑ بھی ہے۔ کیا مجال جو کبھی ہاتھ لگائے یا پلٹ کر گھر کو ہی دیکھ لے۔ وہ تو گھر میں اس وقت گدھے ہی لوٹتے دکھائی دیتے اگر میں اپنی جان نہ کھپاتی۔" شوکت جہاں کو واقعی بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ تب منجھلی بہو نے بڑی بہو کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ کیونکہ ان کی ساس تو ساسوں کی طرح انہیں کولہو کے بیل بنا کر رکھتی تھیں۔

"مگر آپا بیگم۔ آپ کے یہاں تو ایک چھوڑ کئی کئی ملازم ہیں۔ پھر آپ کیوں خواہ مخواہ کام کرنے کی زحمت اٹھاتی ہیں۔"

"اے لو — ملازموں سے بھی کوئی گھر چلا کرتے ہیں۔ جب تک گھر والی خود پلٹ کر نہ دیکھے اور ملازموں کی تو وہی مثل ہوتی ہے مال مفت دلِ بے رحم۔ کمبخت بے دردی سے الگ خرچ کرتے ہیں اور ہاتھ کی صفائی الگ دکھاتے ہیں۔" شوکت جہاں بولیں۔

"ہاں بی — یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو — گھر کے کام جب تک عورت خود اپنے ہاتھوں سے انجام نہیں دیتی گھر سنورتا نہیں ہے۔ مگر تمہارا تو سب پر بہت رعب و دبدبہ ہے۔ پھر تم بہو کو ٹوکتی کیوں نہیں۔" مکرم جہاں نے اپنی بہوؤں کے چہروں پر چلبلی مسکراہٹ دیکھ کر کہا۔

"اے ٹوکوں بھی بھلا کیسے۔ وہاں تو ادھر بہو کے پیسے منہ سے کوئی بات نکلی ادھر بیٹے نے چپاتی کی طرح چمٹے سے پکڑ کر توے پر الٹ دی۔" شوکت جہاں نے کہا تو ان کے مثال دینے پر بہوئیں اور بیٹیاں ہنسنے لگیں۔

"تعجب ہے۔ بہو کو میاں کی محبت سے اس قدر ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھانا چاہیے۔ اور یوں بھی شوہر کا گھر ہی لڑکی کا اپنا گھر ہے۔ کیونکہ میکے کی حیثیت تو مہمان خانے کی سی ہوتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں جس عورت کو اپنا سہاگ پیارا ہوتا ہے۔ اسے شوہر کا گھر رشتے دار بھی پیارے ہوتے ہیں۔" مکرم جہاں نے بہت لپیٹ لپاٹ کے اپنی بہوؤں کو سنانے کی غرض سے کہا۔

"ہاں کتنے افسوس کی بات ہے ورنہ بھابھی جان تو اتنی خوبصورت ہیں کہ جی چاہتا ہے بس دیکھتے ہی رہو ان کو۔" بدر النساء نے اس گفتگو میں حصہ لیا۔

"مگر تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہے بہو۔ تم پر تو میری جب بھی نظر پڑتی ہے میں دل میں یہی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں میری نظر بد سے بچائے۔" شوکت جہاں کچھ چمک کر بولیں۔ تو ان کے خدا تمہیں میری نظر بد کہنے پر ایک بار پھر سب ہنسنے لگے۔ تو انہوں نے مکرم جہاں کی بڑی بیٹی اور دونوں بہوؤں کا دل رکھنے کو کہا۔

"یوں تو پھوپھی جان آپ کی دونوں بہوئیں بہت پیاری پیاری صورتوں کی ہیں اور یہ خیر النساء، مہر النساء بھی مگر یہ اپنی بدر النساء کی مثال تو ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند ہے۔" اور مکرم جہاں انہیں چھوٹی بیٹی پر اس قدر صدقے واری ہوتا دیکھ کر کھل ہی اٹھیں۔

"بیٹی بنا کر تو اسے اللہ نے بھیجا نہیں۔ لیکن اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اپنی بہو بنا کر ضرور رہتی۔" انہوں نے آہستہ سے کہ بدر النساء نہ سن سکے۔ خیر النساء کی طرف جھک کر کہا۔ گویا اپنی شبد ایت پر مکھن لگایا۔ خیر النساء خوش ہو کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ تبھی دسترخوان چن دیا گیا — کہ ان کی باتوں سے کھانا بھی تاخیر سے چنا گیا تھا۔ ورنہ وہاں تو وہی مثل صادق آتی تھی کہ دیے بتی پڑی اور لاڈو میری تخت چڑھی — کہ ادھر مغرب ہوئی اور شام نے اپنا سرمئی آنچل لہرایا اور ادھر دیے اور چراغ روشن ہوئے اور رات پڑنے سے پہلے ہی سب کھا پی کر اور لمبی تان کر سو گئے۔

مگر اس روز تو کھانے کے بعد بھی بڑی دیر تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور گیارہ بجے تک جا کر سب کو سلانے کا موقع ملا۔ البتہ عاقل اور کامل (مکرم میاں کے بیٹے) جلد ہی سو گئے تھے کیونکہ عورتوں کی محفل میں مردوں کی شرکت مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔

بہرحال — اگلے روز — ناشتے سے فارغ ہوتے ہی مکرم جہاں کے بصد اصرار روکنے کے باوجود بھی شوکت جہاں رکیں نہیں — اور بہو کی طرف سے پریشانی اور تشویش کا اظہار کرتی ہوئی کوچ کر جانے کے لیے اٹھیں تو خلافِ دستور چونکہ جلدی میں خالی ہاتھ ہی آئی تھیں۔ اس لیے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"اے ستیاناس جائے اس حافظے کا۔ یہ تو بالکل ہی چٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہاں لانے کے لیے دو ٹوکرے پھلوں کے رکھوا نے اور اپنی بٹیا کے لیے ایک چیز — وہ بھی گھر بھول آئی۔ اصل میں شام بھی تو ہو گئی تھی۔ اسی لیے گھبراہٹ میں خیال ہی نہیں رہا۔"

"چلو اچھا ہی ہوا جو بھول آئیں ورنہ جب بھی آتی ہو، ہمیشہ کچھ نہ کچھ ساتھ ضرور لاتی ہو۔ خواہ مخواہ خود کو زیر بار کرنا —"

"اے زیر بار کرنا کیسا۔ لین دین سے تو آپس میں محبت بڑھتی ہے — اور لو کہے تو خیر شام تک بھجوا دوں گی مگر اپنی بٹیا کی چیز میں اسے اسی وقت دوں گی جب یہ میرے گھر آئے گی۔"

"مگر ایسی کیا چیز ہے وہ آپا بیگم! جو آپ نے اس قدر سینت کر رکھی ہوئی ہے؟" بڑی بہو کو اپنے تجسس پر قابو پانا مشکل ہوا تو انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"لو — پہلے سے بتا کر اس کی قدر کھونے سے تو رہی — اور بھئی، وہ تو میری بچی کی چیز ہے۔ سب سے پہلے تو یہی اسے دیکھے گی بعد میں کوئی اور۔ اے پھوپھی جان! اتنا بیٹی بیٹی کہہ رہی تھیں۔ کیا ایک دو دن کے لیے بدر النساء کو میرے ساتھ نہیں بھیج سکتیں؟" انہوں نے اتنی خوبصورتی سے سب کے دلوں میں شوق و تجسس کی چنگاری بھڑکا کر ایک دم ہی بات کا رخ کچھ اس طرح پلٹا کہ مکرم جہاں کو چپ سی لگ گئی۔ کیونکہ انہوں نے آج تک اپنی کسی بیٹی کو اس کے سگے چچا ماموں خالہ اور پھوپھی کے ہاں بھی تنہا نہیں بھیجا تھا۔ اور شوکت جہاں سے تو ان کی بہت دور پرے کی رشتہ داری تھی۔ پھر بھلا وہ ان کی خاطر اپنی کوئی ریت یا اصول کیسے توڑ سکتی تھیں۔

"اصل میں بہو لاکھ مجھ سے دور دور رہتی ہے مگر گھر میں اس کی موجودگی سے دلاسہٹ کا تو احساس ہوتا ہے۔ اور آج کل تو مسعود الحسن بھی بیوی کے ساتھ شہر میں رہ رہے ہیں۔ اسی لیے گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے تو دل اتنا واہی ہوا کہ وقت دیکھا نہ موقع اور یہاں چلی آئی۔ یوں بھی بہو کی طرف سے سخت پریشان ہوں آج کل۔ اسی خیال سے بٹیا کو لے جانا چاہ رہی تھی کہ کچھ تو دل بہلے گا۔" مکرم جہاں کو خاموش اور ہچکچاتا ہوا دیکھ کر شوکت جہاں ان کے یہاں کے دستور اور اصولوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوئے بھی اپنی بات پر جمی رہیں۔

"ہاں ہاں، محبت میں ہی لے جا رہی ہو۔ اے مگر ذرا عاقل اور کامل آجائیں تو ان سے پوچھ لو؟" مکرم جہاں نے گویا نہ بھیجنے کا بہانہ گھڑا۔

"اے — آپ ماں ہیں۔ آپ کی موجودگی میں میں عاقل اور کامل سے اجازت لیتی کیا اچھی لگوں گی؟" وہ کچھ برا مان کر بولیں۔

"پھر بھی، بی بیگم! (وہ انہیں بی بیگم ہی کہتی تھیں۔) باپ کی جا ہوتے ہیں بڑے بھائی۔ ان سے اجازت لینی بھی ضروری ہوتی ہے۔" مکرم جہاں نے انہیں برا مانتے دیکھ کر سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں سچ ہے پرائی اولاد، پرائی ہی ہوتی ہے پھوپھی جان! اور ہم جیسے لوگ نرے بے وقوف ہی ہوتے ہیں جو اپنے پیٹ کی بیٹیاں ہوتے ہوئے بھی پرائی بیٹیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ خیر منجھلی دلہن ذرا اپنے ملازم کو بھیج کر کہاروں سے کہلوا دو کہ ڈولی دروازے پر لگا دیں۔" وہ سچ مچ خفا ہو گئی تھیں۔

"اے اماں جان! آپ کی بھتیجی کے گھر ہی تو جائے گی بدر النساء۔ کسی ایرے غیرے کے یہاں تو نہیں۔ اور یہاں تو اپنے سگوں میں کچھ ایسی کتا چھنی رہتی ہے کہ سچے دل سے ملتے ہی نہیں۔" خیر النساء نے ان کے روٹھ جانے یا بمعنی دیگر ان کی دل آزاری کے خیال سے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا۔ مکرم جہاں ان کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتی تھیں مگر اپنی روایات اور دستور کے ہاتھوں سخت مجبور تھیں۔ انہوں نے اس امید میں براہ راست بدر النساء سے پوچھا کہ وہ خود ہی جانے سے انکار کر کے ان کی پریشانی کو دور کر دے گی۔

"ارے بھئی! اب اس قدر خفا تو نہ ہو بی بیگم! پہلے جس کا معاملہ ہے۔ اس سے تو پوچھ لو کہ یہ جائے گی یا نہیں۔ کیونکہ میرے بغیر تو یہ کہیں جانے کی عادی ہی نہیں، کیوں بدر النساء؟" انہوں نے بدر النساء کی طرف دیکھ کر ساتھ ہی ساتھ آنکھ سے کچھ اشارہ بھی کر دیا۔ مگر بدر النساء کو تو صرف اور صرف اس چیز کے بارے میں معلوم کرنے کی پڑی تھی جو اسے عنایت کرنے کے کارن وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہی تھیں۔ وہ تھوڑا سا بہن کے پیچھے چھپ کر شرملے شرمائے انداز میں بولی۔

"اگر آپ اجازت دیں گی تو آپا بیگم کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اور مکرم جہاں کو اس کی اس بدتمیزی پر غصہ تو بہت آیا مگر اب تو اس نے اجازت نہ دینے کی ان کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ بلکہ الٹا ان کے سامنے شرمندہ کر کے رکھ دیا تھا۔ آخر بادل نخواستہ انہیں اجازت دینی ہی پڑی۔ اور اجازت ملتے ہی شوکت جہاں کھل اٹھیں۔ فوراً ہی اس کے کپڑے تبدیل کرا کے اور دو جوڑے کپڑوں

کے مع تولیہ، کنگھی اور موباف گٹھڑی میں بندھوا کر (اس زمانے میں گٹھڑی میں ہی کپڑے وغیرہ رکھنے کا رواج تھا) اسے اپنے ساتھ ڈولی میں بٹھوایا اور اسے لے کر گھر آ گئیں۔

گھر کو تو آجکل انہوں نے نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔

دو نوکر ڈیوڑھی پر تعینات تھے۔ ایک ماما کھانا پکاتی تھی۔ اور دوسری گھر کی صفائی ستھرائی پر مامور تھی۔ سجو اوپر کے کام دیتا تھا۔ اور رشیدن ان کی خدمت۔ علاوہ ازیں ایک سائیس، ایک مویشیوں کا رکھوالا اور دونوں کہار بھی ان کے نمک خوار تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے بدرالنساء کے لیے متنجن اور کھڑا قورمہ تیار کرایا کہ خشکہ (سادے چاول) اور رائتہ اور دال تو ہر کھانے پکنے لازمی تھے۔ اور ان کے علاوہ کوئی نہ کوئی سالن بھی ضرور پکتا تھا۔ اور مٹھاس کے بغیر تو کھانا کھانے کو بے سود سمجھا جاتا تھا۔ آموں کا موسم تھا اس لیے آم بھی رکھنے ضروری ہوتے تھے۔ اور بدرالنساء کو مرعوب کرنے کے لیے اس روز انہوں نے کچھ زیادہ ہی اہتمام کر لیا تھا۔

کھانا بھی ان کے یہاں کھانے کے کمرے میں نیچی نیچی چوکیوں پر کھایا جاتا تھا جو میزوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ بزرگوں سے سنتی آئی تھیں کہ سرخ رنگ کے کپڑے یا دسترخوان پر کھانا رکھ کر کھانے سے بہت برکت ہوتی ہے۔ لہٰذا زیادہ تر سرخ یا سرخ پرنٹ کے دسترخوان ہی استعمال کرتی تھیں۔ کھانے کے کمرے کے عین بیچوں بیچ پرانے زمانے کا، یا دوسرے معنوں میں غدر کے وقتوں کا جھاڑ، فانوس لٹک رہا تھا کیونکہ وہ مغلئی طرز کا تھا۔ اور مستطیل چوکی کے بیچوں بیچ اور تھوڑا تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ کر دائیں بائیں تین نقرئی شمع دان رکھے تھے۔ اور وہی اپنے موجد کی پہلی ایجاد گھوں گھوں کرتا اور کھڑکھڑاتا ٹیبل فین خلاف توقع بڑی سبک خرامی سے چل رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے ایک طرف جائنٹ سائز نقشین سلابچی اور آفتابہ رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی تپائی پر صابن دانی میں صابن کی ٹکیہ بھی موجود تھی۔ اور ایک ملازمہ تولیہ لیے آفتابے کے پاس ایستادہ تھی۔ رشیدن پانی پلانے کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ اور بادرچن کھانا کھلوانے کی۔ اس پر اتنی ڈھیر ساری نعمتیں۔ بدرالنساء نے بھلا ایسے کروفر کہاں دیکھے تھے۔ وہ کچھ کچھ کمپلیکس کا شکار اور شرمائی شرمائی سی، بہت جھجک جھجک کر کھانا کھا رہی تھی۔ اور شوکت جہاں تھیں کہ اس کی خاطر داری پر بچھی جا رہی تھیں۔ پھر کھانا ختم ہوا تو وہ اسے اپنے کمرۂ خاص میں لے گئیں۔

جس کے آمنے سامنے دونوں دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی تھیں۔ پنکھا بھی وہیں منگوا لیا۔ حالانکہ اس کمرے میں جھالر لگا کپڑے کا ایک پنکھا بھی چھت میں لٹک رہا تھا۔ مگر وہ بھی چونکہ ان کے شوہر کی ایک یادگار یا نشانی ہی تھا۔ اس لیے ٹیبل فین کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اسے اتروایا نہ تھا۔ بہرحال سجو خس کی اس ننھی جیسی ٹٹیوں پر پانی ڈالتا رہا اور وہ دونوں کمروں میں بچھی چاندنی پر لیٹی آرام کرتی رہیں — اور بدرالنساء تو اس ٹھنڈے ٹھنڈے ماحول میں پڑ کر ایسی سوئی کہ سہ پہر کو ہی اس کی آنکھ کھلی اور اس کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کو مگر یہ وقت شوکت جہاں کے برآمدے میں جا کر بیٹھنے کا تھا۔ وہ اونچی آواز میں برآمدے کا رخ کرتی ہوئی سجو سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اور ان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس لیے وہ بھی جلدی سے اٹھ بیٹھی اور ان کے پیچھے پیچھے برآمدے میں ہی آ گئی۔ اور سجو نے جھٹ پٹ پنکھا وہاں سے برآمدے میں منتقل کر دیا اور ابھی اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ تبھی مسعودالحسن آ گئے۔ ایک نئی صورت کو دیکھ کر ہی نہیں بلکہ وہ ایک مرد تھے اور وہ پردہ نشین۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی تو شوکت جہاں نے کہا۔

"ارے جا کہاں رہی ہو بدرالنساء! یہ تو اپنے مسعودالحسن ہیں۔ ان سے بھلا کیا پردہ — یہ رشتے میں تمہارے بھانجے ہی لگتے ہیں۔" اصل میں یہ بات انہوں نے بیٹے پر یہ جتانے کو کہی تھی کہ بدرالنساء آ گئی ہے۔ اسے بھی نظر بھر کے دیکھ لو۔ مسعودالحسن نے جو اپنی ہی کسی فکر میں غلطاں اور پیچاں تھے اور اپنی دھن میں انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ ماں کے پاس کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ ماں کے جتانے پر چونک کر انہوں نے اس طرف دیکھا، جہاں بدرالنساء کھڑی تھی۔ بلکہ بھاگ کر اندر کمرے میں چھپ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس نے تربوزی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور بس وہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکے تھے۔ کیونکہ وہ بھاگ کر اندر چلی گئی تھی۔ مگر انہیں کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے شفق کے شنگرفی رنگوں میں کوئی کہربائی کرن سی لہرائی ہو۔ مگر اچانک ہی نظروں کے سامنے سے آ کر گزر جانے والے کسی وژن کی طرح انہوں نے اس نظارے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ کہ ایک تو وہ گزشتہ شب کے گئے گئے اس وقت واپس آئے تھے۔ دوسرے زہرہ کی طرف سے سخت پریشان تھے۔ جو ساری رات بخار میں تپتی رہی تھی۔ اور لیڈی ڈاکٹر کی انتھک کوششوں اور توجہ سے اب سہ پہر کو کہیں جا کر پارہ گرا تھا۔ مگر زچہ

ابھی باقی تھی۔ اور اس پر سخت نقاہت طاری تھی۔ جب کہ بچی بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ مگر زہرہ کی پریشانی میں انہوں نے اسے ٹھیک طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تمام رات آنکھوں میں کاٹ دینے کی وجہ سے وہ بری طرح تھک گئے تھے اور اس وقت وہ منہ ہاتھ دھو کر تھوڑی سی دیر آرام کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس زمانے میں سہ پہر کو چائے پینے کا رواج عام نہ تھا۔ جیساکہ قریہ قریہ اور قصبے قصبے آج کل ہے۔ مکھانوں کے ستو اور چاول وغیرہ کے ستو یا کوئی مفرح مشروب وہ بھی مٹکے یا صراحی کے پانی میں گھول کر پلا دیے جاتے تھے کہ یوں بھی وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جہاں ان کی جائیداد اور جاگیر وغیرہ تھی۔ ورنہ شہر میں تو برف بھی ملتی تھی۔ مگر مسعودالحسن کی نشست و برخاست چونکہ معزز اور تعلیم یافتہ طبقے میں تھی۔ اس لیے وہ بھی سہ پہر کو چائے پینے کے عادی ہو گئے تھے۔

ماں کو یہ معلوم تھا کہ بدرالنساء کی موجودگی کی وجہ سے اب وہ اس طرف نہیں آئیں گے۔ مگر نہا دھو کر باہر ہی باہر چلے جائیں گے۔ اس لیے سجو کے ہاتھ چائے کی ٹرے ان کے کمرے میں بھجوا لینے کے بعد وہ خود ہی وہیں چلی آئیں۔ اسی اثناء میں مسعودالحسن غسل سے فارغ ہو کر اور لباس تبدیل کر کے اپنی انیسویں صدی کی لمبی چوڑی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے اپنے بال سنوار رہے تھے۔ شوکت جہاں نے ان کے پلنگ پر بیٹھ کر تپائی تھوڑی سی اپنی طرف سرکائی اور کیتلی سے ان کے لیے پیالی میں چائے انڈیلتی ہوئی بولیں۔

"اے کل کے گئے گئے اب نکل کے آئے ہو اور پھر کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ اے میں کہتی ہوں کبھی تمہارا تلوہ گھر میں ٹکے گا؟"

"میرا تلوہ تو اب اسی وقت ٹکے گا جب زہرہ یا تو اللہ کو پیاری ہو جائے گی یا پھر صحت یاب ہو کر گھر آ جائے گی جس کی امید بہت کم ہے۔" جواب انتہائی چڑچڑے ہوئے لہجے میں ملا۔

"اے بس چھوڑو یہ نخرے بازیاں۔ اس نے تو ایک ہی جنی ہے۔ اور ہم تو پانچ پانچ جن چکے ہیں۔ ہم بھی آخر انسان ہی تھے۔ چودھویں برس شادی ہو گئی تھی ہماری اور پندرہویں برس خیر سے تم پیدا ہو گئے اور وہ بھی گھر پر ہی، ہسپتال میں نہیں۔ لیکن ہمیں تو کبھی چھینک بھی نہیں آئی۔" بیٹے کے جواب سے زیادہ اندازِ تخاطب پر شوکت جہاں جل کر بولیں۔

"اماں! آخر کچھ تو خدا کا خوف کیجیے۔ وہ بے چاری مرنے کے قریب ہے۔ ہسپتال کا سارا عملہ اس کے لیے پریشان ہے اور آپ ہیں کہ اس کے خلاف کوئی اور ہی چکر چلا رہی ہیں۔" وہ ان کی جلی کٹی سے بھنا سا اٹھا اور اس کی بات سن کر ایک لمحے کو دل ہی دل میں خوش ہو کر انہوں نے سوچا۔ "چلو مری تبھی تو خس کم جہاں پاک۔" مگر دوسرے ہی لمحے دل ہی دل میں توبہ کر کے بولیں۔

"نہیں نہیں۔ حاشا و کلا۔ میں تو اس دکھیاری کے ساتھ کوئی چکر نہیں چلا رہی۔ بلکہ کل جب سے تم کہہ کر گئے ہو کہ اس کا جی ماندہ ہے مجھے اس کی فکر کھائے جا رہی ہے۔"

"جی ہاں ضرور جبھی تو آپ نے اپنی ان منظورِ نظر کو اپنے فکروں سے نجات پانے کے لیے بلا لیا ہے۔ مگر یہ آ کیسے گئیں؟ ان پردہ نشینوں کے یہاں تو کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" انہوں نے ماں کی قسم کا بھی اعتبار نہ کیا اور اصل موضوع پر آ گئے۔

"اے یہ ساری پابندیاں تو باپ کی زندگی تک ہی تھیں — کہ زمانہ بدل گیا تھا اور لکیر کے فقیر بنے بیٹھے تھے۔ اپنی اسی ضد [illegible] جہاں بیٹی کو بھی بوڑھا کر دیا۔ بھلا بیٹی کی جوانی برباد کر کے اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر گئے ہوں گے۔ اے جوان بیٹی کی جلد از جلد شادی کرنے کا، حج کے فریضہ سے بھی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ اب باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی بیٹوں نے منجھلی کو غیر خاندان میں بیاہ کر توڑ دی نا ساری ریت، رواج۔" شوکت جہاں نے جان بوجھ کر بیٹے کو بدرالنساء کے خاندان کے سارے حالات سے آگاہ کیا۔

"اچھا تو کیا پردہ بھی اڑوا دیا بہنوں کا بٹن صاحب کے بیٹوں نے؟" انہوں نے طنز سے پوچھا۔

"اے لو جی — پردہ کیوں اڑوانے لگے عاقل، کامل۔ بلکہ انہوں نے تو بہت ثواب کا کام کیا ہے۔ ایک جاہلانہ رسم توڑ کر۔" جواب میں مسعودالحسن خاموش رہے اور اپنے بستر پر ایک طرف ٹک کر انہوں نے چائے کی پیالی ٹرے سے اٹھا لی۔

"پتا نہیں اپنا کلیجہ کیوں جلاتے ہو اس بھبکتی گرمی میں گرم گرم چائے پی کر۔ اس سے بہتر ہے کہ دودھ کی لسی ہی پی لیا کرو۔" ماں ہزاروں بار کہا ہوا فقرہ پھر دہرا کر بولیں۔

"بس کچھ عادت سی پڑ گئی ہے اماں!" انہوں نے کسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے کہا۔
"کہیں جانے کا ارادہ ہے؟" ماں نے دبی زبان سے پوچھا۔
"نہیں، ابھی تو نہیں۔ البتہ رات کو ضرور جاؤں گا۔" وہ بھی دھیمی سی آواز میں بولے۔
"کیا ہسپتال؟" ماں نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ ظاہر ہے وہیں۔" وہ قدرے چونک کر بولے۔
"اے تو کیا وہاں رات کو ٹھہرنے کی اجازت ہے؟" شوکت جہاں کو بیٹے کا بہو پر اس قدر مائل ہونا سخت کَھل رہا تھا۔
"اور کسی کو نہیں لیکن مجھے ضرور ہے۔ کیونکہ زہرہ کے کیس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔"
"اے ہاں، کیا تکلیف ہے بے چاری کو؟" انہوں نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔
"واہ بہت جلد خیال آیا اس کی خیریت پوچھنے کا۔" بیٹے نے پھر طنز کا تیر چلایا۔
"اے تو کیسے پوچھتی کل تو تم بیٹی ہونے کے صدمے میں مبتلا تھے۔ اور پھر جاپے اور زچگیاں تو آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں تو ان پر بھی کسی نہ کسی طرح قابو پا لیا جاتا ہے۔" شوکت جہاں بیٹے کے طنز پر جھک کر بولیں۔
"اچھا۔ اگر بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتا تو کیا اس وقت بھی آپ یہی کہتیں؟" مسعود الحسن نے مسکرا کر پوچھا۔
"ہاں، تو اور کیا کہتی۔ اے کیا میرے یہاں اولاد نہیں ہوئی۔ تمہاری بہنوں کے یہاں اولادیں نہیں ہوئیں۔ لے، کوئی دنیا سے نرالی اور انوکھی بات تو نہیں ہے۔ یہ وقت تو ساری عورتوں پر آتا ہے۔"
"خیر آتا ہوگا مگر زہرہ پر تو مصیبت بن کر ہی آیا ہے۔ اور بیٹی ہونے کا مجھے تو ذرا سا بھی ملال نہیں۔ بلکہ میں تو بہت خوش ہوں اور اگر میری قسمت میں یہی ایک بیٹی بھی لکھی ہے تو میں اس کی بیٹوں کی طرح ہی پرورش کروں گا۔"
"اے خدا نہ کرے جو تمہاری قسمت میں یہی ایک بیٹی لکھی ہو۔ یہ تو تمہاری ہی مرضی اور اختیار پر موقوف ہے کہ تم چاہو تو تمہیں ولی عہد بھی میسر آ سکتا ہے۔ اے اللہ رکھے تم تو مرد ہو۔ تمہیں نہ تو عورتوں کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ نرینہ اولاد کی۔"
"افوہ! اماں — پھر وہی ذکر؟" وہ جھنجلا کر بولے۔
"ہاں تو اس ذکر کے سوا اور تم سے کہوں بھی کیا۔ عقل سے کام لے کر ٹھنڈے دل سے سوچو۔ چلو ایسا ہی ہے تو زہرہ کو طلاق نہیں دینا۔ تمہارے باوا بھی مجھ پر سوت لے آئے تھے اور تمہارے چچا نے بھی یہی کیا تھا۔ ہمارے یہاں تو یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"
ماں کہتی رہیں اور وہ چائے کے گھونٹ لیتے خاموشی سے سنتے رہے کہ ماں کی عادت سے واقف تھے۔ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹ جانے کی عادی تھیں۔ اور پھر کہاں تک ان کی بات کی نفی کرتے — اور ان کی خاموشی سے ماں سمجھیں کہ ان کا جادو چل گیا ہے۔ بڑی لجاجت سے بولیں۔
"ہاں ہاں اچھی طرح سوچ لو۔ لڑکی کی ایک جھلک تم نے دیکھ لی ہے اور نہیں بھی دیکھی تو میں تمہارے سامنے۔ خود اسے ہی لا کھڑا کر دوں گی۔ ایمان سے لعل بدخشاں ہے وہ تو۔ ایسا نادر دانہ ڈھونڈے نہ ملے گا۔"
"لاحول ولا — اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ — آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے پرانے زمانے میں بردہ فروش بولیاں لگاتے تھے۔ ویسے ہوں گی تو وہ — اچھی ہی۔ کیونکہ سارا خاندان ہی خوبصورت ہے۔" بیٹے نے کچھ مسکرا کر اور کچھ چڑ کر کہا۔ تو شوکت جہاں کی جیسے بن ہی آئی۔
"مگر وہ تو یکتا ہے اپنے خاندان میں۔ جا اگر اسے دیکھنا — چاہتا ہے تو میرے کمرے میں کسی کام کے بہانے چلا جا۔ تجھے مجبور تو نہیں کر رہی کہ صرف اسی سے شادی کر۔ مگر کم از کم اسے اچھی طرح دیکھ تو لے —"
"نہیں نہیں، توبہ کریں اماں! اب میں ایک پردہ نشین کے تقدس کو یوں دھوکے سے پامال کرنے سے تو رہا۔ اب یہ گھر آ گئی ہیں تو کبھی تو آمنا سامنا ہو ہی جائے گا۔" وہ گھبرا کر بولے۔
"اے کوئی ہمیشہ کے لیے یہیں ڈیرے ڈالنے کی غرض سے تو نہیں آئی بے چاری۔ بس زیادہ سے زیادہ کل شام تک اُ[illegible]

ٹھ چلی جائے گی۔ اتنی مشکلوں سے پھوپھی جان کو پٹا کر تو لائی ہوں اسے۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔
"اچھا ٹھہرو۔ میں بس ابھی آتی ہوں۔" شوکت جہاں کسی خیال سے اٹھتی ہوئی بولیں۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئیں۔ بیٹا حیران و ششدر بیٹھا رہ گیا۔ شاید وہ یہی سمجھا کہ ماں بدرالنساء کو لینے گئی ہیں۔ اور اسی خیال سے اس کے پسینے سے چھوٹنے لگے۔ مگر جب کچھ ہی دیر بعد ماں ہاتھ میں ایک پوٹلی سی لیے تنہا ہی کمرے میں واپس آئیں تو ان کی جان میں جان آئی۔
"یہ پوٹلی سنبھالو۔ اس میں بمبئی کے کاریگروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے طلائی کنگن ہیں۔ بڑی نادر چیز ہے یہ۔" اور انہوں نے بیوقوفوں کی طرح ان کے ہاتھ سے وہ پوٹلی لے کر ان کی طرف دیکھا۔
"ارے — اس طرح منہ کھولے کیا دیکھ رہے ہو۔ اس کی کچھ خبر نہیں کب چلی جائے۔ اس سے یہ کہنا کہ چونکہ تم پہلی بار یہاں آئی ہو اس لیے ہماری یہ رسم ہے کہ ہم آنے والے کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے اور میں —" مگر وہ تو اچھل کر کھڑے ہو گئے۔
"نہیں، نہیں اماں! معاذ اللہ — میں ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو خود ہی دے دیجیے۔"
"اے لو — ایک بیٹی کا باپ ہو گیا اور پھر بھی کم سن لڑکوں کی طرح بدکا جا رہا ہے۔ اسے! یہ تو تیرے خاندان کے وقار اور عزت کی بات ہے۔ خیر — چل، ایسا ہی ڈرپوک ہے تو لا مجھے دے یہ پوٹلی۔ اور میرے ساتھ چل۔" شوکت جہاں کے زرخیز دماغ نے وہیں کھڑے کھڑے کوئی اور ترکیب سوچ لی۔
"لیکن میرا آپ کے ساتھ جانا ایسا کیا فرض ہے — اور میں تو یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ ساری رات زہرہ کی پریشانی میں آنکھوں میں کاٹنی پڑی تھی۔" بیٹے نے گویا ان کے ساتھ نہ جانے کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔
"اے تو آرام بھی کر لینا۔ کوئی میں تمہیں اس پر پہرہ دینے کی غرض سے تو نہیں لے جا رہی۔ اور میں تو اسے یہیں بُلا لیتی لیکن یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے اس لیے نہیں بُلایا۔ آؤ — چلو تو کسی طرح۔" ماں نے یوں کہا جیسے سخت عاجز آ گئی ہوں۔
"اچھا اماں! چلا بھی جاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ پہلے ذرا خود کو تیار تو کر لوں۔ آپ نے تو خواہ مخواہ اس معاملے کو تماشا ہی بنا لیا۔" مسعود الحسن کو آخر گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے مگر یہ وہی جانتے تھے کہ ماں کو ٹالنے کا محض ایک بہانا تھا۔ کیونکہ بیٹے کو رضامند دیکھ کر ان کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی اور انہوں نے بیٹے سے مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ وہ پوٹلی لے کر واپس چلی گئیں۔
ماں کے جانے کے بعد — وہ بستر پر اطمینان سے لیٹ کر ماں کی باتوں پر دیر تک غور کرتے رہے۔ وہ اگر کسی غلط اقدام کے لیے انہیں مجبور بھی کر رہی تھیں اور وہ اس پر بالکل تیار بھی نہ تھے۔ تب بھی سوچنے اور غور کرنے کے دوران وہ دوشیزہ ان کی آنکھوں میں برابر جھلکیاں مار رہی تھی کہ حسن کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر صاف طور پر آنکھوں کے سامنے آ جائے تو انسان اسے بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر ایک ہلکی سی جھلک دکھا کر چُھپ جائے تو انسان کے احساسات اور جذبات میں ایک تڑپ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جونہی کوئی ایسا احساس اُبھرتا مسعود الحسن فوراً ہی اپنے خیالات کا رُخ زہرہ کی طرف پھیر دیتے۔ یوں بھی اتنی حسین بیوی کو جس کے حُسن کی ہر باریکی سے وہ آشنا تھے کس طرح فراموش کر دیتے۔
مگر ہوا کچھ یوں کہ جب دو تین گھنٹے سو لینے کے بعد ڈھلتی ہوئی شام میں یا رات کے اوّلین پہر کے آغاز میں ان کی آنکھ کُھلی تو دیوار پر آویزاں گھڑیال پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ سوئیاں آٹھ بج جانے کا اعلان کر رہی تھیں اور چونکہ بازار سے زہرہ کے لیے چند بہت ہی ضروری انجکشن اور ادویات خریدنی تھیں۔ اس لیے وہ جلد جلد تیار ہو کر بڑی راہداری میں آ گئے تاکہ سجو یا کسی ملازم سے کہہ کر بگھی تیار کرائیں۔ وہ سجو کو آواز دینے ہی والے تھے کہ سامنے ہی کچھ فاصلے پر وہ کھڑی ہوئی نظر آئی۔ راہداری موی شمعوں سے روشن تھی۔ اور اب — ہزار پردوں میں چُھپا حُسن ان کے سامنے بے نقاب ہو گیا تھا۔
سرو قد — سڈول جسم — چاندی کی طرح دمکتی ہوئی رنگت — محجوب اور سراسیمہ سا انداز۔ اُف، وہ تو لعلِ بدخشاں ہی نہیں اس سے بھی کوئی ماورا چیز ثابت ہوئی تھی۔ چند ثانیوں کو تو وہ نظر جھپکانا ہی بھول گئے۔ مگر پھر ایک دم ہی کچھ

خیال آیا تو ہکلا کر بولے۔

"ہم آپ کے بڑے احسان مند ہیں کہ آپ نے ہمارے غربت کدے تک آنے کی زحمت کی۔ نہیں نہیں بلکہ شرف بخشا۔" یہ بات ہی بکھ اس مضحکہ خیز انداز میں کہی تھی کہ جو بھی سنتا، اور ان کی بوکھلاہٹ کو دیکھتا ہنسے بنا نہ رہتا۔ ہزار ضبط کے باوجود وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور ادھر وہ تو جیسے چاروں خانے چت ہی ہو گئے کہ ادھر تو اس کی ہنسی کی آواز کانوں میں نقرئی گھنٹی بن کر گونجی، اس پر آبدار موتی جیسے دانتوں کی ہموار لڑی۔ یوں لگا جیسے ستاروں کی کوئی لکیر بدرالنساء کے خوبصورت ہونٹوں کے درمیان یکلخت جھلملا اٹھی ہو۔

"ہم بھی آپ کے بڑے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں اتنے گراں بہا تحفے سے نوازا۔" وہ انہیں اس قدر مبہوت دیکھ کر شرم سے گلگوں ہوتے چہرے کے ساتھ بولی۔

"ہیں۔ کیسا تحفہ ہم سمجھے نہیں؟" وہ اس سے جواب کے بالکل متوقع نہ تھے۔ اس لیے اسے بولتا دیکھ کر ان کی سٹی کچھ ایسی گم ہوئی کہ ماں کے جتا دینے کے باوجود کنگنوں کو بالکل۔ بھول ہی گئے تھے۔

"یہ۔ یہ کنگن۔ واقعی بہت خوبصورت ہیں۔" وہ کوئی الھڑ اور نادان لڑکی نہیں تھی۔ بلکہ پورے چوبیس برس کی پختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے حسن سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ دونوں ہاتھ ان کے سامنے بڑھا کر بولی۔

"اوہ، اچھا اچھا یہ کنگن۔" وہ کنگنوں سے زیادہ اس کی کندنی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگے۔ پھر اپنی اسی بوکھلاہٹ میں بولے۔

"لیکن۔ لیکن آپ کی کلائیوں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔" اور اس نے لاجونتی کے پودے کی طرح شرما کر ڈبکی کھائی۔ تبھی معاً انہیں احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں اور کس پوزیشن کھڑے ہیں۔ تو کچھ ایسے سٹپٹائے کہ اس کے ہاتھ چھوڑ تیزی سے باہر چلے گئے اور بدرالنساء نے بمشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکی۔ اور سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک کمرے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑی شوکت جہاں نے جو سب کچھ دیکھ اور سن چکی تھیں، اپنی اتنی زبردست کامیابی پر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے دوڑ کر بدرالنساء کو گلے سے لگا لیا۔

وسیع و بسیط آسمان پر طلوع کے آثار کب سے ہویدا ہو چکے تھے۔ شاہ خاور کی سواری ابھی مشرقی افق سے آسمان کے انتہائی آخری کناروں پر نمودار ہی ہوئی تھی۔ زندگی کے ہنگامے تو خیر پو پھٹنے سے قبل ہی جاگ اٹھے تھے لیکن شوکت جہاں کی صبح تمام رات سر میں شدید درد رہنے کی وجہ سے اب ہوئی تھی۔ ان کی پیشانی پر کسی باریک کپڑے کی پٹی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی اور وہ ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ تبھی مسعود الحسن ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے انہیں سلام کر کے بولے۔

"اگر زہرہ سے ایسی ہی نفرت تھی تو کم از کم آپ نے پوتی کو تو آ کر دیکھ لیا ہوتا۔ وہ بچی کو نکاح میں تو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی اماں۔" بیٹا ایک تو آتے ہی بلا تمہید شروع ہو گیا تھا۔ دوسرے نہ سلام نہ احوال پرسی۔ اس پر کہہ بھی کیا رہا تھا کہ شوکت جہاں تلملا ہی اٹھیں۔ بڑی خشونت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر بیٹے کی اتنی ٹیڑھی بات کا جواب پھر بھی نہ بن سکا کہ خود مجرم ضمیر تھیں۔ بہو گزشتہ روز پورا ایک ہفتہ ہسپتال میں گزار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ اور انہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ کم از کم اس کے کمرے میں جھانک ہی آتیں۔ بلکہ وہ تو بہو کے آنے کی خبر سنتے ہی اپنی ایک عزیزہ کی عیادت کو چلی گئی تھیں۔ شام کو واپس آئیں تو سر میں شدید درد کا بہانہ کر کے بلا کھائے پیے ہی سو گئی تھیں۔ بیٹے کی گفتگو اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی تکلیف یعنی سر درد کو بالکل گردانا ہی نہیں۔ اس لیے تلملا اٹھنے کے باوجود بھی انہوں نے نہایت تحمل سے کام لیتے ہوئے گلے کا سا انداز اپنایا۔

"اے لو اس موئے آدھا سیسی کے درد میں تڑپ تڑپ کر پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ اب کہیں جا کر اونگھ میں آئی ہوں تو تم گلے شکوے کرنے بیٹھ گئے۔ جھوٹے منہ اتنا بھی نہ پوچھا کہ اماں تم کیسی ہو۔ دراصل میرے دودھ میں ہی کچھ خرابی تھی جبھی تو میری ساری اولاد ہی میری طرف سے غافل ہے۔"

"مگر اماں! کل شام تو آپ بالکل بخیر و عافیت تھیں بلکہ پورا دن خالہ سرور جہاں کے ہاں گزار کر آئی تھیں۔ پھر وہاں سے آتے ہی یہ اچانک آدھا سیسی کا دورہ کیسے پڑ گیا آپ پر۔" بیٹا بھی ان سے سخت کبیدہ تھا۔ بڑے طنز بھرے انداز میں بولا۔

"اے لو تو کیا میں مکر کر رہی تھی۔ یا پھر سر پر پٹی باندھ کر کوئی ڈھونگ رچا رہی ہوں میں نے۔ ارے میں نے تو اس موئے درد کی وجہ سے رات کا کھانا تک نہیں کھایا۔ یقین نہ آئے تو جا کر رسولن اور رشیدن سے پوچھ لو جو ایک بھورا بھی رات کو منہ میں

رکھا ہو تو سور اور حرام کے برابر ہی ہو۔" انہوں نے بیٹے کی بات پر چیک کر کہا۔

اپنے کھانے پینے کو وہ بہت اہمیت دیتی تھیں اور بیٹے کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی اور یہ بھی کہ وہ باتوں میں ماں سے جیت نہیں سکتے۔ زیادہ کچھ کہیں گے تو وہ رونے اور چلانے لگیں گی۔ مگر اس لمحے ان پر سخت کوفت سوار تھی۔ وہ ان کی بات کے جواب میں بولے۔

"خیر، مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں اماں۔ میں تو بس آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات پر بڑی خوشی اور فخر ہے کہ بیٹی کی صورت میں مجھے اللہ پاک نے اپنی ایک امانت سے نوازا ہے۔ اور مجھے یہ بالکل گوارا نہ ہو گا کہ اس سلسلے میں آپ اپنی طرف سے دوسروں کو کوئی غلط تاثر دیں۔" انہوں نے یہ بات بہت تیکھے اور تنبیہی لہجے میں کہی تھی جس پر شوکت جہاں بھڑک کر بولیں

"اے میں خوب جانتی ہوں۔ تو یہ اپنی زبان نہیں بلکہ بہو کی زبان بول رہا ہے ورنہ اب سے پہلے تو تیرے منہ میں زبان کے بجائے تولہ بھر کا گوشت کا لوتھڑا ہی تھا۔ تو بھلا کیسی خوبصورتی سے لیپا پوتا ہے اس خطامہ نے اپنی کمزوری کو۔"

"لاحول ولا اماں۔ خدا کو یاد کریں۔ اس بے چاری نے زبان سے تو کیا اشارۃً اور کنایتاً بھی مجھ سے آپ کی بیگانگی کا گلہ نہیں کیا اور آپ ہیں کہ کتنا بڑا اتہام لگا رہی ہیں اس بے گناہ پر۔ یوں تو بڑی باشرع ہیں آپ؟" ان کی بدگمانی پر بیٹے کو بھی تاؤ آ گیا وہ قدرے ملامت بھرے انداز میں بولا۔

"اے ہاں میں تو تیرے خیال میں بے دین اور بے ایمان ہوں۔ جبھی تو تو مجھے اتنا بڑا طعنہ دے رہا ہے بچے۔ لے ماں تو اگر کوٹھے پر بھی بیٹھنے والی ہو تو اولاد کی نظر میں اس کا درجہ بھی ماں کا سا ہی ہوتا ہے۔" شوکت جہاں بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر تھیں۔ بگڑ کر بولیں۔

"توبہ توبہ استغفار اماں۔ آپ سے تو بات کرنا بھی محال ہے۔ خدانخواستہ باشرع کہنے سے میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔" مسعود الحسن ان کی اتنی سخت سست سے گھبرا کر بولے۔

"اے بات کرنا ہی کیا یہ کہو کہ اب تو تمہارے ساتھ رہنا بھی محال ہو گیا ہے۔ اور تم سے کچھ بعید نہیں کہ ایک دن تم یہ بھی کہہ دو گے۔ آخر اس حرافہ کا چلایا ہوا جادو کبھی تو سر چڑھ کر بولے گا" اور ماں کی ایسی رکیک باتوں نے تو بھڑ بھڑا انہیں سر تا پا سلگا کر رکھ دیا۔

"اماں۔ زہرہ کو اپنے غلیظ خطابات سے نوازنے سے پہلے یہ سوچ لیا ہوتا کہ وہ میری بیوی اور اس گھر کی عزت ہے۔ اگر آپ اسی طرح اس کی تذلیل کرتی رہیں تو پھر میں بھی اسے اور اپنی بیٹی کو لے کر پتھر والی حویلی منتقل ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" مسعود الحسن نے بڑے طیش کے عالم میں گویا وارننگ دی اور پھر فوراً ہی کمرے سے ہی نہیں بلکہ گھر سے ہی باہر نکل گئے کیوں بھی وہ اس وقت کہیں باہر جانے کے ارادے سے تیار ہو کر آئے تھے۔ مگر شوکت جہاں یوں سُن سی بیٹھی رہ گئیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ پھر یکلخت ان کا ساکت سا جسم حرکت میں آیا۔ دونوں ہاتھ سر پر بندھی پٹی کی جانب اٹھے اور پھر نوچنے کے انداز میں انہوں نے پٹی کو اتار کر دور فرش پر دے مارا۔ اور اپنی لحیم شحیم مسہری کی پٹی تک کھسک کر دونوں پیر فرش پر لٹکا دیے۔

"ہوں تو یہ بات ہے موئی ڈائن، چڑیل، چھل پیری۔" انہوں نے معنی خیزی سے سر ہلا کر نہ معلوم کس کی صفات کو گنتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا اور اٹھتی ہوئی بولیں۔

"پہلے میرے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالا اور اب میرے لختِ جگر کو بھی مجھ سے چھیننا چاہتی ہے۔ اری میں تو تیرا بیٹنوا مر دوں گی۔ بدبخت نامراد۔" ان کا سانولا سا چہرہ غصے اور جلن سے تپ سا رہا تھا اور آنکھوں میں بڑی غضبناک ہی نہیں خطرناک سی چمک عود کر آئی تھی مگر بستر سے اٹھنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھیں بلکہ سامنے مقابل کی دیوار تک جا کر بڑی اضطراری سی کیفیت میں پھر اپنی مسہری پر آ بیٹھی تھیں۔

اصل میں پتھر والی حویلی ان کی سوت منور خاتون کی ملکیت تھی جسے ان کے شوہر اپنی زندگی میں ہی منور خاتون کے نام کر گئے تھے۔

اور وہ منور خاتون کا ذکر تو کیا نام بھی سننا گوارا نہ کرتی تھیں۔

کجا کہ ان کا اکلوتا اور عزیز از جان بیٹا انہیں منور خاتون کے ہاں منتقل ہونے کی دھمکی دے گیا تھا۔

جب کہ ان کے دائرہ علم میں یہ بات کسی گمان کی طرح بھی نہ آئی تھی کہ بیٹے کا ان سے کوئی رابطہ یا تعلق ہے۔

کیونکہ انہوں نے تو بچپن ہی سے خاص طور پر اس بیٹے کو اپنی چیل سنا سوت سے مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپائے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بیٹے پر اپنی کٹنی، ڈکیت اور بیسوا صفت سوت کا سایہ تک نہ پڑنے دیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ بیٹے کو بچپن ہی سے سوت کے اصل نام کے بجائے انہیں گرے ہوئے القابات سے متعارف کراتی رہی تھیں جو ان کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی پاداش میں انہوں نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

ہمیشہ بیٹے کے کانوں میں اس کی طرف سے زہر ہی انڈیلا تھا۔

بچپن سے ہی بیٹے کے دل میں سوت کی نفرت کا جو بیج بویا تھا اس سے پھوٹنے والے زہریلے پودے کی سینچائی کرتی آئی تھیں اس کے باوجود بھی آج اتنی عمر آ جانے کے بعد بیٹے نے جس انداز میں انہیں دھمکی دی تھی وہ کسی قسم کا ڈراوا یا محض غصے کے عالم میں منہ سے نکلی بات نہیں تھی۔ بلکہ اس بات میں وزن بھی تھا اور صداقت بھی۔ اور اس بات کی بھی ان کے دل نے گواہی دے دی تھی۔

یوں بھی بیٹا اگر دھمکی دینے پر ہی اتر آیا تھا تو پتھر والی حویلی کا حوالہ دیے بغیر بھی بات کر سکتا تھا۔ مگر اس نے تو پتھر والی حویلی کا حوالہ دے کر گویا ان کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔

ہاں۔ کم از کم ان کو تو کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

کہ یہ بیٹا ان کے لیے ایک کھونٹا ثابت ہوا تھا جس کے بل وہ نہ صرف اب تک کودتی اچھلتی رہی تھیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کے بل اپنے اشاروں پر نچاتی رہی تھیں۔ خاص طور پر اپنے مرحوم شوہر کو۔ اپنی سانولی رنگت اور معمولی شکل صورت کے باوجود انہوں نے اس کھونٹے کے سہارے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے کنبے میں خاتونِ اوّل کی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ اپنے شوہر کی پہلی بیوی اور ان کے ولی عہد کی ماں تھیں اور سب سے بڑھ کر تعلقے دار کی بیگم تھیں جن کا ہمسر ان کی سسرال میں اور کوئی نہ تھا اور وہ اس پر جتنا بھی ناز کرتیں کم ہی ہوتا۔ اور انہوں نے ناز بھی کیا تو خوب کیا۔

فخر اور گھمنڈ کی حد تک کیا۔

ساری زندگی پوری سسرال پر چھائی رہیں۔

مگر اب۔ عمر کے اس آخری دور میں آ کر——

بیٹے کی ایک ذرا سی دھمکی نے انہیں عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔ سوکن سے جلاپا، حسد اور رقابت تو خیر ایک فطری امر ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی عورت ہوتی ہو گی جو اپنے ازدواجی تعلقات میں کسی دوسری عورت کی شرکت گوارا کر سکے۔

وہ عورتیں بھی جو بظاہر سوت کو دیکھ کر بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سوت کا ساتھ گوارا کر لیتی ہیں وہ بھی اپنے دل کی خوشی اور مرضی سے یہ اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دیتیں بلکہ اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے تحت یا پھر شوہر کی خوشنودی کی خاطر ہی ایک طرح کا ایثار ہی کرتی ہیں۔

جب کہ شوکت جہاں کو تو ایسی کوئی مجبوری لاحق تھی نہ وہ شوہر کی خوشنودی ہی حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ تو اپنے تئیں اپنی ذات میں ایک مضبوط قلعے کی مانند تھیں۔ جسے ان کے خیال میں ان کے مرحوم شوہر نے عقدِ ثانی کا ارتکاب کر کے مسمار کرنے کی کوشش کی تھی۔

قصہ اس جنجال کا کچھ یوں تھا کہ تعلقہ دار مقصود الحسن مرحوم و مغفور فطرتاً اتنے شوقین مزاج نہیں تھے جتنے کہ شادی کے چند برس بعد ثابت ہوئے تھے۔ اصل میں تو ایک خوش شکل اور خوش مزاج بیوی کے حصول کی خواہش شوکت جہاں جیسی پکی سانولی رنگت اور معمولی شکل صورت کی بیوی ملنے کی وجہ سے تشنہ ہی رہ گئی تھی۔ کہ مرد خواہ بیسویں صدی کا ہو یا قبل مسیح کے کسی سن کا ہر زمانے اور ہر دور کا مرد اپنی شریکِ حیات میں جملہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خوبصورتی کا بھی خواہاں رہا ہے۔ اس پر مقصود الحسن اور شوکت جہاں کے خیالات میں بھی مطابقت نہیں تھی۔ اس پر مستزاد شوکت جہاں کچھ فطرتاً ہی تنک مزاج شکی مزاج واقع ہوئی تھیں انہوں نے مقصود الحسن کے ولی عہد کو جنم دیا تھا اور پھر سگے نہ سہی دور کے رشتے سے چچا زاد بھی تھیں اس لیے ان کا دماغ عرش پر ہی چڑھا رہتا تھا۔ وہ میاں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھیں لیکن میاں پر والہ اور شیدا تھیں۔ یوں بھی میاں شکل و صورت اور رنگت میں ان سے ہزار گنا نہیں سو گنا ضرور بہتر تھے۔ مگر اس زمانے میں ہی نہیں اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی بعض خاندانوں میں لڑکی یا لڑکے کی شکل و صورت کو اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ آج کل بھی اپنے ہی خاندان اور حیثیت کو دی جاتی ہے اور اس زمانے

میں صرف اپنے ہی خاندان کے لڑکے یا لڑکی اور شرافت کو دی جاتی تھی۔ اور اُس زمانے میں اپنے خاندان میں حیثیتوں کے فرق کا کوئی احتمال بھی نہ ہوتا تھا۔ ہاں البتہ اونچے گھرانوں میں غیر خاندانوں کے لڑکے یا لڑکی کی حیثیت ضرور دیکھی جاتی تھی۔

اور مقصود الحسن کی شادی کے معاملے میں بھی صورت شکل تو نہیں صرف خاندان کو اہمیت دی گئی تھی اور دستور کے مطابق یہ بے جوڑ بمنددھ اریج میرج کی صورت میں اُن کے والد نے کرایا تھا کیونکہ ان کی والدہ تو ان کی صغر سنی میں وفات پا گئی تھیں۔

بہرحال اس زمانے کے دستور کے مطابق مردان خانہ اور زنان خانہ ایک ہی گھر کے دو حصوں پر مشتمل ہونے کے باوجود بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ شوہر کو شطرنج کھیلنے کا مینیا یا خبط تھا۔ یا پھر شکار کھیلنے کے بہت شائق تھے بلکہ ایک طرح سے شکار ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا ریڈیو، کاریں، موٹر سائیکلیں ضرور ایجاد ہو گئی تھیں مگر عام نہ ہونے کی وجہ سے خال خال ہی کسی کے پاس نظر آ جایا کرتی تھیں۔ نہ ٹی وی ہوتا تھا اور نہ وقت گزاری کی کوئی سائنسی ایجاد ہی۔ لیکن بیوی اور گھر کے بزرگوں سے چوری چھپے کبھی کبھی گانا سننے چلے جاتے تھے۔

لیکن تُنکی مزاج بیوی کی انویسٹی گیشن بہت تیز اور فعال تھی۔ انہوں نے اپنے جاسوسوں کا جال مردان خانے سے باہر تک بچھا رکھا تھا۔ میاں کے ہزار پینے پوتنے کے باوجود انہیں ان کی ایک ایک نقل و حرکت اور ایک ایک فعل کی ان کو خبر ہو جاتی تھی اور پھر وہ کچھ ایسا رانی گہن ڈالتی تھیں کہ میاں کو چھٹی کا کھایا ہی یاد آ جاتا تھا۔ مگر یہ ساری عشوہ طرازیاں اور شتر غمزے بس اُس وقت تک ہی چل سکے جب تک پیمانہ صبر لبریز نہیں ہوا تھا۔ یا قوتِ برداشت جواب دینے کی حد تک نہیں پہنچی تھی۔ ادھر بیوی نے صرف ایک نرینہ اولاد کو جنم دینے کے بعد یکے بعد دیگرے تین عدد بیٹیوں کو جنم دیا۔ ادھر میاں نے ساری رواداری بالائے طاق رکھ کر کُھلم کُھلا بیرونی دلچسپیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بیوی نے واویلا بھی مچایا اور احتجاج بھی کیا مگر میاں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

مرد جب نگاہ بدل لیتا ہے تو پھر عورت کی قدر رہتی ہے نہ اہمیت۔ پھر بھی مقصود الحسن شریف اور منصف مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے ظاہری حسنِ سلوک سے بیوی کی اہمیت کو برقرار رکھا۔ یوں بھی وہ بہت رحمدل اور خدا ترس تھے اور اسی صلۂ رحمی کے نتیجے میں ہی انہوں نے اپنی ڈھلتی عمر میں عقدِ ثانی کیا تھا۔ ڈھلتی عمر کے شوق یا ولولے کے تحت نہیں۔

اصل میں ان کے ایک مصاحب راحت مرزا جو ان کے جاں نثاروں میں سے تھے طبعاً بھی بہت نیک اور غیور قسم کے انسان تھے۔ یوں تو مصاحبوں کی سرشت میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا کی خوشامد درآمد اور چاپلوسی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بات بھی کرتے ہیں تو گھگھیا اور گلگلا کر اور زبان بھی ایسی فدویانہ اور عاجزانہ بولتے ہیں کہ کیا کوئی زرخرید غلام بولتا ہو گا۔ اور یہ سب آقا کے دل میں جگہ کرنے، نظر میں چڑھنے اور آقا کی توجہ اور عنایتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ مگر راحت مرزا مصاحبِ خاص اور کم مائیگی کا شکار ہوتے ہوئے بھی خوشامد اور چاپلوسی سے گریز ہی کرتے تھے۔ قناعت پسند اور غیور انسان تھے۔

انہوں نے کبھی انعام و اکرام اور روپے پیسے کی تمنا نہیں کی تھی۔ وہ اگرچہ باتونی یا چرب زبان نہیں تھے مگر کم گو بھی نہ تھے۔ بات بھی کرتے اور چٹکلے بھی چھوڑتے تو موقع محل دیکھ کر ہی۔ وہ ذات کے مغل تھے اور قد کاٹھ اور شکل و صورت کے بھی اچھے تھے اور ان کے چہرے سے برستی شرافت، نجابت اور بردباری نے ہی مقصود الحسن کو جن کا لقب عالی مرتبت تھا کچھ اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ ان سے ایک عقیدت سی رکھنے لگے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب شوکت جہاں نے ان کی تیسری بیٹی کو جنم دیا۔

تیسری بیٹی کی پیدائش پر دل ہی دل میں افسردہ مقصود الحسن اپنے مصاحبوں اور ایک شناسا کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے کہ انہی کی رعیت کے ایک لڑکے نے ملازم کے ہاتھ اطلاع بھیجی کہ راحت مرزا گھڑ سواری کے دوران گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہو گئے ہیں اور ان کی حالت تشویشناک ہے۔ شرعاً شطرنج کھیلنے والوں کو ملعون اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ شطرنج کا نشہ بھی چرسی کے سگریٹ کے دم کی طرح ہوتا ہے کہ ایک دو کش حلق سے اتارتے ہی انسان دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور شطرنج کھیلنے والوں کی محویت اور بے خبری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شطرنج کھیلنے کے دوران اگر انہیں کسی کی موت کی خبر بھی دی جائے تو اُن کی محویت ٹوٹتی ہے نہ انہماک میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ گونگے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔

مگر راحت مرزا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جانے کی خبر سن کر مقصود الحسن کچھ اتنے ہراساں ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ کر فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملازمِ خاص کو بگھی تیار کرانے کا حکم دیا اور پھر تھوڑی دیر میں خود بھی تیار ہو کر اپنے مصاحبوں کو شطرنج میں جتا چھوڑ کر راحت مرزا کے غربت کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔

بستی کے دوسرے سرے پر ایک گنجان محلّے میں بنے چھوٹے سے دو کمروں کا مکان راحت مرزا کی اقامت گاہ تھا۔ گنجان محلہ، کھچ پچ سے مکانات، غلیظ گلیاں۔ اور مکان بھی بہت پرانا لگا۔

اس پر راحت مرزا کی خوددارانہ اور مسکین سی شخصیت۔ کیسا تضاد سا محسوس ہوا تھا اس راحت مرزا کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے علاقے کے رئیس کو۔

یوں بھی ایسے کسی پس ماندہ علاقے میں آنے کا پہلا اتفاق تھا اور ایسے کسی گھر کو کیا علاقے میں قدم رکھنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ مگر چونکہ راحت مرزا کا سوال تھا اور وہ ان کی طرف سے سخت پریشان تھے اس لیے اس لمحے انہیں ان ساری باریکیوں کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔

انہوں نے اندر کمرے میں قدم رکھا تو ایک لمحے کو ٹھٹھک سے گئے۔ دونوں کمرے آگے پیچھے بنے ہوئے تھے۔ اور یہ ایک نشست گاہ یا بیٹھک تھی جس کے بیرونی دروازے سے وہ اندر داخل ہوئے تھے۔

یوں لگا تھا جیسے آنکھوں میں اُجالا سا اُتر آیا ہو۔

گو یہ نشست گاہ قیمتی اور اعلیٰ فرنیچر اور آرائشی اشیاء سے آراستہ نہیں تھی۔

لیکن فرش پر بچھا ایرانی مگر قیمتی قالین۔

اور پرانے زمانے کی سی ایک مسند نما کوچ اور اسی کے ساتھ کے دو صوفے۔ دیواروں پر آویزاں راحت مرزا کے آباؤ اجداد کی بڑی بڑی تصاویر اور کمرے کے کونوں میں رکھے آبنوسی اونچے بینچوں پر بڑے بڑے گلدانوں میں سجے تازہ پھول اور ایک کہنہ ولایتی گھڑیال جو دوسرے کمرے میں کھلتے ہوئے دروازے کے اوپر دیوار پر نصب تھا۔

اس قدر سادگی میں بھی اتنی پُرکاری

اتنی جاذبیت۔

اتنی صفائی اور قرینہ۔

راحت مرزا کی اعلیٰ ذوقی کا بیّن ثبوت تھا۔

سامنے دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

مقصود الحسن کے ملازمِ خاص نے آہستہ سے دستک دی تو وہ تھوڑا سا کُھل گیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ گھر میں کوئی دوست آشنا نظر آ رہا تھا نہ اہلِ خانہ میں سے کوئی۔ آخر ملازمِ خاص کو مداخلتِ بے جا کا مرتکب ہونا ہی پڑا۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو بائیں ہاتھ دیوار کے قریب ہی راحت مرزا اپنے مسہری نما پلنگ پر زخموں سے چور نیم مُردہ سی حالت میں چت لیٹے تھے۔ خادم تو یہی سمجھا تھا کہ وہ انا للہ و انا الیہ راجعون ہو چکے ہیں اور پلٹ کر اپنے آقا کو ان کے کوچ کر جانے کی خبرِ الم سنانا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً راحت مرزا کی ایک زبردست کراہ سنائی دی اور وہ جلدی سے نشست گاہ میں پلٹ کر اپنے آقا کو بلا لایا۔ راحت مرزا پر شاید بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

وہ آنکھیں بند کیے ایک سفید چادر اوڑھے ساکت سے لیٹے تھے۔ مقصود الحسن نے ان پر تھوڑا سا جھک کر انہیں دو تین آوازیں دیں تب کہیں جا کر انھوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر تک انھیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہے۔

"کہو کیسے ہو مرزا یہ بیٹھے بٹھائے کیا کر بیٹھے" انھوں نے اپنی پہچان کرانے کی کوشش میں دوہرا سوال کیا۔

مگر مرزا نے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے انھیں تکتے رہے۔

"کب گرے۔ کیسے گرے؟ کہاں چوٹ آئی۔ کچھ تو بتاؤ مرزا مجھے پہچانے نہیں کیا۔ میں عالی مرتبت ہوں" مقصود الحسن ان کی اتنی خاموشی برداشت نہ کر سکے۔ ان کے دل میں اپنے اس ہم نشین کے لیے بڑی ہمدردی اور عقیدت تھی۔ جواب پھر بھی نہیں ملا تو انہوں نے ان کی کلائی پر انگلیاں ٹکا کر ان کی نبض دیکھی۔ پھر سیدھے ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔

"تعجب ہے ان کی حالت غیر ہے اور یہاں کسی کا کوئی نشان ہی نہیں ہے۔ جو لڑکا ان کے زخمی ہونے کی اطلاع لے کر آیا تھا وہ کہاں ہے شرافت۔" انھوں نے آخری فقرہ اپنے خادمِ خاص کو مخاطب کر کے کہا۔

"وہ تو اطلاع دیتے ہی چلا گیا تھا سرکار۔" شرافت نے بتایا۔ مقصود الحسن نے راحت مرزا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو

بالکل ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"جاؤ ہمارے ذاتی معالج ڈاکٹر رؤف فاروقی کو جلدی سے لے کر آؤ۔" انہوں نے شرافت سے کہا تو شرافت کچھ ہراساں ہو کر بولا۔

"لیکن آپ یہاں تنہا؟" تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"ہماری فکر نہ کرو ہم یہاں ہر طرح محفوظ ہیں۔ بس تم گھڑی کی چوتھائی میں ڈاکٹر کو یہاں پیش کر دو۔" اور شرافت کو بہ اُن کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ اور وہ ڈاکٹر کو لینے چلا گیا تھا۔

مقصود الحسن ابھی تک کھڑے ہی تھے اور بڑی تشویش کے عالم میں راحت مرزا کے سُتے سُتے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جس پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں اس بات پر سخت متعجب بھی اور متاسف بھی کہ راحت مرزا اس قدر تنہا رہتے ہیں کہ اس کسمپرسی کے عالم میں کوئی ہانک کو ہے نہ پکار کو۔ شاید ان کے بال بچے نہیں ہیں۔ مگر کم از کم کسی محلے والے یا واقف کار کو ان دگرگوں سے حالات میں ان کے پاس تو ہونا چاہیے تھا۔ اور متاسف اس بات پر تھے کہ برسوں سے راحت مرزا کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باوجود انہوں نے کبھی بھول کر بھی معلومات کیں نہ پوچھا ہی کہ ان کی گزر اوقات کیسے ہوتی ہے کتنی بڑی فیملی ہے اور کتنے بچے ہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے معاشی مسئلے کا تعلق تھا تو مقصود الحسن اتنا ضرور جانتے تھے کہ وہ کتابت اور خطاطی میں بڑے ماہر ہیں اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے اور انہوں نے ان کے گھر آراستگی اور حیثیت کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ گھر میں تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے ان کے ماضی کی یادگار کے طور پر ہے ورنہ فی الوقت وہ بالکل ہی تہی دست ہیں۔

پھر بھی انہوں نے اس دو کمروں پر مشتمل گھر کو کس قدر قرینے اور سلیقے سے رکھ رکھا ہے۔ اور انھوں نے تو راحت مرزا کو اتنا انعام و اکرام سے بھی نہیں نوازا تھا جتنا کہ وہ اپنے دوسرے مصاحبین کو نوازتے رہے تھے۔ کیا یہ ضروری تھا کہ وہ ہاتھ پھیلا کر ہی ان سے مانگتے تو وہ انھیں کچھ دیتے۔ اصل مستحقین تو وہ ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی زبانوں پر غیرت و خودداری کی مہریں ثبت ہوتی ہیں اور جو دست سوال دراز کرنے سے مر جانا بہتر سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنی اس غفلت پر قلق سا ہو رہا تھا۔ ادھر ڈاکٹر کے انتظار میں گزرتا ایک ایک پل ان کی طبع نازک پر پہاڑ کی طرح گزر رہا تھا۔ کہ انھیں گزرتے ہوئے پلوں میں سے کوئی ایک بھی سفاک پل راحت مرزا کی زندگی سے استوار سانس کے رشتے کو اپنے سنگ بہا کر لے جانے کے درپے نظر آ رہا تھا۔ بے چینی اضطراب، مایوسی اور ملال میں گھرے مقصود الحسن۔ ابھی ڈاکٹر کے انتظار کا ایک ایک پل ہی گن رہے تھے کہ تبھی انھیں سامنے اندر کہیں نکلنے والے دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز آئی۔ جسے پہلے تو انہوں نے کانوں کا دھوکا سمجھ کر توجہ ہی نہیں دی۔ مگر چند ہی لمحے بعد جب دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا وا ہوا تو وہ چونک کر متجسس نظروں سے اسی طرف دیکھنے لگے کہ مبادا ہوا کے دباؤ سے ہی دروازہ تھوڑا سا کھل گیا ہو۔ سمجھے تو وہ یہی تھے لیکن دستک تو بقائمی ہوش و حواس انہوں نے اپنے کانوں سے سنی تھی۔ شاید اسی وجہ سے متجسس ہو گئے تھے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہ نیم وا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اور اب کے دستک کی آواز دروازے سے آئی تو ان کے قدم خود بخود ہی دروازے کی جانب اٹھ گئے۔

"کون ہے؟" انھوں نے اپنی پُر رعب آواز میں سختی شامل کر کے پوچھا۔ اور جواباً دروازہ صرف اتنا کھلا کہ جس کے درمیان ایک بلی ہی سکڑ سمٹ کر گزر سکتی تھی۔ اور اسی جھری میں سے ایک چھوٹے سے طشت میں رکھا اور جالی کے خوبصورت اور نازک گرد پوش سے ڈھکا ہوا دودھ کا گلاس نمودار ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔

"اگر زحمت نہ سمجھیں تو برائے مہربانی یہ دودھ کا گلاس" مگر مقصود الحسن انتہا کو پہنچے ہوئے تجسس پر قابو نہ رکھ سکے، انہوں نے مخاطبہ کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں نہیں، زحمت کا بھلا کیا سوال۔ لیکن پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ مرزا صاحب کو یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا۔"

"گزشتہ شام کو شہر سے واپس لوٹتے ہوئے۔" ملول سے لہجے میں جواب ملا۔

"اوہو کل شام سے اور اطلاع ہمیں اب دی گئی ہے۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں تاسف سے بولے۔

"ایسا کوئی تھا ہی نہیں جس کے ذریعے آپ کو مطلع کیا جا سکتا۔"

"کیا مرزا کے گھر میں کوئی اور مرد موجود نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"اور اہل خانہ؟"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

"کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کی مرزا سے کیا نسبت ہے؟"

"بابا جان میرے پدرِ بزرگوار ہیں۔"

"اور آپ کی والدہ صاحبہ کہاں ہیں۔؟"

"وہ میری صغر سنی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔"

"تو گویا آپ اکلوتی اولاد ہیں مرزا صاحب کی۔"

"جی ہاں۔" دل گرفتہ سے لہجے میں کہا گیا۔ اور پھر طشت کو دروازے کی جھری سے گزار کر اس نے کہا۔

"براہِ کرم یہ دودھ جیسے بابا جان کو پلا دیں۔" اور مقصود الحسن جن کی کیفیت اس سمے کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ انھوں نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر طشت اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے لے کر فوراً ہی مرزا صاحب کی طرف پلٹ گئے پھر خود ہی راحت مرزا کے پاس پٹی پر بیٹھ کر چمچہ چمچہ کر کے انھیں دودھ پلانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر پھر دودھ حلق کے بجائے منہ سے باہر گرتا دیکھ کر انھوں نے جھک کر فرش پر رکھے طشت میں گلاس رکھ دیا اور اٹھ ہی رہے تھے کہ تبھی اپنے ساکت سے جسم کو جنبش دینے کی وجہ سے راحت مرزا کے منہ سے ایک کراہ سی نکلی۔

مقصود الحسن سمجھے کہ انھیں ہوش آ گیا ہے۔ اُٹھتے اُٹھتے پھر پٹی پر بیٹھ گئے۔ اور ان کا شانہ ہلا کر مرزا مرزا پکارنے لگے۔ تب کہیں جا کر مرزا کی بند پلکوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے ادھ کھلی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور نہایت پست اور کمزور آواز میں بولے "عالی مرتبت آ... آپ۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن انھیں ہوش میں آتا دیکھ کر مقصود الحسن اپنی بے تابی پر قابو نہ پا سکے۔ فوراً ہی بولے۔

"ہاں میں عالی مرتبت ہوں شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔ تم گھبراؤ نہیں میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے وہ کسی بھی لمحے آتا ہوگا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔؟"

"جی ہاں... لیکن ڈاکٹر کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیجیے سرکار۔ بلکہ میری درخواست سُن لیجیے کہ وقت بہت کم ہے۔" راحت مرزا نے ساری بات بہت اٹک اٹک کر یوں کہی کہ زندگی کی طرح قوت گویائی بھی ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔

"ارے نہیں نہیں ہمارے ہوتے ہوئے تم یہ وقت کی کمی کے خدشے میں نہ پڑو۔ تمہارا الگ کر علاج معالجہ ہوگا تو تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" انہوں نے گویا راحت مرزا کی ٹوٹتی ہوئی ہمت بندھائی۔

راحت مرزا کچھ دیر پھر آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ پھر آپ ہی آپ بڑے زور سے چونک کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ اور جہاں تک نظر پہنچ سکتی تھی وہاں تک آنکھوں کو گھمایا۔ اس سمے شاید تکلیف اور کرب سے ہی ان کا چہرہ متغیر سا ہو رہا تھا۔ پھر ان کی نگاہیں قریب بیٹھے مقصود الحسن کی حمی نگاہوں سے اُلجھ سی گئیں۔

"عالی مرتبت وقت بہت کم ہے اتنا موقع ہی نہیں کہ کچھ عرض کر سکوں۔"

"بس اپنی ایک امانت آپ کو سونپنا چاہتا ہوں۔" یہ فقرے بھی انھوں نے علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں اور اندر ہی اندر دھنستی ہوئی آواز میں کہے تھے۔

"کیسی امانت مرزا۔؟" یہ چونکہ اپنی بات یا فقرے کہہ کر انھوں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اس لیے مقصود الحسن جنھیں ان کی دم بدم بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حالت نزع میں ہیں۔ ان کا شانہ ہلا کر اونچی آواز میں بولے۔ انہوں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا۔

"بے میری بیٹی... مہ منور خاتون... اس... اس کا میرے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ سوائے آپ کے۔" اتنا کہہ کر راحت مرزا کی آواز بند ہو گئی مگر ہونٹ ہلتے ہی رہے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی گردن ڈھلک گئی۔ مقصود الحسن انا اللہ پڑھتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھے اور ان کی نیم وا آنکھوں کو اپنے ہاتھ سے بند کر کے سینے تک ڈھلکی ہوئی چادر جو مرحوم اوڑھے ہوئے تھے اسی سے ان کا چہرہ بھی ڈھانپ دیا۔

انھوں نے سوائے اپنے باپ کے کسی کو اپنے سامنے اتنے نزدیک کبھی مرتے نہ دیکھا تھا۔ ایک اتنے اچھے اعلیٰ صفات رکھنے والے مصاحب کی دائمی جدائی سے انھیں کچھ ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ انھیں کسی دوسرے کمرے میں موجود راحت مرزا کی اکلوتی بیٹی کو بھی اس خبر جانکاہ سے

آگاہ کرنے کا خیال نہ رہا تھا۔ اور پھر ادھر راحت مرزا نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ادھر ڈاکٹر کا جس نے باقاعدہ
کرکے باقاعدہ ان کے رحلت کر جانے کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق راحت مرزا کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ
گردوں میں بھی اندرونی چوٹ آئی تھی۔ اس زمانے میں نہ طبی سہولتیں تھیں اور نہ فیول پر گزارہ کرنے والی گاڑیاں
حتیٰ کہ ہسپتال بھی چیدہ چیدہ تھے۔ فوری علاج نہ ہونے کی صورت میں انھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے
اور غیر متوقع پیش آیا تھا کہ مقصود الحسن جیسے حلیم الطبع اور خدا ترس انسان کافی دن تک اس کا سوگ مناتے رہے
میں بہل کر جب یہ غم ذرا ہلکا ہوا تو انھیں ایک دم ہی راحت مرزا کی وصیت یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک
کا منفرد اور شائستہ سا انداز۔

تب وہ ایک بار پھر پورے گیارہ دن بعد بنفسِ نفیس خود چل کر مرزا مرحوم کے غربت کدے پر پہنچے۔
وہ رئیس تھے۔ اور ان کے ہاتھ میں اپنے تعلقے کے ہی نہیں رعیت کی بھی باگ ڈور تھی۔
اور وہ ہر بات اپنی مرضی اور منشا سے کرنے کے مجاز تھے۔
مگر انہوں نے کبھی کسی معاملے میں بھی زبردستی اور من مانی کو شعار نہیں بنایا تھا بہرحال وہ مرزا مرحوم کے مکان
وقت بھی شرافت ان کے ساتھ تھا جس نے صرف ان کے اشارے پر گھر کا دروازہ کھلوانے کی ڈیوٹی انجام دی پھر اسے باہر
تاکید کر کے مقصود الحسن نشست گاہ میں آ گئے تھے۔

کچھ وقت اسی انتظار میں گزار کر کہ شاید ان کی آمد کے سلسلے میں ان سے کوئی استفسار کیا جائے۔ وہ ہمہ تن گوش
بیٹھے رہے مگر جب سامنے دروازے کی عین پیشانی پر نصب گھڑیال کی سوئیاں سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ لمحاتی منازل طے
ہوئے کچھ زیادہ ہی آگے بڑھتی محسوس ہوئیں تو وہ مسند سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں نکلنے والے ادھ کھلے دروازے کے نزدیک چلے
آواز میں سوز و گداز پیدا کر کے انھوں نے سب سے پہلے منور خاتون کو اُن کے باپ کی تعزیت دی۔

"اس روز تو اپنا ایک مشیر ایک ہم نشین اچانک ہی ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کی وجہ سے ہم کچھ ایسے صدمے سے دوچار تھے کہ تعزیت
طور پر تو کیا دو لفظ آپ کی دلجوئی کے
طور پر بھی نہ کہہ سکے تھے۔ جس کے لیے ہم بہت نادم ہیں۔" اور جواب میں چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار کے ساتھ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز
کی سماعت سے ٹکرائی۔ تو انہوں نے کچھ توقف کے ساتھ مغموم سے لہجے میں کہا۔

"مشیت ایزدی یہی تھی اور مشیت ایزدی کے آگے کیا چھوٹا کیا بڑا سب ہی مجبور و لاچار نظر آتے ہیں اور پھر اس مرحلے سے تو سبھی کو
گزرنا ہے۔ آپ صبر سے کام لیجیے" لیکن جواب میں ہچکیاں سسکیوں میں بدل کر بڑھتی ہی گئیں۔ اور مقصود الحسن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان
سسکیوں کی روک تھام کے لیے اب کیا طریقہ کار اختیار کریں کہ خود وہ بھی بہت ملول اور رنجیدہ تھے۔

"ہمیں بھی اس بات کا بہت ملال ہے کہ ہم اس نقصان کو کبھی پورا نہ کر سکیں گے۔ مرزا مرحوم و مغفور واقعی بڑے اعلیٰ ظرف اور خوبیوں
کے حامل تھے بلکہ وفاداروں اور جاں نثاروں میں سے تھے مگر اب صبر کے سوا ہمارے لیے چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔"

مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی دلداری اور دلجوئی کے الفاظ اشک شوئی کے بجائے الٹا جلتی پر تیل کا کام کر رہے ہیں اور گریہ
کا دورانیہ بڑھتا ہی جا رہا ہے تو انہوں نے مجبور ہو کر اصل مقصد پر آتے ہوئے کہا۔

"اس میں شک نہیں کہ یہ غم اور المیہ تو اب زندگی بھر جان کا روگ بنا رہے گا۔ کہ جانے والے کی خانہ پُری تو کسی طور ممکن
نہیں اور ہم اس وقت مرحوم کی وصیت کے پیش نظر آپ سے چند اہم باتیں کرنے آئے تھے۔ مگر پہلے جا کر تھوڑا سا پانی پی لیجیے کہ
بعد ہم آپ سے کچھ کہہ سکیں گے۔" اور ان کی بات کی تہہ کو پہنچ کر ہی شاید منور خاتون نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

"نہیں آپ ارشاد فرمائیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
"کیا آپ مرزا مرحوم کی وصیت سے باخبر ہیں۔۔؟" انہوں نے کچھ کہنے سے پہلے سوال کیا۔
"جی ہاں۔" جواب ملا۔
"اور اپنے والدِ بزرگوار کی وصیت کے پیش نظر ہماری سرپرستی قبول کرنے پر بھی تیار ہیں۔"
"جی۔"

اور اس "جی" نے مقصود الحسن کو بڑے کشمکش و پیچ میں ڈال دیا خاصی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بالآخر انہوں نے بہت صاف گوئی
سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"افسوس ہے کہ ہم سردست آپ کو اپنی سرپرستی میں لینے سے قاصر ہیں کیا آپ تنہا اس مکان میں گزارہ کر سکیں گی؟"
۔ بیٹی ہمیں افسوس ہے
خاموشی کے بعد آہستہ سے بولی۔
وہ بھی خاصی طویل خاموشی کے بعد آہستہ سے بولی۔
گھر کی تنہائی کا ایک ایک پل مجھے خطرے کا احساس دلاتا ہوا گزرتا ہے۔" اس جواب پر ایک بار پھر وہ ایک مخمصے میں پڑ گئے
نہیں اس گھر کی تنہائی
شوکت جہاں کی شکی اور جھگڑالو فطرت کی وجہ سے ہی وہ منور جہاں کو اپنے یہاں لے جانا نہیں چاہتے تھے اور کسی دوسری جگہ بھی
لڑکی کو رکھنا ان کے خیال میں کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ اسے جہاں بھی رکھتے جس کسی کی بھی تحویل میں دیتے
ایک جوان جہان
شوکت جہاں کی فعال اینٹلی جنس فوراً ہی ان تک یہ خبر پہنچا دیتی چنانچہ مجبور ہو کر انھیں منور خاتون کو صاف صاف بتانا ہی پڑا۔
"ایک دوست کی وصیت کو پورا کرنا میرا فرض ضرور ہے محترم خاتون لیکن جیسا کہ آپ کو ابھی بتا چکا ہوں کہ سردست ہم آپ کو یہاں سے
لے جانے سے قاصر ہی رہیں گے تو اس کا سبب ہماری زوجۂ محترمہ کی شکی فطرت اور بدمزاجی ہے کیونکہ وہ ہمارے ولی عہد کی
والدہ ہیں اس لیے گھریلو اور داخلی امور پر ان کی ہی اجارہ داری ہے ہماری نہیں۔"
"یعنی آپ حضور بیگم سرکار سے ڈرتے ہیں۔" سوال ہوا تو وہ بھی ان کی انا کو چیلنج کرتا ہوا "نہیں۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم اپنی بیگم
سے ڈرتے ہیں۔ بلکہ آپس کی رفاقت میں کچھ پاسداری ہوتی ہے اور کچھ مروت بس وہی ہم ان سے برتتے ہیں۔" اور ادھر خاموشی سی طاری رہی
"بہرحال فی الوقت یہی مناسب رہے گا کہ ہم اپنے کسی وفادار کو یہاں آپ کی حفاظت کے لیے مامور کر دیں۔" انھوں نے گویا اپنا فیصلہ
صادر کرتے ہوئے کہا۔
"جی نہیں آپ کی بڑی نوازش۔ میں فی الوقت بغیر کسی محافظ کے ہی یہاں تنہا زندگی گزاروں گی۔" اور پھر ذرا ایک منٹ توقف
کر کے یہ کہہ کر اندر ہی کہیں چلی گئی۔ چند ثانیے بعد واپس لوٹی۔ ادھ کھلے دروازے کے درمیانی خلاء سے ہاتھ نکال کر ایک خاصی بھاری پوٹلی
ان کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔
"لیجیے۔"
مگر انھوں نے اطلس کے قیمتی کپڑے کی پوٹلی کی طرف توجہ دی تھی نا اس کی بات ہی سُنی تھی وہ تو دم بخود سے کھڑے ایک ٹک
اس کی مرمریں کلائی کو دیکھے جا رہے تھے جس میں پڑی گہری آسمانی رنگ کی مینے کی چند چوڑیاں۔
اس کی سرخ و سفید اور گداز سی کلائی پر کچھ ایسا غضب ڈھا رہی تھیں کہ ان کی نگاہیں محیط سی ہو کر وہیں جم کر رہ گئی تھیں۔
گو وہ اس وقت چار بچوں کے باپ تھے بیٹا آٹھ برس کا ہو گیا تھا اور خود اُن کی عمر بھی جوانی کی حدود پار کر چکی تھی۔ یہی کوئی اتالیس
چالیس کا سن تھا مگر صحت اور جان بنا رکھی تھی۔ اور اگر نا بھی بنا رکھی ہوتی تب بھی وہ آخر کو رئیس تھے وہ بھی مطلق العنان۔
خوب صورت اور خوب سیرت ساتھی کے حصول کی خوابیدہ آرزو کو عرصہ ہوا گہری نیند سو چکی تھی۔
لیکن اسے جگانے میں دیر ہی کیا لگتی تھی۔
دل اور ذہن کا باہمی فیصلہ ہی تو درکار تھا۔
پھر بھلا ایک تشنہ آرزو کی تکمیل میں دیر ہی کتنی لگ سکتی تھی سو انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے اسی لمحاتی سے دورانیے میں گویا دو
ٹوک فیصلہ کر لیا اور پھر انھوں نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"زن اور زمین کی طرح زیور اور پیسہ بھی شر اور فساد کا باعث ہوتا ہے اس چھوٹی سی گٹھڑی میں ہمارے کچھ خاندانی زیورات ہیں
اور باقی نقدی کی صورت میں پانچ صد اشرفیاں آپ انھیں باوا جان کی امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیں تو میں اس گھر کی تنہائی سے پیدا شدہ
برے حالات کا مقابلہ آسانی سے کر سکوں گی۔"
اور حق بات تو یہ تھی کہ اس کا ہاتھ دیکھنے سے قبل مقصود الحسن کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش جاگی تھی نہ کوئی ترغیب زدہ سا خیال ہی
آیا تھا بلکہ انھوں نے تو بھولے سے بھی اس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جوں ہی اس نے بڑے دل گرفتہ سے لہجے میں
اپنی بات ختم کی۔ وہ دروازہ کھول حجاب کے سارے پردے ہٹاتے ہوئے اس کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔
"لیکن ہم کسی قیمت پر یہ گوارا نہ کریں گے کہ آپ تنہا اپنے حالات کا مقابلہ کریں بلکہ اس مقابلے میں ہم آپ کا برابر کا ساتھ دیں گے۔
بشرطیکہ آپ گوارا کریں" اور وہ جو اس بیباکانہ سی جسارت کی اُن سے متوقع نہ تھی متوحش سی پیچھے ہٹی اور اُن کی وارفتہ سی نظروں سے بچنے
کے لیے اس نے اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا پھر بھلا اس اتھل پتھل سی ہیجانی کیفیت میں اُس سے کوئی جواب کیسے بنتا۔
"زبردستی کو شعار بنانا ہمارے اصولوں میں شامل نہیں لیکن ہم جو بھی فیصلہ کرتے ہیں اس پر آخر تک قائم رہتے ہیں اور ہم نے
بقائمی ہوش و حواس اور آپ کے حالات کے پیش نظر یہی مناسب سمجھا ہے کہ ہم آپ سے عقد کر لیں۔" انھوں نے کوئی جواب نہ پا کر گویا اپنے

فیصلے سے اُسے باخبر کیا مگر ان کی بات سُن کر کچھ کہنے کے بجائے وہ کچھ زیادہ ہی پیچھے ہٹ گئی بلکہ اُن سے پشت کر کے کھڑی ہو
کا آنچل اور پیشانی تک ڈھانپا ہوا سر بھی پردہ پوشی کے لیے ناکافی ثابت ہو رہا تھا مگر بے سود ہی تھا کیونکہ وہ اندازے ہو
کا جلوہ دیکھ چکے تھے وہ اس کے احتیاط برتنے پر اپنی مسکراہٹ دبا کر بولے۔

"لیکن ہم سب سے پہلے آپ کو یہ باور کرا چکے ہیں کہ زبردستی اور جبر ہمارا شعار نہیں اگر آپ کو ہمارے فیصلے سے اختلاف ہو
چپ چاپ یہاں سے چلے جائیں گے اور پھر کبھی آپ کو کسی بھی تردد میں نہیں ڈالیں گے۔ انکار یا اقرار صاف ظاہر
ایک فیصلہ کن فوری جواب کے خواہاں تھے۔ وہ ناکتخدا ضرور تھی مگر راحت مرزا جیسے لائق اور باشعور باپ کی بیٹی تھی۔
اور پھر شہری ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اور میٹرکیولیٹ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر حالات کی چکی میں پس پس کر زندگی کے بہت سے تلخ تجربوں کا مزہ بھی چکھے ہوئے تھی
شادی کی پیشکش اسے ناگوار تو نہیں گزری تھی کہ وہ ان کے مرتبے اور مقام سے بخوبی واقف تھی۔

جانتی تھی کہ یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی تنہا رہ کر کم از کم عزت و آبرو کے ساتھ نہیں گزار سکے گی۔ باپ کے سوا
کوئی عزیز رشتے دار بھی نہ رہا تھا۔ صرف ایک خالہ ہی تھیں۔ میاں کے انتقال کے بعد جن کے پاس وہ عرصے تک رہی تھی
مگر خالہ بھی ایک دن داغِ مفارقت دے گئیں تو پھر مجبوراً وہ باپ کے پاس آ گئی تھی۔

بہرحال — ہر چند کہ تمام نزاکتوں سے باخبر تھی پھر بھی فوری اور فی الفور تو مثبت یا منفی کوئی فیصلہ بھی نہیں کر
تھی اور ادھر وہ تھے۔ شاید وہیں کھڑے کھڑے قاضی کو بلوانے کا قصد بھی کر چکے تھے۔ جیسے اگر وقت کے وقت نکاح نہ
پھر وہ کبھی ہاتھ ہی نہ آئے گی۔

"تو پھر کیا خیال ہے آپ کا اپنے فیصلے کو جائز سمجھ لیں؟" انہوں نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔ انداز بتا رہا
"جیسی آپ کی مرضی۔" آخر اسے اقرار کے طور پر کہنا ہی پڑا۔

اور پھر وہی ہوا جو وہ سمجھ رہی تھی۔

اس وقت نہ سہی اسی شام — کل پانچ آدمیوں کی موجودگی میں اسی گھر پران دونوں کا نکاح ہو گیا۔

پھر دو تین ماہ تک تو اس معاملے یا سمبندھ کی کچھ اس طرح احتیاط اور پردہ پوشی کی گئی کہ حکومت کے کسی راز کی بھی
کی جاتی ہو گی۔

اور وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو یہ مثال تو ان کے معاملے میں صادق نہیں آتی تھی بلکہ اس کا
کریڈٹ تو شوکت جہاں کی انٹیلی جنس کو جاتا تھا جس کی حسنِ کارکردگی کی وجہ سے یہ نہایت اہم خبر شوکت جہاں تک پہنچ
تھی۔ پھر تو انہوں نے کچھ ایسا ہنگامہ کھڑا کیا کہ شیطان بھی کان پکڑ کر کسی کونے کھدرے میں گھس گیا ہو گا مگر نتیجے میں وہی
جو عام طور پر ایسی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہیں ایسی ہی کسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بات جب کھل ہی گئی تھی۔ تو مقصود الحسن نے بھی اسے مزید لپیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یوں بھی مرد کا کوئی راز عورت پر عیاں ہو جاتا ہے تو وہ قائل یا شرمندہ ہونے کے بجائے شیر ہو جاتا ہے۔
کیونکہ بات پھر آمنے سامنے کی ہو جاتی ہے۔ اور مرد نے جھکنا کبھی سیکھا ہی نہیں۔ بلکہ وہ اگر قائل بھی ہوتا ہے
اُلٹا قائل کر کے۔

یوں بھی جب تک شوہر کی کوئی ایسی ویسی بات بیوی سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس وقت تک شوہر کھل کر کچھ
جرأت نہیں کرتا۔ وہ رفاقت کی پاسداری کو برقرار رکھنے کی کوشش ہی کرتا ہے اور دوسرے معنوں میں بیوی کی
اور وفاداری سے فائدہ اٹھا کر اسے بے وقوف بناتا رہتا ہے یا پھر اسے دھوکا دیتا رہتا ہے مگر بات جب کھل جاتی ہے
پاسداری، مروّت اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر کھلے بندوں اپنی من مانی کرتا رہتا ہے۔

بات کھل گئی تھی اس لیے مقصود الحسن، منوّر خاتون کو شوکت جہاں کے ساتھ بڑی حویلی میں لا کر رکھنا چاہتے تھے
شوکت جہاں کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے پھر ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ منوّر خاتون خود بھی سوت
ساتھ رہنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اس لیے ان کے لیے پتھر والی حویلی خالی کرا کے جس میں ان کے چند قریبی عزیز بھی رہتے تھے
جہاں کے تصرف میں دے دی گئی تھی اور شوہر کا یہ اقدام بھی شوکت جہاں کے لیے کسی سزا سے کم نہ تھا کہ ان کے شوہر
نے ان کے لیے تو کبھی ایسے مان گون نہیں کیے تھے۔

پھر اسی پر بس نہ ہوا تھا۔ منوّر خاتون سے عقدِ ثانی کے بعد مقصود الحسن نے بیرونی دلچسپیوں اور دلبستگیوں سے یکسر
کنارہ کشی اختیار کر لی تھی کہ شاید انہیں منوّر خاتون کی صورت میں اپنا گوہرِ مقصود مل گیا تھا اور ایک طرح سے وہ اسی کے ہو
کر رہ گئے تھے۔ ہفتے میں پانچ روز اس کے ساتھ گزارتے اور دو روز شوکت جہاں کے ساتھ۔ اور شوکت جہاں یہ دو دن
بھی گلے شکووں اور لڑائی جھگڑوں میں گزار دیتیں۔
اور پھر اکھی پور کے رئیس کی سینئر بیگم تھیں۔
اس کے ولی عہد کی ماں تھیں۔ راہ پڑی سوئی تک جھک کر اٹھانا کسرِ شان سمجھتی تھیں۔ ذرا ذرا سے کام پر نوکر مامور تھے۔
اس لیے کبھی بھول کر بھی ہاتھ نہیں ہلاتی تھیں۔
جب کہ منوّر خاتون کی خوش سلیقگی اور نفاست کا یہ عالم تھا کہ گھر منہ سے بولتا نظر آتا تھا۔
پھر وقت کی پابندی اور شوہر کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنا۔ ان کے سارے کام بھی اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔
اور خوش خلق اتنی کہ جو خلاف بھی ہوتا وہ بھی ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس پر حسنِ صورت میں بھی یکتا —
بھلا جس جگہ مرد کو ذہنی آسودگی اور سکون ہی سکون ملے اس جگہ کے پیچھے تو وہ ساری دنیا کو تیاگ سکتا ہے۔
پھر بھی مقصود الحسن نے شوکت جہاں کے حقوق پامال نہیں کیے تھے۔ منوّر خاتون کے ساتھ ساتھ وہ ان کو بھی نبھاتے
چلے آ رہے تھے۔
جب کہ شوکت جہاں سے ان کا دل بالکل میل ہی نہ کھاتا تھا۔ عقدِ ثانی کے بعد ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے جب وصل
کے پُرہجوم جذبات میں تپتے ہوئے انہوں نے ان کا گھونگھٹ اٹھا کر پہلی بار ان کا عروسی جلوہ دیکھا تھا۔
منوّر جہاں کے بطن سے بھی ان کی دو اولادیں تھیں بالترتیب ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔
بہرکیف! میاں کی زندگی میں تو چاہنے کے باوجود وہ منوّر جہاں کا بال بیکا نہ کر سکی تھیں اور میاں کے انتقال کے بعد بھی
چونکہ بیس برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہ معاملہ ایک طرح ٹھنڈا ہی پڑ گیا تھا۔ اور پھر شوہر کے انتقال کے بعد خاندان والوں
میں آپس میں کچھ ایسی پھوٹ پڑی تھی کہ معاملات کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور وہ گرد و فر بھی باقی نہ رہے تھے جو شوہر کے زمانے
میں ہوا کرتے تھے۔ اس پر بیٹے سمیت چاروں بیٹیوں کو بھی ان کے گھروں میں آباد کیا تھا۔ گویا اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔
جو وہ سوکن کے خلاف کوئی محاذ قائم کرتیں۔ ان کے دل پر سوت کی شکل میں شوہر کے لگائے ہوئے زخم کی بالکل یہی کیفیت تھی۔
جیسے کوئی گہرا اور کاری زخم۔ وقت اور دواؤں کے مرہم سے آہستہ آہستہ بھر تو جاتا ہے لیکن جوں ہی زخم پر جما کھرنڈ کسی وجہ
سے اکھڑ جاتا ہے تو پھر اسے اور تکلیف دینے لگتا ہے پھر ہرا ہو جاتا ہے۔
اور بیٹے نے پتھر والی حویلی کے حوالے سے دھمکی دے کر واقعی بڑی بے دردی سے کھرنڈ نوچ ڈالا تھا۔
اور اب اس میں درد بھی ہو رہا تھا اور رساؤ بھی۔
اور زخم بھی ایسا ہرا ہو گیا تھا جیسے تازہ تازہ لگا ہو۔
اور وہ سوچ رہی تھیں — سوچے جا رہی تھیں کہ یہ سب کیونکر ہوا —؟
بیٹے کی ان کی دشمنِ جاں تک رسائی کیسے ہو گئی —؟
جب کہ انہوں نے تو اسے اس کے سائے سے بھی محفوظ رکھا تھا۔
یوں بھی پچھلے ایک عشرے سے انہیں پے در پے مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی
کہ پوتے کے بجائے پوتی ہوئی تھی۔ گویا بہو کے لڑکی جننے کی وجہ سے ناک تو قدرتی طور پر نیچی ہو گئی تھی۔
مگر وہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بات کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھیں۔ اس پر بیٹا تھا کہ کسی طور پر عقدِ ثانی پر آمادہ ہی
نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک ذرا سی بات پر اتنی ہتک آمیز دھمکی دے گیا تھا۔
اور اس پر مستزاد بالکل اصل نکرا اور پریشانی کا سبب بدرالنساء کا مسئلہ تھا۔ کہ ادھر تو وہ اپنی ہٹ کی پوری اور
بات کی پکی تھیں۔
اور ادھر کرم جہاں نے ایک رات بھی نہ معلوم کیسے صبر کر لیا تھا۔
کتنے چاؤ اور ارمان سے وہ بدرالنساء کو اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اس ارادے سے کہ تین چار روز اپنے پاس رکھیں گی اور

بیٹے کو اس کے قریب لانے کی کوشش کریں گی۔ کہ موقع بہت اچھا تھا۔ بہو بھی ہسپتال میں تھی۔

اور بیٹا تو ایک ہی جلوہ دیکھ کر بے خود سا ہو گیا تھا۔ مگر مکرم جہاں نے دوسرے جلوے کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ اگلی صبح تڑکے ہی تڑکے عاقل کو بھیج کر بیٹی کو بلوا لیا اور وہ عاقل سے گِلہ ہی کرتی رہ گئیں۔ اور پھر جہاں تک اپنی خواہش کی بات تھی وہاں تک تو سب ٹھیک ہی تھا۔ یعنی وہ بدرالنساء کو اپنی چاپلوسانہ باتوں اور امارت سے متاثر کر کے شیشے میں اُتار سکتی تھیں۔ مگر بدرالنساء کوئی لاوارث لڑکی تو نہیں تھی۔ اس کے سر پر سب سے بڑا ڈنڈا تو مکرم جہاں کا دونوں بھائیوں کا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مکرم جہاں ان کی امارت کے رعب میں آئیں گی نہ کسی قیمت پر یہ گوارا کریں گی کہ ان کی کوری اور کنواری بچی کو ایک دوہاجو کے پلے باندھ دیا جائے۔ جب کہ ایسے معاملات انسان کی اپنی کسی مجبوری کے تحت طے پاتے ہیں مگر مکرم جہاں کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ وہ کسی کا دیا کھاتی تھیں نہ کسی کی دبیل ہی تھیں۔ اِدھر چونکہ بیٹا کسی قیمت پر بھی زہرہ سے سبکدوش ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے بدرالنساء کو اس کے عقد میں لانے کا امکان ہی باقی نہ رہا تھا۔ اور ان ساری باتوں کا ذمہ دار انہوں نے بقول ان کے زہرہ جیسی گھنی اور مکار عورت کو ٹھہرا دیا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ جب تک یہ کٹنیوں کی خاصیت والی زہرہ اس گھر میں رہے گی اس وقت تک وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں گی۔

مگر وہ بڑی پالیسی بردار تھیں اور کھلم کھلا زہرہ کی مخالفت کرنا نہیں چاہتی تھیں بلکہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جو کچھ کریں گی اس کے خلاف پسِ پردہ رہ کر ہی کریں گی۔ اور اتنی خوبصورتی سے اس کا پتا کاٹ دیں گی کہ اور کسی کو تو کیا خود ان کے لاڈلے بیٹے تک کو خبر نہ ہو گی۔

وہ شہر کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔

گو ابھی رات کے اولین پہر کا آغاز ہی ہوا تھا۔

پھر بھی چہار طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

یوں تو اس بستی کے باسی کھا پی کر سرِ شام ہی سو جانے کے عادی تھے۔ لیکن تھوڑی بہت جاگ اور لوگوں کی آمد و رفت تو پھر بھی جاری رہتی تھی لیکن ان دنوں چونکہ برکھا رُت نے اپنا رنگ جما رکھا تھا اس لیے پچھلے کئی روز سے آسمان بدلیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جو گذشتہ کئی روز سے مسلسل سارے سال کا جمع شدہ کوٹا دل بھر کے بستی کی کائنات پر انڈیل چکی تھیں۔ مگر اس سمے بارش تھمی ہوئی تھی بس ہوا کا کوئی شوخ جھونکا چھیڑ چھاڑ کرتا گزرتا تو پانی سے لبریز یہ بدلیاں ایک دم ہی چھلک اٹھتیں۔ اور یوں چند لمحوں کو ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ ہوتی اور پھر گمبھیر سناٹا چھا جاتا کہ اس سمے تو گیدڑ۔ کتے اور بلیاں وغیرہ بھی موسم کے غیر متوازن تیور دیکھ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے ہوئے تھے البتہ مینڈک جھینگر حسبِ دستور اپنی اپنی راگنی الاپ رہے تھے کہ دفعتاً فضاؤں پر محیط اس گہرے سناٹے میں ایک شور سا بپا کرتی ایک تانگے کی آواز ابھری۔ اور بستی کے آخری سرے پر بنے ایک نیم پختہ مکان تک جا کر بند ہو گئی۔

تانگے میں کوچوان سمیت کُل تین افراد سوار ہیں۔

اگلی سیٹ پر ایک بڑا سا گٹھڑ پہلو میں رکھے ایک طرف سکڑا سمٹا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہے۔

پچھلی سیٹ پر پائیدان پر رکھے جست کے روغن شدہ ایک ملبے سے بکس پر پیر رکھے ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی ہے۔

تانگہ رکتے ہی وہ معمر شخص جلدی سے نیچے اترتا ہے اور پھر بہت احتیاط سے وہ گٹھڑ اتار کر نیچے رکھتا ہے۔ اس کے اترتے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی خاتون بھی نیچے اُتر آتی ہے۔ اس کے نیچے اترتے ہی وہ شخص جلدی سے ایک لوکری سمیت جو پچھلی سیٹ پر خاتون کے پاس ہی رکھی ہے وہ بکس نیچے اتار کر رکھتا ہے اور یہ سارا سامان مکان کے دروازے کے آگے لے جا کر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر مکان پر ایک نظر ڈالتا ہے جو گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔

خاتون بھی قدم بڑھا کر عین دروازے کے آگے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اس شخص سے کہتی ہے۔
"اچھا اب تم جاؤ دینو بابا۔" خاتون نے گٹھڑی سینے سے لگا رکھی تھی۔
"ارے چلا جاؤں گا ۔ بہو بیگم۔ پہلے آپ کو اندر تو پہنچا دوں۔" دینو کہتا ہے۔
"نہیں نہیں تم جاؤ اگر یہ تانگے والا چلا گیا تو پھر اس خراب موسم میں تمہیں صبح سے پہلے یہاں کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔" خاتون کہتی ہے۔
"پر بہو بیگم پہلے یہ تو دیکھ لوں کہ اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ سارا گھر تو اندھیرے میں ڈوبا پڑا ہے۔"
"خیر ہوں گے تو سب ہی مگر سو رہے ہوں گے اور ممکن ہے بجلی فیل ہو گئی ہو بارش کی وجہ سے۔" خاتون کہتی ہے تو تانگے والا جو اس اثنا میں لگام کھینچ کر تانگے کا رُخ اسی سمت موڑ چکا ہے جدھر سے آیا تھا بڑے کرخت لہجے میں دینو سے کہتا ہے۔
"ارے بابا جلدی کرو میرا تو یہ روزی کمانے کا وخت ہے اگر گاڑی نکل گئی تو۔"
"ارے اتنی تو ائی کیا پڑی ہے بھیا۔ جتنا قسمت میں لکھا ہوتا ہے انسان اتنا ہی کماتا ہے۔ اب زنانی سواری کو ایسے غیر وخت اکیلا چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتا میں۔" دینو نے کہا۔
"اب یہ تیرا جمہ (ذمہ) ہے بابا میرا تو نہیں۔ بھلا اتنے کھراب موسم اور رات کے وقت پورے تین کوس کا کُل ایک روپیہ ہی تو دو گے۔ کوئی اسرپھی (اشرفی) تو نہیں۔ چلتے ہو تو چلو ورنہ۔" تانگے والا ترشی ہوئے لہجے میں بولا۔
"ہاں ہاں بابا! تم چلے جاؤ۔ یہ میرا ہی گھر ہے۔ اپنی عمر کے چھ برس کے علاوہ سترہ برس میں نے یہیں رہ کر گزارے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔"
خاتون کی آواز سے کرب سا نمایاں تھا۔
"اچھا بیٹا۔ خدا آپ کو سکھی رکھے۔" دینو نے تانگے کا رخ کرنے سے پہلے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اور پھر سلام کر کے تانگے کی طرف مڑا تو خاتون نے ایک تھیلی سے ایک ایک روپے کے دس سکے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"لو بابا۔ یہ تمہارے کرائے کے پیسے ہیں ان میں سے دو روپے اس تانگے والے کو دے دینا۔ بے چارہ اتنے خراب موسم میں بھی ہمیں یہاں تک لے کر آ گیا۔"
"لے کر آ گیا تو کیا مفت آ گیا ایک روپیہ لے گا کرائے کا جبکہ آٹھ آنے لگتے ہیں۔"
دینو نے خاتون کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی وہ تو دو روپے کرائے کا سُن کر ہی چمک اُٹھا تھا۔
"اچھا خیر میری یہی مرضی ہے تم اسے دو روپے ہی دینا۔ لو اب کسی طرح یہ پیسے تو سنبھالو۔" خاتون دینو کی باتوں سے زچ سی ہو کر بولی۔
"لائیے بسم اللہ۔" دینو نے پیسے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا اور پھر ہتھیلی پر رکھ کر متعجب سے انداز میں بولا۔
"اتنے سارے روپے بہو بیگم۔ نہیں نہیں یہ میں نہیں لوں گا۔ بس دو روپے ہی کافی ہیں واپسی کا کرایہ تو آپ پہلے ہی دے چکی ہیں۔"
"نہیں دینو بابا یہ تمہیں لینے ہی ہوں گے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مگر میں تمہیں یہ آٹھ روپے انعام میں دے رہی ہوں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں اُتار رہی۔"
خاتون نے کچھ اتنے اصرار سے کہا کہ دینو کے لیے مزید انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔
"ارے بابا اب چل بھی چکو کسی طرح۔" تانگے والا انتہائی بیزاری کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ تو دینو خاتون کو ایک بار رخصتی سلام کر کے اور ہی منہ میں ہزاروں دعائیں دیتا تانگے میں جا بیٹھا۔ خاتون ڈبڈباتی آنکھوں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر دروازے کی طرف مڑ کر اس نے دستک دی۔ پہلے آہستہ اور پھر زور زور سے مگر اندر کا سناٹا اسے ہی منہ چڑاتا ہی نظر آتا۔
"اف کیا سب لوگ مردوں سے شرط باندھ کر سو رہے ہیں یا کہیں ایسا تو نہیں کہ سب کہیں گئے ہوئے ہوں۔" عاجز سی ہو کر سوچنے لگی۔

یوں بھی رات کا وقت اور ہُو کا عالم۔
ادھر ہاتھوں میں اٹھائی وہ گٹھڑی جسے وہ کسی متاع عزیز کی طرح سینے سے لگائے کھڑی تھی اب سنبھالنی مشکل ہو رہی تھی۔
ادھر یہ خوف اور خطرہ بھی دامن گیر تھا کہ اگر کوئی ایسا ویسا اس طرف آ نکلا تو اس سناٹے اور تنہائی میں کوئی ہانک پکار کو ہوگا نہ۔ آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے الٹے ہاتھ سے گٹھڑی کو سنبھالا اور سیدھے ہاتھ سے زمین پر پڑا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر تقریباً توڑ دینے کے سے انداز میں دروازے پر مارنے لگی۔ تب کہیں جا کر اندر کہیں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی کنوئیں سے بول رہا ہو۔ کہ بات تو سمجھ میں نہ آئی مگر آواز ضرور سمجھ میں آ گئی کہ اس کے لیے مانوس تھی، جسے سن کر اسے اتنا اطمینان ہوا کہ اندر جاگ ہو گئی ہے اس کے باوجود بھی وہ مسلسل دستک دیتی رہی۔
"ارے بھئی کون ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔" کچھ ہی دیر بعد وہی مانوس سی مردانہ آواز بند دروازے کی دوسری سمت سے آئی۔ یہ اس کے والد مظفر حسین کی آواز تھی جو ایک ٹانگ سے معذور تھے اور بیساکھی کے سہارے چلتے تھے۔ بعد مدت باپ کی آواز سن کر آنسوؤں کا ایک گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا اس لیے جواب میں وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔
"کون ہے بھئی اتنی رات گئے۔ اپنا نام تو بتاؤ۔" باپ نے پھر پوچھا۔ تب اپنی ریزہ ریزہ سی ہوتی کیفیت پر بمشکل قابو پا کر خاتون نے پھنسی پھنسی سی آواز میں آہستہ سے کہا۔
"مم۔ میں ہوں ابا میاں۔ مے۔ زہرہ ہوں۔"
"ہائیں کیا کہا۔ زو۔ زہرہ۔" ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازہ کھٹ سے کھولتے ہوئے باپ نے گویا ورطۂ حیرت میں غوطے کھاتے ہوئے پوچھا۔
"زہرہ تم۔؟" دروازہ کھولنے کے بعد بیٹی کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر بھی مظفر حسین کے استعجاب میں کمی نہیں آئی بلکہ اس استعجاب میں تجسس بھی شامل ہو گیا۔ اور ادھر زہرہ جو اپنے آنسو پینے کی کوشش میں پوری لرز رہی تھی۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہہ سکی۔ حتیٰ کہ باپ کو سلام تک کرنا بھول گئی۔
اتنے ناوقت وہ بھی بالکل تنہا ایک کسمپرسی کے عالم میں جوان اور بیاہتا بیٹی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر مظفر حسین کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا مگر انہوں نے اپنی تشویش اور پریشانی کا اظہار اس پر نہیں کیا بلکہ گردن اونچی کر کے اس کے پیچھے باہر دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
"آؤ۔ آؤ اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ۔؟"
اور اس سوال پر تو زہرہ کے دل کے زخموں کے گویا سارے ٹانکے کھُل گئے۔ وہ تڑپ کر باپ کے سینے سے جا لگی۔ اور پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ اشکوں کا سیل سا بہاتی ہوئی بولی۔
"ابا میاں۔ میرے ساتھ میری سیاہ بختی کے سوا اور کون آ سکتا تھا۔ میں تو۔ میں تو۔" اشکوں کے ابلنے نے مزید اسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔
مظفر حسین تو اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب جو اس کی بات سنی تو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے آہستہ سے اس کے سر کو تھپک کر بولے۔
"صبر سے کام لو بیٹی اور اندر اپنی ماں کے پاس چلو۔ میں ابھی تمہارا یہ سامان بھی اندر رکھوائے دیتا ہوں۔"
اپنی بات کہتے ہوئے ان کی آنکھوں کے گوشے نم سے ہو گئے تھے۔ زہرہ نے بھی خود کو بدقت تمام سنبھالا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان کے سینے سے الگ ہی ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون جو لعبتہ زہرہ کا بڑھاپا دکھائی دے رہی تھیں ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں۔
"ارے چیختے چیختے حلق چھل گیا۔ مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اتنی رات گئے کون آیا ہے۔" تب بھی مظفر حسین نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی قدم بڑھا کر ان کے نزدیک آ گئیں اور ڈیوڑھی میں جلتے ہلکی پاور کے بلب کی روشنی میں زہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔
"ارے یہ تو میری زہرہ ہے۔ ہے نا منے صاحب۔" اور جواب میں زہرہ بلکتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

"اے ہے کیا ہوا میری بچی تو کیوں رو رہی ہے اور اتنی رات گئے کیوں آئی۔ کون ساتھ آیا ہے تیرے ارے کچھ تو بتا؟"

بیٹی کو اس قدر اچانک اور غیر متوقع وہ بھی اتنے ناوقت دیکھ کر شوہر کی طرح کھٹک تو وہ بھی گئی تھیں۔ جوان کے شانے سے لگ کر وہ اس قدر بلک بلک کر روئی تو انہوں نے اندر ہی اندر دہل کر ایک ساتھ ہی کئی سوال کر ڈالے۔

"امی بھلا کون آتا۔۔۔ میرے ساتھ؟" زہرہ نے روتے روتے موٹی سی آواز میں کہا۔

"ہیں کیا مطلب۔ کیا تو اکیلی اتنی دُور دراز کا سفر کر کے آئی ہے بچی؟"

ماں نے دل میں سرسراتے اندیشوں کے ہجوم سے ابھر کر پوچھا۔

"امی سہاگ کا تمغہ سجا کر اکیلی ہی تو گئی تھی۔ اور۔ اور اب طلاق کا داغ لگوا کر اکیلی ہی۔"

شدتِ گریہ سے زہرہ کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی تھی۔ اس کی بات سن کر رابعہ بیگم کے دل کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ لڑکھڑا کر انہوں نے اسی کا سہارا لیتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے زہرہ؟ نہیں نہیں ایسا ممکن ہی نہیں بھلا ایسا اندھیر بھی کہیں ہو سکتا ہے؟"

"مگر زہرہ کے ساتھ یہ اندھیر ہو چکا ہے رابعہ بیگم اور حقیقت۔ حقیقت ہی ہوتی ہے اسے جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔ تم اسے اندر کمرے میں لے جا کر آرام سے بٹھاؤ۔ پھر اطمینان سے باتیں بھی کر لینا۔"

مظفر حسین جن کے دل پر زہرہ کے منہ سے طلاق کا لفظ سُن کر ایک قیامت سی گزر گئی تھی۔ بیوی کی متغیر سی حالت کے پیشِ نظر انہوں نے قدرے تیکھا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ یوں بھی وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھیں زہرہ خود بھی ان کی حالت دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔۔۔ وہ بہتے ہوئے اشکوں کے ساتھ بولی۔

"ہاں امی اندر چلیے۔"

اور پھر ماں بیٹی ایک دوسرے کا سہارا لیتی اس آخری کمرے میں آگئیں جو اب رابعہ بیگم کے تصرف میں رہتا تھا یا دوسرے معنوں میں ان کا رہائشی کمرہ تھا۔

اس مختصر سے کمرے میں مقابل کی دیوار کے پاس ایک تخت پڑا تھا جس پر خوشنما رنگین جاجم بچھی ہوئی تھی اور بائیں طرف دو نواڑی پلنگ۔ جن میں سے ایک پر ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا بے سُدھ پڑا سو رہا تھا۔ دوسرا پلنگ رابعہ بیگم کا تھا۔ زہرہ نے ماں کے ساتھ اس کے پلنگ کے قریب آتے ہی سب سے پہلے سینے سے چمٹائی ہوئی پوٹلی کو پائنتی کی طرف رکھ کر اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا۔ پھر ماں کو احتیاط سے پلنگ پر بٹھا کر خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ گو آنسوؤں کا ایک تناشا سا اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا لیکن گریہ میں وہ شدت نہیں رہی تھی البتہ جیسا کہ امنڈ کر گھٹائیں تھوڑی دیر بعد برسنے لگتی ہیں بس کچھ یہی حال زہرہ کا بھی تھا۔

رابعہ بیگم نے پلنگ پر بیٹھنے کے بعد اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ انہیں دیکھ کر تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں اور پہنچی ہوئی ہوں ان کا چہرہ بھی دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ زہرہ کو معلوم تھا کہ اس لمحے وہ درد و کرب کی کس منزل سے گزر رہی ہیں۔

"امی!" وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر ماں نے بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تیرے دل پہ جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بیوگی کا درد اپنے زندگی کے ساتھی اور مضبوط سہارے سے۔۔۔ بچھڑ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی چلا جاتا ہے کہ خدا کی مشیئت سمجھ کر صبر آ ہی جاتا ہے مگر یہ موئی طلاق۔ اس کا داغ مٹائے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُلٹا عورت کو برباد اور رسوا کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامرادِ شقی نے تجھے طلاق دے دی؟"

"جرم تو وہی تھا امی کہ میں پہلوٹی کی نرینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی مرضی سے مجھے طلاق نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے بہت مجبور کرنے پر ہی دی ہے۔"

زہرہ نے اشکوں میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا اور پھر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اپنی پریشانی میں اس نے اب تک برقعہ بھی نہیں اتارا تھا۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت مجبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی ہو گی اس لیے اس نامراد نے ماں کی آڑ لے کر تجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ورنہ ذرا تو ہی سوچ شوکت جہاں کو اگر تجھے طلاق دلوانی ہی تھی تو بچی کی پیدائش کے بعد ہی کب کی دلوا دی ہوتی۔ خیر سے قمر جہاں تو اب پانچویں برس میں ہو گی۔"

"نہیں امی وہ تو قمر جہاں کی پیدائش کے بعد سے ہی بیٹے کے سر تھیں کہ وہ مجھے طلاق دے دے مگر وہ ٹالتے ہی رہے مگر اب۔" زہرہ نے بیٹھے بیٹھے ہی برقعہ اتار کر اسے تہہ کرتے ہوئے کہنا چاہا تو مظفر حسین جو اس کا سامان کسی نہ کسی طرح کھینچ گھسیٹ کر ڈیوڑھی کے اندر رکھ آئے تھے اب کمرے کی دہلیز پر بڑی ٹوٹی پھوٹی اور دل گرفتہ سی حالت میں کھڑے بیوی اور بیٹی کی گفتگو سُن رہے تھے۔۔۔ اپنی بیساکھی کے سہارے اندر آتے ہوئے زہرہ کی بات کاٹ کر بولے۔

"خیر طلاق جب ہوتی یا اب ہو گئی میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ مگر میں اسے نوشتۂ تقدیر تو ہرگز نہیں کہوں گا بلکہ خود اپنا ہی کیا دھرا سمجھوں گا۔"

"ہیں کیا مطلب ہے کیا خدانہ کرے ہم نے جان بوجھ کر یا زبردستی اپنی بچی کو طلاق دلائی ہے؟" رابعہ بیگم شوہر کی بات پر چیخ کر بولیں۔

"ہاں میرا خیال ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے رابعہ بیگم۔"

"اے کیسی حقیقت ذرا میں بھی تو سنوں۔" شوہر کے موردِ الزام ٹھہرانے پر رابعہ بیگم ایک دم ہی لال پیلی ہو کر بولیں۔

"یہی کہ اپنے سے اُونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹی دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے جو اس وقت زہرہ کی بربادی کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔"

مظفر حسین نے طنزیہ سے انداز میں کہا۔ تو رابعہ بیگم چمک کر بولیں۔

"لیکن میں کب خود اس رشتے پر راضی تھی جو آپ مجھے الہانہ دے رہے ہیں۔ اے موئی جھاڑ کا کانٹا بن کر تو وہ بڑھیا ڈھڈو شوکت یہاں میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کیسی کیسی قسما قسمی اور حلفا حلفی کی تھی اس نے پھر سمدھیانہ تو آپ کا تھا۔ اگر ایسے ہی انجام کی خبر تھی، تو خود ہی انکار کر دیا ہوتا۔ آپ نے اسے ہاں یوں بھی آپ کے سامنے میری کس دن چلی ہے؟"

"نہیں ابا میاں میری قسمت ہی پھوٹی ہوئی ہے۔ ورنہ بھلا والدین اپنی اولاد کے لیے کوئی غلط فیصلہ کر سکتے ہیں؟"

زہرہ اس خیال سے کہ کہیں ماں اور باپ کے درمیان بحث و تکرار نہ شروع ہو جائے سارا الزام اپنی قسمت پر لیتی ہوئی بولی۔

"نہیں بیٹا قسمت کو برا نہیں کہتے کیونکہ قسمت بنانے والا بھی خدا ہی ہوتا ہے۔ اور تمہیں فکر کس بات کا ہے۔ جب تک تمہارا یہ باپ زندہ ہے تمہیں اور تمہاری بچی کو کبھی بھوکا نہیں رکھے گا۔" باپ نے بیٹی کی مایوسانہ سی بات پر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور پھر بیوی سے بولے۔

"اب تو ہماری بٹیا مستقلاً ہمارے پاس ہی آ گئی ہیں۔ اب اطمینان سے ان کی احوال پرسی کرتی رہنا۔ اس وقت تو انہیں کچھ کھلا پلا کر آرام سے سونے دو بے چاری تھکن سے چُور چُور ہو رہی ہوں گی۔"

اور رابعہ بیگم نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اے ہاں سچ تو ہے میں تو اس کی پریشانی میں بھول ہی گئی کہ دفعتاً زہرہ نے دل سے پائنتی کی طرف ڈالی پوٹلی تیزی سے حرکت کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک شیر خوار بچے کی رونے اور چیخ مارنے کی آواز آئی۔ تو رابعہ بیگم نے یوں اچھل کر پیچھے دیکھا جیسے انہیں کرنٹ سا لگ گیا ہو۔

"یہ کیا ہے؟" انتہائی تعجب اور بے یقینی سی کیفیت میں انہوں نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں زہرہ سے پوچھا۔

"یہی تو میری بربادی کی ذمہ دار ہے امی۔" زہرہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"اے ہے تو اس ننھی سی جان کو بھی تو اپنی ساتھ لائی تھی۔ اور اسے یوں کاٹھ کباڑ کی طرح ایک طرف پھینکے بیٹھی

تھی۔ اے کیسی ماں ہے تو بیٹی۔ لو بھلا اس معصوم کا اس میں کیا قصور۔"

رابعہ بیگم ملامت بھرے انداز میں کہتی ہوئی جلدی سے اس پوٹلی کی طرف کھسکیں۔ اور پوٹلی کی بندش سے جلد بچی کو آزاد کرا کے بے تابانہ اسے اٹھا کر پہلے اسے سینے سے چمٹایا پھر کمرے میں جلتے بلب کی مدھم روشنی میں اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن بچی نے تو کچھ ایسا بلبلا کر رونا شروع کیا کہ نانا بھی بیساکھی ایک طرف رکھ کر وہیں پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"لاؤ لاؤ اسے مجھے دے دو۔"

"ارے نہیں۔ آپ سے بھلا یہ چپکی ہوگی۔"

رابعہ بیگم نے اسے چمکارتے ہوئے کہا پھر اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر ہلکورے دینے لگیں۔ مگر بچی کسی طرح خاموش ہی نہیں ہوئی اصل میں وہ بڑی دیر سے بھوکی تھی جب تک ماں کی گود کی گرمی اسے ملتی رہی وہ بے سدھ پڑی سوتی رہی اور اب ماں نے پائنتی ڈال دیا تھا تو سوتے سوتے اچانک ہی وہ جاگ اٹھی تھی اس لیے چپ کرانے کی کوشش کے باوجود روئے ہی جا رہی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے یہ بہت بھوکی ہے ورنہ میری گود میں آکر تو روتا بلکتا بچہ بھی بہل جاتا ہے" رابعہ بیگم نے زہرہ سے کہا۔

"جی ہاں اس کی شیشی میں وہیں بھول آئی ہوں۔" زہرہ بیزاری سے بولی۔

"ہائیں تو کیا تم اسے اپنا دودھ نہیں پلاتیں؟" اور جواب میں باپ کی موجودگی کی وجہ سے زہرہ شرم سے نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اور پھر اس نے تھوڑا سا مڑ کر تانگے کی ڈوری میں پڑی چسنی جو بچی کے گلے میں اس نے ڈال رکھی تھی بچی کے منہ میں لگا دی۔ جیسے منہ میں لیتے ہی بچی تھوڑی دیر بعد چپ ہو گئی۔

"اے چسنی سے کیونکر پیٹ بھرے گا اس کا تم اپنا دودھ کیوں نہیں پلاتیں اسے۔" رابعہ بیگم نے فہمائشی لہجے میں کہا۔

"ہوتا ہی نہیں تو پلاؤں کیسے۔ کم ہی اترتا ہے۔" باپ کی وجہ سے زہرہ نے ماں کی طرف تھوڑا سا مڑ کر آہستہ سے کہا۔

"اے کیسی ماں ہے تو بچی۔ لو بھلا تو پرسوں صبح کو وہاں سے روانہ ہوئی ہوگی اور آج رات کو یہاں پہنچی۔ شیشی وہیں بھول آئی تو اس ننھی سی جان کو تو بالکل فاقے سے ہی مار دیا ہوگا تو نے۔" رابعہ بیگم کو زہرہ کی لاپروائی پر غصہ آ رہا تھا۔

"جبھی تو بے چاری اتنی دبلی اور کمزور ہے۔ بھلا غضب خدا کا چھ وقت ہو گئے اسے دودھ پیئے ہوئے۔ کتنے دن کی ہے یہ۔" انہوں نے اس کا فضیحتا کرتے کرتے ایک دم ہی پوچھا۔

"تین مہینے دس دن کی۔" زہرہ نے بڑی بیزاری سے بتایا۔

"مگر یہ تو مشکل سے دو مہینے کی بھی نہیں لگ رہی۔ ذرا دیکھیں تو کس قدر ہلکی اور چھوٹی سی ہے۔" رابعہ نے آخری فقرہ شوہر کو مخاطب کر کے کہا جو بچی کو گود میں لینے کے لیے بے تاب سے ہو رہے تھے۔

"بڑی کا نام تو قمر جہاں ہے اس کا کیا نام رکھا تم نے؟" رابعہ بیگم بچی کو دیکھ کر گویا ہر غم بھلا بیٹھی تھیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"بدبختی۔" زہرہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

"ہیں کیا کچھ زیادہ ہی دماغ چل گیا ہے تیرا۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔" رابعہ بیگم نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"نام تو ابھی تک رکھا ہی نہیں گیا اس کا۔ مگر میں اسے بدبختی ہی کہتی ہوں امی۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے میرا گھر میرا شوہر کچھ مجھ سے چھن گیا ہے۔ امی لڑکیاں جب اتنی بدقسمت اور منحوس ہوتی ہیں تو پھر خدا انہیں پیدا ہی کیوں کرتا ہے۔ پہلے کے لوگ اچھا ہی کرتے تھے جو بیٹی کے پیدا ہوتے ہی زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے۔"

زہرہ پر پھر رقت طاری ہو گئی۔

"اے لیں سن رہے ہیں آپ اپنی بیٹی کے خیالات اس نے تو جاہلوں کو بھی مات کر دیا۔ اے بچی میں بھی تو کسی کی بیٹی ہی تھی اور یہ جو دنیا میں لاکھوں کروڑوں بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی بھی پیدا ہوتے ہی دفن نہیں کرتا۔ بلکہ بڑے مان گمان سے پلتی ہیں ان کے بڑے ناز و نعم میں پلتی ہیں۔" رابعہ بیگم دل ہی دل میں بیٹی کی باتوں پر کڑھ کر بولیں۔

"اصل میں بیٹا انسان کا خمیر ہی کچھ ناشکری اور بے صبری سے اٹھایا گیا ہے۔ کیونکہ جن والدین کے یہاں لڑکوں کی بہتات ہوتی ہے وہ لڑکی کے لیے ترستے ہیں اور جن کے یہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں ہوتی ہیں وہ ایک بیٹے کی خواہش میں دوا، دعا اور تعویذ گنڈے حتیٰ کہ ٹونے ٹوٹکے کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور یہی انسان کے ناشکرے پن کی دلیل ہوتی ہے۔"

مظفر حسین نے بچی کو رابعہ بیگم کی گود سے لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر بچی کی پیشانی چوم کر بولے۔

"یہ کفرانِ نعمت ہے بیٹی جو تم اس معصوم کے بارے میں کہہ رہی ہو۔ ورنہ بیٹیاں تو خدا ہی کی امانت ہوتی ہیں۔ اس کے بندے کے پاس اور ہمارے لیے تو آج کی شب بڑی مبارک ثابت ہوئی ہے کہ ہمارے گھر کے سونے آنگن میں مدتوں بعد خداوند تعالیٰ نے اپنے باغ کا ایک پھول کھلایا ہے۔ ہاں یہ بچے پھول ہی تو ہوتے ہیں۔ پیارے پیارے نازک اور برائی سے پاک۔ ننھے ننھے فرشتے سے اور بڑی کا نام تو قمر جہاں رکھا گیا تھا۔ ہم اپنی اس بیٹی کا نام شمس النساء رکھیں گے۔ آج سے یہ شمس النساء ہے بیٹی۔"

نانا نے نواسی پر اپنی تمام تر شفقت نچھاور کرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ بچی کو ڈھنگ سے نہ سنبھال سکے۔ وہ ان کی گود میں آکر ڈسٹرب سی ہوئی تو کچھ ایسی بلبلا کر روئی کہ بے سدھ سوتا عبید بھی ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ اور آنکھیں مل کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ عجیب و غریب شور و غوغا آخر کہاں سے اٹھا ہے

"لو۔ ان کے سر پر تو ڈھول بھی پیٹ لو تو انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ اور آج اس ننھی سی جان کے ذرا سے چیخنے چلانے پر کیسے ہڑبڑا کر اٹھ گئے ہیں۔ بھئی تعجب ہے۔" رابعہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

"مگر بچی کی آواز بھی کیا ڈھول سے کم ہے۔ یوں زہرا پھاڑ کر چلاتی ہے جیسے غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اتنی کمزور ہے مگر آواز میں نہ جانے اس کی کہاں سے اتنی طاقت آ جاتی ہے۔"

بچی کو گود میں لیتے ہوئے زہرہ پہلی بار تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔ اصل میں اس نے پورے چھ سال بعد بھائی کو دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ بمشکل چھ برس کا تھا جب زہرہ کی شادی ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہ اسے کچھ اس لیے بھی غور اور تعجب سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا لگ رہا تھا۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں تو وہ اب تک چھ برس کا ہی بسا تھا۔ اور پھر چھوٹے بھائی کو اتنے عرصے بعد دیکھا تھا آتے ہی تو اپنی پریشانی میں اسے اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ مگر اب وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"یہ کس کا بچہ ہے امی؟" عبید نے اب پوری طرح بیدار ہو کر پوچھا۔

"تم ہی بوجھو تو جانیں یوں تو بڑے عقلمند بننے کی کوشش کرتے ہو۔" ماں نے ہنس کر کہا۔

مگر عبید نے جیسے سنا ہی نہیں۔ زہرہ پر نظر پڑتے ہی وہ استعجاب اور اچانک مل جانے والی خوشی کی ملی جلی سی کیفیت میں چادر پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپا آپ اور اس وقت کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" اس کی باریک سی آواز بھی اب بھاری اور مردانہ سی ہو گئی تھی۔ پھر وہ زہرہ کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ زہرہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر صرف ماشاءاللہ کہا۔

"آپ کب آئیں آپا۔ کوئی اطلاع بھی نہیں دی آپ نے۔ اور وہ قمر جہاں کہاں ہے؟" عبید نے پوچھا۔

بھائی سے ملاقات، وہ بھی اس کسمپرسی کے عالم میں، اس خیال سے زہرہ کا دل بھر آیا۔

"وہ تو ہے باپ اور دادی کے پاس۔ اس وقت تو یہ ہی آئی ہے۔ یہ تمہاری ننھی سی مہمان۔"

رابعہ بیگم زہرہ کو اس کے سوالوں کے جواب سے بچانے کی غرض سے بولیں۔

"واہ یہ کیا بات ہوئی آپا میں نے تو اسے اب تک دیکھا ہی نہیں۔ اسے تو آپ کو ضرور ساتھ لانا چاہیے تھا۔" عبید گلہ آمیز لہجے

میں بولا۔

"اب ایک ہی کو ساتھ لانا دوبھر ہو رہا تھا۔ دو دو کو کیسے لاتی۔ خیر لو ماموں جان تم اپنی اس بھانجی سے اپنا دل بہلاؤ۔" زہرہ نے جواب سے بچنے کے لیے بچی کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ مگر بچی پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"اب کہاں تک بھوکا مارو گی اس غریب کو۔ تھوڑا سا دودھ ہی پلا دو۔"

رابعہ بیگم نے زہرہ سے کہا تو مظفر حسین جو بیساکھی کے سہارے اس اثنا میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عبید کو مخاطب کر کے بولے۔

"بیٹے تمہاری امی تو بیٹی کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئی ہیں۔ ذرا تم ہی نعمت خانہ کھول کر دیکھ لو کہ کھانے پینے کی کوئی چیز بھی ہو تو۔"

"اے ہاں، یہاں تو یہ موا حافظہ ہی اتنا خراب ہے کہ ذرا دیر میں بات بھول جاتی ہوں۔ ٹھہرو میں ابھی اٹھ کر دیکھتی ہوں۔" رابعہ بیگم نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی! آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔" عبید بولا۔

"نہیں بھیا! مجھے اسی وقت بالکل اشتہا نہیں۔ میں نے ریل میں بھی خوب پیٹ بھر کر کھا لیا تھا۔"

غم اور پریشانی میں زہرہ سے بھلا کچھ کھایا پیا جاتا۔ اس لیے اسے غلط بیانی سے کام لینا پڑا۔ اس کے انکار پر عبید نے مستفسرانہ سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تو باپ بول اُٹھے۔

"مگر تھوڑا سا دودھ ضرور پی لو تاکہ اس معصوم کا کسی طرح پیٹ تو بھرے۔"

باپ سے نہ رہا گیا تو انہوں نے ڈھکے ڈھکے انداز میں کہہ دیا۔ زہرہ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

پھر عبید نے گنجینے میں سے اس کے لیے دودھ نکالا۔ مظفر حسین کے پاس ایک سفری چولہا تھا جو اپنے دور ملازمت کے درمیان انہوں نے ایک انگریز شکاری سے خریدا تھا اور چونکہ رات کے وقت رابعہ بیگم بیٹی کو ٹھنڈا دودھ پلوانے کے حق میں نہ تھیں اس لیے عبید نے ان کے مختصر سے چولہے کو جلا کر اس پر دودھ گرم کیا اور ایک نفیس گلاس میں ڈال کر بہن کو پیش کر دیا۔

"اچھا اب تم اپنے ابا میاں کے کمرے میں جا کر سو جاؤ بیٹے۔ یہ زہرہ تمہارے پلنگ پر سو جائے گی۔" ماں نے اس سے کہا تو زہرہ کے منع کرنے کے باوجود وہ باپ کے پاس دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

تب بچی کو پیٹ بھر کر دودھ پلانے کے بعد زہرہ اٹھی اور اپنا برقعہ تہہ کر کے کونے میں رکھے ہوئے جست کے بڑے سے صندوق پر رکھ کر عبید کے پلنگ پر آ لیٹی اور بڑی دیر تک چھت کو تکتے رہنے کے بعد اس نے دھیمی سی آواز میں ماں سے کہا۔

"امی۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں۔ جہاں میں ایسی جا کر چھپوں کہ کسی کو نظر ہی نہ آؤں۔" اس کا لہجہ کچھ ایسا دل گرفتہ سا تھا۔ ماں کے دل پہ ایک چوٹ سی پڑی۔ وہ ایک آہ سی بھر کر بچی کو احتیاط سے اس کے پاس لٹاتی ہوئی بولیں۔

"ہاں بیٹی! جب سے تم آئی ہو، میں بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اب دنیا والوں کی نظروں سے کیسے بچوں گی کیونکر ان کی زبانیں بند کروں گی۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ میری بے گناہ بچی پر یہ ستم حیثیتوں کے فرق کی وجہ سے توڑا گیا ہے تو کون میری مانے گا۔ بلکہ سننے والے رو کر سنیں گے اور ہنس کر اڑائیں گے۔ کہ دنیا والوں کا یہ بھی ایک خاصہ ہی ہے۔"

"کیا کروں امی بہت مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں ورنہ میں نے تو بہت چاہا۔ دعا بھی کی اور کوشش بھی کہ کسی طرح مجھے موت ہی آ جائے مگر۔"

"اے نوج۔ موت تیرے دشمنوں کو آئے بیٹی۔ اور موت اور زندگی تو خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ بندہ خواہ لاکھ چاہے اپنی مرضی سے جی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔ پھر تم نے ایسی احمقانہ بات کیوں سوچی۔" رابعہ بیگم اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"تو پھر کیا کرتی امی۔ کیا جانتیں نہیں آپ کہ ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ امی کوٹھے پر ناچنے والی کو بخشا جا سکتا ہے کہ ان کا پیشہ وہی ہوتا ہے۔ مگر مطلقہ۔ اسے تو آوارہ بدچلن اور بیسوا قرار دے کر معاشرے کے ناسور کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔" اتنا کہہ کر زہرہ آواز گھونٹ کر رونے لگی۔

ماں جواب میں خاموش سی رہیں کہ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔

"امی! اللہ کے خزانے میں کیا کمی پڑ جاتی جو اگر وہ مجھے ایک بیٹے سے ہی نواز دیتا۔ مگر اس نے تو مجھے تباہ و برباد کرنے کی ٹھان لی دی جبکہ ڈاکٹرنی نے تو قمر جہاں کی پیدائش پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آئندہ میرے یہاں زچگی ہوئی تو میری جان بھی جا سکتی ہے مگر

— میں بھی کیسی سخت جان ہوں کہ جاتے جاتے پھر اس دکھ بھری دنیا میں لوٹ آئی۔ حالانکہ تین روز تک میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہی تھی۔ پھر بھی یہ

ایسی ہی مثل ہے کہ جسے خدا رکھے اور اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا، تم خود کو ان فکروں میں نہیں گھلاؤ۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ تو بیٹی اب تو پڑ ہی گئی ہے۔ اب رو رو کر خود کو ہلکان کرنے سے فائدہ۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر اسے قبول کر لو۔" ماں نے سمجھایا۔

"مگر امی۔ قمر جہاں بھی تو میرے جگر کا ٹکڑا ہی ہے۔ ولی کے ہاتھوں اس کی جتنی بے قدری ہوئی ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اس کے باپ تو اسے میرے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ان کی ماں نے کسی طرح اجازت ہی نہیں دی بلکہ وہ تو اس چھوٹی کو بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی تھیں۔"

بات کہتے کہتے زہرہ یکلخت خاموش ہو گئی۔ ماں بھی خاموش لیٹی دل ہی دل میں اس کی حالت پر کڑھتی رہیں۔ یوں بھی دل تو اپنی — بیٹی کے ایسے پر خون ہو رہا تھا کچھ کہتیں بھی کیا۔ کچھ دیر بعد زہرہ خود ہی بولی۔

"امی میں اب آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ پورے دو ماہ رشیدن کے بھانجے کے گھر میں چوروں کی طرح چھپی رہی ہوں کیونکہ اماں جان تو اسے بھی مجھ سے چھین لینے کے درپے ہو رہی تھیں۔ کہتی تھیں کہ یہ بیٹیاں ہمارے گھر کی عزت ہیں یہ تم جیسے مفلوک الحال لوگوں کے یہاں نہیں جا سکتیں۔ اور امی انہوں نے اپنے بیٹے سے زبردستی یہ قسم کھلوائی تھی کہ اگر دوسری بار بھی میرے یہاں بیٹا نہ ہوا تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔ ورنہ یقین کریں امی وہ مجھے طلاق دینے کے بالکل حق میں نہ تھے۔"

زہرہ کی آواز پھر پھنسنے لگی۔ تو وہ خاموش ہو گئی۔

"ہاں بیٹی۔ قسمت کی کارفرمائی ہے ساری۔ مگر اب تم سو جاؤ۔ اتنے دن کی تھکی ہوئی ہو۔ یہ رنج اور ملال تو اب زندگی بھر ہی جان سے چمٹا رہے گا۔"

رابعہ بیگم نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور پھر اٹھ کر بتی بجھائی اور خود بھی اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئیں۔ بچی تو تھوڑی دیر ہاتھ پیر چلا کر اور اپنی ننھی سی آنکھوں کو ادھر ادھر گھما کر کب کی سو چکی تھی۔ کہ ویسے بھی چسنی منہ میں جاتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ٹرینکولائزڈ کر دی گئی ہو۔ مگر زہرہ کو سخت تھکان کے باوجود اپنی پریشانی میں دیر تک نیند نہیں آئی۔

وہ وفاکیش اور ایک حساس سے دل کی مالک بڑی سادہ لوح اور کم گو لڑکی تھی۔ میکے میں اگرچہ سترہ برس گزارے بھی تھے تو پوری آسودگی کے ساتھ تو نہیں گزارے تھے۔ باپ جنگلات کے محکمے میں پوسٹ گارڈ کی حیثیت سے ملازم تھے۔ سستے زمانے تھے اس لیے آرام سے پاؤں پھیلا کر گزر بسر ہو جاتی تھی۔ البتہ خوبصورتی اس کے والدین کو ان کے خاندان کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر شرفاء میں شمار ہوتے تھے۔ سگی نہ سہی مگر مظفر حسین اور رابعہ بیگم میں دور کی رشتے داری تھی۔

رابعہ بیگم رشتے میں مظفر حسین کی چچا زاد ہوتی تھیں۔ قسمت سے رابعہ بیگم کے والدین بھی اوسط طبقے سے ہی تعلق رکھتے تھے جبکہ مظفر حسین کے بعض رشتے دار خاصے متمول اور آسودہ حال تھے۔ اور اتفاق سے مقصود الحسن کی سگی بھابی مظفر حسین کے ایک چچا زاد سے بیاہی ہوئی تھیں۔ یوں تو پردیس میں رہنے کی وجہ سے رابعہ بیگم اور مظفر حسین کی عزیز و رشتے داروں سے کم ہی میل ملاقات ہوتی تھی۔

مگر معلوم کیسے اور کیونکر شوکت جہاں کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ مظفر حسین کی اکلوتی بیٹی حد درجے حسین و جمیل ہے۔ وہ تو پہلے ہی کئی برس سے ایک خوبصورت اور ایسی بہو کی تلاش میں تھیں۔ جو بے زبان اور دبی دبائی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حکم کی غلام بھی ثابت ہو۔ اور ایسی صفات کی لڑکی انہیں اونچے خاندانوں میں نہیں مل سکتی تھی۔ گو یہ بات نہیں تھی کہ اس زمانے کے اونچے خاندانوں کی لڑکیاں اپنی ساسوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ بلکہ وہ تو ساسوں کے ہاتھوں مظالم بھی اٹھا لیا کرتی تھیں مگر ایسی صورت حال میں جھگڑے ٹنٹے بہت ہوتے تھے۔ اور نوبت طلاق تک پہنچ جاتی تھی۔ اور طلاق گو شوکت جہاں کے نزدیک اتنی معیوب بات نہ تھی لیکن وہ ایسا جھنجھٹ پالنا نہیں چاہتی تھیں۔ دوریاں ضرور حائل تھیں مگر آپس میں تعلقات برقرار تھے۔

شوکت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ نند کی بیٹی ایسے گھرانے میں بیاہی گئی ہے۔ جو کھاتا پیتا ضرور ہے لیکن اوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور ایسے گھرانے کی لڑکی کو پوری طرح اپنے بس میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس پر بیٹے کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت ہو۔ سو شوکت جہاں جیسی شاطرانہ فطرت رکھنے والی خاتون نے مظفر حسین کے گھرانے کو ہی تاکا۔ یوں بھی اس چھان بین میں

بیٹے کی عمر خاصی آگے نکل گئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بلا تاخیر بیٹے کا پیغام زہرہ پر دے ڈالا۔ مظفر حسین گرا پنے سے بڑی حیثیت میں بیٹی دینے کے حق میں بالکل نہ تھے۔

لیکن وہی کمزوریاں اور مجبوریاں جو خصوصاً اوسط طبقے کے لوگوں کے ساتھ پیدائشی طور چمٹی ہوتی ہیں۔ انہیں بھی
کہ ایک سال قبل ہی ایک پہاڑی زخمی ریچھ کی انتقامی کاروائی کے نتیجے میں وہ اپنا دایاں پاؤں گنوا بیٹھے تھے۔ وہ تو کچھ
اور قسمت ہی تھی جو وہ بچ گئے تھے ورنہ پوری ٹانگ میں ہی زہر پھیل گیا تھا۔ لہٰذا نوکری سے بھی ریٹائرمنٹ مل گئی تھی۔
ذاتی مکان ان کی ملکیت تھی جسے ملازمت کے دور میں دوسرے شہر میں رہنے کی وجہ سے انہوں نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔
ہو جانے کے بعد اس میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے انہوں نے خالی کرا لیا تھا۔ اور پنشن کے سوا اور کوئی ذریعہ آمدنی بھی
جبکہ زہرہ کی شادی پر انہیں خاصا معقول سرمایہ درکار تھا۔ جو شاید وہ پوری زندگی بھی فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ یوں بھی زہرہ کا مستقبل
میں واضح نہ تھا۔ ادھر شوکت جہاں بیگم کچھ ایسی پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑی تھیں کہ اپنی مجبوریوں کے پیش نظر انہیں بالآخر رضامند ہونا
پڑا تھا۔ اور جس کا نتیجہ اب چھ برس بعد بیٹی کی طلاق کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ جبکہ وہ تو بہت پہلے سے ایسی ہی کسی افسوسناک
صورتِ حال کا سامنا کرنے کے متوقع تھے۔

بہرحال۔ زہرہ چھوٹی بیٹی کے ساتھ میکے آگئی تھی۔ کافی دن تو اپنے اس دردناک انجام کا سوگ مناتی رہی مگر پھر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے درد میں کمی آتی گئی۔ اور وہ بھی گھر کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔ مگر رابعہ بیگم کو کچھ بیٹی کے غم نے اور سب سے زیادہ جگ ہنسائی اور انگشت نمائی نے بتاشے کی طرح بٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ بستر سے جا لگی تھیں۔

ایک صرف مظفر حسین ہی تھے جو ذرا بھلے چنگے نظر آتے تھے۔ یا پھر عبید تھا۔ جو شمس النساء پر جان چھڑکتا تھا اور اتنی سی عمر میں بھی اسے اپنی بیٹی ہی کہتا تھا۔ اور شاید یہ عبید ہی کی توجہ اور محبت تھی جو شمس النساء جیسے تنکے میں بھی جان پڑ گئی تھی۔ ورنہ تو نانی نانا کی بھی آنکھ کا تارا تھی سوائے زہرہ کے جو معصوم سی جان سے ہمیشہ نفرت اور اکتاہٹ ہی کا اظہار کرتی تھی۔ حالانکہ والدہ اس بات پر اسے ٹوکتیں۔ باپ بھی آہستہ سے سمجھاتے اور بھائی تو باقاعدہ احتجاج کرتا۔ لیکن زہرہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے اڑا دیتی۔ اصل میں تو وہ شمس النساء کو ہی اپنی بربادی کا تمام تر ذمہ دار سمجھتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر شمس النساء ہو بہو باپ پر گئی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہی اسے اپنا شوہر یاد آ جاتا۔ وہ شوہر جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کی محبت میں آج بھی چور تھی۔ ہر تعلق قطع ہو جانے کے باوجود اب بھی اسے ایک دیوتا کی طرح پوجتی تھی۔ وہ آج بھی اس کا مجازی خدا تھا۔

یا پھر وہ اسے ایسا ہی سمجھتی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس سے اس کا ہر رشتہ قطع ہو چکا ہے۔

وہ ہمہ وقت گم صم اور کھوئی کھوئی سی اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔

اس کے ساتھ بتائے ہوئے حسین اور خوبصورت جذبوں سے پُر رنگین دنوں کو یاد کرتی رہتی۔

کبھی مسکراتی۔ کبھی روتی اور کبھی اپنی بے بسی پر بلبلاتی۔

اور ایسے میں اگر بیٹی سامنے آ جاتی تو وہ اسے دھنک کر رکھ دیتی۔

نانی بیمار تھیں اور نانا معذور۔

اس لیے عبید ہی بچی کی خبر گیری رکھتا تھا۔

وہ بہت ذہین اور بردبار لڑکا تھا۔

ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

وہ اپنی جماعت میں اوّل یا دوم ہی آتا تھا۔

باپ کے معذور ہو جانے کی وجہ سے بچپن ہی سے اس نے اپنی بساط سے زیادہ ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

اور زہرہ کے المیے سے زہرہ کے بعد سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا۔

جب کبھی بہن کو آزردہ اور دل شکستہ سا دیکھتا ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ جو آپ پر توڑے گئے اس ظلم کا مسعود الحسن سے بدلہ ضرور لوں گا۔

بہن کہتی۔ "تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو اور پھر بدلے کر کرو گے بھی کیا۔ کوئی مجھے میرے وہ خوبصورت دن تو نہیں واپس دلا دے گا جو کبھی میں نے ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ تم تو بھیا بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو اور کچھ بن کر دکھاؤ کہ ہمارے طبقے کے لوگ علم کی سیڑھی کے ذریعے ہی بلندی تک پہنچتے ہیں ورنہ سارے زمانے کی حسرتیں دل میں لیے قبر میں اتر جاتے ہیں۔"

اور جواب میں وہ بہت پرجوش ہو کر کہتا۔

"میں تعلیم بھی حاصل کروں گا اور دولت بھی آپ دیکھیے گا آپا! انشاءاللہ ایک دن میں ترقی کرتے کرتے فلک کی بلندیوں تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر مقصود الحسن تعلقے دار کی اولاد کو پھر نہ بخشوں گا۔"

"مگر تعلقے دار کی اصل اولاد تو یہ دونوں تمہاری بھانجیاں ہی ہیں کیا تم اُن سے انتقام لو گے۔ بھیا ایسے غلط خیالات کو دل و ذہن سے نکال دو اور دنیا میں آئے ہو تو اچھے اور نیک کام کر دو تاکہ ابا میاں کا نام روشن کر سکو۔"

زہرہ جواب میں سمجھاتی تو وہ خاموش ہو جاتا۔ یوں بھی ان دنوں وہ محض ایک بچہ ہی تھا اس لیے اس کی سوچ بھی طفلانہ تھی کم از کم زہرہ کا یہی خیال تھا۔

وقت نے اپنی رگا میں کچھ اتنی ڈھیلی چھوڑ دی تھیں کہ سسک سسک، تڑپ تڑپ، اور حالات کی بھٹی میں تپ تپ کر بھی وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا کہ کتنا آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اس گزرے ہوئے وقت میں اس چھوٹے سے کنبے نے کیا کیا کھو دیا ہے۔ کیونکہ کچھ پانے کا احتمال کم از کم زہرہ کے لیے تو باقی ہی نہ رہا تھا۔ اس مصیبت کی ماری نے کھونے کے معاملے میں سب سے پہلے تو اپنے شوہر سے ابتدا کی تھی۔ پھر چند سال بعد ماں ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گئیں اور ان کے چار سال بعد باپ کی معذوری پر قدرت کو رحم آگیا اور انہیں بھی دنیاوی جھمیلوں سے آزاد کر دیا گیا۔ اب لے دے کے عبید ہی رہ گیا تھا۔

بائیس تئیس سالہ کڑیل جوان بھائی۔

اس کا واحد سہارا۔

شمس النساء بھی وقت کی حدیں پھلانگ کر نو برس کی ہو چکی تھی۔ اور ایک اسکول میں پڑھ رہی تھی۔

اصل میں والدین کے انتقال کے بعد عبید نے اپنا آبائی مکان بیچ دیا تھا اور قریبی شہر کے ایک کرائے کے مکان میں بہن بھانجی کے ساتھ آ بسا تھا۔ کیونکہ اس نے شہر کے واحد کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ اور بہن اور بھانجی کا پیٹ پالنے کے لیے اپنے ایک مشفق استاد کی وساطت سے وہ دو تین ٹیوشنز بھی پڑھاتا تھا۔ کہ اس زمانے میں تعلیم کا خاصا چرچا ہو گیا تھا اور بہت سے پرائمری اور ہائی اسکول بھی کھل گئے تھے۔ زمانہ بھی خاصا ترقی کر گیا تھا اس لیے شہر میں سکونت اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

پھر وقت مزید کچھ آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ عبید نے فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن کر لیا۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ کی تحریک عروج پر تھی۔ اور پاکستان حاصل کرنے کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ ادھر ہندو سیاسی پارٹی کانگریس اور برٹش سامراج حق کی آواز کو ہمیشہ کے لیے دبانے کے درپے ہو رہے تھے اور نتیجے میں ہندوستان میں جا بجا معصوم بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ پھر جونہی پاکستان کو مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ کشتوں کے پشتے ہی لگ گئے۔ فسادات کی آگ اس علاقے کے آس پاس بھی لگنی شروع ہو گئی تھی۔ جہاں عبید اپنی بہن اور بھانجی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ خود بھی پاکستان کا دل سے حامی تھا۔ ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں بے گناہ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کٹتے دیکھا تو اس نے بھی پاکستان ہجرت کر جانے کی ٹھان لی۔ اور نہایت خاموشی اور رازداری سے پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اصل میں ان دنوں مہاجرین کے لیے جو اسپیشل ٹرینیں چلی تھیں۔ ان سے زیادہ تر پناہ گزین ہی سفر کرتے تھے جو راستے ہی میں کاٹ کر پھینک دیے جاتے تھے۔ ایک آدھ ہی خوش قسمت ٹرین ہوتی تھی۔ جو صحیح و سالم پاکستان پہنچ جاتی تھی اور عبید ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ چپکے چپکے اپنا سامان بیچ کر ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جمع جکڑی تو کچھ تھی نہیں پاس۔ زہرہ کے پاس صرف تھوڑا سا زیور تھا۔ اور مہر کی رقم کا نہ اس نے مسعود الحسن سے مطالبہ کیا تھا نہ انہوں نے خود ہی ادا کی تھی۔ بہرحال اب ان مخدوش حالات کے پیش نظر بہت مجبور ہو کر جب عبید نے زہرہ کی طرف سے ادھر اس کے مہر کی رقم کا مطالبہ کیا تو جواب میں شوکت جہاں بنفس نفیس خود آ پہنچیں۔ اس لمحے عبید رقم کا ہی بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ شوکت جہاں نے آتے ہی تھوڑی سی رقم زہرہ کے آگے ڈالی اور پوتی کا بازو پکڑ کر بولیں۔

"تم ماں ضرور ہو۔ مگر اس کی رگوں میں خون باپ کا ہی دوڑ رہا ہے اور یہ اب تک تمہارے پاس رہی تو میں نے کوئی

اعتراض نہیں کیا، اس خیال سے کہ چلو ماں کا بھی حق بنتا ہے مگر اب میں تمہیں اتنی رعایت نہیں دوں گی کہ تم اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ۔"

زہرہ نے دیکھا شوکت جہاں کے بال بگلے کی طرح جھک سے ہوگئے تھے۔ کمر بھی تھوڑی سی جھک گئی تھی اور چہرہ سلوٹوں میں تبدیل ہوگئی تھی۔ مگر طنطنہ اور زعم وہی تھا سو وہ بھی اب پہلے کی طرح بے زبان اور ناتواں سی زہرہ نہیں رہی تھی، پچیس تیس سال تک ہوگئی تھی۔ رقم ان کی طرف پھینکی اور بولی۔

"نہیں، اس کا اب آپ سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ میری بیٹی ہے اور اسے میں نے بڑی مصیبتیں اٹھا اٹھا کر پالا ہے۔ میں اسے ہرگز ہرگز آپ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اگر آپ کو اپنی عزت عزیز ہے تو فوراً یہاں سے چلی جائیے۔ ایک بیٹی کے لیے تو میں نے دل پر صبر کی سل رکھ لی تھی، اب دوسری بیٹی کو۔"

اور دوسری بیٹی کا ذکر زبان پر آتے ہی اس مکار بڑھیا نے ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

"ارے وہ بے چاری زندہ ہوتی تو پھر میں اس بڑھاپے میں اتنی دور دراز کا سفر کر کے تمہارے پاس کیوں آتی۔ تم نے تو پلٹ کر اس کی خبر نہ لی۔ اور وہ معصوم تمہارے ہڑکے میں بیمار رہ رہ کے۔" فقرہ ادھورا چھوڑ کر بڑی بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ زہرہ کے دل پہ تو اس خبر بد سے کچھ ایسا دھچکا پڑا تھا کہ سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"مگر۔ مگر آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟" بڑی دیر بعد زہرہ کے منہ سے یہی نکل سکا۔

"ارے تم تو اپنے غم میں مبتلا تھیں۔ پھر بھلا اطلاع دے کر میں تمہیں بے موت مارنے سے تو رہی تھی نا۔ اگر تم سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا تو پھر بھی انسانیت کا ایک رشتہ تو تھا۔" شوکت جہاں نے رومال سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اور پھر پوتی کو پہلے سینے سے لگایا اور پھر اس کا سر چوم کر اس سے بولیں۔

"میں تمہارے باپ کی ماں، تمہاری دادی ہوں اور تمہارا باپ تم سے ملنے کو تڑپ رہا ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے تمہارا کہ یہ پورا محلہ بھی اس کے برابر نہ ہوگا۔ وہاں تم شہزادیوں کی طرح رہو گی۔ کیوں چلو گی میرے ساتھ۔"

اور پوتی جسے باپ اور دادی کے بارے میں کچھ علم ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی تھی۔ اور جو ماں کی محبت سے ہمیشہ محروم رہی تھی۔ اور اب دادی کے رئیسانہ ٹھاٹھ اور انہیں اپنے اوپر صدقے واری ہوتا دیکھ کر ان سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی ہوگئی تھی اس نے دادی کے سوال پر پہلے ماں کی طرف دیکھا جو سخت پیچ و تاب کھاتی دادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قوت فیصلہ اس میں تھی ہی کب مگر جب دادی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیوں میری چاند چلے گی نا میرے ساتھ۔" تو اس نے شرماتے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لو دیکھا تم نے، بچی تو تیار ہے چلنے کے لیے۔ سچ ہے خون کی کشش اسی کو کہتے ہیں۔ اچھا اب تو اسے اجازت دے دو۔"

"نہیں اماں جان! میں اسے آپ کے ساتھ نہیں جانے دوں گی۔ چلو بیٹی اندر جا کر اپنے اسکول کا کام کر لو۔ ورنہ ٹیچر سے خفا ہو جائیں گے۔" زہرہ نے شوکت جہاں کو کھرا کھرا جواب دے کر بیٹی کی طرف کچھ اس طرح گھور کر کہا کہ اس کی جان ہی نکل گئی۔ اور وہ دادی پر ایک نظر ڈال کر دوسرے کمرے میں جانے لگی تو دادی نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ لیا اور زور سے دہاڑیں۔

"اسے ذرا میں بھی تو دیکھوں کیسے نہیں بھیجے گی تو اسے۔ ارے او غفور ذرا شریف کو لے کر اندر تو آ۔" اور ادھر انہوں نے اپنے دونوں ملازموں کو اندر طلب کیا، اور ادھر وہ دوسرے ہی لمحے یوں اندر آگئے جیسے پہلے سے ہی تیار کھڑے تھے۔

"چلو بیٹا کو لے جا کر گاڑی میں بٹھاؤ۔ اتنے میں ہم بھی آتے ہیں۔"

انہوں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ تو وہ دونوں شمس النساء کو پکڑ کر باہر لے گئے۔ جبکہ زہرہ بے چاری چیختی چلاتی ہی رہ گئی۔ مگر شوکت جہاں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

"دیکھو زہرہ۔ آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سمجھ سے کام لو۔ تمہاری بیٹی اپنوں میں جا رہی ہے دشمنوں میں نہیں۔ جب بھی چاہے آ کر اس سے مل لینا۔ مگر یہ جو لاکھوں کی جائیداد اور روپیہ پیسہ ہے اس سے اسے بھی سکھ چین اٹھانے دو۔ اور آخر یہ سب ہے کس کا۔ کیوں اسے اس کے حق سے محروم کرنے پر تلی ہو۔ تم تو مر کر بھی دوبارہ پیدا ہو جاؤ تو اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی بنوا کر نہیں دے سکتیں۔"

شوکت جہاں نے وہ رقم جو وہ ساتھ لائی تھیں وہ اٹھا کر اس کے قریب ہی بچھے تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر زہرہ نے انہیں

مسلسل روتی اور چلاتی رہی اور انہیں برا بھلا کہتی رہی۔ شوکت جہاں نے بھی اس ڈر سے کہ کہیں کوئی پاس پڑوس والا ... کان نہیں دھرا۔ وہ ... کو نہ نکلے ہو ران کی بچھائی ہوئی شطرنج کی بساط ہی نہ الٹ جائے۔ مزید وہاں رکنا گوارا نہ کیا اور اس موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن ...

... جو مسعود الحسن کے ایک دوست کی تھی جو اسی شہر میں رہتا تھا۔

... ایک بار پھر زندگی کے بحر بے لبسی کے تھپیڑے کھاتی رہ گئی۔

جبکہ وہ چاہتی تو شوکت جہاں کو دھکے دے کر بھی باہر نکال سکتی تھی۔

سب سے بڑھ کر تو خود بچی کو ہی ان کے سامنے آنے نہ دیتی۔

اور ہمت سے کام لیتی تو بچی کو ملازموں کی گرفت سے بھی چھڑا سکتی تھی۔

کہ یہ سارا کام تو جرأت اور ہمت کا ہی تھا۔

مگر کم مائیگی کے کمپلکس اور کچھ فطری کمزوری نے زہرہ سے ہمت جرأت اور استقلال کی دولت تو چھین رکھی تھی پھر بھلا ... کیسے کچھ کر سکتی تھی ماسوا رونے اور تڑپنے کے۔

پھر شام کو عبید تھکا ہارا نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا اور کس کس طریقے سے خود کو انسانیت کو ذبح کرنے والے قصابوں سے بچاتا گھر واپس آیا تو گویا قافلہ ہی لٹ چکا تھا۔

وہ بھانجی جسے اس نے اولاد سے بڑھ کر چاہا۔ چھوٹی سی عمر سے نہ جانے کس کس طرح محنت مشقت کر کے اس کی پرورش کی تھی وہی اس سے چھین لی گئی تھی۔

بھانجی کے چھن جانے پر اسے جتنا غصہ آتا۔ جتنا ملال ہوتا کم ہی تھا۔

جبکہ اس کا خون تو کھول اٹھا تھا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اس ظلم پر ظالموں کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دے۔

مگر وائے قسمت کہ مجبوری اور بے لبسی اس کے پیروں کی بیڑیاں بن گئی تھیں۔

کہ حالات ہی کچھ اتنے ابتر ہو رہے تھے کہ اگر وہ چاہتا بھی تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور وقت بھی تو نہ تھا۔ بڑی محنت اور کوشش کے بعد جہاز کی صرف دو سیٹیں ہی مل سکی تھیں اور اس نے سوچا تھا کہ پہلے بہن اور بھانجی کو لاہور بھیج دے گا۔ بعد میں خود جائے گا۔ مگر گھر واپس آیا تو بھانجی کو ہی غائب پایا۔

اتنا وقت تھا نہ موقع کہ بھانجی کو واپس لانے کی کوشش کرتا۔

چنانچہ دل میں یہی حسرت لیے بہن کو ساتھ لے کر لاہور آگیا۔

پاکستان کی پاک اور مقدس سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد کافی عرصہ تو دونوں بہن بھائی کو مہاجر کیمپ میں رہ کر گزارنا پڑا تھا کہ کوئی جان پہچان والا تھا نہ عزیز رشتے دار۔ مگر پھر عبید نے گھوم پھر کے سب سے پہلے ایک چھوٹا سا مکان خرید کر رہائش کا مسئلہ حل کیا کیونکہ زہرہ ... لاہور آئی تھی اس کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اور عبید جانتا تھا کہ یہ تبدیلی آب و ہوا کا سبب ہی نہیں ہے بلکہ آپا کو بیٹی کی ... کا غم اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔ یوں تو عرصے سے زہرہ کو کھانسی کی شکایت تھی۔ جو کبھی بڑھ جاتی اور کبھی دوا دارو کرنے سے گھٹ جاتی ... لاہور آکر تو اسے مسلسل کھانسی کی شکایت رہنے لگی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بخار سی کیفیت بھی۔ اور اس کے خیال سے عبید نے ... کمرے پر مشتمل مکان خریدا تھا جس کا نقشہ باورچی خانے کی ضرورت کو نظرانداز کر کے بنایا گیا تھا۔

بہرحال ... چھپانے کو ایک آسرا تو مل ہی گیا تھا۔

... سردی گرمی اور ... سے بچنے کے لیے ایک پختہ چھت تو میسر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چند دن بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج معالجے کے باوجود اس کی کیفیت بگڑتی رہی کہ غم کا مرض تو یوں بھی لاعلاج ہی ہوتا ہے

... عبید کوئی معمولی سی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کیونکہ پیسہ اب پاس نہ رہا تھا۔ مکان کی خریداری کے بعد ... تھا وہ بہن کے علاج معالجے پر خرچ ہو رہا تھا کسی سے کسی طرح کی امداد کی بھی امید نہ تھی کیونکہ نوزائیدہ ملک تھا۔ اور سب ... کے سوار۔

... لیے نئی اپنی راہیں متعین کرنا چاہتے تھے۔

اور نفسانفسی کے اس دور میں بھلا کون کسے پوچھتا۔

چنانچہ ادھر بہن کی فکر ادھر فکرِ روزگار۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے کہ ایک روز جب وہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں پھر پھرا کر گھر واپس آیا تو زہرہ نے اس سے پوچھا۔

"کیا کوئی کام ملا بھیا؟" (وہ اسے دُلار میں بھیا ہی کہتی تھی۔)

"نہیں مگر فکر کس بات کی آپا۔ ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گا۔" اس نے بہن کی پریشانی کے پیشِ نظر بات کو لاپرواہی سے ٹالتے ہوئے کہا۔

"مگر کب ملے گا آخر جبکہ میں تو صرف اسی آس میں جی رہی ہوں۔ تمہارے روزی کمانے کا کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے تو کم از کم اطمینان سے تو مر سکوں گی۔" زہرہ بجھے دل کے ساتھ بولی۔

"ہائیں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا۔ میرے ہوتے بھلا آپ مر سکتی ہیں۔ واہ کیا مجھے ایسا ہی کمزور سمجھ رکھا ہے آپ نے۔" وہ آزردگی سے کہی بات کو مزاح کا رنگ دے کر بولا۔

"نہیں بھیا۔ یقین جانو اب مجھ میں آگے چلنے کی سکت نہیں ہے۔ ماں جائے ہو کیا۔ بہن کے دل کے زخموں سے واقف نہیں ہو۔ ارے بھیا حالات کے تھپیڑے لگ لگ کے پھٹ گئے ہیں۔"

"ارے آپا آپ تو صابرین میں سے ہیں۔ ایسی مایوسانہ باتیں کر کے بیکار میں اپنی ساری ریاضت کو رائیگاں کیوں کر رہی ہیں۔" بہن کی مایوسانہ باتوں پر عبید کا دل رونے لگا تھا پھر بھی وہ بہن کی ڈھارس ہی بندھاتا رہا۔

"نہیں بھیا! صبر کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور میں اس حد سے بھی زیادہ صبر کر چکی ہوں۔ ہائے مجھے غم ہے تو اس بات کا کہ میں نے کبھی اپنی شمو کو گلے سے نہیں لگایا۔ کبھی ایک محبت بھری نظر اس پر نہیں ڈالی۔ کبھی اپنے پاس بھی نہیں سلایا۔ حالانکہ وہ ننھی جان کیسی ٹکر ٹکر میری طرف دیکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو خود مجھے اس پر ترس آ جاتا تھا۔ مگر جانے مجھے کیا ہو گیا تھا بھیا۔ کیسی مت ماری گئی تھی میری کہ اس بے قصور سے اپنی بربادی کے سارے بدلے لے رہی تھی۔ اسے بھیا آج تمہیں یہ بات بتا رہی ہوں کہ میری کوتاہیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے ہی دلوی کے ساتھ اتنی خاموشی سے چلی گئی تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ — ورنہ اے بھیا میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں صرف ایک بار مجھے اس سے ملوا دو۔ صرف ایک بار۔ تاکہ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی زیادتیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں۔ صرف ایک بار بھیا! بس ایک بار۔ پھر تو میں ہلکی پھلکی ہو کے اپنی قمر جہاں کے پاس چلی جاؤں گی۔ بھیا تمہیں خدا کا واسطہ۔"

اُف زہرہ کی کیفیت ہذیانی سی ہو گئی۔ وہ بھائی کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس کی منتیں کر رہی تھی۔ اور بھائی کا دل بہن کی دل شکستہ باتوں پر پھٹا جا رہا تھا۔ وہ دلگرفتہ سے لہجے میں بولا۔

"آپا خدا کے لیے خود کو سنبھالیے۔ آپا کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے شمو کے چھن جانے کا غم نہیں ہے۔ میرا دل تو خون کے آنسو رو رہا ہے آپا۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا۔ مگر پوری کوشش کروں گا۔ کہ کسی طرح شمو کو ان ظالموں کے چنگل سے چھڑا لاؤں۔

مگر آپا! آپ کچھ تو صبر سے کام لیں۔" مگر جواب میں زہرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بلکہ اس غم میں گھل گھل کر ایک دن وہ زندگی سے ناتا ہی ناتا توڑ گئی۔

یہ سانحہ تو اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ بہن کی جُدائی نے نہ صرف اس کی کمر توڑ دی تھی بلکہ حوصلے بھی پست کر کے رکھ دیے تھے۔

اور اس نے بہن کی میت کے آگے کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنی بے گناہ اور پیاری بہن کا انتقام نہیں لے لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔

فیروزپور روڈ پر آگے جا کر وہ ایک مختصر لیکن خوبصورت سی کوٹھی تھی۔

اوائل جنوری کے دن اور جاڑا شباب پر۔ بلکہ ایسے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی کہ کسی بھی لمحے پارہ نقطۂ انجماد سے گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اصل میں گذشتہ دنوں موسمِ سرما کی پہلی بارش یعنی مہاوٹیں پڑنے کی وجہ سے کڑی دھوپ کی طرح سردی ایک دم ہی چمک اٹھی تھی۔ کہ موٹے موٹے سوئیٹرز، کوٹ اور جیسٹرز بھی اس بلا کی سردی میں ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔

دن کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ لیکن فضاؤں میں پھیلی ہلکی ہلکی دھند اور یخ بستہ ہواؤں نے اس دھوپ کو بھی جیسے ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا اور اسی ٹھٹھری ہوئی نیم جان سی دھوپ میں بیرونی برآمدے کے ستون سے لگی۔ خاتون خانہ سامنے کچھ فاصلے پر مین روڈ پر رواں دواں ٹریفک پر نظریں جمائے کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے پسندیدہ فالسئی رنگ کی سلکن ساڑھی اور میچنگ کاپل اور زیبِ تن کرنے کے باوجود اپنے سراپا کو شمر و کے گرم شال سے اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی ان کے پیروں کو چھوتی ہوئی برفیلی ہوا تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے جسم میں کپکپی سی پیدا کر رہی تھی۔

ان کے انداز سے اضطراب بھی نمایاں تھا اور انتظار کی صبر آزما کیفیت بھی۔

اس لمحے مین روڈ پر عام دنوں کی طرح گاڑیوں اور سواریوں کی اتنی زیادہ آمد و رفت نہیں تھی بلکہ اکا دکا گاڑیاں، بسیں تانگے اور سائیکلیں وغیرہ ہی وقفے وقفے سے گزر رہے تھے۔ خاتون خانہ کی نظریں ٹریفک سے ہٹتیں تو سیدھی کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر پڑتیں۔

وہ دراز قد۔ چھریرے بدن اجلی اجلی رنگت اور کھڑے نقشے کی حامل کافی خوش شکل خاتون تھیں سن بھی یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال کا تھا۔ ان کی غلافی آنکھیں گہری یاسیت کی غماز تھیں۔

اور چہرے سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ناگواری سی متشرح تھی۔ وہ باہر سڑک پر دیکھتے دیکھتے اکتا جاتیں تو پلٹ کر اندر جا کر تیں۔ مگر پھر پلٹ کر باہر نکل آتیں۔

گویا ایک طرح سے وہ ٹہل لگا رہی تھیں۔
اصل میں تو وہ اپنے شوہر کی منتظر تھیں۔
جن کی آمد ـــ کسی لمحے بھی متوقع تھی۔

ان کے شوہر گذشتہ ڈھائی تین ماہ قبل اپنے قریب المرگ والد کی طلبی پر سیتاپور (انڈیا) گئے ـــ تھے۔ اور
میں انہوں نے خط کے ذریعے اپنی بیوی کو اپنے والد کے رحلت کر جانے کی اطلاع دی تھی اور پھر خط ہی کے ذریعے
آمد کی اطلاع۔ لکھا تھا کہ بس آج شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ اور وہاں سے جہاز کی سیٹ بک کرا کے
روانہ ہو جاؤں گا۔ اس حساب سے تو گذشتہ دو روز قبل ہی انہیں آ جانا چاہیے تھا۔ اور وہ پچھلے دو روز سے برابر
کو کار لے کر ایئر پورٹ بھیج رہی تھیں۔ بلکہ پہلے روز تو خود بھی ایئر پورٹ گئی تھیں۔ مگر بعد میں صرف ڈرائیور کو ہی
بھیجنے پر اکتفا کیا تھا۔ اور آثار آج بھی کہہ رہے تھے کہ ان کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ ان کے آنے کا
ٹل چکا تھا۔ اور خاتونِ خانہ کا اضطراب خفگی اور کوفت میں بدل گیا تھا۔ کیونکہ وہ سخت بدگمانی کا شکار تھیں۔
گو فطرتاً وہ شکی مزاج نہیں تھیں۔ نہ ان کے شوہر ہی شوقین مزاج اور اِدھر اُدھر تاک جھانک کرنے والے۔
بس ان کے حالات نے ہی انہیں کچھ شکی مزاج بنا دیا تھا۔

بچپن میں ہی جب ان پر چار دن طرف سے لاڈ پیار کی بارش ہو رہی تھی تو قدرت نے ماں جیسی نعمت کو ان سے
چھین لیا تھا۔ تب باپ ہی سے انہوں نے اپنی ساری توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ دوسرے معنوں میں وہ باپ کی
محبت اور توجہ کی متمنی تھیں۔ مگر وہ ماں کا کفن میلا ہونے سے قبل ہی دوسری شادی رچا بیٹھے تھے۔
تین بڑے بھائی تھے۔
جان چھڑکنے اور اپنی شفقتیں نچھاور کرتے والے۔

لیکن چونکہ ان سے کافی بڑے تھے اور پھر بچپن ہی سے باپ کی سخت گیری اور غفلت سے بھائیوں کا رعب
بھی ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے وہ کبھی ان سے کھُل نہ سکی تھیں۔
انہیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا کچھ چھن گیا ہو۔
یا پھر وہ خود کہیں گم ہو گئی ہوں۔

پھر جب وہ سنِ بلوغت کی حدوں۔ کو چھونے لگیں تو سب سے زیادہ جان چھڑکنے والے بڑے بھائی تو اس
وقت کب کے بیرونِ ملک سدھار چکے تھے۔
منجھلے بھائی نے بھی شادی کر لی تھی اور چھوٹے بھائی جو کہ زیرِ تعلیم تھے تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے اسٹیٹس چلے گئے
اور اپنے غم پالنے کے لیے وہ خود ہی رہ گئی تھیں۔
پھر جوان ہوئیں تو متمول گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی شاید اِدھر اُدھر سے ان کے پیغامات آنے
شروع ہو گئے۔

والد چونکہ اس وقت تک حیات تھے۔
اس لیے انہوں نے ان کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو ایک اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا
تھا۔ لیکن دوہاجو تھا۔
دوست کا بیٹا تھا اور اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا تھا کہ اس کی بیوی جو اس کی سگی چچازاد اور بچپن کی منگیتر
تھی ایک حادثے کا شکار ہو کر شادی کے چھ سات ماہ بعد ہی چل بسی تھی۔ اور وہ شخص بھی اپنی محبوب بیوی کی یادوں
اور محبت کے سہارے اپنے بقیہ زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور عقد ثانی پر کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔
لیکن اس شخص کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے سے ان کا کوئی وارث پیدا ہو جس سے آئندہ ان کی نسل چلتی
رہے۔ اور کچھ اس شخص کے المیے کے پیشِ نظر ہی کہ وہ دنیا کو تیاگ کر ہی نہ بیٹھ جائے باپ نے بالآخر پورے ...
برس بعد اسے عقد ثانی پر آمادہ کر لیا۔ لیکن وائے افسوس کہ دوسری بیوی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم

بھی۔ گو رواج ہونے کی وجہ سے بیوی کا میڈیکل چیک کرایا گیا تھا نہ شوہر نے خود اپنا کرایا تھا۔ پھر بھی تہمت ہمیشہ
بیوی نے اپنے ہی سر لی تھی۔ جبکہ وہ شخص علی گڑھ کالج سے بی اے کا سند یافتہ تھا۔ روشن خیال اور نئی اقدار کا حامل
بھی۔ لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔
لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔
پھر بھی بزرگوں اور دوستوں کے بہت کہنے سننے اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اس نے تیسری شادی نہیں کی
تھی۔
یوں بھی باپ کے پیہم اصرار اور پوتے کی خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے ہی اس نے یہ دوسری بیوی کا جھنجٹ
اپنے سر لیا تھا ورنہ اسے دوسری شادی کی خواہش تھی نہ بچے کی تمنا۔ بلکہ وہ تو دوسری شادی کرنے کی حماقت کر کے ہی
پچھتا رہا تھا۔ اور زبان سے نہ سہی اپنے رویّے اور انداز سے وہ بیوی پر ظاہر یہی کرتا تھا کہ اس سے شادی کر کے اس
نے جیسے اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔
بیوی خود بھی اس کے احسان تلے پسی جا رہی تھی۔
شروع سے ہی دونوں کے ازدواجی تعلقات ناخوشگوار تھے۔
کیونکہ شروع دن سے دونوں کے درمیان ایک جھجک اور اینچ سی حائل ہو گئی تھی۔ یوں بھی وہ شخص کچھ تھا ہی
نظرتاً نرودٹھا سا۔
اور بیوی پر ہمیشہ یہی جتانے کی کوشش کرتا کہ یہ زبردستی کا سودا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی مرحومہ بیوی کا سوگ مناتا
ہی نظر آتا تھا۔
گو اس میں شک نہیں کہ اسے اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت تھی۔
لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ پورے آٹھ برس کے طویل عرصے میں وہ اس کے لیے حکایت پارینہ
ہی بن چکی تھی۔ کہ یوں بھی وقت میں یہی تو ایک خوبی یا خرابی ہوتی ہے کہ ـــــــــــ سوچ
کے دھاروں کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ گزرے ہوئے کل میں جو گزر جاتا ہے وہ حال
اور پھر مستقبل کی تیز دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔
البتہ کچھ ایسے کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو پھانس کی طرح دل میں اتر جاتی ہیں اور بری طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔
تو اس شخص کے دل میں بھی وہ کھٹک باقی تھی۔
کچھ اس وجہ سے بھی کہ جبر یہ عقد ثانی کرنے کے بعد بھی وہ اپنا گوہرِ مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔
اور کچھ اس لیے بھی کہ دوسری زبردستی سر پڑی بیوی صاحب ثروت تھی۔
جبکہ مالی اعتبار سے وہ شخص کم مائیگی کا شکار تھا۔ باپ کو دادا کی طرف سے کوئی معقول ورثہ نہیں ملا تھا کہ دادا کا مال
و زر ان کی شاہ خرچی اور عیاشیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں۔ یعنی باپ کی پہلی بیوی تعلقدار مقصود الحسن کی منجھلی بیٹی تھیں
اس لیے اولادِ نرینہ کے حصول کی خاطر اس کے باپ نے عقد ثانی کر لیا تھا۔ تب کہیں جا کر دوسری بیوی کے بطن سے وہ شخص
پیدا ہوا تھا۔

پہلی بیوی یعنی مقصود الحسن کی منجھلی بیٹی تو جہیز کی صورت میں جو مال و متاع ساتھ لائی تھیں وہ ان کی بیٹیوں کی
شادیوں پر اُٹھ گیا تھا۔ اور دوسری بیوی کا تعلق چونکہ اوسط طبقے سے تھا اس لیے وہ صرف ضرورت کی چیزیں ہی
ساتھ لا سکی تھیں۔ اور اِدھر باپ کی وہی مثل تھی کہ رسّی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے مگر باہر سے
وہی اپنے تلّے وہی کرّ و فر۔ کوئی کام کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو بچا کھچا تھا وہ بھی ان کی فضول خرچی میں ختم
ہو گیا تھا۔ بس انہی حالات کے پیشِ نظر باپ کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ شخص عقد ثانی پر آمادہ ہوا تھا۔
بیوی کے دم سے ہی چار چاند لگے ہوئے تھے۔
لیکن ظاہر یہی کرتا تھا کہ اسے بیوی کے روپے پیسے کی کوئی طمع ہے نہ اس کی ذات میں کوئی دلچسپی ہی۔ اور اولاد

پیدا نہ کر سکنے کی پاداش میں اسے بالکل ہی بے وقعت کرکے رکھ دیا تھا۔

بیوی بے چاری بھی اپنی اتنی بڑی محرومی کی وجہ سے احساس کمتری کی کچھ ایسی شکار ہوئی تھی کہ ہر دم افسردہ خاموش سی رہتی تھی۔ کہ اولاد کی وہ بھی دل سے خواہاں تھی۔

کتنا ارمان تھا اسے ماں بننے کا۔

مگر جب کاتبِ تقدیر نے اس کی قسمت میں اولاد ہی نہیں لکھی تھی تو صبر کرنے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا تھا۔

بس اسے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کا شوہر اولاد کی خاطر ایک اور شادی نہ کر لے۔

فلاں جگہ گیا ہے تو کسی ایسے ہی چکر میں نہ گیا ہو۔

یا پھر کہیں خفیہ طور پر کسی سے تعلقات استوار نہ کر رکھے ہوں۔

اور اس سمے بھی وہ کچھ ایسے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا تھیں۔

آخر جب ٹہل ٹہل کر انتظار کرتے کرتے دن کا ایک بج گیا تو وہ شوہر کی طرف سے مایوس ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

اصل میں ان کی بھیجی ہوئی کار ابھی تک ایئرپورٹ سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس کی واپسی کے انتظار میں انہیں ڈرائنگ روم میں ہی رکنا پڑا تھا ورنہ اتنی شدید سردی میں وہ سیدھی اپنی خواب گاہ میں جا کر لحاف میں دبک جاتیں۔ وہ جونہی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ گھر کی ادھیڑ عمر پرانی نمک خوار امجدی بوا نے اندر کہیں سے وارد ہو کر اطلاع دی۔

"دلہن بیگم کھانا کب کا تیار ہو چکا ہے۔ کیا میز پر لگا دوں۔" مگر کوفت اور کھسیاہٹ کے عالم میں ان کی بھوک بھی اڑ گئی تھی۔ انہوں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ میز پر لگوانے کی ضرورت نہیں بس تم کھا لو اور خانساماں کو بھی کھلوا دو۔" اس کھردرے جواب سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موڈ میں نہ تھیں اور امجدی بوا اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر جانے سے پہلے دبی زبان سے کہا۔

"کھانے کا وقت نکل جاتا ہے دلہن بیگم تو بے وقت کھانے سے طبیعت پر گرانی رہتی ہے۔ میاں سرکار تو آج بھی آتے نہیں لگ رہے۔"

"وہ تو اب شاید ہی کبھی آئیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں اور پھر کرخت سے لہجے میں بولیں۔

"جب میں بے وقت کچھ کھانے پینے کی عادی ہی نہیں تو پھر طبیعت پر گرانی کا کیا سوال۔" امجدی بوا نے پھر کچھ نہیں کہا جواب میں ایک ٹھنڈا سانس بھرتی واپس پلٹ گئیں۔ اور تبھی چند لمحے بعد ہی کار رکنے کی آواز آئی تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ شوہر نہیں آئے ہیں ان کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔

مگر جانے غصے اور کوفت کی وجہ سے دھڑکا تھا یا تشویش کے باعث۔ حالانکہ وہ بہت مستقل مزاج اور ٹھوس طبیعت کی مالک تھیں۔ لیکن شوہر کے معاملے میں تقریباً ہر عورت کسی نہ کسی پہلو اپنی فطری کمزوری سے مات ضرور کھا جاتی ہے۔ سو وہ بھی ایک عورت ہی تھیں۔

ڈرائیور کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اس لیے اپنی بے کلی پر قابو پاتے ہوئے وہ صوفے پر سنبھل کر کچھ اس انداز میں بیٹھ گئیں جیسے ڈرائیور کی واپسی سے لاعلم ہوں۔

لیکن اگلے ہی لمحے جب ایک مخصوص اور مانوس سی خوشبو سارے ڈرائنگ روم کو معطر کرتی نظر آئی تو انتہائی حیرت کے عالم میں انہوں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تو تھری پیس کے گرم سوٹ میں ملبوس انہیں اپنے شوہر سامنے ہی کھڑے نظر آئے۔ اور ان سے نظر ملتے ہی بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا کر بولے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ ان کے سلام کا جواب دیتی ہوئی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ دل بھی عجب انداز میں دھڑکا نہ…

شگفتہ سا انداز اور یہ ٹیپ ٹاپ ان کے لیے سخت اچنبھے کا باعث بنی جا رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں جامد ہوتی حیرت کے ساتھ اُن کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

"اب آپ نے تو خود سلام کرنے میں پہل نہیں کی تو ہم نے سوچا کہ ہم ہی کر لیں۔" وہ اُن کی ہر کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کے قریب آکر بولے۔

"لیکن قاعدے کے مطابق تو آنے والے پر ہی سلام میں پہل کرنا واجب ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنی حیرت پر قدرے قابو پاکر کہا۔

"ہا ہا ہا یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر خیر اپنی سنائیے اتنے عرصے کیسی رہیں آپ۔" انہوں نے ان کے جواب پر ہنس کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔" ٹکڑا توڑ سا جواب ملا۔

"ظاہر ہے ظاہر ہے معلوم بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔" انہوں نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑایا۔ جواب میں وہ انہیں شاکی سی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"مگر یہ خفگی یا کبیدگی جو کچھ بھی سہی جائز ہی ہے جانِ من آپ کو واقعی انتظار کی سخت زحمت اٹھانی پڑی ہوگی۔" وہ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں منانے کے سے انداز میں بولے۔ جواب میں وہ نظریں جھکائے کھڑی رہیں۔

"لیکن ہم اپنی غیر حاضری کی ساری کسر بھی ابھی پوری کر دیں گے کچھ معلوم بھی ہے ہم آپ کے لیے کیسی انمول سوغات لائے ہیں۔"

انہوں نے اپنے ہاتھوں میں اُن کا چہرہ تھام کر بڑے پیار سے کہا۔ اور شوہر کی بات پر خوش ہونے کے بجائے وہ ہکا بکا سی رہ گئیں کہ یوں بھی شوہر کی ہر بات۔ یعنی ان کا اِسقدر چونچال موڈ۔ نرم سا رویہ۔ اتنا التفات اور گرمجوشی ہی کم تعجب کا باعث تھی کہ یہ سوغات۔ وہ بھی بڑی انمول سی سوغات لے کر آنا۔ جبکہ وہ کسی خوش وقتی میں تو انڈیا نہیں گئے تھے نہ وہاں سے کوئی معرکہ ہی سر کرکے آئے تھے بلکہ وہ تو اپنے والد کی نازک حالت کے پیشِ نظر بڑے ہنگامی سے حالات میں دوڑے دوڑے انڈیا گئے تھے اور باپ کے آخری سفر میں انہیں الوداع کہہ کر آ رہے تھے۔ یوں بھی انڈیا یا والد کے پاس جانے کا یہ پہلا اتفاق تو نہ تھا۔

بلکہ جب وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے دہلی میں مقیم تھے تب بھی سال میں دو مرتبہ باپ سے ملنے سیتاپور ضرور جاتے تھے اور وہاں کم و بیش ماہ ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزار کر ہی آتے تھے۔ یہ ان کے لیے کوئی انوکھی بات تو نہ تھی، نہ ہی وہ کبھی کوئی سوغات لائے تھے۔

مگر اس مرتبہ چونکہ واپسی میں کچھ زیادہ ہی عرصہ لگ گیا تھا اور وہ گھر پر تنہا رہ گئی تھیں شاید اسی وجہ سے انہیں خوش کرنے کے لیے وہ کوئی سوغات لے آئے ہیں انہوں نے دل میں سوچا۔ کہ اس کے علاوہ تو سوغات لانے کا انہیں کوئی جواز ہی نظر نہیں آتا تھا۔

"بھئی واہ تعجب ہے ایک تو ہم آپ کے لیے اتنی اچھی سوغات لائے ہیں اور آپ ہیں کہ پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ ہم ایسی کیا اچک کر آپ کے لیے اٹھا لائے ہیں۔" انہوں نے بیوی کو اسقدر متعجب اور خاموش دیکھ کر کہا۔

"اچھا ٹھہریں ہم خود ہی دکھائے دیتے ہیں کہ ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں۔"

وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر بولے۔ تو بیوی نے بھی سوچا کہ یقیناً وہ کوئی خاص چیز ہوگی ورنہ وہ اس انداز میں کسی چیز کو بتانے کے عادی تو نہیں ہیں۔ اس اثناء میں وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر وہیں رک کر انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی "بشیر!" اور پھر واپس پلٹ کر صوفے پر آ بیٹھے۔

"آئیے آپ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھ جائیے۔" انہوں نے بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔

اور محض اس وجہ سے کہ اس لمحے وہ حد درجہ متجسس ہو رہی تھیں۔ میاں کے کہتے ہی اُن کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پھر اگلے ہی لمحے بشیر دونوں ہاتھوں پر سرخ کمبل میں لپٹی کوئی شے بڑی احتیاط سے اٹھائے اندر آگیا۔ تو وہ اٹھتے ہوئے بے تابانہ سے

انداز میں بولے۔

"لاؤ لاؤ بشیر! ہماری لائی ہوئی یہ سوغات بیگم صاحبہ کو دے دو۔"

بشیر مسکراتا ہوا بیوی کے قریب آگیا۔ اور بیوی آنکھیں نکال کر رہ گئیں ان کی طرف بڑھا دی۔ اور بیوی اس بنڈل نما چیز کو دیکھ اس بُری طرح اچھلیں جیسے بائی وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ کیونکہ سُرخ کمبل میں لپٹا وہ کوئی ڈھائی تین سال کا بچہ اس لمحے بے سُدھ پڑا سو رہا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ کچھ ایسی بھونچکا سی ہوئیں کہ گھبرا کر تھوڑی سی پیچھے سرک گئیں۔ شوہر نے ان کی اس حرکت کو دیکھا اور ان کے چہرے سے متشرح ناگواری کو بھی پڑھ لیا۔ مگر کچھ بولے نہیں بلکہ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر

"لاؤ بشیر اسے ہماری گود میں لٹا دو— ورنہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گئی تو اس کی نیند میں خلل پڑ جائے گا۔" بشیر کو کیا تامل ہوتا۔ اس نے فوراً ہی بچی کو بڑی احتیاط سے ان کی گود میں لٹا دیا۔

"اچھا اب تم جاکر اپنے کوارٹر میں آرام کرو۔ شام کو چھ بجے تک آ جانا، بہت ممکن ہے کہ ہمیں کہیں جانا پڑ جائے۔" انہوں نے بچی کو سنبھالتے ہوئے ڈرائیور سے کہا تو وہ جی بہتر ہے کہتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

بیوی اسی کوچ کے دوسرے سرے پر جس پر وہ بیٹھے تھے جذبات سے عاری چہرہ لیے خاموش بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بچی کو اپنے اور ان کے درمیان جو جگہ خالی تھی آہستہ سے لٹا دیا۔ اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بولے۔

"کیوں کیا ہماری لائی ہوئی سوغات پسند نہیں آئی آپ کو؟" تو بیوی کا دل چاہا کہ کہیں۔ آج تک تو آپ کو میرے لیے کوئی سوغات لانے کی توفیق نہیں ہوئی— اور اب لائے بھی ہیں تو بھلا کیا۔ نہ معلوم کس کی اولاد— کس کے گناہ کا پھل۔ مگر یہ سب وہ شوہر سے تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ بڑے تلخ سے لہجے میں بولیں۔

"پسند ناپسند تو بعد کی بات ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ جن حالات میں آپ سیتاپور گئے تھے ان میں تو بار بار سے آپ کو رنج و کرب سمیٹ کر لانا چاہیے تھا نا کہ سوغات"

"ہاں مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ یہ سوغات بھی اسی رنج و کرب کا ایک حصہ ہی ہے۔"

ہونہہ بہانے گھڑنے کے لیے اس قسم کے بہت سے مفروضے ہی سننے کو ملتے ہیں" انہوں نے تلخی سے دل میں سوچا، بولی نہیں۔

"یہ بات یقیناً آپ کے تعجب میں اضافے کا باعث ہوگی کہ یہ بچی باوا جان کے بڑھاپے کی نشانی ہے۔ اور باوا جان نے بطور خاص ہمیں اس کی سرپرستی قبول کرنے کی غرض سے ہی بلوایا تھا۔" اور انہوں نے ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ان کی طرف کچھ ایسی ملامت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ وہ گڑبڑا سے گئے۔

"میرے خیال میں اس وضاحت کی کچھ ایسی ضرورت تو نہ تھی ثاقب صاحب۔ بس اتنا ہی کافی تھا کہ آپ میرے لیے انمول سوغات اٹھا لائے ہیں۔" انہوں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں ہونا بھی چاہیے۔ کیونکہ ہم نے اس بچی کو آپ کی ایک دیرینہ خواہش کے پیش نظر ہی اپنی سرپرستی میں لینا قبول کیا ہے۔ بچی بہن سمجھ کر نہیں۔"

انہوں نے گویا بیوی پر چھیڑا رکھا۔

"لیکن انسان کے دل میں اگر کوئی شدید خواہش جنم بھی لیتی ہے تو اسی شد و مد کے ساتھ کہ وہ جلد از جلد تکمیل کو پہنچ جائے۔ ورنہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یعنی تاخیر ہوتی جاتی ہے۔ وہ خواہش ایک حسرت میں بدل جاتی ہے۔ میں تو اپنی اس خواہش کو بہت گہرائی میں دفن کر چکی ہوں۔"

وہ اور بھلا شوہر سے اس معاملے میں مات کھا جاتیں۔ اتنے تلخ اور درشت لہجے میں بولیں کہ ثاقب کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کے باوجود بھی ان کے مزاج نے اعتدال سے تجاوز نہیں کیا۔ بڑے دھیمے سے لہجے میں بولے۔

"آپ کے کسی خیال کی نفی کرنے کا ہم منہ تو نہیں رکھتے، فاخرہ بیگم۔ لیکن آپ کی کسی بچے کو متبنیٰ کرنے کی خواہش پوری کرنے سے ہم اس لیے قاصر رہے تھے کہ کسی دوسرے کی اولاد کو گود لے کر پالو پوسو۔ اس پر اپنی تمام تر محبتیں حتیٰ کہ جان تک نچھاور کر دو تب بھی بڑی ہو کر وہ پرائی اولاد ہی ثابت ہوتی ہے۔ اور ہمارے پاس اس کی کئی نظیریں موجود ہیں۔"

"پھر تو اس لحاظ سے یہ بچی بھی بڑی ہو کر پرائی ہی ثابت ہوگی۔ آپ کے لیے کیونکہ بقول آپ کے یہ آپ کی نہیں آپ کے والد کی اولاد ہی ہے۔" فاخرہ بیگم نے چمک کر کہا۔

"نہیں اس بچی کا معاملہ یکسر دوسرا ہی ہے۔ باوا جان کے انتقال کے بعد اس کا ہمارے سوا کوئی دعویدار ہوگا نہ سرپرست ہی۔" ثاقب ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"کیوں کیا اس کی ماں کو بھی آپ بے حق کر دیں گے؟" فاخرہ بیگم نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بے حق کرنا کیسا— اس بچی کی والدہ اگر حیات ہوتیں تو پھر اس بچی کو ہماری سرپرستی میں آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔" ثاقب حسن متانت سے بولے۔ فاخرہ بیگم نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ امجدی بوا کو پکارتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ لباس تبدیل کر کے کھانا کھائیں گے یا—" انہوں نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی کمال ہے اپنے گھر آئے ہیں کوئی مہمان تو نہیں ہیں اطمینان سے لباس تبدیل کر کے ہی کھانا کھائیں گے۔ مگر کیا آپ کھانا کھا چکیں—؟" ثاقب بھی بچی پر ایک نظر ڈال کر ہنستے ہوئے بولے۔

"نہیں—"

"اوہ تو گویا ہمارا ہی انتظار ہو رہا تھا—!" انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں بلکہ مجھے بالکل اشتہا نہیں تھی—" بڑی بیگانگی سے جواب ملا۔ اس جواب پر وہ بجھ کر رہ گئے اور خاموشی سے ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگے تو کسی خیال کے تحت رُک کر بولے۔

"ارے ہاں اس بچی کو تو ہم بھول ہی گئے۔ اسے اندر—" فاخرہ بیگم ان کی بات قطع کر کے بولیں۔

"میں نے امجدی بوا کو اسی لیے بلایا ہے وہ اس لڑکی کو یہاں سے اٹھا کر اندر کہیں پہنچا دیں۔" فاخرہ بیگم کی بات پر ثاقب نے سخت جز بز ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر قدم بڑھا کر بچی کے قریب آ گئے اور اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولے!

"ایک جیتی جان کی ذمے داری قبول کر لینا آسان نہیں ہوتا فاخرہ بیگم، اور یہ بچی لاوارث ہے نہ کوڑے کرکٹ کی طرح گھر کے کسی کونے میں پھینک دیے جانے کی مستحق۔ یہ بہر طور ہماری چھوٹی بہن ہی ہے اور بہن کا حق بیوی سے سوا ہی ہوتا ہے"

"بہن کا حق یا بیٹی کا؟" ان کے آخری فقرے پر تلملا کر فاخرہ بیگم نے اپنی دانست میں ان پر کاری چوٹ کی۔

"ہماری نظر میں چھوٹی بہن بھی بیٹی کے سمان ہی ہوتی ہے۔" بیوی کی بات کا مفہوم سمجھ لینے کے باوجود ثاقب متانت سے بولے۔

"کاش کہ ایسا ہی ہو۔" فاخرہ بیگم نے ایک اور تیر چلایا۔

"ایسا ہو ہی نہیں بلکہ ایسا ہی ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں فاخرہ بیگم کہ خون کے رشتوں میں ایک ہی خوبی ہوتی ہے یعنی جو خون باپ کی رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے وہ بیٹی کی رگوں میں بھی اور بیٹے اور اس کی اولاد کی رگوں میں بھی۔"

ثاقب ان کی بدگمانی دور کرنے کی غرض سے بولے۔ اور فاخرہ بیگم مزید کوئی چوٹ کرنے والی تھیں مگر امجدی بوا کے اندر آجانے کی وجہ سے انہیں بات اپنے ہونٹوں میں دبانی پڑی۔ ثاقب بھی بچی کو لے کر اپنی خوابگاہ میں چلے آئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے فاخرہ بیگم ان کے پیچھے نہیں آئی تھیں۔ بلکہ امجدی بوا کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی تھیں اور میز پر کھانا لگوا کر شوہر کے انتظار میں بیٹھ گئی تھیں۔ اور جب ثاقب کوئی پندرہ بیس منٹ تک انتظار کرانے کے بعد کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے تو بچی ان کا ہاتھ پکڑے ان کے ساتھ تھی۔

تب انہوں نے دیکھا بچی اتنی خوبصورت اور صحت مند تھی کہ کوئی شقی دل ہی ہوتا جو اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے فوراً ہی نظریں چرا لیں۔ اور میز پر رکھی ڈشوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مگر اتنی پیاری سی بچی کو دیکھ کر امجدی بوا بلک ہی اٹھیں۔

جلدی سے ہاتھ میں تھامی مٹھاس کی ڈش میز پر رکھی اور جھک کر بچی کو گود میں اٹھا لیا۔

"اے میاں سرکار۔ یہ کس کی بٹیا ہیں اتنی پیاری سی۔" انہوں نے ثاقب سے پوچھا تو ثاقب نے ایک نظر لاتعلق سی فاخرہ پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یہ تمہاری بیگم سرکار کی بٹیا ہیں۔ امجدی بوا کیوں کچھ پسند بھی آئیں۔" تو امجدی بوا یہی سمجھیں کہ بہو بیگم نے اس بچی کو گود لیا ہے—

دوتوں کو خوش کرنے کی غرض سے بولیں۔

"ماشاءاللہ بالکل والایتی گڑیا لگے ہیں یہ بٹیا تو میاں سرکار خدا آپ کو ان کی خوشیاں دکھائے۔" اور امجدی بوا کی بات پر نہ... کھول ہی اٹھیں۔ بڑے برہم سے لہجے میں امجدی بوا کو مخاطب کرکے بولیں۔

"امجدی! تم جاکر باورچی خانے میں بیٹھو۔ جب ضرورت ہوگی ہم تمہیں بلالیں گے۔"

اور امجدی بوا کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ وہ منہ لٹکائے کھانے کے کمرے سے نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی ثاقب نے اپنے... کرسی پر بچی کو بٹھایا اور پھر خود بھی بیٹھ گئے۔

"کیا کھاؤ گی گڑیا۔۔۔؟" انہوں نے بیوی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بچی سے پوچھا۔ تو جواب میں بچی نے اپنی معصوم اور چمکیلی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر کھانے کی میز کے بیچوں بیچ رکھی فروٹ ڈش کی طرف انگلی اٹھادی۔ فروٹ ڈش میں سنگترے، امرود اور... وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ثاقب نے ایک سیب اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"پہلے کھانا کھالو پھر یہ سیب کھانا۔ ٹھیک ہے نا گڑیا۔ چلو یہ سیب یہاں اپنے سامنے میز پر رکھ دو۔" مگر بچی نے سیب... رکھنے کے بجائے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبالیا۔

"اچھا بھئی چلو یہی کھالو۔" ثاقب نے تھوڑا ہنس کر کہا اور پھر سیب کو چھیلنے اور کاٹنے کی غرض سے چھری اٹھانے کے لیے ذرا... کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فاخرہ بیگم جو ان سے پہلے ہی چھری اٹھا چکی تھیں۔ اور سیب چھیل کر قاشیں کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے پلیٹ... پلیٹ بچی کے آگے سرکادی۔

"او ہاں۔۔۔ یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔" ثاقب نے خوش ہوکر کہا۔ اور پھر بچی کے ہاتھ سے سیب لے کر فاخرہ بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

"اس نے صبح صرف دو چھوٹے بسکٹ ہی کھائے تھے۔ میرے خیال میں ایک سیب نا کافی ہوگا۔"

"لیکن پہلے اسے یہ تو ختم کرنے دیجیے پھر دوسرا بھی کاٹ دوں گی۔" فاخرہ بیگم نے پہلی بار مصالحانہ سا رویہ برتا۔ اور پھر ناپسندیدگی سے... سہمی بچی کی طرف دیکھنے لگیں۔

بچی کے براؤن بالوں میں ہلکے ہلکے گھونگر سے پڑے تھے۔

گوری رنگت اور کھڑے کھڑے سے نقشے پر سرخ اونی سویٹر اور سیب کھاتے ہوئے پھول سے گالوں میں پڑتے گڑھے اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ وہ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھی رہیں۔ ثاقب نے بھی انہیں بچی کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مگر انجان سے بن...

"اچھا بھئی گڑیا اب تم اپنا کھانا کھاؤ اور ہم اپنا۔۔۔ لیکن وہ جو انگریزی کا مقولہ ہے کہ لیڈیز فرسٹ تو پہلے آپ بسم اللہ کریں۔" بچی سے بات کرتے کرتے وہ بیوی سے مخاطب ہوئے تو انہوں نے ان کی توقع کے برخلاف خاموشی سے پلاؤ کی ڈش اپنے آگے سرکا...

"اس کا نام کیا صرف گڑیا ہی ہے یا کچھ اور بھی۔۔۔؟" انہوں نے دو تین نوالوں کے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر پلاؤ کی ڈش ثاقب کی طرف بڑھادی۔

"ابھی تک تو صرف گڑیا ہی ہے۔" ثاقب نے اپنی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر شامی کباب اور بینگن کی تلاجی پلیٹ میں ڈالنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"اصل میں بڑے ہنگامی حالات میں ہماری یہ چھوٹی بہن ہمیں سونپی گئی تھیں۔" پھر وہ خاموش ہوکر کھانا کھانے لگے۔

"تعجب ہے ایک اتنی بڑی ذمہ داری قبول کرنے کے باوجود بھی آپ نے اس بچی کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔" فاخرہ بیگم نے دل... سر سراتے شبہات کو پھر ہوا دی۔ تو ثاقب نے ان کی بات کی تہہ میں چھپے شک و شبہات کو محسوس کرکے کھانے سے ہاتھ روک کر اور سخت ناگوار سے لہجے میں بولے۔

"تعجب تو ہمیں ہونا چاہیے کہ ہمارا اور آپ کا بارہ طویل سالوں کا ساتھ ہے اس کے باوجود بھی آپ ہماری فطرت اور مزاج کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ کرسکیں۔" فاخرہ بیگم نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مگر دل میں سوچا ضرور۔۔۔ ہونہہ مجھ سے زیادہ بھلا آپ سے کون واقف ہوگا۔ ثاقب کو ان کی یہ خاموشی بہت کھلی۔

"کچھ یاد بھی ہے ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہوگا۔" انہوں نے بڑے تحمل سے کام لے کر پوچھا۔

"یہی کوئی بارہ تیرہ سال۔۔۔"

"نہیں بلکہ پورے چودہ سال۔۔۔ ہماری شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی۔ اور یہ ۱۹۶۳ء ہے۔" انہوں نے تیز لہجے میں گویا بیوی کے اندازے...

کوفتوں کا ڈونگا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں کوفتے ڈال کر انہوں نے دست مال کے نیچے سے گرم چپاتی اٹھائی اور خاموشی، تیزی کی اور پھر کوفتوں سے نوالے بنا بنا کر کھانے لگے۔ مگر ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ شدید قسم کی کوفت میں مبتلا ہیں۔

فاخرہ بیگم نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر آہستہ آہستہ پینے لگی تھیں۔

"کم از کم ہمارے لیے تیسرا عقد تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم اتنے عرصے بعد بھی آپ کی نظروں میں معتبر نہیں ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہم نے لوگوں کے بہت کہنے سننے بلکہ ورغلانے کے باوجود بھی بُرا بھلا نہیں کہا۔" پھر انہوں نے آخری دو نوالے کھانے کے بعد گلاس میں پانی انڈیل کر اسے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ورنہ جانتی بھی نہیں آپ کہ ہمیں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی۔ ایسی تمنا جس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں۔" اور ان کی اس بات پر فاخرہ بیگم نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس لبوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

"کچھ معلوم بھی ہے آپ کو کہ ثریا کی حادثاتی موت کو اب تک کس وجہ سے ہم بھلا نہیں سکے۔ اور اس کی مفارقت کا غم ہمیں اندر ہی اندر کیوں گھلا رہا ہے۔" انہوں نے خالی گلاس کو قدرے زور سے میز پر رکھتے ہوئے بیوی کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔ لیکن اس سوال کا جواب ان کے پاس تھا ہی کہاں۔۔۔ ماسوا شوہر کو اتنے عرصے بعد بھی پہلی بیوی کی محبت میں غرق دیکھ کر آزردہ ہونے کے۔

"وہ حادثے کے وقت حاملہ تھی۔ چار ماہ کا حمل تھا اسے۔" انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا تو فاخرہ بیگم جو خود بھی یہی سمجھتی تھیں کہ ان کے شوہر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی طرف سے مشکوک بھی رہتی تھیں۔ یہی سمجھیں کہ یہ کہہ کر وہ ان کی خامی کو جتا رہے ہیں۔ کٹ کر رہ گئیں۔

"مگر ہم نے کسی بچے کو اس لیے گود نہیں لیا تھا کہ ہم کو آپ سے ضد ہوگئی تھی یا ہم آپ سے آپ کی خامی کا بدلہ لے رہے تھے۔ بلکہ اس وجہ سے نہیں لیا کہ قدرت نے ہمیں اولاد سے محروم رکھ کر ہم پر بڑا ظلم کیا تھا۔ اس لیے ہم نے بھی سوچا جب خدا نے ہمیں اولاد سے محروم ہی رکھا ہے تو پھر پرائی اولاد کو پال پوس کر کیا کریں گے۔" پھر بات کے اختتام پر انہوں نے فروٹ ڈش سے سنگترہ اٹھایا۔ اور بچی پر ایک نظر ڈالی۔ جیسے اپنی باتوں میں شاید وہ بھول چکے تھے۔ بچی نے سیب کی چند قاشیں ہی کھائی تھیں باقی اپنی گود میں گرالی تھیں۔ اور کچھ نیچے قالین پر پھینک دی تھیں۔

"ارے گڑیا! تم نے تو آدھا سیب بھی نہیں کھایا۔ بھئی یوں تو کام نہیں چلے گا۔" ان کی بات پر بچی نے اپنی چمکتی ہوئی معصوم نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر فاخرہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ ثاقب نے سنگترہ چھیل کر اس کی پھانک بچی کے ہونٹوں سے لگا کر پھر کہا۔

"لو تم تو یہ سنترہ کھاؤ گڑیا۔" مگر بچی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"یہ ابھی تک مانوس نہیں ہوئی کسی سے اسی لیے شاید جھجک رہی ہے۔" بچی کے منہ پھیر لینے پر وہ قدرے خفیف سے ہوکر بولے۔

"اگر سچ پوچھتی ہیں تو ہم اس بچی کی ذمہ داری قبول کرنے کے بالکل حق میں نہ تھے لیکن چونکہ والد صاحب قبلہ کی یہ آخری خواہش تھی اس لیے مجبوراً ہمیں اسے۔۔۔ اپنی سرپرستی میں لینا ہی پڑا اور اب ہم اسے اولاد کی طرح نہ سہی بہن کی طرح پالیں گے۔" اور پھر انہوں نے اپنے گرم سوئیٹر کی اندرونی جیب سے ایک پھولا ہوا بڑا سا لفافہ نکال کر اپنے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"لیکن اس کی کیا ضمانت کہ کل کلاں کو اس بچی کا کوئی دعوے دار پیدا ہوگیا تو۔" فاخرہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"...دعوے دار ہمارے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔ ہم سے خوش قسمت تو ہمارے والد صاحب قبلہ ہی تھے کہ خدا نے انہیں اولاد سے تو نوازدیا۔" اولاد کے بارے میں کہی شوہر کی ہر بات فاخرہ کو شرمندہ اور مجرم ضمیر سا کرکے رکھ دیتی تھی۔

"بہرکیف باوا جان نے ہمارے لیے زیادہ اثاثہ نہیں چھوڑا۔ بلکہ جتنا چھوڑا تھا اس کے پانچ چھ حصہ دار تھے۔ ایک بڑی اماں، چاروں بہنیں اور ہم۔ اور اثاثے کے اسی قضیے کو نمٹانے میں ہی تو ہمیں واپسی میں اتنی دیر ہوگئی۔ اور ہمارے حصے میں آئی بھی تو کل پچاس ہزار کی رقم۔ بیچاری گڑیا تو وراثت سے بھی محروم کردی گئی۔" انہوں نے اتنا کہہ کر شکرانہ ادا کرنے کے لیے اپنے ہاتھ اٹھالیے اور پھر دونوں ہی ہاتھوں کو منہ پر پھیر کر وہ لفافہ ان کے آگے رکھتے ہوئے بولے۔

"گو یہ تو حقیر سی رقم یعنی آپ کی رقم کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی یہ ہم آپ کی نذر کرتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔" انہوں نے ہنس کر کہا اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ فاخرہ بیگم کچھ دیر تو گم سم سی بیٹھی رہیں پھر کچھ سوچ کر لیں...

"ارے نہیں۔ گر قبول افتد کی کیا بات ہے۔ عزوشرف تو آپ نے مجھے بخشا ہے یہ اتنی بڑی رقم دے کر۔ اور اب جبکہ یہ رقم میری ملکیت بن گئی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اس رقم کو اس بچی کے اخراجات کے لیے ـ"

"واہ تو گویا ہمارا اتھو کا ہمارے منہ پر ہی مار دینا چاہتی ہیں آپ؟" اور ثاقب ان کی بات کو چوٹ سمجھ کر بھنا ہی اٹھے۔

"نہیں نہیں۔ آپ کی عطا کردہ چیز تو مجھے ہر شے سے عزیز ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ جب آپ نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے تو آپ کی شریکِ سفر ہونے کی حیثیت سے میں بھی اس ذمہ داری میں شریک بن جاؤں گی اور" فاخرہ بیگم نے فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کی مگر ثاقب حسن کا دل ان کی اس تاویل کو ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ بڑے اکھڑے لہجے سے بولے۔

"بہر حال ہم نے تو اپنی طرف سے آپ کو ایک حقیر سا نذرانہ پیش کیا ہے۔ اب یہ آپ کی خوشی اور مرضی ہے کہ اسے قبول کر لیں یا پھینک دیں اور پھر بچی کو ساتھ والی کرسی سے اتار کر ساتھ لے جانے لگے تو فاخرہ بیگم جلدی سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے بھی اس بات کا غم ہے کہ آپ مجھے ابھی تک نہیں سمجھے ثاقب حسن۔ ورنہ آپ اگر تحفتاً مجھے ایک سوئی بھی دیتے تو وہ بھی میں بہت قیمتی سمجھ کر حرزِ جاں بنا لیتی۔ یہ رقم تو پھر بھی بہت بڑی ہے۔"

"اچھا!" انہوں نے یوں کہا جیسے ان کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ فاخرہ بیگم کو پھر مزید کچھ کہنا مناسب نہ لگا۔ وہ بچی کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

"جی ہاں مگر اس بچی کے نام کا کیا مسئلہ ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی نام تو ضرور ہو گا اس کا۔"

"اگر ہو گا بھی تو اب تک ہمارے علم میں نہیں آیا۔" پھر انہوں نے بچی کی ٹھوڑی اونچی کر کے پوچھا۔

"بھئی گڑیا آخر تمہارا کوئی نام ہے یا نہیں؟" جواب میں بچی پھر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا یہ کچھ بولتی بھی ہے؟" فاخرہ بیگم نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ بولتی کیوں نہیں مگر شاید اپنے موڈ سے ہی بولتی ہے اور تھوڑا بہت سمجھ بھی لیتی ہے۔ اگر اس کا کوئی نام ہوتا تو ضرور بتا دیتی" انہوں نے بتایا۔ تب فاخرہ بیگم نے بچی کے پھول سے رخسار کو آہستہ سے چھو کر اس سے پوچھا۔

"آہا۔ بڑی اچھی بچی ہو تم۔ کیا نام ہے تمہارا؟" تب بچی نے کچھ دیر تک کبھی ثاقب اور کبھی فاخرہ بیگم کو دیکھنے کے بعد کہا

"چھل بت۔"

"ہائیں کیا شربت؟" ثاقب نے پوچھا۔

فاخرہ نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ لو دیکھا کوئی نہ کوئی نام تو ضرور ہے اس کا۔

"ہاں تو پھر بتانا بچی تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"چھل وت۔" بچی نے نام دہرانے میں خاصی دیر لگائی۔ پھر بھی دونوں میاں بیوی کے پلے کچھ نہ پڑا۔

"اچھا دیکھو یہ کیا ہے۔" فاخرہ بیگم نے دماغ پر زور ڈالنے کے بعد فروٹ ڈش میں رکھے سیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بچی سے پوچھا۔ اصل میں وہ اس کا تلفظ معلوم کرنا چاہ رہی تھیں۔

"چھب۔" سیب کو دیکھ کر بچی کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

"معلوم ہوتا ہے سیب اسے بہت مرغوب ہیں۔" ثاقب حسن نے قیاس آرائی کی۔ مگر فاخرہ بچی کے نام یا چھل وت کا معمہ حل کرنے میں ہی مصروف تھیں۔

"اچھا تو یہ سین کو چھین بولتی ہے۔ چھل وت چھل دت۔ یعنی س ل و ط۔ کیوں تمہارا نام سلوط ہے نا بچی؟" انہوں نے گویا بچی کے نام کا معمہ حل کر کے بڑے فخریہ سے انداز میں شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بچی سے پوچھا تو جواب میں بچی نے اثبات میں اپنا چھوٹا سا سر ہلایا۔

"مگر بالکل نیا سا نام ہے یعنی عام نہیں ہے۔ اور میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اس بچی کا کچھ نہ کچھ نام تو ضرور ہو گا لیکن۔"

"خیر خاص ہو یا عام۔ مگر آپ تو بچوں کی نفسیات میں ماہر ثابت ہوئی ہیں کہ اس کا نام تو معلوم کر لیا۔ ورنہ ہم تو چھل بت کے معمے سے شاید عمر بھر نہ نکل سکتے۔" ثاقب خوش ہو کر بولے تو اتنی دیر میں فاخرہ بیگم پہلی بار ذرا کھُل کر ہنسیں۔

"لو بھئی اب تم اپنی وہ ــ وہ ہاں بھابی جان کی گود میں بھی تو جاؤ۔" بیوی کے رویے میں لچک دیکھ کر ثاقب نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر فاخرہ بیگم ان کی بات ان سنی کر کے میز کی طرف پلٹ گئیں اور امجدی بوا کو پکارنے لگیں۔ تب ثاقب

اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔

سلوط کو گود میں لیے وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی اپنے بارے میں وضاحت پر بیوی کے دل سے سارے شکوک مٹ گئے ہوں گے اور مگر جیسا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ آہستہ آہستہ سلوط کی طرف راغب ہو جائیں گی تو یہ محض ان کی خوش فہمی ہی ثابت ہوئی اولاد کی بھوکی ہونے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بدگمان اور مشکوک تھیں اور اب اس انکشاف پر کہ شوہر واقعی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں کم از کم سلوط کے معاملے میں تو بالکل ہی کھٹک گئی تھیں بلکہ وہ تو اس بات پر بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھیں کہ ثاقب والد کے طلب کرنے پر انڈیا گئے تھے۔ اور پورے تین ماہ گزار کر آئے بھی تو چھوٹی بہن کا دُم چھلا ساتھ لگا کر۔ کیونکہ فاخرہ بیگم تو ہمیشہ سے ہی

بہر حال سلوط ان کے اور ثاقب کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی رہی اور اس میں شک نہیں کہ فاخرہ نے اس کا پورا پورا خیال تو رکھا لیکن اپنی وہ ممتا اس پر نچھاور نہ کر سکیں جو ایک ماں اپنی اولاد پر کرتی ہے اور خود ثاقب بھی جو کچھ عرصے تک تو اس کی پوری پوری خبر گیری رکھتے رہے تھے۔ مگر جب انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ فاخرہ نے ذہنی طور پر بچی کی ذمہ داری قبول کر لی ہے وہ اس کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے تھے۔

سلوط خود بھی جب گھر آئی تھی تو دونوں میاں بیوی نے بھائی اور بھاوج کی حیثیت سے خود سے متعارف کرایا تھا والدین کی حیثیت سے نہیں۔ جب تک نا سمجھ تھی اس وقت تک اسے رشتوں کو سمجھنے کا شعور ہی نہیں تھا لیکن جوں جوں اس نے ہوش سنبھالا اور بڑی ہوتی گئی تو اسے رشتوں کا علم ہی نہیں بلکہ رویوں کا احساس بھی ہوتا گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھاوجیں نہ سہی بہن بھائی کتنے محبت کرنے والے اور جان چھڑکنے والے ہوتے ہیں مگر وہاں بھاوج تو تھی ہی سدا کی لکڑی کے برادے کی طرح خشک اور کھردری۔ مگر بھائی بھی کچھ عجیب غیر واسطہ اور بیگانے واقع ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کے دلار نہیں کیے تھے۔ البتہ کھانا، لباس وغیرہ اچھا ہی مہیا کیا جاتا تھا مگر ہر بچہ محبت کا متمنی بھی ہوتا ہے۔

بھائی بھاوج کے بیگانہ سے سلوک پر وہ بچپن ہی سے بجھ سی گئی تھی۔ یوں بھی ایک مرتبہ جب وہ آٹھ نو سال کی ہی تھی تو فاخرہ کے ساتھ شاپنگ پر جانے کی ضد کر بیٹھی تھی اور اس ضد کے نتیجے میں اسے فاخرہ بیگم سے ایک زناٹے دار تھپڑ کھانا پڑا تھا کہ جس کی چوٹ وہ بڑی ہو کر بھی محسوس کرتی تھی۔

بھائی سے تو اس کا دم ہی نکلتا تھا کیونکہ وہ تو بھابھی سے بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے اور ان کا مزاج بگڑا بگڑا یا خراب ہی رہتا تھا۔ اصل میں تو بھائی اور بھاوج کے دلوں میں کچھ ایسی گرہیں پڑ گئی تھیں کہ جو کھُلنے کے بجائے دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ نہ معلوم دونوں کے ایسے کیا اختلافات تھے۔ جو کبھی بنتی ہی نہ تھی۔

اور یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہ آتی۔ اگر ایک روز اسکول سے واپسی پر اس نے ان دونوں کی گفتگو نہ سن لی ہوتی۔

گو پوری بات اس وقت بھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ بس اسی قدر پلے پڑا تھا کہ بھائی کسی کاروبار کا آغاز کرنے کی غرض سے بھابی جان کی جائیداد بیچ دینا چاہتے تھے۔ مگر بھابی کسی طور پر بھی اپنی جائیداد بیچنے کے حق میں نہ تھیں۔ اب اسے یہ کب معلوم تھا کہ کاروبار شروع کرنے کا قضیہ تو اب اٹھا ہے۔ اصل میں تو شروع ہی سے خود اس کی ذات وجۂ فساد بنی ہوئی تھی۔

بہرکیف ــ وقت کے ساتھ ساتھ حالات نے بھی پلٹا کھایا۔ بھائی جو ہمہ وقت گھر میں ایٹھتے نظر آتے تھے۔ اب اتنے مصروف رہنے لگے کہ کئی کئی روز تک گھر سے غائب ہی رہتے تھے۔ گو حالات پہلے سے بھی زیادہ سدھر گئے تھے۔ مگر بھابھی تب بھی ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے کی زندہ مثال بنی نظر آتی تھیں۔ اور بہت پریشان سی رہنے لگی تھیں۔

گھر میں تو یوں بھی سدا سے ہی الو بولتا نظر آتا تھا۔ البتہ جب سے ٹی وی لا دیا تھا گھر کے سناٹے اور ویرانی سے تھوڑی دیر کے لیے نجات ضرور مل جاتی تھی۔

بھابی کا موڈ خراب رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھائی اب دنوں گھر سے غائب رہنے لگے تھے۔ بعض مرتبہ تو وہ دو دو ماہ بعد واپس لوٹتے وہ بھی بس ایک آدھ روز کے لیے ہی اور پھر نہ یہ بتا کر جاتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اور نہ ہی اپنی مصروفیت کے بارے میں کچھ کہتے تھے۔

اس روز بھی وہ فاخرہ بیگم کے ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کوئز پروگرام دیکھ رہی تھی کہ اس کے بھائی جان تقریباً دو

ماہ بعد اپنا سوٹ کیس ملازم سے اُٹھوائے اور بریف کیس ہاتھ میں لیے اچانک ہی آ گئے۔ اور حسبِ دستور
میں "السلام علیکم" کہا۔

سلوط بھی انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑی ہوگئی۔ مگر فاخرہ بیگم جو کروشیے پر ٹیبل کلاتھ بُن رہی تھیں کہ ان کا محبوب مشغلہ
نے شوہر کی آمد کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ اور اپنے کام میں مشغول رہیں۔ بھائی ان کے قریب ہی کوچ پر بیٹھ گئے۔ تو
وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر سمجھا۔ کہ یوں بھی بھائی کی موجودگی میں وہ بھابی کے پاس نہیں بیٹھتی تھی۔ اور ان دنوں
ہوگئی تھی۔ یعنی سولہ برس کی تھی اور میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ وہ جانے کی غرض سے اٹھی۔ تو فاخرہ بیگم نے اپنے مخصوص کرخت
"جا کہاں رہی ہو سلوط؟ یہیں بیٹھ کر پروگرام دیکھو۔"

اور وہ دہم سی ہو کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

ثاقب اسے دوبارہ بیٹھتا دیکھ کر اٹھے اور ٹی وی کی آواز نیچی کر کے پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر بھابی سے باتیں کرنے
نے یہ تو نہیں سنا کہ بھائی نے بھابی سے کیا کہا تھا مگر ان کی بات کے جواب میں بھابی نے جو کچھ کہا تھا اس نے صاف سن لیا
"لیکن یہ کاروبار تو نہیں ہوا۔ یہ بد دیانتی بلکہ بے ایمانی ہوئی۔" تب اس کے بھی کان کھڑے ہوگئے کہ بھابی
کون سے کاروبار کی بات کر رہی ہیں۔

"نہیں — یہ بد دیانتی ہے نہ بے ایمانی۔ بلکہ تقریباً ساری دنیا کے لوگ ہی ایک ملک سے دوسرے ملک میں مال بھیجنے
کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ تو تجارت ہوئی۔"

"ہوں۔ مگر جائز طریقے سے — یعنی حکومت سے باقاعدہ پرمٹ یا اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہی۔ لیکن آپ
اور آپ کے پارٹنر تو چوری چھپے اسمگلنگ کا کاروبار کرتے ہیں۔ جو خلافِ قانون ہے۔ اور ایسے کاموں سے دنیا و آخرت
ہی برباد ہو جاتی ہیں۔" بھابی چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"خیر خیر، آپ کو آم کھانے سے مطلب رکھنا چاہیے۔ پیڑ گننے سے نہیں اور پھر آجکل کس کام کو جائز سمجھتی ہیں۔ ہر کام
دھوکے اور کھوٹ پر مبنی ہے اور کیا آپ نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ اس کاروبار کے طفیل آپ کو کتنی آسائشیں میسر آگئی
گھر کی تو بالکل کایا ہی پلٹ گئی ہے۔" بھائی جھلا کر بولے۔

"مگر جہاں تک میرا خیال ہے مجھے تو ہمیشہ سے ہی یہ ساری آسائشیں میسر ہیں۔ البتہ آپ کے بارے میں نہیں کہہ
سکتی۔" بھابی نے کہا تو سادہ سے لہجے میں تھا۔ مگر بھائی اسے چوٹ ہی سمجھے۔ ایک دم ہی چراغ پا سے ہو کر بولے۔

"اوہو۔ تو یہ کہہ کر گویا آپ اپنی اور اپنے بھائیوں کی امارت کا رعب ہم پر ڈالنا چاہ رہی ہیں۔ یہ جتانا چاہ رہی ہیں کہ
دس سال سے آپ ہمیں پالتی آئی ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" بھابی بھی جھلائے ہوئے انداز میں بولیں۔

"بس رہنے بھی دیجیے۔ ہم خوب سمجھتے ہیں آپ کی زہر فشانی کو لیکن جب بات ہی — نکلی ہے تو ہم بھی یہ کہے بغیر نہ رہیں
گے کہ روکھی سوکھی جو بھی ہم مہیا کر سکے آپ کو کھلاتے رہے اور اپنی بساط کے مطابق موٹا جھوٹا بھی پہناتے رہے۔ یعنی
آپ کو بھوکا یا ننگا نہیں رکھا۔ اور اگر آپ ایسا ہی سمجھتی تھیں تو پھر ہمارے گھر کے دروازے تو کھلے ہوئے تھے۔ آپ
اپنے میکے جا کر آباد ہو سکتی تھیں۔ ہم تو اپنی مرضی سے آپ کو لائے بھی نہیں تھے۔ تو پھر معترض کیوں ہوتے

اور ان کی اس بات پر بھابی کا چہرہ اتر گیا۔ وہ کھسیانی سی ہو کر بولیں۔

"آپ نے بھی تو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ثاقب حسن! میری مراد تو صرف اسمگلنگ کے کاروبار سے تھی۔ جس کے نتیجے
ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ ملتا ہی نہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان کے پاس خود اپنی جتنی جمع پونجی ہوتی
وہ بھی عزت اور جان کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔"

— "خیر خیر، آپ ہماری بزرگ ہیں نہ مستعلیق جو ہمیں نصیحتوں کے ڈوز پلائیں اور ہم بھی ایسے کم عقل اور بچے نہیں
بلا سوچے سمجھے آگ میں ہاتھ ڈال دیتے۔ ہمیں آپ سے زیادہ ان ساری نزاکتوں کا علم ہے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے

...دہشت لہجے میں بولے اور پھر قالین پر رکھا سوٹ کیس اپنی طرف کھسکا کر اسے کھولا۔ اور اس میں سے ایک سیلولائیڈ
...ڈبہ نکال کر بولے۔

...خوبصورت تحفہ آپ کی نیت سے ہی لائے تھے۔ لیکن آپ کو تو خواہ طشت میں رکھ کر اپنا دل بھی پیش کر دیں تو آپ نفرت سے
...ٹھکرا دیں گی۔ چنانچہ یہ تحفہ ہم اپنی چھوٹی بہن کو سوغات کے طور پر دے رہے ہیں۔"

...انہوں نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور جب وہ اٹھ کر آ گئی تو وہ تحفہ اسے دیتے ہوئے بولے۔

"...تم بھی کیا یاد کرو گی کہ ہم تمہارے لیے کتنا خوبصورت تحفہ لائے ہیں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں وہ
...دیا۔ بھائی نے زندگی میں پہلی بار اسے کسی بلکہ اتنے خوبصورت تحفے سے نوازا تھا۔ سلوط کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔
...کے ہاتھ سے لے کر اسے کھول کر دیکھنے کی غرض سے — اندر جانے لگی تو فاخرہ کی رعونت بھری آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے
...کہیں۔ جانے کی ضرورت نہیں سلوط! یہیں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی رہو۔" اور وہ اپنے شوق اور دل کو مار کر منہ لٹکائے
...بیٹھ گئی۔

...خواہ لاکھوں کی ہو یا کروڑوں کی کسی چیز کے لیے بھی اس قدر للکا نہیں کرتے۔ چلو یہ ڈبہ یہاں میرے پاس رکھ دو اور جا
...اپنے بھائی جان کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"

اور سلوط پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ فوراً ہی اٹھی اور کچن میں چل دی۔

...امجدی بوا بہت زیادہ ضعیف ہو جانے کی وجہ سے اپنے بیٹے کے پاس انڈیا چلی گئی تھیں اور وہیں کئی برس بیشتر ان کا
انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے شرمندگی اور رنج کے مارے وہ ڈبہ بھی بھائی کے پاس نہیں رکھا تھا اور اسے رنج بھی اس بات پر تھا کہ
...کے بھائی کی موجودگی میں بھابی نے اسے خوار کیا تھا لیکن پھر بھی بھائی نے نہیں ٹوکا تھا بلکہ یوں بن گئے تھے جیسے انہوں
نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ بھابی کا رویہ تو شروع سے ہی آمرانہ اور ظالمانہ سا تھا مگر بھائی بھی کچھ کم نہ تھے اور وہ تعجب سے
سوچتی رہ جاتی تھی کہ کیا بھائی ایسے ہی بے حس اور بے اعتنا ہوتے ہیں۔

پھر ہوا کے دوش پر اڑتے دن ہفتے اور مہینے کچھ اتنی سرعت سے گزرے کہ دو سال کا عرصہ بیت گیا اور اسی عرصے
...بھابی کی پیش گوئیاں اس حد تک درست ہی ثابت ہوئی تھیں کہ بھائی اب چوروں کی طرح سب سے چھپے زیادہ تر گھر
...ہی نظر آنے لگے تھے۔ اور کچھ اتنے چڑچڑے اور بد مزاج ہو گئے تھے کہ سادگی سے کہی معمولی سی بات بھی انہیں زہر لگتی تھی۔
...بخار بھابی پر ہی اتارتے تھے۔ اسے تو انہوں نے کبھی کسی بات میں اہمیت دی تھی نہ کوئی حیثیت ہی اور پھر وہ خود بھی تو
...ڈری ڈری سی رہتی تھی۔ بھائی کے سامنے زیادہ پڑتی ہی نہ تھی۔

...انہی دنوں، جب وہ انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ ایک روز اس کے بھائی کہیں باہر سے آئے تو بڑے
...دنوں بعد اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

"...تمہاری بھابی کہہ رہی تھیں کہ تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

...یہ سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ بھائی اسے آگے پڑھنے کی اجازت دے دیں گے۔

"...مگر اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرو گی بٹیا؟" بھائی اسے بٹیا کہہ رہے تھے۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"...اپنے اندر قابلیت پیدا کروں گی بھائی جان!" وہ محجوب سے انداز میں آہستہ سے بولی۔

"...ارے نہیں گڑیا! بس اتنی ہی قابلیت کافی ہے جو تم انٹر تک پیدا کر چکی ہو۔ اور پھر ہم تو تمہاری شادی کا سوچ رہے
...ہیں۔ ...تو تمہارے ...دار اور مختار رہیں۔ اگر ہم نے یہ فرض ادا نہ کیا تو روزِ محشر اللہ میاں کو کیا جواب دیں گے۔
...ہمارے پاس ایک نہایت لائق فائق اور شریف لڑکا بھی موجود ہے۔" پھر اپنی بات کہتے کہتے انہوں نے
...قہقہہ لگایا اور بولے۔

"...بھلا ہم بھی کیسے سڑی ہیں کہ تم سے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ تم بھی کیا سوچ رہی ہو گی اپنے دل میں۔ اچھا جاؤ اب
...بجائے دلہنیا بننے کی تیاری کرو۔"

کبھی کبھی وہ خالص پوربی اردو بولتے تھے اور انہوں نے دلہنیا کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی — شرم سے
تھی کہ ایسی باتیں بھائی بھاوج نے تو کیا اس کی بے تکلف سہیلی نے بھی نہیں کی تھیں اب جو انہوں نے دلہنیا
منہ چھپا کر وہاں سے بھاگ آئی۔

پھر کئی روز گزر گئے۔ بھائی نے کچھ کہا نہ بھابی نے ہی کچھ بتایا۔

امتحانوں کے بعد تعطیل ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کا تمام وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔ بھائی نے دو برس قبل
لیا تھا کہ گلبرگ کے علاقے میں ایک بنگلہ خرید کر اس میں آ بسے تھے۔ ملازموں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اور
ہی عیش تھے۔

اس روز وہ بھابی کے ساتھ لان میں بیٹھی سہ پہر کی چائے پی رہی تھی کہ ایک لمبی سی خوبصورت کار گیٹ سے
ہو کر عین ان کے سامنے روش پر رکی۔ شاید کار چلانے والے نے ان دونوں کو لان میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس
نے پورچ کے بجائے کار وہیں روک لی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ تو وہ بھابی بھی اسے دیکھتی رہ گئیں۔
دراز قد۔ چوڑا چکلا جسم اور وجیہہ چہرہ اور ایک شاہانہ سا وقار۔ گو چالیس بیالیس برس کا ہی لگ رہا تھا۔
کڑیل جوان نہ تھا پھر بھی گبھرو جوانوں کو مات دیتا نظر آ رہا تھا۔

وہ کار سے اتر کر سیدھا ان دونوں کی طرف ہی بڑھ آیا اور بہت ہی مہذب انداز میں دونوں کو سلام کر کے
اس نے پوچھا۔

"کیا ثاقب حسن صاحب اس وقت گھر پر موجود ہوں گے؟"

اس کی نظریں سلوطہ پر ٹکی تھیں اور سوال وہ فاخرہ سے کر رہا تھا۔

"جی نہیں۔ وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں لیکن اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو غالباً آپ اے ایچ درانی صاحب ہیں" فاخرہ بیگم
نے ایک خلیق سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو اس نے بڑے خوبصورت سے انداز میں ہنس کر کہا۔

"اوہو۔ اندازہ — غالباً اور اے۔ ایچ درانی صاحب۔ بڑا طول کھینچ دیا آپ نے تو ورنہ صرف درانی ہی کافی تھا۔ ویسے
اگر میرا اندازہ بھی غلط نہیں تو غالباً آپ بھی مسز حسن ہی ہیں"

"جی۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً۔ لیکن آپ تشریف تو رکھیں" فاخرہ بیگم نے شیریں گفتاری کی حد توڑتے ہوئے کہا تو سلوطہ کو اپنی سماعت
پر کیا آنکھوں پر بھی یقین نہیں آیا۔ اس کی بھابی کسی سے اس قدر مروت اور اخلاق بھی برت سکتی ہیں۔ یوں بھی ان کے چہرے
پر ایسی شگفتگی پہلی بار دیکھنے میں آئی تھی۔

"شکریہ مسز حسن۔ تشریف رکھنے میں مجھے کوئی تامل تو نہیں۔ لیکن چند منٹ بعد ہی میرا کسی سے ایک ضروری اپائنٹمنٹ ہے اس
لیے معذرت" اس نے بڑی شائستگی سے معذرت کی۔

"لیکن پھر بھی درانی صاحب۔ یہ بات ہمارے دستور کے خلاف ہے کہ مہمان دروازے سے جھانک کر ہی واپس چلا جائے
آپ کو — ایک کپ چائے پینے کے عرصے تک تو رکنا ہی ہوگا" فاخرہ بیگم مصر ہونے کے انداز میں بولیں۔

"لیکن دروازہ تو بہت پیچھے رہ گیا۔ میں تو لان تک جھانک چکا ہوں۔ یوں بھی یہاں آنا تو اب مجھ پر فرض نہیں قرض ہو گیا
ہے کہ پھر کسی روز ضرور حاضر ہوں گا۔ اس وقت تو معاف کر دیں" وہ بھی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کے شیرے میں ڈوب
رہا تھا۔

"اچھا چلیں معاف کیا بشرطیکہ وعدہ جلد ایفا کیا جائے" فاخرہ بیگم ہنس کر بولیں۔

"جی ہاں ضرور بلکہ جلدی — اچھا خدا حافظ"

وہ کچھ اتنی عجلت میں تھا کہ پلٹ کر اسی دم چلا گیا۔ اور وہ جو اپنی بھابی کے قریب لان چیئر پر بیٹھی بھابی کی شیریں کلامی اور خوش اخلاقی

خندہ پیشانی سے ایک اجنبی اور غیر مرد کے ساتھ پیش آنے پر بیٹھی ابھی تک ورطۂ حیرت میں غوطے کھا رہی تھی۔ بھابی کی غصے سے بھری آواز اور خشونت بھرے سے لہجے سے اس بُری طرح چونکی جیسے بحرِ حیرت میں اچانک اُٹھنے والے کسی تھپیڑے نے اُسے اُچھال کر پھینک دیا ہو۔

"کتنی مرتبہ کہا ہے کہ کسی غیر مرد سے سامنا ہو جایا کرے تو اُٹھ کر چلی جایا کرو۔ لیکن تم نے شاید بے غیرتی کا جامہ پہن لیا ہے، میری کسی بات پر کان ہی نہیں دھرتیں۔ اب دودھ پیتی بچّی تو نہیں تم۔ بالغ ہو چکی ہو۔ آج تمہاری شادی کر دوں تو کل تم ماں بن جاؤ گی۔ سمجھیں تم۔"

اُف بھابی نے تنا ڑا بھی تھا تو بھلا کس طرح کہ ان کے آخری فقرے پر وہ گڑ کر رہ گئی۔ کہ ماں بننا تو بڑی بات اس کے تو گمان میں بھی شادی کا تصوّر نہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خفت اور شرم سے چہرہ جھکائے سُن سی بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کر اندر جانے لگی تو بھابی نے پھر کہا۔

"اب اندر جانے سے فائدہ۔ البتہ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا۔ اور ہاں اب گھر میں بیٹھ کر امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرو، میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کی قائل نہیں ہوں۔" اور جواب میں چپ چاپ وہ کرسی پر یوں بیٹھ گئی جیسے کرسی میں مقناطیس ہو جس نے فوراً ہی اسے کھینچ لیا ہو۔

"میں تمہاری ماں تو نہیں ہوں لیکن میں نے تمہاری پرورش ضرور کی ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ گھر گرہستی کے معاملے میں پھوہڑ کہلائی جاؤ یا تمہارے بارے میں لوگ غلط تاثر لیں۔" بھابی ناصحانہ انداز میں بولیں۔

"میں تمہاری ماں تو نہیں ہوں۔" یہ فقرہ تو وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکی تھیں۔ گویا وہ اس فقرے کی عادی سی ہو چکی تھی۔ اس لیے یہ بالکل نہیں کھلا تھا البتہ جب پہلی بار انہوں نے یہ فقرہ استعمال کیا تھا تو اسے بہت افسوس ہوا تھا کہ وہ اکلوتی بھاوج بھی نہیں لگتی تھیں۔ خود بھائی بھی اس سے ایسے بے نیاز تھے کہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ہوسٹل یا پھر دارالامان جیسے ادارے میں زندگی گزارتی آئی ہو یا پھر اس کے سرپرست اس کے لیے بالکل غیر اور غیر واسطہ سے ہوں۔

اسے افسوس تھا تو صرف تعلیم کو خیرباد کہنے کا۔ اور بھابی نے تو اب کہا تھا جب کہ اسے تو بھائی کی گفتگو سے بہت پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ اس معاملے میں ضد تو بڑی چیز وہ ہلکا سا احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کہ بچپن میں ایک مرتبہ کسی بات پر ضد کرنے پر اس نے بھابی سے تھپڑ کھایا تھا۔

اسے تو اس کے حالات نے چھوٹی سی عمر سے ہی بہت حسّاس بنا دیا تھا۔

ذہانت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

حالات کو سمجھنے کا پورا پورا شعور بھی رکھتی تھی۔

البتہ تیز طرار اور چالاک بالکل نہ تھی۔

اس کی محرومیوں نے تو اس کے منہ پر چُپ کی مہریں لگا دی تھیں۔

وہ خاموش ہی نہیں رہتی تھی بلکہ اسے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی لگن ہو نہ کسی چیز کی لگن، بس زندگی کو ایک مجبوری اور معمول سمجھ کر جی رہی تھی۔

جب کہ فاخرہ بیگم اس کی خاموشی کو اس کے گھنے پن پر محمول کرتی تھیں۔

کتنے افسوس کا مقام تھا کہ صرف ایک شبہے کی بنا پر انہوں نے اپنے دل میں چھپے ممتا کے لازوال جذبے کو بھی اندر ہی اندر گھونٹ دیا۔ اس پر وہ کچھ وہ فطرتاً اکھڑ مزاج اور اکھل کھری بھی واقع ہوئی تھیں اور کچھ اس اینچ اور ضد کی بھی وجہ تھی جو ایک مدت تک سلوط کو متبنیٰ کرنے کی خواہش کے سلسلے میں انہیں ہو گئی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی سلوط کی طرف ملتفت نہ ہو سکی تھیں۔ اور بھائی کے سرد اور بے مہر رویّے اور بھابی کی غفلت اور بے اعتنائی نے بچپن ہی سے سلوط کے معصوم سے دل اور احساسات کو ٹھیس پہنچائی تھی کہ کچھ وہم سی ہو کر رہ گئی تھی اور شاید اپنے حالات نے اسے بہت حساس اور باشعور بنا دیا تھا۔ وہ بالی عمر کی شرارت، پھرتی اور الھڑپن اس میں بالکل نہیں تھا اور دوسرے ماحول ہی کچھ ایسا خشک اور بیگانہ سا ملا تھا کہ اس نے اپنے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

بھابی نے یہ کہہ کر کہ اب تم گھر میں بیٹھ کر امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرو گویا اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے دو ٹوک فیصلہ کر دیا تھا کہ یوں بھی بھائی سے زیادہ بھابی کی تقریباً ہر بات یا فیصلہ حرفِ آخر کی طرح ہی ہوتا تھا اور رہے امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے کا سوال تھا تو بھابی نے تو اُسے سلائی بُنائی کڑھائی اور کروشیہ ورک سے لے کر گھر تک ہنرمندی، سلیقہ مندی اور کھانا پکانا سب ہی کچھ سکھا رکھا تھا۔ پھر وہ مزید کس قسم کی تربیت دینا چاہتی تھیں۔ یہ اس کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آ رہا تھا۔

حقیقتاً اسے صحیح معنوں میں امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ بھائی اور خصوصاً بھابی کی نئی مصروفیت تھی۔

پچھلے چند ماہ سے درّانی صاحب کی گھر میں آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور ان کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات میں بھابی نے شاید اسے تربیت دینا بھول گئی تھیں یا پھر اس کی تعلیم منقطع کرنے کا یہ محض ایک بہانہ تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ بھابی نے گھر کے بیشتر کام اسے سونپ دیے تھے۔

پھر تعلیم کو خیرباد کہے کوئی تین یا چار ماہ ہی گزرے تھے جب ایک روز رات کے کھانے پر مدعو درّانی صاحب کو رخصت کرنے کے بعد اسے کسی کام کے بہانے اپنے کمرے میں بلا کر اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔

"کچھ جانتی بھی ہو یہ درّانی صاحب جو آج کل شب و روز ہمارے گھر میں دیکھے جاتے ہیں کون ہیں؟"

بھابی کے سوال کرنے کے انداز میں معنی خیزی بھی تھی اور تھوڑا سا فخر بھی۔ مگر جب اسے درانی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ تھا سوا اس کے کہ وہ گزشتہ دو تین ماہ سے تقریباً ہر دوسرے تیسرے اس کے بھائی کے پاس آ رہے تھے یا ان کے دوست تھے اور ڈرائینگ روم میں بہروں بیٹھ کر اپنی خاطریں کرانے کے ساتھ ساتھ بھائی اور بھاوج سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ بھابی کی تنبیہ پر کبھی خود ان کے سامنے نہیں پڑی تھی۔ البتہ بھائی کو کبھی اس کی موجودگی کا خیال آتا تو وہ اسے بھی کھانے میں شرکت کے لیے بلوا لیا کرتے تھے اور انہوں نے اسے درّانی صاحب سے متعارف کرایا تھا۔ وہ بھی بے حد سرسری طور پر۔ تو پھر وہ کیسے بھابی کو کچھ بتاتی۔

"شکر ہے انہیں ڈھب کا کوئی پارٹنر تو ملا۔ خاندانی بھی اور ہم وطن بھی۔ کم از کم ان لوگوں کی طرح ــــ ضمیر فروش اور بے ایمان تو نہیں ہے۔" بھابی اسے خاموش دیکھ کر خود ہی بڑبڑائیں۔

"کن لوگوں کی طرح بھابی جان" ہم جانے کیسے اور کیونکر اس کے ہونٹوں سے یہ سوال پھسل گیا۔ جب کہ بھابی کی کسی بات پر وہ کوئی سوال کرنے کی عادی نہ تھی۔

"ہائیں۔ کن لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی ہو تم؟ میں تو درّانی صاحب کی بات کر رہی تھی نا۔" صاف ظاہر تھا بھابی نے اس کے سوال کا جواب گول کر دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے سوال پر خفیف سی ہو گئی۔

"یہ درانی صاحب تمہارے بھائی جان کے نئے بزنس پارٹنر ہیں۔ بڑے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ بلند شہر کے رؤسا میں سے ہیں۔"

بھابی اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئیں۔ اور چونکہ اس کے لیے یہ معلومات دلچسپی کا باعث نہ تھیں ــــ اس لیے اس نے بھابی کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔

"بہر حال بہت پُرخلوص اور مہذب انسان ہیں اور نہایت اعلیٰ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر غیریت کا کوئی احساس تک نہیں ہوتا۔" بھابی نے درانی صاحب کے اطوار اور شخصیت کے بارے میں مزید انکشاف کیے۔ اور اتنا اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا کہ بھائی سے زیادہ بھابی درانی صاحب کی شخصیت اور حیثیت سے بے حد متاثر اور مرعوب ہیں۔ گویا بھابی کا درانی صاحب کے بارے میں اس قدر رطب اللسان ہونا بھی اس کے لیے تعجب کا باعث نہ تھا اس لیے ان کی اس بات پر بھی اس نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

"بے چارے چالیس کے پیٹے میں ہیں پھر بھی اب تک مجرد زندگی ہی گزار رہے ہیں۔" بھابی نے ذرا سے توقف کے بعد پھر کہا۔ "لیکن کریں بھی کیا۔ وہاں انڈیا کا تو معلوم نہیں لیکن یہاں پاکستان میں تو ان کا دور و نزدیک کا کوئی عزیز ہی موجود نہیں جو اس معاملے میں ان کی کچھ مدد ہی کر سکتا۔"

بھابی چبا چبا کر بات کر رہی تھیں۔ نہ معلوم اُسے سُنانا چاہ رہی تھیں یا درانی صاحب کی ہمدردی میں کہہ رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی۔ یوں بھی درانی صاحب سے اس کا کوئی واسطہ تھا نہ نسبت جو بھابی کی باتوں پر اسے کوئی جستجو ہوتی۔

"خیر۔ اب ہم ان کے دوست اور عزیز بن کر ان کے اس مسئلے کا حل تلاش کریں گے۔ ویسے تمہاری کیا رائے ہے ان کے بارے میں سلوط؟" بھابی نے درانی صاحب کی ہمدردی میں ڈوبے ڈوبے اچانک ہی اسے مخاطب کرکے پوچھا۔ وہ ہڑبڑا گئی۔

"جی میری۔ میری رائے بھابی؟"

"ہاں بھئی میرا مطلب ہے تمہیں کیسے لگے وہ؟" بھابی نے یہ کہہ کر گویا اپنے سوال کا مفہوم سمجھایا۔ لیکن وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ اسے کیسے لگے۔ جب کہ بھائی کا پارٹنر یا دوست سمجھنے کے سوا اس نے ان کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ ویسے وہ بے حد معقول اور وجیہہ سے نظر آتے تھے۔ مگر وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ بہت ہی وجیہہ اور پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔

"بھئی۔ یہ ایسا کوئی مشکل سوال تو نہیں۔ بس اتنا ہی بتا دو کہ وہ تمہیں برے تو نہیں لگتے۔" بھابی نے اس کی ہچکچاہٹ پر کہا۔

"نہیں نہیں بھابی جان۔ بھلا وہ مجھے برے کیوں لگنے لگے۔ وہ بھائی جان کے پارٹنر ہیں اور ـــ"

"بس بس میں یہی معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔" بھابی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بات قطع کرکے کہا اور جواب میں ان کے بلاوجہ مسکرانے پر تعجب سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ بھابی کچھ دیر بعد ایک طویل سانس کھینچ کر بولیں۔

"اصل میں تو میں سرے سے پوچھنے پچھانے کی قائل ہی نہیں تھی۔ مگر وہ تمہارے بھائی جان کچھ زیادہ ہی روشن خیال بنے ہوئے ہیں۔ خواہ مخواہ ہی میرے سر ہوگئے کہ سلوط کا عندیہ ضرور لے لو۔"

اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ درانی صاحب کے بارے میں اس کا عندیہ لینے سے اس کے بھائی جان کی کیا مراد ہے۔ وہ تعجب سے بھابی کی شکل دیکھنے لگی۔

"خیر اب تم ننھی سی بچی تو نہیں ہو جو کچھ سمجھ ہی نہ سکو۔ یوں بھی میں زیادہ لاگ لپیٹ سے کام لینے کی عادی نہیں ہوں۔ درانی صاحب گو عمر میں تم سے دگنے اور تگنے ہیں مگر ہیں نہایت شریف اور متموّل اور مرد کی عمر اور صورت نہیں قابلیت اور سیرت ہی دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے ان ہی اوصاف کے پیش نظر تمہارے بھائی جان نے ان سے تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" اور اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے یہ بات کہنے کے بجائے بھابی نے اس کے سر پر کوئی وزنی سی شے دے ماری ہو جس سے اس کے حواس معطل ہوگئے ہوں۔ وہ اچھل پڑنے کے سے انداز میں "جی" کہہ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھئی اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو تمہاری خوش نصیبی ہی ہے کہ بلا محنت مشقت کیے ہی تمہارے بھائی کو ایک اتنا قابل اور خوبصورت بر مل گیا ہے تمہارے لیے۔ اگلے جمعے چاند کی دوسری تاریخ کو تمہارا ان سے نکاح ہونا قرار پایا ہے" بھابی نے یہ کہہ کر تو سچ مچ ہی اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔ وہ سناٹوں کی زد میں آ گئی۔ کچھ دیر تو بے حس و حرکت سی بیٹھی رہی پھر نہایت خاموشی سے اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر بھابی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کہ دستور زباں بندی کی ماری ہوئی تھی۔ خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ اتنا بوتا تھا نہ ہمت کہ بھائی سے اس معاملے میں احتجاج ہی کر سکتی۔ اور پھر اس نے اپنا کوئی آئیڈیل بنانا تو کیا اپنی شادی کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ حتیٰ کہ یہ خیال بھی کبھی اس کے پاس سے نہ گزرا تھا کہ اس کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔

اسے تو بس تعلیم حاصل کرنے کا ہی شوق تھا۔

اب تو جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ چند روز بعد اس کی شادی ہو رہی ہے درانی صاحب کے بارے میں سوچ سوچ کر اس پر ایک سہم سا طاری رہنے لگا تھا کہ درانی صاحب کو تو وہ بھائی کا دوست اور پارٹنر ہونے کی مناسبت سے ان ہی کی طرح بزرگ سمجھتی تھی۔

جب بھی ان سے سامنا ہوتا نہایت ادب و احترام سے انہیں سلام کرتی تھی۔

بھابی کا فضیحتا سننے کے بعد ان سے ڈری ڈری بھی رہتی تھی۔

وہ واقعی اس سے عمر میں تگنے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت ہی خوبصورت اور دلآویز شخصیت کے حامل تھے اور اس اعتبار سے اسے پسند بھی تھے مگر انہیں شوہر کی حیثیت دینے کے لیے اس کا ذہن آمادہ ہوتا نہ دل۔ مگر اب تو اس کی قسمت کا فیصلہ کر ہی دیا گیا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی گویا دل پر جبر کرکے درانی صاحب کو کسی نہ کسی طرح قبول کرنا ہی پڑا تھا۔

پھر بھی کبھی کبھی اس خیال سے اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹنے لگتے کہ چند روز بعد ہی درانی صاحب سے اس کی شادی ہو جائے گی تو پھر ـــ

تو پھر وہ نئی زندگی کیونکر گزارے گی۔

درانی صاحب نہ معلوم کیسے ثابت ہوں۔

کیسا سلوک روا رکھیں۔

اصل میں تو اپنے بھائی اور بھاوج کی تلخ اور بورسی ازدواجی زندگی نے اسے پریشان سا کر رکھا تھا کہ اس نے تو ان دونوں میاں بیوی کو کبھی آپس میں شیر و شکر نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ہمیشہ ان دونوں کے درمیان ایک کبیدگی ــ اور سرکشی سی قائم دیکھی تھی جس کی وجہ سے گھر کا ماحول بھی کچھ ایسا خشک اور بدمزہ سا رہتا تھا کہ کبھی کبھی تو اسے وحشت سی ہونے لگتی۔ اس پر اتفاق سے بھابی بھی اس کے بھائی سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں۔ اور وہ یہی سوچ سوچ کر ہراساں ہوتی رہتی تھی کہ کہیں اس کی ازدواجی زندگی بھی بھائی اور بھاوج کی طرح تلخ اور بدمزہ ثابت نہ ہو۔ کچھ اس بات کا بھی ملال تھا کہ جس گھر میں وہ چھوٹی سے بڑی ہوئی تھی وہ بھی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑے گا۔ دوسرے معنوں میں دوسری لڑکیوں کی طرح اسے اپنی شادی کی ذرا سی بھی خوشی نہیں تھی۔

پھر وہ دن بھی آگیا جس روز وہ اپنے تمام جملہ حقوق سمیت درانی صاحب کے نام پر چڑھنے والی تھی۔ بھائی اور بھابی نے اس کی شادی پر کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔ بس ایک روز قبل اس کی کالج کی چند سہیلیوں کو بلا کر اسے مایوں بٹھا دیا تھا۔ اور اسی رات کو مہندی کی رسم بھی ادا کر دی تھی۔ نہ ڈھولک نہ سہاگ گیت نہ کوئی اور ریت رسم ــ نہایت سادگی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا گیا تھا حد تو یہ تھی کہ درانی صاحب کی طرف سے باراتیوں کے طور پر صرف پانچ افراد ہی آنے تھے۔ ایک خود درانی صاحب ــ دوسرے ان کے دوست اور دوست کی بیوی اور دو بیٹیاں ــ بری بھی وہ نکاح والے دن بارات کے ساتھ ہی لائی تھیں۔ بھابی نے جہیز بھی بہت مختصر سا دیا تھا۔ کل اکیس جوڑے اور چھ زیورات کے سیٹ برتن اور فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں دی تھی۔ البتہ پچاس ہزار روپے نقد دولہا کی سلامی میں ضرور دیے تھے۔

بہرحال ــ اس کی رخصتی بھی بہت سادگی اور خاموشی سے ہوئی اور وہ بھائی کے گھر سے وداع ہو کر ایکمن روڈ کے ایک عالیشان بنگلے میں آگئی۔ کمرے یا خوابگاہ کو حجلۂ عروسی کی طرح تو نہیں سجایا گیا تھا مگر بنا سجائے بنائے ہی وہ منہ سے بول رہا تھا۔ ہر شے قیمتی تھی اور بے حد خوبصورتی اور ترتیب سے آراستہ تھی۔

عصر و مغرب کے درمیان نکاح ہوا تھا اور نو بجے رات تک رخصتی بھی عمل میں آگئی تھی۔ اور اس وقت سے کمر جھکا کر بیٹھے بیٹھے وہ شل سی ہوگئی تھی۔ جبکہ زیادہ سے زیادہ وہ ساڑھے دس بجے تک سو جانے کی عادی تھی مگر اس وقت ایک بج چکا تھا ــ اور درانی صاحب کا دور تک پتا نہیں تھا۔ اور وہ پلکوں پر جھپٹتی ہوئی نیند کو بھگا بھگا کر نڈھال سی ہوگئی تھی۔ وہ نیند سے مات کھانے ہی والی تھی کہ تبھی کوئی دو بجے شب کے قریب درانی صاحب نے خوابگاہ میں قدم رکھا بہت کھنکھار کر زور سے دروازہ بند کرتے اور شور سا کرتے وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

اس کی پلکوں پر جھپکتی نیند بھک سے اڑ گئی۔ اور منتشر سی دھڑکنوں کے ساتھ وہ سمٹ اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ درانی صاحب کہیں رکے بنا سیدھے اس کی طرف بڑھتے ہی چلے آئے۔ اور کچھ دیر تو اس کے قریب ہی خاموش سے کھڑے رہے پھر انہوں نے کھڑے کھڑے ہی جھک کر اس کا گھونگھٹ الٹنے کے بجائے سرے سے اس کا زرتار عروسی دوپٹہ اتار کر فرش پر اچھالا تھا۔ اور بولے۔

"سنو مجھے شرم و حجاب اور ناز و انداز کے یہ فرسودہ سے مظاہرے بالکل پسند نہیں۔ یوں بھی میں نے یہ شادی تمہارے حسن پر فریفتہ ہو کر یا کسی نفسی تقاضے سے مغلوب ہو کر نہیں کی ــ بلکہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے کی ہے۔"

اف یہ درانی صاحب کہہ رہے تھے وہ بھی اتنے سخت اور کرخت لہجے میں۔

وہ بھی ازدواجی زندگی کے لمحۂ آغاز کے موقع پر وہی درانی صاحب جن کے منہ سے بات کرتے پھول جھڑتے تھے۔

جو ہمیشہ پیکر خلوص و اخلاق ہی نظر آتے تھے۔

وہ اس سے کوئی مذاق کر رہے تھے یا اپنی کسی مصلحت کے تحت اسے آزما رہے تھے یا پھر سچ مچ ہی سنجیدہ ــ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ مگر نازک سا دل اندر ہی اندر لرزنے لگا۔ کہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا تھا۔ لاطینی یا کسی ناقابل فہم زبان میں تو نہیں کہا تھا ــ بلکہ نہایت صاف ستھری اردو زبان میں ہی کہا تھا۔ اور براہ راست اسے مخاطب کرکے کہا تھا۔ جبکہ وہ تو خود بھی اس بے جوڑ کی شادی پر ہزاروں اندیشوں میں گھری ہوئی تھی۔ مگر جواب دیتا تو کیا وہ تو ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکی۔

انہوں نے اپنی بات کہہ کر سگریٹ سلگایا اور پھر فرش پر پڑے اس کے عروسی دوپٹے کو جوتے کی ناک سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کے قریب ہی ٹہلتے ہوئے بڑے عجیب انداز میں ہنس کر بولے۔

"ہونہہ — وہ جو عرصے سے ایک گانا سنتے آئے تھے کہ مایا کے لوبھی باپ نے بڈھے کو بیاہا۔ تو آج ایک لالچی بھائی نے اپنے میں منافع کی خاطر ایک جوان بہن کی بھینٹ دے کر اس بند کی ایک حقیقی نظیر پیش کر دی۔" انہوں نے یہ بات اُسے مخاطب کر کے نہیں کہی تھی لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ چوٹ بھی اس کے بھائی پر ہی کی گئی تھی۔ اور جو کچھ کہا تھا وہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ شرمندگی نے اسے پانی پانی سا کر دیا۔ دراز اور گھنیری پلکیں رخساروں کی حدت سے کچھ زیادہ ہی جھپک گئیں۔ وہ تھوڑی دیر تک سگریٹ کے کش لگاتے اسی طرح ٹہلتے رہے پھر سگریٹ کو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں مسل کر اس کے قریب آئے اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیڈ کی پٹی پر ٹک کر انہوں نے ایک بے حد چبھتی سی نظر اس پر ڈالی۔ اور پھر چہرہ اونچا کر کے سامنے مقابل کی دیوار پر نظریں جما دیں۔

"کیا اس شادی میں تمہاری مرضی کو بھی کوئی دخل تھا۔؟" انہوں نے تیکھے سے لہجے میں سوال کیا۔ اب وہ جواب میں یہ کیونکر کہتی کہ نہیں بالکل نہیں۔ یہ شادی تو بھائی اور بھابی نے زبردستی کی ہے۔ وہ جواب میں صرف "جی" ہی کہہ سکی۔

"نہیں صرف جی کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ تم خاصی پڑھی لکھی اور سمجھدار ہو روایتی انداز اختیار کرنے کے بجائے بلا جھجک بلا تامل میری بات کا جواب دو۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ تب بھی وہ دل کی بات زبان پر نہ لا سکی کہ اب تو زندگی بھر کے لیے ان کے ساتھ بندھ گئی تھی۔ اس پر ان کی تلخ و ترش باتوں اور بگڑے بگڑے سے موڈ نے اسے خائف سا کر کے رکھ دیا تھا۔ اوپر سے شرم و حیا نے لبوں پر خاموشی کے پہرے سے بٹھا رکھے تھے۔ اور ادھر وہ اس کے جواب کے منتظر سے بیٹھے تھے۔

آخر اس نے کسی نہ کسی طرح اپنی شرم پر قابو پا کر کہا۔

"بھابی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہیں درانی صاحب کیسے لگتے ہیں تو میں نے کہہ دیا کہ بہت اچھے۔" شرم کی وجہ سے یہ ایک بہت ہی غلط بات کہنے کی وجہ سے اس کی آواز کانپ سی رہی تھی۔ اس لیے وہ اپنا فقرہ بھی پورا نہ کر سکی۔ اور اس کی سادگی سے کہی بات پر انہوں نے چونک کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ اور یوں ازدواجی زندگی کی پہلی شب کے ادھیڑ عمر دولہا نے اپنی نوخیز دلہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں کترا لیں۔

"کیا عمروں کے اتنے زبردست فرق کے باوجود بھی ؟ کچھ معلوم بھی ہے میں عمر میں تم سے پورے چالیس برس بڑا ہوں۔ یعنی تمہارے بھائی سے بھی آٹھ برس بڑا ہوں۔" اب وہ جواب میں کیا کہتی سوائے خاموش رہنے کے۔

"بہر حال تم نے میرے لیے رضامندی دے کر محض جھک ہی مارا ہے۔ یا پھر اپنے پورے مستقبل پر کالک ہی پھیر لی ہے۔" برافروختہ سے انداز میں ایک دم ہی اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"جی!" ان کی بات پر وہ ہراساں سی ہو کر بولی۔

"ہاں۔ تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھا کھود لیا ہے سلوط بیگم! ورنہ عمر کے اس اٹھاون سالہ دور میں۔ جبکہ میں بال بچوں والا ہی نہیں پوتے اور نواسہ، نواسی والا بھی ہوں۔ مجھے تم جیسی نوخیز لڑکی سے شادی کرنے کی بھلا کیا احتیاج تھی۔"

اور اس انکشاف پر تو اس کے حواسوں پر بجلی سی گر گئی۔ اور اس میں کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"سنو۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ میں نے یہ شادی ایک انتقامی جذبے کے تحت کی ہے۔" وہ ایکدم ہی پلٹ کر اس کے نزدیک آ گئے۔

"پورے اڑتالیس برس میں آتشِ انتقام میں جلتا رہا ہوں۔ اپنے دشمنوں کو ڈھونڈنے میں میرا قیمتی وقت ہی نہیں کتنا ہی پیسہ برباد ہوا ہے۔ تب کہیں جا کر بڑی سرگردانی کے بعد تمہارا لالچی اور حریص بھائی میرے قبضے میں آیا ہے۔ اور تمہارا حصول میری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ثابت ہوا۔ سمجھیں تم۔" اُف توبہ۔ ان کی آنکھوں سے کیسی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں اور چہرے پر کیسی خشونت تھی کہ ڈر کے مارے اس کا خون خشک ہو گیا۔ جبکہ ان کی ایک بات بھی تو اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی کہ کیسا انتقام اور کیسی کامیابی۔

وہ اٹھارہ انیس برس کی دبی دبائی اور محرومیوں کا شکار ایک کمپلیسڈ اور ناتجربہ کار سی لڑکی تھی۔ جسے شادی کی پہلی شب سہاگ کے مزے لوٹنے کے بجائے ایک بہت ہی اذیت ناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ سخت پریشانی اور حیرانگی کے عالم میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں۔؟"

"ہوں۔ وہ بھی تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔" نہایت خشونت بھرے انداز میں جواب ملا۔ انہوں نے اس کے نزدیک بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اپنے اکلوتے ماموں مسعود الحسن تعلقہ دار کو جانتی ہو۔؟" انہوں نے چبھتے سے لہجے میں سوال کیا۔

"جی نہیں۔"

"بہت خوب یعنی کہ اپنے حقیقی ماموں سے بھی واقف نہیں ہو۔ یہ میں کیسے مان لوں۔" انہوں نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

"میں نے تو یہ نام بھی آج ہی سُنا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"خیر جہنم میں ڈالو اس بات کو۔ میرے پاس بھی فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔" وہ اس کی لاعلمی ظاہر کرنے پر پھنا کر بولے۔ "تم اگر جھوٹ اور ریا سے بھی کام لے رہی ہو تو مجھے اس کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ میں نے تو اب سے تیس سال قبل اپنی کلوتی اور عزیز از جان مرحومہ بہن کی میت پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ میں خواہ بوڑھا ہو جاؤں مگر مسعود الحسن سے اپنی معصوم بہن کا انتقام لے کر رہوں گا۔ سو الحمدللہ تمہاری صورت میں آج میں نے اپنی قسم پوری کر دی ہے۔ سمجھیں تم—"

انہوں نے ایک جذب کے عالم میں اسے مخاطب کر کے اپنی بات ختم کی۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں سمجھی— اور سمجھتی بھی کیسے۔ جبکہ مسعود الحسن سے اس کا دور تک کوئی واسطہ تھا نہ تعلق اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں کون تھی۔ باپ کیسے تھے۔ یا اس کے کچھ رشتے دار بھی ہیں۔ البتہ بھابی کے رشتے داروں سے وہ ضرور واقف تھی۔

"تم صولت جہاں کی بیٹی ہو نا۔" انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد پوچھا۔

"صولت جہاں؟ لیکن مجھے تو اپنی والدہ کا نام معلوم نہیں۔" اس نے پھر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"لیکن مجھے تو معلوم ہے۔ تم نہ معلوم کس وجہ سے اتنی غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔ جبکہ میں تمہارے خاندان کے سارے کچے چٹھے سے باخبر ہوں۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی باتوں کو جھوٹ اور غلط بیانی پر ہی محمول کر رہے تھے۔

"بہر حال— تمہاری جلاد صفت نانی اور ماموں نے میری جوان اور معصوم بہن پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ صرف— صرف اس جرم کی پاداش میں کہ میری پیاری سی آپا نے یکے بعد دیگرے بیٹوں کو جنم دینے کے بجائے بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ ایک رات صرف تن کے کپڑوں میں انہیں طلاق دے کر اور پھر دوسری بچی کو چھین کر زہرہ پر تو قیامتیں ڈھائی گئی تھیں۔ زہرہ کے اس غم میں تڑپ تڑپ کر جان دینے تک کی ساری روداد اُسے سنا ڈالی۔

"جانتی ہو اس وقت میں صرف دس گیارہ سال کا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ہی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مسعود الحسن کو ایسی ذہنی اور روحانی زک پہنچاؤں گا کہ قبر میں جا کر بھی انہیں چین نہیں ملے گا۔ اور خدا کے فضل سے اب وہ موقع میرے ہاتھ آ گیا ہے۔"

زہرہ کی ساری روداد سنانے کے بعد انہوں نے کہا۔ اور پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"میں نے شادی کی۔ اولادیں پیدا کیں مگر ایک روز بھی چین و سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکا۔ آتشِ انتقام نے میری ساری حسیات کو جلا ڈالا تھا۔ میں عارف حسین عرف عبید آج دنیا کا مسرور اور کامیاب ترین انسان ہوں میرے اندر انتقام کے شعلوں کی جو تھوڑی بہت لپک باقی رہ گئی ہے۔ وہ اب تمہارا حشر خراب کر کے ہی ٹھنڈی ہو گی۔"

اف کیسا ڈراؤنا سا تاثر تھا ان کے وجیہہ چہرے پر اور کیسا خوفناک سا انداز۔ کہ اسے بھی اب اپنی روایتی شرم بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

"لیکن اس میں بھلا میرا کیا قصور— میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مسعود الحسن کا نام بھی میں نے آج آپ کے منہ سے پہلی بار سُنا ہے اور میرا تو کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔"

"ہوں تو یہ بھی تمہارے حریص بھائی کی کوئی شاطرانہ چال ہی ہو گی کہ اس نے تمہیں تمہارے رشتے داروں سے دور رکھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم تو حقیقت میں مسعود الحسن کی بھانجی ہی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے تمہارا بھائی چونکہ مالی طور پر بالکل کنگلا اور کوڑی کا محتاج ہے اس لیے اس نے جائیداد سے بے حق کرنے کی غرض سے تمہیں اپنے سگے رشتے داروں سے دور ہی رکھا ہے۔" انہیں اس کی باتوں سے صداقت سی جھلکتی نظر آئی تو انہوں نے اظہارِ خیال کے طور پر کہا مگر پھر فوراً ہی پینترہ بدل کر کہا۔

"لیکن یہ تو تمہارا نجی معاملہ ہے جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میرے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ تم مسعود الحسن کی بھانجی ہو۔"

صولت جہاں کی بیٹی اور شوکت جہاں جیسی بدخصلت اور شقی دل عورت کی نواسی موجس نے ایک پوتی کو ماں کی جدائی کا
دے کر جان سے مار دیا اور دوسری پوتی کو چھین کر ماں کو قبر میں اتار دیا۔ پھر پوتے کی خواہش میں نئی بہو بیاہ کر لائی لیکن
دل میں لیے خاک کا پیوند ہوگئی۔ یہ ہوتا ہے خدائی عذاب۔ کسی بے گناہ پر ستم توڑنے کا نتیجہ اور وہ مسعود الحسن پورے
تک فالج میں بتلا رہ کر مرے بھی تو ایسے کسمپرسی کے عالم میں کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے۔ باپ کی عیاشی میں
چچازاد اور سوتیلے بھائی قابض ہوگئے تھے۔ اتنا اثاثہ بھی نہ چھوڑا کہ بیٹیوں کو اچھے گھرانوں میں بیاہ دیتے۔ اصل
پڑا تھا مسعود الحسن پر۔ امی جان، ابا میاں، آپا کا اور میرا۔ کیونکہ آپا کا غم ہی تو امی جان اور ابا میاں کو لے بیٹھا تھا
بعد ہی یکے بعد دیگرے دونوں فوت ہوگئے تھے اور پھر آپا بھی۔"

وہ سانس لینے کو ذرا رکے ـــــ پھر بولے

"لیکن میں تمہاری نانی کو اس بیداد کا ذمہ دار نہیں سمجھتا۔ اصل ذمہ دار تو تمہارا ماموں تھا۔ کیونکہ شادی کے بعد مرد ہی
کُل ہوتا ہے اور میں ایسے مردوں کو زنخے سمجھتا ہوں جو ماں کی جہالت آمیز اور بے جا ضد یا ہٹ دھرمی پر اپنا بنتا بستا گھر
رکھ دیتے ہیں اور زندگی تو اصل میں بیوی کی ہی برباد ہوتی ہے۔ ماں کے پیروں تلے جنت ضرور ہوتی ہے اور اس کا ہر حکم سر آنکھوں پر
لیکن اگر ماں یہ کہے کہ نعوذ باللہ دو خدا ہیں یا کوئی ایسی فطرت کے خلاف یا نامناسب بات۔ اپنی اولاد کی ازدواجی زندگی
شر اور فساد کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی باتوں کے لیے ایک ماں اپنی اولاد کو اکسائے یا حکم دے تو حکم عدولی یا نافرمانی عین جائز
ہوتی ہے۔ لیکن عیاشی مسعود الحسن کو باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔

تبھی تو اس نے ماں کے اکسانے اور ورغلانے پر میری بے گناہ اور معصوم بہن کو بلاقصور ہی طلاق دے دی تھی۔
آپا تھیں کہ طلاق کے بعد بھی حتیٰ کہ مرتے دم تک اس شقی دل جفاکار کو نہیں بھول سکیں اور اس کی محبت کو سینے سے لگائے قبر میں
جا سوئیں۔"

وہ یہ سب کہہ کر شاید دل میں برسوں سے بھرا غبار نکال رہے تھے اور ادھر وہ تھی کہ دم سادھے سب کچھ سنے چلی جا رہی
تھی۔ عمروں کا فرق۔ انتقام اور ہر گزرتی ساعت کے بعد ذہن میں نیزے کی طرح چبھتا یہ سوال کہ اب کیا ہوگا۔ وہ اس کا کیا حشر
کریں گے۔ اس کے ہوش اڑائے جا رہا تھا۔

جب کہ اس نے تو پڑھا بھی تھا اور سنا بھی کہ ایک نئی نویلی دلہن کے لیے سہاگ رات کا تصور ہی بڑا خوابناک اور حسین ہوتا
ہے اور سہاگ رات سے متعلق بے شمار تشبیہات اور باتیں بھی۔

مگر یہ کیسی سہاگ رات تھی جس کی ابتدا نفرت اور انتقام سے ہوئی تھی۔ درانی صاحب تو شادی کا نام آتے ہی بہت پہلے اس کے
لیے ہوا بن گئے تھے اور اب تو ایسی ڈراؤنی باتیں کر رہے تھے کہ بالکل ڈریکولا ہی لگ رہے تھے۔

"خیر اب وقت آگیا ہے۔ اگلا پچھلا سارا حساب چکانے کا اور جس طرح میں یہ حساب چکاؤں گا اسے تم اور تمہاری آئندہ نسلیں
ہمیشہ یاد رکھیں گی۔" وہ بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اٹھتے ہوئے بولے۔

"تو۔ تو کیا آپ بھی مجھے طلاق دے دیں گے۔" اس کی پریشانی حد سے تجاوز کر گئی تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیوں۔ کیا تم یہی چاہتی ہو؟" انہوں نے پلٹ کر چبھتے سے لہجے میں سوال کیا۔ تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"نہیں نہیں، میں بھلا کیوں چاہنے لگی۔" اس نے سہم کر کہا۔ کہ زندگی بھر کی محرومیوں کے بعد طلاق کا داغ لگانا اسے مرکر
بھی گوارا نہ تھا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بھی ہم بعد میں سوچیں گے۔ اس وقت تو تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ تین بج چکے ہیں۔ یقیناً تم تھک گئی ہوگی۔"
لیکن اس کا دوپٹہ بھی اتار دیا گیا تھا۔ لباس بھی ایسا بھاری تھا کہ بدن میں چبھ رہا تھا۔ اس پر بھاری زیورات اور پھر
ان کے سامنے وہ بھلا دوپٹہ اوڑھے بنا کیسے لیٹ سکتی تھی۔ سراسیمہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں کہتا ہوں آرام کرو۔ سمجھیں تم۔ یا پھر چاہتی ہو کہ میں زبردستی کروں؟"

وہ یکا یک کچھ اتنی زور سے دہاڑے کہ اسے اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا محسوس ہوا۔ انہوں نے زبردستی کا لفظ استعمال کیا تھا
اس لیے چار و ناچار اسے ان کی بات ماننی ہی پڑی۔ پھر وہ لباس تبدیل کر کے اور لائٹ بجھا کر اس کے پاس آگئے۔

"غیرت گوارا کرتی ہے نہ طبیعت۔ لیکن پھر بھی تم میری منکوحہ ہو اور پھر۔"

اور پھر وہ اپنی زندگی کے سب سے زیادہ کربناک اور اذیت ناک تجربے سے دوچار ہوئی۔ ہاں۔ وہ ایک تجربہ ہی تو ہے
شادی کے بعد تقریباً ہر لڑکی کو گزرنا پڑتا ہے اور جو ـــــ شوہر کے باہمی التفات، اظہارِ رضا اور جذبوں کی شدت
جس سے مزین ہوتا ہے۔

مگر وہاں تو سب کچھ گویا یک طرفہ تھا۔
درانی صاحب کی مرضی اور جبر پر منحصر تھا۔
اس میں نفرت اور انتقامی سی کیفیت شامل تھی۔
روتے روتے اس پہ غشی سی طاری ہونے لگی تھی اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔
پہلے سے کسی نے کچھ بتایا تھا۔ نہ وہ خود ہی کچھ جانتی تھی۔
بھابی نے تو سہیلیاں بنانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔
بس کلاس کی دو ہی لڑکیوں سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔
مگر یہ دوستی صرف کالج ہی کی حد تک محدود تھی۔

حد یہ تھی کہ حلقۂ احباب خاصا وسیع ہونے کے باوجود بھی بھابی اپنے ملنے والوں سے اسے زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیتی تھیں۔
حکم تھا کہ بس۔ کوئی آیا کرے تو تھوڑی دیر اس کے سامنے بیٹھا کرو۔ پھر اٹھ کر چلی جایا کرو کہ ہماری روایات میں لڑکیاں بالیاں
بڑوں کی صحبت میں نہیں بیٹھا کرتیں۔ بات بات میں روایات کا ہوّا۔
بھابی نہ معلوم کس گزرے ہوئے زمانے میں لوٹنے کے لیے کوشاں نظر آتی تھیں۔ جبکہ وہ تو اٹھترواں سال چل رہا تھا بیسویں
صدی کا۔

بہرحال اگلی صبح گزری ہوئی شب کی ساری نشانیاں اس کے اترے اترے چہرے پر ثبت نظر آرہی تھیں۔ اور وہ کچھ ایسی شکستہ
اور دلگیر نظر آرہی تھی کہ درانی صاحب نے اپنی کسی مصلحت کے تحت اسے حکم دیا۔

"جاؤ ناشتہ کرنے سے پہلے اپنی بھاوج صاحبہ کو فون کر کے اتنا بتا دو کہ وہ تمہیں لینے کے لیے کسی کو بھیجنے کی زحمت گوارا نہ
کریں کیونکہ اس وقت میں سخت مصروف ہوں۔ جب فرصت ملے گی تو خود ہی تمہیں لے کر آجاؤں گا۔" اور اسے حکمِ حاکم کے مصداق
نہ چاہتے ہوئے گھر پر فون کرنا پڑا۔

فون اس کے بھائی جان نے ریسیو کیا تھا۔ نہ حال پوچھا نہ احوال بلکہ بہنوئی کا پیغام سن کر بڑی فراخدلی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔
"اچھا اچھا۔ کوئی مضائقہ نہیں اور نہ کوئی ایسی جلدی ہی ہے۔ جب بھی فرصت ملے تم دونوں اطمینان سے آنا۔" اور بس
پھر خود اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ پھر پورے تین روز درانی صاحب سخت مصروف رہے تھے بلکہ گھر سے ہی غائب
رہے تھے۔ چوتھی شب رات گئے آئے بھی تو اپنی من مانی کرنے میں لگے رہے۔ اور اس سے اگلی صبح تقریباً نو بجے کے قریب بیدار ہو کر
انہوں نے کہا۔

"چلو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں تمہارے بھائی کے گھر ڈراپ کرتا چلا جاؤں گا۔"
اس کا دل تو چاہا کہ انکار کر دے لیکن شوہر کے سامنے میکے سے بیزاری کا اظہار اسے مناسب نہ لگا۔ اور وہ چپ چاپ ایک نسبتاً
ہلکا سا جوڑا پہن کر تیار ہوگئی۔ زیور بھی اس نے بہت ہلکا سا پہنا تھا۔ درانی صاحب نے بڑی پسندیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا
اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

اصل میں تو اس کے دل کی کلی کھلے بنا ہی مرجھا گئی تھی۔ اس پہ یہ احساس کہ شوہر عمر میں اس کے باپ کے برابر ہے۔ اس
کا دل اسے اپنا روپ سنگھار دکھانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک کراہیت سی پیدا ہوگئی تھی مزاج میں جس میں درانی صاحب
کی وجاہت اور پرسنیلٹی سب کچھ ہی دب کر رہ گیا تھا۔

بہرحال۔ وہ بڑے اشکراہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر ان کے قریب کار میں جا بیٹھی۔ اور اپنے میکے کا رخ کیا۔
آدھا راستہ تو خاموشی سے کٹا۔ پھر درانی صاحب نے جو نہایت خاموش اور لاتعلق سے کار چلا رہے تھے خود ہی گفتگو کی ابتدا کی
"تم نے اس روز یہی کہا تھا نا کہ تم طلاق لینے کے حق میں نہیں ہو۔" انہوں نے سوچنے کے سے انداز میں پوچھا تو وہ جو ان کے
قریب ہی اگلی سیٹ پر بیٹھی اپنے اس المیے کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی جو شادی کی صورت میں گزرا تھا ان کی بات پر بری

طرح چونکی۔

"جی — جی ہاں۔" اس کے منہ سے خود بخود نکلا۔

"ہوں۔" انہوں نے کہا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں طلاق دے کر تمہاری تو ہین کیا ہے بلکہ یہ تو پہلے سے میرے بنے بنائے پروگرام میں شامل ہے۔ ویسے بائی داوے کیا تم اپنی پوری زندگی ایک بوڑھے کے ساتھ نکاح میں بندھے بندھے آسانی سے گزار سکوگی۔" یہ سوال ہی ٹیڑھا تھا۔ کم از کم اس کی سمجھ میں نہ آنے والا۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔

"دیکھو یہ مذاق ہے نہ تمہاری قوت برداشت کی آزمائش بلکہ اس معاملے میں میں بہت سنجیدہ ہوں۔ میں تمہیں اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا بلکہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت تمہیں ہمیشہ کے لیے تمہارے میکے چھوڑنے جا رہا ہوں اب تم میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ میں ہی تمہارے پاس آؤں گا نہ تمہیں بلاؤں گا یعنی تم کو اب ہمیشہ کے لیے میکے میں رہنا ہوگا مگر بے حد عزت اور شرافت کے ساتھ۔ میں بوڑھا اور بال بچوں والا آدمی ہوں۔ میرے جذبات بجھ چکے ہیں اور نیت بھی بہت سیر ہے۔ مگر تم میری منکوحہ ہو اور تم کو محتاط ہو کر رہنا پڑے گا۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر تمہارا لالچی بھائی تمہارا سودا کر دے۔"

اُف درانی صاحب یہ کیا کہہ رہے تھے۔

کہ ان سے چھٹکارا حاصل ہونے پر طمانیت کے احساس کے ساتھ ساتھ وہ مضطرب سی ہوگئی۔

یوں بھی جس گھر سے ہمیشہ کے لیے خلاصی ملی تھی اس گھر میں دوبارہ ہمیشہ کے لیے واپس جانے کا خیال بہت تکلیف دہ تھا۔ اس سے غنیمت تو وہ درانی صاحب کے گھر کو ہی سمجھتی تھی۔ جہاں کم از کم ان چار دنوں میں بات بات پر روک ٹوک اور طنز کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئے تھے اور وہ اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سُن کر مُہر بہ لب۔ مگر جب انہوں نے اندر جانے کے بجائے اس کے بھائی کے بنگلے کے باہر ہی کار روکی تو خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

"آپا کو بھی صرف تن کے کپڑوں میں نکالا گیا تھا اور پھر حد تو یہ تھی کہ پھر جہیز واپس کیا گیا نہ زیورات۔ بلکہ مہر کی رقم بھی ہضم کر لی گئی تھی۔ ابا میاں نے تو اپنی نسبی شرافت اور رکم مائیگی کی وجہ سے آپا کا حق انہیں واپس دلوانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی مگر میں۔" اور پھر وہ ایک دم ہی اس سے مخاطب ہو کر بولے۔

"وہ پچاس ہزار کی رقم، زیورات کے چھ سیٹ اور انیس جوڑے ہی تو تھی نا تمہاری کل جمع پونجی۔ تو کہہ دینا اپنے حریص بھائی سے کہ میں انہیں ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی چوٹ دے چکا ہوں۔ وہ اسمگلنگ کے کاروبار سے حاصل کی ہوئی باون لاکھ روپے کی رقم وہ بھی میری تحویل میں آچکی ہے۔ ابھی دو بجے کی فلائٹ سے بیرونی ممالک کی سیر کو جا رہا ہوں۔ لہٰذا مجھ سے رابطہ قائم کرنے یا مجھے تلاش کرنے کی کوشش بے سود ہی ثابت ہوگی۔ اچھا۔ اب تم جاؤ۔ ہاں۔ مگر ایک منٹ۔"

انہوں نے اپنی بات کہتے کہتے ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈال کر ایک موٹا سا ہار اٹھایا اور پھر اس سے مخاطب ہو کر بولے۔

"لو، یہ کنٹھا سنبھالو — میں نے تمہیں رونمائی بھی نہیں دی نا۔ اگر ہو سکے تو اسے سہاگ کی نشانی سمجھ کر اپنے پاس حفاظت سے رکھ لینا۔"

اور پھر انہوں نے اگلے ہی لمحے وہ کنٹھا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ مگر اس نے وہ کنٹھا باہر آنے سے قبل ہی اپنے گلے سے اور پوری قوت سے توڑ کر ان کی گود میں پھینکتی ہوئی کار سے اتری اور بھاگتی ہوئی گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ بھاگ کر سیدھی اندر چلی آئی تھی۔

غم و غصے اور کھسیاہٹ کے مارے اس کی آنکھوں کے آگے زمرے سے ناچ رہے تھے۔

پورچ کی بالائی سیڑھی تک آئی تو تیورا کر وہیں گر پڑی۔

آخر باون لاکھ روپے کی رقم — زیورات کے چھ سیٹ — پچاس ہزار اور اپنی بربادی کوئی معمولی چوٹ یا چھوٹا موٹا نقصان تو نہیں تھا۔

جس سے وہ عجیب و غریب تجربوں سے دوچار ہوتی رہی تھی۔

گزشتہ چار روز سے وہ اور اذیتناک درانی صاحب کا سرد اور انتقامی سا رویہ تھا۔ اور انہوں نے اب جتنی بھی باتیں کی تھیں۔ جن میں سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ محض دھمکی یا ڈراوا تو نہیں ہو سکتی تھیں۔ بلکہ ہر بات حقیقت اور صداقت پر مبنی تھی۔ اس لیے اس کا تیورا کر گر جانا بے جا یا غیر ممکن تو نہ تھا۔

دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور گھر میں ہمیشہ کی طرح اُلّو ہی بول رہا تھا۔ یوں بھی یہ گھر کے مکینوں کے آرام کرنے کا وقت تھا۔ نوکر چاکر بھی اس وقت کہیں اِدھر اُدھر ہی اینڈتے نظر آتے تھے۔ اسی لیے اسے کسی نے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا نہ گرتے۔

وہ تو خود ہی تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو کراہتی ہوئی اٹھی اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ تب بھی خاصی دیر بعد دروازہ کھلا۔

اور بھابی اپنے چہرے پر ناگوار سے تاثرات لیے سامنے ہی کھڑی نظر آئیں۔ گو پورے چار روز سے پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لینے پر وہ دل ہی دل میں دونوں سے سخت کبیدہ تھی۔ پھر بھی باون لاکھ روپیہ ڈوب جانے کی بات تھی۔

اس نے بھابی کو سلام کیے بغیر ہی بے تابانہ پوچھا۔

"بھائی جان کہاں ہیں۔؟"

"او ہو اگر تم اپنے بھائی جان سے ہی ملنے آئی ہو تو پھر کسی وقت آجانا۔ کیونکہ اس وقت تو وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔" بھابی نے طنزاً کہا۔

"اُفوہ بھابی جان! یہ طعن و تشنوں کا موقع نہیں ہے۔ جلدی بتائیے کہ بھائی جان کہاں گئے ہوئے ہیں۔" وہ بھابی کے سامنے پہلی بار تیوری چڑھا کر بڑے برہم سے انداز میں بولی۔

"کہہ کر جاتے ہی کب ہیں جو یہ معلوم ہو کہ کہاں گئے ہیں۔ لیکن تم خاص طور پر انہیں کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا میں کسی قابل نہیں۔" بھابی کے لہجے سے اب شکوہ سا نمایاں تھا۔

"نہیں بھابی جان! یہ بات نہیں۔ بلکہ وہ مکار اور فریبی شخص ہمیں چکمہ دے کر چلا گیا ہے۔ وہ بھائی جان کو —"

"کون — کون چلا گیا ہے۔؟" بھابی نے اس کی بات قطع کر کے پوچھا۔

"وہی درانی بھابی جان — وہ میری زندگی بھی برباد کر گیا ہے۔" اور پھر وہ بھابی سے لپٹ کر رونے لگی۔

"یہ — یہ کیا کہہ رہی ہو تم گڑیا۔!"

بھابی نے بھی زندگی میں پہلی بار اُسے خود سے لپٹا کر اُسے گڑیا کہتے ہوئے پوچھا تو اس نے رو رو کر وہیں داخلی دروازے پر ہی کھڑے کھڑے انہیں ساری بات بتا دی۔ اور باون لاکھ روپے کا سن کر بھابی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اُسے لے کر سیدھی اپنے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اور فون پر ہر اس جگہ جہاں ثاقب حسن کے موجود ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ درانی صاحب نے اپنی فلائٹ کا وقت دو بجے ہی بتایا تھا۔ اور وہ چاہ رہی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح — ثاقب درانی کو ایئر پورٹ پر جا کر گھیر لیں۔

مگر قسمت پیار کی چھانے لگتی ہے تو انسان کامیابی کے نزدیک پہنچ کر بھی تشنہ کام رہ جاتا ہے۔ اور یہ تو محض کوشش ہی تھی۔ انہوں نے بہت چاہا بھی کہ خود ہی ایئر پورٹ چلی جائیں لیکن — تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی زمام اُن کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی اور برا وقت ہی نہیں آیا تھا۔ ان کی تو پیج صحیح شامت ہی آگئی تھی۔

ثاقب حسن ان دونوں کو شدید انتظار کی اذیت سے گزار کر شام کو لوٹے تھے۔ اور بیوی کی زبانی ساری بات سُن کر پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا تھا مگر جب سلوطہ نے رو رو کر اصل بات بتائی کہ انہوں نے اپنی بہن کا انتقام اس سے لیا ہے اور باون لاکھ روپے بعد جہیز اور جہیز کی رقم ہضم کر جانا بھی انتقام کا ہی ایک حصہ ہے تو وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جھک گئے تھے۔

مگر یہ دل کا دورہ نہ تھا بلکہ وہ شاک تھا جو اتنی خطیر رقم لُٹ جانے پر انہیں پہنچا تھا۔ بہر حال پھر اس کے سانحے کے بعد — ثاقب حسن نے درانی کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا۔ بلکہ سر توڑ کوشش کر لی لیکن درانی انہیں کہیں مل کر ہی نہ دیے۔

جس بنگلے میں وہ بیاہ کر لے جائی گئی تھی۔ وہ بھی مقفل ہی ملا تھا۔ اصل میں تو وہ بنگلہ درانی کے ایک دوست کا تھا
جو لندن میں رہائش پذیر تھا۔ اس لیے وہ بنگلہ نو سال سے، مقفل ہی پڑا تھا۔ جسے درانی نے دوست کے بیٹے سے اجازت لے کر
رہائش کے لیے یا شادی کا یہ ڈھونگ رچانے کی غرض سے لے لیا تھا۔

پھر یوں ہوا جیسے ڈائنامائٹ لگانے سے بڑی بڑی چٹانیں کھیل کھیل ہو جاتی ہیں۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ سابقہ پارٹنر
داروں نے کاروبار میں لگائی ہوئی اس رقم کا مطالبہ کیا جو ثاقب حسن کے ذمے آتی تھی۔ اور جس کا منافع وہ وصول کر چکے تھے
انہی منافعوں سے وصول ہونے والی رقموں کو درانی صاحب کے کاروبار میں لگا چکے تھے کہ تگنے اور چوگنے منافع کی توقع تھی
وہاں تو اصل رقم ہی ڈوب گئی تھی۔ پھر بھلا اپنے پرانے شریک کاروں کو کیا لوٹاتے۔ چنانچہ نتیجے میں انہیں اپنا گلبرگ والا بنگلہ
کاریں اور جیپ اور بہت سا قیمتی سامان فروخت کرنا پڑا۔ تب بھی آدھی رقم لوٹانے کے قابل نہ ہو سکے۔ مخالفت کرنے
سے علیحدگی کے اعلان پر ہی ہو چکے تھے۔ اب آدھی رقم ادا نہ کرنے پر دشمنی کی داغ بیل بھی پڑ گئی۔ گو اس وقت تو باقی آئندہ
تھا۔ مگر چالیس لاکھ روپے کی رقم بھلا کہاں سے دیتے۔ جبکہ عالم تو یہ ہو گیا تھا کہ مزنگ کے علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر
لے لیا تھا۔ جس کے گھر کرائے سمیت تمام اخراجات فاخرہ بیگم ہی اٹھا رہی تھیں۔ وہ تو شروع ہی سے اس سے بیگانہ تھیں
جو سارے اخراجات ان کے سر پہ آ پڑے تو ہمیشہ اسے ہی ان سارے مصائب کا ذمہ دار ٹھہراتیں اور وہ جو درانی صاحب کی
سی رفاقت سے نکل جانے کے بعد بالکل ہی تہی دامن اور تہی دست ہو گئی تھی۔ اسے بہت کچھ سننے کے باوجود حالات کی سنگینی
کے پیش نظر ثاقب حسن کہیں ملازمت کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ پورے چھ برس تک ایک بہت ہی آسودہ حال زندگی
گزارتے یہ افتاد پڑی تھی۔ اور اس پر تو دوہری اور تہری افتاد ــــ اس لیے وہ ایک طرح سے گوشہ نشین ہی ہو کر رہ گئی تھی۔

پیدا ہوتے ہی محرومیوں کی گود میں پلی بڑھی تھی اور بچپن سے ہی وہم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لیے اس کے اندر صبر اور سہار کا
مادہ کچھ سوا ہی تھا۔ یہ اتنا بڑا المیہ یا سانحہ اس پر ٹوٹا تھا تب بھی پہلے کی طرح خاموش اور پُرسکون نظر آتی تھی۔ جبکہ بھابی کا رویہ
اتنا معاندانہ سا ہو گیا تھا کہ شادی سے پہلے تو واقعی اس کی برداشت سے باہر ہی ہو جاتا۔ لیکن اب اپنے حالات کے پیش نظر
وہ خود بھی اس ساری مصیبت کا خود کو ہی ذمہ دار سمجھتی تھی۔ اس لیے بھابی کی کڑوی کسیلی نہایت صبر اور تحمل سے برداشت
کر لیتی تھی۔ بلکہ وہ تو الٹا بھابی کی قوتِ برداشت کو داد دیتی تھی۔ جنہوں نے ہمیشہ آسودگی سے زندگی بسر کی تھی مگر اب شوہر کی
خاطر کتنی مصیبتیں جھیل رہی تھیں اور ایک طرح اپنے جان چھڑکنے والے بھائیوں سے بھی کٹ کر رہ گئی تھیں کیونکہ اپنی دگرگوں
حالت کے پیش نظر انہوں نے اپنے بھائیوں سے اپنے سارے رابطے توڑ دیے تھے۔ اور مزنگ والے گھر میں آ کر ایک
گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔

وقت کے پر ہوتے ہیں نہ پَر۔ پھر بھی وہ گزرتا ہی۔ چلا جاتا ہے اور گزرتا تو اپنی رفتار اور تعین سے ہی ہے لیکن انسان کو کبھی
اچھے یا بُرے حالات کے پیش نظر کبھی گزرتا۔ محسوس ہی نہیں ہوتا اور کبھی سسک سسک کر انگل انگل آگے بڑھتا
محسوس ہوتا ہے۔ اور سال بھر کا وہ عرصہ جس طرح رینگ رینگ کر گزرا تھا۔ یہ ان تینوں کا ہی دل جانتا تھا۔

بھابی تو کروشیہ پر میز پوش، پلنگ پوش، گرد پوش اور بیلیں۔ بُن بُن کر محلے میں چپکے چپکے فروخت کرنے اور ادبی
رسائل کا مطالعہ کرنے میں گزار دیتی تھیں ــ اور بھائی ــ کام کی تلاش میں سارا سارا دن اپنی جوتیاں گھستے پھرتے تھے۔

جو لوگ عمر کے تعمیری دور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کا کچھ یہی انجام ہوتا ہے جیسا کہ ثاقب حسن کا ہو رہا تھا
کیونکہ ایسے ناکارہ اور ناعاقبت اندیش لوگوں کو اگر کوئی کام بھی ملتا ہے تو وہ ایسا ہی ناجائز اور غیر قانونی جیسا ثاقب حسن
کو ملا تھا۔ جس نے ان کی ساری عزت اور حیثیت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ بلکہ ایسے پھٹے حالوں کو پہنچا دیا تھا کہ بُرے کاموں
کے انجام بھی بُرے ہی ہوتے ہیں۔ اور بھائی کی ساری کوششوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب روزگار کے سارے در
ان پر بند ہو گئے ہوں۔ اور ادھر وہ تھی کہ گھر کے تمام کام جلد جلد نمٹا کر تنہا بیٹھی تصور ہی تصور میں الٹ پلٹ کر بیتے دنوں
اور گزرے واقعات اور حالات کی فلمیں ریوائنڈ کیا کرتی تھی۔

کتنا دل چاہتا تھا کہ کسی کالج میں داخلہ لے کر کم از کم تھوڑی سی تعلیم ہی حاصل کر لے لیکن مالی بدحالی کو دیکھ کر دل مار کر رہ
جاتی۔ درانی نے تو اسے کسی جوگا ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اسے نکاح کے بندھن میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے اسے پابہ زنجیر کر دیا تھا۔

تو وہ بیس سال کے جولانی اور طولانی دور میں بھی کسی لطیف خیال کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ کیسی خشک ـ سرد
سی ہو کر رہ گئی تھی وہ اندر سے کہ کبھی کبھی تو یہ کیفیات یا خصلتیں باہر بھی چھلکنے لگتیں تو بھائی آہ گھونٹ کر رہ جاتے۔
انہیں اس پر کی گئی زیادتی کا شدت سے احساس تھا۔

وقت کا پنچھی اپنے پروں کو پھلکورے دیتا مزید چند ماہ آگے بڑھا تو ایک نئی افتاد نے سر اٹھایا۔
ناجائز کاروبار میں جن حصے داروں کی رقم واجب الادا تھی۔ ان ہی میں سے ایک، ایک روز بھائی سے ملنے آیا اور
ان کی زبوں حالی پر دیر تک افسوس کرتا رہا اور پھر انہیں بہت دلاسے تسلیاں دے کر اور اس مسئلے کا کوئی مثبت حل تلاش کرنے
کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

اصل میں آیا تو تھا وہ اپنی رقم کا مطالبہ کرنے مگر بھائی کے ناگفتہ بہ حالات دیکھ کر مطالبہ کیے بغیر ہی واپس چلا گیا تھا۔ اور
ان کو دی تسلی تھی کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ وہ شخص ہمدردی کے دو لفظ کہہ کر انہیں دلاسا ہی نہیں امید بھی دلا گیا تو وہ فوراً ہی
اپنے مسئلے کا حل معلوم کرنے اس کے پاس پہنچے تو اس نے ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اور یہ تو اسے
بہت بعد میں بھائی اور بھابی کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ اس بدطینت شخص نے اپنی رقم کے عوض اسے مانگا تھا۔ مگر اس شخص
سے ملاقات کے بعد دھمکی آمیز خطوط موصول ہونے کی وجہ سے بھائی کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ مگر یہ سلسلہ کچھ عرصے ہی جاری
رہا تھا۔

پھر وہ شخص جو کسی سنگین جرم میں ملوث تھا گرفتار کر لیا گیا۔ تب کہیں جا کر یہ سلسلہ بند ہوا اور زندگی قدرے سکون سے گزرنے
لگی۔ بھابی اب اخراجات اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گئی تھیں اور ان کے مزاج کا سورج سوا نیزے پر رہنے لگا تھا۔ نئے دن
کے جھگڑوں نے بھائی کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ بھابی اسے بھی نہیں بخشتی تھیں۔ اور طعنوں تشنوں سے اس کا جگر چھیلتی رہتی تھیں
اور بھائی اس واقعے کے بعد سے گھر میں ہی چھپے بیٹھے رہتے تھے۔ گھر میں پیسے کی آمد کا کوئی حل ہی نظر نہیں آ رہا تھا اور یوں وقت
کا پہیہ چھ مہینوں کو پھلانگ مزید آگے بڑھ گیا تھا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد بھائی نے یہی مناسب سمجھا کہ بیوی اور بہن کو لے کر انڈیا
چلے جائیں۔ کیونکہ صرف ایک ماموں ہی بقید حیات تھے اور ایک وسیع جائداد کے مالک بھی تھے۔ یوں تو چچا اور پھوپھیاں بھی موجود
تھیں۔ لیکن جائداد کے بٹوارے پر ان سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ اور یوں بھی لاہور میں بودوباش اختیار کرنے کی وجہ سے ان سے کٹ کر
رہ گئے تھے۔ کچھ باپ کی زندگی میں چچا سے آپس کی چپقلش تھی۔ اس لیے ماموں کے پاس جانا ہی مناسب لگا تھا اور ماموں کے
پاس الٰہ آباد میں مستقل سکونت تو اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ بس چند ماہ کے عارضی قیام کے ارادے سے ہی جا رہے تھے ــ
بھابی ان کے ساتھ چلنے پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئی تھیں اور انہوں نے ہی تینوں کے پاسپورٹ بنوانے کے لیے رقم مہیا کی تھی۔
اصل میں بھابی کے حصے کی ایک خطیر رقم بنک میں جمع تھی۔ اور اسی رقم میں سے تھوڑا تھوڑا نکال کر گھر کے اخراجات پورے کیے جا رہے
تھے۔ مگر بیٹھے بیٹھے تو بڑے بڑے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ بھائی نے بھی اس مقولے پر بے حد سنجیدگی سے غور کیا تھا اور اسی
لیے ماموں کے پاس جا رہے تھے کہ ان کے ذریعے پیسہ آنے کی کوئی سبیل نکال لیں۔

پاسپورٹ بن کر تیار ہو چکے تھے۔ اور اسی روز بھائی ویزا حاصل کرنے گئے تھے۔ ویزا بھی بڑی دقت سے مل رہا تھا اور یہ
امید نہیں تھی کہ تینوں کا ـــــ ساتھ ہی مل جائے۔ بہرکیف بھائی ویزا آفس پہنچے تو ان کا اور بھابی کا ویزا تو مل گیا مگر انتہائی
کوشش کے باوجود سلوٹا کا ویزا حاصل نہ کر سکے۔ منہ لٹکا کر باہر نکلے ہی تھے کہ کسی نے محبت سے شانے پر ہاتھ مارا۔ گھوم کر دیکھا۔
تو وہی شخص کھڑا تھا۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے ان کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ بھائی کے ہاتھ میں پاسپورٹس اور ویزا دیکھ کر بولا۔

"کہاں کے ارادے ہیں مسٹر حسن؟" اور بھائی کو نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑا کہ وہ انڈیا جا رہے ہیں۔

"اوہو تو یہ ٹھاٹھ ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر بولا۔

"نہیں بھائی ـ ٹھاٹھ واٹ کیسے۔ ہم تو ماموں جان کی عیادت کو جا رہے ہیں۔ جو سخت علیل ہیں۔" بھائی نے غلط
بیانی سے کام لیتے ہوئے بتایا۔

"واپسی کب تک ہو گی؟" پوچھا گیا۔

"بس جب تک ویزا ختم ہونے کی معیاد پوری ہو گی۔" بھائی نے بتایا۔

"کیا اکیلے ہی جا رہے ہیں؟"

"نہیں۔ ہماری فیملی بھی ساتھ جا رہی ہے۔" بھائی نے اپنی سادگی میں کہہ دیا۔

"چلیں میں آپ کو اس کے گھر تک چھوڑ دوں۔" اس نے انہیں ڈراپ کرنے کی پیش کش کی۔

"نہیں بے حد شکریہ۔ ابھی تو ہم کو بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

بھائی نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے بہانہ گھڑا۔ تب وہ ان سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اور بھائی نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اندر ہی اندر انہیں کچھ خوف سا دامن گیر تھا۔ وہ جلد از جلد سلوط کا ویزا حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ گھر سے نکلتے تو بڑی سختی سے تاکید کر کے جاتے کہ ان کی غیر موجودگی میں خواہ کوئی بھی ان سے ملنے آئے، دروازہ نہ کھولا جائے بلکہ جواب ہی دینا۔ دو تین روز تو خیریت سے گزر گئے اور کوئی غیر معمولی غیر واقعہ رونما نہ ہوا۔ مگر چوتھی شب آدھی رات کے لگ بھگ، گہری نیند میں سوئی ہوئی سلوط کو کچھ غیر معمولی پن کا سا احساس ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس دو قد آور مرد، اس کے پلنگ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ جن پر نظر پڑتے ہی خوف و دہشت سے وہ چلانے لگی۔ مگر ان دو نے اسے زیادہ چیخنے چلانے کا موقع نہیں دیا۔ ایک نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دوسرے نے اسے کولی بھر کر اٹھا لیا۔ پھر بھی وہ مزاحمت کے طور پر زور زور سے ہاتھ پیر چلانے لگی۔

یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ ثاقب حسن کو اس وقت بیت الخلاء جانے کی حاجت محسوس ہو گئی تھی۔ اور وہ جوتی میں پیر ڈال کر اٹھے ہی تھے کہ تبھی انہیں سلوط کی چیخیں سنائی دیں۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر وہ اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا پستول رکھ کر سوتے تھے۔ بہن کے چیخنے چلانے کی آواز آئی تو وہ ریوالور لے کر اس کے کمرے کی طرف دوڑے۔ اتنا میں وہ دونوں آدمی سلوط کو اس کے کمرے سے باہر نکال لائے تھے۔ بھائی نے نزدیک آ کر ہوائی فائر کیا تو وہ انہیں مسلح دیکھ کر سلوط کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بھابی نے بعد میں آ کر یہ ہنگامہ دیکھا تو بڑی سنائیں۔ اسے خوب برا بھلا کہا اور اس کی خوبصورتی کو ان ساری مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس روز تو بھائی بھی بھابی کی بات کے قائل ہو گئے تھے۔

وہ خود بھی اپنی خوبصورتی سے سخت نالاں تھی۔

کہ اس کی خوبصورتی ہی اس کے لیے جان کا وبال بن گئی تھی۔

یوں بھی دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ قدرت اگر کسی کو بڑی فیاضی سے کسی نعمت سے نوازتی ہے تو دوسری بیشتر نعمتوں سے محروم ہی رکھتی ہے جیسے کہ اسے رکھا گیا تھا۔

ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کے پیار و اخلاق سے اور پھر ـــــ وہ بھائی کے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہی بن گئی تھی کہ اگلتے بنتی نہ نگلتے۔

تب بھائی اور بھابی نے خاصی سوچ بچار کے بعد سر جوڑ کر آپس میں مشورہ کیا اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر اسے منجھلے بھائی شعیب منصور کے پرانے ملازم عظمت علی کو بلا کر سلوط کو بھائی کے پاس چند ضروری ہدایات کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور خود بیوی کو لے کر انڈیا چلے گئے۔

تو یہ تھے وہ معاملات۔

واقعات یا باتیں جن سے وہ کوشش کے باوجود اسفند کو آگاہ نہ کر سکی تھی یوں بھی ایک تو بتانے کا کبھی موقع ہی نہیں مل سکا تھا دوسرے ہوا ڈھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اسے کتنا چاہنے لگا تھا۔ اس کا اندازہ بھی اسے اب ہوا تھا اور وہ خود بھی تو من مندر میں اس کی مورتی سجا کر بیٹھ گئی تھی۔

پھر بھلا کس دل اور کس منہ سے بتاتی کہ اس کی زندگی کو ایک ایسا المیہ پیش آیا ہے جس نے اس کا پورا مستقبل بھی تاریک کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ میرے سے اس کی پوری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ اور اپنی پوری کتھا بیان کرنی آسان بھی تو نہ تھی اگر وہ صرف اتنا ہی کہتی کہ انتقامی کارروائی کے نتیجے میں اس کی یہ درگت بنی ہے تو شروع سے انتقام لینے کی وجوہات بھی بیان کرنی پڑتیں۔ بھائی کے ناجائز اور غیر قانونی کاروبار پر بھی روشنی ڈالنی پڑتی اور پھر سب سے بڑھ کر اپنے بارے میں بھی بتانا پڑتا۔ جبکہ وہ خود اپنی طرف سے ہی وہ مطمئن نہیں تھی کہ سچ مچ اپنے بھائی کی سگی بہن ہے یا پھر بھائی بیوی کی اولاد کی حسرت پوری کرنے کی غرض سے اسے کسی یتیم خانے سے اٹھا کر لائے تھے۔ اور پھر کس دل سے اسفند کے اس قدر شدید اور صدیق جذبے

ہو بہاں کرتی۔ کچھ اس قدر سنجیدگی اختیار کر گئے تھے کہ بتائے بنا کوئی چارہ ہی نظر نہ آ رہا تھا۔ بلکہ اس مرتبہ تو اس نے مذاب تو حالات سوچ لیا تھا کہ وہ اماں جان (سلمیٰ بیگم) ۔ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اور پھر اماں جان اسفند کو سارے معاملات سے آگاہ کر کے اچھی طرح سمجھا بجھا بھی دیں گی کہ اس کا خیال چھوڑ دے۔ اور یوں سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی اگر اس کا جذبہ سچا ہی ہے تو اسفند میری روداد سن کر یقیناً مجھ سے کنارہ کش ہو جائے گا۔

گزشتہ روز سے مسلسل سوچتے سوچتے اسے یہی ایک کارگر تدبیر سوجھی تھی اور اگلے روز وہ اماں جان کو سب کچھ بتا دینے کا مصمم ارادہ کر کے کچھ پرسکون سی نظر آ رہی تھی کہ اس کی قسمت نے یہاں بھی اس کی سوچی سمجھی تدبیر پہ چاک پھیر دیا۔ اس روز صبح ہی صبح ملتان سے اماں جان کے بھائی کی سخت علالت کا تار موصول ہوا تو اماں جان نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً رخت سفر باندھ لیا۔ کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک ہی تو بھائی تھے ان کے۔ جو انہیں جان سے بھی ـــــ زیادہ عزیز تھے وہ پریشانی میں روتی ہوئی اسے یونہی تشنہ کام چھوڑ کر سہ پہر کی ٹرین سے ملتان سدھار گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ایک طرح سے تو وہ بالکل ہی تنہا رہ گئی تھی کیونکہ نیلما کا تو گھر میں ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ دن کے وقت تو کبھی کبھی کوثر بھی آ جاتی تھی اور نازش بھی لیکن رات کو تنہائی کا احساس بہت بڑھ جاتا تھا۔ اور وہ اتنی محتاط ہو گئی تھی کہ ہمیشہ دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر بیٹھتی تھی کہ اسفند کی طرف سے اسے اطمینان نہیں تھا کہ کب اس کا منہ اٹھے اور وہ بے دھڑک کمرے میں چلا آئے۔ کہ وہ ہمیشہ ہی اس سے بہت فری ہونے کی کوشش کرتا تھا اور بڑی بے باک طبیعت کا مالک تھا۔ کسی کی موجودگی کا خیال نہیں کرتا تھا۔ نہ کسی مصلحت کو ہی خاطر میں لاتا تھا۔

تو اب تو وہ بالکل تنہا تھی۔

اور تنہائی کا تو وہ عرصے سے خواہاں تھا۔

بس اسی وجہ سے وہ اس قدر احتیاط برتتی تھی۔

حتیٰ کہ اس سے سامنا ہونے کا امکان ہوتا تو فوراً ہی کہیں چھپ جاتی۔ تاکہ ہمیشہ کی طرح وہ اسے دیکھ کر بے قابو نہ ہو جائے۔

اگر اس سے کبھی سامنا بھی ہو جاتا تو یوں لاتعلق اور بیگانی بن جاتی جیسے کوئی واقفیت یا جان پہچان ہی نہ ہو۔ اور ادھر وہ تھا کہ اس کی ان احتیاطوں اور گریز پہ چپکے چپکے مسکراتا رہتا تھا۔

دو تین روز مزید اسی خاموشی سے گزر گئے تھے۔

اسفند بھی اسے اس قدر احتیاط اور اجتناب برتتے دیکھ کر اس سے دور دور ہی رہا تھا۔ اور یوں سلوط کو جو اس کی طرف سے بے اطمینانی اور فکر سا دامن گیر تھا وہ کسی حد تک دور ہو گیا تھا۔

شعبان المکرم کا مہینہ تھا اور شب برات کا دن۔ نازش کو چنے کی دال کا حلوہ بہت مرغوب تھا۔ لیکن جب بھی بنانے کی کوشش کرتیں کبھی دال کچی رہ جاتی کبھی مٹھاس کم۔ جب کہ فاخرہ بیگم نے سلوط کو قسم قسم کے کھانے پکانے میں طاق کر دیا تھا اور اس کی اس خوبی سے نازش بھی بخوبی واقف تھیں اور اس روز صبح ہی صبح آ کر اس خیال سے اسے اپنے ساتھ لیتے گئی تھیں کہ چنے کی دال کا حلوہ بنانے میں اس سے مدد لے سکیں۔ نیلما بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔ اور ادھر سے نازو بھی آ گئی تھی۔ کچھ دیر وہ بھی حلوہ بنانے میں نازش کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ پھر دوپہر کے کھانے کے بعد نیلما کو لے کر چلی گئی۔ مگر سلوط تقریباً تمام دن ہی قسم قسم کے حلوے بنانے اور نازش کے ساتھ ان کے عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کو حصے بھیجنے میں مصروف رہی۔ شام ہوئی تو نازش اور کوثر نے بڑے اصرار سے اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ اصل میں پروگرام تو یہ تھا کہ نازو کے گھر سے شام تک نیلما براہ راست اپنے گھر چلی جائے گی۔ بس اسی خیال سے وہ رات کے کھانے پر رکتے ہوئے

بہر حال جب رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر پہنچی تو جاتے ہی کریم نے بتایا کہ چھوٹی بی بی کو بڑی بٹیا نے اپنے پاس روک لیا ہے اور وہ آئندہ روز کسی وقت آئیں گی تو وہ بالکل تنہا رہ جانے کے خیال سے ہراساں سی ہو گئی۔ اور دل ہی دل میں پچھتانے لگی کہ کوثر کے اس قدر اسے روکنے کے باوجود وہ یہاں کیوں چلی آئی۔ جب کہ جاگنے کی رات تھی نے اس کے ساتھ مل کر عبادت کرنے کا کتنا شوق بھی ظاہر کیا تھا مگر نیلما کے ہمراہ مان جانے کے خیال سے وہ کوثر کی درخواست کو ٹھکرا کر گھر واپس آ گئی تھی — اور اب آ گئی تھی تو واپس جانا ناممکن ہی نہ تھا کہ سہیل منصور کا ڈرائیور اسے اتار کر کب کا جا چکا تھا۔ ادھر کریم بھی اسے نیلما کے رک جانے کی اطلاع دے کر بنگلے کے پہلو سے ہوتا کہیں پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ گھر پر مسلط سناٹا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ گھر میں اس وقت کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ اور یہی اطمینان کر لینے کے بعد وہ اندر داخل ہوئی تو کاریڈور عبور کر کے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اسفند کو اپنے عین مقابل فون پر کسی سے بات کرتا دیکھ

کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اور وہ جہاں تک آئی تھی وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کیونکہ اسفند نے اسے دیکھ

فون پر کسی سے بات ضرور کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں اس پر جم سی گئی تھیں اور یہ صورت حال اس کے لیے کچھ

کہ نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ الٹے پیروں واپس لوٹ جائے

کے سامنے سے گزرتی ہوئی اپنے رہائشی کمرے میں چلی جائے۔ موقع ہی کچھ ایسا نازک تھا کہ اس سے نظریں چار کرنے

پڑ رہی تھی اور ادھر وہ تھا کہ اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک سی اٹھی تھیں اور خوبصورت چہرے پر تازگی

تھی۔ اس نے اسے مزید کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا اور ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر بولا۔

”اوہو۔ آپ کہاں غائب تھیں۔“

”وہ بس۔ بھابھی دلہن آج مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں۔“ اس کا لہجہ سپاٹ ضرور تھا لیکن اندر سے بوکھلاہٹ صاف

عیاں تھی جسے اسفند محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”اچھا۔ مگر اس میں اس قدر ڈرنے یا سہمنے کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو بہت اچھا ہوا — یعنی آپ کو کم از کم تھوڑی دیر کے لیے اس گھر کی بوریت سے تو نجات مل گئی۔ پھر ڈر کس کا پڑا ہے آپ کو۔“ اور وہ اندر ہی اندر اس خیال سے دہل اٹھی کہ اسفند اس کی خوفزدہ سی کیفیت کو بھانپ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بوکھلا کر بولی۔

”نن۔ نہیں نہیں۔ میں بھلا کس سے ڈروں گی۔ میں تو — میں تو —“

”مجھ سے اور کس سے —؟“ اس نے عجیب سے انداز میں تھوڑا سا چمک کر کہا۔ تو سلوط کا دل دھک سے رہ گیا اتنی دیر میں پہلی بار نہایت غیر ارادی طور پر اس کی طرف نگاہیں اٹھیں تو اس کے چہرے پر پھیلی معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں سے اٹھتی ایک طوفانی سی لپک کو دیکھ کر نہ صرف فوراً ہی جھک گئیں بلکہ ان کی زد میں مزید کھڑا رہنا اسے دوبھر ہو گیا اور وہ اپنے رہائشی کمرے کی طرف بھاگی۔ حالانکہ وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

”ارے ارے ذرا ٹھہریں تو سلوط — یہ آپ بھاگی کہاں جا رہی ہیں — سلوط — سلوط —“ مگر اسے مزید ٹھہرنا یا سننا گوارا ہی کب تھا۔ اتنے دن سے اسے اسفند کا جو ہوا ہی تو کھائے جا رہا تھا اور کسی ایسی صورت حال کا سامنا کرنے سے تو وہ اب تک بچتی آ رہی تھی۔ اس نے تو ڈر کے مارے پلٹ کر پیچھے بھی نہیں دیکھا کہ کہیں وہ اس کے تعاقب میں نہ آ رہا ہو اور جلدی سے اپنا کمرہ کھول کر اندر گھس گئی اور پھر اندر سے کھٹکا لگا لیا۔

کمرے میں آنے کے بعد۔ اپنے پھولے ہوئے سانس اور منتشر دھڑکنوں پر قابو پانے میں بھی اسے خاصا وقت لگا۔ اور پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اس کے تعاقب میں نہیں آیا بلکہ اس کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تب اس نے لباس تبدیل کر کے وضو کیا۔ کیونکہ اس نے ابھی تک عشا کی نماز ادا نہیں کی تھی۔ اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ عشا کی نماز کے بعد ہی عبادت شروع کر دے یا پھر آدھی رات کو بیدار ہو کر تہجد کے وقت سے فجر کے وقت تک عبادت کرتی رہے جب کہ اسے سخت نیند بھی آ رہی تھی اور ادھر آدھی رات کو اٹھ کر عبادت کرنا بھی آسان نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو۔ ایسا الارم یا الارم والی گھڑی بھی موجود نہیں تھی جو مقررہ وقت پر اسے گہری نیند سے اٹھا کر بٹھا دیتی۔ دوسرے یہ آدھی رات یا رات کے پچھلے پہر میں اٹھ کر عبادت کرنا بھی کسی کار دارد سے کم نہ تھا — کہ رمضان المبارک میں بھی۔ پچھلے پہر جاگنا بھی اس کے لیے کسی مشکل ترین مسئلے سے کم نہ ہوتا تھا۔ آدھے مہینے تک بھابھی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھاتی تھیں تو افطار کا کھانا سینے پر رکھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے سحری پر بھی کچھ کھایا نہیں جاتا تھا۔ ماسوا نیند کے جھونٹے کھانے کے۔ یہی وجہ تھی رمضان المبارک کے آخری دنوں میں وہ اول وقت ہی سحری کھا کر اور روزے کی نیت کر کے ہی سو جاتی تھی۔ کوثر نے جو اتنا کہا تھا کہ دونوں مل کر عبادت کریں گی تو زیادہ لطف آئے گا تو اس کا احساس اسے اب تنہا بیٹھ کر عبادت کرنے کے خیال سے ہو رہا تھا۔ بہر کیف وہ ابھی تک کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ دفعتاً بند دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور بری طرح اچھل پڑنے کے ساتھ ساتھ دل بھی اچھل کر حلق میں آ اٹکا۔ یہ پوچھنے کی ہمت بھی نہ پڑی کہ دروازہ کس نے کھٹکھٹایا ہے۔ وہ تو جب دوسری دستک کے ساتھ کریم کی آواز سنائی دی۔

”بی بی۔ آپ کا فون آیا ہے۔“ تب حلق میں اٹکا ہوا دل تھوڑا بہت اپنی سابقہ پوزیشن میں آیا۔ اور وہ خود کو سنبھالتی ہوئی لرزتے ہاتھ سے کھٹکا گرا کر دروازہ کھولا اور لہراتی ہوئی آواز میں کریم سے پوچھا۔

”کس کا فون آیا ہے اس وقت؟“

"جی چھوٹی بی بی صاحب کا" کریم نے بتایا۔ نیلما کے فون کا سن کر اسے تعجب ضرور ہوا مگر پھر یہی سمجھی کہ نازو کے ہاں رک گئی ہے اس لیے خود اسے بتا دینا چاہ رہی ہو گی۔

اس نے لاؤنج میں پہنچ کر ریسیور اٹھایا تو نیلما اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

"ارے آپ سلوط آپا۔ تو آپ گھر پہنچ ہی گئیں" واہ۔ یہ بھی کوئی سوال تھا۔ جب کہ نیلما کو اچھی طرح معلوم تھا وہ گھر واپس آ گئی ہے۔ اس نے اس کے چند ذکر بات کرنے پر جل کر کہا۔

"ہاں ظاہر ہے پہنچ ہی گئی ہوں۔ جبھی تو تم سے بات بھی کر رہی ہوں"

"ہاں ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے" نیلما بولی۔

"تو پھر؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"ارے کچھ بھی نہیں سلوط آپا۔ وہ اصل میں تو میں نے بھائی جان کو بلایا تھا"

"اچھا اچھا تو بلا وہ مجھے لایا وہ تمہارا کریم" وہ چبھتے لہجے میں بولی۔ کہ کریم کی اس حماقت پر اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

"خیر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے میں نے آپ کے بارے میں اس سے پوچھا بھی تو تھا۔ اس لیے وہ آپ کو بلا لایا ہو گا" نیلما نے یہ کہہ کر گویا بات بنا لی۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے مگر تم تو اب کل صبح ہی آؤ گی نا" اس نے یونہی گویا برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

"نہیں کل صبح نہیں البتہ دن میں کسی وقت بھی آ جاؤں گی۔ کیا پتا شام ہی ہو جائے میری واپسی میں" نیلما ہنس کر بولی اور پھر فوراً ہی پوچھا۔

"مگر یہ بھائی جان کہاں ہیں؟" اور اسفند کا ذکر آتے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بہت سوچ سمجھ کر بولی۔

"کیا کریم سے تم نے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں ہاں پوچھا تو تھا مگر وہ ان کے بجائے آپ کو بلا لایا" نیلما نے ہنس کر کہا۔ وہ جواب میں خاموش ہی رہی۔

"تعجب ہے اس وقت بھائی جان کہاں چلے گئے۔ جبکہ یہ وقت تو ان کے آرام کرنے کا ہے" نیلما خود ہی بولی۔

"اب مجھے کیا معلوم" وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی بولی۔ مبادا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہو۔

"افوہ، یہ تو بہت برا ہوا" نیلما نے کہا۔

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی بھائی جان کا اس وقت غائب ہو جانا۔ جب کہ کریم تو کہہ رہا تھا کہ وہ گھر پر ہی موجود ہیں مگر وہ یقیناً کہیں نکل ہی گئے ہوں گے تبھی تو وہ ان کے بجائے آپ کو بلا لایا" نیلما بولی۔

"ہاں ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر تمہیں ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے ان کی" نیلما کو بار بار اسفند کا نام لیتے دیکھ کر وہ بھی متجسس ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"ارے وہ اپیا کی ساس نسرین آنٹی ہیں نا ان کے ایک کزن کیمبرج میں بھائی جان کے کولیگ تھے۔ وہ آج کل انہی کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور بھائی جان سے ملنے کو بے تاب ہیں" نیلما نے بار بار بھائی کو پوچھنے کا اصل سبب بتایا۔ وہ رائے دینے کے انداز میں بولی۔

"مگر ایسی جلدی کیا ہے۔ وہ صاحب تو کل بھی کسی وقت مل سکتے ہیں تمہارے بھائی جان سے"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ صبح کی فلائٹ سے یو کے واپس جا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے وقت ہی کہاں ہے ان کے پاس" نیلما نے کہا اور پھر شاید نازو کے استفسار پر اسے بتانے لگی کہ اسفند گھر پر نہیں ہیں اور وہ اس سے باتیں کر رہی ہے۔

"اچھا سلوط آپا۔ آپ ایسا کریں کہ اگر بھائی جان ابھی آ جائیں تو ان سے کہہ دیں کہ فوراً ہی مجھے فون کر لیں۔ پلیز کریں گی نا" نیلما پھر اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ اف پھر وہی اسفند کا ذکر۔ وہ بھلا کیوں کر ہامی بھر لیتی۔ جب کہ بات تو کجا وہ اس کے سامنے پڑنے سے بھی کترا تی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اگر ان سے نہ کہہ سکی تو کریم سے بتاکید یہ ضرور کہہ دوں گی کہ تمہارے بھائی جان کے آتے ہی وہ ان تک فوراً تمہارا پیغام پہنچا دے" اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنا پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ دین سو لانگ" نیلما نے اچھا کو اس طرح کھینچ کر کہا جیسے اس کے جواب سے اس کی تشفی نہ ہوئی ہو اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

[illegible] اس نے رات کو اپنے نازو کے ہاں قیام کرنے یا اس کے تنہا رہ جانے پر اشارتاً بھی کچھ نہ کہا تھا۔ دوسرے [illegible] وہاں [illegible] نے [illegible] لی تھی جو نیلما کو اس سے باتیں کرتا دیکھ کر بیزاری کا اظہار کر رہی تھی۔ نازو کچھ فطرتاً بھی دوسری [illegible] اس نے [illegible] کی مالک تھی۔ وہ اپنے بڑے سے بات کرنے کی عادی تھی۔ وہ بھی صرف اس کے ساتھ ورنہ اس کے تمام ملنے [illegible] اس کے خلوص و اخلاق کے گن گاتے ہی نظر آتے تھے اور نیلما کی عادت سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی جو بلا [illegible] طرف جھکا دیتی اسی طرف جھک جاتی تھی۔ اس لیے وہ ان سب سے اس قدر معذرانہ اور کہ [illegible] کھرے سلوک [illegible] بھی۔ البتہ ان کی بے اعتنائی کا اس حد تک شکار ہو جانے اور اپنی ناقدری پر اسے بہت افسوس تھا۔ اور اس [illegible] وہ کچھ ایسا ہی دل گرفتہ سا احساس لیے اپنے کمرے میں داخل ہوتی اور اسی احساس میں گھرے گھرے دروازے کا کھٹکا [illegible] دل یوں دھک سے رہ گیا جیسے چلتے چلتے یکلخت کہیں اٹک گیا ہو اور خون رگوں میں منجمد سا ہونے لگا۔ کیونکہ سامنے [illegible] کمرے کے عین وسط میں سفید پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس اسفند کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب [illegible] اور چہرے پر خشونت۔

"آ۔ آپ [illegible] وہ اس کے اس بری طرح گھورنے پر سفید پڑتی ہوئی صرف اس قدر ہی کہہ سکی۔

"ہاں میں۔ کیوں کیا مجھے شناخت کرنے میں کچھ دشواری ہو رہی ہے آپ کو" اس کی آنکھوں سے ہویدا کاٹ اس کے لہجے میں اتر آئی۔

"نن۔ نہیں تو" وہ ہکلا کر بولی۔

"نہیں تو اور ہاں تو سے کیا مطلب ہے آپ کا۔ آخر آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کوئی غنڈہ، ڈکیت یا آدم خور جو بلا چبائے ہی آپ کو ثابت نگل جاؤں گا" وہ بگڑے بگڑے تیور لیے بولا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں" وہ لہراتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

"تو پھر کیا بات ہے آخر۔ مجھے دیکھ کر یہ ایک دم ہی آپ کا خوف سے ہاتھ ہو جانا یوں گھبرا اٹھنا جیسے کسی جن بھوت یا غیر مرئی شے کو دیکھ لیا ہو۔ آخر۔ آپ کی ان باتوں سے میں کیا مطلب لوں؟ اور خود کو کیا سمجھوں؟" وہ ایک جذب کے عالم میں قدم بڑھا کر اس کے نزدیک آ گیا۔

"مم۔ میں کیا بتاؤں" اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔

"آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق سکھانے آیا ہوں جسے آپ تمام عمر یاد رکھیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور سارے میں اسی کمرے میں آپ کے ساتھ [illegible] گزاروں گا" اف وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ گویا جس بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اب اس کا سابقہ پڑنے والا تھا۔ [illegible] خطرے سے اب تک خود کو بچاتی آئی تھی وہ بالآخر سر پر منڈلانے ہی لگا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت سے کام لے کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ مجھے کچھ بھی سیکھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے چلے جائیے"

"[illegible] کے لیے نہیں آیا بلکہ تم پر یہ ثابت کرنے آیا ہوں کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں۔ تمہارے لیے یہی [illegible] ہو گا کہ تم بے فکر ہو کر بستر پر لیٹ جاؤ۔ آپ سے ایک دم تم پر اتر آنا اور اتنی دھاندلی سے بات کرنا" اف وہی درانی صاحب سے ملتا جلتا لہجہ اور الفاظ۔ ایسے یوں۔ محسوس ہوا کہ جیسے تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے پر تلی ہو۔ [illegible] تاریخ میں جو زندگی کے ایک تلخ ترین تجربے سے دوچار ہوتے ہوئے رقم کی گئی تھی۔ اور اس تاریخ [illegible] [illegible] زمین و آسمان کا بعد تھا۔

[illegible] تاریخ نہیں کھلی [illegible] اور بتایا [illegible]۔

[illegible] اپنی عزت [illegible] عزیز تھی۔

[illegible] بچانے کی خاطر وہ [illegible] پر [illegible] تھی۔

[illegible] خشک ہوتے ہوئے یکلخت خیال سی آ گئی تھی۔

اور وہ اپنی ساری عزت، ہمت اور حوصلہ مجتمع کر کے قہر آلود لہجے میں بولی۔

"نہیں نہیں، میں مر کر بھی آپ کو اپنی بے بسی اور تنہائی سے فائدہ اٹھانے نہیں دوں گی۔ مجھے آپ۔۔۔ اگر آپ کے اندر ذرا سی بھی حمیت اور شرافت ہے تو آپ یہاں سے چلے جائیے۔ آپ کے ناجائز مطالبات پورے کرنے کے لیے ایک دنیا پڑی ہے۔" اور اس کی بات یا بدگمانی پر وہ یوں اچھلا جیسے اس نے ننگے برقی تار پر پیر رکھ دیا ہو۔ پھر سلگتے اور کھولتے ہوئے وجود کے ساتھ سختی سے اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو سلوط۔ کیا یہ مطلب اخذ کیا ہے تم نے اس وقت میری آمد سے۔ کس قدر زنگ آلود ذہنیت ہے تمہاری۔ کتنی بدگمان اور کوتاہ نظر ہو تم۔ کاش میری زندگی میں داخل ہونے سے پہلے ہی تم مجھ پر اپنے ان مفلوج خیالات کا اظہار کر دیتیں تو میں تمہارے تصور کو کبھی اپنے پاس بھی پھٹکنے نہ دیتا۔ یعنی حد ہو گئی۔ بیچ پن کی بھی جو تم مجھ پر یقین رکھتیں کہ میں تمہاری اس کچی کلی جیسے بدن پر شب خون مارنے کی نیت سے آیا ہوں۔ جب کہ میں تو تمہیں دوسروں پر اعتماد کرنے کا سبق دینے آیا تھا۔۔۔ کہ تمہاری بے اعتمادی نے مجھ سے میری شناخت ہی نہیں چھین لی تھی بلکہ مجھے خود اپنی نظروں میں گرا کر رکھ دیا۔ ہٹو میرے راستے سے یو ایڈیٹ۔ اور آئندہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔" اس پر ملامت کے سائے ڈالتے ہوئے اس کا رخ دروازے کی ایک طرف دھکیلتا کھٹکا کھول کر باہر نکل گیا اور سلوط پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ گڑ جانے کے سے انداز میں اسی جگہ کھڑی ندامت اور تاسف سے سوچتی رہ گئی۔

اُف بدگمانی اور پست خیالی کی بھی تو انتہا کر دی تھی میں نے۔ کہ اسے بھی ایک عام اور اخلاقی سطح سے گرے ہوئے مردوں کے زمرے میں شامل کر لیا تھا۔ ورنہ آخر کو وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد ہے۔ سب سے بڑھ کر ایک ذمے دارانہ منصب سنبھالے ہوئے ہے۔ میں یہ کیوں بھول گئی تھی کہ اس کا واسطہ ایک سے ایک بڑھ کر حسین اور طرح دار لڑکیوں سے پڑ چکا ہے جو اس کی ہم مکتب رہ چکی ہیں اور اپنے پیشے کی وجہ سے اب بھی پڑتا رہتا ہے وہ اگر بدکردار اور عیاش ہوتا تو اتنی پابندی سے گھر میں نظر نہ آتا جیسے کہ اس نے اپنے آنے اور جانے کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں بلکہ باقاعدہ اصول باندھ رکھے ہیں۔

اُف۔ پچھتاوا۔ ندامت۔ کھسیاہٹ اور ملامت سب ہی تو اس پر ٹوٹ پڑ رہی تھی۔

جانے کب کے رُکے اشک پرنالوں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ اور جانے کتنی دیر اور کب تک وہ اشکوں کے دریا بہاتی اپنے اعتماد کے کھوکھلے پن کا غم کرتی رہی۔ پھر جانے کب بستر پر لیٹی اور کب سوئی۔ کہ عشا کی نماز ادا کرنی یاد رہی نہ عبادت کرنے کا خیال ہی آیا۔ اگر کچھ احساس باقی رہا تو بس اس کے روٹھ جانے کا۔

وہ سچ مچ ہی اس کی بے اعتمادی کے مظاہرے پر اس سے حد درجہ بددل اور بدظن ہو گیا تھا۔ جو دو تین روز تک تو گھر میں ہی نہیں آیا تھا اور جو آیا بھی تھا تو اس روز جس دن اس کے والدین اور بہن عمرہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ آدھے یورپ اور ایک تہائی مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت سے واپس آئے تھے۔ اس روز گھر میں اتنی چہل پہل اور رونق تھی کہ اپنے بارے میں اس کے تاثرات کا پتا چلانا ممکن ہی نہیں تھا اور ایک آدھ بار اگر سامنا بھی ہوا تھا تو وہ اسے اس طرح نظرانداز کر گیا تھا جیسے اس کا کوئی وجود کوئی حقیقت ہی نہ ہو اور وہ بظاہر دل میں تو یہی سوچتی کہ چلو یہی میرے لیے غنیمت ہی ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ اس طرح کم از کم میں اس کے پاگل پن کا نشانہ تو نہیں بنوں گی۔۔۔ کہ وہ اس کے اس خواہ مخواہ کے رویے کو اس کی دیوانگی پر محمول کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اسے دیکھ کر بے قابو سا ہو جاتا تھا۔ پھر وہ موقع دیکھتا نہ محل۔ بلکہ کسی نزاکت کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا اور اسی لیے وہ اس کے روٹھ جانے پر بھی تشکر بھیجتی تھی۔ مگر اندر ہی اندر بڑی بے کل اور مضطرب سی رہتی تھی۔

ہر شے اسے پھیکی اور بے کیف لگتی تھی۔

اور ہر چیز سے اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے جھل جھل کرتے چراغوں کی روشنیاں ماند پڑ گئی ہوں۔

اردگرد کوئی احساس ہی باقی نہ رہا ہو۔

پوری کائنات ہی بے رنگ ہو گئی ہو۔

اور ساری دنیا اس سے روٹھ گئی ہو۔

مگر ایسے احساسات کو تو اس نے خود سے بھی چھپا کر کہیں گھونٹ کر رکھا تھا۔ اور پھر وہ بچہ تو نہ تھی۔ بلکہ پوری مقصدیت کے ساتھ جائز اور ناجائز کے فرق کو سمجھتی تھی۔ اور زندگی کے تلخ تجربات کی بھٹی میں تپ تپ کر بڑی پختہ اور ناقابلِ تسخیر ہو گئی تھی۔

وہ تو اپنا سارا کچا چٹھا ساری حقیقت اس کے سامنے کھول دینے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ مگر ہائے قسمت کہ موقع اس کی گرفت میں آ کر بھی ہمیشہ چھٹ ہی جاتا تھا۔ اور رجگے کی رات میں تو موقع ہاتھ میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس روز تو اعتماد کے کھوکھلے پن نے اُلٹا اسے ہی فگار کر کے رکھ دیا تھا۔

شعیب منصور، زینت اور نیلوفر چونکہ عمرہ ادا کر کے آئے تھے اس لیے ایک ہفتے تک تو مبارک باد دینے والوں کی آمد و رفت اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ اور اگر رمضان کا متبرک مہینہ شروع نہ ہو جاتا تو یہ سلسلہ شاید مہینوں جاری رہتا کیونکہ عزیز و اقارب کے علاوہ شعیب منصور کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔

اس روز شعبان المکرم کی انتیسویں تاریخ تھی۔ رمضان المبارک اور بالخصوص عیدین کے چاند تو قسمت سے ہی اہلیانِ کراچی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے نصیب ہوتے ہیں کہ مغربی اُفق پر گہرے بادلوں کی تہہ کچھ اس طرح جم جاتی ہے کہ اگلے دن ہی جا کر چھٹتی ہے اور اہلیانِ کراچی کو بیشتر اوقات باسی چاند ہی دیکھنا میسر ہوتا ہے۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا تھا کہ بادلوں کی دبیز تہہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی رمضان المبارک کے چاند کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھنے سے سب محروم ہی رہے تھے۔ اور دستور کے مطابق کہیں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جا کر ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے چاند دیکھے جانے کی اطلاع ملی تھی۔ تو سڑکوں اور بازاروں میں خرید و فروخت کرنے والوں کا ایک اژدہام سا پھوٹ نکلا تھا۔ لیکن شعیب منصور کے گھر میں اگر کچھ گہما گہمی نظر آ رہی تھی تو وہ باورچی خانے میں کہ یوں بھی اس وقت رات کا کھانا تناول کیا جا رہا تھا اور زینت سحری کے لیے تیار کیے جانے والے کھانے کی ہدایات خانساماں کو دینے کی غرض سے سب سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں بھئی اصل بات تو میں تم لوگوں سے باتیں کرنے میں بھول ہی گئی اور ادھر وہ بے چارا خانساماں بھی انتظار میں سوکھ رہا ہو گا۔ یہ بتاؤ کہ کون کون روزہ رکھے گا؟"

"کون کون سے کیا مراد۔۔۔ سبھی رکھیں گے ممی۔" اسفند بولا۔

"لیکن تمہاری ممی کو تو اس وقت بھی تھوڑی بہت حرارت ہو گی۔ یہ بے چاری تو روزہ رکھنے سے قاصر ہی ہوں گی۔" شعیب منصور نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"خیر میرا مذاق تو نہ اُڑائیں۔ نماز روزہ ہو یا عبادت اس کا تعلق ڈائریکٹ خدا سے ہوتا ہے لہٰذا میرے اعمال جانیں اور میں جانوں۔" زینت میاں کی بات پر چڑ کر بولیں۔

"لیکن ممی دو روز قبل ہی تو آپ کا بخار اترا ہے پھر آپ کیسے روزہ رکھ سکتی ہیں۔" نیلوفر ماں کی حمایت میں بولی۔

"تم اپنی سناؤ تم بھی روزہ رکھو گی یا تمہیں بھی کوئی عذر لاحق ہے۔" اسفند نے نیلوفر سے پوچھا۔ تو نیلما ہنستی ہوئی پلیٹ پر جھک گئی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے نیلما مجھ میں اتنا اسٹیمنا ہی کہاں ہے جو میں روزہ رکھ سکوں۔ پہلے ہی اتنی ویک اور کمزور ہو رہی ہوں۔" بہن کے ہنسنے پر نیلوفر برا مان کر بولی۔

"چلو تو پھر روزہ رکھنے کو رہ ہی کون گیا سوائے میرے، سنی اور نیلما کے۔" شعیب منصور ہنس کر بولے۔

"لیکن ڈیڈی۔ نماز کی طرح روزہ بھی بندے پر فرض کیا گیا ہے۔ اور پھر تزکیۂ نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ اور والدین پر یہ فرض اور ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اگر اپنی کسی مجبوری کے تحت وہ خود روزہ نہ رکھ سکیں تو اپنی اولاد اور جو بھی ان کی سرپرستی اور اختیار میں ہوں اسے زبردستی روزہ رکھوائیں بلکہ مذہباً تو اس کے لیے سختی اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔" اسفند بولا۔

"مگر میں سختی اور جبر کرنے کے حق میں بالکل نہیں ہوں سنی۔" شعیب منصور نے جواب میں کہا اور اس موضوع کو ٹالنے کی غرض سے سلوط سے مخاطب ہو کر پوچھا جو نہایت خاموش اور لاتعلق سی کھانا کھا رہی تھی۔

"ارے تم بھی کچھ بتاؤ سلوط بیٹی کہ تمہارے کیا ارادے ہیں۔ روزے تو تم بھی رکھتی ہو گی نا۔"

"جی ہاں، بلکہ پورے روزے رکھتی ہوں منجھلے ابا۔" سلوط اچانک مخاطب کیے جانے پر چونک کر بولی۔

"واہ۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے ورنہ ہمارے تو زیادہ تر گنڈے دار ہی ہوتے ہیں۔" گنڈے دارے ان کی مراد چند ایک روزے چھوڑ چھوڑ کر رکھنے سے تھی۔

"لیکن منجھلے ابا! سال بھر میں صرف انتیس تیس روز ہی تو میسر ہوتے ہیں۔ خدا کے عائد کردہ ایک فرض کے لیے یعنی تین سو پینسٹھ دنوں میں سے صرف تیس دن۔ اور پھر اس فرض کو قضا کر دینے کی معافی بھی تو نہیں اور مرض کے عذر کے ساتھ بعد میں پورے کر دینے کا حکم عائد کیا گیا ہے۔"

"واہ۔ جزاک اللہ۔ بڑی ہمت والی بچی ہو تم بھی۔" شعیب منصور نے جھینپ کر کہا۔

"چلیں پھر تو سلوط آپا کی وجہ سے سحری بھی بڑی ٹھاٹھ دار مل جایا کرے گی روزے داروں کو" نیلما چہک کر بولی۔

"کیوں ان پر ہی کیوں موقوف ہو گا سب کچھ۔ جوان بہنوں کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو دوسروں کا مرہون منت نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نیلوفر تیار کیا کریں گی سحری اور افطاری۔" اس نے اصل میں تو اس کی طرف داری میں کہا تھا مگر اس کی بات کو اس کی خفگی کا ہی ایک اظہار سمجھی۔

"ہا ہا نیلوفر آپا کو تو دیگچی میں چمچہ بھی چلانا نہیں آتا۔ کچھ پکانا تو بڑی بات۔" نیلما مسکرا کر بولی۔

"نہیں آتا تو سیکھ جائیں گی۔ مگر آج سے پورے رمضان یہی سحری پر اٹھیں گی اور روزے بھی رکھیں گی۔" اسفند یار ہی پینترہ بدل کر تند و تیز لہجے میں بولا۔ نیلوفر نے تلملا کر پہلے باپ کی طرف اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔ تو زینت فوراً ہی بولیں۔

"ارے لو۔ اصل بات تو پھر وہیں کی وہیں رہ گئی۔ بھئی، اگر چار آدمی بھی روزہ رکھیں گے تو کھائیں گے کیا۔ تاکہ میں خانساماں سے کہہ کر وہی تیار کرا دوں۔"

"ارے بیگم یہ جو اتنا کچھ تیار ہوا رکھا ہے یہی کیا کم ہے جو مزید فرمائشی کھانا پکوایا جائے۔ البتہ کھجلے یا پھینیوں کا انتظام ضرور کرا دیجیے۔"

"جی ہاں اور اس کے ساتھ میرے لیے دو انڈے بھی ابلوا لیجیے۔ میں تو ڈبل روٹی کے سلائس اور مکھن ہی کھاؤں گی۔" نیلما بولی۔

"اور تم کیا کھاؤ گی سلوط۔" شعیب منصور نے سلوط کا دل رکھنے کی غرض سے پوچھا۔

"میں تو سرے سے سحری کھانے کی عادی ہی نہیں ہوں منجھلے ابا۔ بس اس وقت جو کھا لیا ہے اسی پر روزے کی نیت کر کے سو جاؤں گی۔"

"نہیں اب اس قدر تکلف سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں سلوط۔ اگر تمہارا یہی معمول رہا تو عید تک یقیناً سوکھ کر کانٹا ہو جاؤ گی۔"

شعیب منصور نے کہا تو سلوط ہنستی ہوئی بولی۔

"نہیں نہیں منجھلے ابا۔ میں تو عرصے سے اسی معمول پر چلتی آ رہی ہوں۔ سحری اس لیے نہیں کھاتی کہ یا تو رات کا کھانا سینے پر رکھا رہتا ہے۔ یا پھر سحری پر کھایا ہوا تمام دن روزے کو مکروہ کرنے کا باعث بنا رہتا ہے۔"

کتنی خوبصورت ہنسی تھی۔ یوں بھی پہلی بار اسے ہنستے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ سادگی کبیدگی بھول سا اسے تکتا رہ گیا۔ جب کہ اس کے سحری پر نہ اٹھنے کی عادت کا سن کر وہ بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ کسر نفسی سے کام لے رہی ہے۔ اس کے سحری کے وقت نہ اٹھنے پر اس پر کوئی معترض ہوا تھا نہ اس سے شاکی ہی تھا ماسوا نیلوفر کے۔ جسے مخفی کی خفگی کے ڈر سے نہ چاہتے ہوئے بھی رات کے پچھلے پہر اپنی میٹھی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا پڑتا تھا۔ نماز۔ وہ ضرور پڑھتی تھی مگر صرف فجر اور مغرب کی لیکن سلوط کو اچھی طرح معلوم تھا کہ چکھنے کے سے انداز میں سو سو نخرے کر کے جو سحری کھائی جاتی ہے تو اس کا افطار عموماً دوپہر کو چپکے چپکے اپنے کمرے میں ہی ہوتا ہے اور باپ اور بھائی پر یہی ظاہر کیا جاتا ہے روزہ سے ہے۔ اور اسے یہ بات نیلما نے بہت ہنس ہنس کر بتائی تھی۔ بھلا ایسے روزے اور نماز سے فائدہ ہی کیا تھا جو بندے کے ڈر سے ادا کیا جا رہا تھا۔ کاش انسان اپنے خدا سے اس حد تک ہی ڈر لے تو اس کی رحمت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ ہو۔ وہ بڑے تاسف سے اکثر سوچتی۔ مگر اس کے افسوس کرنے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ وہاں تو پوری نہ پہلی نہ ادھی...

نظر آتی تھی۔

...بے بہرہ اور غافل ... رمضان کے متبرک مہینے میں انڈور اور آؤٹ ڈور گیمز۔ ڈیک پر گانے سننے۔ ... وی سی آر پر فلمیں دیکھنی اور فالتو باتوں میں وقت گنوانا۔ ... بھلا کیا فرق باقی رہ جاتا ہے عام دنوں اور رمضان کے دنوں میں۔ جب کہ رمضان کا مہینہ تو بڑی خیر و برکت اور ... والا ہوتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل انتہائی متبرک اور اہم ہوتا ہے۔ اب یہ بھی نہیں کہ انسان اپنے سارے ... چھوڑ کر ہر وقت تسبیح اور مصلا سنبھالے بیٹھا رہے۔ لیکن کم از کم اس کا اتنا احترام تو کرے کہ شیطانی اور فضول کاموں سے ... کرے۔ یعنی وی سی آر نہ دیکھے۔ گانے نہ سنے۔ کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ وہی کام انجام دے جو زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ عبادت نہ کرے تو کم از کم روزے نماز کی پابندی تو کر لیا کرے۔ صرف اور صرف تین سو پینسٹھ دن میں تیس روز۔ تاکہ اس برکتوں والے اور مقدس مہینے کی حرمت تو برقرار رہے۔ اس کی اہمیت کا دوسروں کو تو احساس ہو۔ مگر یہ سارے آداب اور مذہب سے پوری طرح اپنی اولاد کو روشناس کرانے کی ذمہ داری تو والدین پر ہی عائد ہوتی ہے اس لیے قصوروار والدین کو ہی گردانا جاتا ہے۔

شعیب منصور کے ہاں نمازیں بھی ادا کی جاتی تھیں اور روزے بھی رکھے جاتے تھے۔ میلاد اور قرآن خوانیاں بھی ہوتی تھیں اور منتیں بھی اٹھائی جاتی تھیں مگر بالکل اس طرح جیسے رسم دنیا نبھائی جا رہی ہو۔ یا پھر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا جا رہا ہو۔ کچھ یہی دستور سہیل منصور کے یہاں بھی تھا۔ نازش اور کوثر موقع موقع سے نماز پڑھتی تھیں اور اسی طرح سے انگلی کٹا کر شہیدوں میں شریک ہونے کے مصداق دنیا دکھاوے کو روزے بھی رکھ لیتی تھیں۔ لیکن سہیل منصور نماز پڑھتے تھے نہ روزے ہی رکھتے تھے۔ پھر ایسے والدین اپنی اولاد کو مذہب سے روشناس کرانے کے قابل ہی کہاں ہوتے ہیں جو ان کی اولاد ان نزاکتوں اور حرمت کو کیسے جان سکتی ہے۔ جو ایمان کا جزو لازم ہوتی ہیں۔

مگر اسفند نے تو پرورش ہی ایسی گود میں پائی تھی کہ پورے پانچ برس انگلینڈ جیسے ترقی کے عروج کو پہنچے ہوئے ملک میں جہاں اخلاقی اقدار صرف آداب مجلس نشست و برخاست اور گفت و شنید تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ باقی تو اخلاق کے نام پر سب کچھ ہی روا ہے۔ گزارنے کے باوجود اس کے خیالات اور نظریات میں کجی نہیں آئی تھی۔ وہ روزے بھی پورے رکھتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ پنج وقتہ نماز بھی ادا کرتا تھا اور بڑی پابندی سے اپنی ڈیوٹی بھی انجام دیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ عام دنوں میں صرف فجر کی نمازیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ صبح نور کے تڑکے اٹھ جانے کا عادی تھا۔

آخری عشرے میں دونوں لڑکیاں نیلوفر اور نیلما اپنا اپنا فطری عذر پیش کر کے روزے نماز سے بری الذمہ ہو گئی تھیں۔ اور زینت چونکہ ان دنوں روزے رکھ رہی تھیں۔ اس لیے ان کا مزاج درہم برہم سا رہتا تھا۔ اصل میں تو انہیں روزہ بہت لگتا تھا۔ اور سحری کے وقت اٹھ کر میاں اور بیٹے کو سحری کھلوانا اور خود کھانا دوبھر۔ کیونکہ نیا خانساماں سحری کے وقت نہیں آتا تھا۔ اس لیے کھانا تو اول وقت ہی پکوا کر رکھتی تو شے دان میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اور کریم صرف اوپر کے کام ہی کرتا تھا۔ اسی لیے زینت کو بہت دقت اٹھانی پڑتی تھی جس کا اظہار وہ افطار اور کھانے کے موقعوں پر کر چکی تھیں۔ جبکہ افطاری کا اہتمام سلوط ہی کرتی تھی۔ اور ایسی ایسی خوش ذائقہ اور ... چیزیں بناتی تھی کہ شعیب منصور تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ بہرحال زینت کے بار بار جتانے کی وجہ سے اس نے بھی سحری کے وقت ... شروع کر دیا تھا۔ اور وہ زینت کو زحمت دیے بغیر سارے کام جلد جلد نمٹا لیتی تھی۔ اور یوں وہ جو اسفند کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی تھی۔ اس صورتحال نے گویا اسے اس کے بالکل سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ کہ افطار کے وقت تو روزے کے توڑ اور ایک ہولا جولی کا وقت ہوتا تھا۔ سب کی نظریں وال کلاک پر لگی رہتیں کہ کب سائرن بجے اور کب روزہ کھلے۔ اس لیے کسی سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور وہ تو بڑی سنجیدگی سے اس سے روٹھا تھا۔ جو آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ اور وہ بھی دانستہ اس کی موجودگی

کو نظرانداز کیے رہتی لیکن سحری کے وقت اُسے نظرانداز کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کیونکہ زینت کہتیں۔ "بابا سے پوچھ لو کیا کھائیں گے۔ یا پئیں گے۔" یا پھر کہتیں۔ "ان کے لیے جلدی سے دو انڈے اُبال کر لے آؤ۔ میں تو اگر سحری پر انڈے کھا لیتی ہوں تو پیٹ میں ایسی ہیں کہ دوپہر تک کھٹی کھٹی ڈکاریں آتی رہتی ہیں۔ یہ تمہارے منجھلے ابا تو سرے سے انڈے کھاتے ہی نہیں۔" تب اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے پوچھنا پڑتا تھا۔ یا اسے کوئی نہ کوئی چیز آفر کرنی پڑتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قصور سارا اسلوط کی ذہنیت اور بے اعتمادی کا تھا۔ لیکن وہ بہت غیور اور خوددار تھی۔ وہ اسی کی ایک غلطی کی وجہ سے اس سے خفا ہو گیا تھا۔ تو وہ اس سے بات کرنے میں اپنی کو اپنی گراوٹ تصور کرتی تھی۔ کہ یوں بھی اس نے کسی کے آگے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔ اور اس نے تو ناراضگی کی حد کر دی تھی۔ کہ مہینوں سے رہا تھا۔ اور اس کی خفگی دور نہیں ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے جو کہا تھا کہ آئندہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنا تو وہ ایسا ہی کر کے اس کو یہی جتانا چاہ رہا تھا کہ وہ ہر تعلق کو توڑ چکا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ وہ اپنے طور پر تو اس کی اس ناراضگی یا لاتعلقی کو نعمت ہی سمجھتی تھی۔ کہ اس طرح کم از کم اس کی دیوانگی سے تو بچی ہوئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اسے اپنے اور اس کے درمیان حائل مجبوریوں اور پابندیوں کا بھی شدت سے احساس تھا۔ اور بس یہی احساس اس کی طرف مائل ہونے سے روک دیتا تھا۔ ورنہ اس کی ناراضگی تو اس کے لیے سوہانِ روح بن چکی تھی۔ اور اس وقت تو اسے بڑی ہی کوفت ہوتی جب زینت کے کہنے پر وہ اس سے پوچھتی کہ اسے کیا چاہیے مطلوب ہے۔ اور وہ اسے جواب دینے کے بجائے ماں کو مخاطب کر کے بس فلاں چیز کافی ہوگی یا پھر انکار کر دیتا تھا۔

روزے تو باقاعدگی سے وہ رکھ رہی تھی یا پھر اسفند ـــ ورنہ زینت سمیت کسی کو بھی دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ رمضان کا مہینہ ہے۔ نیلما تو خیر کالج بھی جاتی تھی۔ مگر نیلوفر ـــ اپنی کار لے کر زیادہ تر گھومتی ہی پھرتی تھی۔ یا پھر گھر میں رہتی تو ڈیک پر ویسٹرن میوزک سنتی رہتی۔ یا وی سی آر پر فلمیں دیکھتی رہتی۔ کالج سے آنے کے بعد نیلما بھی کچھ ایسے ہی مشاغل میں مصروف ہو جاتی۔ البتہ اگر روزہ ہوتا تو آتے ہی پڑ کر سو جاتی تھی۔ عید کی بڑے جوش و خروش بلکہ اہتمام سے منانے کی تیاریاں نصف رمضان سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ زینت کا زیادہ وقت خریداری میں ہی گزرتا تھا۔ لباس تو اسی کپڑے کے سلوائے گئے تھے جو زینت اور نیلوفر باہر سے لائی تھیں۔ اور ایک نہیں کئی کئی سوٹ سلوائے گئے تھے۔ شادی کے بعد پہلی عید آئی تھی اس لیے ناز پر اور احمد سروش بلکہ نازو کی ساس کے بھی کپڑے تیار کرائے گئے تھے۔ ڈائمنڈ کا ایک بھاری سیٹ وہ نازو کے لیے باہر سے لائی تھیں اور طلائی جڑاؤ سیٹ کراچی میں بنوایا تھا۔ بیٹی اور داماد کی عیدی جا رہی تھی۔ اس لیے بیٹی کے لیے زیورات کے دو سیٹوں کے علاوہ۔ پانچ عدد جوڑے اور جوڑوں سے میچ کرتے پرس اور جوتیاں اور درجنوں کانچ کی چوڑیاں ـــ پانچ کلو مٹھائی ـــ ٹوکرہ بھر پھل ـــ سیروں سوئیاں ـــ چھوہارے چینی ـــ دودھ کے اکیاون روپے اور خشک میوہ علاوہ ازیں احمد سروش کے لیے دو گرم سوٹ ـــ دو شلوار اور آڑا پاجامہ سوٹ۔ شیروانی ـــ شیروانی کے اشرفیوں کے بٹن ـــ طلائی کف لنکس ـــ شیونگ کا بڑا سیٹ ـــ سینٹ اسپرے ـــ سلیم شاہی ـــ مردانہ سینڈل اور بوٹ ـــ حتیٰ کہ بنیان ـــ رومال اور ازار بند تک اس عیدی میں شامل تھے۔ بلکہ نازو کے ساس سسر اور نندوں کے سوٹ اور تحائف بھی ـــ گویا دوسرے معنوں میں جہیز اور چڑھاوے کا سامان تھا سارا اوٹا تر تھا اس لیے بڑے دھڑلے سے نئی چیزوں کا اضافہ کر کے بیٹی کے میکے والوں کی دھاک سسرال والوں پر بٹھائی جا رہی تھی۔ بس روپے پیسے کا کھیل تھا سارا۔ مثل تھی کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا اور جہاں تک گڑ ڈالنے کا سوال تھا۔ بڑے زور و شور سے عید ـــ منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ اور سجاوٹ کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ ایک ڈیکوریٹنگ کمپنی سے بھی رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ ادھر نازش اور کوثر بھی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ اور یوں رمضان المبارک کا متبرک مہینہ بالآخر اختتام پذیر ہوا۔

چاند والے روز بھی ـــ تلاش بسیار کے باوجود بھی عید کا چاند نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ لوگ ایک روزہ بڑھ جانے کا غم کر رہے تھے۔ اور کچھ لوگ بوڑھی عید منانے پر بیزاری کا اظہار ـــ کہ وہی مطلع کے ابر آلود ہو جانے کا پرانا مسئلہ پیش آ رہا تھا۔ لیکن جب کچھ ہی دیر بعد ریڈیو اور ٹی وی سے دوسرے شہروں میں چاند دیکھے جانے کی خبر کے ساتھ ساتھ اگلے روز عید ہو جانے کا اعلان ہوا تو پوری کراچی میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لوگ باگ خریداری کے لیے برساتی چیونٹیوں کی طرح گھروں سے نکل کر سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں بکھر گئے۔ اور یوں عید کے استقبال میں دوکانداروں کے ساتھ ساتھ ٹیکسی اور رکشہ والوں کی بھی چاندی ہو گئی۔ اور جو لوگ گھروں میں رہ گئے۔ وہ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

یہ چاند رات کو خریداری بھی ایک ریت سی بن گئی ہے کہ جو لوگ شروع رمضان یا بیچ رمضان عید کی ساری تیاری کر بھی بیٹھتے ہیں۔ وہ بھی چاند رات کو کوئی نہ کوئی چیز خریدنے نکلتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چاند رات کی خریداری کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تو یہ بھی کہتے سُنا گیا ہے کہ چاند رات کو کچھ نہیں خریدا تو سمجھو عید بھی پھیکی گزرے گی اور مزے کی بات یہ کہ روزے رکھنے والوں سے زیادہ روزے خور چاند رات کو جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ عید کا چاند نظر آنے کا اعلان کیا ہوا کہ سلام کے لیے آنے والوں اور مبارکباد دینے والوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ سب سے پہلے نازو اپنے شوہر کے ساتھ والدین اور بھائی کو سلام کرنے آئی۔ اس کے بعد عزیز و رشتے داروں کی نوبیاہتا بہوئیں حتیٰ کہ قریبی دوست احبابوں کے بیٹے اور بہوئیں بھی ـــ اور زینت دستور کے مطابق سب کے سلام قبول کر کے انہیں عیدیاں دے دے کر رخصت کرتی رہیں۔ اس پر ٹیلیفون کا سلسلہ بھی ایک تسلسل سے جاری تھا۔ وہ اُسے بھی بھگتا رہی تھیں۔ اور بوکھلا بوکھلا کر خانساماں کو عید کے لیے قسم قسم کے کھانے تیار کرنے کی ہدایات بھی دیتی جا رہی تھیں۔ ان پر سب سے زیادہ ڈیکوریٹرز کے آنے کی فکر سوار تھی۔ جنہیں رات کے نو بجے کا وقت دیا تھا۔ اور کریم کی تو جیسے شامت ہی آگئی تھی۔ وہ زینت کے اشاروں پر پھرکی کی طرح ناچ رہا تھا۔ کبھی اندر جاتا کبھی باہر کبھی کچن میں تو کبھی پینٹری میں۔ کبھی ایک دم ہی حکم ملتا کہ دوڑ کر منواڑی کے یہاں سے اتنے میٹھے اور اتنے سادے پان بنوا کر لاؤ۔ کیتلی میں چائے ختم ہو گئی نئی بنوا کر لاؤ۔ یہ کرو وہ کرو غرضیکہ بے چارہ کانورا ہو کر رہ گیا تھا۔ ادھر دیور اور دیورانی بیٹی کو لے کر بھائی بھاوج کے سلام کو آئے تھے۔ نازش اور کوثر شاپنگ کے لیے جا رہی تھیں۔ اس لیے نیلوفر اور نیلما ان کے ساتھ جانے کے لیے ماں سے پیسوں کا تقاضا کر رہی تھیں۔ اور زینت جھنجھلا جھنجھلا کر کہہ رہی تھیں۔

"اگر نازش کو جانے کی ایسی ہی جلدی ہے تو انہیں جانے دو۔ تمہارے پاس بھی کار ہے تم بعد میں چلی جانا۔ دکانیں تو آج تمام رات ہی کھلی رہیں گی۔ اور پھر تمام چیزیں تو خرید لیں تم نے ـــ اب کونسی چیز باقی رہ گئی ہے جو شاپنگ کی ضرورت پیش آگئی۔ اتنا بھی تم لوگوں احساس نہیں کہ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور بھی سینکڑوں کام ہیں میں تنہا کیا کیا کروں گی۔" مگر دونوں بیٹیاں نازش کے ساتھ ہی جانے پر بضد تھیں۔ انہیں اپنی کوئی نہ کوئی ضرورت یاد آگئی تھی۔ آخر زینت کو انہیں بھیجنا ہی پڑا۔

اسفند معلوم اس وقت کہاں گیا ہوا تھا کیونکہ ڈیوٹی سے تو وہ سہ پہر کو ہی واپس آگیا تھا۔ رات کے دس بجے نکل کر آیا تو زینت، بیٹیوں کو دیر ہو جانے اور ان کی لاپروائی کا رونا رو رہی تھیں۔ کہ آئیڈیا سارا نیلوفر کا تھا اور ڈیکوریٹرز کے سر پہ کھڑا انہیں ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے آتے ہی بیٹیوں کی شکایت کے ساتھ ساتھ شکوہ سا کیا۔

"تم بھی خوب ہی ہو بابا ـــ دو جیا بہن شوہر کو ساتھ لے کر تمہیں سلام کرنے آئی تھی اور تم غائب تھے۔ میں نے تو محض رسم نبھانے کے طور پر تمہاری طرف سے احمد کی ہتھیلی پر ایک سو ایک روپے رکھ دیے ورنہ دینا تو زیادہ ہی چاہیے تھا۔"

"چلیے آپ نے جو دے دیا وہی کافی ہے۔ ورنہ میں تو ایسی لغو رسومات کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔" اسفند نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر کچھ خیال آیا تو فوراً ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ماں کے آگے جھک گیا۔ اور ماں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کر بڑے دلار بھرے انداز میں ملامت کی۔

"رسموں کے قائل نہیں ہو تو پھر یہ سلام دعا کیسی۔؟"

"سلام تو دعائیں لوٹنے کا ایک وسیلہ ہے ممی۔ کیا آپ ان سے بھی محروم رکھنا چاہتی ہیں مجھے۔" وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ ماں کی ممتا میں جوش دلانے کو ایک جذباتی سا فقرہ بول گیا۔

"اے خدا نہ کرے میں تمہیں محروم کیوں رکھنے لگی۔ تم تو میری آنکھوں کی روشنی ہو۔ جسم کا ایک ٹکڑا ہو خدا تمہیں ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور سلامت شاد و آباد رکھے۔" ماں کی ممتا فوراً ہی پھڑک اُٹھی۔

"بس ـــ آپ کی یہ دعائیں ہی تو میری زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔" وہ ماں کے سینے سے سر ہٹاتا ہوا بولا۔

"اوفوہ ـــ بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں تمہیں ـــ مگر تم نے کچھ کھایا پیا بھی ـــ آج تو کھانے پینے کا کسی کو ہوش ہے نہ پروا ـــ" زینت نے کہا۔

"میں نے بھی کھانا تو نہیں کھایا مگر منہ ضرور جھٹال لیا ہے۔ اصل میں چند بے تکلف دوستوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ بس انہوں نے مجھے الٹی سیدھی چیزیں کھلا کر میری بھوک ہی اُڑا دی۔ البتہ کولڈ ڈرنک پینے کو ضرور دل چاہ رہا ہے۔" اسفند نے کہا تو زینت بولیں۔

"ارے تو پیتے کیوں نہیں ـــ میں نے تو ایک نہیں دو دو کریٹس منگوا کر رکھے ہیں۔ جونسی ڈرنک چاہو پی لو ـــ اچھا ٹھہرو میں خود تمہارے لیے لے آتی ہوں۔"

"نہیں نہیں آپ تکلیف نہ کریں ممی ـــ میں خود فرج سے نکال کر پی لوں گا۔" اسفند نے ماں کو کولڈ ڈرنک لانے سے باز رکھتے ہوئے کہا اور مزید کچھ بولے سیدھا پینٹری کا رُخ کیا۔

اصل میں تو اس نے پینٹری کا رخ کرتی ہوئی سلوط کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اور جھلک تو یا [illegible]
ہر روز ہی اس کے قریب ہوتی تھی مگر اس سے کبیدہ ہوجانے کی وجہ سے وہ اس کی [illegible]
اس کے خیال میں اس نے بے اعتمادی کا اظہار کرکے نہ صرف اس کے جذبے کو مجروح کیا تھا [illegible]
توہین بھی کی تھی اور وہ اس سے کبیدہ اور ناراض ہوجانے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اور [illegible]
اور بیگانگی کا اظہار کرتا آرہا تھا۔

مگر۔ اس روز چاند رات تھی جس کی اہمیت کا اندازہ اسے بھی تھا۔ اور پھر اس کی عمر کی [illegible]
کررہی تھیں اور بازاروں کی رونق اور چہل پہل کے مزے لوٹ رہی تھیں اور وہ تھی کہ گھر میں [illegible]
جھلک دیکھتے ہی سب سے پہلا خیال اسے یہی آیا تھا کہ اس کی بہنوں نے اسے ساتھ چلنے [illegible]
اسے بھیجنے کی ضرورت [illegible] سمجھی ہوگی۔ اور اس ناانصافی یا زیادتی کا اسے شدت سے احساس [illegible]
وہ آخر تو اس کی محبت تھی۔

اور پھر۔ اس سے ہمدردی کا جذبہ اچانک ہی اس کے دل پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس پر کی گئی [illegible]
سے نہیں کی۔ بلکہ خود ہی اسے یہ باور کرانے کو کہ وہ جو کچھ بنا چاہ رہی ہے وہ اس کا مقام نہیں ہے وہ کولڈ ڈرنک [illegible]
بہلانے خود ہی پینٹری میں چلا آیا۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن۔ فرج کے قریب بنے کاؤنٹر کے آگے کھڑی پستے اور بادام کی ہوائیاں کاٹ رہی تھی [illegible]
نے اس کے عین پیچھے کھڑے ہوکر آہستہ سے کہا۔

”ارے آپ شاپنگ کے لیے نہیں گئیں کیا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ چمار کو عرش پر بھی بیگار تو اس [illegible] یہاں کھڑی آپ [illegible]
نظیر پیش کررہی ہیں۔“

اور وہ جو اس کے آنے سے قطعاً لاعلم تھی اور نامعلوم کیا سوچ رہی تھی۔ اس لیے خبر [illegible] کے عالم میں اتنی زور سے [illegible]
کہ ڈر کر اچھل ہی پڑی۔ دل بھی کسی سوئیل ٹی گھنٹے کی رفتار سے چلنے لگا۔ لیکن اس نے کام سے ہاتھ [illegible] اس کی طرف دیکھ [illegible]
کی بات کا جواب ہی دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ ادا ناراضگی کا بیّن ثبوت تھی۔ اور وہ جو اس کے [illegible] اچھل پڑنے پر زور [illegible]
آئی ہنسی کو روکے کھڑا تھا۔ اس نے اس کی طرف سے کوئی جواب تو کیا اپنی بات کا ردعمل بھی نہ پا [illegible] سنجیدگی اختیار
کرتے ہوئے کہا۔

”حکم تو یہی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین روز سے زیادہ کشیدگی قائم نہ رکھے [illegible] نہ رہے لیکن [illegible]
پورے پینتالیس روز ہوگئے ہیں اور یہ ناراضگی ——— اب ختم کرنی لازمی ہوگی۔“

تو اس کا دل چاہا کہے یہ ناراضگی تو خود تم نے قائم رکھی تھی اور اب خود اسے ختم بھی کرنا چاہ [illegible] ہو گویا اپنے مو [illegible]
کے عادی ہو۔ مگر میں اتنی گری پڑی نہیں ہوں کہ تمہاری مرضی کی تابع ہوجاؤں اور آج [illegible] ہمدردی امنڈ آئی [illegible]
کہ تم تو مجھے سحری اور افطار کے وقت نوکروں کی طرح ٹہلیں کرتے دیکھ کر بھی نہیں [illegible] ایک خاموشی سب
جواب میں گویا خود ہی ایک مکمل جواب ہوتی ہے۔ اسفند کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس [illegible] کرنے کی روادار
نہیں ہے وہ فرج سے بوتل نکال کر بولا۔

”کمال ہے۔ ایک طرف اتنی اللہ رسول اور دینداری۔ اور دوسری طرف یہ بے ایمانی [illegible]
ٹھیک ہے بات کرنی گوارا نہیں تو کم از کم چاند رات کی مبارکباد تو قبول کرلیجیے۔ بھلا [illegible]
سارا آپ کا اور گرمی مجھے دکھائی جارہی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ الٹا کوتوال چور کو [illegible] دانت [illegible]
کو بدل کر کہا تھا مگر جس طرح [illegible] کے ساتھ [illegible] استعمال کیا تھا سلوط کو [illegible]
گھونٹ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

”آپ کو بھی مبارک ہو۔“

”کون کو [illegible] اور وہ اس سے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو منہ پھیر کر بولی۔

”عید اور چاند رات۔“

عید کی مبارکباد تو قبل از وقت ہے۔ صرف چاند رات کی ضرور تسلیم کرلیتے ہیں۔“ وہ اس کے من جانے پر شوخ
[illegible] مسکرا کر رہ گئی۔
[illegible] بولا۔ اور وہ مبارکباد وصول کررہی ہیں مگر عید کی تیاری بھی کی آپ نے۔“ اسے یکا یک اس کے کپڑوں وغیرہ کا خیال آیا تو
[illegible] پوچھا۔

”تیاری کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سب کچھ تو منجھلے آکا نے بنوا دیا ہے۔“ وہ افسردہ سی ہوکر بولی۔ تو اسے
ہی اس کی بے بسی کا احساس ہوا۔ وہ اس کی افسردگی دور کرنے کی غرض سے بولا۔
”خیر ڈیڈی نے آپ کے لیے کچھ بنوایا ہے تو پھر خوب ہی نہیں بہت خوب ہی ہوگا۔ اور پھر ڈیڈی پر تو آپ کا
حق بھی بنتا ہے کہ آج کل وہی تو آپ کے سرپرست ہیں بہرحال۔ اگر کسی چیز کی ضرورت نہیں تو آئیے ذرا میرے ساتھ چاند
رات کی بہار ہی دیکھنے چلی چلیے۔“

اور وہ اس کی پیش کش پر لہو کھلا کر کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ زینت آگئیں۔ اور ماں کو دیکھتے ہی بوتل اور
[illegible] لیے وہ فوراً ہی پینٹری سے باہر نکل گیا۔

[illegible] دل میں تھوڑی بہت انسانیت تھی اور خوف خدا بھی۔ اسی وجہ سے زینت اسے اپنے یہاں رکھنے پر معترض نہیں
تھیں۔ یوں بھی وہ منٹوں میں ان کے دس کام نمٹا دیتی تھی۔ وہ اسے ملازمہ تو اگر چاہتی بھی تو نہیں سمجھ سکتی تھیں لیکن ان
کی نظروں میں اس کی کوئی خاص وقعت بھی نہ تھی۔ اس نے پورے روزے رکھے تھے۔ جاگنے کی راتوں کی عبادت
بہت پنجگانہ نمازیں ادا کی تھیں۔ اور افطار کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی اور آخری رمضانوں میں سحری
کا ذمہ بھی لیا تھا۔ اور اب دوپہر سے مسلسل کام میں جتی ہوئی تھی۔ پہلے بے روزہ داروں کے لیے کھانا تیار کرایا تھا۔
پھر افطار کے لوازمات بھی مع کھانے کے تیار کرائے تھے۔ اور روزہ افطار کرنے کے بعد ان کے ساتھ عید کی تیاریوں
میں لگ گئی۔ اس کی عمر کی لڑکیاں بالیاں بے فکری سے چاند رات کے مزے لوٹتی پھر رہی تھیں۔ یعنی مزے سے کھاپی
بھی رہی تھیں اور خریداری بھی کرتے کے ساتھ ساتھ بازاروں کی جگمگاہٹوں سے بھی لطف اندوز ہورہی تھیں۔
ایک صرف وہی تھی۔ کم از کم زینت کے دائرہ علم میں جو گھر میں گھسی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ جب تک انسان بے حس
نہیں ہوتا اس کے احساسات اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان میں بڑی وسعت اور شدت پیدا ہوجاتی
ہے۔ زینت کو بری طرح احساس ہورہا تھا کہ ایسے اہم موقعے پر جبکہ تہوار سر پر ہے۔ اور تہوار بھی جو برس کے
برس بعد آتا ہے مسرتوں کے خزانے لٹانے اس موقع پر تو بہنوں سے بچھڑے ہوئے لوگ بھی اپنے گھر والوں کے
ساتھ مل کر مسرتیں بکھیرتے عظیم تہوار کی خوشیاں لوٹتے ہیں۔ آپس میں تحفے اور تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ایک
دوسرے پر محبت اور خلوص کی بارش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دلوں میں بھری کدورتیں اور تلخیاں تک دھو دی جاتی ہیں مگر
اس بے چاری کا کوئی پرسان حال بھی نہیں ہے۔ ایک بھائی ہے تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ اس کے دل پر اس
وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ خوشی کے بجائے رنج اور افسردگی سے سینہ پھٹ رہا ہوگا۔ مگر کیسی صابر اور شاکر ہے کہ
اپنی دلی کیفیات کو کسی پر ظاہر ہی نہیں ہونے دیتی اور اس احساس کے ساتھ ہی انہیں خیال آیا کہ کام چھڑوا کے
[illegible] لیے اسے بھی نیلوفر اور نیلما کے ساتھ کیوں نہ بھیج دیا پھر انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچا اور
[illegible] بولیں۔

”یہ لڑکیاں تو لڑکیاں تمہارے منجھلے آکا بھی معلوم کہاں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ پھل وغیرہ تو میں نے منگوا لیے تھے اور
[illegible] بھی کل ہی نازو کی عیدی کی مٹھائی کے ساتھ بنوالی تھی۔ کیک کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔ چلو جلدی سے تیار ہو
جاؤ تو ٹھیک [illegible] ساری تیاری تو مکمل ہوگئی ہے اور ایسے میں بابا بھی ہیں گھر پہ۔“

”لیکن میں نے ابھی [illegible] کے لیے چھوہارے بھی نہیں [illegible] میوہ الگ گھوٹنا ہے مزعفر کے لیے۔
[illegible] کی دال بھی تو پیسنی ہے گرائنڈر میں۔“ سلوط نے ان کے ساتھ نہ جا سکنے کا عذر پیش کیا۔
”ارے چھوڑو۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہی ہوگی ایسا ہی ہے تو واپس آکر کرلینا یہ سارے کام۔ ارے کام کا کیا ہے وہ

تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ چلو شاباش تم جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔"
اُف یہ زینت کہہ رہی تھیں وہ بھی اتنے دلار اور اپنائیت سے۔ وہ بھلا اتنے خلوص اور یگانگت بھرے ... سکتی تھی۔ فوراً ہی بادام پستے کی ہوائیاں فریج میں رکھ کر تیار ہونے چل دی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد وہ بھی زینت کے ساتھ ان کی کار میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی چاند رات کی رونق اور ... اٹھا رہی تھی۔ زینت صرف آرڈر کیا ہوا کیک لینے گئی تھیں۔ شاپنگ کرانے نہیں۔ پھر بھی انہوں نے ... کے ساتھ میچ کرتی ہلکے فیروزی رنگ کی کامدانی کی چوڑیاں اسے دلوا دی تھیں۔

اگلے روز عید تھی۔ وہ گذشتہ شب تین بجے کے قریب جا کر سوئی تھی کیونکہ جو میٹھی اور نمکین چیزیں ... کی گئی تھیں انہیں پکانے اور بنانے میں آدھی رات سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ آنکھ بھی کھلی تو نیلما کے ... پر۔

"ارے سلوطا آپا! مرد حضرات کب کے عید گاہ سدھار چکے اور آپ ہیں کہ اب تک پڑی سو رہی ہیں۔ کچھ معلوم ... آج عید ہے عید۔ ممی کہہ رہی تھیں کہ رواج کے مطابق مرد سویاں کھا کر عید گاہ جاتے ہیں مگر آپ کی وجہ سے ... بھائی جان سویاں کھائے بغیر ہی چلے گئے۔" نیلما نے اسے ہلا جلا کر گہری نیند سے اٹھاتے ہوئے ایک ساتھ ... ساری باتیں کہیں تو وہ نیند سے بوجھل آنکھوں اور دُکھتے ہوئے سر کی وجہ سے جھنجھلا کر بولی۔

"کیوں کیا رواج کے مطابق میرے سوا انہیں کوئی اور سویاں نہیں کھلا سکتا تھا۔"

"کون کھلاتا۔ ممی ڈیڈی کو تیار کرانے میں لگی رہیں اور ہم دونوں اپنی اپنی تیاری میں لگے رہے کیونکہ نماز کے ... بعد ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر واپسی پر کھا لیں گے سویاں۔" وہ تکیے پر سر رکھ کر دوبارہ آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی۔

"ارے آپ پھر سونے لگیں۔ میں تو آپ کو اپنا یہ عید کا ڈریس اور اس کے ساتھ میچ کرتی چیزیں دکھانے آئی ... اور آپ سے عید ملنے بھی۔ مگر تیار ہونا تو کجا۔ آپ تو ابھی تک سو ہی رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو سونے نہیں دوں گی ... اُٹھ کر جلدی سے تیار ہو جائیے۔ ممی بھی آپ کو پوچھ رہی ہیں۔"

تب بڑی کسلمندی محسوس کرتی ہوئی وہ اُٹھ کر تیار ہوئی۔ طبیعت تو نہیں گوارا کر رہی تھی شعیب منصور کے ... ہوئے کپڑے پہننے کو مگر گذشتہ رات زینت نے بہت تاکید سے کہا تھا کہ وہ ۔۔ وہ کپڑے ضرور پہنے۔ ... بادل نخواستہ اسے پہننے ہی پڑے تھے۔

پورے روزے رکھے تھے اس لیے ویسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسی کہ روزے پورے ہونے پر سرخروئی کے احساس ... سے ہوتی ہے۔

لیکن دل تو اندر سے خوش نہ تھا۔ اندر ہی اندر اُداسی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ اس لیے ایک افسردگی سی طاری ... اسفند کے بات میں پہل کرنے پر بلکہ بات نہ کرنے کی قسم توڑنے پر یہ افسردگی دُور نہ ہوئی تھی۔

ظاہر تھا اس اتنی بڑی دُنیا میں اپنے یک و تنہا رہ جانے کا احساس اسے کوئی خوشی تو نہیں بخش سکتا تھا۔ جب کہ ... طرف سے عزیزوں میں گھری ہوئی تھی۔ جو اسے اپنا کہنے کو تیار ہی نظر نہ آتے تھے۔

اسے معلوم تھا کہ نیلما اسے سوتے سے اٹھا کر جلد جلد تیار ہو جانے کی تاکید کرنے اس غرض سے نہیں آئی کہ وہ سب کے ساتھ مل کر عید کی خوشیوں میں حصہ لے بلکہ اس سے کام لینے کی غرض سے اسے بلانے آئی تھی۔ ارادہ تو تھا ... عید کا نیا لباس پہننے کا لیکن نیلما نے جس انداز میں مردوں کے سویاں کھائے بغیر عید گاہ جانے کا ذکر کیا تھا اور جس ... میں کیا تھا۔ اس کے پیش نظر اس نے صرف منہ دھونے پر اکتفا کر کے شعیب منصور کی خوشی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ... دیا ہوا عید کا فیروزی جوڑا زیب تن کیا۔ مگر چوڑیاں پہنیں نہ کوئی اور زیور۔ حتیٰ کہ میک اپ کے نام کی کوئی چیز بھی ... پر نہیں لگائی البتہ بال ضرور سنوارے اور پھر کمرے سے نکل آئی۔

اندر پہنچی تو لاؤنج کوریڈور سے لے کر پینٹری اور کچن سنسان پڑا دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ خانساماں اور کریم عید کی نماز ...

... نیلما نے کہا تھا کہ ممی آپ کو پوچھ رہی تھیں۔۔ اور زینت اور دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں ہوں گی۔ ... سے جا کر معلوم کر آئے کہ وہ اسے کیوں پوچھ رہی تھیں۔ مگر پھر یاد آیا کہ مرد عید گاہ سے واپس ... اس نے سوچا کہ زینت ... شیر خورمہ وغیرہ مٹھائی کی بڑی ڈشوں میں نکال کر میز پر لگا دینی چاہیے۔ ورنہ برس کے ... اس لیے ... خواہ مخواہ ہی بُرا مان جائیں گی۔ اس لیے اس نے کریم اور خانساماں کے واپس آنے کا بھی انتظار نہ کیا ... بھابی جان ... ساری چیزیں جلد جلد فریج اور ہاٹ کیس سے نکال کر قرینے سے کھانے کی میز پر لگا دیں جس پر کریم نے ... شامیت ... چائے کی پیالیاں اور کوارٹر پلیٹیں سجا رکھی تھیں۔

... ابھی کچھ ہی دیر بعد عقبی دروازے سے پہلے کریم اور خانساماں کچن میں داخل ہوئے اور پھر اندر سے زینت۔ اس سے وہ ... ڈائننگ ٹیبل کے آگے ہی کھڑی تھی اور زینت نے پینٹری سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ بھی لیا تھا۔ مگر اسے نظر انداز کرتی ... سیدھی کچن میں چلی گئی تھیں۔ اس وقت تو وہ عجلت میں تھیں مگر یہ بھی ان کی کچھ عادت ہی تھی کہ گھڑی میں ... گھڑی میں بھوت" کے مصداق کہ وہ اس سے اخلاق و مروت برتتے برتتے ایک دم ہی بھرٹ سی ہو جاتی تھی۔ مگر ... وقت تو وہ واقعی بہت عجلت میں تھیں کیونکہ اسفند اور شعیب منصور شاید عید کی نماز پڑھ کر واپس آگئے تھے۔ ... وہ خانساماں کو جلد سے جلد چائے دم کرنے اور کریم کو چائے کی ٹرالی سجا کر کھانے کے کمرے میں لانے کا حکم صادر کر کے ... واپس پلٹیں تو سیدھی کھانے کے کمرے میں ہی آگئیں اور اس پر اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈال کر بولیں۔

"تو تم یہاں کھڑی ہو سلوطا! واہ بھئی نہ سلام نہ دعا نہ عید کی مبارکباد۔" ان کے لہجے میں شکوہ نہیں طنز سا تھا۔ ... اس نے جھینپ کر جلدی سے انہیں سلام کیا اور عید کی مبارکباد دی۔

"جیتی رہو۔ اور تم کو بھی عید مبارک ہو لیکن تم نے ابھی سے یہ کپڑے کیوں پہن لیے؟" انہوں نے ایک روکھے پھیکے سے انداز میں اس کے سلام اور مبارکباد کا جواب دے کر تیکھے سے لہجے میں پوچھا۔

"جی؟" وہ ان کے سوال پر متعجب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ ہی جھینپ کر بولی۔

"بھئی، میرا مطلب ہے ایسی کیا جلدی تھی بعد میں اطمینان سے پہن لیتیں عید کا یہ جوڑا۔۔ اب میٹھی چکنی چیزوں کو ہاتھ لگاؤ گی تو تمہارے اتنے قیمتی سوٹ کا ستیاناس ہی ہو جائے گا۔ معلوم بھی ہے یہ سوٹ میں نے پیرس سے خریدا تھا اور وہاں کی مہنگائی بھی خدا کی پناہ۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز پر آگ برس رہی ہو۔" انہوں نے جس بیزار کن ... انداز میں اپنی بات کہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ کہہ کر انہوں نے اسے اس کی اوقات جتائی ہو۔ یہ جتانے کی کوشش کی ہو کہ تم اتنی قیمتیں چیزیں پہننے کے قابل ہی کہاں ہو۔ جی چاہا کہ وہیں وہیں کھڑے کھڑے وہ سوٹ اتار کر ان کے آگے پھینک دے۔

مگر اس کے وہ ندامت اور کمتری کے احساس میں دبی جا رہی تھی۔۔ تیوری چڑھا کر بولی۔

"لیکن بھابی جان! آپ نے ہی تو نیلما سے کہلوایا تھا کہ جلدی سے نیا لباس پہن کر کام کرنے کے لیے آجاؤ۔ کیونکہ گھر کے مرد سویاں کھائے بغیر ہی نماز پڑھنے چلے گئے ہیں۔ ورنہ میں تو بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ میں بھلا یوں جھٹ پٹ تیار ہو کر کیوں آتی۔"

"... نیلما نے اگر اپنی بے وقوفی میں کہہ بھی دیا تھا تو تم تو عقلمند تھیں۔ تمہیں خود ہی سوچنا چاہیے تھا کہ بھلا ایسا ... لباس پہن کر بھی کوئی کام ہوتا ہے۔ مگر چلو خیر، جب پہن ہی لیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ یہ سوٹ پہنا تھا تو تھوڑا سا میک اپ ہی کر لیتیں اور ہاں تم نے تو چوڑیاں اور کوئی زیور بھی نہیں پہنا۔ اس کے باوجود بھی بڑی جچ رہی ہو۔" بات کرتے کرتے ایک دم ہی پینترا بدل دینا یعنی سخت اور چبھتے ہوئے ... کا موم میں ڈھل جانا اور کھردرے اور تیکھے سے لہجے میں یکایک لچک پیدا ہو جانا۔ اس اچانک رونما ہو جانے والی تبدیلی پر وہ اتنی متعجب ہوئی کہ کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ آخر وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

اصل میں ایک تو عید کی بے پناہ خوشی۔ دوسرے شعیب منصور جو آٹھ بجے سو کر اٹھنے کے عادی تھے۔ اس روز اپنے معمول سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے جاگ گئے اور تیار ہو کر بھاگم بھاگ عید کی نماز پولو گراؤنڈ میں ادا کرنے دکھ تیاری میں اتنی دیر ہو گئی

تھی کہ نماز کا وقت ہی نکلا جا رہا تھا اور وہاں چند دوستوں سے عید ملنے ملانے کی وجہ سے ساڑھے نو بجے آئے تھے۔ اور چونکہ انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اس لیے بیوی کو کمرے میں نہ پا کر سیدھے ڈرائنگ روم کی طرف سے بیٹھ تھی مگر زینت سامنے ہی کھڑی تھیں اور خلافِ عادت سلوط کو قدرے تیز لہجے میں بات کرتا دیکھ کر دروازے کے آگے ہی ٹھٹک گئے۔ بات کو بڑی خوبصورتی سے نہیں موڑا بلکہ لہجہ بدل دیا۔ اس سے بات کرتے کرتے ان کی نظر جو نہی شوہر پر پڑی تو اس کے باوجود بھی شعیب منصور بہت کچھ سمجھ گئے۔ بڑھتے ہوئے بولے۔

"چلیں خیر۔ اگر انہوں نے چوڑیاں وغیرہ نہیں پہنی ہیں تو ناشتے سے فارغ ہو کر پہن لیں گی۔ مگر آپ کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔ ورنہ یہ آپ کا بخشا ہوا اتنا قیمتی سوٹ واقعی خراب ہو کر رہ جائے گا۔ ان کے لہجے سے طنز عیاں تھا۔ جسے سلوط نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے ان کی بات اسے بالکل ناگوار نہیں گزری۔ اس نے بڑھ کر ان کی طرف گھوم کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اس کے نزدیک آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہاتھوں کو آہستہ سے دبا کر دعا دی۔

"خدا تمہیں سکھی رکھے اور یہ عید تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔ بیٹی! ہم نے تمہیں اس لیے تو اپنے پاس نہیں رکھا کہ سارا وقت کام ہی کرتی رہو۔ بھئی اسے تو تمہیں اپنا ہی گھر سمجھنا چاہیے۔ کچھ ہنسا بولا اور آرام بھی لیا کرو۔"

"اپنا گھر سمجھتی ہوں جبھی تو کام بھی کرتی ہوں لیکن ہر وقت تو نہیں کرتی۔ منجھلے ابا آج سو رہی تھی تبھی تو آپ بھی کھائے بغیر ہی نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔" وہ ان کی اپنائیت بھری باتوں سے خوش ہو کر بولی۔ زینت کو چپ سی لگ گئی۔ شعیب منصور نے ان کی طرف دیکھ کر گویا ان کی بات کے ساتھ ساتھ ان کا دل رکھنے کو کہا۔

"ہاں یہ تمہاری بھابی جان بھی صبح کو یہی کہہ رہی تھیں۔ اصل میں انہیں اطمینان ہی تمہارے کام سے ہوتا ہے۔ دونوں صاحبزادیاں کہاں غائب ہیں بیگم؟"

"یہیں اپنے اپنے کمروں میں ہی ہوں گی۔" زینت نے تیکھے سے لہجے میں کہا پھر فوراً ہی لہجہ ٹھیک کر کے بولیں۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آپ کی لاڈلی نیلوفر کا نہانا دو گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہوتا۔ آپ کے جانے کے بعد سے گھسی ہوئی ہیں ٹوائیلٹ میں۔ اب میں نے عاجز ہو کر نیلما کو ان کے کمرے میں بھیجا ہے تاکہ ان کے ہاتھ پیر پھیلا کر انہیں ذرا جلدی نکال لیں۔ مگر آپ تو بیٹھیے۔ ایسا ہی ہے تو وہ بعد میں ناشتا کر لیں گی۔"

"ارے نہیں نہیں بیگم! یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم عید کے اس پُرمسرت موقع پر اپنی بیٹیوں کی شمولیت کے بغیر ہی ناشتہ کر لیں جب کہ ہماری ایک بیٹی کو تو آپ نے پرایا کر دیا ہے۔" شعیب منصور کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"تو پھر کرتے رہیے ان کا انتظار۔ وہ تو ایک گھنٹے سے پہلے آئیں گی نہیں اور ہاں یہ بابا کہاں رہ گئے جو نظر نہیں آ رہے۔" زینت نے بھی ان کے پہلو والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سلوط کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کر کے پوچھا۔

"سنی صاحب۔ وہ بے چارے تو آج دھر ہی لیے گئے۔ اچھے خاصے میرے ساتھ گھر کا رُخ کر رہے تھے کہ بیچ چلتے ایک کار نے اچانک رک جانے کا اشارہ کیا۔ اتفاق سے کار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ سنی نے آہستہ سے کہا بھی کہ کٹ لیجیے مگر میں اس اثنا میں کار روک چکا تھا اور بس کار روکنی غضب ہو گئی۔ وہ چاروں کے چاروں پلک جھپکتے میں کار پر جھپٹے۔ دروازہ کھولا اور سنی کو باہر کھینچ لیا۔"

"ہے ہے۔ کون تھے آخر وہ مصیبت لوگ؟" زینت جو بے چینی سے پہلو بدل بدل کر شوہر کی گفتگو سن رہی تھیں ضبط نہ کر سکیں تو انہوں نے ہول کر پوچھا

"بھئی، ان کے چند بہت ہی پرانے دوست تھے وہ۔ ان کے علاوہ اس بے تکلفی کا مظاہرہ اور کون کر سکتا تھا بھلا" شعیب منصور نے کہا۔ اور جواب میں سینے پر ہاتھ رکھے رکھے نہایت کوفت اور ناگواری کے عالم میں زینت نے کہا۔

"اُف توبہ توبہ۔ آپ تو کچھ ایسا منظر کھینچ رہے تھے جیسے خدانخواستہ بابا کے دشمنوں پر اچانک کسی نے حملہ کر دیا ہو۔ ہے ہے آپ نے تو میری جان ہی نکال ڈالی۔" تو سلوط کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

جی آپ کی جان کے کیا کہنے وہ تو گھر کے قریب کوئی پٹاخہ بھی چھوڑا جائے تو اس سے بھی نکل جاتی ہے۔ ورنہ میں تو عین بہ عین عکاسی کر رہا تھا۔" شعیب منصور مسکرا کر بولے۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ بابا تو اب شام تک گئے کام سے۔" زینت خلافِ توقع شوہر کی چھیڑ چھاڑ پر چڑے بغیر بولیں۔

"اچھا تو اس کا مطلب ہے کہنا زیادہ درست ہوگا۔" شعیب منصور نے پھر چھیڑا۔

"کام نہیں بلکہ ہاتھ سے کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اپنی یہ گرامر اور لغت خواہ مخواہ۔ ایک تو دم ہی کتنے ہیں اس گھر میں کُل چار یا پانچ اور پھر ایک بھی رہنے بھی دیجیے اپنی یہ گرامر اور لغت خواہ مخواہ۔ ولایت میں رہ کر تو سچ مچ کے رنگروٹ ہی بن گئے ہیں وہ۔"

"دیے تو بابا کی یہاں یہ پہلی عید ہے اس پر غائب۔ ولایت میں رہ کر تو سچ مچ کے رنگروٹ ہی بن گئے ہیں وہ۔" آخر کو وہ بابا کے جگری دوست تھے۔ ان کا بھی تو دل رکھنا تھا انہیں۔ بھئی اس میں اس قدر بگڑنے کی کیا بات ہے۔ سبھی جانتے ہیں اس کی اہمیت کو کہ اس دن کسی جگہ کوئی بھی جم کر نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ بھی ابھی آ جائیں گے۔ دیر عید کا دن ہے شعیب منصور نے ان کی کوفت دور کرنے کی غرض سے کہا۔ اور تبھی نیلوفر اور نیلما بھی آ گئیں پھر کچھ وقت ان سب کا آپس میں ادب و سلام اور عید ملنے میں گزرا۔ جائے تو کب کی تیار تھی۔ پھر سوا دس بجے کہیں جا کر سب ناشتے سے فارغ ہوئے اور وہ ابھی باورچی خانے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ تبھی آگے پیچھے پہلے سہیل منصور، نازش اور کوثر اور پھر نازپرور اور احمد سروش عید ملنے آ گئے۔ نازش اور کوثر اس کے لیے تحفے لائی تھیں اور سہیل منصور نے اسے عیدی میں ایک سو ایک روپے دیے تھے۔ نازپرور تو پوری دلہن بن کر آئی تھی۔ اسے ان گنا لگ چکا تھا۔ اور روپ جیالی کا جوبن اس پر کچھ اس بری طرح آیا تھا کہ بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ نازپرور اس کے لیے کچھ نہیں لائی تھی۔ چچا چچی کو تحفہ دیتے دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اپنی انگلی سے سونے کا ایک چھلا اتار کر زبردستی سلوط کی انگلی میں پہنا دیا۔ نیلوفر اور نیلما سے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ ہوا۔ وہ بھی اس کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے لے آئیں اور یوں اس کے دل سے ایک تکدر سا چھٹ گیا۔ یوں یہ زندگی میں پہلا اتفاق تھا جب اسے کتنے سارے تحفے ملے تھے۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ کچھ دیر سب کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی۔ تو کوثر بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی اصل میں کوثر نے اسے پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا وینٹی باکس دیا تھا۔ تحفہ گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔ جب اس نے گفٹ پیپر ہٹایا تو اس میں سے وینٹی باکس کے ساتھ ایک چھوٹی سی چٹ بھی نکلی۔ لکھا تھا۔

"کم از کم خاص خاص موقعوں پر تو مجھے استعمال کیجیے گا۔"

یہ فقرہ اردو میں لکھا تھا۔ اور کسی سے پوچھ کر لکھا گیا تھا۔ کوثر نے شاید پہلی بار اردو پر مشق ستم توڑی تھی۔ وہ بڑی دیر تک ہنستی رہی اور کوثر بھی اس کا ساتھ دیتی رہی۔ پھر کوثر نے خود اپنے ہاتھ سے اس کا میک اپ کیا۔ اس نے بھی فیروزی رنگ کا تنگ پاجامہ سوٹ زیب تن کیا تھا۔ جس پر فیروزے کے جڑاؤ وہائٹ گولڈ کے جھلملیوں والے ٹاپس پہن رکھے تھے۔ اس کے لباس سے میچ کرنے کی وجہ سے وہی کانوں سے اتار کر زبردستی اسے پہنا دیے اور پھر اس کا رخسار چوم کر بولی۔

"ہائے آج تو بھائی جان بیچ مچ پھسل ہی پڑیں گے۔ آپ کا یہ جلوہ دیکھ کر۔"

اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے یہ شوخ سا فقرہ کہہ کر اس کے جسم کے اندر نئی روح پھونک دی ہو کہ کسی نے بھی تو اس سے ایک ایسی بات نہیں کہی تھی جو احساس تک محدود ہو کر اس کے دل کے کسی نہاں خانے میں کہیں دبی ہوئی تھی۔ بہرحال پھر تب دیر بعد کھانے کا وقت ہوا تو اسے پھر اندر جانا پڑا۔ اور اس روز بلکہ اسی وقت اسے پہلی بار احمد سروش کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور پھر گویا۔ وہ خوبصورت چہروں کا شیدا تھا اور یہ بات سلوط کو بھی معلوم تھی۔

وہ سب کی نظر بچا بچا کر بار بار اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی وجہ سے۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کہ نازو کی دل شکنی اسے گوارا نہ تھی۔ کمرے میں آئی۔ تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹی تو ایسی سوئی کہ شام ہوتے ہی آنکھ کھل سکی۔ کوفت تو بہت ہوئی کہ لو بھلا یہ کیسی عید گزری کہ ہنسی نہ مذاق نہ کوئی اور تفریح اور کچھ نہیں کم از کم کوثر سے ہی تھوڑی دیر گپ شپ کر لیتی۔ اس وقت تو وہ چلی بھی گئی ہوگی۔

ایسے ہی خیالات لیے وہ بڑے اہتمام سے تیار ہو کر اندر آئی تو ڈرائنگ روم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ لاؤنج میں بھی بہت سے کمسن لڑکے اور لڑکیاں کھیل رہے تھے اس کے ڈرائنگ روم میں جانے میں کوئی حرج تو نہ ہوتا لیکن اسے دیکھ کر لوگ اپنا تعارف کروانے سے ہوا استفسارات کرنے لگتے تھے۔ ان کا سامنا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ پینٹری میں چلی آئی۔ نوکر سے کوثر کے بارے میں دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ کوثر نیلما اور نیلوفر کو لے کر نازو کی سسرال گئی ہے۔ تب وہ منہ

لٹکائے اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

میک اپ کرنا اور تیار ہونا بھی بے کار گیا تھا۔ کیا تھا اگر یہ تینوں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتیں۔

وہ دل ہی دل میں اپنی ناقدری پر ملول ہوتی رہی۔ اتنی باشعور تھی۔ خود کو اپنی عمر سے بڑا ہی سمجھتی تھی۔ مگر یہ لوگ کبھی کبھی اسے ناسمجھ بچے سے بھی چھوٹا بنا دیتے تھے۔ صبح سے اسفند کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے پہلے ہی چڑچڑی ہو رہی تھی اور اب تو کمرے سے نکلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لباس تبدیل کر کے لیٹ جانے کا سوچ رہی تھی۔

لباس تبدیل کر لینے کا ارادہ کر لینے کے باوجود وہ خود پر طاری کسلمندی اور افسردگی کی وجہ سے بستر سے اٹھی نہیں بلکہ ملول سی ہو کر اپنے لباس کو دیکھنے لگی کیوں تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک تقریباً ہر عید ہی محرومیوں اور رنج کا احساس دلاتی ہی گزری تھی اور شادی کے تلخ ترین تجربے کے بعد تو عید کا دن اس کے لیے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوتا کہ ایک تو محض اس کی وجہ سے حالات بہت خستہ و خراب ہو گئے تھے دوسرے خود اس کے دل سے جینے کی امنگ ہی جاتی رہی تھی۔ یوں روزے رکھتی۔ پنجگانہ نماز ادا کرتی۔ لیکن عید کے دن لباس تک تبدیل کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی بھائی بیگانہ تھے تو بھابی سخت بیزار اور نالاں۔ وہ لباس ہر تی یا نہ بدلتی پرواہ کسے ہوتی تھی۔ مگر اس عید پر تو بڑے خلوص سے اس کے لیے عمدہ لباس بنوایا گیا تھا جیسے بڑے اہتمام کے ساتھ پہن کر اس نے اتنے سارے لوگوں کے درمیان رہ کر گویا زندگی میں پہلی بار بڑی امنگ کے ساتھ یہ عید منائی تھی تو وہ بھی کس قدر پھیکی اور بوری ثابت ہوئی تھی اور وہ ـــ

بڑے رنج اور تاسف سے اپنے لباس کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ دوسروں کا بخشا ہوا یہ لباس پہن کر اور اتنی ٹیپ ٹاپ ... کیا ہوا ما سوا محرومی اور اپنے یکہ و تنہا ہونے کے تکلیف دہ احساس کے جو شاید ماں کے پیٹ سے ہی اس کے ... ہوا تھا۔ اور یہ سارے اہتمامات یعنی یہ لباس۔ یہ میک اپ اور چوڑیاں وغیرہ تو ان لوگوں کو ہی زیب دیتے ہیں جن ... سراہنے والا ہوتا ہے۔ چاہنے والا ہوتا ہے۔ تو پھر اتار کر پھینک کیوں نہیں دیتیں ... ـــ

کیا تامل ہے ـــ؟

کس کا انتظار ہے ـــ؟

تمہارا کوئی ایسا ملنے جلنے والا ہی نہیں جسے دکھا کر داد حاصل کرو۔ اپنی تعریف پر کھل اٹھو

ہونہہ بے وقوف ہے سراسر۔

وہ کچھ ایسے ہی دل آزار سے خیالات لیے کچھ زیادہ ہی ملول اور افسردہ سی دوپٹے کو بیدلی سے بیڈ پر ڈال رہی تھی کہ دفعتاً دروازے پر پردہ تھوڑا سا کھسکا اور اسفند اندر داخل ہوا۔

وہ اسے نظروں کے سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔
وہ بھی سراپا قیامت بنی۔
کھلتے ہوئے آسمانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔
ہلکے ہلکے زیورات اور میک اپ سے دوآتشہ۔
دوپٹے کی قید و بند سے آزاد۔
سانچے میں ڈھلا جسم۔
ایک دم حسن و رعنائی کے کسی زندہ مجسمے کی طرح۔
"اوہ۔ ویٹس یو مائی لو! اوہ یہ تم ہو میری محبت!" دروازے کے آگے ہی ٹھٹھک کر [illegible] وہ ازخود رفتہ سا ہو کر بولا۔ اور وہ بھی۔ اس کی اچانک آمد پر گم صم کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
ڈارک بلو تھری پیس کے سوٹ پر میچ کرتی ٹائی اور بڑے دلآویز انداز میں سنوارے [illegible] لگا کر وہ بلک جھپکنا ہی بھول گئی۔ کہ یوں بھی اسے دیکھتے ہی دل کے سارے ساز بج اٹھے [illegible]
جن کی جھنکار نے دل کے پاتال میں بڑی دور تک مسرت و انبساط کی ایک لہر سی دوڑا دی [illegible]
دھڑکنیں بھی [illegible] اتنی بے ترتیب ہو گئی تھیں کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ کہ سارا دن [illegible] سراپا دیکھنے اور حیات بخش آواز سننے کو وہ ترستی رہی تھی۔
انتظار کا ایک ایک پل بھی گنا تھا تو خود سے چھپ کر ——
خود سے مخفی رکھ کر ——
کہ بائیس تئیس سالہ زندگی میں وہی تو تھا۔

پہلا مرد — پہلی ہستی جسے خود سے چھپ کر اس نے چاہا تھا۔ چاہتی آ رہی تھی۔
اب اسے دیکھتے ہی خود پر طاری افسردگی اور اکتاہٹ کا سبب بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔
اس سمے ہر احتیاط
ہر مصلحت اور نزاکت
حتیٰ کہ دیکھ لیے جانے کا دھڑکا
سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔
وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔
پرائی امانت ہے۔
اور وہ اس کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
یا کیا غلط ہے کیا صحیح ہے۔
کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے۔
کیا گناہ ہے کیا ثواب ہے۔
دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کی نگاہوں میں پیوست سی ہو گئی تھیں۔
اور دونوں عجیب مسحور کن سی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔
لب خاموش تھے۔
اور جسم ساکت۔
البتہ دونوں کے قلوب ایک ہی لے پر دھڑک رہے تھے۔
آنکھیں گونگی اور بے زبان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے جذبات کی ترجمانی [illegible]
مگر جب جذبے کی شدت نے اسفند کو بے قابو سا کر دیا تو وہ اسی ازخود رفتگی کے عالم [illegible] بڑھا اور تبھی [illegible]
غفلت پر بری طرح چونکی۔

سب سے پہلے دیکھ لیے جانے کا خیال آیا۔ اور پھر — اپنے اس حد تک کھل کر اس کے سامنے آ جانے کا۔
تو کھلی آنکھوں سے بیداری کے عالم میں ایک حسین سپنا دیکھتے دیکھتے جاگی تھی وہ — اس لیے ایک دم ہی بپھر اٹھنے والے جذبات ابھی معمول پر نہیں آئے تھے۔
دھڑکنیں بھی ابھی ترتیب میں نہیں آئی تھیں۔
اس کے باوجود بھی حواس قابو میں آ گئے تھے۔
وہ قریب آیا تو وہ چند قدم پیچھے سرک کر بولی۔
"آپ اب کیوں آئے ہیں؟" آواز مرتعش سی تھی لیکن لہجہ قدرے تیکھا — یہ تو وہ ہی خوب جانتی تھی کہ اس نے کس طرح خود کو سنبھال کر یہ لہجہ اختیار کیا ہے۔
مگر وہ مرد تھا۔
سر سے پیر تک اس کی چاہت میں غرق۔
اور پھر اس لمحے اس کے جذبات انگیز تھے۔
ابھی چند لمحے قبل ہی اس کی آنکھوں کی راہ اس کے اندر اترتے ہوئے اس کے خفتہ جذبوں سے ٹکرا کر دوآتشہ ہو گئے تھے۔
اور پھر سب سے بڑھ کر — آج ہی پہلی بار تو سلوط کی طرف سے اس کے یک طرفہ جذبے کو بڑھاوا اور حوصلہ افزائی ملی تھی۔
پھر بھلا وہ اس کی طرح اپنے شوریدہ سر جذبے پر ایک دم ہی کس طرح بند باندھ لیتا۔
کیونکر اور کس دل سے اسے اندر ہی اندر گھونٹ کر رکھ دیتا۔
اس نے تو اس کے رویے میں اچانک رونما ہونے والے تغیر کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا اور اپنے جذبے کی یورش میں بندھا بندھا بولا
"بھئی آپ کو عید کی مبارکباد دینے بلکہ آپ سے عید ملنے کی غرض سے آیا ہوں۔ لیکن اگر آپ کے خیال میں اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو پھر—"
اس نے شوخ سی معنی خیزی کے ساتھ جس انداز سے فقرہ ادھورا چھوڑا اسلوط کا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل دھک سے رہ گیا کہ اس کی بے باک فطرت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اس پر خود ہی تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر دل کا سارا راز عیاں کر کے اپنی حماقت کا ثبوت دے چکی تھی۔ اب اگر وہ اس کے ساتھ فری ہو جاتا تو کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے بے رخی برتنے میں ہی عافیت سمجھی۔
"لیکن عید تو کب کی گزر چکی ہے۔ اس وقت تو شام ہو رہی ہے۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔
"اونہوں — ابھی تو کل سات ہی بجے ہیں۔ گویا عید کے گزرنے میں ابھی پانچ گھنٹے مزید باقی ہیں اور عید کے لفظی معنی خوشی کے ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ خوشی کسی خاص موقع پر ہی منائی جائے یعنی انسان کا دل اگر خوش اور آسودہ ہو تو عام سے دن بھی اسے عید کی طرح ہی محسوس ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہر روز روز عید اور ہر رات شب برات تو اسی لیے تو کہتے ہیں البتہ آج کے دن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمارا سب سے بڑا تہوار ہے۔ سمجھیں آپ!"
وہ بھلا کہیں قائل ہونے والا تھا۔ اپنی ہی کوئی منطق جھاڑتا ہوا بولا۔ مگر اس کی سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔ البتہ اس سے جان چھڑانے کی خاطر جلدی سے بولی۔
"اچھا تو آپ کو عید مبارک ہو۔"
"واہ اس طرح تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے عید کی مبارکباد نہیں بلکہ آپ بہت جبریہ مبارکباد کا چھلا اتار رہی ہیں۔ بھلا یوں بھی کہیں مبارکباد دی جاتی ہے۔" اس نے سر کو جھٹک کر مبارکباد دینے کے انداز پر نکتہ چینی کی۔
"تو پھر کس طرح دی جاتی ہے مبارکباد؟" وہ زچ ہو کر بولی تو اسفند نے بیڈ پر پڑا اس کا دوپٹہ اٹھایا اور اس کے نزدیک آ کر اس کے شانے پر ڈال کر کہا۔
"یوں اس طرح۔ یعنی پہلے مصافحہ کیا جاتا ہے اور پھر گلے ملا جاتا ہے۔"
"آپ — آپ پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔"
"تو پھر کیسی باتیں کیا کروں؟" وہ بالکل ہی چکنا گھڑا ثابت ہوا۔

"کیسی بھی نہیں۔ بس اب آپ چلے جائیے۔" اس کی موجودگی اسے بڑا ڈسٹرب کر رہی تھی۔ یوں بھی کسی لمحے کسی کے آنے کا...
"ہائیں۔ یعنی چلا بھی جاؤں۔ مگر یہ عتاب کس سلسلے میں؟ آخر میری خطا؟" اس نے قدم بڑھا کر جھکتے ہوئے پوچھا...
گھبرا کر بولی۔
"نہیں نہیں۔ کیسی خطا۔ کیسا عتاب۔ بس آپ جس مقصد سے آئے تھے وہ تو پورا ہو گیا نا۔"
"بھلا کس مقصد سے آیا تھا میں؟ وضاحت کر سکیں گی۔" وہ ایک دم ہی پھر شوخ ہو گیا۔ اور وہ اپنے غلط انداز...
کرنے پر کٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے بات بنا کر بولی۔
"عید کی مبارک باد دینے آئے تھے نا آپ سو دے دی۔"
"گویا اب میں چلا جاؤں۔ یہی چاہتی نا آپ۔" وہ عجیب چلبلے سے انداز میں مسکرا کر بولا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔
"اچھا اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں اسے رد تو نہیں کر سکتا۔" وہ قدرے سنجیدہ ہو کر بولا اور اس نے خاموش رہنا ہی...
یوں بھی اس خیال سے کہ کوئی اسے بلانے آ گیا تو۔ اس کے دم پر بنی جا رہی تھی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن ہمارے ہاں خالی خولی مبارکباد دینے کا رواج نہیں ہے۔" اپنی بات کہنے کے دوران میں اسفند
نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پریزنٹ پیپر میں لپٹی ہوئی کوئی شے نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
"لیجیے۔ گر قبول افتد۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی۔" مگر وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گئی اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
"یہ۔ یہ کیا ہے۔؟"
"صرف ایک حقیر سا نذرانہ جو بندۂ عاجز عیدی کے طور پر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہے۔" وہ عقیدت مندانہ سے انداز میں تھوڑا
سا جذباتی ہو کر بولا مگر وہ مزید چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"نہیں نہیں۔ آپ رشتے میں مجھ سے چھوٹے ہیں اور۔ اور پھر۔ میں کسی سے بھی کوئی تحفہ وصول کرنے کی قائل نہیں ہوں۔"
"مگر میری بات اور ہے۔ کیا اس حقیقت کو آپ جھٹلا سکتی ہیں جو اس قدر غیریت برت رہی ہیں۔ اچھا چھوڑیں اس تکلف
کو۔ میں خود ہی آپ کو پہنائے دیتا ہوں۔"
اس نے پریزنٹ پیپر کو پھاڑتے ہوئے کہا اور پھر سرخ رنگ کے مخملیں کیس کو کھول کر اس میں رکھا ہوا عید کا تحفہ اسے دکھایا۔ ...
کیس میں جھلملاتا فیروزے کا جڑاؤ نیکلس دیکھ کر وہ بری طرح سٹپٹا گئی لیکن اسفند نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جلدی سے وہ
نیکلس اس کی صراحی دار خوبصورت گردن میں پہنا دیا اور پھر بڑی گہری اور پسندیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
"ماشاء اللہ۔ شاید یہ نیکلس خاص طور پر آپ ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کس قدر جچ رہا ہے آپ پر۔"
اپنی تعریف تقریباً سب ہی کی کمزوری ہوتی ہے اور تعریف بھی وہ ہستی کرے جس پر اپنا سب کچھ وار دینے کو جی چاہتا
ہو۔ سلوط کمزور لمحوں کی گرفت میں ایک بار پھر آ گئی تھی۔
اپنی تعریف پر اس کے رخسار دہکنے لگے۔
بارِ حیا سے پلکیں بھی رخساروں پر جھک سی گئیں اور یوں تشکر کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔
"ذرا ادھر آئیے۔" وہ شفق کا بازو پکڑ کر سنگھار میز کا رخ کرتا ہوا بولا اور اسے سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے بولا۔
"ذرا دیکھیے تو کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں آپ۔ میری آنکھیں تو خیرہ ہوئی جا رہی ہیں۔" اور وہ سرخ ہوتے چہرے اور محجوب سی
مسکراہٹ کے ساتھ آئینے پر صرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال سکی کیونکہ وہ اس کے عین پیچھے کھڑا آئینے میں ہی کچھ ایسی پرتپش اور وارفتہ نظروں
سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے اس سے نظر ملانے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکی۔
"شاید آپ کو پسند نہیں آیا۔" اس نے آئینے سے نظریں ہٹا کر سلوط کی جھکی جھکی حیا بار نظروں پر انہیں مرکوز کر کے پوچھا۔
"نہیں تو۔ بہت ہی اچھا ہے۔ انتہائی خوبصورت۔ آپ کا بے حد شکریہ۔" وہ اس کی دل آزاری کے خیال سے کچھ زیادہ ہی پسندیدگی
کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔
"ارے نہیں ممنون اور مشکور تو میں آپ کا ہوں کہ آپ نے اسے پسند کر لیا۔"
"اتنی اجازت تو دے دیں گی نا کہ اس پر اپنے دلی تاثرات ثبت کر دوں۔" وہ اس کے خوبصورت ہاتھ کو غور سے دیکھتا ہوا ملتجی ...

"... نہیں ملے گی۔" سلوط نے اندر ہی اندر گھبرا کر بظاہر شگفتہ لہجے میں ہنس کر کہا۔
"اونہوں۔ ہرگز نہیں۔ اب زیادہ فری ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔" ... بولا۔
... نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"اچھا تو پھر یہ معاملہ بھی آپ پر ادھار رہا۔" وہ بھی ہنس کر بولا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر اسی وقت چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد سلوط ایک خود فراموشی کے عالم میں آئینے کے سامنے کھڑی اس کے عطا کردہ اپنی گردن پر سجے نیکلس کو دیکھتی رہی۔
اس کی قربت کا سحر اب تک اس پر چھایا ہوا تھا۔
وہ مدہوش کن سی خوشبو۔
وہ قطرہ قطرہ پیار کا مدھ ٹپکاتی گفتگو۔
یہ سب کچھ محسوس اور یاد کر کے اس کے خیالات باغی ہونے لگے۔ کوئی اپنی سچی چاہتیں یوں بے دریغ مجھ پر نچھاور کرے اور میں
انہیں اتنی ناقدری اور بے دردی سے ٹھکرا دوں۔ یہ بھلا کہاں کی انسانیت ہے اور پھر سچے اور پاک جذبوں کے ساتھ کسی کو چاہنا
گناہ تو نہیں۔
جیسے کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ اور پھر درانی نے تو جذبۂ انتقام میں اندھا ہو کر خواہ مخواہ ہی مجھے پابندِ سلاسل کر دیا ہے۔
گویا جو کچھ بھی ہوا جبر اور زبردستی کے زمرے میں ہی آتا ہے اور یک طرفہ ہی ہے۔
یعنی میری مرضی کو تو اس میں ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔
پھر بھلا میں کیوں اس کی پابند ہو کر بیٹھوں۔
کیوں ایک فالتو اور بڈھے شخص کے پیچھے اپنی جوانی برباد کروں۔ آخر اس نے مجھے دیا کیا ہے ماسوا ذلت اور پریشانی کے۔
اور پھر میرے سینے میں بھی تو ایک دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔
جس میں ہزاروں خواہشیں بھی ہیں اور امنگیں بھی۔
جذبات کی شوریدہ سری بھی ہے اور احساسات کے بھڑکتے ہوئے شعلے بھی۔ پھر بھلا ایک ایسی ہستی کا جو مجھے جان سے بڑھ کر
عزیز ہو گئی ہے اور خود بھی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے مان کیسے توڑ دیتی۔
کیونکر اور کس دل سے اس سے بے رخی اور بے اعتنائی برت کر اس کے جذبات پر برف کی تہہ جما دیتی۔
وہ جو کتنے ارمان اور امنگیں لے کر عید کی خوشیوں میں مجھے شامل کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا۔
اگر میں نے اس کا دیا ہوا یہ نیکلس قبول بھی کر لیا تو اس میں ایسی کون سی معیوب بات ہو گئی۔ آپس میں تحائف کا تبادلہ تو یوں
بھی جان پہچان والوں تک میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ تو پھر بھی بھابی کا سگا بھتیجا ہے۔
اور اگر یہ گناہ بھی ہے تو بھی مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی اتنی چاہت سے دی ہوئی چیز اسے لوٹا دیتی۔
وہ تو شاید ایک محویت کے عالم میں آئینے کے سامنے یہی سب سوچتے ہوئے پوری رات بِتا دیتی اگر کریم اسے بلانے نہ آ گیا ہوتا۔ زینت
نے اسے فوری طور پر طلب کیا تھا۔
اس نے نیکلس گلے سے اتار کر کیس میں رکھ کر جلدی سے الماری میں مقفل کیا اور دوپٹہ قرینے سے اوڑھ کر باہر نکل آئی۔
اس فوری طلبی پر اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔
وہ لاؤنج میں پہنچی تو زینت کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی نظر آئیں۔ انہوں نے بڑے نفیس کام کی بنی اور بہت قیمتی ساڑھی اور
میچنگ سینڈلز اور ڈائمنڈ کا ہلکا سیٹ پہن رکھا تھا۔ حتیٰ کہ پرس بھی نیا اور لباس سے میل کھاتا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے
قدرے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"اُفوہ بھئی، کہاں رہ گئی تھیں تم جو اتنی دیر کر دی۔ ادھر شام سے اب تک نازش کے کئی فون آ چکے ہیں۔ آج ڈنر ہے نا ہم
سب کا ان کے ہاں۔"
تو جس اندیشے کو ذہن میں رکھ کر اندر ہی اندر سہمتی وہ یہاں تک آئی تھی اس پر فوری قابو پا کر اس نے بھی تیکھے انداز میں کہا۔
"لیکن بھابی جان مجھے کیا خبر تھی کہ آج چھوٹے آغا کے ہاں ڈنر ہے اور میں نے تو بالکل دیر نہیں کی۔ جونہی آپ نے بلوایا میں
فوراً ہی چلی آئی۔"

"کمال ہے۔ صبح سے تو بڑا اسی بات کا چرچا ہو رہا تھا اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔ چلو خیر۔ آؤ اب مزید دیر نہ کرو۔" زینت
شعیب منصور کو کمرے کی جانب سے آتے دیکھا تو گویا قصہ مختصر کرتی ہوئی بولیں۔

"لیکن میرا وہاں جانا ایسا کوئی ضروری تو نہیں بھابی جان۔ یوں بھی گھر بالکل اکیلا رہ جائے گا۔" اس کا واقعی کہیں جانے کا
موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مگر ——" زینت نے کہنا چاہا۔

"ارے بھئی، اگر مگر کیسی۔ سلوط تو گیسٹ آف آنر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ضرور جائیں گی خواہ گھر میں ڈاکہ ہی کیوں نہ پڑ جائے۔"
شعیب منصور نے بیوی کو اسے ساتھ لے جانے میں پس و پیش سے کام لیتے دیکھا تو نزدیک آکر بولے۔ زینت کو ان کے گیسٹ
آف آنر کہنے پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر انہوں نے فہمائشی سا انداز اختیار کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

"اے ہے۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا نہ کرے جو گھر میں ڈاکہ پڑے۔ مالی بھی اپنے بیوی بچوں کو سیر کرا کے آگیا ہے
اور چوکیدار بھی ہیں گھر میں۔"

"چلیے خیر۔ اب جلدی سے چلیے —— ورنہ اگر وہ بابا صاحب کا ناریل چٹخ گیا تو وہ کپڑے وپڑے اتار کر بستر میں لیٹ جائیں گے۔"
شعیب منصور نے بیوی کے آڑے ترچھے موڈ کے پیشِ نظر جلدی سے بیٹے کا ڈراوا دیا تو زینت باہر کا رخ کرتی ہوئی بولیں۔

"اوہو۔ ہاں —— میں تو بھول ہی گئی کہ بابا باہر کار میں ہمارے منتظر ہیں۔ آؤ بھئی سلوط اب آ بھی جاؤ —— اور ہاں کریم
باہر سے دروازہ لاک کر کے گیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ مگر دیکھو باہر کا بھی خیال رکھنا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"

"ہاں بھئی اور ایک بندوق بھی ہاتھ میں لے لینا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوائی فائر کرتے رہنا تاکہ چور ڈکیت دور سے ہی
بھاگ جائیں۔"

شعیب منصور نے بیوی کو اتنی ہدایات دیتے ہوئے دیکھ کر ہنستے ہوئے انداز میں گویا ایک لقمہ سا دیا تو وہ ان پر ایک
تیکھی نظر ڈال کر رہ گئیں۔

"میں نے اس لیے تو نہیں کہا کہ سچ مچ کوئی ڈاکہ ہی پڑنے کا امکان ہے۔ بلکہ یہ نوکر لوگ مالکوں کی غیر موجودگی میں ہمیشہ غافل
ہی ہو جاتے ہیں اور خدا بری گھڑی سے بچائے محتاط رہنا تو اچھی بات ہی ہوتی ہے۔"

پھر سلوط سمیت دونوں میاں بیوی پورچ میں آئے تو اسفند کو ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا دیکھ کر شعیب منصور نے دبی
دبی آواز میں زینت سے کہا۔

"شکر کریں ینگ مین کا خون ابھی جوش میں نہیں آیا۔"

"ارے چھوڑیں —— ایک تو بےچارے بابا اتنی شرافت سے بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ بس خواہ مخواہ کی چھیڑ
چھاڑ۔" زینت فہمائشی سے انداز میں بولیں تو سلوط ان کے شرافت سے بیٹھے کہنے پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

والدین کو دیکھ کر وہ ازراہِ ادب اور اخلاق دروازہ کھول کر باہر اترنے لگا تو شعیب منصور نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں سنی —— تمہیں اترنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم خود ہی بیٹھ جائیں گے۔"

"ہاں ہاں نو فورمیلٹی سنی —— ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں۔"

زینت نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ مگر چونکہ وہ باہر نکل آیا تھا اس لیے اس نے ماں کے لیے پچھلی سیٹ
کا دروازہ کھول ہی دیا۔ کہ شعیب منصور اگلی سیٹ کا دروازہ خود ہی کھول چکے تھے۔

بہرکیف پھر چار نفوس پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ سہیل منصور کی رہائش کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں شعیب منصور اور
زینت ہی باتیں کرتے رہے۔ نہ معلوم وہ کیسے موڈ میں تھا جو ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ البتہ وہ چونکہ عین اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اس
لیے بیک ویو مرر میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس پر ایک نگاہ ضرور ڈالتا رہا۔ اور زینت کی موجودگی کی وجہ سے وہ اس کی اس
حرکت سے بھی سخت ہراساں سی ہو رہی تھی۔ اس لیے زیادہ تر چہرہ کھڑکی کے رخ کیے باہر دیکھتی رہی تھی۔ مگر ایک آدھ بار بیک
ویو مرر میں دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی بھی تھیں تو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب برہم سا تاثر دیکھ کر وہ اندر ہی اندر
مضطرب سی ہو گئی تھی۔

سہیل منصور کے خوبصورت ترین بنگلے الکوثر پہنچے تو روشنیوں کی جگمگاہٹوں سے وہاں دن کا سا
سماں ہو رہا تھا۔ —— وہ کچھ ہی دیر بعد بارے اس پر رونق اور چہل پہل بھی بہت تھی۔ سینکڑوں نہ سہی مگر پچاسیوں مہمان ضرور آئے ہوئے تھے۔ ڈریس سوٹس
میں ملبوس خواتین کی ایک بہار سی آئی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے روپہلے اور سنہری آنچل بھی ہر سو لہراتے نظر آرہے تھے۔ اس
پر جھلملاتے اور چکاچوند مچاتے زیورات کی نمائش اور حسیناؤں کی ایک پریڈ سی۔ کوثر —— نازو —— نیلوفر اور نیلما نے بھی بڑے ہی
بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور حسن و امارت کی اس محفل میں جا کر وہ بری طرح احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی تھی۔
نازش اور کوثر نے بڑی گرمجوشی اور خندہ پیشانی سے اس کا سواگت کیا تھا۔ مگر شعیب منصور کے کہنے کے مطابق
تو سہیل منصور، نازش وغیرہ کی نظر میں وہ گیسٹ آف آنر کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ نازش اور کوثر وغیرہ جیسے دوسرے مہمانوں کا گرمجوشی سے سواگت کر رہے تھے۔
اسی طرح اس کا بھی کیا تھا۔ اور پھر اپنے کاموں اور دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ نیلوفر تو اسے دیکھ کر دور ہی سے کٹ
گئی تھی۔ نازو اپنے شوہر کے ساتھ اندر ہال میں بیٹھی تھی۔ نیلما نے البتہ ضرور اس کے پاس آکر اس کی مزاج پرسی کی تھی۔ مگر وہ بھی کچھ
ہی دیر بعد اپنی سہیلیوں میں رل مل گئی تھی۔

کوثر بھی مہمانوں کی خاطر تواضع اور سہیلیوں سے باتوں میں مصروف تھی۔ زینت اور شعیب منصور اپنے دوست و احباب کے ساتھ
مصروفِ گفتگو تھے۔ اور ایک وہ تھا۔ جس کے بارے میں اسے یہ خوش فہمی تھی۔ کہ کم از کم وہ اسے کسی محرومی یا احساسِ کمتری کا شکار
نہیں ہونے دے گا۔ تو وہ بھی اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کیے مردوں اور خواتین کے جھرمٹ میں ہیرو بنا بڑے اسٹائل سے مسکرا مسکرا
کر باتیں کر رہا تھا۔

ڈنر یعنی عشائیہ میں تو پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے کچھ ہی دیر بعد دعوتِ طعام تناول فرمانے میں مصروف ہو گئے تو پھر وہی
حالت ہو گئی —— یعنی —— بہت وسیع طعام خانے (ڈائننگ روم) میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دیواروں کے ساتھ
لگی طویل میزوں پر قابوں —— ڈونگوں اور پلیٹوں پر مہمان فاقہ کشوں کی طرح ٹوٹ پڑے —— وہ بھی سب کی دیکھا دیکھی اپنی پلیٹ
میں تھوڑی تھوڑی چیزیں ڈال کر ایک کونے میں کھڑی ہو کر کھانا کھانے لگی۔ تبھی وہ ایک بہت ہی حسین اسٹائلش اور ویل آف لڑکی
سے باتیں کرتا ہوا۔ اس کے آگے ہی آکر کھڑا ہو گیا۔ سارے ہال میں ہی انگلش کچھ اتنے فراٹے سے بولی جا رہی تھی کہ یوں محسوس ہو رہا تھا
جیسے اردو کا کوئی وجود کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اور بس انگلش سب کی مادری زبان ہو۔

بڑے تعجب کی بات ہے یہ بھی۔

انگریز خود تو برصغیر ہند و پاک سے اپنی حکومت کا بیڑہ اٹھا کر چلا گیا مگر ایک متنازعہ کی صورت میں اپنی مادری زبان انگریزی کا لنگر
بڑی گہرائی سے زمین کی تہہ میں دبا چھوڑ گیا۔

اب جو انگریزی بولے یا جانے تو مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نکتہ چینی اور اعتراضات کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔"
اور اگر نہ جانتا ہوا سے چپراسی اور دربان سے اونچی ملازمت کا اہل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

حد تو یہ ہے کہ اگر ایک عام اور ادنیٰ سا شخص بھی انگریزی زبان میں تھوڑی سی گٹ پٹ کر لے تو لوگ باگ اس سے مرعوب ہو
جاتے ہیں۔

اس پر نعرے بلند کیے جاتے ہیں کہ اردو سیکھو۔ اردو بولو۔ اردو پڑھو کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔
اور جب اپنی قومی زبان میں درخواست لکھ کر کسی دفتر یا محکمے میں بھیجی جاتی ہے تو اس کا یہ حشر ہوتا ہے کہ چاک کر کے ردی کی ٹوکری
کی نذر کر دی جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں انگریزی کو نیم سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

واہ کیا تضاد ہے یہ بھی۔

اس نے چند بالشت کے فاصلے پر اپنے آگے کھڑے اسفند اور اس کی حسین ساتھی کو آپس میں انگریزی میں باتیں کرتے دیکھ کر
دل ہی دل میں سوچا۔

گو انگریزی زبان اسے اچھی طرح بولنی نہیں آتی تھی۔ مگر وہ سمجھ ضرور لیتی تھی۔ لیکن کچھ تو ارد گرد کھڑے مہمانوں کی باتوں کے شور میں
اور کچھ اپنے اس بری طرح نظر انداز کیے جانے کے غم میں اس نے ان کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی۔ اور دل میں اٹھتی ہلکی ہلکی سی
کسک کے ساتھ آہستہ آہستہ کھانا کھاتی رہی۔ پھر جب کچھ دیر بعد وہ لڑکی اسفند سے کچھ کہہ کر اپنی خالی پلیٹ لیے میز کی طرف بڑھی تو

اسفند یکایک اس کی طرف گھوما اور اس کے خالی گلے پر نظر ڈال کر بولا۔

"میں نے وہ نیکلس خاص طور پر اسی اوکیژن (موقع) پر پہننے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ کم از کم زیور کے معاملے میں تو کمپلیکس کا شکار نہ ہوں مگر آپ شاید ان باریکیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں تبھی تو اسے کہیں پھینک آئی ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیاں برداشت نہیں کر سکتا۔"

اتنا کہہ کر وہ اسی تیزی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔ اُف کیسا کٹیلا اور زہریلا لہجہ تھا اور اس نے کہا بھی تو کیا۔ کر... مزاج اور سخت سے سخت بات کو سہار جانے والی لڑکی کو جسے اول تو کبھی غصہ نہیں آتا تھا اور جو کبھی آتا بھی تھا تو وہ ... کر کے اور رو دھو کر خود کو ہی سزا دے لیتی تھی کہ منہ سے کچھ کہنے یا کسی اور پر اپنا غصہ اتارنے کا اس میں بوتا ہی کہاں تھا۔ اس ... کو اس سمے کچھ اتنا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا ہر شے کو پھونک کر رکھ دے۔ فنا کر دے۔

سارے جسم میں آگ سی بھر گئی تھی اور وہاں کھڑا رہنا اسے دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ پلیٹ کو میز پر رکھنے کے بجائے اسی ... سی کیفیت میں ہاتھ میں لیے ڈائننگ ہال سے باہر آ گئی۔ کہ اب ایک منٹ بھی وہاں رکنا اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ ... ایک پسیج نما آراستہ و پیراستہ سے کمرے میں بہت سے ملازم اور بیرے۔ کھانے کی قابیں اور ڈونگے اور کریٹس اٹھائے ادھر ادھر آ جا رہے تھے اور انہیں میں اتفاق سے اسے سہیل منصور کا نوکر مارشل کریٹ ہاتھوں پر اٹھائے آتا نظر آیا تو اس نے فوراً ہی اسے روک کر کہا۔

"سنو مارشل۔ یہ کریٹ کسی اور کو دے دو اور بھاگ کر قدیر کو باہر سے بلا لاؤ۔ میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے اور میں فوراً گھر جانا چاہتی ہوں۔" مارشل اس سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ شعیب منصور کے گھر کی ہی ایک فرد ہے۔ اس پر جس انداز میں اس نے اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بلا تامل جی اچھا کہہ کر قریب سے گزرتے ایک بیرے کے ہاتھ میں کریٹ تھمائی اور پھر فوراً ہی قدیر کو بلانے چل دیا۔ اور وہ پسیج اور کوریڈور کو عبور کر کے پورچ کی سیڑھی پر آ کھڑی ہوئی۔ کہ وہ کسی کے علم میں یہ بات لانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ پارٹی چھوڑ کر اکیلی گھر جانے کا ارادہ کر بیٹھی ہے۔ یہ بھی بہت غنیمت ہوا تھا کہ اس لمحے سب کھانا کھلانے میں مصروف تھے اس لیے کسی نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر تھوڑی ہی دیر بعد مارشل قدیر کو ساتھ لیے واپس آ گیا۔ مگر قدیر کار لے کر نہیں بلکہ پیدل چل کر آیا تھا۔ کیونکہ اس روز دعوت کی وجہ سے ساری کاروں کو گیٹ سے باہر ہی پارک کرایا گیا تھا۔ اس نے قدیر کے سامنے بھی یہی بات دہرائی جو مارشل سے کہی تھی۔ تو قدیر بولا۔

"جی اچھا ——— میں آپ کو منٹوں میں گھر چھوڑ آؤں گا۔ بس ذرا صاحب بہادر سے اجازت لے لوں۔" تو وہ بگڑ کر بولی۔

"لو اب اتنی سی بات کے لیے اجازت لو گے۔ کیا مجھے جانتے نہیں تم۔"

اور مارشل نے بھی کہا کہ بس چند منٹ کی تو بات ہی ہے۔ اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جا کر جلدی سے بی بی کو گھر چھوڑ آؤ۔ تب کہیں جا کر قدیر نے اسے گھر لے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور اسے لے کر بنگلور ٹاؤن کی سمت روانہ ہو گیا۔

پھر اسے کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کن کن راستوں سے گزرتی رہی۔ قدیر نے ہوائی جہاز کی رفتار سے کار چلائی اسے تو اس وقت ہوش آیا جب کار شعیب منصور کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

کریم اس لمحے گیٹ کے نزدیک بچھی چارپائی پر بیٹھا دربان سے باتیں مٹھار رہا تھا۔ گاڑی کو گیٹ پار کرتے دیکھ کر وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اور جلدی سے گھر کا داخلی مقفل دروازہ کھول دیا۔ اصل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید گھر والے واپس آ گئے ہیں۔ مگر جب اس نے تنہا ... کو کار سے برآمد ہوتے دیکھا تو اسے سخت اچنبھا ہوا۔

"سلوط بی بی آپ ——— آپ کیسے آ گئیں ———؟" وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو اس نے پوچھا۔

"میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے چلی آئی ہوں۔ اور سب تھوڑی دیر بعد آئیں گے۔ تم ایسا کرو کہ باہر سے دروازہ اسی طرح لاک کر دو۔" اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا اظہار اپنے لب و لہجہ سے بھی کیا۔

"او ہو تو آپ کے لیے چائے یا کافی بنا دوں ——— یا پھر ٹھنڈی بوتل لا دوں۔" اس نے یہ کہہ کر گویا اخلاق نبھایا۔

"نہیں بس مہربانی ——— میری طبیعت بری طرح مالش کر رہی ہے۔ میں اب پڑ کر سوؤں گی۔ بس تم اتنا کرو کہ باہر سے دروازہ لاک کر دو۔"

وہ قدرے بیزار کن سے لہجے میں بولی۔ اور پھر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

... کریم کی خاطر داری اس سمے سخت کھلی ———

دماغ میں اب تک سرخ آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اور بدن میں شعلے سے دہک رہے تھے۔

پورے راستے وہ کچھ ایسی ہی کیفیت میں تپتی آئی تھی۔

کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو گئی تھی۔

مگر اپنے رہائشی کمرے میں آ کر بستر پر ڈھیر ہوتے ہی ساری صلاحیتیں ———

ساری حسیات یکدم جاگ اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی اسفند کا تحقیر آمیز رویہ اور اہانت آمیز الفاظ بھی ———

اس کی گفتگو تو یوں بھی سماعت میں مسلسل ٹیپ کی طرح بج رہی تھی۔

"میں نے وہ نیکلس خاص طور پر اسی اوکیژن پہ پہننے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ کم از کم زیور کے معاملے میں تو آپ کسی کمپلیکس کا شکار نہ ہوں۔ مگر آپ شاید ان باریکیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں تبھی تو اسے کہیں پھینک آئی ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

اُف اُس نے یہ سب کیوں کہا ——— کیوں کہا ———

کیا سمجھتا ہے وہ مجھے ——— کیا میں ایسی ہی گری پڑی ہوں یا اس کی محکوم ہوں۔

صاف ظاہر ہے وہ میری ذات میں اپنی دلبستگی کے سامان ڈھونڈ کر مجھ سے ایک جز وقتی کھیل کھیل رہا ہے۔

ورنہ اس کی نظر میں میری کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں ———

وہ صرف میری خوبصورتی اور جوانی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

تبھی تو اتنا خود مختار ہوتے ہوئے بھی اس نے آج تک مجھے کسی معاملے میں بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب کے سامنے وہ مجھ سے اس قدر لاتعلق اور دور دور رہتا ہے۔ جیسے میرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

اور میں، ہوں کہ زندگی کا ایک سنگین تجربہ اٹھا کر بھی اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی۔

سب کچھ جانتے ہوئے بھی کھلی آنکھوں سے دھوکا کھا گئی۔

تف ہے مجھ پر ——— جو میں نے اس کے چند جذباتی فقروں سے متاثر ہو کر اس کا تحفہ قبول کر لیا۔

وہ بھی ——— کسی اور کی امانت ہوتے ہوئے ایک غیر محرم شخص سے صاف اور صریح گناہ ہی ہوا یہ تو ———

تبھی تو اس کی اتنی جلد سزا بھی مل گئی ———

اور سب سے بڑھ کر گناہگاری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس سے دل ہی کیوں لگایا؟

کیوں ایک غیر اور نامحرم شخص کی محبت میں گرفتار ہوئی۔

وہ بھی سب کچھ جانتے ہوئے۔

اتنے تلخ تجربات اٹھانے کے بعد ———

میری مت واقعی ماری گئی تھی۔

مجھے میرا اس جوان العمری کی شوریدہ سری نے اندھا ہی کر دیا تھا۔

ورنہ یہ سب کچھ جس کا وہ گاہے بگاہے مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ اسے سمجھ لینا کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا۔

مگر میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی دھوکا کھاتی رہی۔

سارا قصور میرا ہی ہے۔

وہ غصے اور تاسف کی آگ میں جلتی بڑی دیر تک اپنے بستر پر بیٹھی یہی سب سوچتی رہی۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ لوگ واپس آ کر اس سے اس کے یوں بلا بتائے ایکدم ہی وہاں سے چلے آنے پر استفسار نہ کرنے آ جائیں وہ جلدی سے اٹھی۔ لباس تبدیل کیا اور اپنے نزدیک وہ منحوس نیکلس الماری سے نکالا۔ کھٹکا کھول کر باہر آئی۔ اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ان لوگوں میں سے ابھی تک کوئی ایک بھی واپس نہیں پلٹا۔ اس نے سیدھا اسفند کے کمرے کا رخ کیا۔

مگر اسفند کا کمرہ بھی مقفل تھا۔ اور وہ جو اسی ارادے سے آئی تھی کہ نیکلس سمیت وہ مخملیں کیس کسی طرح
ہی اس کے کمرے میں پھینک دے گی تو دروازے کی مضبوطی اور ہموارین نے دروازے کے نیچے سے بھی اس گے اس
نہ ہونے دیا۔ تب وہ ناکام اور دل برداشتہ سی ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ کمرے کی لائٹ بجھائی اور بستر پر ڈھیر ہو گئی
آنسوؤں نے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سیلاب کی سی شکل اختیار کر لی۔ اور یہ سیلاب گھنٹوں تک بہتا رہا۔

ادھر کھانا ختم ہوتے ہی قلفی کا دور چلا اور اس کے ساتھ ساتھ مہمان پھلوں سے بھی طبیعت سیر کرتے رہے۔ اسفند بھی
میں شریک رہا۔ اور وہ جو سدا سے سنتے آئے ہیں بلکہ مردوں کا ایک وطیرہ سا بن گیا ہے کہ وہ دعوتوں اور تقریبوں میں عموماً
کے گرد ہی منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ تو آج کی بے کینڈے تہذیب نے اس بات کو بالکل ہی الٹا کر کے رکھ دیا ہے۔ آجکل عام طور
دیکھنے میں آتا ہے کہ حسین لڑکیاں اپنے نسوانی وقار کو تج کر خوبصورت مردوں اور گلیمر بوائز کے گرد منڈلاتی نظر آتی ہیں اور دعوت
پیشکش کے ساتھ ساتھ۔۔۔

ڈیٹس فکس کی جاتی ہیں۔
ٹیلی فون نمبر بتلائے جاتے ہیں۔
پہلے کہا جاتا تھا کہ اے عورت تیرا دوسرا نام کمزوری۔۔۔
اور اب ۔۔۔ آج کے عصری تقاضوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اے عورت تیرا دوسرا نام شہ زوری۔
اور اسفند کے گرد بھی بہت سی حسینائیں منڈلاتی رہی تھیں۔ اور اس پر اپنے حسن اور امارت کا جال پھینکنے کے ساتھ ساتھ اپنے
اپنی ادائیں بھی دکھلاتی رہی تھیں۔ اور وہ تھا ایک کھلے ذہن اور فراخ دل کا مالک ۔۔۔ یعنی بہت ہی روشن اور آزاد خیال۔
اور پھر آج کی سوسائٹی میں تو سب کچھ ہی روا ہوتا ہے۔
یعنی مرد اور خواتین آپس میں ہنس بول بھی سکتے ہیں۔
ہنسی مذاق بھی کر سکتے ہیں۔
اور بڑی آزادی اور بے باکی سے اپنے اپنے تاثرات بھی ایک دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں۔
بہرحال اسفند بڑی دیر تک اپنے دوستوں اور حسین ساتھیوں کے ساتھ طعام اور کلام میں مصروف رہا۔ اور اس نے یہ دیکھنے
کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کی دل شکن باتوں نے سلوط پر کیا قیامت ڈھائی۔
یا اس کی ڈانٹ اور پھٹکار نے سلوط پر کیا اثر کیا۔
اور وہ کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔
وہ تو جب کھانے کے کچھ دیر بعد ۔۔۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور اس کے گرد بندھا حسیناؤں کا جھرمٹ ٹوٹ
گیا۔ تبھی اسے سلوط کا خیال آیا۔ پہلے تو اس نے ان جگہوں پر جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ جا کر اسے دیکھا۔ حتیٰ کہ
باہر نکل کر بھی پھر کوثر سے آ کر اس کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے بالکل نہیں معلوم کہ سلوط آپا کہاں ہیں۔ میں نے تو انہیں ڈائننگ روم میں آپ کے پیچھے کھڑا دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو وہ نظر
ہی نہیں آئیں" اور تب یہ سوچ کر کہ وہ کہیں اندر ہی کسی کمرے میں ہو گی وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔
مگر جب باتیں کرتے اور چٹکلے چھوڑتے چھوڑتے رات کا ایک بجنے لگا تو زینت اور شعیب واپسی کے ارادے سے ایکدم اٹھ
کھڑے ہو گئے۔ نیلوفر اپنی گاڑی لائی تھی۔ اس لیے وہ نیلما کو اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ زینت کو ایکدم ہی سلوط کا خیال آیا تو۔
انہوں نے نیلوفر سے کہا کہ وہ اُسے بھی اپنی کار میں لے جائے۔ اور تب پہلے اسے آواز پڑی اور پھر اس کی ڈھونڈیا مچی ۔۔۔ اور جب وہ کہیں
نہیں ملی تو سب ہی کو تشویش لاحق ہوئی۔
قدیر کو کھانے کے بعد سہیل منصور نے چھٹی دے دی تھی۔ اور بار شل جھوٹے برتن اور سامان سمیٹنے میں لگا ہوا تھا۔ ورنہ وہ
فارغ ہوتا تو کسی کو بھی اتنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اسی پریشانی میں سوئیاں دو کے ہندسے سے آگے نکل گئیں۔ تب طے ہی
پایا کہ شعیب منصور اور ان کی فیملی اپنے گھر چلی جائے۔ سلوط کی اچانک روپوشی کے بارے میں اگر کوئی اطلاع ملے گی تو فون کے ذریعے
یہ لوگ انہیں مطلع کر دیں گے۔ اور اس طرح یہ سب پھر واپس آئے تو کریم کی زبانی پتا چلا کہ سلوط تو نو بجے ہی واپس آ گئی تھی۔ اور

لیکن زینت جنہوں نے یہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ
منصوری کار ہی اسے ڈراپ کر کے گئی تھی۔ تب جا کر اسفند کی جان میں جان آئی ۔۔۔
بڑے سخت کوفت اٹھائی تھی ۔۔۔ تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔
معلوم ثاقب بھائی نے کیسی تربیت دی ہے سلوط کو ۔۔۔ ذرا بھی تو ایٹی کیٹس (علم مجلسی) سے واقف نہیں ہیں ۔۔۔ لو بھلا اگر
بیت ہی خراب ہو رہی تھی تو کم از کم بتا کر تو آتیں۔"
ہونہہ ہمیں کیا بتا کر آتیں جبکہ انہوں نے تو چچا جان سے بھی اجازت نہیں لی ۔۔۔ سخت اَن کلچرڈ شخصیت ہیں یہ سلوط بھی۔"
"خیر خیر اب ایسے ثقیل الفاظ تو نہ استعمال کرو۔ یہ تو اب صبح ہی کو معلوم ہو سکے گا کہ انہوں نے ایسی بچکانہ حرکت
کیوں کی۔ اس وقت تو تم سب جا کر سو جاؤ وقت ڈھائی بجے سے اوپر ہی ہو گیا ہے۔" شعیب منصور نے ہمیشہ کی طرح بات
رفع دفع کرنے کی غرض سے کہا۔
"ہونہہ خاک سو جاؤ۔ سارا مزا تو کرکرا کر کے رکھ دیا اس اسٹوپڈ سی لڑکی نے۔"
نیلوفر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ مگر اسفند خاموش ہی کھڑا رہا اور اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں چل دیا۔ کہ سلوط
کے اچانک وہاں سے آ جانے کی وجہ سے وہی بخوبی واقف تھا۔ اور لباس تبدیل کرنے سے لے کر بستر پر لیٹنے کے عرصے
تک دماغ پر زور ڈال ڈال کر یہی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ ایسا میں نے کیا کہہ دیا تھا غصے میں کہ سلوط ناراض ہو کر
گھر گئی پھر ایک دم ہی اسے نیلوفر کا ریمارک یاد آیا۔
"انہوں نے تو چچا جان سے بھی اجازت نہیں لی۔ سخت ان کلچرڈ شخصیت ہیں یہ سلوط بھی۔" اور اس کے ساتھ ہی ڈیڑھ
دو گھنٹے کی پریشانی اٹھانے کا خیال آیا تو اس نے سرہانے جلتا لیمپ آف کیا اور آرام سے پیر پسار کر آنکھیں بند کر لیں۔
اگلی صبح چھٹی ہونے کی وجہ سے تقریباً تمام اہل خانہ ہی دن چڑھے بیدار ہوئے تھے ماسوا سلوط کے جو بھرپور نیند لے کر
حسب عادت اور معمول بہت سویرے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اور کوئی نہیں تو کم از کم زینت بیدار ہوتے ہی
اس کے پاس آ کر رات کی حرکت پر اس کی خبر ضرور لیں گی۔ اس لیے بیدار ہونے کے باوجود وہ بستر پر لیٹی رہی۔ یوں
بھی رات بھر رونے کی وجہ سے اس کے پپوٹے متورم ہو گئے تھے۔ اور چہرہ بھی ستا کر رہ گیا تھا۔ رنج و ملال اب
بھی کاری تھا اس لیے ہر شے سے دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ گڑگڑ کرتا پیٹ بری طرح سے اپنے خالی ہونے پر
احتجاج کر رہا تھا۔
مگر وہ ہر احساس سے بے نیاز منہ لپیٹے بستر میں پڑی سوچ رہی تھی کہ کیونکر اور کیسے اسفند کو وہ نیکلس لوٹائے۔
کیونکہ وہ جب بھی کبھی ڈیوٹی پر یا گھر سے باہر جاتا تھا ہمیشہ اپنا کمرہ لاک کر کے ہی جاتا تھا۔ البتہ جب گھر میں موجود ہوتا
تو اس کا کمرہ کھلا رہتا تھا اور اس کی موجودگی میں جانا تو بڑی بات وہ تو اب اس کے سامنے پڑنے کی بھی روادار نہ تھی۔
کبھی سوچتی کیوں نہ وہ کیس ایک پیکٹ میں ڈال کر کریم کے ہاتھ بھجوا دے۔ مگر پھر فوراً ہی خیال آتا کہ اگر وہ پیکٹ کریم
نے کسی اور کے ہاتھ میں تھما دیا یا خود کسی نے زبردستی کریم کے ہاتھ سے لے لیا تو۔ تو پھر۔ جو بات ابھی اس کے
اور اسفند کے درمیان ہی محدود ہے۔ اگر طشت از بام ہو گئی تو پھر شامت میری ہی آئے گی۔ اور میں ہی گردن زدنی
قرار دی جاؤں گی۔
کبھی خیال آتا کہ بذریعہ پارسل ہی اسے لوٹا دے مگر وہی بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا پیچیدہ سا مسئلہ آڑے
آ جاتا۔ کہ پارسل ڈاک خانے تک کس سے بھجوائے گی اور جو پارسل کہیں ادھر ادھر ہو گیا تو وہ یہی سمجھے گا کہ اس نے اس
کے تحفے کو حرز جاں بنا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے کیونکہ اس کے نزدیک اس نیکلس کو اپنے پاس رکھنا ایسا ہی تھا جیسے کسی
زہریلے سانپ کو پالنا۔ کہ احساس گناہ نے اسے بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد اس نیکلس سے چھٹکارا
حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نیکلس لوٹا کر وہ اسفند کو یہ جتا دینا چاہتی تھی کہ اسے ایسی چیزوں
کی خواہش ہے نہ ہی وہ آئندہ اس سے کوئی تعلق رکھنا چاہتی ہے۔ غرض کہ صبح سے وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں بری طرح
الجھی ہوئی تھی کہ دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب۔ بند دروازے پر دستک کی آواز کے ساتھ زینت کی آواز آئی۔
"ارے بھئی کیا آج اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے سلوط۔ ذرا دروازہ تو کھولو۔"

"دروازے کا کھٹکا تو کھلا ہوا ہے بھابی جان۔ آپ اندر آجائیے۔" اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ... دروازے کے پٹ کھول کر اندر آگئیں۔ تیور تو اچھے نہیں تھے مگر اسے بستر پر لیٹا دیکھ کر انہوں نے ...

"کیوں خیریت تو ہے سلوط۔؟ رات کو بھی ایسے چپکے سے آگئیں کہ گھر بھر کو پریشان کر کے رکھ دیا ... ہی خراب ہو گئی تھی تو مجھ سے یا چھوٹی دلہن یا پھر بچیوں سے ہی کہہ دیا ہوتا۔" نہ کہتے ہوئے بھی وہ بہت ... کچھ کہنے سے گریز کیا اور قریب آکر بولیں۔ لہجہ بھی گلہ آمیز نہیں خبر لینے کا سا تھا۔

"اچھا۔ مگر مارشل اور قدیر کو تو اچھی طرح معلوم تھا کہ طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے میں گھر آگئی تھی ... کے کہنے پر قدیر ہی مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ لوگوں نے کم از کم ان دونوں سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ جو خواہ مخواہ ... وقت برباد کیا۔" سلوط بھی قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔

"خیر وہ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ مگر اب کیسی طبیعت ہے تمہاری جو خلافِ معمول ابھی تک لیٹی نظر آرہی ہو۔" زینت ... اس کی مزاج پرسی بھی کی تو بھلا کس طرح۔

"طبیعت تو رات ہی خراب ہو گئی تھی میری۔ اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی کسلمندی محسوس ہو رہی ہے ... لیے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ البتہ آپ کو مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو اُٹھ جاتی ہوں۔" سلوط نے کہا تو زینت جلدی ... بولیں۔

"نہیں نہیں تم لیٹی رہو۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔ اچھا اگر تمہاری طبیعت خراب ہے تو ... میں تمہارا ناشتا یہیں کمرے میں بھجوا دیتی ہوں۔" اپنی بات کہہ کر وہ کریم کو آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں ... نے ہر بات اپنے مطلب کی کی تھی۔ مگر جھوٹے منہ بھی یہ نہیں پوچھا تھا کہ ایسی کیا طبیعت خراب ہو گئی تھی تمہاری ... ہو؟ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس سے کام لینے کی غرض سے ہی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اصل میں عید کا دوسرا ... دن تھا اور رات کو ناز پرور کے شوہر اور سسرال والوں کی دعوت تھی۔ اور زینت یہی چاہ رہی تھیں کہ وہ آکر خانساماں کا ہاتھ ... بٹائے مگر اس پر بھی غصہ سوار تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ——— ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی ناقدری پر وہ ان سے ... دل برداشتہ ہو گئی تھی اس لیے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیے سارا دن بستر میں ہی پڑی رہی تھی۔

مگر روز روز تو یہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ جبکہ وہ خود بھی اس قدر آرام کرنے کی عادی نہیں تھی۔ گذشتہ شب نازیہ ... بھی اس کی مزاج پرسی کو آئی تھی اور کوثر تو خاصی دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ کچھ اس لیے بھی اس کے دل سے تھکا ... تکدر چھٹ گیا تھا۔ یوں بھی اسے اگر کسی بات کی فکر تھی تو وہ اسفند کو اس کا دیا ہوا نیکلس لوٹانے کی۔ جس کے لیے اس نے ... ہزاروں نہ سہی تو سینکڑوں ترکیبیں ضرور سوچی تھیں۔ اور اسی سوچ و بچار میں مزید دو دن اور گزر گئے تھے تب کہیں جا کر ... اسے یہی ترکیب بہت مناسب اور موزوں لگی کہ کسی طرح خود اس کے کمرے میں جا کر وہ نیکلس کہیں رکھ آئے۔ مگر مشکل ... یہ تھی کہ پہلے تو عید کی چھٹیوں کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر ہی میں رہتا تھا اور جو باہر بھی جاتا تو ہمیشہ اپنا کمرہ ... مقفل کر کے ہی جاتا تھا۔ پھر چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا۔ گھر واپس لوٹتا تو ـــ بھی زیادہ تر اپنے ... کمرے میں ہی رہتا تھا۔ البتہ ناشتے اور کھانے کے وقت وہ اپنا کمرہ کھلا چھوڑ کر ہی نکلتا تھا۔ اور سلوط نے وہی ... وقت اور موقع تاکا تھا۔

اس روز اتفاق سے عام تعطیل کا دن تھا۔ عید کو گزرے کل چھ روز ہی ہوئے تھے۔ مگر عید کی خوشیاں اب تک منائی ... جا رہی تھیں۔ چھٹی کے دن زینت اس وقت کریم اور جمعدار سے اس کے کمرے کی صفائی کراتی تھیں جب وہ ناشتا کرنے کی ... غرض سے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ اور چونکہ اس کا قاعدہ تھا کہ چھٹی کے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لاؤنج ... میں بیٹھ کر کچھ وقت اخبار بینی میں گزارتا تھا۔

گویا سلوط کے خیال میں نیکلس اس کے کمرے میں رکھ آنے کا اس سے بہتر کوئی موقع ہی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے وہ اس سے بدظن اور کبیدہ ہوئی تھی اس نے اس کے سامنے پڑنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسی کی وجہ ...

... بھی علیحدہ بیٹھ کر کرتی تھی اور کھانا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھانے کا وقت ٹال کر کھاتی تھی۔ اور اس روز ... نیکلس لوٹانے کے چکر میں وہ ناشتا کرنا ہی بھول گئی تھی۔

... نیکلس اتنی خوبصورتی سے بغل میں دبائے کہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے وہ اسفند کے کمرے سے کریم اور جمعدار ... کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاؤنج میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر ...

... انتظار کے بعد کسی طرح کریم اور جمعدار اس کے کمرے کی صفائی کر کے باہر نکلے تو وہ ان کے جاتے ہی جلدی ... اس کے کمرے کی جانب لپکی۔ بھاگتی ہوئی اندر پہنچی اور بیڈ کے سرہانے رکھا تکیہ اُٹھا کر مخملیں کیس وہاں رکھا اور پھر ... سے باہر نکل آئی اور سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا سانس ضرور پھول رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے تھے مگر ... لگ رہا تھا جیسے سر پر لدا منوں بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ ـــ نیکلس واپس کر کے دل میں اتری طمانیت کے باوجود طبیعت کچھ ... نڈھال سی ہو رہی تھی۔

وہ بستر پر لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس وقت تو نہیں مگر رات کو ضرور جب وہ سونے کی غرض سے ... درست کرے گا تو نیکلس کو تکیے کے نیچے رکھا دیکھ کر حیران ہی نہیں ہوگا بلکہ شرمندہ بھی ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو اتنا ... تو ضرور سمجھ جائے گا کہ جس چیز کو وہ اتنی اہمیت دے رہا تھا وہ میری نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ اتنا تو محسوس ... کرے گا کہ اس کے جھوٹے اور کھوٹے جذبے کا پول کھل گیا ہے اور اب وہ مجھے مزید بیوقوف نہیں بنا سکتا۔

"ہونہہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان آج کل کے مردوں کو۔ شرافت نام کی تو کوئی چیز ہی باقی نہیں رہی ان میں ... اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ مگر اپنی ذمہ دارانہ حیثیت اور اپنے وقار کا بھی احساس نہیں کرتے۔ اور زندگی کو ایک کھیل ایک مذاق سمجھ کر گزارتے ... ہیں۔" وہ بستر پر پڑے پڑے بڑے رنج و تاسف کے ساتھ کچھ یہی سوچ رہی تھی کہ تبھی پردہ زور سے سرکانے کی آواز ... پلٹ کر دیکھا تو اسفند بگڑے ہوئے تیور لیے اور کیس ہاتھ میں تھامے پردے کے آگے کھڑا نظر آیا۔ اور نظر ملتے ... ہی بولا۔

"بھئی یہ کیا حماقت تھی یہ نیکلس آپ میرے تکیے کے نیچے کیوں پھینک آئیں ایسا ہی دل سے اُتر گیا تھا تو کسی گٹر میں پھینک دیا ہوتا ـــ یہ میرے منہ پر کیوں مار آئیں آپ؟"

اور وہ جو اسے دیکھ کر غصے میں اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی بڑے برہم اور درشت لہجے میں بولی۔

"میں آپ کی کسی بات کا جواب دینا تو کیا آپ کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ آپ پلیز میرے کمرے سے چلے جائیں۔"

"ارے ارے خیریت تو ہے۔ یہ اتنا غصہ۔ اتنا عتاب۔ وہ بھی ایک ذراسی بات پر۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ میری اس روز کی ... باتوں پر مجھ سے خفا ہو گئی ہیں مگر۔"

تو اس کا دل چاہا کہے کہ وہ ذراسی بات تو نہ تھی تم نے تو مجھ پر میری اوقات جتائی تھی میری تذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی ... چھوڑا تھا۔ مگر بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ وہ شکوے شکایت کی کوئی گنجائش ہی نہیں سمجھتی تھی اس لیے اس کی بات کاٹ کر ...

"سنیں ڈاکٹر اسفند۔ آپ ایک بہت معزز اور ذمہ دار ہستی ہیں آپ کو کسی طور پر بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ وقت بے وقت ... جب چاہیں بے دھڑک میرے کمرے میں گھس کر مجھے اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کریں کہ میں آپ کے گھر کے ایک کمرے پر ... ناجائز قبضہ کیے بیٹھی ہوں ہیں تو یوں بھی اپنی بے مائیگی کی وجہ سے کمپلکس کا شکار ہوں۔ مگر صرف تھوڑے عرصے کے لیے اور ... ہوں آپ اطمینان رکھیں اور مجھے پریشان نہ کریں۔"

... وہ تو عام مردوں کی طرح یہ سوچ کر بلکہ تہیہ کر کے اس کے پاس آیا تھا کہ وہ چند میٹھی میٹھی اور چاپلوسی کی باتیں کر کے ... اُسے منا لے گا اور وہ تو اسے ایک دبی دبائی۔ محرومیوں اور کمپلکس کا شکار اور بے زبان لڑکی ہی سمجھتا رہا ... مگر وہ تو بڑی تیز طرار اور زبان دراز لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں کیسی بے نقط سنا رہی تھی۔ کہ اس کی باتوں ... کوئی جواب ہی نہیں بن رہا تھا۔ یوں بھی اپنی غلطی کا احساس اسے بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر ہونٹ کاٹتا اور

فرش کی طرف دیکھتا کچھ سوچتا رہا پھر قدم بڑھا کر اس کے نزدیک کھڑے ہو کر اس نے کہا۔
"سنیں اس میں شک نہیں کہ میں نے کچھ زیادتی سے کام لیا تھا لیکن اس کے لیے بھی آپ نے ہی مجھے مجبور کیا تھا۔
ممی کے ساتھ کار میں بیٹھتے وقت میری نظر آپ کے خالی گلے پر پڑی تو میرا موڈ ایک دم ہی آف ہو گیا تھا کیونکہ
تھا کہ میری دی ہوئی چیز آپ کو پسند نہیں آئی تھی اس لیے آپ اسے اُتار کر آئی تھیں۔ جبکہ وہ آپ کے لباس
میچ کر رہا تھا۔ باقی باتیں جو میں نے کہی تھیں محض غصے میں کہی تھیں۔ اصل میں مجھے غصے میں بات کرنے کا سلیقہ
نہیں آتا۔ بس جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتا ہوں۔ آپ اسے میری کمزوری سمجھ لیں۔ بہر حال یہ جو کچھ بھی ہوا
سے معافی کا خواستگار ہوں" وہ اپنی صفائی پیش کرتا رہا اور وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوا تب
اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
"کمال ہے زندگی میں پہلا موقع اور پہلا اتفاق ہے جو میں کسی کے سامنے اتنا بے بس ہوا ہوں کہ معافی مانگنے
چُوکا۔ اور آپ ہیں کہ میری معذرت قبول کرنے کی بھی روادار نہیں۔" اس کی خاموشی پر وہ آزردہ سا ہو کر بولا۔ تو
کہیے۔
"صلح صفائی اور معذرت اس وقت قابل قبول ہوتی ہے جب جذبے صادق ہوں اور تعلق استوار۔ مگر تم تو ایک
انسان ہو، جو اپنی جھوٹی محبت کے دام میں مجھے گرفتار کر کے مجھے کسی بڑی گمراہی میں ڈال لینے کے درپے ہو رہے تھے
شکر ہے کہ بات بڑھنے سے پہلے ہی مجھ پر تمہاری ساری حقیقت عیاں ہو گئی۔"
مگر یہ سب کہتے ہوئے زبان ہی ساتھ نہیں دے رہی تھی اصل میں وہ بھی اس کی اہمیت اور انفرادیت سے
تھی۔ اتنا عرصہ اس گھر میں گزار کر اس کی طبیعت اور مزاج سے بھی بڑی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی
کسی کے سامنے جھکنے والا نہیں ہے۔ کجا معافی مانگتا۔ اور اگر وہ جھوٹی سچی قسمیں کھا کر اسے منانے اور اپنی جھوٹی محبت کا
دلانے کی کوشش کرتا تو وہ کبھی اس کی باتوں سے اس حد تک متاثر نہ ہوتی جتنی کہ اس کے سادہ سے انداز میں اپنی صفائی
پیش کر کے معذرت طلب کرنے پر۔ کچھ اس لیے بھی اس کا دل اس کے لیے پسیج گیا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ لاتعلق
سی تھی۔ کہ وہ ایک دم ہی گھٹنوں کے بل فرش پر اس کے نزدیک بیٹھ کر بولا۔
"کیا آپ کے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی گنجائش نہیں رہی۔ یقین جانیں محض غصے میں، میں نے آپ کو نظر انداز کیا
تھا۔ ورنہ آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا کہ میں آپ کے اردگرد ہی منڈلاتا رہا تھا۔ یوں بھی اگر غصے میں نہ بھی ہوتا تب
بھی آپ سے فری ہو کر بات تو نہیں کر سکتا تھا کہ خود آپ ہی ہمیشہ اپنی رسوائی کے خوف میں مبتلا نظر آتی ہیں اور پھر
اپنی بہنوں کے مقابلے میں ہی آپ کو کمتر بھی تو دیکھنا نہیں چاہتا اُف جانے ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے جس کی آپ کے
خیال میں کوئی معافی تلافی ہی نہیں۔" اور جانے کیوں اس کی باتوں پر اس کا دل بری طرح بھر آیا۔ اور وہ اپنے اشک
سے چھپانے کی خاطر پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔
"نہیں۔ معافی تلافی کی گنجائش تو حالات کے بدترین صورت اختیار کر جانے سے پہلے تک باقی رہتی ہے۔ اور میرا دل
اب آپ کی طرف سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔"
روکنے اور ضبط کرنے کی ہزار کوشش کے باوجود چند آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر اس کے رخساروں پر ڈھلک
آئے جنہیں دیکھ کر وہ تڑپ سا اُٹھا۔
"او نو نو۔ ڈونٹ ویپ مائی لو۔ (در و نہیں میری محبت) کم از کم آپ کے آنسو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں
واقعی بہت برا بہت ہی گیا گزرا انسان ہوں جو آپ کی دل شکنی کا مرتکب ہوا۔"
وہ اس کا آنچل اٹھا کر اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ مگر اس کے یہ الفاظ تو اور بھی اس کے اشکوں میں اضافے کا باعث
ثابت ہوئے۔ وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور رقت بھری آواز میں بولی۔
"نہیں نہیں یہ آپ کی وجہ سے نہیں یہ تو بس یونہی۔ آپ پلیز اب چلے جائیے۔ جائیے پلیز میں اس وقت کوئی بات
کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا تھا۔ وہ جانا تو نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کے بار بار کہنے پر چار و ناچار
اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد دروازے کا کھٹکا لگا کر کچھ دیر تو وہ بڑی روانی سے سیل اشک بہاتی رہی پھر اشکوں کی اس
روانی میں ہی اسے خیال آیا کہ یہ گریہ وزاری آخر کس سلسلے میں۔
اور اس کا دل کیوں پسیجا تھا۔
آخر اس نے اسے معاف کیسے کر دیا۔ کیوں اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہو گئی تھی؟
کیا وجہ تھی آخر جو اس نے اتنی مہلت دے دی کہ وہ اتنی ساری باتیں کہہ گیا۔ کیا اس کے دل میں اتنا کچھ جان لینے
کے باوجود بھی اس کے لیے کوئی جذبہ کارفرما ہے۔ اور کیا اس کے دل میں اب خوف خدا گناہ۔ جزا اور سزا
کا کوئی احساس باقی نہیں رہا ہے۔ اور تب ان سارے سوالوں کے جوابات کی تلاش میں اس نے اپنے دل کو بری
طرح کھنگال ڈالا اور وہاں اگر کچھ ملا تو صرف جذبۂ محبت۔
شدید چاہت۔
اور لوحِ دل پر کندہ اسفند کا نام۔
مگر پوری صداقت اور پاکیزگی کے ساتھ۔
کہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والا اور من میں بس جانے والا وہ پہلا مرد تھا۔
اور جو دل کو پیارا ہوتا ہے۔ اس کے کڑوے کسیلے بول بھی ہنس کر سہنے ہی پڑتے ہیں اور اس نے جو کچھ بھی کہا تھا اپنی محبت
اور میری ہمدردی میں تو ہی کہا تھا۔ جیسا کہ وہ کتنی سادگی سے کہہ رہا تھا کہ آپ کا گلا خالی دیکھ کر میرا موڈ ایکدم آف ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر
ہے اس نے جس جذبے اور لگن سے مجھے وہ نیکلس دیا ہوگا۔ اسے میرے گلے میں نہ دیکھ کر کتنی کوفت ہوئی ہوگی اور پھر وہ یہ بھی تو نہیں
چاہتا تھا کہ میں کسی قسم کے کمپلیکس میں مبتلا ہوں۔ یا خود کو کسی سے کمتر سمجھوں۔ اور میں اپنے نظر انداز کیے جانے پر خواہ مخواہ ہی اس
سے کبیدہ اور بدگمان ہوئی۔ ورنہ جدھر میں جاتی تھی وہ دوسروں سے باتیں کرتا میرے آس پاس ہی آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ میں خود
ہی تو سب کے سامنے بات کرتے ہوئے اس سے کتراتی ہوں۔ بلکہ اتنی لاتعلق سی رہتی ہوں جیسے میرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔
اب اگر وہ میری ہی ذات میں دلچسپی لیتا۔ میرے ہی ساتھ رہتا تو تاڑنے والے فوراً ہی تاڑ جاتے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔
واہ میں نے ناحق اس کی باتوں کا اتنا اثر لیا۔
خواہ مخواہ ہی کڑھ کڑھ کر اور رو رو کر اپنے دم پہ بنالی۔
وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ بات کرنے کا ٹیکٹ اسے بالکل نہیں آتا۔ اور جس سادگی اور سچائی سے اس نے اپنی بات کی۔
اس سے ثابت ہوتا ہے۔ اس میں تو دور دور تک بھی فریب اور ریا کو دخل نہیں۔
اگر مجھے فریب دینا ہی مقصود ہوتا یا اس کا جذبہ جز وقتی ہوتا تو وہ یا تو بالکل ہی نہیں آتا اور جو آتا بھی تو کسی فلمی ہیرو کی طرح
بڑے بڑے ڈائیلاگ بولتا۔
اپنی جھوٹی محبت کی قسمیں کھاتا اور چاپلوسی کی باتیں کر کے مجھے شیشے میں اتارنا چاہتا۔
مگر اس نے تو ایک بات ایک ذرا سی حرکت بھی ایسی نہیں کی جس سے اس کی غرض اور طلب کا اظہار ہوتا۔ اور پھر وہ ایسا گرا
ہوا بھی نہیں۔
ایک اعلیٰ اور متمول خاندان کا چشم و چراغ ہے۔
اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر ہے۔
اس پر بھی میری کڑوی کسیلی اور اہانت آمیز گفتگو پر ذرا نہیں بھڑکا۔ بلکہ اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کتنی سادگی
سے معذرت بھی پیش کر دی۔
اور تو اور۔ سلوطنے اپنے جذبے اور اپنی چاہت کے بل بوتے پر اپنے ضمیر اور نفس کی تسکین کے لیے اس کے جذبے کی
صفائی میں کتنے ٹھوس دلائل پیش کیے تھے۔ کہ اس سمے وہ گناہ اور ثواب
جائز و ناجائز سب کچھ بھول گئی تھی۔
کیونکہ اس کے خیال میں اس کا جذبہ سچا اور پاک تھا۔ اور سچے اور پاک جذبے کے ساتھ کسی کو چاہنا اس کے نزدیک ناجائز یا

گناہ نہیں تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے تو کبھی اعتراف تو بڑی چیز اپنے جذبے کا اس پر اظہار بھی نہیں کیا۔ اور آئندہ بھی کبھی نہیں کرے گی۔

بس اسی طرح خاموشی سے اسے چاہتی رہے گی جیسے اب تک چاہتی آ رہی ہے۔ کچھ غم و غصہ تو اس کی وضاحت نے دھو ڈالا تھا اور کچھ ـــ ان ساری باتوں نے ـــ جو وہ صرف اپنے ضمیر اور دل کو اطمینان دلانے کی غرض سے آئندہ ... رہی تھی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ وہ بستر پر ایک زاویے ایک ہی پہلو ساکت سی بیٹھی تھی۔

دل سچی گواہی دے رہا تھا مگر دماغ اس گواہی سے انحراف کر رہا تھا۔ وہ مخملیں کیس جو وہ اس کے قریب بیڈ پر ہی ... اپنی محویت میں وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ وہ تو ایکدم ہی باہر سے جوتیوں کی کٹ کٹ کی آواز آئی تو اس نے بری طرح ... اِدھر اُدھر دیکھا۔

اور پھر اس کی نظر کیس پر پڑی تو اس نے بلا سوچے سمجھے جلدی سے وہ کیس اُٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تبھی نیلما اندر داخل ہوئی۔

"اوہو سلوط آپا آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں اور وہاں کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ چلیے نا جلدی سے میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔" نیلما دروازے ہی سے بولتی آئی تھی۔ کہنے کا انداز کچھ بیزار کن سا تھا جسے محسوس کر کے سلوط نے کہا۔

"ارے ایسی سخت بھوک لگ رہی تھی تو تم نے کھا لیا ہوتا مجھے کیوں بلانے آ گئیں۔ اور آج ایسی کیا خاص بات ہو گئی جو ... بلانے آ گئیں ـــ ورنہ میں تو بنا بلائے خود ہی پہنچ جاتی ہوں۔ اب بھی بس آ ہی رہی تھی۔" نیلما اس کے ساتھ باہر کا رخ کرتی ہوئی بولی۔

"یہ تو میں نے بھی کہا تھا کہ سلوط آپا بس آتی ہی ہوں گی۔ مگر یہ بھائی جان انہیں بھلا کون سمجھا سکتا ہے۔ آتے ہی آپ کی کرسی خالی دیکھ کر حکم صادر کیا کہ پہلے سلوط کو بلا کر لاؤ پھر کھانا شروع کرنا۔" نیلما بولی۔ اور اس کا دل آہستہ سے دھچکا کھا کر بحال ہو گیا۔

"سچ سچ یہ تو بڑی زیادتی کی تم پر تمہارے بھائی جان نے ـــ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے بات کو مذاق میں اڑا دیا۔

"اور بھائی جان کی تمام تر ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔" نیلما نے شوخ سی معنی خیزی سے کہا۔ تو اس کے دل میں دھک دھک سی ہونے لگی۔

"ارے چلو بڑی شریر ہو گئی ہو تم ـــ وہ بے چارے سب کے ساتھ ـــ اخلاق برتتے ہیں میری ایسی خصوصیت ہی کیا ہے۔" اس نے ایسا منہ بنا لیا جیسے نیلما کا مذاق اسے گراں گزرا ہو۔

"اب یہ تو آپ ہی جانتی ہوں گی کہ آپ کی کیا خصوصیت ہے۔"

نیلما تب بھی فقرہ پھینکنے سے باز نہیں آئی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے دونوں چپ چاپ جا کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ یعنی شعیب منصور، زینت اور نیلوفر تینوں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ مگر اسفند نے سلوط کے آنے کے بعد ہی کھانا شروع کیا ... اس پر طرہ یہ کہ اسے ڈشیں بھی پیش کرتا رہا۔ اور اس کے حلق سے نوالے پھنس پھنس کر اترتے رہے۔ زینت کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بھئی، اب اتنے عرصے سے یہاں رہ رہی ہو۔ گھر ہی کی ایک فرد بن گئی ہو۔ پھر بھی اس قدر تکلف سے کام لیتی ہو۔ کبھی ... چیز لے لیا کرو۔"

"اصل میں یہ شرماتی بہت ہیں ممی۔" نیلما بولی۔

"نہیں خیر یہ شرماتی ہیں نہ تکلف سے کام لیتی ہیں بلکہ بہت غیریت برتتی ہیں۔ آئی مین۔ یہ ہم میں مکس ہونا پسند نہیں کرتیں اس لیے اس قدر ریزرو سی رہتی ہیں۔" نیلوفر نے یوں کہا جیسے نکتہ چینی کر رہی ہو۔

"ہاں یہ تو کسی حد تک درست ہے۔ اس روز سہیل بھائی کے یہاں بھی یہ سب سے الگ تھلگ سی رہی تھیں۔ جانے ... دلہن اور کوثر تو ان کی خاطر میں بچھ بچھ جاتی ہیں۔" زینت نے نیلوفر کے خیال کی تائید میں کہا۔

"نہیں خیر، نہ میں تکلف اور غیریت برتتی ہوں نہ ہی الگ تھلگ رہتی ہوں۔ بلکہ میری عادت اپنے کام سے کام رکھنے کی ہے یوں بھی ـــ"

"ہاں اور وہ کام عموماً خوش ذائقہ ڈشز اور کچن سنبھالنے کا ہوتا ہے۔ مگر بیٹی اس کام کے علاوہ کچھ کر لیا کرو۔ میرا مطلب ہے سیر سپاٹا وغیرہ کہ یہ شغل بھی زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔" بات کے اختتام پر شعیب منصور ہنسنے لگے۔ اور جواب میں ... اگر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسفند نے کہا۔

"... مگر سیر سپاٹا اور مکس ہونا تو اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب آپ لوگ بھی ان سے مکس ہونے کی کوشش کریں۔ مگر ... لیکن یہ سیر سپاٹا ... آپ نے تو انہیں کریم کا سپروائزر مقرر کر رکھا ہے۔ اور دیٹ از ناٹ فیئر۔"

"... یہاں ہے بابا بات نہیں کرتے بلکہ ایک تیر سا چھوڑ دیتے ہیں۔" بیٹے کے طنز سے زیادہ اسے سلوط کی حمایت میں بولتا دیکھ کر زینت جز بز سی ہو کر بولیں۔

"وہ تو خیر آپ کے لاڈلے ہیں اب تیر چھوڑیں یا مدحت برسائیں۔ لیکن یہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔ مگر کچھ قصور خود ان کا بھی ہے کہ یہ ... بننے کے کمپلیکس میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ اس لیے اس قدر محتاط اور دبی دبی سی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ ہنسا ... بار ... آیا جایا کریں۔ بھئی آخر کو یہ میری اکلوتی بہن کی اکلوتی نند ہیں۔ موسٹ آنریبل کوئی معمولی ہستی نہیں۔" شعیب نے بات کے اختتام پر پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ تو زینت نے نیلوفر کی طرف دیکھا۔ اور بولیں۔

"ہاں بھئی اس سے کس کافر کو انکار ہے کہ یہ آپ کی اکلوتی بہن کی نند ہیں۔ ہم سے تو ان کے کسی معاملے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ یوں بھی ہم تو سب سے ہی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ ان کی تو بات ہی دوسری ہے۔" زینت کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

"چھوڑیں ممی ـــ یہاں تو پاکستان میں اگر اخلاق بھی برتا جاتا ہے تو وہ بھی تصنع اور ظاہرداری میں لپٹا۔ حیثیتوں میں بٹا ... جس کی جتنی حیثیت ہو گی اسی قدر اخلاق بھی برتا جائے گا۔ سادگی تو نام کو نہیں۔" اسفند سویٹ ڈش سے اپنی پلیٹ میں مٹھاس نکالتا ہوا بولا۔

"اے یہ بابا کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔" زینت آہستہ سے بڑبڑائیں۔ مگر بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"بھائی جان سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" نیلوفر آہستہ سے نیلما کی طرف جھک کر بولی۔

"اب آپ کیوں چپ ہیں۔ آپ بھی تو کچھ اظہارِ خیال کیجیے۔" زینت نے شعیب منصور سے کہا۔

"بھئی ہم کیا بولیں یہ بابا تو ہمیشہ بات تے کی یعنی سولہ آنے درست ہی کہتے ہیں۔ اب کچھ دیر ہمیں مٹھاس کے ذائقے سے تو لطف اٹھانے کا موقع دیجیے۔" شعیب منصور نے اس موضوع کو ـــ ٹالنے کی غرض سے مٹھاس کا چمچہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ تو پھر کوئی بھی نہیں بولا۔ اسفند کو خود پر اس قدر مہربان دیکھ کر سلوط اندر ہی اندر سہمی ضرور جا رہی تھی۔ مگر اسے ایک خوشی ایک فخر سا محسوس ہو رہا تھا کہ اس گھر میں آخر کوئی تو اتنا اپنا اپنا سا موجود ہے۔ جو اس کے لیے بڑے ہمدردانہ خیالات رکھتا ہے۔ بلکہ دنیا میں ایک ہستی تو ایسی ہے جو دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہے۔ اس کا خیال رکھتی ہے۔ اس کا احترام کرتی ہے۔ اور ہستی بھی کون ـــ جس سے بات کرتے ہوئے اس کے والدین بھی ہچکچاتے ہیں۔ اس سمے اسے زینت کے بگڑے ہوئے موڈ کی پرواہ ہوئی نہ نیلوفر کے پھولے ہوئے منہ کی۔ کہ شعیب منصور بھی تو اس کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ یعنی کم از کم اپنی بیوی کی کوتاہیوں اور بے نیازی پر انہیں ٹوک تو دیتے تھے۔ اس لیے اس روز جب وہ کھانا ختم کر کے اٹھی ... سی تھی۔

عید کو گزرے آٹھ روز ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود بھی عید ملن پارٹیز۔۔۔ ایک دوسرے کے گھر آ جا کر مبارکباد دیئے اور دعوتیں
اڑانے کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کچھ لوگ عید کی خوشی میں سیر و تفریح کی غرض سے گھومتے پھر رہے تھے۔

شعیب منصور اور ان کے ایک گہرے یار نے بھی آپس میں مل کر پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شعیب منصور اور ان کے
دوست صمد جلیل کی فیملیز بھی ان کے ساتھ ۔۔۔۔ فارم پر جا رہی تھیں۔ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ گھر کے تمام افراد کھانے کی
میز کے آگے بیٹھے۔ پکنک میں اپنے ساتھ لے جانے والی چیزوں کی فہرست تیار کر رہے تھے۔ زینت، شعیب منصور سے کہہ رہی تھیں۔

"میں نے قیمہ۔۔۔ شامی کباب۔۔۔ آلو کی ترکاری۔۔۔ اور ٹوسٹ تیار کرا لیے ہیں۔ دو درجن انڈے بھی فل بوائل ابلنے کو
دے آئی ہوں۔ آدھا پونڈ مکھن اور چار بڑی ڈبل روٹیاں بھی منگوا لی ہیں۔ کینو اور کیلے بھی درجنوں کی تعداد میں موجود ہیں۔
مزید کیا رہ گیا ہے نیلوفر۔۔۔؟"

"ایک عدد کریٹ آئس بکس میں ڈالنے کے لیے برف کی سلّی۔ چھ درجن لقمی سموسے، چار کلو سیب، ٹماٹو کیچ اپ کی دو بڑی بوتلیں
اور بس۔۔۔" نیلوفر نے کاغذ پر لکھی ہوئی لسٹ میں سے پڑھ کر سنایا۔

"چلو یہ سب تو ٹھیک ہے مگر وہ مٹھاس میں آپ نے کیا رکھا ہے بیگم؟" شعیب منصور نے پوری فہرست سن کر پوچھا۔

"اوہ ہاں مٹھاس۔۔۔ ہاں بھئی مٹھاس تو ضرور رکھنا یہ تمہارے ڈیڈی تو مٹھاس کے بغیر راستہ ہی نہیں چلتے۔" زینت بولیں۔

"مٹھاس وٹھاس نہیں ممی۔ ہم جاتے وقت بہت ساری آئس کریم لیتے جائیں گے۔" نیلما بولی۔

"ہاں جیسے صبح کے چار بجے تمہارے لیے دکانیں تو کھلی ہوں گی آئس کریم کی۔" نیلوفر بولی۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ابھی سے منگا کر فرج میں رکھ لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کے ساتھ پانچ چھ ٹن برف بھی منگا لینا۔" شعیب منصور نے مشورہ دیا۔

"چلیں یہ بھی ہو جائے گا۔ مگر وہ دریاں اور قالین بھی لے جانے ہوں گے۔ ورنہ بیٹھیں گے کہاں۔" زینت بولیں۔

"ممی ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔ میں نے صبح ہی فون کر کے دو کمرے ریزرو کرا لیے ہیں۔ پھر دریاں اور قالین بھی لے جانے
کی کیا ضرورت ہے۔" اسفند بولا۔

"لیکن سارا وقت ہم ریسٹ ہاؤس میں ہی تو نہیں گھسے رہیں گے بھائی جان۔ ظاہر ہے باہر بھی گھومے پھریں گے۔ ایک دو
دریاں تو ضرور ساتھ لے جانی چاہئیں ساتھ میں۔" نیلوفر بولی۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے میری وہ جوٹ کی بڑی دری اسٹور سے نکلوا کر کریم سے جھڑوا لو۔ ہاں بھئی جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔ صبح کو تو
جانے کی جلدی میں کچھ ہونے سے رہا۔" زینت نے کہا تو نیلوفر سلوط سے بولی۔

"اُف مجھے تو ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔ سلوط پلیز آپ جا کر ذرا کریم کے ساتھ اسٹور سے وہ دری نکلوا لیں۔"

"نہیں بھئی دیوانی ہوئی ہو کیا جو سلوط کو بھیج رہی ہو۔ کریم خود ہی نکال لے گا۔"
زینت اس خیال سے جلدی سے بولیں کہ کہیں شعیب منصور نیلوفر کو کچھ نہ کہہ دیں۔ اس وقت کھانا ختم ہو چکا تھا اور سلوط کو آلو
کی ترکاری اور شامی کباب بنانے تھے۔ وہ کھانا ختم ہوتے ہی اُٹھنے لگی تو شعیب منصور سمجھے کہ وہ کریم کے ساتھ اسٹور سے دری نکلوانے
جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا۔

"ارے بیٹھو۔ تم ابھی سے کہاں چلیں۔ تم بھی کوئی مشورہ دو کہ اور کیا کیا لے جانا چاہیے۔ ہماری طرف سے تو کُل سات آدمی
جائیں گے۔ مگر میرے دوست صمد کی فیملی بہت بڑی ہے اور پھر اس کی بہنیں اور مامی صاحبہ بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ کم و بیش پندرہ آدمی
ہوں گے ان کے۔ یہ کھانے کی چیزیں کم تو نہیں پڑیں گی اتنے لوگوں میں؟"

"لیجیے کم کیوں پڑنے لگیں۔ آخر وہ لوگ سولہ آدمی ساتھ لے جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی پکنک کی کچھ تیاری کی ہو گی۔" زینت بولیں۔

"مائی گڈنیس۔ سولہ۔۔۔ سولہ اور سات تئیس۔ پھر تو پورا جلوس ہی جائے گا۔ بلکہ قافلہ۔" نیلما آنکھیں پٹپٹا کر اور ایک جھرجھری سی
لے کر بولی۔

"ارے نہیں ڈیڈی سے کاؤنٹ (گنتی) کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ ہم تو صرف چھ آدمی ہوں گے ۔۔۔" نیلوفر بولی۔

"تب بھی فرق ہی کیا پڑے گا۔ بائیس تو ہوں گے نا۔" نیلما نے کہا۔

"مگر کیا تم کریم کو ساتھ نہیں لے جا رہیں۔" شعیب منصور نے پوچھا۔

"نہیں کریم کو نہیں لے جائیں گے تو پھر کام کون کرے گا۔" زینت بولیں۔

"تو پھر میں، آپ، سنی، نیلوفر، نیلما، سلوط اور کریم کُل سات ہی ہوئے پھر آپ نے چھ کیسے بتا دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے آپ کے
میتھس (حساب) میں فاسٹ ہونے کا۔" شعیب منصور نے ہنس کر کہا تو جواب میں کچھ دیر خاموشی چھائی اور زینت اور نیلوفر ایک
دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر زینت نے آہستہ سے کہا۔

"یہ سلوط تو نہیں جا رہیں ہمارے ساتھ۔۔۔ اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں سہیل بھائی کے یہاں بھیج دوں کیونکہ وہ لوگ بھی تو
ہمارے ساتھ پکنک پر نہیں جا رہے اس لیے سلوط ان کے پاس رہ لیں گی۔"

"لیکن کیوں ممی ان کو چھوٹے آکا کے یہاں بھیجنے کی کیا تک ہے بھلا۔ یہ پکنک پر کیوں نہیں جائیں گی؟" اسفند نے تیوری پر
بل ڈال کر پوچھا۔ زینت پھر نیلوفر کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"بھئی وجہ کوئی خاص نہیں ہے۔ ہم نے سوچا ان کے لیے وہ لوگ بالکل انجان اور اجنبی ہوں گے۔ اور یہ اس ماحول میں خود
کو ایڈجسٹ نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے کل کا دن نازش کے یہاں گزار لیں گی اور بس۔"

"اور بس۔ کیا خوب۔۔۔ بھئی ان کو اپنے ساتھ میں لے جائیے۔ تاکہ یہ ذرا گھومیں پھریں تو ان کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئے۔
پکنک تو ویسے بھی ہر انسان کے لیے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ایک ہی گھر ایک ہی جگہ بیٹھ کر انسان جمود اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔۔۔"
شعیب منصور نے کہا۔

"اوہ مجھے تو ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" سلوط کو معاً اپنے کاموں کا خیال آیا تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ اور مزید کچھ کہے کھانے کے
کمرے سے نکل گئی۔

"اُفوہ آپ تو وقت دیکھتے ہیں نا موقع اور ساری باتیں سلوط کے سامنے کر کے مجھے شرمندہ کر دیتے ہیں۔" زینت اُس کے جانے
کے بعد بولیں۔

"کمال ہے میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ مجھ سے یہ شکوہ کر رہی ہیں۔" شعیب منصور نے گردن کو ایک جھٹکا سا دے کر کہا۔

"یہی جو آپ سلوط کو لے جانے کی بات کر رہے تھے۔ بھلا ان کو ساتھ لے جانے کا یہ کیا موقع ہے۔ وہاں سب لوگ
غیر اور اجنبی ہوں گے۔ کس سے بات کریں گی وہ اور کیسے انجوائے کریں گی۔"

"وہ انجوائے کریں یا نہ کریں۔ مگر وہ ہمارے ساتھ جائیں گی۔ اور یہ میرا فیصلہ ہے ممی۔" اسفند ایکدم ہی کھڑا ہو گیا
کا لہجہ ہی اٹل نہ تھا بلکہ انداز میں بھی کرختگی تھی۔

شعیب منصور نے بہت چونک کر گہری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے سے برہمی سی ہویدا تھی۔

"ٹھیک ہے۔ وہ ضرور ساتھ جائیں گی بشرطیکہ وہ چلنے پر آمادہ ہو جائیں۔ کیونکہ وہ خود بھی ایسے ہنگاموں سے دور بھاگتی
بیٹے کے لب دیکھے اور بات پہ کچھ دیر تک ورطۂ حیرت میں غوطے کھانے کے بعد زینت نے قدرے دبی زبان سے کہا۔

"ان کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کرنا بھی آپ کا ہی ذمہ ہوگا۔ بھلا یہ کون سا انصاف ہے کہ گھر آئے مہمان کو اس حد تک بے
وقعت کر دینا کہ اس کا مصرف صرف کام ہی قرار دے دیا جائے۔ آخر کس وجہ سے یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے سلوط کے ساتھ۔ اگر یہاں
رہ بھی رہی ہیں تو پھپھو بیگم کی خوشی اور مرضی سے ہی تو رہ رہی ہیں۔ مگر یہ شاید بھول گئی ہیں آپ۔"

وہ ماں پہ ایکدم ہی برس سا پڑا۔ اور پھر کرسی پیچھے ہٹا کر تیزی سے چلتا ہوا کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔ اور ساں کچھ زیادہ ہی
متعجب ہونے کے ساتھ ساتھ نند کا حوالہ دینے پہ جل کر بولیں۔

"بھئی اگر پھپھو بیگم کی خوشی اور مرضی سے رہ بھی رہی ہیں تو ہم نے کب روکا ہے۔ انہیں یہاں رہنے سے۔"

"خیر آپ روک بھی نہیں سکتیں لیکن یہ کام وام لینا درست نہیں۔ یہ نیلما تو کبھی کبھی کوئی نہ کوئی چیز پکا لیتی ہیں۔ نیلوفر کو چاہیے
کہ یہ بھی ان کاموں میں حصہ لیا کریں۔" شعیب منصور نے کہا۔

"مگر یہ نیلوفر تو پڑھ رہی ہیں۔ بھلا وقت ہی کہاں ملتا ہے انہیں کام کرنے کا۔" زینت جلے کٹے انداز میں بولیں۔

"نہیں ملتا تو نکالنا چاہیے کہ یہ کام بھی بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اب آخر ہماری نازو بیٹی بھی تو ہر فن مولا ہیں۔ انہوں نے بھی
دوران تعلیم ہی سارے کام سیکھے تھے۔" شعیب منصور نے کہا۔ زینت جواب میں خاموشی سے کینو چھیل کر کھاتی رہیں۔ انہیں خاموش
دیکھ کر شعیب منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جائیے پہلے جا کر سلوط کو چلنے کے لیے آمادہ کریں۔ ورنہ وہ آپ کے لاڈلے خواہ مخواہ میں فسن مچائیں گے۔" اور پھر ہاتھ دھونے
کی غرض سے ڈائننگ روم میں ہی بنے چھوٹے سے غسل خانے میں گھس گئے تو زینت نے آہستہ سے سخت جلے کٹے انداز میں کہا۔

"دیکھا۔ پوری جادوگرنی ہے یہ فاخرہ کی بچی بھی جو اتنی دور سے بھی بھائی اور بھتیجے کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ اف توبہ ہے
بد لوگوں کی رسی کتنی دراز ہوتی ہے۔ اب یہ خوبصورت بلا بھیج دی میرے دم پر کہ اس کی بھی ناز برداریاں اٹھاؤں۔" زینت
کے آخری فقرے پر نیلما کو ہنسی آ گئی۔ زینت نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اٹھ کر سلوط کے پاس چل دیں۔

کھانے کے کمرے سے کچن کا رخ کرتی ہوئی زینت اس خیال سے بہت آزردہ اور دلگیر سی ہو رہی تھیں کہ ان کے شوہر
کی طرح ان کا بیٹا بھی اپنی پھوپھی کی حمایت میں بولا تھا۔ یا معنی دیگر ان کی نند کے بارے میں ویسے ہی ہمدردانہ خیالات
رکھتا تھا جیسے کہ ان کے شوہر رکھتے تھے۔

اور اب فاخرہ بیگم کے حوالے سے سلوط جیسی بے ضرر سی لڑکی بھی ان کے سسرال کی بکری ہی ثابت ہو رہی تھی
اپنی معصوم۔ بھولی۔ بے ضرر اور بے زبان صفات کے باوجود۔ چونکہ سسرال کی ہوتی ہے اس لیے وہ بھی
پرائے گھر کی لڑکی یعنی بہو کو منہ چڑانے سے باز نہیں آتی۔ انہیں اس وقت سلوط سخت زہر لگ رہی تھی۔ دل یہ کہنے پر کسی
طرح آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ تم بھی ہمارے ساتھ پکنک پر چلو یا ہم تمہیں ساتھ لیے بغیر پکنک پہ جائیں گے
اور اسے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار اگر شعیب منصور نے کیا ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طور پر انہیں ٹال کر
بات ٹال جاتیں مگر یہ بیٹے کی خواہش نہیں اصرار تھا کہ سلوط ہر قیمت پر ساتھ جائے گی جسے ٹالنا زینت کے بس سے باہر
تھا۔ کہ وہ بیٹے کی ہٹیلی اور اٹل طبیعت سے بخوبی واقف تھیں کہ وہ اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔ گو وہ اس سے
یا دبتی نہیں تھیں، البتہ اس کا لحاظ ضرور کرتی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ جوان اور کماؤ بیٹوں کے منہ لگنا اچھی بات
نہیں ہوتی۔

کیونکہ ایک بار اگر ان کے منہ سے گستاخی کا کوئی کلمہ نکل جاتا ہے تو پھر وہ بے ادب اور بے لحاظ ہو جاتے ہیں اور
ادب و احترام ختم ہو کر نوبت برابری کی آ جاتی ہے۔ اور ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا پروان بھی چڑھا تھا
... جس پر وہ سخت متاسف بھی تھیں اور شرمندہ بھی۔

کیونکہ اس زمانے میں شعیب منصور سے زیادہ ان پر اپنا مستقبل سنوارنے کی دھن سوار تھی۔ اس پر ناز پرور
گود میں آ گئی تھی۔ ورنہ ماں ہونے کے ناتے اگر اس وقت جب اسفند چھوٹا سا تھا اگر وہ چاہتیں تو بڑی
آسانی سے اپنے بیٹے کو سوتیلی ساس کی گود سے چھین سکتی تھیں مگر انہوں نے اپنی نت نئی دلچسپیوں اور تفریحات میں
بیٹے کو حالات اور ساس سسر کے رحم و کرم پر ہی چھوڑے رکھا اور اپنی اس اتنی بڑی کوتاہی اور غفلت کا احساس انہیں
اب ہوا تھا۔ کچھ پچھتاوا اور شرمندگی اور کچھ اس لیے بھی کہ بیٹا فطرتاً صاف گو اور منہ پھٹ تھا۔

اس پر برسر روزگار بھی تھا۔ اور بیٹے اگر برسر روزگار ہوتے ہیں تو ان کو اپنی کمائی پر بڑا زعم ہو جاتا ہے۔ جب
اسفند تو ایک وسیع جائداد کا مالک بھی تھا۔ بس اسی وجہ سے وہ لحاظ کے ساتھ ساتھ احتیاط بھی برتتی تھیں۔

ان جیسی مائیں۔ جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دوسروں کے زیر سایہ پروان چڑھنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں بعد میں اس
قدر پچھتاتی اور کھسیاتی ہیں کہ ان کے دل تو کیا روحیں تک فگار ہو جاتی ہیں۔

ایسے زخم جو نظر آ سکتے ہیں نہ دیکھے ہی جا سکتے ہیں۔
پھر بھی ایسے کاری۔ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ تا دم زیست کبھی بھرتے ہی نہیں۔ بلکہ ان سے اٹھنے والی ٹیسیں
انسان کو کسی کل چین ہی نہیں لینے دیتیں۔
وہ سدا۔ دکھ۔ رنج اور تاسف کی اذیت میں ہی مبتلا رہتا ہے۔

جیسے کہ زینت تھیں۔
جنہوں نے اسے اپنے پیٹ میں رکھا تھا۔ جنم دیا تھا۔
مگر ہمیشہ دور رہنے کی وجہ سے ان کے پیٹ کی یہ اولاد۔ جو اولاد نرینہ کی صورت میں گویا اکلوتی ہی تھی۔
ان کے لیے غیر اور اجنبی سی بن گئی تھی۔
کیونکہ نہ انہیں یہ معلوم تھا کہ کون سی چیز اسے اچھی لگتی ہے اور کون سی بری۔
یا اس کے کیا خیالات ہیں؟
کیسی پسند ہے۔
وہ زندگی کو کس طریق اور کس چلن پر گزارنے کا خواہاں ہے؟
اور کیسے نظریات کا حامی ہے۔

ان باتوں کو جاننے کے لیے وہ ہمیشہ اس کی شکل ہی دیکھتی تھیں۔ مگر کہتی یا پوچھتی کچھ نہ تھیں کیونکہ انہیں تو صرف یہ
معلوم تھا کہ ان کا بیٹا بہت ہٹیلا۔ صاف گو تند مزاج ہے اور اپنی بات منوانے کا عادی ہے۔ جسے اس کی ان کج ادائیوں
کے باوجود وہ دل و جان سے چاہتی ہیں۔
اس کی مردانہ وجاہت آن بان اور قابلیت پر فخر کرتی ہیں۔

اپنی اسی شدید چاہت کے بل بوتے پر ماں ہونے کے ناتے شروع ہی سے اس سے اس بات کی متوقع اور
منتظر ہی تھیں کہ وہ نند کے مقابلے میں انہیں ترجیح دے۔
ان کی حمایت کرے اور ان ہی کی زبان بن کر بولے۔

مگر اس نے آج پھوپھی کی حمایت میں بول کر ان کی ساری توقعات اور تمناؤں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ایسے
ہی دل آزار اور دلگیر خیالوں میں الجھی وہ پینٹری میں داخل ہوئیں تو سلوط وہیں انہیں شامی کبابوں کے قیمے کی چھوٹی چھوٹی
ٹکیاں بناتی نظر آئی۔

"بابا نے کہا ہے کہ یہ ضرور ساتھ چلے گی۔ اب اگر یہ میرے کہنے سننے کے باوجود بھی جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو
بابا یہی سمجھیں گے کہ میں نے اسے ساتھ لے جانے پر زور ہی نہیں دیا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ بابا اور بیٹا مجھ سے بدظن اور بدگمان
ہو جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ خود بھی اپنا جانا ملتوی کر دیں۔ گویا اب مجھے دل پر جبر کر کے ایسا رویہ اختیار کرنا

چاہیے کہ وہ چلنے پر مجبور ہو جائے۔" انہوں نے ایک محبت کرنے والی ماں بن کر وہیں کھڑے کھڑے ممتا اسے اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف محض اولاد کی خوشی کی خاطر کے لیے بعض باتیں کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر وہ سلوط کی طرف بڑھتی ہوئی اونچی آواز میں بولیں۔

"ارے یہ تم کباب بنانے کیوں کھڑی ہو گئیں۔؟ ہاتھوں میں مرچیں لگ گئیں تو ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ چھوڑو یہ فضول کام۔ خانساماں کے ہاتھوں میں کیا مہندی لگی ہے جو اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔"

ابھی کچھ دیر پہلے کھانے کی میز پر اتنی نشتر زنی اور بیگانگی اور اب ایک دم ہی کایا پلٹ۔ زینت کا یہ دھوپ چھاؤں سا رویہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا وہ تعجب اور بے یقینی کی ملی جلی سی کیفیت میں ان پر ایک نگاہ ڈال کر بولی۔

"مگر بھابی جان خانساماں بے چارے کو تو ابھی کتنی چیزیں تیار کرنی ہیں۔ کریم بھی اس کے ساتھ کام میں جتا ہوا ہے پھر بھلا یہ درجنوں کباب کون بنائے گا اور کون تلے گا اور اب میں اتنی نازک بھی نہیں ہوں کہ مرچیں لگنے کی وجہ سے سو بھی نہ سکوں۔ یوں بھی جب کام کرنا ہی ٹھہرا تو تکلیف کو بھی برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اس کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ ان کی اپنائیت بھری ہمدردانہ گفتگو سے متاثر ہوئی ہے بلکہ اس نے تو ان کی بات کا جواب بھی کچھ اتنا کھرا دیا تھا کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔ پھر بھی کسی طرح اسے چلنے کے لیے آمادہ کرنا بھی ضروری تھا۔ کچھ زیادہ ہی شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"ارے چھوڑو یہ اس وقت کیا مشیخت دکھانے بیٹھ گئیں تم۔ یہ بھی بھلا کوئی تمہارے کرنے کا کام ہے۔"

"مشیخت کیسی بھابی جان۔ کمال ہے آپ نے ہی تو کہا تھا کہ خانساماں اور کریم کو تو سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ذرا تم جا کر کم از کم شامی کباب ہی ان کے مشیخت دکھاتے کہنے پر وہ گردن کو آہستہ سے جھٹک کر قدرے تیکھے لہجے میں بولی تو زینت نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ارے وہ تو میں نے اس خیال سے کہہ دیا تھا کہ ماشاءاللہ تمہارے ہاتھ میں مزاہت ہے تم ذرا اپنے سامنے مسالے وغیرہ ڈلوا دو گی اور تم ہو کہ ساری کھکیڑ ہی اپنے سر لے کر بیٹھ گئیں۔ چلو ایسا ہی کام کرنے کا شوق ہے تو صرف ٹکیاں بنا دو۔ تل کوئی اور لے گا۔ تم تو جلدی سے جا کر سو جاؤ۔ مگر تین بجے کا الارم لگا کر سونا۔ الارم والی گھڑی تو رکھ دی گی تمہارے کمرے میں۔" مگر سلوط نے الارم لگا کر سونے کی بات سنی ہی کب۔ وہ تو رات کے تین بجے اٹھنے کا سن کر ہی بدک گئی۔

"لیکن تین بجے اٹھ کر کیا کروں گی بھابی جان۔ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے میں کباب تل تلا کر ہاٹ کیس میں رکھ دیتی ہوں پھر تو ٹھنڈے نہیں ہوں گے یہ کباب۔"

"ارے۔ میں کوئی ایسی پاگل ہوں جو رات کے تین بجے تمہاری نیند میں خلل ڈال کر تم سے کباب تلواؤں گی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تم دیر سے سوئیں تو تین بجے اٹھنا مشکل لگے گا۔ ایسا کرو کہ ابھی سے کوئی معقول سا لباس نکال کر رکھ لو۔"

زینت ہنس کر بولیں۔ جانے کیوں اس لمحے اصل بات کہنی ان سے مشکل ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ بیٹے پر محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس کی اکلوتی اور چہیتی پھوپھی سے کوئی بغض و عناد نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے دل پر جبر کر کے اس سے اتنی یگانگت برت رہی تھیں ورنہ دل میں تو ان کے کدورت بھری ہوئی تھی۔

"لباس نکال کر رکھ لوں بھابی جان؟" سلوط کے پلے کچھ نہ پڑا تو اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ کپڑے نکال کر ساتھ کے ساتھ استری بھی کر کے رکھ دو گی تو بس نہیں وقت کے وقت پہننے کی کسر ہی رہ جائے گی۔" انہوں نے پھر بھی اپنا مقصد واضح نہ کیا۔

"ہیں تو کیا آپ لوگ مجھے رات کے تین بجے چھوٹے آقا کے یہاں ڈراپ کرتے ہوئے جائیں گے۔" وہ تعجب سے اچھل کر بولی۔

"ارے کیا سچ مچ ہی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے تمہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کروں گی۔ ارے پکنک پر نہیں چل رہا کیا۔ میں نے تو شام کو ہی نیلما سے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہو گی۔ یوں بھی بالکل نہیں لگا کہ تم سہیل بھائی کے ہاں رہو۔ آخر تم بھی تو اس گھر کی ایک فرد ہی ہو۔ اب اگر مگر کرنے کی ضرورت نہیں بس جلدی سے کپڑے تیار کر لو۔"

زینت جس یگانگت اور اپنائیت سے بات کر رہی تھیں کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ورطۂ حیرت میں غوطے کھانے لگتی۔ مگر اس وقت تو پکنک پر جانے کا سن کر وہ اندر ہی اندر پھولے نہ سمائی۔ کیونکہ آخر تو لڑکی ہی تھی اور لڑکی بھی نہ رہتی۔ اور یہ کمزوری کبھی کبھی اس پر بھی غالب ہو جاتی تھی۔ دوسرے اس گھر کے مکینوں نے جہاں وہ زبردستی کی مہمان بنی ہوئی تھی اسے گھر کا ایک فرد سمجھ کر اتنی اہمیت تو دی تھی کہ اپنی تفریح میں شریک کر رہے تھے اور تیسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس پکنک میں اسفند بھی شامل تھا۔ اب اسے یہ کب معلوم تھا کہ اسفند کی ضد پر ہی وہ پکنک میں شریک کی گئی ہے۔

"جی اچھا" وہ اپنی خوشی میں کھوئی کھوئی سی بولی۔ تو زینت نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تم نے تو خاصے کباب بنا لیے۔ کتنی تعداد ہو گی ان کی۔" زینت نے پوچھا۔

"تین درجن کے قریب۔" اس نے بتایا۔

"ہائیں تین درجن۔ مگر تین درجن تو کم پڑ جائیں گے۔" زینت کچھ اندازہ لگاتی ہوئی بولیں۔

"لیکن قیمہ تو کافی بچ گیا ہے بھابی جان کم از کم ڈھائی تین درجن کا اور۔" سلوط نے کہا۔

"پھر تو سارے قیمے کے ہی بنا لو آخر اکیس بائیس افراد ہوں گے۔ کم از کم تین تین کباب تو فی کس پڑنے چاہئیں۔" زینت نے کہا

"جی اچھا" وہ آہستہ سے بولی۔ کیونکہ مزید تین درجن کباب بنانے اور پھر انہیں تلنے کے خیال سے اسے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ اور زینت جو کتنی خوبصورتی سے اس پر یہ اتنا سارا کام چھوڑ کر چلی گئی تھیں اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر مزید تین درجن کباب بنانے اور انہیں تلنے میں دو نہیں ڈھائی گھنٹے صرف ہو گئے تھے اور اسے یہ کام کرنا سخت دو بھر لگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی جائے اور پکنک کے موقع پر پہننے کے لیے کوئی موزوں سا لباس منتخب کر کے اس پر استری کرے۔ مگر جلدی جلدی ہاتھ چلانے کے باوجود اسے دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی اس بور اور تھکا دینے والے کام سے فرصت مل سکی۔

اس وقت گیارہ بج چکے تھے جب وہ کام ختم کر کے اپنے کمرے میں پہنچی۔ اس لمحے اس پر تھکن کا احساس اس حد تک غالب تھا ایک منٹ بھی کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ ایک تو کمر اور ٹانگیں کھڑے کھڑے شل ہو کر رہ گئی تھیں دوسرے نیند بھی اس بری طرح آ رہی تھی کہ پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ کمرے میں جاتے ہی تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے غرض سے وہ بستر پر لیٹی تو ایسی سوئی کہ ساڑھے تین بجے شب نیلما کے زور زور سے ہلاتے جلانے پر ہی اس کی آنکھ کھلی۔

آتے ہی نیند نے آ لیا تھا اس لیے کپڑے بھی نہیں نکال سکی تھی۔ جب کہ نیلما بالکل تیار کھڑی تھی۔ آخر اس نے بھی الماری کھول کر سرسری ڈیزائن میں بنا ہوا اپنا ایک ریشمی سوٹ نکالا۔ جو اس نے گذشتہ ماہ نازش اور کوثر کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے خریدا تھا۔ اور جسے نازش نے اپنے ٹیلر سے سلوا کر دیا تھا۔ یہ جدید ترین ڈیزائن کا سوٹ بے حد خوبصورت تھا۔ سیاہ پر سبز کاہی، تربوزی اور زرد رنگ کی باریک دھاریاں پڑی تھیں۔ ہائی نیک کے گریبان آستینوں اور دامن پر سیاہ پٹی لگی ہوئی تھی۔ جس کی مناسبت سے اس نے اس پر سیاہ چنا ہوا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ بالوں کو بغیر مانگ نکالے پیچھے کر کے کلپ سے یکجا کر لیا تھا تاکہ منہ پر بکھرنے نہ پائیں۔ آنکھوں میں ہلکا ہلکا کاجل اور ہونٹوں پر نیچرل رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی اور کانوں میں سیاہ رنگ کے بڑے بڑے رنگ پہنے تھے۔

بس یہی تھا سنگھار، یہی آرائش تھی اس کی۔ اور اس میں وہ اتنی خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی کہ زینت بھی سراہے بغیر نہ رہی تھیں۔

نیلوفر اور نیلما نے ایک ہی طرز کے کپڑے پہنے تھے۔ مگر نیلوفر نے بلو جینز پر جینز کلاتھ کا ہاف کوٹ اور نیلما نے نیلی کاڈرائی کی جینز پر سرخ اسپائیڈر بلاؤز پہنا تھا۔ بالوں کو ربن میں باندھا تھا۔ اور بڑے خوبصورت بڑے بڑے ٹاپس پہنے تھے میک اپ بھی خاصا گہرا کیا تھا۔ اور دونوں ہی بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ دونوں

بہنوں نے اپنے اپنے شانوں پر کیمرے اور دوربینیں لٹکا رکھی تھیں۔ اور نیلما نے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا
بھی لے رکھا تھا۔ نیلما نے پیروں میں جوگرز پہن رکھے تھے اور نیلوفر نے کورٹ شوز سر پہ دونوں نے بہت
اسکارف باندھ رکھے تھے۔

اسفند تیار ہو کر اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب زینت، نیلوفر، نیلما اور سلوط سمیت لاؤنج میں کھڑی پر
پر ساتھ لے جانے کا سامان کریم سے اٹھوا کر باہر بھجوا رہی تھیں۔

"السلام علیکم ممی" اس نے ماں کے نزدیک آکر انہیں سلام کہا اور پھر بہنوں پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"ارے ممی یہ دونوں ینگ لیڈیز کون ہیں کہاں سے آئی ہیں ان سے تو آپ نے میرا تعارف کرایا ہی نہیں" زینت
نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد مسکرا کر کہا۔

"کمال ہے تم نے ان ینگ لیڈیز کو نہیں پہچانا۔ یہ دونوں تو سردار محمد اسفند کی منجھلی اور چھوٹی بہنیں ہیں
بات پر نیلوفر اور نیلما نے جو بھائی کے مذاق پر کھل اٹھی تھیں ہنستے ہوئے اسے سلام کیا تو اس نے دونوں کو
ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی ممی۔ مگر میں تو انہیں پہچان ہی نہیں سکا کہ یہ میری بہنیں ہیں۔ یہ تو بالکل شہزادیاں لگ رہی ہیں
ہی کیا دونوں بہنوں نے بھی کبھی اس کو اتنی لگاوٹ برتتے نہیں دیکھا تھا۔ تینوں ہی خوشی سے کھلے پڑ رہی تھیں

"او ہاں ممی۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ جو ہماری پھوپھو بیگم کی ڈپلیکیٹ ہیں کیا انہیں کسی نے دعا سلام کرنے
آداب نہیں سکھائے" وہ بہنوں سے الگ ہو کر ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ جو تینوں بھائی بہنوں کا پیار
کا اخلاص و پیار دیکھ کر اپنی ایک بھائی کی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتر سا گیا۔

"جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو پہلے تم انہیں سلام تو کرو۔ یوں بھی پھوپھی کی قائم مقام ہونے کی حیثیت سے سلام تو
تمہیں انہیں کرنا چاہیے تھا" زینت نے محض اس کی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے کہا۔

"او ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مجھے کچھ خیال ہی نہ رہا تھا" اس نے بھنویں اچکا کر کہا اور پھر قدم بڑھا کر سلوط کے آگے جھکا
اور ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا۔

"خادم آداب بجا لاتا ہے مس جونیئر" مگر وہ اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے سراسیمہ سی ہو کر پیچھے سرک گئی
تو اس نے یونہی جھجکتے جھجکتے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں ممی۔ پھوپھو بیگم تو میرے سلام کے جواب میں چٹ چٹ بلائیں لے کر میری پیشانی چوم لیتی ہیں۔ کیا ان
کا سر پر ہاتھ پھیر دینا ہی کافی نہ ہوگا" اور اس کی اس بات پہ جہاں سلوط اندر ہی اندر ہول کے رہ گئی وہاں زینت
دونوں بہنیں ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔ اور اس ہنسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سیدھا ہوتے ہوئے اس
سے کہا۔

"اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ کسی گستاخی کا مرتکب ہونے کو دل چاہ رہا ہے" مگر اس تعریف اور تحسین پر شرمانے کے
بجائے وہ گھبرا سی اٹھی۔ مگر اسی دم باہر کاریں رکنے اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی تو زینت نے گھبرا کر کہا۔

"افوہ۔ وہ لوگ آ گئے۔ آؤ بچیوں جلدی سے باہر چلو۔ تمہارے ڈیڈی نے تاکید کی تھی کہ پہلے سے باہر آ کر کھڑے
ہو جانا۔ یہ نہ ہو کہ سب کو انتظار کی سولی پر لٹکانے کے بعد آؤ۔ مگر ہوا وہی اب دیکھ لینا اس بات پر کتنی خفا ہوں گے"

"اوہو اب اتنی سی بات پر ڈیڈی خفا کیوں ہو جائیں گے۔ ہم نے تو بالکل دیر نہیں کی۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ
ہم پہلے سے جا کر باہر کھڑے ہو جاتے" نیلوفر بولی۔

"ممی یہ آپ دونوں نے صمد انکل کے فارم پر پکنک منانے کا پروگرام کیوں بنایا ہے آخر ہمارا اپنا فارم بھی تو ہے"
پکنک منانے کی بات ہی اور ہوتی" نیلما نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"اصل میں صمد بھائی نے یہ فارم نیا نیا خریدا ہے۔ اور اس میں کچھ نئی اصطلاحات بھی کی ہیں۔ بس اسی خوشی میں انہوں
نے ہمیں وہاں چلنے کے لیے انوائیٹ کیا ہے" زینت نے بتایا۔

"کیسی نئی اصطلاحات ممی؟" نیلوفر نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

بھی وہ انہوں نے جو نئے رائیڈنگ ہورس (گھڑ سواری کے گھوڑے) خریدے ہیں ان کے لیے جدید طرز کا اصطبل
بنوایا ہے۔ آب پاشی کے لیے جو نہر نکالی ہے اس پر بڑا خوبصورت پل بنوایا ہے۔ اور ریسٹ ہاؤس کے علاوہ جو پہاڑی
ان کے حصے میں آتی ہے اس پر بڑے خوبصورت ہٹس بھی بنوائی ہیں یعنی اتفاق سے چاروں فارم ایک ساتھ فروخت ہو
رہے تھے جو سب کے سب انہوں نے خرید لیے تھے۔ معلوم بھی ہے پورے ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں یہ فارم
ہیں سوئس طرز کے باغات۔ پولٹری فارم الگ بنا رکھا ہے۔ اور مویشی خانہ الگ۔ حتیٰ کہ کھیت بھی ہیں جن پر گنوں
اور ترکاریوں وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے"

"او واؤ پھر تو واقعی صمد انکل کا فارم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہوگا" نیلما بولی۔

"ظاہر ہے جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ ہمارا فارم اول تو ڈھائی سو ایکڑ کا ہے۔ دوسرے ہم نے اس پر
اتنی جان بھی تو نہیں کھپائی۔ تمہارے ڈیڈی نے تو بس اس خیال سے خرید کر ڈال دیا تھا کہ وہ بھی کم از کم ایک فارم کے
مالک تو کہلائیں گے۔"

زینت بولیں تو اسفند جواب تک نہایت خاموشی سے ان کے ساتھ باہر کا رخ کر رہا تھا بولا۔

"خیر یہی کیا کم ہے کہ ہم ایک فارم کے مالک تو ہیں۔ اگر ضرورت محسوس کی تو قرب و جوار کی زمینیں خرید کر اسے توسیع
بھی دے دیں گے۔ مگر دوسرے کی کسی چیز سے اس قدر متاثر ہونا دل میں حسد اور حرص پیدا کرتا ہے اور یہ کوئی اچھی
بات نہیں" اور اس کی بات پر تینوں ماں بیٹیاں چپ سی ہو گئیں۔

یوں بھی یہ سب باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

باہر پورچ سے لے کر گیٹ کے باہر تک۔ کئی کاریں ایک قطار کی صورت میں کھڑی تھیں۔ جن میں کاروں کے علاوہ
ایک اسٹیشن ویگن۔ ایک جیپ اور ایک سوزوکی وین بھی شامل تھی۔ اور زینت کی طرف کا سارا سامان وین میں رکھا جا رہا
تھا۔ کاروں میں ایک کچھ دھاں سی بھری ــــ ہوئی تھی۔ اور ایسا شور مچ رہا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ کچھ مرد اور خواتین کاروں سے
اتر کر باہر بھی کھڑے ہوئے تھے اور ان سے ملنے ملانے اور باتیں کرنے کا سلسلہ اب طویل ہونے لگا تو اسفند نے اپنی کار میں بیٹھ
کر دونوں بہنوں کو آواز دی۔ دونوں فوراً ہی بھائی کی آواز پر لپکیں۔ نیلما سلوط کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

"چلو آؤ جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ بس مجھے یہی بے قاعدگی پسند نہیں۔ اگر ان لوگوں کو باتیں ہی کرنی ہیں تو پکنک اسپاٹ پر
پہنچ کر بھی ــــ کر سکتی ہیں۔ مگر یہاں کی خواتین کو وقت ضائع ہو جانے کا کوئی احساس ہی نہیں" اسفند بولا۔ اسی اثناء
میں نیلوفر بھائی کے ساتھ اگلی سیٹ پر اور نیلما اور سلوط پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ اور چونکہ اسفند کی کار پورچ میں سب سے
آگے کھڑی تھی اس لیے اس نے اپنی کار آگے بڑھائی اور دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"مگر بھائی جان اور سب تو ابھی یونہی کھڑے ہیں" نیلوفر نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"یونہی بھی کھڑے ہیں تو اب مجھے پیش قدمی کرتے دیکھ کر خود ہی آ جائیں گے" اور ہوا بھی یہی۔ اسفند کی کار کو دوسرے
گیٹ سے باہر نکلتا دیکھ کر سب جلد جلد اپنی کاروں میں بیٹھ گئے اور پھر یکے بعد دیگرے کاروں کا یہ مختصر سا قافلہ سوئے
منزل روانہ ہوا۔

شعیب منصور نے پکنک کے لیے نیلوفر کی کار کا انتخاب کیا تھا۔ اور وہ بیوی کے ساتھ اس میں آ رہے تھے۔
روانگی چونکہ چار بجے کے بجائے ساڑھے پانچ بجے ہوئی تھی اور صمد جلیل کا فارم ملیر کے نواح میں کہیں واقع تھا اس
لیے وہاں پہنچتے پہنچتے پو پھٹ گئی تھی۔ اور کچھ اتنا دلفریب اور سحر انگیز سا سماں تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ وقت صبح کے اس
زرین پہر میں ٹھہر جائے۔
اس پہر میں ٹھہر کر ان پرفسوں اور حسین تر ساعتوں کو لازوال بنا دے۔

مگر وہاں تو اس دلفریب سماں سے لطف اٹھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اپنی سوچ کو امر بنا لینا تو بڑی بات۔
کیونکہ تقریباً دوسری تمام کاریں بھی آ گئی تھیں اور ان کے رکتے ہی ان میں سے ڈھیروں لڑکے اور لڑکیاں، خواتین اور
مرد بمعہ ملازمین ابل سے پڑے تھے۔ جبکہ زینت کے اندازے کے مطابق تو کل اکیس بائیس افراد ہی تھے جو پکنک پر
جا رہے تھے۔ مگر وہاں تو پکنک منانے تقریباً تین درجن افراد آئے تھے۔ چھ شادی شدہ جوڑے۔ چھ لڑکے بارہ

لڑکیاں اور چار ملازم اور ایک ڈرائیور جو وین کو چلا کر لایا تھا۔

"واہ بھئی، یہ لوگ پکنک منانے آئے ہیں یا کسی جلسے کا انعقاد کرنے۔" انہیں دیکھ کر اسفند نے ریمارک پاس کیا تو نیلوفر اور نیلما ہنسنے لگیں اور سلوط کے چہرے پر بھی مسکان دوڑ گئی۔

"میرے خیال میں تو صمد انکل اپنے فارم کی افتتاحی رسم ادا کرنے کی غرض سے اتنے سارے لوگوں کو ساتھ لائے ہیں۔" نیلما نے اظہار خیال کیا۔

"خیر جو کچھ بھی ہو میرا تو سارا موڈ آف ہو کر رہ گیا ہے۔ بھلا اتنے سارے لوگوں کے ساتھ بھی کہیں پکنک ہو کر انجوائے کیا جا سکتا ہے۔" نیلوفر سخت ناگواری سے بولی۔

"خیر جب آ ہی گئی ہو تو پھر خود ہی اپنی تفریح کا کوئی سامان پیدا کرو۔ ایسے بھی اتنی بڑی جگہ ہے جہاں چاہو خود کو ایڈجسٹ کر سکتی ہو۔"

اسفند نے کہا جو خود بھی اتنے لوگوں کو دیکھ کر بیزار سا ہو رہا تھا۔

تبھی بے حد طرح دار اور چنچل سی لڑکیوں کا ایک ٹولا سا جنہوں نے ——— جینز کے ساتھ کھلے گلے اور بغیر آستینوں کے بلاؤز پہن رکھے تھے۔ ان کی طرف بڑھا۔ اس ٹولے میں صمد جلیل کی دو بیٹیاں اور سالیاں شامل تھیں۔

"ہائے نیلو تم اتنی دیر سے یہیں جم گئی ہو ادھر کیوں نہیں آئیں ہمارے پاس۔" ثمینہ نے قریب آتے ہی شکوہ سا کیا۔

"ارے نہیں بس آ ہی رہی تھی کہ تم خود آ گئیں۔" نیلو بولی اور پھر اس نے خاص طور پر صمد صاحب کی سالیوں کا تعارف بھائی اور سلوط سے کرایا۔ اور ان سب سے ——— بھائی کا تعارف کرا کے اس نے سلوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ سلوط ہیں۔" اصل میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سلوط کو اپنی کزن ظاہر کرے یا پھوپھی کی نند۔

"کیا تمہاری بھابی ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"نہیں بھئی کیسی باتیں کرتی ہو تم یہ تو میری کزن ہیں۔" نیلوفر نے آنکھیں پٹپٹا کر اور گردن نہوڑا کر کہا۔ جب کہ نیلما، ثمینہ کے سوال پر ہنسنے لگی تھی۔

"خیر خیر۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو تو انہیں ان کی سمجھ کے مطابق جو کچھ کہہ رہی ہیں کہنے دو۔" اسفند بھی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ایک قہقہہ پڑا۔ اور سلوط کٹ کر رہ گئی۔

"ویسے اگر سچ پوچھا جائے تو آپ کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔" صمد جلیل کی سالی عروج نے سراہنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں بشرطیکہ سچ پوچھا جائے بھی نا۔" اس نے دیکھا کہ لڑکیاں اس معاملے کو بہت سیریس لے رہی ہیں تو بات کو مذاق میں اڑایا۔ اور اس کے کہنے کے انداز پر ایک بار پھر سب ہنسنے لگیں۔

"ارے نہیں یہ تو پہلے سے انگیجڈ ہیں۔" نیلوفر نے محض اس موضوع کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"اوہ ہاؤ سیڈ مسٹر اسفند۔ شاید آپ سو گئے تھے۔" ارم بولی۔

"ہاں اور جب آنکھ کھلی تو مال دوستوں کا ہو چکا ہو گا۔" ایک اور لڑکی ماریہ نے گویا لقمہ سا دیا جو ثمینہ کی کزن تھی۔ اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا۔ اف تو یہ کس قدر فری اور چرب زبان لڑکیاں تھیں۔ سلوط تعجب سے انہیں دیکھے گئی۔

"مال دوستوں کا بھی ہو جائے تو اپنی ملکیت ہونے کی وجہ سے چھینا بھی تو جا سکتا ہے۔" اسفند بھلا ان سے پیچھے رہنے والا تھا۔

"آہا دیکھا نیلو۔ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے نا۔" سبینہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی۔

"اف تو بہ بھئی تمہیں تو بس ذرا سا بہانہ چاہیے بات کو کہیں سے کہیں پہنچانے کا۔" نیلوفر ان کی باتوں سے زچ ہو کر بولی۔

"ان لوگوں کو تو سوائے ایسی باتوں کے اور کچھ آتا ہی نہیں آپ مائینڈ نہ کیجیے گا ان کی باتوں کو سلوط آپا۔" نیلما نے سلوط کو بری طرح جھینپتا ہوا دیکھ کر کہا۔ تبھی اس پکنک پارٹی کے دوسرے افراد بھی ان کے نزدیک آ گئے۔ سلام دعا کے بعد صمد جلیل نے کہا۔

"میں آپ سب کو یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ آج کے دن ریسٹ ہاؤس میں بیٹھ کر کھانا پینا کچھ لطف نہیں دے گا اس لیے میں نے سب کے لیے سنترے کے باغ میں قالینوں کا فرش بچھوا کر بیٹھنے کا انتظام کر دیا ہے۔ کیا آپ حضرات میں سے کسی کو اس پر اعتراض تو نہیں۔"

"نہیں اعتراض تو نہیں مگر یہ ضروری تو نہیں کہ سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھائیں پئیں۔" ایک صاحب نے کہا۔ جو اپنے لباس سے گھڑی، انگوٹھیوں اور کیمرے وغیرہ کی بہت شو آف کر رہے تھے۔

"ہاں یعنی آپ کا مطلب ہے بلو صاحب کہ سب علیحدہ علیحدہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائیں۔" مسز صمد بولیں۔

"لیکن اس طرح تو بد نظمی پیدا ہو جائے گی کسی کو کچھ ملے اور کسی کو کچھ۔" مسز صمد کی ایک دوست مسز قیصر بولیں۔

"نہیں بھئی جو کچھ بھی لایا گیا ہے سب آپس میں برابر کا شیئر کر کے کھائیں گے۔" زینت بھی دبی زبان سے بولیں۔

"ہاں بھئی پکنک وغیرہ کے موقع پر یہی ہوتا ہے کوئی دنیا سے نرالی باتیں تو نہیں۔" مسز حمید نے کہا۔

"لیکن ہم تو بھابی پابندی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ جو کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ اپنے پاس ہی رکھیے۔ البتہ ہم جو کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں وہ اپنی خوشی اور مرضی سے ہی کھائیں گے۔" بلو صاحب بولے۔ تو صمد جلیل کو غصہ آ گیا۔ پھر بھی انہوں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے ملازم سے کہا۔

"جاؤ بدرو۔ یہ بلو صاحب کھانے پینے کا جو سامان ساتھ لائے ہیں اسے الگ کر کے انہیں دے دو۔"

"ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔" بلو صاحب اکڑتے ہوئے بولے حالانکہ ان کی بیوی اور بیٹی انہیں منع کرتی ہی رہ گئیں۔ مگر انہوں نے ریسٹ ہاؤس کی پینٹری میں جا کر ملازم سے اپنا سامان الگ کروا لیا۔ اور پھر بیوی اور بیٹی اور بھانجے کو جو ان کے ساتھ آیا تھا لے کر ایک سمت چل دیے۔

"اف تو بہ بڑی ہی چھچھوری شخصیت ہیں یہ بلو صاحب۔ آپ نے خواہ مخواہ ہی انہیں پکنک پر انوائیٹ کیا۔" ان کے جانے کے بعد مسز صمد بولیں۔ "بھئی میں نے تو سوائے اپنے چند دوستوں کے کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کیا تھا۔ بس وہ تو میرا کہنا ہی غضب ہو گیا کہ پکنک پر جا رہا ہوں۔ اب جو یہاں آ کر دیکھا تو بھانت بھانت کی صورتیں نظر آئیں۔ بھلا اتنا ہجوم کہ معلوم ہو رہا تھا کہ کسی پکنک پر نہیں بلکہ خطرناک مہم کو سر کرنے پوری فورس کے ساتھ آئے ہیں۔"

صمد جلیل نے جس جلے کٹے انداز میں یہ آخری فقرے کہے۔ سب زور زور سے ہنسنے لگے۔ حد تو یہ تھی کہ وہ بھی اس ہنسی میں شامل ہو گئے۔ جو بن بلائے ہی دوسروں کے ساتھ لگے لگے آ گئے تھے۔

"اچھا ڈیڈی۔ اب مزید بور تو نہ کیجیے ہمیں۔ ویسے ہی انکل بلو کی بیں نس پر دل جل رہا ہے۔" ثمینہ اکتا کر بولی۔

"ارے دل تو ہمارا جل رہا ہے ممی۔ نہ معلوم صبح ہی صبح کس کا منہ دیکھا تھا جو۔"

"انکل بلو کا۔" صمد جلیل کی بات کے درمیان عروج نے ٹکڑا لگایا۔ تو ایک قہقہہ پڑا۔

اس سمے سورج نکل آیا تھا۔ اور ایک دھندلا سا آتشیں اجالا کائنات کی ہر شے پر شنگرفی سا رنگ برسا رہا تھا۔ اصل میں مشرقی افق اس وقت سنہرے بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ نسیم سحری کے خنک باد جھونکوں میں اب زندگی کو جلا دینے والی حدت بھی شامل ہو گئی تھی قسم قسم کے پنکھ پکھیرو۔ اپنے پورے پنکھ پھیلائے پوری آزادی سے فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے۔ اور جو ڈالی ڈالی اور پات پات ڈول رہے تھے۔ ان کی چہکاریں سماعت کو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ ارد گرد اور تاحد نظر درخت تھے، سبزہ تھا اور نگاہوں کو محیط کرنے والے دلفریب مناظر گویا رنگ ہی رنگ اور حسن ہی حسن۔

کوئی بھی اس طلسماتی ماحول میں بوریت اٹھانے کا روادار نہ تھا۔

سبینہ کو رائیڈنگ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

اس کی دیکھا دیکھی سبینہ بھی رائیڈنگ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اصل میں اپنے اس شوق کے پیش نظر انہوں نے باپ سے ضد کر کے اعلیٰ نسل کے گھوڑے خریدنے پر انہیں مجبور کیا تھا۔ اور جب سے فارم خریدا گیا تھا وہ دونوں ہر ہفتے یہاں آ کر گھڑ سواری کا شوق پورا کرتی تھیں۔

اس سمے صبح کا وقت ہی تھا۔ اور رائیڈنگ کے لیے یہی وقت سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اور ثمینہ تریزہ پروگرام بنا کر آئی تھی۔ ماں سے بولی۔

"ممی ہم دونوں کو رائیڈنگ کے لیے جا رہے ہیں اگر کوئی اور بھی چلنا چاہے تو بڑے شوق سے میرے ساتھ آجائے" تب نیلو کے ساتھ نیلما اور کئی اور لڑکیاں تیار ہو گئیں۔ وہ تینوں ثمینہ کی ممانی کی بھانجیاں تھیں۔

"آؤ بھئی سلوط تم بھی تو آؤ نا۔" نیلو نے محض منہ چھوا لیا۔

"نہیں بھئی رائیڈنگ تو کیا میں گھوڑے کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔"

"اور بھائی جان آپ۔ آپ تو ایکسپرٹ ہیں رائیڈنگ کے۔" نیلوفر نے بھائی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ایکسپرٹ ہوں جبھی تو نہیں جا رہا۔ تاکہ تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔" اسفند نے کہا تو نیلوفر خواہ مخواہ ہی ہنسنے لگی۔ ثمینہ تو پہلے بھی ایک دو بار اسفند سے مل چکی تھی لیکن آج اس کی طرف بڑا رُخ دے رہی تھی۔ اٹھلا کر بولی۔

"ہوں۔ ایزاِن یُو۔ بس آئیں زیادہ بور نہ کریں۔"

"اچھا صرف ایک شرط پر چلوں گا۔" اسفند آمادگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ تو ثمینہ نے جلدی سے پوچھا۔

"آپ کی ہر شرط ہمیں منظور ہے۔"

"تو پھر کسی طرح ان کو بھی رائیڈنگ کے لیے آمادہ کر لیجیے۔" اسفند نے سلوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ گھبرا کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ میں نے کہا تو ہے کہ مجھے رائیڈنگ کا شوق ہے نہ ہی اس فن سے واقف ہی ہوں۔ پھر میں آپ لوگوں کے ساتھ جا کر کیا کروں گی۔"

"لیجیے جناب یہ تو صاف انکاری ہیں ہمارے ساتھ جانے سے۔" ثمینہ نے اسفند کو مخاطب کر کے کہا۔ تو وہ سلوط سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لیکن رائیڈنگ کوئی اتنی خوفناک چیز تو نہیں ہے۔ آئیے میں آپ کو سکھا دوں گا۔ یوں بھی آپ یہاں تنہا رہ کر کیا کریں گی۔" اصل میں پارٹی کے دوسرے افراد اسی اثنا میں اِدھر اُدھر چھٹ گئے تھے۔ حتیٰ کہ شعیب منصور اور زینت بھی صمد جلیل اور ان کی بیگم وغیرہ کے ساتھ باغات کی طرف چلے گئے تھے۔ اگر یہ لوگ بھی چلے جاتے تو وہ واقعی بالکل تنہا رہ جاتی اسی صورت حال کے پیش نظر اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے تنہا رہ جانے سے تو یہی بہتر ہے کہ میں چلی چلوں۔"

"واہ۔ اگر یونہی ہونا تھا تو ہمیں چاہیے تھا کہ پہلے آپ سے پوچھتے۔" ثمینہ نے طنز سا کیا۔

نیلوفر حیران بھی ہو رہی تھی اور جز بز بھی۔ کیونکہ اسے بھائی کا سلوط کو اس قدر اہمیت دینا بالکل نہیں بھایا تھا۔ یوں بھی اس کے خیال میں سلوط ایک بور اور اَن کلچرڈ سی لڑکی تھی۔ جو گھرداری کے کاموں کے لیے ہی فٹ بیٹھتی تھی۔ اس میں ایک تو ماں نے اس کے بارے میں کچھ امپریشن ہی ایسا دیا تھا۔ دوسرے وہ اس کی خوبصورتی سے بھی جلتی تھی۔ اور اسے بالکل قابل اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو بس بھائی کی خوشنودیٔ خاطر کو اور کچھ بھائی پر یہ ثابت کرنے کو وہ کس قدر با اخلاق اور تہذیب یافتہ ہے سلوط سے اتنی رواداری سے پیش آ رہی تھی۔ ورنہ جب کھانے کی میز پر بھائی نے سلوط کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ صادر کیا تھا تو سب سے زیادہ کوفت اسے ہی ہوئی تھی۔ اور سب سے زیادہ اسے ہی بُرا لگا تھا۔ اسی لیے جب چند گھنٹے بیشتر زینت نے اس سے کہا تھا کہ وہ جلدی سے جا کر سلوط کو جگا دے اور اسے تیار ہونے کو کہے۔ تو خود جانے کے بجائے اس نے نیلما کو بھیج دیا تھا۔ اور اب بھائی نے سلوط کو ساتھ لے جانے کی شرط رکھی تو وہ کچھ زیادہ ہی جل گئی۔ سلوط کی آمادگی کے بعد سب فوراً ہی اصطبل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ نیلوفر ثمینہ کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔

"اصل میں یہ سلوط گھریلو ٹائپ سی ہیں۔ سوسائٹی موو کرنا انہیں بالکل نہیں آتا۔" نیلوفر نے انگریزی میں آہستہ سے ثمینہ کو بتایا۔

"ہاں میں تو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی اور مجھے تو تمہاری یہ کزن کمپلیکسڈ سی لگتی ہیں۔" ثمینہ نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"مگر یہ میری کزن تو نہیں ہیں۔" نیلوفر نے کہا۔

"ہیں۔ دہاٹ۔ کیا یہ تمہاری کزن نہیں ہیں؟" استعجابی سی کیفیت میں ثمینہ اونچی آواز میں بولی۔

"ذرا آہستہ بولو۔ مجھے مروا دو گی کیا۔" نیلوفر نے زور سے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"تو ابھی تم نے کزن کہہ کر کیوں تعارف کرایا تھا۔" ثمینہ کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"مگر ابھی وہ تو بھائی جان کی وجہ سے کرایا تھا۔" نیلوفر بولی۔

"بھائی جان کی وجہ سے کرایا تھا مگر کیوں؟ آخر یہ چکر کیا ہے؟" ثمینہ نے حد درجے متجسس سی ہو کر پوچھا۔

"یہ چکر وکر تو کوئی نہیں ہے۔ اصل میں سلوط سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہماری پھپھو کی نند ہیں۔ لیکن بات بھی یقینی نہیں ہے کیونکہ سُنا ہے کہ یہ پھپھو کی اڈاپٹڈ (متبنیٰ) ہیں۔" نیلوفر نے سلوط کے اور اپنے تعلق کی تفصیل بتائی۔

"اچھا۔ مگر کیا یہ واقعی انگیجڈ ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں انگیجڈ ہے یا مطلقہ۔ مگر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" نیلوفر بولی۔

"اچھا تو کچھ گڑبڑ بھی ہے۔ ہاں بھئی بعض لوگ اوپر سے جتنے معصوم، جتنے اچھے لگتے ہیں اندر سے اتنے ہی چالاک اور بُرے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تو تمہارا بھائی اس میں بہت انٹرسٹڈ لگتا ہے۔" ثمینہ نے وہ بات آخر پوچھ ہی لی۔ جو اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔ بھائی جان کے لیے کیا لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ جو وہ اس میں انٹرسٹ لیں گے۔ وہ تو چونکہ سلوط پھپھو جان کی نند ہے اس لیے اور ہمارے یہاں ہی ٹھہری ہوئی ہے۔ اس لیے بھائی جان اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔" نیلوفر نے کہا۔ تبھی نیلما جو نیلوفر اور ثمینہ کے پیچھے ہی چل رہی تھی۔ اس نے ذرا سا آگے بڑھ کر نیلوفر سے کہا۔

"بجواب خاموش ہو جائیں کیونکہ بھائی جان کے کان بہت تیز ہیں۔ اور ہوا بھی بھائی جان کی سمت ہی چل رہی ہے۔" یہ بات نیلما نے بہن کو خبردار کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ یہ جتانے کی غرض سے کہی تھی کہ وہ بھی یہ ساری گفتگو سن چکی ہے نتیجۃً بہن کے اس طرح ٹوکنے پر نیلوفر نے برہم سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن ثمینہ کی وجہ سے بولی کچھ نہیں مگر جونہی ثمینہ اس کے پاس سے ہٹی اس نے نیلما کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ثمینہ کے سامنے یہ جتانے کی کیا ضرورت تھی کہ تم بھی میری باتیں سن رہی ہو۔"

"کیونکہ کسی کے بارے میں اتنی بے بنیاد باتیں کرنے سے غیبت کا مرتکب ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" نیلما بڑی متانت سے بولی۔

"مگر غیبت تو نہیں تھی بلکہ جو حقیقت تھی وہی بیان کی ہے میں نے۔" نیلوفر چمک کر بولی۔

"لیکن حقیقت اس طرح تو بیان نہیں کی جاتی بجو کہ دوسرے کا امپریشن ہی خراب ہو جائے۔" نیلما نے کہا۔

"اوہو۔ تم تو اس وقت ایک دم بھائی جان کی چمچی لگ رہی ہو۔" نیلوفر چھوٹی بہن کی ناصحانہ گفتگو پر جل کر بولی۔

"لیکن ان باتوں میں بھائی جان کا کیا ذکر جو آپ انہیں ملوث کر رہی ہیں۔"

"اصل معاملہ انہی کا ہے۔ وہ کیوں سلوط کو اتنی امپورٹینس دیتے ہیں کہ ایک تو زبردستی پکنک پر ساتھ لے آئے۔ اس پر یہاں بھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خوشامد کر رہے ہوں۔ آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی نا۔"

"کمال ہے۔ وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ سوائے لائکنیس (پسندیدگی) کے۔ یوں بھی سلوط آپا ہماری مہمان ہیں اور پھپھو کی نند ہیں۔ بس اسی وجہ سے بھائی جان ان کا اس قدر خیال رکھتے ہیں۔" نیلما نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ یہ خیال وپال رکھنا کہیں کوئی اور گل نہ کھلا دے۔" نیلوفر بولی۔

"اگر کھلا بھی دے گا تو ہم کیا۔ آپ بھائی جان کے کسی معاملے میں دخل اندازی تو نہیں کر سکتیں نا۔"

"اے خدا نہ کرے۔ ایسی بات تو نہ کہو۔ سلوط کا معاملہ بڑا کمپلیکیٹڈ (پیچیدہ) سا ہے اور وہ ایسی گھُنّی ہے کہ کچھ بتاتی نہیں۔" نیلوفر بولی۔

"کیوں۔ آپ نے ان سے کچھ پوچھا تھا کیا؟" نیلما نے پوچھا۔
"نہیں۔ میں کیوں پوچھنے لگی۔" نیلوفر نے بُرا سامنہ بنا کر کہا۔
"تو پھر کیا وہ خود آ کر آپ کو بتائیں۔ ویسے بھی ان کے ساتھ آپ کا ایٹی ٹیوڈ ـــــ (سلوک) کون سا بہتر
نیلما طنز سا کرتی ہوئی بولی تو نیلوفر فوراً جواب سی ہو کر بولی۔
"افوہ بھئی تم تو ذرا ذرا سی بات میں بحث پر اُتر آتی ہو مگر یہ کچھ اچھی عادت نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا
کہ مجھے سلوط کے رویے سے شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ کہ کبھی جھینپ رہی ہیں، کبھی شرما رہی ہیں اور کبھی یوں الجھ رہی
ہیں جیسے کسی کو خاطر میں ہی نہ لا رہی ہوں۔ ایٹی کیٹس سے تو ایک دم عاری ہی ہے یہ لڑکی۔" نیلوفر نے جیسے بات ہی
توڑ دی۔
"ہاں۔ وہ مکس ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ مگر" نیلما نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عروج ان کے نزدیک آ گئی جس کی وجہ سے
نیلما کو چُپ ہو جانا پڑا۔ شروع شروع میں تو سب آہستہ آہستہ چل رہے تھے مگر تھوڑا آگے جا کر سب نے رفتار
تیز کر دی تھی۔
"بھئی آخر کتنی دور اور جانا ہوگا؟" ثمینہ کی ممانی کی بھانجی طلعت نے راستے کی طوالت سے اکتا کر پوچھا۔
"بس تقریباً نصف فاصلہ رہ گیا ہے۔" سبینہ نے بتایا۔
"پھر تو ہمیں دوڑ لگانی چاہیے تاکہ یہ فاصلہ کسی طرح ختم تو ہو۔" طلعت کی بہن رفعت بولی۔
"نہیں بھئی، یہاں چلنا مشکل ہو رہا ہے اور تم دوڑ لگانے کو کہہ رہی ہو۔ اگر ابھی سے تھک گئے تو پھر سارا دن کیسے
گزاریں گے۔" طلعت بیزاری سے بولی۔
"مگر یہ کچھ زیادہ فاصلہ تو نہیں۔ مشکل سے تین فرلانگ ہی ہوگا اور ہم دونوں تو صبح جوگنگ کے لیے نکلتے ہیں تو
دو دو میل تک بھاگتے چلے جاتے ہیں۔" ثمینہ بولی۔
"ہاں بھئی، تمہارے کیا کہنے۔ تمہاری تو بات ہی اور ہے۔ مگر اور تو اتنی دور تک چلنے کے عادی نہیں ہیں نا۔"
عروج بولی۔
"بھئی پکنک پر آئے ہیں۔ کوئی زبردستی تو نہیں لائے گئے نا۔ تھوڑی بہت اسپورٹ مین شپ تو سبھی میں ہونی چاہیے۔"
ارم بولی۔
وہ سب کے سب جن میں ثمینہ کے دو کزنز بھی شامل تھے ایسی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف
میں سبزہ ہی سبزہ اور درخت ہی درخت اُگے ہوئے تھے۔ آگے جا کر درختوں اور سبزے کا سلسلہ ختم ہوا اور دائرے کی شکل
میں گھوم کر کھیتوں کی طرف چلا گیا اور یہ لوگ ایک چٹانی سے علاقے میں داخل ہو گئے۔ مگر یہ علاقہ اتنا سنگلاخ نہیں تھا۔
درخت اور پودے یہاں بھی لہلہا رہے تھے۔ صبح کی روپہلی اور زندگی کی حرارت میں ڈوبی دھوپ اب خاصی چمک رہی
تھی۔ ساری لڑکیاں آگے بڑھ گئی تھیں۔ صرف سلوط ہی پیچھے رہ گئی تھی۔
اصل میں اس کی پینسل ہیل اسے بہت تنگ کر رہی تھی جسے پہن کر وہ سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ گھر سے چلتے وقت
اندازہ نہیں تھا کہ اتنا چلنا پڑے گا۔ جب کہ چلنے پھرنے کی تو ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ کوئی معقول چپل ایسی نہیں تھی۔
تین سینڈلز ہی تھے اور صرف لباس سے میچ کرنے کی وجہ سے اس نے وہ کالا سینڈل پہن لیا تھا اور تیز چلنے کی کوشش
کے باوجود پیچھے رہ گئی تھی جب کہ اور لڑکیاں اپنے آپ ہی میں مگن تھیں۔ اس پر انتہائی تیز و طرار اور چنچل سی۔ اس سے
نہیں تھی اور پکنکس وغیرہ کے موقعوں پر ان باتوں کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ کسی کے انتظار میں وقت ضائع کیا جائے
یا کسی کی وجہ سے اپنی تفریح میں وقت ضائع کیا جائے اور پھر وہ پیچھے ہی تو آ رہی تھی۔ اسی لیے سب بہت آگے بڑھ گئے۔
اسفند بھی ثمینہ کے کزنز سے باتیں کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان، ساری توجہ سلوط کی طرف ہی تھی۔
جا کر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ سلوط اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ دانستہ
کزنز سے کٹ کر علیحدہ چلنے لگا اور جب وہ دونوں کافی آگے نکل گئے تو وہ اسے ڈھونڈتا ہوا پلٹ کر پیچھے آ گیا۔ وہ دھیرے

آہستہ آہستہ چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔
"کیوں کیا ابھی سے تھک گئیں آپ۔" اس نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔
"تھکی تو بالکل نہیں بس ذرا یہ جوتی تکلیف دے رہی ہے۔" سلوط نے بتایا تو اسفند کی نظر اس کے پیروں پر پڑی
"یہ جوتی تکلیف نہیں دے گی تو اور کیا کرے گی۔ بھلا یہ پینسل ہیل بھی کہیں پکنک پر پہنی جاتی ہے۔ تعجب ہے آپ کو اتنا بھی
معلوم نہیں۔ کیا آج سے پہلے کبھی پکنک پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا آپ کو۔" وہ صاف گو تھا اس لیے کوئی بات کہنے میں باک نہیں
تھا۔ مگر سلوط پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسی شرمندگی میں وہ اسے یہ بھی بتانے کے قابل نہیں رہی کہ اس کے پاس کوئی
ڈھنگ کی جوتی ہی نہیں تھی۔
"خیر اگر آپ کو معلوم نہیں تھا تو کم از کم کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ نے اپنے کمپلیکس میں نہیں پوچھا
ہوگا۔ اب اس نوکیلی ہیل کی وجہ سے آپ تھوڑا سا انجوائے کرنے کے بھی قابل نہ رہیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب اسے اتار کر اپنے
ہی بیگ میں ڈال لیں۔"
وہ اپنی صاف گوئی میں تھوڑی سی ناگواری شامل کر کے بولا۔ حالانکہ وہ بہت سادہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مگر ایک
تو اس نے اسے کمپلیکسڈ کہا تھا دوسرے اس کی گفتگو کے ہر لفظ سے اسے طنز سا جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں سے وہ
بہت ہی محسوس کر رہی تھی۔ احساسات مجروح ہو کر رہ گئے تھے۔ دل کٹ کے رہ گیا تھا۔ اور دل تھا کہ بھر سے چلا آ رہا تھا۔ پھر
بھی وہ بڑے ضبط سے کام لے کر بولی۔
"نہیں۔ جب انہیں پہن کر ایک جہالت آمیز قدم اٹھا ہی چکی ہوں تو اب انہیں اتاروں گی نہیں۔"
"خواہ پیر میں موچ آ جائے یا ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ جائے۔" اس نے چڑتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"ہاں خواہ کچھ بھی ہو جائے مگر برہنہ پا ہو کر تماشا نہیں بنوں گی۔" وہ ہٹیلے انداز میں بولی۔
"تعجب ہے۔ آخر اس بچکانہ سی ضد سے حاصل کیا ہوگا۔ آخر آپ کس وجہ سے اتنے شدید کمپلیکس کا شکار ہیں
ایسی کیا کمی ہے آپ میں۔ جب کہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں آپ ہمیشہ اور ہر جگہ ممتاز ہی لگتی ہیں۔"
وہ اس کی ہٹیلی باتوں پر متعجب سا ہو کر بولا تو اس کا دل چاہا کہے۔ سب سے بڑی کمی تو یہ ہے کہ مالی اعتبار سے
ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ دوسرے آپ لوگوں سے میری کوئی رشتے داری بھی نہیں ہوتی۔ بس آپ کی پھپھو کے
حوالے سے ہی پہچانی جاتی ہوں۔ اسی لیے آپ کے ہاں میری قدر کی جاتی ہے نہ وقعت۔ مگر بھلا کیسے کہہ دیتی یہ سب۔
اگر ہمت سے کام لے کر کہہ دیتی تو وہ اسے وہی کمپلیکس کا شکار ہونے کا طعنہ دیتا۔ کبھی کبھی حالات کی ریشہ دوانیاں
انسان کو کس قدر بے بس اور بے دست و پا کر کے رکھ دیتی ہیں کہ اپنے تئیں اگر بہت کچھ ہوتا بھی ہے تو بھی خود اپنی نظروں
میں کچھ نہیں ہوتا۔ جواب دینے کے بجائے وہ آزردہ سی ہو کر اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ بھی سمجھ گیا کہ اس کی کھری
باتوں نے دکھ پہنچایا ہے۔ اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر کے اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔
"دیکھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے گرد چڑھائے ہوئے احساس کمتری کے اس خول سے باہر نکل آئیں جس نے
آپ کی شخصیت پر ایک جمود سا طاری کر دیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ مکس ہوں۔ آزادی سے ہنسیں بولیں۔ دوسروں کی
طرح اپنی مرضی کو مقدم رکھیں۔ تھوڑا سا اس نئی تہذیب میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ میرا مطلب ہے زمانے
کے ساتھ چل کر دکھائیں۔ اور کچھ نہیں تو یہی سمجھ کر کہ آپ میری ملکیت بننے والی ہیں میری امانت ہیں۔"
"نہیں نہیں۔ میں آپ کی امانت نہیں ہوں۔ میں کبھی آپ کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ ایسا ہر خیال آپ اپنے دل
سے نکال دیں۔"
آنکھوں میں ایک دم ہی گرم گرم سا پانی بھر جانے کی وجہ سے اس نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا کہ یوں بھی حالات
کی مجبوریوں کے جس شکنجے میں وہ بری طرح جکڑی ہوئی تھی اس کا بھی اسے پورا پورا احساس تھا۔
"پھر وہی بات۔ آخر ایسا کیا کمپلیکس ہے آپ کو۔ آخر کس وجہ سے آپ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتیں۔ کچھ
مجھے بھی تو پتا چلے۔" وہ اس کی باتوں پر زچ سا ہو کر بولا۔
اچھا موقع مل رہا تھا اسے سب کچھ بتا دینے کا۔ مگر بعض مواقع مصلحتوں کے لبادے میں کچھ اس بری طرح لپٹے ہوئے

ہوتے ہیں کہ انسان انہیں ضائع کرنے پر ہی مجبور ہو جاتا ہے۔ اب بھلا سیر و تفریح کے اس موقع پر۔ ایک ہوا
اس کے سامنے اپنی بائیس تیئیس سالہ زندگی کی پوری کتاب کیسے کھول کر بیٹھتی اور اب نہیں یہ موقع تو وہ بہت پہلے
چکی تھی۔ کیونکہ معاملہ اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اب کچھ کہنا بارود کو شعلہ دکھانے کے مترادف ہی ہو سکتا تھا۔ پھر بھی وہ
"کیونکہ میں اپنے حالات کی وجہ سے سخت مجبوریوں میں گھری ہوئی ہوں۔ اور یہ بات پہلے بھی میں آپ کو کئی بار
آپ خدارا مجھ سے اتنی توقعات وابستہ نہ رکھیں۔"
"اوہو۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ لیکن میں آپ کی اجازت کا پابند نہیں ہوں بلکہ اپنی مرضی کا مالک ہوں
میں نے آپ کی ذات سے کبھی کوئی توقع وابستہ نہیں کی بلکہ میں تو خود آپ کی توقعات پر پورا اُترنے میں کوشاں ہوں
اس کی باتوں پر سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
"لیکن میں نے اپنی کوئی ایک بھی توقع آپ سے کبھی وابستہ نہیں رکھی۔ پھر آپ کے پورا اترنے کا کیا سوال" اور کچھ نہیں
اس طرح وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔
"مگر کیوں۔ کیوں نہیں رکھی؟" وہ جز بز سا ہو کر بولا۔ مگر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ گھبرائے ہوئے انداز
میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔
"اوہ پلیز۔ اب چلیں۔ پہلے ہی ہمیں اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اگر کوئی ہمیں ڈھونڈتا یہاں آ گیا تو بھلا کیا سوچے گا۔ ویسے
ہمارے بارے میں ثمینہ وغیرہ نے بہت غلط امپریشن لیا ہے۔ ہیل اگر تکلیف بھی دے رہی ہے تو کیا میں اچھی طرح چل تو سکتی ہوں
اپنی بات کہتے کہتے وہ آگے بڑھی تو اس نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔
"مائی فٹ۔ اگر کوئی آ بھی گیا تو مجھے کسی کی بھی پروا نہیں۔ یوں بھی اس نئی تہذیب میں ایسی باتوں کی کوئی پروا نہیں
جس کا جو دل چاہے کرے۔ جس کے ساتھ چاہے رہے۔" وہ صاف سمجھ گیا تھا کہ وہ محض اسے ٹالنے کی غرض سے جانا چاہتی
"مگر پھر بھی اسفند۔" اس نے کہنا چاہا۔
"دیکھیں سلوط۔ یہ میرے جذبات اور زندگی دونوں کا ہی سوال ہے اور میں اس معاملے میں انتہائی سنجیدہ ہوں۔ آپ
مجھے صاف صاف بتایئے کہ یہ کوئی کھیل تھا یا آپ کا کوئی فریب۔ جو میں کھلی آنکھوں سے آپ کے ہاتھوں کھا تا رہا ہوں"
وہ سختی سے دانت بھینچ کر ——— بڑی اضطرابی سی کیفیت میں بولا۔ تو اس نے بھی سوچا کہ اب بھی وقت ہے
اور پھر وہ خود ہی بہت جبریہ اس سے پوچھ رہا ہے۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے جھلملاتی آنکھوں سے کچھ دیر اس کی
طرف دیکھتی رہی۔ پھر اشکوں سے بوجھل ہوتی سی آواز میں بولی۔
"ہاں۔ یہ فریب ہی تھا۔ مگر یہ میں نے آپ کو نہیں دیا۔ بلکہ آپ خود ہی کھاتے رہے۔" لیکن اس نے اس کی بات پوری
کب ہونے دی۔ وہ تو غصّے کے مارے اپنے آپے میں ہی نہ رہا۔
"تو تم اب تک مجھے فریب دیتی آئیں۔ مگر جانتی ہو اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ میں تم سے ایسا بدترین سلوک کروں گا
کہ تم کہیں کی بھی نہیں رہو گی۔"
اُف۔ اتنی بات کہتے سے اس کی آنکھوں میں کیسا خون سا اُتر آیا تھا کہ اس کی روح تک لرز کر رہ گئی۔ اس کے جھنجوڑنے پر بھی
بھرے آنکھوں کے کونوں سے آنسو یوں ٹپکے جیسے کسی شاخ کو ہلانے سے پتوں پر جمع شدہ بارش کی بوندیں ایک ساتھ
گرتی ہیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"نہیں نہیں۔ فریب میں نے آپ کو نہیں دیا بلکہ آپ ——— میں۔ خود ہی فریب کھاتی رہی ہوں۔ کیونکہ میں اتنی چھوٹی
ہو کر چاند کی تمنا کر بیٹھی تھی۔ جو کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتی۔"
جی میں تو آیا ساتھ کے ساتھ کہہ دے کہ میں شادی شدہ ہوں اور ایک ظالم اور انتقامانہ ذہنیت رکھنے والے شخص نے
مذہبی اور قانونی طور پر پابندِ سلاسل کر رکھا ہے۔ مگر کیسے کہتی بھلا۔ اس کے خطرناک ارادے اور خوفناک تیور دیکھ کر تو
ہی دم نکلا جا رہا تھا۔
"اوہ ——— لاحول ولا۔ پھر وہی کمپلیکسڈ زدہ باتیں۔ سلی گرل۔ مجھے تمہاری کم مائیگی کا بھی علم ہے اور یہ بھی معلوم
کہ تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی معلوم ہے کہ چچی اور میری بہنیں تمہیں تمہاری حیثیت کی وجہ سے بنند

میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ اپنے معاملات کا خود مختار ہوں۔ تم میری پسند نہیں، محبت ہو اور یہاں کسی
نہیں جو میری مرضی کے خلاف کچھ بول سکے۔"
بڑی ہی قطعیت سے بولا۔ جب کہ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اسفند
ی طرح کھڑے کھڑے ———
اختیارات حاصل ہیں۔ اور اس کی مرضی کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ لیکن وہ اپنی مجبوریوں سے تو اچھی طرح واقف
کاش بھابھی جان یہاں موجود ہوتیں تو یہ بات اتنی آگے نہیں بڑھتی۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہ اپنی بات کے جواب
اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس توقع کے ساتھ کہ اب وہ ہلکی اور بے فکر ہو کر مسکرائے گی۔ یا پھر شرما کر اپنے
ہو جانے کا ثبوت دے گی۔
ہوائیں کہ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو سلوط کو یوں لگا جیسے کوئی آتشیں گرز اس کے میٹھی نیند سوئے ضمیر پر اچانک
وہ جس تیزی سے آپ ہی آپ اس کے نزدیک آئی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے اس سے علیحدہ ہوئی اور
بھاگتی ہوئی جس راہ سے یہاں تک آئی تھی اسی راہ سے واپس پلٹ گئی۔
مگر وہ بھی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہ تھا اور اس کی اس جنونی سی ادا کو اس کی شرم پر محمول کر رہا تھا۔ اس
وہ بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا۔
مگر وہ تھوڑی دور آگے جا کر ہی رُک گئی تھی۔
یا دوسرے معنوں میں رُکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔
کیونکہ سامنے کچھ فاصلے پر زینت اور شعیب منصور مسٹر صمد اور ان کی بیگم سے باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔
اور انہیں دیکھ کر سلوط کی رنگت فق سی ہو گئی تھی حالانکہ ان لوگوں نے اسے بھاگ کر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
مگر چونکہ چند لمحوں بعد ہی اسفند بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آ گیا تھا اس لیے وہ بڑی نروس ہو رہی تھی۔ زینت نے دیکھا کہ سلوط
ایک جگہ تنہا کھڑی ہے اور ان کا لاڈلا سپوت بھاگتا ہوا اس کے قریب رُک گیا ہے تو تجسس کے ساتھ ساتھ شکوک نے بھی
ان کے دل و دماغ پر دھاوا بولا۔ فوراً ہی شعیب منصور کو سنانے کی غرض سے بولیں۔
"ارے یہ سلوط اور بابا یہاں اکیلے کیا کر رہے ہیں۔" کہنے کا انداز ہی معنی خیز تھا۔ شعیب منصور بھی اس اثنا میں دونوں
کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"اب یہ تو ان کے نزدیک ہی جا کر معلوم ہوگا کہ یہ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں۔ لیکن ہے ضرور کوئی غیر معمولی بات۔"
"بھئی باتیں کر رہے ہوں گے بھابی۔ جوان بچے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔"
صمد جلیل جو کچھ زیادہ ہی روشن خیال تھے انہوں نے لاپروائی سے کہا اور زینت چونکتے ہوئے انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔
باتیں کرتے ہوئے یہ سب ان دونوں کے نزدیک آئے تو اسفند آگے بڑھ کر بولا۔
"معاف کیجیے گا آنٹی۔ آپ کے پاس کوئی ایکسٹرا جوتی یا چپل ہو گی۔"
"ایکسٹرا جوتی اور چپل۔ واہ واہ۔ میاں صاحبزادے یہ ایکسٹرا جوتی یا چپل کیا ہوتی ہے۔ کیا اب بٹوے میں کیش اور
سے سامان کے ساتھ ایک ایکسٹرا جوتی بھی رکھنی پڑا کرے گی۔" صمد جلیل قہقہے مار کر ہنستے ہوئے بولے۔ تو ———
شعیب منصور بھی ہنسنے لگے۔ اور مسز صمد بھی مگر زینت چونکہ کچھ الجھ سی گئی تھیں اس لیے خاموش ہی رہیں۔
"لیکن انکل میرے لیے تو پرس میں ضرورت کی اور چیزوں کے ساتھ جوتے کا ایک پیئر رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اب
سلوط کو دیکھ لیں۔ یہ جلدی اور بے خیالی میں پنسل ہیل پہن کر آ گئی تھیں ——— تیز چلنے کی کوشش کی تو پیر مڑنے کی وجہ سے
ان کی رجب سے وہیں بیٹھی رو دیے جا رہی ہیں۔ وہ تو اگر میں یہ دیکھ کر کہ ریوڑ سے بچھڑ گئی ہیں ان کی تلاش میں نہ
"واہ۔ واہ۔ واہ۔ ریوڑ سے بچھڑ کر۔ واہ ڈیئر سنی۔ تم باتیں بھی بہت دلچسپ کرتے ہو۔"
صمد جلیل نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہا۔ زینت نے غور سے سلوط کی شکل دیکھی۔

جو احساسِ گناہ سے اور کچھ اسفند کے ساتھ دیکھ لیے جانے کی وجہ سے اتنی اتری اتری لگ رہی تھی کہ یوں لگ رہا تھا
جیسے وہ سچ مچ روتی رہی ہو۔ تب زینت نے اس کے پاس گھاس پر ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

صمد جلیل نے واقعی غضب کا اہتمام کرایا تھا۔

سنترے کے باغ میں درختوں کے درمیان — ایک کھلے ہوئے وسیع قطعے کے سبزہ زار پر خوشنما اور دیدہ زیب بڑے بڑے قالین بچھوائے تھے جن پر بڑے قرینے سے سبز، سرخ، نیلے اور زرد رنگ کے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ اور اوپر شامیانہ تانا گیا تھا۔ ایک سرے پر شامیانے سے باہر چھوٹی چھوٹی میزوں پر جگ اور گلاس رکھے گئے تھے۔ اور ان میزوں سے ذرا فاصلے پر ایک طرف ٹھنڈے پانی کے دو فلٹر رکھے تھے اور دوسری طرف واش بیسن لگی دو ٹنکیاں — اور وہیں — قالینوں کے آخری سرے پر نیچی چوکیوں کو باہم جوڑ کر دستر خوان بچھوائے گئے تھے جن پر پلیٹیں سجی تھیں اور یہ سب اس قدر خوبصورت اور نفیس سا لگ رہا تھا کہ سلوط تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول کر گنگ سی ان ساری چیزوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

زینت اسے لے کر یہاں تک تو آ گئی تھیں مگر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی تفریح کو خراب نہیں کر سکتی تھیں اور پھر صمد جلیل اپنی بیگم اور اپنے دوست قیصر اور مسز قیصر سمیت ان کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ وہ سلوط کو ایک گاؤ تکیے کے سہارے آرام سے بٹھا کر خود بیٹھی نہیں تھیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے وہیں کھڑے کھڑے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سلوط سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"اچھا اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ کریم تو کسی نہ کسی کام سے اِدھر آئے گا ہی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے منگوا لینا۔"

"لیکن میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ یہ اُٹھ کر تھوڑا چلنے پھرنے کی کوشش کریں۔ پیر کو بلائیں جلائیں۔ ورنہ اگر سوجن بڑھ گئی تو کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہیں گی۔" مسز قیصر نے مشورہ دیا تو صمد جلیل فوراً بولے۔

"ہاں علیٰ ہٰذا القیاس بھابی۔ یوں بھی عموماً موچ پیر کی ہڈی کا جوائنٹ ہل جانے کی وجہ سے آتی ہے۔"

"ہاں، لیکن یہ تنہا کیسے چل پھر سکیں گی۔ جب تک کوئی سہارا دینے والا ان کے پاس نہ ہو یا پھر کم از کم کوئی چھڑی وغیرہ ہی ہو۔" شعیب منصور نے کہا تو زینت جلدی سے بولیں۔

"خیر چھڑی کا دستیاب ہونا کچھ مشکل تو نہیں۔ کریم بار بار اِدھر کے پھیرے لگا ہی رہا ہے یہ اس سے کہہ کر منگوا لیں گی۔ ویسے یہ اُٹھنا چاہیں؟"

"نہیں نہیں۔ میں کوشش تو یہی کروں گی کہ بلا سہارے اُٹھ کر چل سکوں لیکن اگر چھڑی کی ضرورت پڑی تو وہ بھی منگوا لوں گی۔"

سلوط نے گویا شعیب منصور کو اطمینان دلانے کی غرض سے کہا۔ اصل میں تو اسے معلوم تھا کہ یہ سب سیر سپاٹے کے تول رہے ہیں۔ اور یوں بھی اس کی وجہ سے کوئی بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور وہ تو خود بھی شرمندہ سی ہو رہی تھی کہ وہ خود ہی سب کے لیے ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ وہ سب تو پہلے ہی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اس کے اطمینان دلانے پر ایک سمت روانہ ہو گئے۔ اور جب یہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہ پیر میں موچ کہاں آئی تھی۔ وہ تو دونوں کو یکجا دیکھ لیے جانے پر خاص طور پر اس کی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے اسفند نے محض ایک بہانہ گھڑا تھا جسے مصلحتاً اسے بھی نبھانا پڑ رہا تھا۔

اردگرد کے تقریباً سارے ہی پیڑ کچے پکے سنتروں سے لدے ہوئے تھے۔ اسے پیاس بھی لگ رہی تھی مگر ذہن اُلجھا ہوا تھا اور ضمیر پر کچھ اتنا بوجھ آن پڑا تھا کہ اس نے نگاہ اُٹھا کر پھلوں سے لدے درختوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اُلٹی تو وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ سنتروں کے باغ کی تھوڑی سی سیر ہی کر آئے گی۔ لیکن وہی مثل تھی کہ اکیلا نہ ہنستا بھلا نہ روتا بھلا۔ بس قالینوں کے فرش پر ہی ٹہل ٹہل کر ان سارے واقعات پر غور کرتی رہی جو اب تک اسے پیش آتے رہے تھے۔ مگر احساسِ گناہ اس حد تک غالب تھا کہ سوچ کے تانے بانے بار بار ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔

جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی وہ۔

یا خیالات کی کون سی جنگ لڑ رہی تھی وہ کہ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔

جو بڑی سرعت سے گزر گیا تھا۔

دھوپ اس لمحے اپنی تمازت کے ساتھ پوری شدت سے چمک اُٹھی تھی۔

اور سورج نصف النہار کی حد پار کر گیا تھا۔

اور جیسا کہ زینت کا خیال تھا کہ کریم کسی نہ کسی کام سے اس طرف آتا جاتا رہے گا تو وہ اب نکل کے آیا تھا۔ وہ بھی چند دوسرے ملازمین کے ساتھ جو شاید تختوں کے چوکے پر کھانا چننے کی غرض سے آئے تھے۔

اسے وہاں خلافِ توقع اور گمان تنہا بیٹھا دیکھ کر کریم متعجب ہوئے بغیر نہ رہا اور اس کے پاس آ کر ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا بی بی کہ آپ کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ آپ ناحق ہی ان لوگوں کے ساتھ آئیں۔"

اوہ تو گویا ان لوگوں کے رویے نے کریم کو بھی میری اوقات جتا دی ہے اس نے دکھ کے ساتھ دل میں سوچا اور پھر فوراً ہی کریم کے خیال کی تردید کرتی ہوئی بولی۔

"ارے نہیں، یہ بات نہیں کریم۔ اصل میں میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ بھابی جان بے چاری خود ہی سہارا دے کر مجھے یہاں لائی تھیں۔ اب میری وجہ سے بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتی تھیں اس لیے میں نے خود ہی بہت کہہ سن کر انہیں بھیج دیا ہے۔"

مگر اس کی وضاحت پر بھی کریم نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو خیر آپ جو کچھ بھی کہیں مگر میں بھی خوب جانتا ہوں۔

"کیا بجا ہو گا اس وقت کریم؟" اس نے کریم کا دھیان پلٹنے کی غرض سے پوچھا۔

"ایک بجنے والا ہے بی بی اور اِدھر ابھی تک کسی کا پتا ہی نہیں۔ اور اِدھر اس غلام قادر (صمد جلیل کا ملازم) کے بچے نے تو جلدی کر کر کے میرے ہاتھ پیر پھلا دیے یہ کہہ کر کہ اس کے صاحب نے ٹھیک بارہ بجے کھانا لگ جانے کا بولا تھا — لو بھلا — بارہ بجے کھانا لگا دیا جاتا تو اب تک ٹھنڈا ہو کر کسی جوگا ہی نہ رہتا۔"

کریم نے اتنے مختصر سے سوال کا اتنا طویل جواب دیا تھا — اور پھر مڑ کر فوراً ہی اس طرف چلا گیا تھا جہاں دوسرے ملازم کھڑے تھے۔ اور ابھی اس کی دوسرے ملازموں سے کچھ بحث و تکرار ہو ہی رہی تھی کہ مخالف سمت سے گھوڑوں پر سوار ثمینہ، سبینہ، عروج، ارم، ماریہ، طلعت، رفعت، نیلوفر، نیلما اور ثمینہ کے دونوں کزنز کا قافلہ آتا نظر آیا۔

ماریہ، ثمینہ، سبینہ، عروج، ارم، اور ثمینہ کے دونوں کزنز تو علیحدہ علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ایک گھوڑے پر اور نیلوفر نیلما دوسرے گھوڑے پر بیٹھی تھیں۔

شامیانے سے تھوڑی دور ہی رک کر گھوڑوں سے اُتر گئے تھے اور ثمینہ کے دونوں کزنز کو گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ کر ساری لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی شامیانے میں آ گئی تھیں۔

"ارے آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوط؟" سبینہ نے آتے ہی اس سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ وہ تو آپ کے ساتھ ہی گئے تھے۔" سبینہ کے سادگی سے کیے سوال میں بھی سلوط کو ایک معنی خیزی سی محسوس ہوئی۔ اس نے قدرے تیکھے سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں گئے تو ہمارے ساتھ ہی تھے اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مگر وہ ہم سے پہلے ہی چلے آئے تھے۔" نیلوفر چبھتے سے لہجے میں بولی۔

"تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے تو منجھلے آغا اور بھائی جان یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے پیچھے رہ گئی تھی۔ تیز چلنے کی کوشش کی تو پیر مڑ گیا۔ ورنہ ایسا کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا مجھے۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"تو آپ نے بھی بے وقوفی کی حد کر دی۔ بھلا پکنک کے موقع پر پینسل ہیل پہن کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ موچ ہی کیا فریکچر بھی ہو سکتا تھا آپ کے پیر میں۔"

نیلوفر نے جلے کٹے سے انداز میں یہ کہہ کر گویا دوسرے معنوں میں اس کی نااہلی اور جہالت کا پول کھولا۔ مارے شرمندگی کے اس سے کچھ جواب بھی نہ بن سکا۔

"اب چھوڑیں بھی بجو۔ جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا خواہ مخواہ سب کے سامنے انہیں شرمندہ کرنے سے فائدہ۔" نیلما نے جو نیلوفر کے قریب ہی کھڑی تھی آہستہ سے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں شرمندہ کیوں کرنے لگی انہیں۔ شرمندہ تو اصل میں سب کے سامنے انہوں نے ہمیں کیا ہے — پینسل ہیل پہن کر۔" نیلوفر نے بھی آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

"لیکن بھائی جان نے تو یہ بتایا تھا کہ یہ عجلت اور بے دھیانی میں پینسل ہیل پہن کر آ گئی تھیں اور اپنی اس غلطی کا احساس انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ہوا تھا۔" نیلما جو اس معاملے کو دبانا چاہ رہی تھی آہستہ سے بولی۔

"ارے چھوڑو۔ بھائی جان سب کے سامنے کیا یہ کہتے کہ یہ اتنی اَن کلچرڈ اور جاہل ہیں۔ ظاہر ہے انہوں نے اپنی جھینپ مٹانے کو بات بنائی ہو گی۔" نیلوفر جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ سبینہ اس کے عین پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہی ہے۔ وہ فوراً ہی بولی۔

"ہائے نہیں۔ ایسا تو نہ کہیں نیلوفر۔ عجلت اور گھبراہٹ میں تو انسان اس سے بھی کہیں زیادہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ پتا ہے ایک مرتبہ ہمیں انٹرکون ڈنر پر جانا تھا۔ ممی کی عادت ہے بڑی دیر میں تیار ہوتی ہیں۔ اِدھر ڈنر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ ڈیڈی جلدی مچا رہے تھے۔ ممی نشتم پشتم تیار ہو کر ہم سب کے ساتھ انٹرکان پہنچیں تو پیروں پر نظر پڑتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ بڑی جلدی میں وہ باتھ روم سلیپرز پہنے پہنے آ گئی تھیں۔"

"ارے ہاں اس وقت ممی کی شکل دیکھی ہوتی۔ بس رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ میرا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا تھا۔" ثمینہ اس واقعے کو یاد کر کے ہنستی ہوئی بولی۔

"ارے تم سلیپرز کی بات کر رہی ہو میری ممی تو جلدی میں بلاؤز بدلنا بھی بھول گئی تھیں۔ گھر واپس جا کر بدلنے کا بھی وقت نہ رہا تھا۔ سارا وقت اپنی بروکیڈ کی ساڑھی میں لپٹی بیٹھی رہی تھیں۔" طلعت نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں پتا نہیں، یہ خاص طور پر ممی لوگ کی میموریز (یادداشتیں) اتنی کمزور کیوں ہوتی ہیں۔ میری ممی تو ایک ایئر رنگ پہنتی ہیں تو دوسرا پہننا ہی بھول جاتی ہیں — اور شوز کے معاملے میں تو کچھ یوں ہوتا ہے کہ ایک جوتی ایسی ایک جوتی ویسی ماشاء اللہ۔"

عروج نے کہا تو ایک قہقہہ پڑا۔ اور یوں جہاں سلوط کو ان لوگوں کی گفتگو نے مزید شرمندگی سے بچا لیا وہاں بات کا رُخ بھی پلٹ گیا۔ اور باتوں کا رُخ — ہواؤں کے رُخ پر رکھے ہوئے کاغذ کی طرح ہوتا ہے جو ہواؤں کی زد میں آ کر اڑتا ہے تو

کبھی اونچی پرواز لیتا ہے کبھی نیچی۔ اور کبھی رہ جاتا اور پھر پھڑپھڑاتا ہوا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اور جب کئی ...
ہے یا جُھکا تا ہوا نیچے گرجاتا ہے تبھی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اور وہاں ہوا یہ تھا کہ کچھ ہی دیر بعد ایک طرف سے ...
کی پوری ٹیم ڈونگے اور رکابیں اُٹھائے اور دوسری طرف سے اسفند اپنے والدین اور ان کے دوستوں کے قافلے کو ...
آیا تو اِدھر اُدھر کی ہانکتی۔ ساری لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"او ہو تو یہ ڈاکٹر اسفند ان سب لوگوں کو ہنکا لانے کی غرض سے کہیں غائب ہو گئے تھے" تمینا اسفند پر طنز ...
"ہاں سب کو تو ہانک لائے ہیں۔ صرف گھوڑے کی کسر ہی رہ گئی ہے۔"

ارم نے کہا تو سب کو ہنسی آگئی۔ سب آتے ہی بھوک کی شدّت کا گلہ کرنے لگے تھے۔ اس لیے سب نے ...
کیا۔ اس اثنا میں کھانا بھی چوکیوں پر لگایا جا چکا تھا۔ سب ہاتھ منہ دھو کر اطمینان سے چوکیوں کے آگے بیٹھ گئے اور ...
سے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے دوران ہنسی مذاق بھی ہوتا رہا اور چٹکلے بھی چھوڑے جاتے رہے اور ...
ماحول میں کھانا ختم ہوا۔ تو تھوڑی دیر سستانے کے بعد پھر گھومنے پھرنے کا چکّر چلا تو لڑکیاں اس طرف چل دیں جہاں ...
نے ان کے گھوڑوں کو باندھ رکھا تھا۔ اسفند اپنا گھوڑا ریسٹ ہاؤس کے ہاؤس کیپر کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ وہ اِدھر چل دیا ...
بزرگ پارٹی آبشار کی سیر کو۔ اور یوں سلوط پھر تنہا رہ گئی۔

موچ آ جانے کی وجہ سے کسی نے ساتھ چلنے کے لیے اس سے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ عروج نے صرف اتنا کہا تھا کہ ...
اگر وہ چل پھر نہیں سکتی تو اس کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جائے۔ کیونکہ یہ سب برج کی طرف جا رہے تھے جو خاصی دور تھا۔ دل تو ...
کا بھی چاہ رہا تھا نہر پہ بنے خوبصورت پُل کو دیکھنے کو۔ لیکن چونکہ اسفند بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا اور پھر گھوڑے پر عروج کے پیچھے ...
بیٹھنا اسے مناسب نہیں لگا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا تھا اور اب تنہا بیٹھی وہ سوچ رہی تھی کہ تو بھلا آئی کیوں تھی یہاں ...
پکنک منانے کی غرض سے اور اب یہ جھوٹ موٹ کی موچ کا طوطا پالے سب سے الگ تھلگ ٹُٹروں ٹوں یہاں بیٹھی ...
رہی ہوں۔ بھلا کیا فائدہ ہوا میرے یہاں آنے کا۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ بُرے کاموں کے بُرے انجام تو کچھ یہی مثل اس وقت مجھ پر بھی صادق آ رہی ہے۔ کیونکہ غلطی ہی ...
قصور تو سارا میرا ہی ہے کہ میں اپنی حقیقت اچھی طرح جانتی ہوں۔ ورنہ اسفند تو میری ہر بات سے لاعلم ہے اور جو کچھ ...
اپنے دل اور جذبے سے مجبور ہو کر نادانستگی میں ہی کر رہا ہے۔ اور میں ایک طرح واقعی اسے فریب دیتی آ رہی ہوں۔ کاش ...
میں شروع شروع ہی میں اسے سب کچھ بتا دیتی مگر میری بزدلی اور کمزوری ہمیشہ میرے آڑے آئی۔ اور اب میری خاموشی ...
سے بات اتنی آگے نکل گئی ہے کہ اسے کچھ بتانا خود اپنی ذلت اور خواری کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اصل میں شروع ...
شروع میں تو میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ میری خوبصورتی اور عمر کے اس پُربہار دور سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اسے باہر کی ہوا لگی ہوئی ہے اس لیے اپنے جز وقتی جذبوں کو اتنا بے لگام کر دینے کا عادی ہے۔

اور مجھے اس قدر بے وقعت۔ بے بس اور مجبور دیکھ کر وہ اور بھی شیر ہوتا جا رہا ہے۔ جب اس کے خیالات اور ...
کسی دوسری لڑکی کی طرف مبذول ہو جائے گی تو وہ مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا جذبہ صادق ہے
اور وہ اس معاملے میں واقعی بہت سیریس ہے۔

وہ بھی اس قدر کہ اگر میں نے اس پر اپنی حقیقت ظاہر کر دی یا اپنی مجبوریوں سے اسے آگاہ کر دیا تو اگر اس نے مجھے ...
چھوڑ بھی دیا تب بھی وہ مجھے اتنا ذلیل و خوار کرے گا کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔

مگر۔ اس طرح آخر میں کب تک اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہوں گی؟

کب تک اس کی محبت کا دم بھرتی رہوں گی۔؟

اور آخر کہاں تک یہ سلسلہ چل سکے گا۔؟

اس کا ذہن اس گتھی کو سلجھاتے سلجھاتے کچھ زیادہ ہی اُلجھ گیا۔

اور اس اُلجھن میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ کہاں بیٹھی ہے اور وقت تیزی سے اپنے منازل طے کرتا کہاں کا کہاں پہنچ گیا ...
سوچتے سوچتے غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اور ذرا کی ذرا اس کی آنکھ جھپکی تھی کہ مردانہ آوازوں کی بھنبھناہٹ ...

... چونکا دیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو غلام قادر کئی ملازموں کے۔۔ ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔
... ڈھل چکی تھی۔
... لمبے سہ پہر ... مسافت سے تھک ہار ... مشرق کا شہسوار ۔۔۔۔۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔
... بھر کی ... ہو کر کائنات پر سونا ہی سونا بکھیر رہی تھی۔
... خنکی کا پھریرا اُٹھائے اِدھر اُدھر۔ سرسراتی پھر رہی تھیں۔
... جانے کہاں غائب تھا۔ غلام قادر کو ہی بڑھ کر اس سے کہنا پڑا۔
... یہ لوگ شامیانہ اُتارنے اور قالین اُٹھانے آئے ہیں۔ ورنہ شام ہو گئی تو اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آئے گا ۔۔۔
... بی بی یہ ... ریسٹ ہاؤس میں چلی جائیں۔ صاحب لوگ بھی اب سیدھے وہیں جائیں گے۔"
... ایسا کریں کہ ذاکر کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں چلی جائیں۔ صاحب لوگ بھی اب سیدھے وہیں جائیں گے۔ غلام قادر نے ذاکر کو آواز دی
... تو جواب میں یہ بھول کر اس نے موچ کا عذر تراش رکھا ہے وہ چُپ چاپ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غلام قادر نے ذاکر کو آواز دی
... ایک کالا دھیٹر سا لڑکا ۔۔۔۔ دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ تو غلام قادر نے اس سے کہا کہ وہ سلوط کو ریسٹ ہاؤس چھوڑ ...
... وہ ذاکر کے ساتھ ریسٹ ہاؤس آ گئی۔

... اور یوں ... کریم وہاں سے بھی کہیں غائب تھا اور اسے ریسٹ ...
... نئی اور اجنبی جگہ تھی اور خود وہ تنہا۔ اس پر نئی نئی صورتوں کے ملازم ... کریم وہاں سے بھی کہیں غائب تھا اور اسے ریسٹ
... ہاؤس میں تنہا جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی بلو صاحب اپنی فیملی سمیت وہاں موجود نظر آئے تو اس کے دل کو کچھ
... ڈھارس بندھی۔

... بلو صاحب شعیب منصور سے بھی واقف نہیں تھے۔ ان کی بیوی اور دونوں بیٹیاں خاصی ملنسار ثابت ہوئی تھیں۔ وہ سلوط
... اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اور سب تو اس وقت تک واپس لوٹے ہی نہ تھے اس لیے غلام قادر کے پوچھنے پر سلوط نے
... اور بلو صاحب کی فیملی کے لیے وہیں چائے منگوا لی تھی۔

... پھر جب شام گہری ہونے لگی تو وہ سب یکے بعد دیگرے واپس آ گئے۔ بڑے اطمینان سے چائے پی گئی۔ تب کہیں جا کر
... سب واپسی کے لیے اُٹھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ ایک تو سارا دن گھومتے پھرتے سن برنٹ ہو گیا تھا اور
... سب کے چہرے ہاتھ اور گردنیں تک سیاہی مائل سُرخ ہو کر رہ گئی تھیں۔ دوسرے تھک کر اتنے چور ہو گئے تھے۔ نشتم پشتم نہا دھو کر اور
... تھوڑا سا کھانا کھا کر فوراً ہی پڑ کر سو گئے تھے۔ ماسوا سلوط کے جو گھومی پھری تھی نہ کوئی تفریح ہی کر سکی تھی۔ پھر بھی تھکن سے اس کا بدن
... ٹوٹ سا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

... وہاں فارم پر تنہائی میسر آنے کے باوجود اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اور خلش میں مبتلا رہی تھی۔
... جس کی وجہ سے خیالات بھی ایک مرکز پر جم نہیں سکے تھے۔
... مگر یہاں اپنے بستر پر بیٹھنے کے بعد گو خلش اور بے چینی میں کمی نہیں آئی تھی مگر تھوڑا سکون تو میسر آیا تھا۔
... اور وہ احساس گناہ اور لذّتِ گناہ کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی تھی۔ خیالات بھی ایک ایسے مرکز پر جمے تھے جو
... ... گھیر میں چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔
... یعنی عہدِ رفتہ کی طرف لوٹ جانے پر۔
... اس ... وہ اپنے ماضی میں پہنچی ہوئی تھی۔
... اس ماضی میں نہیں جس کے ظالم پنجے نے اس کی ساری اُمنگیں، سارے ارمان چھین لیے تھے اور اس کے دریدہ دامن
... دُکھوں اور محرومیوں کے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔
... بلکہ وہ تو اس سے کہیں پیچھے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔
... کچھ ماضی بعید سے بھی کہیں پیچھے کا زمانہ لگ رہا تھا اسے۔
... زمانے میں جب اس نے ہوش سنبھالا تھا۔
... اور اس کے اندر بہت سی باتوں کو سمجھنے کا احساس جاگا تھا۔
... اپنے بچپن۔ اس کے بعد لڑکپن اور عہدِ طفولیت ۔۔۔ میں خود پر گزری ہوئی باتوں کو محسوس کرنے کا شعور پیدا ہوا تھا

تب بھی اس نے خود کو محرومیوں کے خول میں ہی لپٹا پایا تھا۔
اور اب بھی ـــــ بھابی کا معاندانہ سا سلوک ـ
بھابی کا مغایرانہ اور بیگانہ سا رویّہ ـ
بات بات میں روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ ـ
بچپن میں بھائی اگر اس سے کبھی یگانگت بھی برتتے تو بھابی اپنے ناروا سلوک سے اس معصوم سی خوشی کو غارت ... دیتیں جو بھائی کے یگانگت برتنے پر اسے حاصل ہوتی تھی۔
یادداشت پر پورا زور ڈالنے کے باوجود اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ چھٹپن میں بھی کبھی اسے اس پیار و اخلاص ... اہمیت سے نوازا گیا ہو جو بھائی کی اکلوتی بہن اور گھر کی واحد بچی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونا چاہیے تھی۔ یوں ... جیسے کوئی لاوارث بچی ہو۔
جس کی بے بسی پر ترس کھا کر اسے اس گھر میں لا کر ڈال دیا گیا ہو۔
اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب تک امجدی بوا اس گھر میں موجود رہیں وہی اس کی کنگھی چوٹی، نہلانے دھلانے اور ... بدلوانے کی ذمے داری نبھاتی رہی تھیں۔ مگر جب وہ آٹھ سال کی ہو گئی تو بھابی نے سب کچھ اس کی ننھی سی جان پر ڈال دیا ...
بھابی کا عجیب و غریب رویّہ آج بھی اس کی سمجھ سے باہر ہی تھا۔
کہ وہ اگر نفرت نہیں کرتی تھیں تو محبت بھی نہیں کرتی تھیں۔
ہمدرد اور خیر خواہ نہیں تھیں تو بدخواہ بھی نہیں تھیں۔
جانے کیا تھیں اس کی بھابی اس کے لیے۔
اب رہ گئے بھائی ـــ تو خواہ وہ کتنے ہی غافل اور بیگانہ کیوں نہ تھے۔
لیکن اس کی بہت سی ضرورتوں کا خیال ضرور رکھ لیا کرتے تھے۔
اور اگر سچ پوچھا جائے تو بھابی کی اتنی بے التفاتی اور بے اعتنائی کے باوجود اسے ان سے دلی اُنسیت تھی۔
اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ چار پانچ سال کی تھی۔
اور اتنی بے پروائی کے باوجود بڑی گول مٹول اور پیاری پیاری سی تھی تو اس کے بھائی بھابی سے چھپ کر اسے گود میں بھی اُٹھاتے تھے۔ پیار بھی کرتے تھے اور باہر لے جا کر کھلاتے پلاتے بھی تھے۔
مگر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی ان کا رویّہ بدلتا گیا۔
اور ہوتے ہوتے کچھ اس قدر بدلا کہ انہوں نے اس کی نجی زندگی کے اور سب سے اہم معاملے میں بھی بہت غیر منصفانہ اور جابرانہ فیصلہ کر کے نہ صرف اس پر ستم ڈھایا بلکہ اس کی قسمت پر ہمیشہ کے لیے چاک پھیر دیا۔
آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟
صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مجھے درّانی کے انتقام کی بھینٹ کیوں چڑھایا۔
تھوڑی دیر کو اگر یہ بھی فرض کر لوں کہ وہ درّانی کے منتقمانہ ارادوں سے آگاہ نہ تھے تب بھی کیا انہوں نے ... اور درّانی کے درمیان حائل دُگنے تگنے فرق پر بھی غور نہیں کیا تھا ـ؟
صاف ظاہر ہے انہوں نے پیسے کے لالچ میں اندھے ہو کر میری جوانی اور میری جوان اُمنگوں اور آرزوؤں کو ... سن رسیدہ انسان کی بھینٹ چڑھایا تھا مگر نتیجے میں خود ہی تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔
کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جو انسان دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے پہلے خود اس میں گرتا ہے۔
مگر میرے بھائی جان نے جو گڑھا کھودا تھا اس میں پہلے مجھے اتنی گہرائی میں گرایا تھا کہ آج تک اُبھر کر اوپر نہیں آ سکی ...
آخر میں کون ہوں؟
کیا ہوں؟ میں تو خود اپنی شناخت ہی بھول گئی ہوں۔
درّانی سے میرا دور کا کوئی واسطہ رہا نہ بھائی جان سے۔
اور بھائی تو یوں بھی شادی کے بعد بیگانے ہو جاتے ہیں۔

... گر یہ درّانی۔
... میں کس دل سے اور کیونکر اپنا شوہر تسلیم کر سکتی ہوں۔
... کہ اس کے ساتھ میری شادی محض جبر اور زبردستی کا سودا تھا۔
... میں میری مرضی کو تو دور تک دخل نہ تھا۔
... شرعاً بھی ایسی شادیاں ناجائز قرار دی جاتی ہیں۔
... پھر درّانی نے تو مجھے اتنی بے دردی سے حالات کے بھنور میں ڈبکیاں کھانے کو چھوڑ دیا ہے۔
اس ڈھائی تین سال کے عرصے میں کبھی پلٹ کر بھی میری خبر نہ لی نہ نان نفقہ ہی بھیجا۔ بلکہ اُلٹا اسے اور اس کے بھائی کو ... لوٹ کر کہیں روپوش ہوا بیٹھا ہے۔ بھلا ایسا جعل ساز، دھوکے باز اور ظالم شخص بھی کہیں شوہر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس نے نہ صرف مجھے نکاح کے بندھن میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے پابندِ سلاسل کر کے رکھ دیا بلکہ میری پوری جوانی برباد کر کے رکھ دی۔ میری تمام خواہشیں، ارمان، اُمنگیں حتیٰ کہ جینے کی لگن تک اس نے مجھ سے چھین لی ہے۔ اب اگر میرے دل نے اسفند کو چاہا ہے تو اس میں بھلا کون سا گناہ ہو گیا۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس ظالم و جابر شخص سے ایسا انتقام لوں کہ اسے قبر میں اتر کر بھی چین نہ آئے۔ لیکن میرا مذہب ـ میرا ضمیر ـ بلکہ سب سے بڑھ کر خوفِ خدا مجھے کوئی غلط روش اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔
تو پھر میں کیا کروں ـ کیا کروں؟
کیونکر اس جعلساز کی ڈالی ہوئی بیڑیوں کو پیروں سے اُتاروں؟
کیونکر اس کی قید سے رہائی حاصل کروں۔
وہ آدھی رات تک کروٹیں بدل بدل کر یہی سب سوچتی رہی۔
ماسوا اسفند کے اس کا اعتماد ہر شخص پر سے اُٹھ گیا تھا۔
اسفند اس کے لیے جاگتی آنکھوں سے دیکھا جانے والا سنہرا خواب ثابت ہوا تھا۔
اور اسفند سے محبت کرنا اس کے نزدیک کوئی گناہ نہیں تھا۔
البتہ اس سے جو بے ساختگی میں ایک غلط حرکت سرزد ہو گئی تھی اس پر وہ سخت متاسف اور پشیمان تھی۔
یوں بھی کافی عرصے سے وہ اخبارات اور رسائل میں وہ کالمز تلاش کر کے جن میں لوگوں کے شرعی مسائل اور ان کے جوابات درج ہوتے تھے بڑے غور اور توجہ سے پڑھتی آ رہی تھی۔ لیکن لاکھ ڈھونڈنے کے باوجود اسے اپنے مطلب کا حل کہیں نظر ہی نہیں آیا تھا۔
بہرحال اتنا کچھ سوچنے اور اتنے باغیانہ ارادے رکھنے کے باوجود وہ احساسِ گناہ سے خود کو نجات نہیں دلا سکی تھی کیونکہ ایسی بچہ تو نہ تھی جو جائز اور ناجائز کے فرق کو نہ جان سکتی۔ اور ادھر بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اسفند کو اپنی حقیقت سے آگاہ کرنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ کیونکہ آگاہ کرنے کی کوشش میں ہی اس کے خطرناک ارادے اور تیور بھانپ کر ہی تو محض اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس کے ہاتھوں ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھی تھی۔ مگر اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس معاملے میں اسفند کو مزید آگے بڑھنے دے گی نہ خود ہی آگے بڑھے گی اور پہلو تہی اور روگردانی سے کام لے کر اسفند کو دور ہٹنے پر مجبور کر دے گی۔
... یوں بھی اسے شعیب منصور کے ہاں رہتے سال بھر کا عرصہ ہو گیا تھا اور بھائی اور بھاوج کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی کیونکہ بھائی نے اسے یہاں بھیجتے وقت ہی کہا تھا کہ چار پانچ ماہ کی تو بات ہی ہے تم کسی طرح یہ عرصہ وہاں گزار لینا۔ پھر یا تو ہم خود ہی ... لینے آ جائیں گے یا کسی کو بھیج کر بلوا لیں گے ـ تو بھائی کے بتائے عرصے سے سات آٹھ ماہ اوپر ہی ہو گئے تھے اور بھائی ... بات پر وہ اس لیے ایمان لے آئی تھی کہ بھائی بہت صاف اور راست گو تھے۔ اگر وہ اسے پاس بلانے کا ارادہ نہ رکھتے ... سے صاف صاف کہہ دیتے کہ اب ہم نے تمہاری سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ یا اب ہم تمہاری ذمے داری قبول کرنے کے قابل نہیں رہے۔ لہٰذا اب تم اپنی مرضی اور خوشی سے جیسی چاہو زندگی بسر کرو۔

اور جہاں چاہو قیام کرو۔

مگر اسے رخصت کرتے وقت ان کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

اور آنکھوں کے گوشے بھیگ سے رہے تھے۔

اور بس ایک یہی بات تو تھی جو اس کے اور ان کے درمیان ارتباط کا ذریعہ بنی تھی۔

یہی ایک لہجہ تو تھا جس نے اسے ان سے بدظن ہونے سے روک دیا تھا اور آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشوں نے اسے یہ یقین دلایا تھا کہ بھائی ایک نہ ایک دن اسے لینے ضرور آئیں گے۔

اور اس دن کی آمد اب جلد ہی متوقع تھی۔

اور بھائی کے آنے کے بعد وہ اگر اسفند سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی تو کہلوا ضرور سکتی تھی۔ لہٰذا جب تک کے لیے وہ اسفند سے دور دور ہی رہنا چاہ رہی تھی۔

یوں بھی اسفند کا سامنا کرنے کے تصور سے ہی اسے وحشت سی ہونے لگی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ پیر کی موچ کا بہانہ کر کے دو تین روز تو اپنے کمرے میں بستر پر پڑے پڑے گزار دے گی اور اس کے بعد تین چار روز کے لیے سہیل منصور کے یہاں چلی جائے گی کہ نازش اور کوثر نے اسے بڑے اصرار سے بلایا تھا مگر وہ عید کی گہما گہمی میں اب تک ان کے ہاں نہیں جا سکی تھی۔ اگر اسفند اس سے ملنے وہاں بھی پہنچ گیا تو وہ اسے تنہائی میں ملنے کا موقع ہی نہیں دے گی اور اس کے بعد اسفند سے دور رہنے کا کونسا طریقہ اختیار کرے گی۔ اس پر فی الوقت اس نے غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر حالات موافقت میں ہوتے ہیں تو خود ہی کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس نے سوچا تو یہی تھا کہ اگلے روز موچ کا عذر کر کے کمرے ہی میں پڑی رہے گی۔ اور اگر کریم اسے ناشتے پر بلانے آیا تو وہ اس سے کہہ کر اپنا ناشتا بلکہ دونوں وقت کا کھانا بھی کمرے میں منگوانے گی اور اگلی صبح دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھ بھی دیر سے ہی کھلی تھی۔ اس لمحے صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

کمرہ تو اندر سے بند ہی کر رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور بالوں پر کنگھا پھیر کر دروازے کا کھٹکا کھول دیا اور بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

گھڑی پر نظر پڑی تو اتنا وقت گزر جانے پر وہ سوچنے لگی کہ اور سب تو کب کا ناشتا کر چکے ہوں گے کہ آج چھٹی کا دن بھی نہیں ہے۔ دونوں لڑکیاں کالج چلی گئی ہوں گی اور اسفند ڈیوٹی پر اگر نہیں گئے ہوں گے تو اب جانے ہی والے ہوں گے۔ پھر ایسی کیا غیر معمولی بات ہو گئی کہ کریم ناشتے پر مجھے بلانے ہی نہیں آیا۔ یا ہو سکتا ہے کہ میری تکلیف کے خیال سے بھائی جان نے اسے یہاں آنے کی ممانعت کر دی ہو —— کہ تبھی دروازے کو دھڑ سے کھول کر کریم بولایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور آتے ہی بڑے پریشان کن لہجے میں بولا۔

"بی بی وہ بڑی بٹیا کی حالت بڑی خراب ہے۔ صاحب اور بیگم صاحب صبح چار بجے سے ان کے پاس ہسپتال گئے ہوئے ہیں۔"

"ہائیں خدا خیر کرے۔" وہ پریشان سی ہو کر اٹھتی ہوئی بولی۔

"ہاں جی۔ بس خیر ہی ہو۔ دونوں لے بی لوگ بھی —— بلا ناشتا کیے ابھی ابھی ہسپتال گئی ہیں۔ بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بولا ہے کہ آپ بابا صاحب کو ناشتا دے کر دوپہر کا کھانا بھی تیار کرا دیں۔"

اُف وہ نازو کی ساری پریشانی بھول کر کریم کا منہ تکتی رہ گئی۔

کیا قدرت واقعی اس کا امتحان لے رہی تھی۔ جب کہ وہ تو اسفند سے دور رہنے کا تہیہ کر چکی تھی اور اس کے تصور سے بھی بیزار اور خوفزدہ سی ہو رہی تھی۔ اور سوچا تو یہی تھا کہ موچ کی تکلیف کا عذر کر کے کمرے سے نکلے گی ہی نہیں مگر سارا معاملہ ہی اُلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

"بی بی جلدی کریں ورنہ بابا صاحب نہار منہ ہی ڈیوٹی پر چلے جائیں گے —— صبح تڑکے سے وہ بھی ہسپتال میں تھے۔ انہوں نے تو بیڈ ٹی بھی نہیں لی آج۔" کریم اپنی بات کے جواب میں اسے اپنی شکل تکتا دیکھ کر بولا۔

"اوہو بھئی، اگر ایسی ہی جلدی تھی تو تم نے خود ہی ناشتا کرا دیا ہوتا اپنے بابا صاحب کو۔ کھانا تو میں پکوا ہی دوں گی۔" وہ اسفند سے نہ ملنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہوئی بولی۔

"جی —— ساری مشکل تو وہ پورچ ایگ بنانے ——"

"پورچڈ ایگ۔" سلوط نے لفظ کی تصحیح کی۔

"جی نہیں پورچڈ ایگ مجھے بنانے ہی نہیں آتے۔" کریم نے کہا۔

"اب جی رہی پورچڈ ایگ بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ بس ایک پیالی پانی کو فرائی پین میں ڈال کر اتنا کھولاؤ کہ وہ جوش کھانے لگے تو پورچڈ ایگ... پھر انڈا توڑ کر اس پانی میں ڈال دو۔ چمچے سے کھولتا ہوا پانی جلد جلد انڈے پر ڈال دو اور بس پورچڈ ایگ تیار۔" وہ اسفند کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے اس خیال سے کریم کو پورچڈ ایگ بنانے کی ترکیب بتائی تاکہ وہ خود ہی جا کر پورچڈ ایگ بنا لے گا۔

"بی بی جی پہلے بھی کئی مرتبہ ٹریائی (ٹرائی) کر چکا ہوں۔ پر میرے ہاتھ سے تو پورچ نہیں دلیہ بن جاتا ہے انڈے کا۔ اور وہ جینک کی اولاد تو سودا سلف لیتا ہوا نو بجے نکل کر آتا ہے۔ دُگنے تگنے دام وصول کرتا ہے ہر چیز کے۔ بیگم صاحب سے کتنا کہا ہے کہ اس چونٹے سے سودا سلف نہ منگوایا کریں۔ پر وہ دھیان ہی کب دیتی ہیں۔" کریم نے کہا۔

"اچھا بھئی چلو۔ پھر میں ہی بنائے دیتی ہوں۔ مگر یہ خانساماں شکل سے تو ایسا نہیں لگتا۔" وہ اٹھ کر باہر کا رُخ کرتی ہوئی بولی۔

"ابی شکل سے تو وہ کا شین بھی نہیں لگتا تھا۔ پر بیگم صاحب نے خود اس کی چوری پکڑی تھی۔ جب میں کہتا تھا تو بیگم صاحب مانتی ہی نہیں تھیں۔ آخر اسے نکال ہی دیا نا۔ اصل میں ان کھانساموں کی ساری قوم ہی بے ایمان ہوتی ہے۔ پر آپ کے پیر میں تو موچ آ گئی تھی نا؟"

خانساماؤں کی قوم کو بُرا بھلا کہتے کریم کی نظر اس کے پیروں پر پڑی تو اسے ایک دم ہی اس کی موچ کا خیال آ گیا اور وہ جو بے دھیانی اور پریشانی میں یہ بھول گئی تھی کہ اس نے گزشتہ روز سے موچ کا عذر تراش رکھا ہے اور اس وقت بالکل ٹھیک ٹھاک اور معمول کے مطابق سیدھی سیدھی چل رہی تھی کریم کے ٹوکنے پر ذرا سا لنگڑا کر بولی۔

"ہاں موچ بھی آ گئی تھی اور تکلیف بھی بہت ہے لیکن نازو کی پریشانی نے سب کچھ بھلوا دیا ہے۔"

"ہاں بی بی۔ اللہ پاک بڑی بٹیا کو خیریت سے رکھے اور کوئی بڑی خبر سنائے میرا مطلب ہے چاند سا بیٹا دے۔" کریم اپنی بات کہہ کر ہنسا اور مارے کوفت کے سلوط کا بُرا حال ہو گیا۔ اب کریم کو کیا معلوم تھا کہ چاند سا بیٹا دے کہہ کر اس نے سلوط کو نہ معلوم کیا کیا یاد دلا دیا ہے۔ وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"ہاں۔ خدا بیٹا دے یا بیٹی۔ مگر نازو کو زندہ سلامت ہی رکھے۔"

کریم سے باتیں کرتی ہوئی وہ کچن میں آ گئی تھی اور کچن میں آتے ہی دل پر ایک بوجھ سا آن پڑا تھا۔ اس نے چولھے پر فرائی پین رکھ کر جلد جلد دو انڈے پورچ کیے اور انہیں پلیٹ میں ڈال کر کریم سے پوچھا۔

"کیا یہ ناشتا تم اسفند صاحب کے کمرے میں لے جاؤ گے؟"

"نہیں جی۔ ناشتا تو میں نے کب کا کھانے کی میز پر لگا دیا ہے۔ توس بھی آپ کے اور بابا صاحب کے لیے ٹوسٹر میں سینک کر رکھ دیے ہیں۔ بس یہ انڈے ہی رکھنے رہ گئے تھے۔" کریم نے بتایا۔

"توس تو بالکل ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے۔ پہلے سے سینک کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" سلوط بولی۔

"وہ جی بیگم صاحب ٹھنڈے توس ہی استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ گرم توسوں پر مکھن پگھل جاتا ہے۔" کریم نے کہا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے تو تم یہ انڈے کھانے کی میز پر رکھ کر اسفند صاحب کو ناشتا لگ جانے کی اطلاع دے دو۔" وہ انڈوں کی پلیٹ کریم کو تھماتی ہوئی بولی۔

"جی اچھا۔ مگر کیا آپ ناشتا نہیں کریں گی۔ میں نے تو آپ کا ناشتا بھی میز پر لگا دیا ہے؟" کریم نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ہاں —— اچھا ٹھیک ہے کر لوں گی میں بھی ناشتا مگر تم جا کر کسی طرح انہیں اطلاع تو دے دو ورنہ کہیں وہ ناشتا کیے بغیر ہی ڈیوٹی پر نہ چلے جائیں۔"

اس نے یہ کہہ کر گویا کریم کو کسی طرح ٹالا۔ اور جب کریم چلا گیا تو —— وہ کچن سے نکل کر پینٹری عبور کرتی لاؤنج میں آ گئی۔

گھر پر ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی اور سناٹا یوں بول رہا تھا جیسے کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہوئی تھی تو پریشانی کی بات ہی۔ کہ نازپرور کے ہاں پہلی زچگی ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ موٹی بھی بہت ہو گئی تھی۔ دوسرے اس کا بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) بھی ہائی ہو گیا تھا

سلوط بھی اسی گھر میں رہتی تھی۔ ہزار وہ لوگ اس کے لیے بیگانے سہی مگر یہ وقت تو تقریباً ہر عورت پر نازو کا کیس تو کچھ پیچیدگی اختیار کر گیا تھا اس لیے بھی اس کی طرف سے بڑی فکرمند اور پریشان ہو رہی تھی۔ دل ہی سر اٹھا رہے تھے اور ہونٹوں سے نازو کے خیر و سلامتی کے ساتھ فارغ ہو جانے کی دعائیں جاری تھیں۔

کریم کی زبانی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اسفند میٹرنٹی ہوم سے ہو کر آیا ہے اور بہن کی طرف سے چونکہ سخت پریشان اسے ڈیوٹی پر پہنچنے کی بھی جلدی ہے اس لیے وہ ناشتا نہیں کرے گا۔ سلوط کا خالی پیٹ گڑ گڑ کر رہا تھا۔ ڈھنگ سے کھایا پیا بھی نہ تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ ناشتے کو مزید ٹھنڈا کر لے سے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اسے یہی سوچ کر وہ کھانے کے کمرے میں چلی آئی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کریم واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کا انتظار سمجھا۔ اور اپنے آگے رکھی کو اڑ۔ پلیٹ سے توس اٹھا کر اس پر مکھن لگانا ہی چاہ رہی تھی کہ تبھی اسفند کریم کے ساتھ لسے توس پر مکھن لگاتا دیکھ کر وہ میز کے آگے رک کر بولا۔

"اوہو یہاں اتنی عیاشی کہ ٹھاٹ سے ناشتا اڑایا جا رہا ہے اور وہاں پریشانی کے مارے ہم سب کی جانوں

اس نے کریم کے سامنے اتنا گہرا طنز کیا تھا۔ شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ مارے غصے کے وہ کانپ کر رہ گئی۔ چھری سمیت توس پلیٹ میں پھینک کر اٹھتی ہوئی بولی۔

"جی نہیں۔ اس توس پر مکھن میں آپ کے لیے لگا رہی تھی ورنہ میں ایسی فاقے زدہ اور کم ظرف نہیں ہوں کہ اس کے باوجود ناشتا اڑانے بیٹھ جاؤں!" وہ کہنا تو بہت سخت سست چاہ رہی تھی لیکن بدگوئی اور بدزبانی چونکہ اس کی سرشت شامل نہیں تھی اس لیے یہی کہہ سکی۔

"جی ہاں سرکار بی بی تو آج اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلی تھیں۔ پر وہ بیگم صاحب نے فون پر حکم دیا تھا کہ یہ آپ کو ناشتا کے بعد کھانا بھی تیار کرا دیں۔ اس لیے یہ دکھتے ہوئے پیر!" کریم بھی اس کی اہانت برداشت نہ کر سکا تو فوراً ہی اس کی حمایت میں بولا۔

"تم سے کس نے کہا ہے بکواس کرنے کو۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔"

اسفند اس کی بات کاٹ کر گرجا — تو وہ سر جھکا کر چپ چاپ کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔ سلوط نے بھی جانے کو کرسی پیچھے کھسکائی تو اسفند میز پر رکھے ہوئے برتنوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں اس وقت کچھ بھی کھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ صرف چائے پیوں گا۔ وہ بھی بغیر دودھ کی۔"

تو اس کا دل تو چاہا کہے کہ چائے ہی پینا چاہتے ہو تو خود ہی بنا لو۔ لیکن کچھ تو اس کے یہاں رہ پڑنے کا خیال۔ کچھ پریشانی اور اتری اتری صورت کا احساس اور سب سے بڑھ کر مروت اور لحاظ۔ ان ساری باتوں نے اسے چپ چاپ چائے بنا کر دے دینے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ بیٹھی نہیں تھی۔ بس کھڑے کھڑے ہی کیتلی سے پیالی میں چائے انڈیل دی تھی اور شکر دان بھی اس کی طرف کھسکا دیا تھا۔

"کیوں۔ آپ نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی؟" اس نے شکر دان سے چمچے میں شکر بھرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!"

"کیوں؟"

"بس میرا موڈ نہیں ہو رہا!" وہ بہت رکھائی سے بولی۔

"اچھا موڈ نہیں ہو رہا تو خیر۔ مگر بیٹھ تو جائیے!" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

اور وہ جواب میں انکار ہی کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ ملتجی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پلیز!"

تب اسے بیٹھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

"ناراض ہو گئی ہیں نا مجھ سے؟" وہ چائے کا ایک سپ لینے کے بعد پیالی پر جھکا جھکا بولا۔

"نہیں تو۔" نہیں تو کہنے کے باوجود ناراضگی اس کے لہجے سے صاف عیاں تھی۔ جواب میں وہ کچھ دیر تک بالکل خاموش سلوط کو گھورتا رہا پھر ایک گہرا سانس لینے کے بعد بولا۔

"میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوں سلوط کیونکہ میری اتنی پیاری سی بہن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نہ جانے آپ کو یہاں دیکھ کر کیا بک گیا۔ مگر اپنی پریشانی یا غصے کو اپنوں پر اتارا جاتا ہے نا۔ آئی ایم ٹیریبلی سوری جان!"

واہ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ یہ اسفند بھی جانے کس مزاج اور قماش کا انسان ہے۔ کہ برا بھلا بھی کہتا ہے تو اس پر ہونے کا مرہم رکھ کر اپنے مخاطب کو اپنی زبان سے کیے واروں پر احتجاج کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ سلوط کو اس کا سوری بالکل نہیں بھایا تھا۔ اس لیے وہ بدستور منہ پھلائے اور بگڑے بگڑے تیور لیے بیٹھی رہی۔

"آپ ہی سوچیں۔ نازو کو کل صبح سے تکلیف تھی۔ کئی بار ادھر سے فون کرایا گیا مگر ہم گھر میں موجود ہوتے تو ملتے بھی۔ ہم تو اکل احمد کے فارم پر موج اڑا رہے تھے اور ہماری بہن یہاں تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔ احمد کو آخر خود ہی اسے ہاسپٹل لے جانا پڑا اور کل دوپہر سے اب تک وہ لیبر روم میں ہے اور دردِ زہ میں تڑپ رہی ہے!"

اس نے نازو کی تکلیف کو کچھ اس انداز میں بیان کیا جیسے خود بھی اس تکلیف سے گزر رہا ہو۔ اس کا دل چاہا کہے کہ تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تکلیف تو کسی کو زیادہ اور کسی کو کم تقریباً ساری ہی شادی شدہ عورتوں کو ہوتی ہے۔ مگر اس کے برا مان جانے کے خیال سے یہ بات دبا کر اس نے آہستہ سے کہا

"اوہ یہ تو واقعی بڑی پریشانی کی بات ہے۔ خدا جلد سے جلد نازو کو ساتھ خیر و سلامتی کے فارغ کرے!"

"آمین!" وہ بھی آہستہ سے بولا۔ اور پھر آدھی پیالی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بہن کی سلامتی کی دعا کرتی رہیں۔ اس کی حالت کافی سیریس ہے۔ ایک تو دس مہینے گزر چکے ہیں دوسرے بچہ بہت تندرست ہو گیا ہے اور — ڈرپ بھی چڑھائی جا رہی ہے۔ آکسیجن بھی لگی ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز آپریشن کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا ہے۔ آپ واقعی دل سے اس کے لیے دعا کریں اور آپ کے ساتھ اس نے کوئی زیادتی کی ہو تو اسے میری وجہ سے معاف کر دیں!"

وہ دھواں دھواں سے چہرے کے ساتھ بہن کی ساری کیفیت بتاتا رہا۔ اور اس بتانے کے درمیان چونکہ ڈاکٹر تھا اس لیے اس نے بلاجھجک کچھ ایسی بھی باتیں بتا دیں جو کم از کم اسے نہیں بتانی چاہیے تھیں۔ مگر اس کے آخری فقرے پر وہ تلملا ہی اٹھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ بھلا نازو میرے ساتھ کیوں زیادتی کرنے لگیں — کمال ہے آپ اپنی بات کہنے میں دوسروں کے جذبات کا بالکل خیال نہیں رکھتے!" وہ بگڑے بگڑے تیور سے بولی۔

"لیکن میں نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کہی۔ یہاں اس گھر میں نازو کا ایٹی ٹیوڈ آپ کے ساتھ کچھ اچھا تو نہیں رہا ہے۔ اور چونکہ میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو جس پر زیادتی کی گئی ہوتی ہے جب تک وہ زیادتی کرنے والے کو معاف نہیں کر دیتا اسے معافی نہیں ملتی!" اس نے گویا اپنی بات کی وضاحت پیش کی۔

"معاف کیجیے۔ نہ معلوم کس امپریشن میں بات کر رہے ہیں آپ۔ ورنہ تو میرے تو سان و گمان میں بھی ایسا کوئی خیال نہیں۔ بلکہ جب سے سنا ہے کہ نازو کی طبیعت خراب ہے میں ان کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ حتیٰ کہ نفل تک مانگ لیے ہیں!" وہ تلخ و ترش سے انداز میں بولی۔

"اچھا تو پھر خدا کرے آپ کی دعائیں ہی مستجاب ہو جائیں!"

اس نے باہر جانے کی غرض سے مڑتے ہوئے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ یوں ہی بیٹھی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی بہن کی پریشانی میں پاگل سا ہو رہا ہے۔ اور نازو جس نازک صورتِ حال سے گزر رہی تھی اس کا بھی اسے پورا پورا احساس تھا۔ اس کے باوجود بھی۔ اسفند کا اکھڑا اکھڑا اور بیگانہ سا رویہ اسے دلگرفتہ کر گیا۔ یوں بھی اس نے کئی بار نوٹ کیا تھا کہ کبھی کبھی وہ بالکل ہی بیگانہ اور اجنبی سا ہو جاتا ہے اور طنز اور نکتہ چینی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

اور اگر مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو اپنے آپے میں نہیں رہتا۔
اصل میں تو اب تک وہ اسے سمجھ ہی نہ سکی تھی۔
نہ اس کی عادات و مزاج کے بارے میں ہی کچھ جان سکی تھی۔
ماسوا اس کے کہ وہ بہت صاف گو۔
تند مزاج اور اپنی بات منوانے کا عادی ہے اور سلوط تو سلوط خود اسفند کی ماں بھی اس کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات رکھتی تھیں۔ سب سے بڑی بات جو اسے بُری لگی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنی پریشانی میں اسے شریک نہیں کیا تھا۔
ورنہ جب دل ایک ہوں اور جذبے اتنے ہم آہنگ۔
تو خوشی، غمی اور پریشانی بھی مشترک ہونی چاہیے۔
صاف ظاہر تھا وہ سلوط کو اب تک کوئی حیثیت، کوئی مقام نہیں دے سکا تھا اور بہن کی فکر اور پریشانی کو تنہا ہی جھیل رہا تھا۔ اور یہ بات سلوط کو ـــــ سخت گراں گزری تھی۔
آخر یہ کیا جذبہ ہے۔
کیسی محبت ہے۔
کیا اسفند صرف اپنے موڈ سے ہی ہر بات کرنے کے عادی ہیں۔
کیونکہ اس وقت اگر موڈ میں ہوتے تو ہزار گریز و احتراز سے کام لیتی وہ اپنی بے ساختگی کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ کر کے ہی رہتے اور اس وقت ان کا موڈ بدلا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے گردانا تک نہیں۔
ایسے دل گرفتہ سے خیالات میں گھری وہ اٹھ کر پینٹری میں آئی تو کریم فرج کی صفائی کرتا نظر آیا۔
"کیا ولی محمد آ گئے۔؟" اُس نے خانساماں کے بارے میں پوچھا۔
"نہیں بی بی وہ لات صاحب کا بچہ کبھی ساڑھے نو بجے سے پہلے نکل کر آتا ہے۔ گھوم رہا ہوگا لونڈوں پر تینچی مارتا ہوا۔" کریم فریزر سے ناکارہ برف کا بڑا سا ٹکڑا نکالتا ہوا بولا۔
"اچھا خیر میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ خانساماں آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کا رخ کرتی ہوئی پینٹری سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو لاؤنج میں آتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پلٹ کر ریسیور اُٹھا لیا۔
"ہیلو کریم ـــ" یہ زینت کی آواز تھی۔ جسے سُن کر اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔
"بھابی جان کریم تو کچن میں ہے۔" اس نے کوئی بری خبر سننے کے لیے خود کو تیار کر کے کہا۔
"اچھا تو تم سلوط بول رہی ہو۔" زینت بولیں۔
"جی ـــ"
"کیا بابا گھر پر ہیں یا چلے گئے۔؟"
"معلوم نہیں ابھی کچھ دیر پہلے تو یہیں تھے۔"
"کیا انہوں نے ناشتا کر لیا ؟"
"نہیں صرف چائے پی ہے۔"
"اوہو سمجھ گئی۔ نازو کی طرف سے پریشان بھی تو بہت تھے وہ۔ اس لیے نہ کیا ہوگا۔ خیر اگر ابھی گھر پر ہی موجود ہیں تو انہیں جا کر خوشخبری سنا دو کہ خدا نے انہیں ایک چاند سے بھانجے سے نوازا ہے۔ نازو کے یہاں ابھی دس منٹ قبل بارہ پونڈ کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔" زینت یہ خوشخبری سناتے وقت اتنی مسرور تھیں کہ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔
"او اچھا اچھا ـــ نواسہ مبارک ہو بھابی جان مگر نازو کی طبیعت کیسی ہے۔؟"
"بس ٹھیک ہی ہے۔ اتنی سخت تکلیف بھی تو اٹھائی ہے۔ ہوتے ہوتے ہی بحال ہوگی۔ خیر تم بابا کو تو کسی طرح بتا دو۔" زینت بولیں۔ شاید بہت زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھیں جو انہوں نے اس کی مبارکباد کو بھی نہیں گردانا تھا۔
"جی اچھا دیکھتی ہوں۔" سلوط نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اور پھر اسفند کو یہ اتنی بڑی خوشخبری سنانے اس کے کمرے کی طرف دوڑی تو وہ جو ڈیوٹی پر جانے کی جلدی میں تھا اسے راستے میں ہی مل گیا۔
"آپ کے لیے ایک زبردست خوشخبری ہے۔ نازو کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ابھی ابھی بھابی نے فون پر اطلاع دی ہے۔"
"کیا سچ ـــ مگر نازو کیسی ہے۔؟" خوشی کے ساتھ ساتھ اس نے بہن کی طرف سے تردد کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ کمزوری تو ہوگی اتنی سخت تکلیف جو اٹھائی ہے۔"
"مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اسفند نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر شکرانہ ادا کیا۔ اور پھر ایکدم ہی بہت شوخ اور جذباتی سا ہو کر اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔
"ایسی زبردست خوشخبری سنانے والے کا منہ تو موتیوں سے بھر دیا جاتا ہے مگر میں آپ کا منہ ـــــ کس چیز سے بھروں؟" اور اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ایسی ڈری کہ بھاگتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے کچن میں آ گیا۔ خانساماں اسی وقت آ کر کھڑا ہوا تھا اور کریم اپنی ٹکسالی زبان میں اسے وقت گزر جانے کا احساس دلا رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ اسفند بھی آ گیا تھا۔ آتے ہی کریم سے بولا۔
"لو بھئی کریم اب اپنی ساری منتیں پوری کر لو۔ خدا نے تمہاری بڑی بٹیا کو بیٹے سے نوازا ہے۔"
"مبارک ہو مبارک ہو بابا صاحب ـــ کیوں بی بی میں نہ کہتا تھا کہ اللہ پاک کوئی بڑی خبر سنائے گا۔" کریم خوشی سے چہچہا اُٹھا۔
"پر چھوٹے سرکار اتنی بڑی خبر آپ اتنے روکھے منہ سے دے رہے ہیں۔ ماموں بن گئے ہیں آپ تو کچھ صدقہ خیرات دیجیے مٹھائی کھلائیے۔" خانساماں پوری کھیسیں نکال کر بولے۔
"ارے جا بے تجھے تو بس ہر بات میں ہی پیسہ بٹورنے کی پڑی رہتی ہے۔ ارے اتنی بڑی خوشی کا موقع ہے یہی کیا کم ہے۔ ہونہہ مٹھائی دے دو انعام دے دو۔" کریم خانساماں پر برسا۔
"نہیں کریم ـــ یہ انعام اور مٹھائی وغیرہ تو تم لوگوں کا حق ہے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں صدر میں اتارتا جاؤں گا۔ تم فی الحال دس سیر تِلا قند بندھوا لینا۔ میں چھٹی لینے جا رہا ہوں۔ واپسی میں تم کو لیتا آؤں گا۔" اسفند بولا پھر اس نے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا اور سو روپے کا نوٹ خانساماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔
"اس میں سے پچاس تم لے لو اور پچاس کریم کو دے دو۔ میرے پاس اس وقت چینج نہیں ہے۔" اور خانساماں نے فوراً ہی وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اسے دعائیں دینے لگا۔ وہ خاموش کھڑی یہ سب دیکھ اور سُن رہی تھی کہ اسفند ایکدم ہی اس سے مخاطب ہو کر بولا۔
"اور آپ انعام میں کیا لیں گی۔؟ یہ اتنی بڑی خوشخبری سب سے پہلے آپ نے ہی سنائی ہے۔"
"بی بی کو ڈبل انعام ملنا چاہیے ڈبل۔" کریم ہنس کر بولا۔ اور سلوط جیسے دونوں ملازموں کے سامنے انعام کے بارے میں پوچھنا بہت شاق گزرا کہ انعام و اکرام سے تو ملازموں کو نوازا جاتا ہے اور وہ اسے بھی شامل کر رہا تھا ان میں ـــ اس پر کریم نے جو ہنسنا شروع کر دیا تو اس کا چہرہ غم و غصے سے سرخ پڑ گیا۔
"جی نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آئی ایم ناٹ یور سرونٹ (میں تمہاری نوکر نہیں ہوں) سمجھے آپ۔" وہ غصے سے بل کھا کر بولی۔
"ارے آپ تو برا مان گئیں بی بی ورنہ یہ تو خوشی کا موقع ہے اور آپ کو تو انعام بھی بڑا تگڑا ملے گا۔" کریم اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی نیت سے بولا۔
"تم چپ رہو کریم ـــ میں اگر اپنی مروت اور رواداری میں یہاں کے کام کر دیتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کی زرخرید ہوں۔ میرے اپنے گھر میں تو ایک دو نہیں آٹھ دس نوکر تھے۔ اور اتنا کر و فر کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بولنے پر آئی تو شاید ضرورت سے کہیں زیادہ کہہ گئی تھی۔
"اوہ تو تم نے میرے ذرا سے مذاق کا یہ مطلب لیا ہے۔ تم واقعی سر تا پا احساسِ کمتری میں غرق ہو۔" ملازموں کے سامنے اس کا اس قدر بد دماغ ہو جانا اسفند کو سخت گراں گزرا۔ اسی لیے اس نے انگلش میں گویا اسے ملامت کی اور پھر کریم سے بولا۔ "جلدی کرو کریم مجھے واپس بھی آنا ہے۔" اور پھر تیزی سے چلتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ اور سلوط جیسے اب یہ احساس

کمتری کا طعنہ کسی گالی کی طرح لگنے لگا تھا۔ غصے اور کھسیاہٹ کے عالم میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

"آپ اپنے دل پر اثر نہ لیجیے بی بی۔۔۔ بابا صاحب کی تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔" خانساماں نے اسے اس قدر [illegible]
دیکھ کر کہا۔ تو وہ جلدی سے بولی۔

"ارے نہیں خانساماں۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ نازو کی سسرال والے بیٹا ہونے پر کتنا خوش ہو رہے ہوں گے
کے خاندان میں تو زیادہ تر لڑکیوں کی بھرمار ہے۔ خیر آپ سودا کیا لائے ہیں اور کیا پکانے کا ارادہ ہے؟"

اس نے کتنی خوبصورتی سے بات پلٹ ہی نہیں دی تھی۔ بلکہ اس تاثر کو بھی بدل دیا تھا۔ جو اس کے چہرے سے [illegible]
پھر خانساماں اسے وہ چیزیں دکھانے لگا جو وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اور وہ اسے دو تین کھانے تیار کرنے کی ہدایت [illegible]
کمرے میں واپس آگئی۔ اس پر اب بھی غصہ اور کھسیاہٹ سوار تھی۔ کیونکہ اگر اسفند نے مذاقاً پوچھ بھی لیا تھا تو اس کے [illegible]
اسے نوکروں کے سامنے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا جس میں اس کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔ اور پھر اگر وہ اپنی بہن کی طرف [illegible]
پریشان بھی تھا تو اسے میرے ساتھ اس قدر بیگانہ سا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔

پھر وہی بات ہو گئی نا کہ وہ اپنی مرضی چلانے کا عادی ہے۔
اپنے موڈ سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
اور اگر کوئی بات مجھے زہر لگتی ہے تو صرف یہی۔
بھائی جان۔ بھابی جان حتیٰ کہ ورّانی۔۔۔ سب ہی مجھ پر اپنی مرضی ٹھونستے رہے اور اب یہ اسفند بھی مجھے اپنی مرضی پر
چلانا چاہتے ہیں۔
اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔
یوں بھی میں آخر کب تک دوسروں کے اشارے پر ناچتی رہوں گی۔
اور آخر میں نے خود کو اتنا بودا اور کمزور کیوں بنا لیا ہے۔
بقول اسفند میں اس قدر کمپلیکسڈ کیوں ہو گئی ہوں۔
کس وجہ سے آخر۔۔۔
صرف اسی لیے نا کہ زبردستی ان لوگوں پر بار بنی پڑی ہوں۔
مگر میں خود تو آئی نہیں یہاں۔۔۔
نہ میں نے کبھی یہاں آنے کا تصور ہی کیا تھا۔
مجھے تو بھابی جان اور بھائی جان نے اپنے حالات کی خستہ حالی اور اپنی کسی مصلحت کے تحت یہاں بھیجا تھا۔
پھر میں خواہ مخواہ ہی کیوں شرمندگی اور احسان مندی کے احساس میں لپٹی رہتی ہوں۔
میں نے کئی سال قبل انٹر سائنس کیا ہے۔ اور نیلما اب انٹر میں پڑھ رہی ہے۔ ان تینوں بہنوں کے چہروں پر تو ان کی آسودہ
حالی نے تر و تازگی بخش دی ہے۔ اس پر میک اپ اور ٹیپ ٹاپ کی مدد سے یہ اتنی خوبرو نظر آتی ہیں۔
مگر میں۔۔۔ میں اگرچہ بے مایہ اور بے حیثیت ہوں تب بھی۔۔۔ خدا نے مجھے خوبصورتی کی نعمت سے نوازا ہے۔۔۔
میرے چہرے پر تر و تازگی اُسی کی عطا کردہ ہے۔
اس پر مجھے تقریباً سارے ہی کام کرنے آتے ہیں۔
اتنی صلاحیت ہے کہ میں کہیں سروس بھی کر سکتی ہوں۔
پھر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے آخر۔۔۔؟
جو میں اتنا زیادہ احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہوں۔
مگر یہ احساسِ کمتری نہیں بلکہ وہ احساسِ محرومی ہے جو میری پیدائش سے قبل ہی میرے ۔۔۔ وجود کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا
اب میں اسفند کو یہ سب کیسے بتاؤں۔
اور بتلانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اب جس بیگانگی سے وہ مجھ سے پیش آتے ہیں خدا کرے وہ بیگانگی اتنی بڑھے۔۔۔ [illegible]

[illegible] پھر جائے۔
[illegible] سفند کا دل مجھ سے پھر جائے۔
[illegible] وہ میری خامیوں اور بے مائیگی کی وجہ سے مجھ سے متنفر ہو جائے۔
[illegible] خیال ہی چھوڑ دے۔
[illegible] نہیں چھوڑے گا تو میں خود اُسے مجبور کر دوں گی۔
[illegible] اسے بہادر بن کر اور احساسِ برتری میں ڈھل کر دکھا دوں گی۔ اب میں اس خول کو اتار پھینکوں گی جو میری،
[illegible] عرصے سے مجھ پر چڑھا رکھا ہے۔ اور شرما حضوری اور مروت سے کام لینے کے بجائے دھاندلی اور بے مروتی کو اپنا شعار

[illegible] بھی اسفند ہی نہیں منجھلے اکا۔۔۔ چھوٹے اکا اور بھابی دلہن کئی بار مجھ پر یہ جتانے کی کوشش کر چکے ہیں کہ مجھے یہاں جو
[illegible] ہے اسے میں نے خواہ مخواہ ہی ان لوگوں کے زیرِ بار ہونے کے احساس میں ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ واقعی میری
[illegible] مگر اب میں خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کروں گی اور اپنی اہمیت کو بھابی جان اور ان کی مغرور بیٹیوں
[illegible] سا دوں گی۔

[illegible] دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی یہی سوچتی رہی۔
[illegible] تین روز تو کچھ ایسی پریشانی ۔۔۔ میں گزرے کہ کسی کو کسی کا ہوش تک نہ رہا۔
[illegible] کو ایک تو سوجن چڑھی ہوئی تھی۔
[illegible] بلڈ پریشر بھی ہائی تھا۔
[illegible] کم ہو گیا تھا۔ اور بچے کی ولادت کے بعد خون کی کمی کی وجہ سے اس کی نبضیں ڈوبنے لگی تھیں۔ اس لیے اسے خون کی دو
[illegible] چڑھائی گئی تھیں۔ خون چڑھانے کے بعد نبض ذرا قابو میں آئی تو اسے بخار ہو گیا۔ گو یا ہر ممکنہ علاج اور طبی سہولتیں فراہم
[illegible] کے باوجود اس کی حالت اطمینان بخش نہیں ہوئی تھی۔ جس کے نتیجے میں یہی لوگ ہی نہیں بلکہ سہیل منصور کی فیملی اور احمد
[illegible] کے گھر والے سبھی پریشانی کی زد میں آ گئے تھے۔ دونوں لڑکیوں کو تو زینت نے اسی روز گھر بھیج دیا تھا۔ اور شعیب منصور
[illegible] گئے تھے۔ مگر زینت نباس تبدیل کرنے کی غرض سے بس کھڑے کھڑے آ گئی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی تھیں۔
[illegible] منصور بھی شام کو تھوڑی دیر کے لیے ہو آئے تھے مگر زینت، اسفند کے ساتھ اسپتال ہی میں رہی تھیں۔
[illegible] بہرحال۔۔۔ چوتھے دن کہیں جا کر نازو کی طبیعت سنبھلی۔ اور ساتویں روز وہ اس قابل ہوئی کہ ہسپتال سے اسے فارغ

[illegible] اور اس کی والدہ تو قاعدے کے مطابق اسے اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہ رہے تھے۔ لیکن چونکہ نازو کی پہلی زچگی تھی
[illegible] کے منہ میں داخل ہوتے ہوتے ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس لیے زینت اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔
[illegible] کی وجہ سے گھر میں کچھ زیادہ ہی رونق اور چہل پہل ہو گئی تھی۔ اور جب کہ اس نے سوچا تھا کہ وہ کچھ بن کر دکھائے گی اور
[illegible] حضوری سے کام ہی نہیں لے گی تو نازو کے آ جانے کی وجہ سے وہ اپنے اسی تہیے پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب نہیں۔۔۔

[illegible] زینت زیادہ تر خود بھی کچن میں ہی نظر آتی تھیں۔
[illegible] کے لیے سوپ تیار کر رہی ہیں۔
[illegible] دودھ کے گلاس لے جا رہی ہیں۔
[illegible] کا فیڈ تیار کر رہی ہیں۔
[illegible] کھانے کا اہتمام کر رہی ہیں۔
[illegible] سب سے الگ تھلگ کمرے میں بند ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ جبکہ بار بار اسی کا نام لے کر پکارتی رہتی تھیں۔
[illegible] تو اس قابل تھیں نہیں۔۔۔
[illegible] تیار کرنے کا شوق بھی تھا تو وہ بھی اپنے موڈ سے اپنا یہ شوق پورا کرتی تھی۔ اور ان دنوں تو اس کے سمسٹرز ہونے
[illegible] پریشانی میں پڑھائی کا بھی کافی حرج ہوا تھا۔ اور نیلوفر کو تو ان کاموں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ عذرا اس کا بھی

وہی پڑھائی کا تھا۔ اس لیے دونوں میں سے کوئی ایک بھی ماں کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی۔ اور اب سلوطا اتنی آنکھ بھی نہیں رکھتی تھی۔ کہ زینت کا ہاتھ بٹانے سے صاف انکار کردیتی۔ مگر اب اس کے رویے میں اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ باندھے کردیا کرتی تھی وہ باقاعدہ حکم دے کر کریم اور خانساماں سے کرواتی تھی۔ اب وہ دبی دبی اور ڈری ڈری سی بھی نہ خاص طور پر کوثر کے ساتھ خوب ہنس ہنس کے اور اونچی آواز میں باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ اور کھانے کے دوران کام لینا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔

اسفند سے تقریباً روز ہی اس کا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ اور وہ اس کی موجودگی کو بری طرح نظر انداز کرنے کے ساتھ کوثر اور شعیب منصور سے خوب باتیں کرتی رہتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں ناز وکی وجہ سے نازش اور کوثر تقریباً روز ہی آجایا کرتی تھیں۔

اصل میں تو اس کی نئی روش پر ہی کوثر نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔

اسے خوب سراہا تھا۔

گویا کوثر ہی کی وجہ سے وہ کافی دلیر ہوگئی تھی۔

اس روز گھر میں کچھ زیادہ ہی چہل پہل تھی۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ناز پرور کو چودھویں دن چھٹی نہلائی گئی تھی۔ اس کی سسرال والے عزیز و اقارب اور دوست احباب خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔

زینت نے نواسہ کی چھٹی بھی ایسی دی تھی کہ جہیز کا گمان ہو رہا تھا۔ اس پر رات کے کھانے پر سب کو مدعو بھی کیا تھا۔

سلوط صبح سے تو کام میں لگی ہوئی تھی۔ مگر دوپہر کے کھانے کے بعد اس کی طبیعت مالش کرنے لگی تھی اس لیے لیٹے لیٹے ہی آنکھ لگ گئی۔

یوں بھی تین بجے تو لیٹنا نصیب ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی سوئی تھی کہ کریم نے اپنی گدھے کی سی آواز میں آکر اسے جگا دیا۔

"بی بی ــــ بی بی جلدی چلیے بیگم صاحب نے کسی ضروری کام سے آپ کو بلایا ہے۔" اس کے بیدار ہوتے ہی کریم نے کہا۔ مارے کوفت کے اس کا برا حال ہوگیا۔

"بھئی ایسی کیا آفت نازل ہوگئی ہے۔ ایکدم جو مجھے بلایا جارہا ہے۔ جاؤ کہہ دو اپنی بیگم صاحب سے کہ میں اس وقت بالکل نہیں آسکتی۔ ایسا ہی کوئی ضروری کام ہے تو نیلوفر یا نیلما سے کرالیں۔" اور ظاہر تھا۔ کریم جو اس سے ایسے سخت اور کرخت جواب کی توقع ہی نہیں ہوسکتا تھا وہ ہکا بکا سا اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

"جاؤ بھئی یہاں کھڑے میرا منہ کیوں تک رہے ہو۔ جاؤ کہہ دو ان سے جاکر صاف صاف ــــ واہ بھئی ذرا سی مروت کیا برت لی کہ سب نے نوکری سمجھ لیا۔"

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی تو کریم حیران حیران سا اس کے کمرے سے نکل گیا۔ جرات تو اتنی بڑی کرلی تھی مگر کریم کے جاتے ہی ایک سہم سا سوار ہوگیا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ اب اس کی بات کے ردعمل میں کسی بھی لمحے زینت بم کے گولے میں تبدیل ہوکر سے اس پر آگریں گی۔ تو ہوا کچھ یوں کہ اس کے کڑوے کسیلے جواب پر کریم خود بھی حیران ہونے کے ساتھ ساتھ تاؤ کھاتا ہوا جب پہنچا تو زینت اسے اسفند سے باتیں کرتی نظر آئیں۔ اور اس نے اسفند کی موجودگی کی پروا کیے بغیر جو کچھ سلوط نے کہا تھا حرف بحرف بیان کردیا۔

زینت کو اس کے جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ خود بھی سلوط کی اس جسارت پر متعجب ہونے سے زیادہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ماں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ نگاہیں کترا کر کریم سے بولا۔

"ہاں تو تم اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنے کیوں گئے تھے۔ کسی کی نیند میں خلل ڈالو گے تو وہ تمہیں سر پر تو نہیں بٹھائے گی۔" بات پر زینت جز بز سی ہوکر بولیں۔

"ارے رہنے بھی دو سنی ــــ تم بھی بعض وقت ایسی باتیں کرتے ہو کہ دل جل کر خاک ہوجاتا ہے۔ ارے یہ کریم خود اپنی مرضی سے ڈسٹرب کرنے نہیں گیا تھا۔ انہیں تو اس وقت میں نے بلوایا تھا میں نے اور اس نے بھی سلوط سے یہی کہا ہوگا کیوں کریم ــــ ؟"

زینت تیز لہجے میں اپنی بات کہہ کر کریم سے مخاطب ہوئی تھیں۔ کریم فوراً ہی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا بولا۔

"جی بیگم صاحب ــــ تو اور کیا میں جاکر یہ کہتا کہ چھوڑ دو یہ سونا ونا اور جلدی سے اٹھ کر میرے ساتھ چلو۔"

زینت کی شہ پاکر کریم گستاخ سا ہوگیا تھا۔ اسفند ایکدم ہی طیش میں آگیا۔

"شٹ اپ ڈیم اٹ ــــ تم تو کیا تمہارا تو باپ بھی سلوط سے ایسی بات کہنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ کیا سمجھ کر تم نے ایسی بات کہی ہے۔ بولو ــــ بولو۔" اسفند طیش کے عالم میں ایکدم ہی کریم کی طرف بڑھا تو زینت سہم کر جلدی سے بولیں۔

"ارے ارے یہ تم اس بے چارے کو کیوں ڈانٹ رہے ہو سنی بیٹے ــــ یہ تو ان پڑھ اور گنوار ہے ایکدم اسے بھلا بات کرنے کا سلیقہ ہی کہاں آتا ہے۔"

"نہیں خوب آتا ہے سلیقہ اور طریقہ لیکن چونکہ آپ نے اور آپ کی صاحبزادیوں نے سلوط کی طرف سے سب کا امپریشن خراب کر رکھا ہے اس لیے آج اسے اتنی جرات ہوئی کہ یہ انہیں اپنے لیول پر رکھ کر بات کر رہا ہے۔ مگر میں اس کا سارا جاہل اور اجڈ پن ایک منٹ میں دور کرکے رکھ دوں گا۔"

اسفند نے ماں کو بھی آنکھیں دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔ تو کریم جو اس کے بگڑے تیور دیکھ کر پہلے ہی سہما جارہا تھا فوراً ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نہیں ــ نہیں چھوٹے سرکار مجھ سے غلطی ہوگئی معاف کردیجیے ــ اب میری توبہ جو میں سلوط بی بی کو کچھ کہوں۔ اللہ قسم میں تو ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔" تو زینت بھی اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بولیں۔

"ارے بیوقوف عزت تو کیا کرے گا۔ عزت تو ہم بھی ان کی بہت کرتے ہیں۔ اے ہاں بھلا ہم نے تو اپنی نند پر بھی انہیں فوقیت دے رکھی ہے۔ وہ تو کچھ اس وقت میری ہی مت ماری گئی تھی جو میں نے کریم کے ہاتھ ان کو بلوا لیا تھا۔ یوں بھی اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے اور چونکہ بکرا دیر سے ذبح ہوا تھا۔ اس لیے صرف اس کا گوشت علیحدہ کرنے کی غرض سے ہی بلوایا تھا۔ ورنہ بیس سیر مرغی بھی صبح سے آئی جوں کی توں پڑی ہے۔"

"مگر یہ کام تو نیلوفر اور نیلما بھی کرسکتی تھیں۔" اسفند قدرے ٹھنڈا پڑ کر بولا۔

"اے لو ان سے کیا خاک کراتی ــ انہیں بھلا ایسے کام کہاں آتے ہیں۔ وہ تو سلوط ہی ماشاءاللہ ان کاموں میں ماہر ہیں ــــ" زینت نے کہا۔

"خیر خیر انسان کام کرکے اور سیکھ کر ہی ماہر بنتا ہے۔ اور یہ کہیں کہ آپ نے ان دونوں کو کوئی کام سکھانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔" اسفند چبھتے سے لہجے میں بولا۔ اور تبھی شعیب منصور نے جو قیلولہ کرنے کے بعد کمرے سے باہر آئے تھے۔ قریب آکر پوچھا۔

"بھئی کس بات کی ضرورت نہیں سمجھی سنی بیٹے ــــ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

اب باپ کے سامنے ماں کی شکایت کرنے سے تو وہ رہا تھا جلدی سے بات پلٹ کر بولا۔

"کچھ نہیں ڈیڈی ــ وہ بس میں آج کی دعوت میں رکھے جانے والے آئیٹمز کے بارے میں کہہ رہا تھا۔" اور پھر فوراً ہی پلٹ کر جانے لگا۔

"ہائیں دعوت کے آئیٹمز ــ میں سمجھا نہیں ــــ مگر یہ تم مجھے دیکھتے ہی کہاں چل دیے۔" اصل میں شعیب منصور اس کے تیور اور لب و لہجے سے ہی بھانپ گئے تھے۔ کہ وہ اس وقت ماں سے کسی مسئلے پر الجھا ہوا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسے جاتا دیکھ کر فوراً ہی ٹوکا۔ اور وہ چند قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ باپ کی طرف گھوم کر وہیں کھڑے کھڑے اس نے ان پر ایک نظر ڈالی اور پھر ماں پر اور پھر ایک پھیکی مسکان کے ساتھ بولا۔

"اصل میں ڈیڈی دو کے درمیان تیسرا عموماً ٹھیکرا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور پھر میں نے سوچا آپ دونوں کو بھی بات کرنے کا موقع دینا چاہیے۔" اس کے لہجے میں شوخی سی عود کر آئی تھی۔ شعیب منصور نے اس کی بات کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ حتیٰ کہ زینت بھی جو اس کی باتوں سے بہت بددل سی ہو رہی تھیں ہنسنے لگیں۔

"ہمارا ننھا ہی نہیں بہت سیانا ہوگیا ہے بیگم ــــ اب جلد از جلد اسے پابند کرنے کی فکر کیجیے ورنہ ــــ" شعیب منصور نے بات ادھوری چھوڑ کر ہنستے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو زینت بیگم یہی کہتیں کہ میں نے تو جب سے لندن سے آئے ہیں

سی کرکے دیکھ لی۔ مگر یہ کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتے یا انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔
یا پھر کوئی لڑکی ان کے معیار پر پوری ہی نہیں اُترتی۔
مگر اس وقت چونکہ وہ بیٹے سے سخت کبیدہ اور شاکی تھیں اس لیے پھولے پھولے سے منہ کے ساتھ بولیں۔
"اب اس سلسلے میں، میں کیا کرسکتی ہوں جبکہ خود انہیں ہی پابند ہونا گوارا نہیں۔ میں نے ایک دو نہیں بیسیوں بہ بڑھ کر لڑکیاں انہیں دکھادیں۔"
"ادہ تو ممی اب ایسا بھی نہیں کہ کوئی لڑکی مجھے پسند ہی نہیں آئی۔ بلکہ آپ کی اطلاع کو میں ایک لڑکی پسند کرچکا ہوں اور پابند ہونے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔"
اس نے بتایا مگر کہنے کا انداز کچھ ایسا عجیب اور چیلنج کرتا ہوا سا تھا کہ ماں اور باپ دونوں ہی ٹکر ٹکر ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اور جب شعیب منصور نے اچانک آگھیرنے والی خوشی سے سرشار ہوکر اس خوش نصیب لڑکی کے بارے میں بیٹے سے استفسار کرنے کی غرض سے کچھ پوچھنا چاہا تو نگاہیں سارے استفسارات سمیت خالی خولی ہی لوٹ آئیں کیونکہ وہ جاچکا تھا۔

اس روز تو چونکہ چھٹی کے سلسلے میں رات کو ڈنر تھا اور نازش وغیرہ تو سہ پہر کو ہی آگئی تھیں ادھر کھانوں کی تیاری، ادھر دیگر انتظامات زینت کو سکون سے بیٹے سے بات کرنے کا موقع ملا تھا نہ شوہر سے کہ رات گئے تک مہمان گھر میں رہے تھے اور ان سب کو رخصت کرنے کے بعد ساری چیزوں کو قرینے سے لگواکر وہ اپنی خواب گاہ میں آئی تھیں تو تھکن کے مارے ان سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔
نیند بھی ایسی ٹوٹ کر آرہی تھی کہ جلد جلد ـــــ لباس تبدیل کرکے وہ بستر پر آلیٹی تھیں۔ شعیب منصور تو سدا سے ہی نیند کے بہت کچے واقع ہوئے تھے۔ گو وہ بھی بیوی سے ذرا پہلے ہی کمرے میں آئے تھے مگر بستر پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے تھے اور اگلے دن تو جیسے دونوں میاں بیوی بھول ہی گئے کہ ان کے ذہنوں میں کوئی سوال بری طرح کلبلا رہا تھا۔ کیونکہ اگلے دن شعیب منصور حسب معمول تیار ہوکر اپنے آفس چل دیے اور زینت بیٹی اور نواسے کے چاؤ چونچلوں میں لگ گئیں یوں بھی احمد سروش کا قاعدہ تھا کہ وہ آفس جاتے ہوئے کھڑے کھڑے بیوی اور بچے کو ضرور دیکھ کر جاتا تھا اور شام کا کھانا ساس اور سسر کے اصرار پر سسرال میں ہی کھاتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے زینت کھانے میں کچھ زیادہ ہی اہتمام کرتی تھیں۔ یوں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھیں اور نواسے کے سارے کام خود اپنے ہاتھ سے کررہی تھیں۔ عرصے بعد سب کے ہاتھ ایک ننھا سا کھلونا لگا تھا اس لیے سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا اور ایک گود سے دوسری گود میں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ ادھر احمد سروش کے والدین بھی پوتے کے دم و دیوانے تھے اور اس کی محبت میں تقریباً روز ہی کھنچے چلے آتے تھے۔ نسرین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح بہو اور پوتے کو اُٹھا کر گھر لے جائیں اور باتوں ہی باتوں میں جب اس خواہش کا اظہار کرتیں تو زینت یہ کہہ کر کہ بس تھوڑے دن کا تو معاملہ ہی ہے پھر تو آپ کی بہو اور پوتا ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہے گا ان کی اس خواہش کو رد کردیتیں۔ ادھر سسرال والے بھی زچہ اور بچہ کو دیکھنے آتے اور میکے والے اور دوست احباب بھی۔
غرض انہیں سکون و یکسوئی سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا جو وہ بیٹے کی بات پر غور کرتیں یا اس سے یہ پوچھتیں کہ تم

نے کس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔ یا وہ ایسی کون سی خوش نصیب اور دنیا سے نرالی لڑکی ہے جسے اپنی زندگی کی ... شامل کرنے کا تم نے فیصلہ کیا ہے۔

کچھ موضوع ہی ایسا نکلا تھا جو ایک دم ہی ان کا خیال اس مسئلے کی طرف چلا گیا تھا۔ اصل میں تو موضوع ... پر پہلے بھی بارہا گفتگو ہو چکی تھی۔ نسرین نے ناز پرور اور پوتے کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ کیا تھا اور زینت نے ... وہی عذر پیش کیا تھا جو ان کے اس مطالبے پر وہ کرتی رہی تھیں۔ اور ماں کے اس جواب پر نیلوفر نے کہا تھا۔

"ہم تو اس ننھے سے گڈے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں آنٹی کہ جب آپ اپیا کو اور اسے ساتھ لے جائیں گی ... بہت مس کریں گے۔"

"ارے تم تو خیر پھر بھی اسے کم ہی لیتی ہو۔ یہ تو اللہ رکھے ہر وقت میرے کلیجے سے لگا رہتا ہے۔ میری سوچ ... ددھیال جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتے گی۔" زینت دادی کی گود میں لیٹے نواسے کی پیشانی کو چوم کر بولیں۔

"اب نواسہ نواسی تو بیٹی کی طرح پرائے گھر کے ہی ہوتے ہیں بھابی جان آپ بھی بہو لے آئیے تو آپ کے گھر ... سے ننھی منی کلکاریاں گونجنے لگیں گی۔" نسرین ہنس کر بولیں۔ تب معاً زینت کو بیٹے کی کہی بات یاد آ گئی۔ مگر ان کے کچھ کہنے ... پہلے ہی ناز پرور بولی۔

"امی جان۔ ممی کے بس میں ہوتا تو اب تک بہو کیا دو تین پوتا پوتی بھی ہو چکے ہوتے ان کے مگر بھائی جان کو کوئی لڑکی ... پسند نہیں آتی۔ جب کہ ممی تو انہیں ایک سے ایک بڑھ کر خوب صورت لڑکی دکھا چکی ہیں۔"

"ارے نہیں ناز و۔ بابا اب اس معاملے میں کافی سیریس ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تو شاید کوئی لڑکی بھی پسند کر لی ہے" زینت نے کہا تو ناز و اور نیلوفر دونوں ہی حیرت اور مسرت سے اچھل سی پڑیں۔

"ہائیں۔ کیا سچ ممی۔" دونوں نے ہی یک زبان ہو کر کہا۔

"ہاں۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ چھٹی والے دن تمہارے ڈیڈی کے کہنے پر خود بابا نے ہی بتایا تھا کہ اب وہ شادی کے بارے میں سیریس ہیں اور انہوں نے کوئی لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔" زینت نے بتایا۔

"چھٹی والے دن کہا تھا اور آپ اب تک خاموش ہی بیٹھی ہیں۔ ہمیں بتایا تک نہیں۔ واہ ممی یہ کیا بات ہوئی" نازو نے شکوہ سا کیا۔

"ارے تو اس روز کے بعد سے فرصت ہی کہاں ملی۔ بلکہ خیر سے تم دونوں ماں بیٹے کے کاموں میں یاد ہی کہاں رہا۔" زینت قدرے خجل سی ہو کر بولیں

"مگر ممی وہ لڑکی ہے کون۔ آپ نے بھائی جان سے یہ نہیں پوچھا۔" نیلوفر نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اس روز کے بعد سے بابا کے ساتھ بیٹھنا ہی کب نصیب ہوا۔ ادھر میں سخت مصروف رہی اور ادھر وہ ... میں ڈبل ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پتا نہیں یہ ہماری قوم کب سدھرے گی۔ خود ہی آپس میں لڑ لڑ کر جانیں گنواتی ہے۔ زخمی ہوتی ہے۔ نہ حکومت کا کچھ بگڑتا ہے نہ دوسروں کا۔ البتہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں مصیبت بے چارے ڈاکٹروں کی آتی ہے۔"

"اوہو۔ جبھی بھائی جان آج کل اتنی دیر دیر سے گھر آتے ہیں۔" نیلوفر بولی۔

"خیر۔ اگر آپ کو پوچھنے کا موقع نہیں ملا تو میں آج ہی معلوم کروں گی بھائی جان سے خواہ وہ کتنے ہی لیٹ کیوں نہ آئیں۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے بلکہ بہت بڑی خوشخبری ہے یہ بھائی جان کا کسی کو سلیکٹ کر لینا۔ سچ میں تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔" ناز پرور جوشیلے سے انداز میں بولی۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔

"ہاں بھئی ہے ہی بڑا خوشی کا مقام۔ تمہارا بھی ایک ہی بھائی ہے۔ جتنی خوشی مناؤ کم ہی ہوگی۔" نازو کی ساس نے ...

"ہائے سچ ممی۔ میں تو مایوں، مہندی، شادی اور ولیمے کے لیے ڈبل ڈبل ڈریسز بنواؤں گی اور نئے سیٹ بھی" نیلو نے بھی خوش ہو کر کہا۔

"لیجیے انہیں ابھی سے کپڑے اور زیور کی پڑ گئی" نازو نے ہنس کر کہا تو نسرین بھی ہنسنے لگیں۔

"اصل میں انہیں کپڑوں کا بہت کریز ہے امی جان۔ جبھی تو اتنے بے شمار ڈریسز ہوتے ہوئے بھی ان کا دل نہیں ... بس سے بولی۔ بھائی کی شادی میں تو نئے کپڑے ہی پہننے کو جی چاہتا ہے۔ تانیہ وغیرہ نے بھی ایک سے ایک بڑھ کر ڈریسز ...

"نہیں خیر بھائی کی شادی میں تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔" نازو کی ساس نسرین بولیں۔

"... تے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے ... ہی کیا میں تو اس اتنی بڑی خوشی میں بھائی جان سے ان کی مرسیڈیز بھی ہتھیالوں گی۔ کیونکہ سسرال ... ابھی ڈریسز اور زیورات ... بھائی جان کو نئی گاڑی ملے گی نا ممی۔" نیلوفر کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ کر بولی۔ زینت نے جز بز ہو کر نازو کی طرف دیکھا ... کی طرف سے بھائی جان ... نے کے سے انداز میں بولیں۔

"... یہ کیسے واہیات خیالات ہیں تمہارے نیلوفر۔ بلکہ تمہارے دماغ میں یہ خیال آیا کیسے کہ تمہارے بھائی جان کو سسرال ... سلامی میں کار ملے گی۔ ارے وہ اپنی اتنی انمول بیٹی دے دیں گے یہی کیا کم ہو گا۔ اور ہماری تو کچھ ڈیمانڈز ہی نہیں ہوں گی۔ ... بس خیر سے بابا کا گھر بس جائے یہی بہت ہوگا۔" زینت نے نسرین کو سنانے کے لیے جان کر یہ بات کہی۔

... احمد سرور کی طرف سے خاصے مطالبات کیے گئے تھے اور شادی کے بعد دبے دبے الفاظ میں داماد کو کار دینے پر طنز بھی کیا گیا تھا۔ نسرین زینت کی باتوں کا مفہوم سمجھ گئی تھیں اس لیے انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔

"ہاں بھئی کسی پر بے جا پریشر نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ لڑکی والے جو کچھ بھی دیتے ہیں اپنی حیثیت کے مطابق ہی دیتے ہیں۔"

"اصل میں امی جان یہ نیلوفر بس اپنے بارے میں ہی سوچنے کی عادی ہیں۔ ایسی نزاکتوں کو سمجھنے کا ان میں شعور ہی کہاں ہے۔" نازو نے بھی ایک طرح ان کے لتے لیے۔ نیلوفر بھی سمجھ گئی تھی کہ ماں اور بہن کس وجہ سے لتاڑ رہی ہیں۔ فوراً ہی اپنی بات سنبھالنے کی غرض سے بولی۔

"اف تو یہ آپ دونوں نے تو ایک ذرا سی بات کو اتنا سیریس لے لیا ورنہ میں نے تو یونہی خوشی میں ایک اسٹوپڈ سی بات کہہ دی تھی۔ یوں بھی بھلا بھائی جان اپنی مرسیڈیز کسی کو دے سکتے ہیں۔"

"اصل میں داناؤں نے کہا ہے کہ پہلے تو لو پھر بولو۔ تو تم ہی جیسی بے وقوف کے لیے کہا ہو گا۔" نازو نے ہنس کر گویا ماحول کو خوشگوار بنانے کی غرض سے کہا تو زینت بلاوجہ ہی ہنسنے لگیں۔ تبھی نیلما کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے سمسٹرز ہو رہے تھے۔ اس لیے ان دنوں کتاب کا کیڑا بنی ہوئی تھی۔ اور اس وقت بھی پڑھ کر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی نیلوفر دور ہی سے چلائی۔

"اسے سنو نیلما تمہارے لیے ایک بڑی ہی ہمباسٹک خبر ہے۔"

"اوہو نیلوفر تم کبھی تو کوئی بات اپنے پیٹ میں بچا لیا کرو۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ جو بات سنی اسے فوراً ہی بھڑ بھڑ سب کے سامنے کہہ دیا۔" نازو نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔ اصل میں تو نازو ابھی اس بات کو اخفائے راز میں رکھنا چاہ رہی تھی۔

"اونواپیا۔ کوئی اور بات ہوتی تو اسے ضرور بچا لیتی لیکن یہ بات۔ اگر اسے بچا پایا تو یقیناً مجھے شدید قسم کی ڈیسنٹری ہو جائے گی۔" نیلوفر نے جس چلبلے پن سے کہا نسرین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ زینت بھی مسکرانے لگیں۔

"کیوں۔ آخر ایسی کیا بات ہے ایسا جو آپ مجھ سے چھپانا چاہ رہی ہیں؟" نیلما نے نازو کو مخاطب کر کے گلہ آمیز سے لہجے میں پوچھا۔

"ارے بس بھی ــــ مت پوچھنا۔ ٹاپ سیکرٹ ہے ایک دم۔" نازو نیلما کا تجسس بڑھانے کی غرض سے بولی۔

"ارے کیوں ستا رہی ہو میری معصوم سی بچی کو تم دونوں۔ خوشی کی بات ہے بتا کیوں نہیں دیتیں۔" نیلما کو منہ پھلائے دیکھ کر زینت نے کہا۔

"میں نے تو انہیں دیکھتے ہی بتانا چاہا تھا ممی مگر اپیا نے خواہ مخواہ ہی سسپنس پھیلا دیا۔" نیلوفر بولی۔

"افوہ بھئی میں تو مذاق کر رہی تھی۔ ورنہ خوشی کی بات ہے۔ مجھے بتانے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔" نازو نے کہا۔ اور پھر نیلما سے مخاطب ہو کر بولی۔

"بھئی بات یہ ہے نیلما ــ اپنے بھائی جان شادی کے لیے رضامند ہو گئے ہیں۔"

"اوہو ــ ہو کیا گئے ہیں بلکہ جلد ہی شادی کرنے والے ہیں کیونکہ انہوں نے لڑکی بھی سلیکٹ کر لی ہے۔" نیلوفر کا ہلکا ہٹ اصل بات کو زیادہ دیر بچا نہ سکا۔

"ہائے کیا سچ ممی۔" نیلما نے خوشی سے کھلتے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں سے تصدیق چاہی۔

"ہاں کہا تو انہوں نے یہی ہے۔" زینت نے مگھم سا جواب دیا۔

"اچھا۔ یعنی بھائی جان نے خود کہا ہے۔" نیلما نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں بھئی تو کیا ہم اپنے دل سے گھڑ کر کہہ رہے ہیں۔ بھائی جان نے خود ممی اور ڈیڈی کو بتایا ہے۔ تو ... خوش ہو رہے ہیں۔" نیلوفر بہن کے بار بار پوچھنے پر قدرے چڑ کر بولی۔

"ارے نہیں بجو میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کیا بھائی جان نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کس لڑکی سے شادی ..." نیلما نے گویا اپنے بار بار پوچھنے کی وجہ بیان کی۔

"نہیں۔ یہ تو نہیں بتایا۔" زینت بولیں۔

"کمال ہے ممی۔ اگر انہوں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کہ سب سے اہم اور ضروری بات یہی تھی۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس وقت کچھ موقع ہی ایسا تھا۔ شام کو چھٹی کی دعوت تھی اور سہ پہر تک سارے کام یونہی پڑے ... جب بابا نے یہ خوشخبری سنائی تھی۔" زینت دل ہی دل میں اپنی اس چوک پر پشیمان سی ہو کر بولیں۔

"لیکن کیا سلوط بابا کی منگیتر نہیں ہیں؟" نسرین سے رہا نہ گیا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"اوئی نوج۔ خدا نہ کرے۔" زینت کے منہ سے بڑی بے ساختگی میں نکلا۔

"کیوں۔ کیوں۔ کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟" زینت کے خدا نہ کرے کہنے پر نسرین نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔ زینت کو خدا نہ کرے کہتے ہی غلط بات بول جانے کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔

"نہیں خیر۔ وہ تو بہت نیک اور پیاری بچی ہے۔ مگر بچپن سے ہی کسی سے منسوب ہے۔"

"ہائے کیا سچ۔ مگر تم نے تو ہمیں کبھی نہیں بتایا نازو۔" نسرین کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔ انہوں نے نازو سے شکوہ کیا۔

"بس امی جان کبھی ایسا موضوع ہی نہیں نکلا اس لیے نہ بتا سکی ہوں گی۔" نازو نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کے شکوے کا جواب دیا۔

"خیر ایسا اگر آپ لوگوں سے کسی کو نہیں معلوم تو میں ایک ذریعے سے ابھی ابھی یہاں کھڑے کھڑے معلوم کر سکتی ہوں۔" نیلما جو ان سب کی گفتگو سے بے نیاز سی کھڑی دماغ لڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا۔ کیا معلوم کر سکتی ہو تم؟" نیلوفر نے بیزاری سے پوچھا۔

"بھائی جان کی پسند۔" نیلما نے یوں سینہ پھلا کر کہا جیسے امریکہ کو دریافت کرنے کا سہرا اسی کے سر ہو۔

"اچھا تو کیا تم پر الہام و الہام بھی ہونے لگا ہے۔" نیلوفر نے اس کی بات کو اس کا بچپنا قرار دیتے ہوئے کہا۔

"بھئی یہ تم نے پھر نوک جھونک شروع کر دی۔ پہلے ان سے یہ تو معلوم کرو کہ یہاں کھڑے کھڑے گھر کی ... کیسے کچھ بتا سکتی ہیں۔" نازو نے نیلوفر کے طنزیہ انداز پر اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ زینت جو بڑی دلچسپی اور توجہ سے ... گفتگو سن رہی تھیں انہوں نے مسکرا کر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے نیلما سے پوچھا۔ "ہاں بھئی، یہ نسخہ تو ہمیں بھی بتاؤ ..."

"نسخہ کیسا ممی۔ میں ابھی ابھی کوثر کو فون کر کے پوچھے لیتی ہوں۔"

"کوثر کو فون کر کے۔" دونوں بڑی بہنوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"جی ہاں کوثر کو ہی ڈیر سسٹرز۔" نیلما نے شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مگر بھائی جان کی پسند کے بارے میں بھلا کوثر کو کیسے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" نازو نے بہن کی بات کو مذاق ... کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ٹاپ سیکرٹ ہے بھائی جان کی۔" نیلما شرارت بھرے انداز میں بولی۔

"چلو ہٹو شریر کہیں کی۔ یہ کہو کہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔" نازو نے دلار سے اسے ڈانٹتے ہوئے ...

"ارے نہیں توبہ توبہ۔ اب اتنی بھی گستاخ نہیں ہوں کہ اپنے بڑوں کو بے وقوف بناؤں۔ ٹھیک ہے اگر آپ کو ... بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں ابھی کوثر کو فون کر کے ان سے پوچھ لیتی ہوں۔" نیلما ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اب پھر لیجیے۔ یہ ہے ریسیور اور یہ ہے ڈائل۔ اب تھوڑی سی انگلیوں کو زحمت دے دیجیے۔" نیلوفر نے نازو کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسیور بھی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما نے ... نہیں کہا چپ چاپ سہیل منصور کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ مگر ہوا یوں کہ بیل تو پاس ہوتی رہی مگر ادھر سے ... انتظار کے باوجود کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ نیلما نے دو تین بار پھر کوشش کی اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر بولی "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے سارے فیملی ممبرز کہیں آؤٹنگ پر گئے ہوئے ہیں جو میرا فون کوئی ریسیو ہی نہیں کر رہا۔"

"مگر اور کوئی ہو یا نہ ہو بابا شرافت تو چوکیداری کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں اور فون کے پاس اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے مچھلیوں کی گھات میں دریا کے کنارے کوئی آبی پرندہ۔" نیلوفر بولی۔

"مگر وہ آبی پرندہ بھی اس وقت شاید گھر پر موجود نہیں ہے۔"

"واہ واہ بھائی جان۔ آپ کی بیٹیاں تو اتنی دلچسپ گفتگو کرتی ہیں کہ میرا پیٹ تو ہنستے ہنستے دکھنے لگتا ہے۔" نسرین ... ہنستی ہوئی بولیں۔

"جی ہاں ضرور بھابی۔ یہ جس قدر دلچسپ باتیں کرتی ہیں اسی قدر آپس میں لڑتی بھی ہیں۔" زینت چہرے پر ممتا بھری مسکان سجا کر بولیں۔

"خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اوپر تلے کے بہن بھائی تو اس سے بھی زیادہ لڑتے ہیں۔ مگر ایک بھی تو فوراً ہو جاتے ہیں۔" نسرین نے کہا۔

"اوہ بھئی نیلما ایک دفعہ تو اور ٹرائی کرو۔ لاؤ ریسیور مجھے دو میں خود نمبر ڈائل کرتی ہوں۔" نیلوفر درمیان میں نکل آنے والے ... سے اکتا کر بولی۔

"کیوں آپ کے نمبر ڈائل کرنے سے کیا وہ تینوں دوڑے دوڑے گھر واپس چلے آئیں گے۔ ویسے اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ خود ہی نمبر ڈائل کر کے دیکھیے۔" نیلما بہن کی بات پر جل کر بولی۔ اور فون اپنی گود سے اٹھا کر نیلوفر کی گود میں رکھ دیا۔

"ہائیں ہائیں کیا بد تمیزی ہے تم دونوں بات بے بات آپس میں لڑنے کیوں لگتی ہو۔" نسرین کی وجہ سے زینت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نیلوفر کو گھورتے ہوئے کہا۔ دونوں میں سے ایک بھی کچھ نہیں بولی۔

پھر نیلوفر نے بھی سہیل منصور کے گھر کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر اس کا فون بھی کسی نے ریسیو نہیں کیا۔

"ارے چھوڑو فون وون کو۔ رات کو تو بھائی جان گھر واپس آئیں گے ہی میں خود ان سے پوچھ لوں گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا ممی۔" نازو نے اپنی بات کہہ کر ماں سے اس کی تائید چاہی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" زینت نے نسرین کی وجہ سے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر جب نسرین اپنے گھر چلی گئیں۔ اور نیلوفر اور نیلما بھی اپنے اپنے کمروں میں ... تو زینت نے موقع دیکھ کر نازو سے کہا۔

"بھلا نسرین کو دیکھو کتنا کہا تھا کہ رات کا کھانا کھا کر جائیں۔ مگر وہ مانی ہی نہیں۔ مجھے تو بہت برا لگا ہے ان کا یوں بغیر کھائے چلے جانا۔"

"اصل میں ممی۔ آج امی جان بالکل تنہا آئی تھیں نا۔ اور ادھر ابا جی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بغیر ایک لقمہ ہی نہیں توڑتے۔ اسی لیے ... میں چلی گئی ہوں گی۔" نازو نے جیسے ساس کے چلے جانے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"خیر تم تو سویرے سے کھانا کھا لو۔ دیر سے کھاؤ گی تو ہضم بھی دیر سے ہوگا۔"

"نہیں ممی۔ خواہ کھانا ہضم ہو یا نہیں میں تو آج بھائی جان کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گی۔" نازو بولی۔

"مگر بابا کا تو کوئی ٹھیک نہیں نہ معلوم کب واپس لوٹیں۔ تم کب تک انتظار کرو گی ان کا۔" زینت نے کہا۔

"نہیں ممی خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ گزر جائے۔ میں بھائی جان کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ہاں بھلا ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ ... دیکھنے کی آرزو میں جانے کب سے مری جا رہی ہوں۔ اور وہاں یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر بھائی جان کی شادی ہو رہی ہے۔" نازو شیلے سے انداز میں بولی۔

"لیکن میری مانو تو تم ابھی بابا سے کچھ نہیں پوچھو۔" زینت بولیں۔

"کیوں ... کیوں ممی۔ آخر میں ان کی شادی شدہ بہن ہوں۔ میرا بھی ان پر کچھ حق ہوتا ہے۔" نازو اپنے بہن ہونے کے

زعم میں بولی۔

"ہاں ہاں حق کیوں نہیں ہوتا۔ مگر بیٹی تم تو بابا کی طبیعت سے واقف ہی ہو۔ اگر انہیں کوئی بات بری لگ گئی تو پھر شادی کرنے سے ہی پھر جائیں گے۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ میں خود ہی کوئی نہ کوئی بات نکال کر لڑکی کے بارے میں پوچھوں گی۔" زینت نے سمجھایا۔

"ممی آپ نے تو بھائی جان کو بالکل ہی ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔ سگے بھائی تو وہ لگتے ہی نہیں۔" ماں کی باتوں پر بھڑک کر نیلما نے طنز سے کہا۔

"ارے میں نے نہیں میری قسمت نے بنایا ہے۔ بھلا کہیں ایسی کم نصیب ماں بھی دیکھی ہوگی جس کا اکلوتا بیٹا اس کے لیے اجنبی بن جائے۔" زینت آزردہ سی ہو کر بولیں۔

"خیر ممی فکر نہ کریں انشاء اللہ شادی کے بعد بھائی جان بالکل درست ہو جائیں گے۔"

"شادی کے بعد نہیں بلکہ تمہاری دادی کے بعد۔" زینت نے کہا۔

"مگر اماں جان سے تو اب ان کا کوئی واسطہ رہا ہے نہ رابطہ۔ پھر بھلا وہ اماں جان کی کسی بات کا اثر کیوں کر لے سکتے ہیں۔"

"ارے بیٹی وہ بڑھیا نہیں پوری آفت کی پڑیا ہے۔ وہ دور بیٹھے بیٹھے بھی اپنی کارگزاریوں میں مصروف رہتی ہے۔ یہ لمبے لمبے کئی صفحوں کے خط آتے ہیں بابا کے پاس۔" زینت نے کہا۔

"شکر ہے میری ساس تو بہت ہی اچھی ہیں ایکدم اپنوں کی طرح۔" نازو ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

"ہاں اس لیے کہ وہ تمہاری سگی ساس ہیں۔" زینت بولیں۔

"ممی۔ احمد آج بہت زور دے رہے تھے گھر چلنے پر۔ میں بھی تیار ہو گئی تھی مگر بھائی جان کی شادی کی خبر سن کر دل ہی نہیں چاہا یہاں سے جانے کو۔ سچ سچ مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔" نازو نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں کیوں نہیں ہوگی۔ خدا سلامت رکھے ایک ہی تو بھائی ہے تمہارا۔ جتنی خوشی بھی ہو کم ہے۔" زینت بیٹی کا جذبہ دیکھ کر خوش ہو کر بولیں۔

"نہیں ممی۔ میرے تو اگر دس بھائی بھی ہوتے تو مجھے سب کی خوشی اتنی ہی عزیز ہوتی۔" نازپرور نے کہا۔ اصل میں وہ ہمیشہ سے اپنی بات اونچی رکھنے کی عادی تھی۔

"اے ہے دس بھائی۔" زینت سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں اور پھر زور زور سے ہنسنے لگیں۔ انہیں اس وقت صرف نازو کو کھانا کھلانے کی پڑی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا اور دوسرے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ بھائی کا انتظار کر کے اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ انہوں نے بیٹیوں سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ بیٹا شادی کے لیے رضامند ہے۔ اور اپنے لیے لڑکی بھی تلاش کر چکا ہے۔ مگر وہ خود اس معاملے کی صحت پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ جس وقت بیٹے نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ شادی کرنے پر تیار ہے بلکہ اس نے ایک لڑکی بھی ڈھونڈ لی ہے۔

اس وقت سچویشن بڑی تلخ ہو رہی تھی کہ دونوں ہی ماں بیٹے غصے کی حالت میں تھے۔ اور اس صورت حال سے بے خبر شعیب منصور نے جب اس کی معنی خیز باتوں پہ ہنس کر زینت سے کہا تھا کہ بیٹا اب دانا ہی نہیں سیانا ہو گیا ہے۔ مگر اسے پابند کرنے کا انتظام کرو۔ تب اس نے جس لب و لہجے میں انہیں بتایا تھا کہ وہ نہ صرف شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے بلکہ اس نے لڑکی بھی تلاش کر لی ہے۔ اس لب و لہجے میں خوش کن احساس یا لگن شامل نہیں تھی۔ بلکہ ماں کو چیلنج کرتا ہوا سا جواب تھا۔ اور کسی نتیجے پر پہنچنا تو بڑی بات زینت ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگا سکی تھیں کہ آیا بیٹے نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود وہ بیٹے سے اس کی بات کی تصدیق نہیں کر سکی تھیں۔ اصل میں چونکہ ان کا بیٹا اب تک ان سے دور دور ہی رہا تھا۔ وہ اس کو خود سے نزدیک لانا چاہتی تھیں۔ اس لیے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتی تھیں نہ اس کے معاملات میں ہی دخل دیتی تھیں۔ گو بیٹے کو رام کرنے کا یہ طریقۂ کار غلط ہی تھا کیونکہ ممتا تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر نافرمان سے نافرمان اولاد سے بھی اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ مگر ان کا موجودہ طرزِ عمل بھی ممتا کے ہی تقاضوں پر مبنی تھا۔

بہرحال اس رات وہ اس انتظار میں تھیں کہ ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد کوئی مناسب موقع نکال کر بیٹے سے اس کی شادی کے بارے میں استفسار ضرور کریں گی۔ دراصل میں ان دنوں کراچی کے مضافات میں شر پسند عناصر کے بدامنی پھیلانے کی وجہ سے بعض علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ اور چونکہ وہ شہر کے ایک بڑے ہسپتال سے منسلک تھا۔ اس لیے ہسپتال میں آنے والے زخمیوں کو طبی امداد دینے اور ان کی مرہم پٹی میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ بعض دن تو اسے آدھی رات کے قریب گھر آنے کی مہلت ملتی تھی۔ مگر اس روز بھی شدید انتظار کے باوجود وہ رات گئے تک نہیں آیا تھا۔

ادھر زینت بیٹے کے انتظار میں ایک ایک پل گن رہی تھیں اور ادھر نیلوفر اور نیلما تھیں کہ شام سے رات تک تھوڑی تھوڑی دیر بعد سہیل منصور کا ٹیلی فون نمبر ملا ملا کر تھک گئی تھیں مگر کوئی اٹھا کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ دراصل دونوں کی کوشش یہی تھی کہ وہ بھائی کے بتانے سے پہلے ہی سب کے سامنے یہ پہیلی بوجھ لیں جو بھابی کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے تجسس کو بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ دونوں کی بیقراری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اب انہیں کیا معلوم تھا کہ اخبار میں صوبہ سندھ میں فروخت ہونے والی زرعی زمینوں کا اشتہار دیکھ کر سہیل منصور نے اچانک ہی دادو جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اتنا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ بھائی کے یہاں فون کر کے انہیں اپنے جانے کے متعلق بتا دیتے۔ بس بیوی اور بہن کو لے کر فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔

بابا شرافت بھی اتفاق سے ایک روز قبل چھٹی لے کر ملیر ہالٹ اپنی بہو کی عیادت کو گئے تھے۔ حمل ضائع ہو جانے کی وجہ سے جس کی حالت نازک تھی۔ اور گھر پورا مقفل صرف مالی اور دربان کی نگرانی میں۔ پھر نیلما کا فون کون ریسیو کرتا۔ ادھر نازپرور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ معلوم کرنے نیلما کو باہر بھیج رہی تھی کہ آیا بھائی ڈیوٹی سے واپس لوٹا کہ نہیں۔ مگر ساڑھے دس بجے تک تو وہ لوٹا ہی نہیں تھا اور نازپرور جلد سو جانے کی عادی تھی۔ چنانچہ اس روز تو تمام اہل خانہ ماسوا شعیب منصور کے لڑکی کے بارے میں معلوم کرنے کی حسرت دل میں لیے ہی سو گئے تھے۔

اگلی صبح نیلما اور نیلوفر تو جلد جلد تیار ہو کر کالج چلی گئی تھیں۔ اور نازو جو شوہر کے جانے کے بعد۔ جو حسبِ معمول آفس جاتے ہوئے اسے اور بچے کو دیکھنے آیا تھا کوثر کو فون کر کے ان سب کی خیر خبر معلوم کرنے کی غرض سے کہ گزشتہ رات تینوں کے گھر سے ایک دم ہی غائب ہو جانے کی وجہ سے وہ خاصی پریشان رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ چاہ رہی تھی کہ بھائی کی منتخب کردہ لڑکی کے بارے میں کسی اور کے پوچھنے سے پہلے وہ ساری معلومات حاصل کر لے۔ کہ تبھی۔ خود کوثر کا فون آ گیا۔ نازو نے چھوٹتے ہی کہا۔

"بھئی کل کہاں غائب تھیں تم۔ فون کرتے کرتے تھک گئے مگر کسی نے ریسیو ہی نہیں کیا۔ اور پتا ہے میں نے تو انکوائری تک سے پوچھ لیا کہ کہیں تمہارا فون ہیلڈ اپ تو نہیں ہو گیا۔ حالانکہ رنگ تو برابر پاس ہو رہی تھی۔ مگر ادھر سے بھی یہی جواب ملا کہ فون بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ڈیڈی نے تو پریشان ہو کر ڈرائیور کو بھی بھیجا تھا مگر تمہارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور باہر بھی کوئی نظر نہیں آیا تو ڈرائیور واپس آ گیا۔"

"او ہاؤ سویٹ۔ یعنی کہ آپ لوگ بلا وجہ ہی ہماری طرف سے پریشان ہوئے۔" کوثر نے جواب میں کہا اور پھر اپنے دادو جانے کی غرض و غایت بیان کی۔

"اچھا تو کیا تم رات کو ہی واپس آ گئی تھیں؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم تو ابھی صبح کو آٹھ بجے واپس آئے ہیں۔ اصل میں پاپا کا خیال تو وہاں ٹھہرنے کا تھا لیکن ایک تو زمینیں پسند نہیں آئیں دوسرے وہاں گرمی بہت تھی اس لیے پاپا چند گھنٹے وہاں ٹھہر کر بائی کار ہی واپس آ گئے۔"

"اوہ۔ پھر تو کافی وقت ہوا ہوگا آنے اور جانے میں۔" نازو بولی۔

"ہاں بس۔ زیادہ وقت سفر میں ہی گزرا۔ ورنہ کار تو اے سی تھی اس لیے گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہوا اور پتا ہے پاپا اور ممی کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر آپ لوگوں نے گھر فون کیا ہوگا تو جواب نہ پا کر کافی پریشان ہوئے ہوں گے۔ اسی لیے ممی نے مجھ سے کہا کہ میں فون کر کے آپ کو بتا دوں۔"

"چلو یہ بھی تم نے اچھا ہی کیا ورنہ میں خود تمہیں فون کرنے والی تھی۔ اور اگر اس وقت تم نہیں ملتیں تو پھر تو یقیناً سب بہت پریشان ہو جاتے۔" نازو بولی۔

"اچھا آپ کیسی ہیں اور آپ کا وہ ننھا سا پوڈل کیسا ہے۔" کوثر نے اس کی اور اس کے بچے کی خیریت پوچھی۔

"ہائے بھئی تم نے اسے پوڈل کہہ کر پکارا تو اس کا نام سچ مچ پوڈل ہی پڑ جائے گا۔ جب کہ تمہاری اطلاع کو وہ انسان کا بچہ
ہے کتے کا نہیں۔"

نازو نے برا ماننے کے باوجود مروت سے کام لیتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ اصل میں پوڈل ایک چھوٹا سا فینسی
خوبصورت پالتو کتا ہوتا ہے۔ اور کوثر لاڈ میں نازو کے بیٹے کو پوڈل ہی کہتی تھی۔ نازو نے جس انداز میں بات کہی تو
کوثر زور زور سے ہنسنے لگی۔

"میں کسی برے سینس میں تو اسے پوڈل نہیں کہتی ایپا بلکہ وہ ہے ہی بہت پیارا بالکل پوڈل کی طرح" کوثر نے
ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا خیر چلو۔ جو جی چاہے کہہ لو۔ لیکن اس کا اصل نام شارع احمد ہے۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ۔"
نازو۔ بھائی کی پسندیدہ لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اسی لیے اس نے موضوع بدلتے
ہوئے کہا۔

"کونسی بات۔" کوثر نے پوچھا۔ مگر نازو نے ایک دم ہی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ اس بات کی تمہید باندھتے
ہوئے کہا۔

"معلوم بھی ہے بھائی جان نے شادی کے لیے رضامندی دے دی ہے۔"

"ہائیں کیا واقعی۔" کوثر نے خوش ہوتے سے زیادہ متحیر سی ہو کر پوچھا۔

"ہاں بھئی واقعی۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے لیے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔"

"او ڈیر می یعنی کہ لڑکی بھی پسند کر لی انہوں نے۔" کوثر نے پوچھا مگر اس کے لہجے میں ذرا سی بھی چونچالی یا اشتیاق نہ تھا۔

"ہاں۔ بس اب تم جلدی سے اس لڑکی کا نام بتا دو۔" نازو نے کہا تو کوثر اچھل کر بولی۔

"وہاٹ۔ یعنی کہ میں بتا دوں لڑکی کا نام ایپا۔"

"ہاں، نیلما تو یہی کہہ رہی تھی کہ جس لڑکی کو بھائی جان نے اپنے لیے سلیکٹ کیا ہے اسے تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اور
یہی جاننے کے لیے تو ہم نے کل رات تمہیں کتنے ہی فون کر ڈالے تھے۔" نازو نے اس کے چونکنے کا کوئی نوٹس لیے بغیر کہا۔

"اچھا۔ نیلما آپا ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا۔ ورنہ آپ ہی بتائیے میں بھائی جان کی پرسنل سیکرٹری ہوں نہ ایڈوائزر اور نہ بھائی جان
نے مجھے بتا کر اس لڑکی کو سلیکٹ کیا تھا۔ پھر بھلا مجھے کیا معلوم کہ وہ لڑکی کون ہے۔"

کوثر نے کچھ اس انداز میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کہ نازو کو اس کی بات کا یقین ہی کر لینا پڑا۔ اس کے باوجود بھی اس نے کہا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو مگر نیلما کی عادت سے بھی میں واقف ہوں۔ وہ نیلوفر کی طرح بغیر جانے بوجھے کوئی
بات نہیں کہتی۔ اور بیٹھے بٹھائے اس کا دماغ تو نہیں خراب ہوا تھا جو اس نے تمہارا نام لے دیا۔"

نازو نے کہا تو کوثر کا دل چاہا کہ سلوط کا نام لے دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں اسفند نے کسی اور لڑکی کو پسند نہ کر لیا ہو۔
اس لیے وہ چاہنے کے باوجود سلوط کا نام نہ لے سکی۔

"خیر ذرا نیلما آجائیں تو میں ان سے پوچھتی ہوں کہ انہیں بیٹھے بٹھائے یہ کیا مذاق سوجھا تھا جو انہوں نے خواہ مخواہ ہی تمہارا
نام لے دیا۔ ویسے تم مائنڈ نہ کرنا گڑیا۔ اصل میں بھائی جان کی شادی کی خوشی سب سے زیادہ مجھے ہی ہو رہی ہے۔
اس لیے میں نے بلا سوچے سمجھے ہی اپنے شوق میں تم سے پوچھ لیا۔"

"ارے نہیں نیور مائنڈ ایپا۔ یہ بھی کوئی برا ماننے کی بات ہے۔ مجھے خود بھی اتنی خوشی ہو رہی ہے اتنی اچھی خبر سن کر مگر
آپ نے خود بھائی جان سے کیوں نہ پوچھ لیا لڑکی کے بارے میں۔" کوثر کو ایک دم ہی احساس ہوا کہ اسفند کی شادی ہو رہی
ہے تو وہ بھی خوش ہو کر بولی۔

"بھائی جان سے پوچھ لیتے تو پھر کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر بھائی جان تو آج کل ڈے اینڈ نائٹ ڈیوٹی
اٹینڈ کر رہے ہیں گھر میں ہوتے ہی کب ہیں جو ان سے پوچھا جا سکتا" نازو نے کہا تو کوثر سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔

"اچھا ٹھہریں ایپا نیلما آپا تو ڈھائی بجے تک کالج سے واپس آجاتی ہیں نا۔ بس میں تین بجے تک آجاؤں گی۔ اور پھر
لڑکی کے بارے میں آپ کو بتا دوں گی۔" کوثر نے سوچا خوشی کا موقع ہے اور جب بھائی جان شادی کے لیے سیریس ہی

ہوئے ہیں تو بتا دینے میں کیا حرج ہے۔
اچھا بڑی چالاک ہو۔ یعنی کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہے اور ظاہر ایسا کر رہی تھیں کہ کچھ جانتی ہی نہیں۔ اچھا خیر اور
ابھی چپکے سے مجھے تو بتا دو۔" کوثر کی بات پر نازو ایک دم ہی کھل کر بولی۔
"اچھا چلیں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ لڑکی کا نام سلوط ہے اور بھائی جان لو زہرا سے لوٹ را سے بہت چاہتے ہیں۔"
اور ہمیں انکشاف پر نازو کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ کیونکہ بڑی دیر تک اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ کوثر خود ہی کہتی رہی۔
"ویسے سلوط آپا ہیں بھی بہت ڈیزروِنگ اور کتنی خوبصورت بھی ہیں۔ بھائی جان کی چوائس بڑی اچھی ہے نا اس
لیے انہوں نے۔" مگر نازو سے کچھ بھی سنا نہیں گیا۔ اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلوط کا نام سن کر اس کی ساری خوشی پھیکی پڑ گئی تھی اور ساری چونچالی رخصت ہو گئی تھی اور اسے سخت تعجب کے ساتھ
ساتھ کوفت بھی ہو رہی تھی۔ اور ابھی ابھی کوثر نے جو کچھ کہا تھا کہ ہی لو زہرا سے لوٹ اس پر تو وہ کسی طرح یقین
کر لینے پر تیار ہی نہ تھی لیکن بھی اسے سلوط کے بارے میں ماں نے بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ مگر اس وقت سب کچھ بھول کر اسے
صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ اس کا بھائی سلوط سے شادی کر رہا ہے۔ جب کہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس کے بھائی نے کسی بہت
ہی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہو گا۔
کسی بہت ہی دولت مند اور ایڈوانس لڑکی کا انتخاب کیا ہو گا۔
مگر وہاں تو وہی مثل ہو گئی تھی کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ کہ پہاڑ کھودنے کا کام بھی آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ پہاڑ
کھودتے وقت جیسے توانائی صرف کرنے میں انسان کے جسم کا تیل نکل جاتا ہے بس کچھ اسی طرح بھائی کے اس معاملے میں
اگرچہ نازو نے توانائی صرف نہیں کی تھی لیکن بھائی کی شادی کا یہ معاملہ عرصے سے اس کے اور اس کی ماں کے لیے ایک پرابلم
بنا ہوا تھا۔ اور اتنے دن بعد اس پرابلم کا حل بھی اس کے ہاتھ آیا تھا تو جیسے چھوت کی بیماری کی صورت میں۔
بہرکیف۔ کچھ دیر تک تو وہ وہیں پیر لٹکائے فون کے پاس بیڈ پر ہی ساکت اور صامت سی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر
کمرے سے باہر نکل آئی۔ گو ماں کو یہ خبر سنا کر ان کی خوشیوں میں تلخیاں گھولنی نہیں چاہتی تھی۔ کہ اسے معلوم تھا کہ ماں یہ
بات بالکل برداشت نہیں کر سکیں گی لیکن پھر بھی۔ بتانا تو ضروری ہی تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو دیکھا۔ ماں سامنے ہی
کھڑی سلوط سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ اور اس سمے چونکہ اسے سلوط کی شکل دیکھنی ہی کیا اس کا تصور تک گوارا نہ تھا اس لیے اس
نے وہیں کھڑے کھڑے ماں کو پکار کر کہا۔
"ممی جلدی آئیے آپ کا فون آیا ہے۔" اور پھر پلٹ کر کمرے میں چلی آئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ماں کمرے میں داخل ہوئیں تو
ریسیور کو کریڈل پر رکھا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔
"ہائیں تم نے ریسیور بھی رکھ دیا۔ کس کا فون تھا۔" تو بیٹی نے نگاہیں نیچی کیے کیے کہا۔
"کسی کا نہیں۔ میں نے خود کوثر کو فون کیا تھا۔"
"اچھا تو کیا وہ لوگ گھر میں ہی موجود ہیں۔"
"نہیں بلکہ دادو گئے ہوئے تھے زمینوں کی خریداری کے سلسلے میں۔ ابھی صبح کو واپس لوٹے ہیں۔"
"اچھا پھر۔ کیا تم نے کوثر سے پوچھا۔"
"جی ہاں پوچھ لیا ہے" نازو نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔ زینت نے تو کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ بیٹی کا
چہرہ کچھ اترا اترا سا ہے۔ اور لب و لہجہ بھی بدلا بدلا سا۔ اس کے جواب دینے کے انداز پر انہوں نے بیٹی کی طرف
غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں خیر تو ہے۔ یہ تمہارے موڈ کو ایکدم ہی کیا ہو گیا ہے۔ اور کوثر نے آخر تمہیں کیا بتایا۔" اور تب تھوڑی
دیر خاموش رہنے ـــــ کے بعد نازو نے بہت جھجکتے ہوئے کہا۔
"جو کچھ کوثر نے بتایا ہے اسے آپ برداشت نہیں کر سکیں گی۔" اور چونکہ زینت کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا اس
لیے وہ بیٹی کے پہیلیاں بجھوانے پر تنرخ کر بولیں۔

”اے تو ایسی کیا نرالی بات ہے جو میری برداشت سے باہر ہو گئی بابا نے تو اگر کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو بھی
پسند کیا ہوگا تو ہماری مجال نہیں ہو گی کہ ان کی مخالفت کر سکیں۔“

”لیکن کاش انہوں نے کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو ہی پسند کر لیا ہوتا ممی۔“ نازو نے کہا تو زینت اس کی بات پر
کر بولیں۔

”آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو نازو۔ یا پھر نیلیا کی طرح مجھے بھی سرپرائز دینا چاہ رہی ہو۔“ زینت نے غور سے اس
کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیجیے میں بھلا آپ سے مذاق کروں گی ممی۔ میں تو اس وقت اپنے اندر اتنی ہمت ہی نہیں پا رہی کہ اصل بات
آپ کو بتا سکوں۔“

”مگر آخر ایسی کیا بات ہے۔ کچھ بتاؤ تو مجھے پتا تو چلے۔“ زینت زچ ہو کر بولیں۔

”بات ساری یہ ہے کہ بھائی جان نے اپنی لائف پارٹنر کے طور پر سلوط کو پسند کیا ہے۔“

اور سلوط کا نام سن کر زینت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی انہوں نے تعجب سے ہیں کہنا چاہا لیکن آواز
حلق میں ہی کہیں اٹک گئی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر پھر انہوں نے جلد ہی اپنی اس شوکڈ زدہ سی کیفیت پر قابو پا کر کہا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوثر نے یونہی اپنی فوقیت جتانے کو بڑ ہانکی ہو۔ یوں بھی وہ ابھی بچی ہی ہے۔ اس کی بات کا
کیا اعتبار۔“

”وہ بچی نہیں آزاد فضاؤں کی پروردہ وہ بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ اور پھر ممی اس نے کچھ دیکھا ہو گا تبھی تو کہہ بھی دیا معلوم ہو
کہہ رہی تھی کہ بھائی جان سلوط کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ اور بھائی جان کے بارے میں وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کہہ ہی نہیں
سکتی۔“ نازو نے کہا تو زینت چپ ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں میں معاً وہ سب کچھ گھوم گیا جسے محسوس
کرنے کے باوجود بھی وہ لاپروائی اور غفلت میں اڑاتی رہی تھیں۔

وہ اسفند کا سلوط پر اتنا مہربان ہونا۔

موقع پاتے ہی اس سے تنہائی میں کھڑے ہو کر باتیں کرتا۔ چاند رات کی شب کو بھی وہ بیٹے کو سلوط سے بے تکلفی سے
باتیں کرتا دیکھ کر چونک سی گئی تھیں۔ مگر پھر انہوں نے یہ سوچ کر اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ آخر وہ فاخرہ کی
نند ہے اور ان کے گھر کی مہمان۔ اس لیے بیٹا اگر اس سے اخلاق و مروت سے بات کر لیتا ہے تو اس میں ان کا کیا گھٹ جاتا
ہے۔

وہ تو اور بھی بہت سی بری طرح دل پر گراں گزرتی باتوں سے ہمیشہ چشم پوشی ہی سے کام لیتی رہی تھیں۔

مگر اب انہیں ایک ایک بات یاد آتی جا رہی تھی۔ خاص طور پر پکنک پر دونوں کا تنہائی میں یکجا ہونا۔ اور اس کے
علاوہ بھی بہت کچھ۔ اور وہ جتنا یاد کرتی اور سوچتی جا رہی تھیں انہیں اتنی قدر سلوط پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ ان کے خیال میں
سارا قصور اور فطور اسی کا تھا۔

اسی نے اپنی خوبصورتی اور مسکینی بلکہ اپنی مظلومیت دکھا کر ان کے خوبصورت جوان کماؤ اور خاصی بڑی املاک کے مالک
بیٹے کو بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔

کیونکہ اس نے بابا کو پرچایا ہو گا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی ہو گی۔

بلکہ ان کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش، تبھی تو بابا اتنی آسانی سے اس کے دام میں آ گئے۔ اور ایک طرح
سے وہ بابا کو بے وقوف بھی بناتی رہی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے بابا کو کچھ بھی نہیں بتایا۔
کیسی چلتر اور مکار لڑکی ہے۔ اور بدچلن بھی۔ تب ہی تو بابا کو اپنا دیوانہ بنا کر انہیں بھی گمراہی میں ڈال دینا چاہتی تھی۔
زینت پیچ و تاب کھاتی ہوئی سوچتی رہیں۔

سب سے زیادہ غصہ تو انہیں اس بات پر آ رہا تھا کہ جب اسے معلوم تھا کہ وہ کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہے تو اس
نے یہ بات اسفند سے کیوں چھپائی۔ واہ کیا خوب صلہ دیا تھا اس نے ان کے احسانات کا ان کے اپنے گھر میں پناہ دینے

بنا کر رکھنے کا۔

ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے چوٹی سے پکڑ کر کچن سے باہر لائیں اور سب کے سامنے اسے خوب ذلیل و خوار کریں۔
کسی بھی حالت میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھیں یا پھر دوسرے معنوں میں عمل درآمد نہیں کر سکتی تھیں۔
کیونکہ پھر وہی نند کی نند کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔
خود اسفند کے سامنے سلوط کا کچا چٹھا کھول کر رکھ سکتی تھیں۔ کہ سلوط سے ان کا رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ اور پھر
بیٹے کو صرف یہ بتاتیں کہ سلوط فریبی اور مکار ہے اور تمہیں دھوکا دے رہی ہے تو اس کے لیے بھی انہیں بڑی
خواریوں سے گزرنا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے سوچا وہ یہ بات بہت ترکیب اور قاعدے سے بیٹے تک پہنچائیں گی اور
اس وقت پہنچائیں گی جب ان کے شوہر بھی وہاں موجود ہوں گے۔

پھر پورے دو روز لیے تھے انہوں نے بابا شرافت سے سلوط کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے میں۔ اور
یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ دو تین روز بعد ہی ایک دن، جب وہ رات کے کھانے پر موجود تھا تو کھانا کھانے کے دوران
ان کے اشارے سے نیلوفر اور نیلما کو پینٹری میں بھیج کر تھوڑی دیر بعد نازو نے گویا بات کی ابتدا کی۔

”ممی اب تو بہت دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں رہتے۔ احمد بھی سخت بور ہوتے ہیں میرے بغیر اور پھر امی جان اور باجی تو
پوتے کو ساتھ رکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ اب آپ مجھے گھر جانے کی اجازت ہی دے دیجیے۔“

”ارے بیٹی تو چلی جاؤ۔ اتنی لمبی چوڑی تفصیل اور تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کے بعد والدین کا گھر تو لڑکی کے لیے
سرائے خانہ ہی بن جاتا ہے۔ اور تمہارا قیام واقعی کچھ لمبا ہو گیا ہے۔“ شعیب منصور نے ہنس کر کہا تو نازو نے ماں کی طرف
کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ لیجیے دیکھیے یہ ڈیڈی بھلا کیا کہہ رہے ہیں۔ زینت فوراً ہی جلے کٹے انداز میں
بولیں

”ان کی باتوں پر نہ جاؤ یہ تمہارے ڈیڈی تو ایسی ہی بے موقع بولتے ہیں اب تو تم بابا کی شادی کی تیاریاں کرو۔
یہ شادی کرنے پہ رضامند ہو گئے ہیں۔“

”اچھا کیا واقعی بھائی جان۔ پھر تو ہماری پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہی پڑا نظر آئے گا۔“ نازو یوں خوش ہو کر
بولی جیسے اس نے پہلی بار یہ خوشخبری سنی ہو۔

”ہاں بیٹی خدا تمہیں بھائی کی شادی کی خوشیاں مبارک کرے بس ابھی سے تیاری شروع کر دیں اس نیک کام میں دیر
نہیں کرنا چاہتی۔“ زینت بولیں۔

”لو یہی مثل ہو گئی کہ مدعی سست اور گواہ چست۔ جس کا معاملہ ہے وہ تو منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے ہیں۔“ شعیب منصور
نے نہایت خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے بیٹے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

”اب آپ بزرگوں کی موجودگی میں میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”جی ہاں جی ہاں ممی! بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ان کا کام تو اب خاموش بیٹھ کر ہماری کارکردگی کو دیکھنا ہو گا
مگر ممی پلیز بہت دھوم دھام سے ہونی چاہیے بھائی جان کی شادی۔ سچ پوری زندگی کا یہی ایک واحد ارمان ہے۔“ نازو
نے کہا تو اس کے آخری فقرے پر شعیب منصور ہنسنے لگے۔ اسفند بھی مسکرانے لگا۔

”ہاں بھئی کیوں نہیں کریں گے دھوم دھام سے اللہ آمین کا ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اب
روز روز تو ہونے کی نہیں اس کی شادی۔“ زینت بولیں تو ان کے روز روز تو ہو گی نہیں اس کی شادی کہنے پہ سب کو ہنسی آ گئی۔

”خیر ممی میں تو ابھی جا کر مہمانوں کی لسٹ تیار کرتی ہوں۔ اور ہاں ٹاپ پہ پھپھو بیگم اور پھوپھا جان کا نام رکھوں گی۔
بیچارے پھوپھا جان تو ہر بار تو چلے گئے لیکن میری شادی میں آنے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی مگر اب پھپھو بیگم کے آئے بغیر شادی
ہو گی نہیں۔“ نازو نے کہا۔

”نہیں بیٹی ایسا نہ کہو۔ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ورنہ فاخرہ جی تو تمہاری شادی میں سب سے پہلے یہاں
موجود ہوتیں۔“ شعیب منصور بولے۔

”خیر مجبوریاں تو ہوتی ہیں مگر ان کی خواہ مخواہ کی مجبوریوں میں یہ بیچاری سلوط بلاوجہ ہی ماری گئی۔“ زینت ہاتھ چلا کر

بولیں۔

"کیوں کیوں سلوط بچاری کیوں ماری گئیں اچھی بھلی تو گزر بسر کر رہی ہیں ہمارے ساتھ" نازو نے پوچھا۔

"اے صرف گزر بسر کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں گزر بسر کرنا چاہے تو انسان فٹ پاتھ پر بھی کر سکتا ہے مگر اپنے ہوں بات کچھ اور ہی ہوتی ہے اور یہ آخر سلوط کب تک یہاں بیٹھی رہے گی" زینت نے کہا تو شعیب منصور جو اس حد تک سارے حالات سے واقف نہیں تھے ذرا اونچی آواز میں بولے۔

"بیگم یہ آپ کیسی بے موقع باتیں کر رہی ہیں جب کہ بات ہو رہی تھی سنی کی شادی کی"

"بس کچھ ایک دم ہی سلوط کے ٹھکانے سے بے ٹھکانہ ہونے کا خیال آگیا۔ اور ثاقب بھائی سب سے بڑی غلطی یہ کر چکے ہیں کہ اس کے شوہر کے ڈر سے اسے یہاں بھیج دیا ہے اور اس سے بڑی غلطی آپ یہ کر رہے ہیں کہ کسی کی جائز بیوی کو چھپا کر آپ نے اپنے گھر میں رکھ رکھا ہے۔ بھئی برا ماننے کی بات نہیں غلطی اصل میں سلوط کی ہی ہے جو وہ اپنے لیے چنے شوہر اور گھر پر لات مار کر بھائی کے گھر چلی آئی تھیں۔ جب کہ درانی لکھ پتی نہیں کروڑ پتی ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ عمر میں سلوط سے دگنا ہے اور سلوط نے اسی وجہ سے اسے چھوڑا ہے۔ اور یہ تو آپ کی عزت کے لیے بھی خطرے کی بات ہے میرا مطلب ہے جب اس نے سلوط کو حاصل کرنے کے لیے ثاقب بھائی کے یہاں غنڈے کروائے تھے تو وہ یہاں بھی کروا سکتا ہے یا پھر قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے کہ آپ نے اس کی بیوی کو اس کی بلا اجازت اپنے پاس رکھ رکھا ہے" زینت شوہر سے ڈرنے کے باوجود بیٹے کو سنانے کی غرض سے ساری باتیں کہہ گئیں اور بیٹا جو اس لمحے ایک زخمی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی حالت نازک تھی اور اپنی شادی سے متعلق ماں اور بہن کی گفتگو پر بھی کان نہیں دھر رہا تھا ماں کے منہ سے سلوط کا نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور جب اس نے ماں کی زبانی سنا کہ سلوط شادی شدہ ہے اور اپنے کروڑ پتی شوہر کو صرف اس لیے چھوڑے بیٹھی ہے کہ وہ ادھیڑ عمر کا ہے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کھولتا ہوا لاوا۔ اس کے جسم کے آتش فشاں سے اچانک بہہ نکلا ہو۔

ہاں وہ ایک آگ ہی تھی۔ ایک بھڑکتی ہوئی۔

ہر شے کو پھونکتی ہوئی آگ۔

جو یک لخت اس کے اندر ہی کہیں بھڑکی تھی۔

اور جس سے اس کا خون جوش کھا کھا کر ابال کی صورت میں سر کی طرف آ رہا تھا۔

اور اس اوپر چڑھتے ابال کے زور میں وہ اچانک پلیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور شعیب منصور جو بیوی کی باتوں کے جواب میں کچھ کہنے والے تھے۔

"ہائے سنی۔ کیا بات ہے" انہوں نے اس کے متغیر ہوتے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

"نتھنگ" جواب میں اس نے پتھر سے برسائے اور سب کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

اف یہ کیسی آگ بھڑکی تھی ایکدم

جوش کھاتے خون میں کیسا ابال آ رہا تھا۔

کہ آنکھوں کے آگے بھی خون کی چادر سی تن گئی تھی۔

اور سر پر بھی خون سوار ہو گیا۔

اس لیے اس کا ہر احساس مٹ گیا تھا۔

ماسوا ہر شے کو فنا کر دینے کے احساس کے۔ اف اتنا بڑا دھوکا۔ اتنا بڑا فریب وہ بھی تم نے کھایا ہے اسفند" وہ اپنے جبڑوں کو بری طرح بھینچ رہا تھا۔

اس کی نظریں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں پر تھیں۔ جن پر نظریں جمائے اور بڑی سختی سے کھول اور بند کر رہا تھا پھر کچھ اسی پوزیشن میں وہ اخروٹ کی لکڑی کے خوبصورت چیسٹ کی طرف بڑھا۔ دراز کھولی اور اس میں رکھے اپنے شفاف چمکتے ہوئے ریوالور پر گرفت جما دی۔

کچھ دیر چہرہ نیچا کیے ریوالور کو دیکھتا کچھ سوچتا رہا۔

پھر یک لخت ریوالور اٹھا کر دراز بند کی اور بڑے بے ڈھب انداز میں قدم اٹھاتا۔ اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسفند نے ریوالور ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ کریم جو خاصی تیز رفتار میں اس کے کمرے کی طرف آ رہا تھا اسے دیکھتے ہی بولا۔

"بابا صاحب! ہسپتال سے ڈاکٹر قمر کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ابھی آپ کو بلایا تھا۔ بول رہے تھے کہ جلکھی لڑکے کی حالت خراب ہے۔ میں نے تو ان سے بولا تھا کہ ٹھہریں بابا صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔ پر وہ بہت جلدی میں تھے میری بات بھی نہیں سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔" اتنا کہہ کر کریم جہاں تک آیا تھا وہیں سے پلٹ گیا۔

ہر چند کہ اس سمے وہ انتہائی غضب اور اشتعال کے عالم میں تھا بلکہ اس کے سر پہ خون سوار تھا۔ حتیٰ کہ ہر احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ اور بس اس کے ذہن میں تو ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

اس کے سر پہ تو ایک ہی دھن سوار تھی۔

دھوکے باز، بے وفا اور ہرجائی سلوط کو فنا کر دینے کی دُھن۔

اس کے سینے میں اپنے ریوالور کی ساری گولیاں اتار دینے کی خواہش۔

لیکن ایسے خطرناک موقع پر اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی کریم نے اندر کہیں سے وارد ہو کر اس سے کچھ کہا تھا اور اس کہنے کی کیفیت کچھ یوں تھی جیسے کوئی شخص خدشات سے پُر کوئی مہم سر کرنے جا رہا ہو اور اسے خطرات میں گھرا دیکھ کر اس کا کوئی دوست، کوئی بھی خواہ اسے با آواز بلند یعنی چلا کر اس خطرے سے خبردار کر دے۔ تو وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کی دُھن میں اس کی آواز تو سن لیتا ہے مگر اس کی بات کا مفہوم بعد میں ہی سمجھتا ہے۔ تو یہی کیفیت کچھ اسفند کی بھی ہوئی تھی کریم نے اچانک وارد ہو کر اسے فون کے آنے کی اطلاع دی تھی اور اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر قمر کا پیغام بھی سنا دیا تھا۔ لیکن چونکہ غیض و غضب نے اس کے ہوش و حواس گم کر رکھے تھے اس لیے وہ صرف کریم کی آواز ہی سن سکا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس نے کریم کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تک نہ تھا۔ بلکہ سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔

مگر جب اسے پیغام دے کر واپس چلا گیا تو۔ وہ جس کے بڑھتے ہوئے قدم کریم کے آ جانے کی وجہ سے رک گئے

کہے الفاظ کوئی مقصد ظاہر کیے بغیر اس کی سماعت میں گونج رہے تھے۔ کریم کے جانے کے بعد ایک دم ہی معنویت واضح ہوتے چلے گئے اور پھر سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

اور جب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا تو وہ یوں چونکا تھا جیسے بلندی سے گرتی ہوئی کوئی شے عین سر پہ آ گئی ہو تو انسان چونک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی باہر کا رُخ کرنے کے بجائے اُلٹے پیروں اندر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

اصل میں سارا دن وہ اور اس کے ساتھی دوسرے ڈاکٹرز ایک جواں سال کالج اسٹوڈنٹ کی جو بس کے حادثے میں شدید زخمی ہو کر بڑی مخدوش حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا جان بچانے کی ان تھک کوششیں کرتے رہے تھے۔ اور اس کیس کا ایک المیہ پہلو یہ بھی تھا کہ وہ لڑکا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور لڑکے کی ماں بیوہ اور مفلوک الحال تھی اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ڈاکٹروں کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ کسی طرح لڑکے کی جان بچالیں۔ اس کی منتوں اور گریہ وزاری نے اسفند کے دل پہ گہرا اثر کیا تھا اور اس کو لڑکے پر اتنی زیادہ توجہ دیتے دیکھ کر اس کے دوسرے کولیگ بھی لڑکے کی جان بچانے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ لڑکے کی ماں غریب اور نادار تھی اسی لیے لڑکے کو جو چار خون کی بوتلیں چڑھائی گئی تھیں ان کی قیمت بھی اسفند نے اپنی جیب سے ادا کی تھی اور شام کو گھر آتے وقت اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر قمر کو تاکید کر کے آیا تھا کہ جونہی لڑکے کی حالت بگڑے فوراً فون کر کے مجھے گھر سے بلا لینا۔

اسی لیے وہ سب کچھ بھول کر یا پھر سلوط کو شوٹ کرنے کے ارادے کو فی الوقت ترک کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ گو اس کی کیفیت میں اب وہ اشتعال انگیزی باقی نہیں رہی تھی جو انسان کو ہر احساس سے بیگانہ اور اندھا کر دیتی ہے مگر غصہ جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ چیسٹ کے نزدیک کھڑا ہو کر تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر ریوالور کو چیسٹ کی دراز میں رکھ کر الماری کھولی اور ہینگر پر لٹکا سفید اوورآل پہن کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی الماری کی چابی اُٹھاتا ہوا تیر کی طرح اپنے کمرے سے نکل گیا۔

زینت اور نازو بابا شرافت سے سلوط کا سارا کچا چٹھا معلوم کرنے کے بعد کئی روز سے اس تاک میں تھیں کہ کسی طرح جلد از جلد شعیب منصور اور اسفند پر سلوط کی اصلیت ظاہر کرنے کا موقع ان کے ہاتھ آ جائے۔

گو بابا شرافت نے انہیں سلوط کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس میں مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی زیادہ تھی اور حقیقت آمیزی کم پھر بھی دونوں ماں بیٹیاں۔ بابا شرافت کی زبانی سنی ہوئی باتوں کو حدیث کا لکھا سمجھ بیٹھی تھیں۔ اور اگر نہ بھی سمجھتیں تب بھی اسفند کی ماں بہن اور بہی خواہ تھیں اور اسفند کو حقیقت سے آگاہ کرنا ان کا فرض بنتا تھا۔ اور وہ موقع ایک نحس شب کو بالآخر ان کے ہاتھ آ گیا تھا اور انہوں نے جو آگ لگائی تھی اس کے ردِعمل میں بیٹے کے کھانا چھوڑ کر غضبناک سی کیفیت میں اُٹھ کر چلے جانے پر وہ صاف سمجھ گئی تھیں کہ اب سلوط کی خیر نہیں۔ سلوط کا پول کھول کر وہ ہلکی پھلکی تو ہو گئی تھیں مگر ایک عجیب سی بے چینی نے انہیں آ گھیرا تھا۔

وہ شوہر کے کھانا ختم کر کے اُٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں جب کہ شعیب ان کے ارادوں سے قطعاً لاعلم تھے۔ بیٹا ایک تو کئی روز بعد کھانے کی میز پر نظر آیا تھا دوسرے بالکل لاتعلق اور گم صم سا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس پر ایک دم ہی جو بلا کچھ کہے سنے اُٹھ کر گیا تو انہوں نے متحیر سے لہجے میں بیوی سے پوچھا۔

"یہ اسفند کا موڈ کبھی تولہ کبھی ماشہ کیوں ہو رہا ہے آج کل۔ جب کہ ذکر تو سلوط کا ہو رہا تھا پھر وہ کیوں اُٹھ کر چلے گئے ایک دم؟"

"سلوط کے ذکر سے ان کا کیا تعلق۔ وہ اصل میں آج کل ایک بہت ہی سیریس کیس آیا ہوا ہے ان کے پاس ایک نوجوان لڑکا جس کی حالت بہت مخدوش ہے بس اسی کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو سارا سارا وقت ہسپتال میں رہتے ہیں۔"

زینت بڑی خوبصورتی سے سلوط کے ذکر کو ٹالتی ہوئی بولیں۔

"اچھا کیا لڑکا اسفند کا کوئی واقف کار ہے یا پھر کسی بگ شاٹ کی اولاد ہے جو اس پر اپنی جان مار رہے ہیں۔" شعیب منصور نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ہے شاید کچھ ایسی ہی بات۔"

"ہاں ورنہ غریب غربا بے چاروں کو تو آج کل کے ڈاکٹرز مہنگی دواؤں کی لمبی چوڑی فہرست اور بلز کی مار مار کر بلا علاج مار ڈالتے ہیں۔" شعیب منصور طنزیہ انداز میں ہنس کر بولے۔

"نہیں خیر۔ کم از کم بابا ان لالچی اور خود غرض ڈاکٹروں میں سے نہیں ہیں۔" زینت نے بیزار کن لہجے میں کہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے بولیں۔

"تم نے اگر کھانا کھا لیا ہے تو جا کر بچے کو دیکھو۔ سلوط بھی تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ اگر انہوں نے پہلے ... لیا تھا پھر بھی کہاں تک بچے کو سنبھالیں گی۔"

تو نازو باپ سے معذرت کر کے فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ زینت بھی جیسے ... کچھ دیر بعد شعیب منصور کھانا ختم کر کے اٹھے تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور کریم سے برتن اٹھانے اور میز صاف کرنے کا ... سیدھی نازو کے کمرے میں آ گئیں۔

"کیا سلوط چلی گئی؟" انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر نازو سے پوچھا جو بچے کے پنگھوڑے کے قریب ... پر بیٹھی سوتے ہوئے بچے کو ممتا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ماں کے سوال پر اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بولی۔

"جی ہاں۔ وہ تو اسی وقت چلی گئی تھیں۔"

"تب پھر آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں کہ کہیں سچ مچ بابا اس کی شامت بلانے تو نہیں گئے۔"

تو ماں کو سلوط کے معاملے میں اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر نازو نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تو کیا کچھ ایسے بھی امکانات ہیں۔"

"ہاں۔ ہو تو سکتے ہیں۔ کیونکہ تم نے نوٹ نہیں کیا تھا کہ سلوط کی قلعی کھل جانے پر بابا کے تیور کتنے خطرناک ہو رہے تھے کہ انہوں نے ادب رکھا نہ لحاظ اور باپ کی موجودگی میں ہی بلا کہے سنے میز سے اٹھ گئے۔"

"ہاں تو شاک بھی تو زبردست پہنچا ہو گا۔ سلوط کے بارے میں اپنی توقعات کے خلاف باتیں سن کر۔ مگر ہم بھی کیا کرتے ... آنکھوں دیکھی مکھی تو اپنے بھائی کے منہ میں نہیں ڈال سکتے تھے۔"

"اے منہ میں ڈالنی کیسی ۔۔ وہاں تو کسی طور پر سلوط سے شادی ہی ممکن نہیں ہوتی۔ بھلا شادی شدہ عورت کی دوسری شادی بھی کہیں ہوتے سنی ہے۔" زینت بولیں۔

"جی ہاں۔ اگر یہ مسئلہ درمیان میں حائل نہ ہو جاتا تو پھر مجھے بھی اپنے بھائی کے انتخاب کے بارے میں غور کرنا پڑتا۔" نازو نے ہنس کر کہا اور ماں کے ساتھ ہو لی۔ پھر دونوں ماں بیٹیاں ۔ نازو کے غسل خانے کے عقبی سمت کھلنے والے ... سے نکل کر چوروں کی طرح بے آواز قدموں سے چلتی۔ سلوط کے کمرے کی اس کھڑکی کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئیں جو عقبی سمت ... ہی بنی ہوئی تھی۔

اس روز چونکہ اسفند سر شام ہی گھر لوٹ آیا تھا اور اس نے آتے ہی ماں سے کہہ دیا تھا کہ اسے دو راتیں مسلسل جاگ کر گزارنی پڑی ہیں اس لیے وہ نیند اور تھکن سے نڈھال ہو رہا ہے۔ آج ذرا جلدی کھانا لگ جانا چاہیے۔ نیز۔ اگر رات کو کسی وقت بھی ہاسپٹل سے اس کا فون آئے تو اسے فوراً جگا دیا جائے۔ کیونکہ ایک بیوہ اور نادار عورت کے اکلوتے اور جوان لڑکے کو جس کا حادثہ پیش آ گیا ہے اور اس کی حالت بہت مخدوش ہے وہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹر لڑکے کی جان بچانے کی ... کر رہے ہیں۔ وہاں بھی کہہ آیا ہے کہ کوئی خطرہ دیکھیں تو فوراً اسے بلا لیں۔ کیونکہ یہ کیس اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ تو یہ سن کر کر بیٹا رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھائے گا ان کی باچھیں ہی کھل گئی تھیں۔

مگر اب اصل مسئلہ تو سلوط کو کھانے کی میز سے غائب کر دینے کا تھا کیونکہ اس کی موجودگی میں تو بات بننے کے بجائے ... تھی۔ مگر قدرت جب انسان کے کسی ارادے کی تکمیل میں اس کا ساتھ دیتی ہے تو حالات خود بخود ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں ... کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

حسن اتفاق سے اس وقت جب کریم میز پر کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آیا تھا سلوط بھی نازو کے کمرے میں ہی ... اور اتفاق سے اس وقت نازو کا بچہ بھی جاگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ اس کے سونے کا وقت تھا۔ لیکن چونکہ نازو کو ... کمرے میں پہنچنے کی جلدی پڑی تھی اس لیے وہ ڈھنگ سے سلا نہیں سکی تھی۔ اور اب اسے گود میں لٹائے اسی غرض سے تھپکے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح سو جائے۔ آخر جب بچہ کسی طرح سویا ہی نہیں اور رونے ہی لگا تو اس نے ماں سے کہا۔

"ممی! آپ سلوط کو لے کر چلی جائیے۔ ڈیڈی اگر میز پر آ گئے ہوں گے تو آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر ... سلا کر آ جاؤں گی۔"

"نہیں، تم اسے میری گود میں دے دو۔ اور جا کر کھانا کھاؤ۔ آج اتنے دن بعد تو اسفند خیر سے ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔"

زینت نے بچے کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھابی جان اسے میری گود میں دے دیجیے۔ میں اسے ٹہلا ٹہلا کر ابھی سلا دوں گی۔ آپ بے فکر ہو کر چلی جائیے۔" پھر وہ نازو سے مخاطب ہو کر بولی۔

"لاؤ نازو۔ بچے کو میری گود میں دے دو اور تم جا کر کھانا کھاؤ۔ تمہارا یہ ڈیلیوری پیریڈ ہے۔ تمہیں تو وقت پر کھانا کھانا چاہیے اور آج یوں بھی دیر ہو گئی ہے۔" اس نے جھک کر بچے کو نازو کی گود سے اٹھا لیا اور بیٹی نے ماں کی طرف ایک منافقانہ سی مسکراہٹ اچھالی اور یوں ظاہر کیا جیسے بچے کو گود میں دیتے ہوئے اب بھی ہچکچا رہی ہو۔

"مگر یہ کچھ اچھا تو نہیں لگے گا کہ ہم وہاں ٹھاٹھ سے کھانا کھاتے رہیں اور یہاں تم اس ننھے سے شیطان کی ناز برداریوں میں لگی رہو۔ یہ ... کے لاڈ پیار کی وجہ سے ابھی سے بہت نخریلا ہو گیا ہے۔" نازو نے اسی منافقانہ مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں تو ہے بھی تو نخرہ کرنے کے لائق۔ ماشاءاللہ ابھی سے اتنا پیارا ہے اور میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں جو تمہارے ساتھ کھانا نہ کھانے کی وجہ سے برا مان جاؤں گی۔ مجھے تو ویسے بھی آج بالکل بھوک نہیں۔ سہ پہر کو چائے کے ساتھ جو تھوڑے سے اسنیکس کھائے تھے وہ اب تک سینے پر رکھے ہیں میرا تو آج کھانا کھانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔"

سلوط اپنی فطری رواداری اور انکساری سے کام لے کر بولی۔

"ہاں بھئی سلوط بھی تو گھر کی ایک فرد ہی ہیں مگر مجھے بھی یہ مناسب نہیں لگ رہا کہ انہیں یہاں بچے کی چوکسی کے لیے چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن اب یہ اتنی مصر ہی ہیں تو تم چلی ہی چلو۔ تمہارے ڈیڈی میرے بغیر نوالہ نہیں توڑیں گے۔" آخری فقرہ زینت نے عجلت دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ تو نازو اٹھ کر ماں کے ساتھ ہو لی۔

اور سلوط دیر تک بچے کو گود میں لے کر ٹہلتی رہی۔ اور جب وہ گہری نیند سو گیا تو اسے پالنے میں لٹا کر آہستہ آہستہ پالنے کو جھوٹے دیتی اور نازو کے آنے کا انتظار کرتی رہی کہ بچے کو تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔

پھر جب کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ بھائی کو ورغلانے اور بھڑکانے کے بعد نازو واپس آئی تو اس کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ سکی۔

وہ کھانا کھانے سے تو پہلے ہی انکار کر چکی تھی کہ واقعی سہ پہر کا کھانا اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے طبیعت پر گرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ جلدی سے بستر پر پڑ کر سو جانا چاہتی تھی۔

اور اس نے بستر پر جھکی تو ایسے ... رہی تھی کہ دفعتاً کمرے کے بھڑے ہوئے دروازے پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی اور دونوں پٹ دھاڑ سے کھل گئے۔ اور بستر پر جھکی سلوط بری طرح ڈر کر اچھلی اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تبھی وہ بپھری ہوئی حالت میں دندناتا اور پھنکارتا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے سے ایک غضبناک سی کیفیت منشرح تھی اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے خونخوار تیور دیکھ کر سلوط پوری جان سے لرز اٹھی۔

"شکر کرو دھتکار زدہ لڑکی۔ قیصر نے میرے ارادوں میں خلل نہ ڈال دیا ہوتا تو اس وقت میرے ریوالور کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں پیوست ہوتیں۔ مگر گولیوں سے زیادہ میں گالیوں کے ذریعے تمہیں روحانی موت تو مار سکتا ہوں تاکہ تم زندہ رہنے کے قابل نہ رہو۔"

وہ اپنے کرخت اور سخت لہجے میں زمانے بھر کی نفرت اور حقارت سمو کر بولا۔ اور وہ جو غیظ و غضب کے عالم میں کی باتیں سن کر کچھ کچھ تو معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی، اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود جی کڑا کر کے بولی۔

"آپ اپنے ہوش میں تو ہیں۔ یہ کس انداز میں بات کر رہے ہیں۔ کیا سمجھ رکھا ہے آخر آپ نے مجھ کو؟"
اصل میں اسے بھی اسفند کے اس قدر اہانت آمیز طریقے سے بات کرنے پر غصہ آ گیا تھا اور اس غصے نے ہی اسے کچھ
کہنے کا حوصلہ دیا تھا۔ مگر جواب میں تو وہ کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔
"محض ایک مکار اور دھوکے باز لڑکی، جو اپنے غلیظ اور ناپاک وجود پر معصومیت اور شرافت کا خول چڑھائے
ایک برس تک میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی۔ مجھے احمق بناتی رہی۔ لیکن اب میں مزید بے وقوف نہیں بنوں گا۔
تمہاری کرم خوردہ کھوکھلی اصلیت مجھ پر کھل چکی ہے۔"
اب تو جو کچھ وہ سمجھ رہی تھی وہ درست ہی نکلا تھا۔ اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔
"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم شرافت اور مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہی تھیں کیونکہ تمہیں
اپنی خوبصورتی اور جوانی پر بڑا ناز ہے۔ جبھی تو تم نے اپنی فطری تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے اپنے شریف اور بوڑھے
شوہر کو چھوڑ کر مجھے تاکا تھا۔ تم اتنی ہرجائی اور گمراہ کن بھی ہو سکتی ہو مجھے تو گمان تک نہ تھا۔ میں تو تمہیں مقدس
من کھلا ایسا پھول سمجھتا تھا جو شبنم کا غسل لے کر رات کی تاریکیوں میں کھلتا ہے اور جسے کوئی انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔
مگر تم تو کیچڑ اور غلاظت میں کھلنے والا ایسا پھول ثابت ہوئیں جس کا رنگ، تازگی اور خوشبو۔ سبھی کثافتوں میں
میں بدل جاتا ہے اور تم وہی تعفن زدہ عفریت ہو۔ بدکردار اور بدچلن اور۔" اُف وہ کتنا آگے بڑھ گیا تھا۔ حد سے تجاوز
کر گیا تھا۔

اور کہہ بھی کیا رہا تھا کہ شرم اور ندامت سے کٹتی سلوط کی برداشت جواب دے گئی۔
"اپنی زبان کو لگام دیجیے اسفند۔ آپ اپنی حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اگر میری اصلیت آپ پر کھل بھی گئی ہے تو اخلاق
کے دائرے میں رہ کر بات کیجیے اور پھر جب آپ سب کچھ جان ہی گئے ہیں تو اس میں اس قدر غصہ دکھانے اور تلملانے
کی کیا بات ہے۔"
اور اس کے اس جواب پر وہ آگ بگولا سا ہو گیا اور بڑی ملامت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
"یو ڈیم شیم لیس کیریکٹر۔ یہ تم کہہ رہی ہو۔ کیا تم کو اپنے کیے پر تھوڑی سی بھی شرم نہیں۔ ذرا بھی غیرت نہیں۔ رہی تم میں
جب کہ تمہیں اپنا پول کھلنے پر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے تھا۔"
"نہیں مجھے تو کوئی ضرورت نہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی۔ کیونکہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ نہ آپ کو دھوکا
ہی دیا ہے۔ بلکہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے یا ہوا ہے آپ کی طرف سے ہی ہوا۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ اجتناب ہی برتا
حتیٰ کہ میں نے آپ کے جذبے کی حوصلہ افزائی کی نہ آپ کو رجھایا اور بہکایا۔ میں تو آپ سے ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ میں آپ
کے جذبے کی پذیرائی کرنے سے قاصر ہوں۔ ہمیشہ یہی عذر پیش کیا کہ سخت مجبوریوں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ آپ کا ہاتھ تھام کر
چند قدم بھی چلنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس لیے آپ میرا خیال چھوڑ دیں۔ مگر ——"
"نہیں، غلط بالکل غلط۔ تم نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا اور برابر کہتی رہیں وہ تو ہر وہ لڑکی کہہ سکتی ہے جو حیثیت اور قابلیت
میں تمہاری طرح کمتر ہو۔ اور ایسے ہی کومپلیکس کا شکار ہو۔ کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتی ہے کہ لڑکے کے گھر والے اسے قبول کرنے پر
تیار نہیں ہوں گے مگر تم تو سارے تجربوں سے گزری ہوئی تھیں۔ گناہ اور ثواب کے فرق کو اچھی طرح محسوس کر سکتی تھیں۔
یہ بھی معلوم تھا کہ شوہر کے ہوتے ہوئے کسی نامحرم کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ تمہیں یہ بھی اچھی
طرح معلوم تھا کہ میں تمہاری حقیقت سے لاعلم ہوں اور اسی لاعلمی میں تمہیں چاہ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر
بیٹھا ہوں پھر بھی تم مجھے اپنی جھوٹی محبت کا فریب دیتی رہیں۔"
اصل میں وہ سلوط سے متوقع تھا کہ وہ اس کی لعنت ملامت کے جواب میں ۔ کچھ کہنا تو کیا نگاہ اٹھا کر اس کی طرف
دیکھ بھی نہ سکے گی۔ مگر وہ تو یوں بول رہی تھی جیسے اسے اپنے کیے پر ندامت ہو نہ اس کے غضب و جلال سے متاثر ہوئی ہو۔
یہی دیکھ کر وہ اسے قائل اور شرمندہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مگر اس نے ایک طرح سلوط کی عزت کو چیلنج کیا تھا۔ اس کی توہین
—— کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا چھوڑی تھی۔

...ا کے کردار پر نہ صرف کیچڑ اچھالی تھی بلکہ اسے بدچلن تک کہہ دیا تھا۔
...ں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر یہ بے بنیاد الزامات۔
...اور سلوط سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر
...توہین اور تذلیل مر کر بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔
...اس کے خون میں بھی ایک دم ہی ابال آ گیا تھا۔
...اس کی بات کے جواب میں جھجھک کر بولی۔
"نہیں۔ میں نے آپ کو ہرگز فریب نہیں دیا۔ نہ ہی آپ کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی البتہ میں اس
بات کا اعتراف ضرور کرتی ہوں کہ میں چاہنے کے باوجود اپنی بابت آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکی۔ مگر اس کی وجہ وہ نہیں
جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ نے امیر اور اعلیٰ خاندانوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکیوں کو
ریجیکٹ کر کے میرا چناؤ کیا ہے۔ آپ سچے جذبوں کے ساتھ دل کی تمام تر گہرائیوں سے مجھے چاہتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر آپ
کے جذبات حتیٰ کہ آپ کی زبان آپ کے بس میں نہیں رہتی۔ آپ مجھ سے باتیں کرتے وقت بہت سی اخلاقی پابندیوں کو بھی
بھول جاتے ہیں۔ پھر بھلا ایسی صورت حال میں کس دل اور کس زبان سے اپنے بارے میں لب کشائی کر کے آپ کے جذبات
کو مجروح کرتی۔ آپ کا دل توڑتی۔ میں پتھر کی بنی ہوئی تو نہیں ہوں۔ بلکہ میرے سینے میں ایک گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل
موجود ہے۔ جسے بہت پہلے آپ کے جذبات کی صداقت نے لوٹ لیا تھا۔"
اپنی بات کہتے کہتے سلوط کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز رندھ سی گئی۔
"ہونہہ۔ آنسوؤں سے ڈرانا عورت کا بہت پرانا حربہ ہے کہ وہ آنسوؤں کی چادر کے پیچھے اپنے جرم اور غلطیوں کو
چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں تمہارے ان حربوں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ اگر رونا ہی ہے تو اپنے کرتوتوں کو
روؤ۔ اپنی پھوٹی ہوئی قسمت پر آنسو بہاؤ۔ مگر مجھ سے کسی اچھے سلوک کی امید نہ رکھو۔ کیونکہ میری نظر میں تمہاری حیثیت
اب دو کوڑی کی بھی نہیں رہی۔ میرے سامنے تمہارے یہ تریا چلتر نہیں چلیں گے۔"
وہ کچھ اتنی حقارت سے بولا کہ سلوط کے پیروں سے لگی تو سر تک جا پہنچی کہ وہ تو پھر بھی اس کی مروت، رواداری اور
تہذیب و اخلاق کی حدیں توڑنے کے باوجود اس سے تھوڑی بہت رواداری سے بات کر رہی تھی۔ مگر وہ تو تھا کہ اس پر حاوی
ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بھنا کر چیخی۔
"او۔ کیپ یور ماؤتھ شٹ آپ اگر بادشاہ بھی ہیں تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ میری نظر میں تو اب آپ کی حیثیت دو کوڑی کی بھی
نہیں رہی اور آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ پر اتنے رکیک الزامات لگانے اور اتنی گری ہوئی باتیں کہنے کا۔ آپ پلیز اسی وقت
یہاں سے چلے جائیے۔"
اور یہ سن کر ۔ وہ بھی سلوط کے منہ سے وہ بھلا اپنے آپ میں رہتا۔ دانت پیس کر بولا۔
"لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ بلکہ تمہارے لیے یہ بہتر ہو گا کہ ابھی اور اسی وقت اپنے ناپاک وجود کو لے کر میرے گھر سے
نکل جاؤ۔ مجھے تم سے سخت نفرت ہے اور میں ایک منٹ بھی تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں
تمہیں دھکے دے کر نکالنے پر مجبور ہو جاؤں یو گیٹ آؤٹ فروم مائی ہاؤس۔ گیٹ آؤٹ۔"
"نہ تو مجھے بھی ضرورت نہیں پڑی ایسے غیر مہذب گھر میں رہنے کی جہاں گندی ذہنیتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ اور میں تو
بہت پہلے ہی یہاں سے جانے کا سوچ رہی تھی۔ اب تو یہاں کھڑے ہو کر تھوکنا بھی میری توہین کا باعث ہو گا۔"
وہ بھی اب اتنی بے وقعت اور گری پڑی نہیں تھی جو اس کے اس بری طرح دھتکارنے پر بھی اس کے ہاں دھرنا دے کر
بیٹھی رہتی۔

"ہاں تو بس اگر اتنی ہی غیرت مند ہو تو اب میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔"
اس نے جواب میں گویا حرفِ آخر کے طور پر کہا اور پھر پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔
ادھر زینت اور نازو جو اس کے کمرے کی کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھیں اس وقت وہاں سہمی کھڑی تھیں۔ جب سلوط
...بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے بارے میں اس لیے نہیں بتا سکی تھی کہ مبادا اس کا دل ٹوٹ جائے یا جذبات

مجروح ہو جائیں۔ دونوں ماں بیٹیاں کھڑکی کی زیریں چوکھٹ سے کان لگائے بڑے غور سے ساری گفتگو سن رہی تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ اسفند اس کے کمرے سے باہر جا رہا ہے دونوں جلدی سے کھڑکی سے ہٹیں اور دبے پاؤں کے کمرے میں آگئیں۔

"لو دیکھا تم نے۔ کس قدر مکار اور چلتر لڑکی ہے۔ کیسے بڑھ بڑھ کے بابا کو جواب دے رہی تھی۔ چلو خس کم۔ اچھا ہی ہوا جو بابا نے اسے گھر سے نکلنے کو کہہ دیا ورنہ ایسی بدچلن لڑکی کا کیا بھروسا تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ" زینت بستر پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے بولیں۔

"جی ممی! یہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا یہاں سے نکلنا آسان تو نہیں۔ کیونکہ یہاں سے نکل کر وہ جائے گی کہاں۔ اس یہاں کوئی جان پہچان والا ہی نہیں ہے اور پھر اس کے جانے سے خصوصاً آپ کے لیے بہت سے پرابلم کھڑے ہو جائیں وہی مثل ہو گی کہ کھلائے کا نام نہیں ہوتا رلائے کا نام ہوتا ہے۔ سب لوگ آپ ہی کو الزام دیں گے کہ آپ کے ناروا سلوک نے اسے یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے اور ڈیڈی تو سچ مچ قیامت ہی کھڑی کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے ہی آپ نے سلوط کا ذکر نکالا تھا"

نازو نے کہا زینت دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل ہو گئیں۔ یوں بھی ان کی تینوں بیٹیوں میں نازو ہی سب سے زیادہ عقلمند اور معاملہ فہم تھی۔ زینت قائل سی ہو کر بولیں۔

"ہاں۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ مگر تم نے سنا نہیں بابا جس طرح اسے نکل جانے کو کہہ رہے تھے بس دھکے دینے کی کسر رہ گئی تھی۔"

"خیر اب وہ تو اتنی بھی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اپنا شوہر اور اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے گھروں میں کیوں جھانکتی پھرتی؟"

نازو بحث پر اتر آئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی بات۔ ور رکھنے کی عادی تھی اور جب اپنی بات گرتے دیکھتی تو بحث مباحثے پر تیار ہو جاتی تھی۔

"خیر میں نے تو اسے گھر سے نکل جانے کو نہیں کہا۔ بابا نے کہا ہے وہ خود ہی جانیں۔" بیٹی کی بحث کرنے کی عادت سے واقف زینت نے قصہ کوتاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے جا کر دیکھنا تو چاہیے ممی کہ آیا وہ چلی گئی یا ابھی یہیں دھرنا دیے بیٹھی ہے۔" نازو بولی۔

"لے لو کیا اب میں اسی کام کی رہ گئی ہوں کہ بار بار جا کر یہی دیکھتی رہوں کہ بابا نے کیا کیا اور وہ کیا کر رہی ہے اور پھر بقول تمہارے۔ وہ جا بھی کہاں سکتی ہے۔ فاخرہ نے اسی لیے تو اپنی بلا ہمارے سر منڈھی ہے کہ ہمارے سوا کوئی بھی اس کی ذمے داری لینے کو تیار نہ ہوا ہو گا۔"

زینت اٹھتی ہوئی بولیں۔ اور پھر پنگھوڑے میں سوئے ہوئے نواسے کو آہستہ سے گود میں اٹھا کر اسے نازو کے بستر پر لٹاتی ہوئی بولیں۔

"تمہیں کتنا منع کیا ہے کہ رات کے وقت بچے کو جھولے میں نہ لٹایا کرو۔ مگر تم تو اسے سلاتی بھی اسی میں ہو۔ اتنی ننھی سی تو جان ہے۔ اسے اپنے پاس سلایا کرو۔ نو ماہ تک مسلسل ماں کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے بچہ ماں کے پیٹ کی گرمی کا عادی ہو جاتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بھی وہی گرمی چاہتا ہے جو ماں کے قرب سے ہی اسے حاصل ہوتی ہے تبھی تو یہ اتنا بے چین رہتا ہے اور پاؤں چلنے تک تو تمہیں اسے اپنے پاس ہی سلانا چاہیے کہ بچے کا خون ہلکا ہوتا ہے۔ بزرگ خواتین بڑا وہم کرتی تھیں علیحدہ سلانا تو دور کی بات ـــ بچے کو اس ڈر سے تنہا بھی نہ چھوڑتی تھیں کہ کہیں خدانخواستہ اسے اوپری اثر نہ ہو جائے۔"

اور ماں کی لمبی چوڑی تقریر پر نازو کو ہنسی آگئی۔

"ممی وہ آپ کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ یہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا زمانہ ہے۔ آجکل تو پیدا ہوتے ہی بچہ آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا ہے۔ ورنہ پرانے زمانے میں تو سنا ہے کہ بچے کی آنکھیں تین روز بعد کھلتی تھیں پہلے حرکت کرتی ہوئی چیزوں کو پہچانتا تھا پھر رنگوں کو اور پھر چار پانچ ماہ بعد کہیں جا کر صورتوں کو پہچانتا تھا۔ مگر یہ اپنے شارع صاحب تو جھولے کے اندر ہی آپ کو پہچان کر مسکرانے لگے تھے۔"

انہوں نے گویا ماں کے واہموں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان واہموں سے نکالنا چاہا۔ ہاں تو کیوں نہیں پہچانیں گے یہ آجکل کے نومولود ـــ دنیا بوڑھی ہو کر خاتمے پر آ رہی ہے اور آسمان پر جمع پتا نہیں کتنے اربوں، اور کھربوں سالوں کی ارواحیں مادی زندگی میں داخل ہونے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہیں اور وہ جب آتی ہیں تو ظاہر ہے تیز و طرار بن کر ہی آتی ہوں گی۔"

زینت ہنس کر بولیں تو ماں کی اس منطق پر نازو بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

پھر زینت نواسے کو پیار کر کے اور بیٹی کی پیشانی چوم کر اسے شب بخیر کہتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں۔

اسفند نے جس تیزی سے سلوط کے کمرے کی دہلیز پار کی تھی۔ اسی تیزی سے سلوط بھی اس کے جاتے ہی الماری کی طرف مڑی الماری کھول کر سب سے نچلے خانے میں رکھا ہوا اپنا سوٹ کیس نکالا گو اس کے پاس اتنا ہی سامان تھا کہ سوٹ کیس میں آسانی سے سما جاتا۔ لیکن اس نے صرف ضرورت کے چند جوڑے اور استعمالی چیزیں ہی اوپر تلے سوٹ کیس میں بھریں۔ اور پھر الماری میں احتیاط سے رکھا ہوا سلمیٰ بیگم کا سلکن چادرہ جو وہ بھائی کے گھر جانے کی خوشی میں اپنے ساتھ لے جانا بھول گئی تھیں۔ الماری کے بالائی خانے سے نکال کر اوڑھا اور سوٹ کیس اٹھا کر کمرے کو یونہی کھلا چھوڑ کر بنگلے کے عقبی گیٹ سے باہر نکل کر گلی عبور کرتی ہوئی مین روڈ کی طرف آگئی۔

اس سمے رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مگر شاہراہ فیصل پر بھاری ٹریفک معمول کے مطابق بڑی تیزی سے رواں دواں تھا۔ البتہ خاصی چوڑی چکلی فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک کے دونوں اطراف میں بنے مکانات اور گلیاں سنسان نظر آ رہی تھیں اور وہ فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے کنارے چلنے کے بعد ـــ بنگلوں کے آگے بنی باؤنڈری والز کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ سوٹ کیس بھی خاصا وزنی تھا۔ کم از کم عام حالات میں تو اسے اٹھا کر چلنا مشکل تھا ـــ مگر اس سمے تو وہ بری طرح شدید غم و غصے کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

بدن میں آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

جس کی تپش میں اس کا چہرہ بھی بری طرح تپ رہا تھا۔

ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم رہی تھیں۔

ہتھیلیوں میں ایک عجیب تکلیف دہ کھنچاؤ کا احساس ہو رہا تھا۔

قدم بھی رکھ کہیں رہی تھی پڑ کہیں رہے تھے۔

اس کی کوئی منزل تھی نہ کوئی ایسا ٹھکانہ جس میں پناہ لے کر وہ محفوظ رہ سکتی ـــ بلکہ وہاں تو سرے سے سر چھپانے کا بھی کوئی آسرا نہیں تھا۔

کوئی یار تھا نہ مددگار ـــ

ہمدرد تھا نہ غمگسار ـــ

نہ ہی کوئی شناسا یا واقف کار ـــ

اس نے تو یہ تک نہ سوچا تھا کہ شعیب منصور کے گھر سے نکل کر آخر وہ جائے گی تو کہاں جائے گی ـــ پھر کراچی جیسے پرہنگام شہر میں جو ہر قسم کے گیر کی بھرتی بھری ہوئی ہے ـــ ہر قسم ہر قماش اور ہر مزاج کے لوگ رہتے ہیں۔ اور جہاں ایک بے یار و مددگار تنہا اور نوجوان لڑکی کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔ نہ صلہ رحمی کی ہی کوئی گنجائش ہوتی ہے۔

اور جہاں کی گنجان بحر ذخار کی طرح چاروں طرف پھیلی آبادی میں ایک بھولا بھٹکا انسان خصوصاً ایک تنہا اور لاوارث لڑکی یوں گم ہو جاتی ہے جیسے سطح سمندر پر نظر نہ آنے والا کوئی بلبلہ۔ جسے سرکش لہروں کے تھپیڑے جلد ہی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ مگر وہ ہر خطرے اور نزاکت سے بے نیاز ـــ اپنی ہی دھن میں آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔ البتہ اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ اور اسے معلوم نہ تھا کہ بنگلوں کے گیٹوں پر کھڑے اور بیٹھے چوکیدار اور ملازمین اور فٹ پاتھ پر چلتے راہ گیر، ایک عورت کو تنہا رات کے وقت کہیں جاتے ہوئے بڑی حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ تو ہر احساس سے بے نیاز ـــ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی ـــ حتیٰ کہ دیکھتے ہی دیکھتے ـــ دیکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

اگلی صبح کا نوروزہ سورج کراچی کے مشرقی افق پر کبھی کا طلوع ہو چکا تھا۔ اور اس سمے نو بج رہے تھے۔ شوہر کو آج کوئی اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی اس لیے وہ ساڑھے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل گئے تھے ان کے جانے کے بعد وہ کمرے میں چلی آئی تھیں جو کچھ دیر قبل ہی سو کر اٹھی تھی۔ شارع احمد بھی جاگ رہا تھا۔ نانی کی شکل دیکھ کر تو نانی نے اسے جلدی سے گود میں اٹھا لیا اور اس کے چہرے کو چومتی ہوئی بولیں۔

"دیکھو یہ ہوتی ہے ماں کی کشش کہ جب تک تم سوتی رہیں تمہارا قرب اور گرمی پا کر یہ بھی سوتا رہا اور جونہی تم جاگیں اور اگر تم بارہ بجے تک بھی سوتی رہتیں نا تو میں شرطیہ کہتی ہوں کہ یہ بھی اس وقت تک تمہارا ساتھ دیتا رہتا۔"

شاید انہوں نے یہ بات اپنی گزشتہ شب میں کہی باتوں کو درست ثابت کرنے کی غرض سے کہی تھی۔

"ہاں تو ممی اس میں اتنے تعجب کی کیا بات ہے چونکہ ماں بچے کو جنم دیتی ہے اس لیے وہ اس کا عادی ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لمس اور خوشبو سے ایک طرح کا سیٹسفیکشن حاصل کرتا ہے۔"

نازو نے بہت بے دلی سے کہا۔ کیونکہ اب صبح ہی صبح اٹھ کر وہ کسی بھی بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی اس کے شوہر گذشتہ دو روز سے اپنے بزنس ٹرپ پر ہانگ کانگ گیا ہوا تھا اور ہانگ کانگ میں عورت کی ارزانیت کے اس نے قصے سن رکھے تھے کہ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اس کا شوہر وہاں کی عورتوں کے ہاتھوں غلط باتوں کا عادی نہ ہو جائے یوں بھی وہ کچھ تھوڑا تھوڑا نظر باز تھا اور خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر بالکل ہی لٹو ہو جاتا تھا۔ یوں بھی وہ اس کا شوہر اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کے بغیر نازو کو کائنات کا ہر رنگ پھیکا پھیکا سا لگتا تھا۔

وہ اس کی اتنی زیادہ عادی ہو گئی تھی کہ یہ اتنے دن بھی اس کے بغیر رہ کر نہ جانے کس طرح گزار رہے تھے۔ اور شاید اس وجہ سے گزر رہے تھے کہ وہ صبح و شام اس سے ملنے آتا تھا۔ اور اب پانچ وقت ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے۔ اس لیے اس سمے نازو پر کچھ اداسی سی طاری تھی۔ ماں نے اس کے جواب میں جھنجھلاہٹ محسوس کی تو فوراً ہی اس کے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہوں نے کریم کو آواز دے کر اس کا ناشتہ منگوایا اور اسے کھلا پلا کر اور بچے کی نیپی بدل کر اس کے لیے سوپ اور دوپہر کا کھانا تیار کروانے کی غرض سے پینٹری میں آ گئیں۔ انہوں نے پینٹری میں کھڑے کھڑے کچن میں جھانکا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔

"ارے او کریم یہ خانساماں کہاں چلے گئے اس وقت۔" انہوں نے کریم کو آواز دے کر پوچھا۔ جو کھانے کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔

"جی بیگم صاحب۔ وہ تو سودا لینے مارکیٹ گیا ہے۔" کریم ان کی طرف آتا ہوا بولا۔

"مگر کون سا سودا لینے گئے ہیں آخر۔ جبکہ خدا کے فضل سے ہر چیز گھر میں موجود ہے۔"

"یہ تو پتا نہیں بیگم صاحب۔ پر مچھلی مچھلی کی رٹ لگا رہے تھے۔" کریم نے کہا۔

"مگر مچھلی وچھلی کی کیا ضرورت تھی۔ کس نے کہا تھا ان سے مچھلی لانے کو۔ یونہی خواہ مخواہ آوارگی کرنے گئے ہوں گے باہر۔ میرے خیال میں تو ابھی انہوں نے بٹیا کے لیے سوپ بھی نہیں چڑھایا۔ ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ گیارہ بجے سوپ دینے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اب کب چڑھایا جائے گا۔ کب تیار ہو گا۔ میں نے تو اس وجہ سے رات کو ہی بڑا چوزہ ذبح کرا کے اور کٹوا کے فریزر میں رکھوا دیا تھا۔ ابھی تک اسے بھی فریزر سے نکالا یا نہیں۔؟"

زینت فضیحتہ کرنے کے سے انداز میں بولیں۔ اور پھر فرج کھول کر فریزر میں جھانکا۔ اور پولیتھین کی تھیلی میں بند چوزے کو فریزر میں بند رکھا دیکھ کر ایکدم ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے غصے میں زور سے فریزر میں رکھی تھیلی کو کھینچ کر نکالا اور اسے میز کے موزیک کاؤنٹر پر پھینک کر بولیں۔

"لو بھلا۔ غضب خدا کا۔ ابھی تک چکن بھی فریزر سے نہیں نکالا گیا۔ اب یہ اس پر جمی برف آدھ گھنٹے سے قبل تو گھلنے سے رہی آج تو میری بچی کو سوپ بھی نصیب نہیں ہو گا۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے لوگوں کو شاید روٹیاں لگ گئی ہیں جو اتنا ذرا سا کام بھی نہیں ہوتا۔ یہ اتنا سا کام تو سلوط بھی کر سکتی تھیں۔ مگر وہ بہت لاپروا ہو گئی ہیں۔ کہاں ہیں وہ جاؤ بلا کر تو لاؤ انہیں کریم۔"

انہوں نے کام چور کے بجائے لاپروا کا لفظ کریم کی وجہ سے استعمال کیا تھا۔ مگر کریم بھی ایک کائیاں تھا ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔

"اجی اتنا سا کام تو کیا بیگم صاب۔ انہوں نے صبح سے آکر جھانکا تک نہیں چکن میں۔ میں تو جا کر خود اٹھا دیتا انہیں پر بی بی بابا صاب کے ڈر سے نہیں گیا۔"

"بیٹے کا نام سن کر زینت کو اس کا خیال آیا تو انہوں نے پوچھا۔ بابا تو شاید رات کو بھی نہیں آئے ہوں گے۔"

"نہیں وہ تو اب بھی نہیں آئے بیگم صاب۔" کریم نے بتایا۔

"خیر۔ اس زخمی کی جان بچانے میں لگ گئے ہوں گے۔ مگر تم سلوط کو تو بلا کر لاؤ۔ بس باتیں کرنے کھڑے ہو گئے۔"

زینت تیوری چڑھا کر جو بولیں تو کریم نے گردن بچکا کر دانتوں میں زبان دبائی اور سلوط کو بلانے چلا گیا۔ بیٹی کا سوپ تیار کرنا تھا اس لیے زینت نے سلوط کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا اور ایک گہرے برتن میں پولیتھین کی تھیلی سے چوزہ نکال کر اسے اور پیچھے کے سنک میں نل کے نیچے رکھ دیا اور ابھی کچن سے نکل کر پینٹری میں ہی آئی تھیں کہ تبھی کریم پریشان سی صورت لیے واپس آ گیا۔

"بیگم صاب۔ وہ سلوط بی بی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔" اس نے قدرے دبے دبے الفاظ میں بتایا۔

"ارے تو اس میں اس قدر منمنانے کی کیا ضرورت ہے۔ ادھر ادھر ہی ہوں گی کہیں۔ ایسا ہی ہے تو باہر جا کر بھی دیکھ لو اور دیکھو نازو کے کمرے میں نہ ہوں۔"

زینت اس کے کہنے کے انداز پر چڑ کر بولیں۔ حالانکہ اندر ہی اندر ان کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا۔ مگر وہ اس معاملے میں اتنی پُر یقین نہیں تھیں کہ سلوط سچ مچ چلی ہی گئی ہو گی۔

"اجی بڑی بٹیا کے کمرے میں بھی دیکھ کر ہی آ رہا ہوں اور سلوط بی بی کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں اور الماری بھی کھلی ہے اس میں سے کپڑے غائب ہیں۔" کریم بولا۔

"ہائیں کیا بک رہے ہو۔ آؤ چلو میرے ساتھ میں خود چل کر دیکھتی ہوں۔" زینت اندر ہی اندر گھبرا اٹھی تھیں۔ سنک کا نل یوں ہی بہتا چھوڑ کر کریم کے ساتھ ہو لیں۔

اس کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی الماری چوپٹ کھلی دیکھ کر اور اس میں سے سارے کپڑے غائب دیکھ کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس پر آگے بڑھ کر جب سوٹ کیس بھی غائب دیکھا تو پھر شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ مگر کریم کے سامنے مصلحتاً انہوں نے اس کے یوں اچانک کہیں غائب ہو جانے کو زیادہ اہمیت نہیں دی بس اتنا ہی کہا۔

"ارے یہ اتنے سویرے کہاں چلی گئیں۔ کہیں سہیل بھائی کا ڈرائیور تو نہیں آیا تھا انہیں لینے۔"

"نہیں بیگم صاب۔ یہاں چھوٹے صاب کا ڈلیور تو کیا کوئی ملنے والا بھی نہیں آیا صبح سے۔" کریم بولا۔

"لیکن۔ خیر۔ میں ابھی خود سہیل بھائی کے یہاں فون کر کے معلوم کر لیتی ہوں اتنے میں تم جا کر خانساماں کو دیکھو کہ وہ بھی آئے۔ ارے ہاں وہ کچن کے سنک کا نل بند کر دینا میں بے دھیانی میں کھلا چھوڑ آئی ہوں۔" ہر بات سے لاپروائی ظاہر کرنا اور ہر بات سلوط کے بارے میں کریم کے تجسس کو ختم کرنے کی کوشش میں کی تھی انہوں نے۔ کریم بھی ان کے حکم کی تعمیل میں جی اچھا کہہ کر چلا گیا۔

تب وہ بھاگی بھاگی نازیہ و نازو کے کمرے میں آئیں جو فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی وہ تھوڑی دیر تک اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہیں مگر جب بات چیت طویل ہو گئی تو انہوں نے بیٹی کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ارے اب بند بھی کرو فون۔ آج تو غضب ہی ہو گیا ہے۔" اور نازو نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کیوں خیر تو ہے ممی۔" اور جواب میں زینت نے ہاتھ چلا کر ان کو معنی خیز انداز میں گھما کر آہستہ سے کہا۔

"وہ نواب زادی بستر بوریہ گول کر کے چلی گئی ہیں۔"

"ہائیں کیا واقعی۔؟" نازو اچک کر بولی اور پھر فون پر کسی سے معذرت کر کے ریسیور رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سلوط چلی گئی ہے۔" اس نے یوں پوچھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"ارے بھئی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔ کمرہ اور الماری دونوں چوپٹ کھلے ہیں۔ سلمان بھی غائب ہے اور سوٹ کیس بھی۔ اور کریم تو اسے سارے گھر میں ڈھونڈ آیا۔" زینت بولیں۔

"ہائیں تو کیا کریم کو بھی معلوم ہو گیا کہ سلوط غائب ہو گئی ہے۔" نازو نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں اسی نے تو مجھے اطلاع دی تھی اس کے غائب ہو جانے کی۔ اصل میں، میں نے تو سلوط کو تمہارا سوپ تیار کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ وہ بھی اب آدھا دن چڑھے مگر کریم وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو نو دو گیارہ ہو چکی ہے۔"

"مگر ممی یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ کریم کو بھی پتا چل گیا۔ یہ آخر کو ہماری پرسٹیج کا معاملہ ہے۔ کریم کا چھوٹا سا دماغ نہ معلوم اس

معاملے کو کس رنگ میں لے۔ اور کن الفاظ میں لوگوں میں پھیلائے ممی آپ ہی تو کہتی ہیں کہ یہ نوکر لوگ گھر کے بھیدی ہوتے ہیں باتیں ان سے چھپانی چاہییں۔ ورنہ یہ اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں الٹی سیدھی باتیں پھیلا کر اپنے مالکوں کو بدنام کرکے رکھ دیتے ہیں گو کریم ایسا نہیں ہے پھر بھی۔۔۔ یہ معاملہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے گھر سے فرار ہو جانے کا ہے جسے کریم زیادہ عرصہ پیٹ میں نہیں رکھ سکے گا۔"

یہ نازو تو کچھ بہت ہی عقلمندی کی باتیں کرنے لگی ہے۔ ماں نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر دل میں سوچا۔۔۔ یہ معاملہ واقعی ہی اور ٹیڑھا تھا اور وہ تو خود بھی کریم کے سامنے احتیاط برتنا چاہ رہی تھیں۔ مگر کریم کو اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ سلوط اپنا سامان سمیٹ کر بتائے چپکے سے کہیں چلی گئی ہے اور افسانہ بنانے کو یہی کیا کم تھا۔ اور ان کی نظروں میں ابھی اور بھی بہت سی دشواریاں اور مشکلات تھیں جو سلوط کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے انہیں پیش آنے والی تھیں۔ انہوں نے متفکر سے لہجے میں بیٹی سے کہا۔

"اب اس معاملے میں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ صرف اس بات پر خفا ہو کر کہ بچے کو بہلانے کی وجہ سے سلوط رات کے کھانے پر شریک نہیں ہو سکی تھیں۔ اس لیے رات ہی کو اپنا سامان لے کر سہیل بھائی کے یہاں چلی گئی تھیں۔"

"واہ ممی۔۔۔ یہ تو کوئی عذر ہی نہ ہوا۔۔۔ پھر بھلا کریم کوئی بچہ تو نہیں ہے گھر کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں اور پھر آپ ڈیڈی کے سامنے بھی یہی عذر پیش کریں گی۔"

"ارے ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ اصل میں اس وقت پریشانی کی وجہ سے میرا دماغ بھی کام نہیں کر رہا۔ مگر تم تو ماشاءاللہ بہت سمجھدار ہو۔۔۔ تم ہی اس خوبصورت بلا کے فرار ہونے کا عذر تلاش کر لو۔"

زینت بیٹی کی باتوں سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی تھیں۔ تو نازو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ سوائے اس کے کہ۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رک کر اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر گردن کو دائیں بائیں ہلایا اور پھر بستر پر بیٹھ کر سرہانے کی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیں ہیں کس کو فون کر رہی ہو۔۔۔؟" ماں نے جو ابھی تک کھڑی ہی تھیں اس کے قریب آتے آتے پوچھا۔

"چچا جان کو اس معاملے میں شریک کیے بغیر بات نہیں بنے گی۔۔۔" نازو نے کہا اتنے میں ادھر سے کسی نے فون ریسیو کر لیا تھا۔ اور یہ نازش تھیں۔۔۔ سلام اور حال احوال پرسی کے بعد نازو نے جلد از جلد انہیں ساری بات بتا دی لیکن سلوط کے چلے جانے کا سبب انہیں نہیں بتایا۔

پھر دیر تک فون پر دونوں ماں بیٹی نازش سے باتیں کرتی رہیں۔ اور جب زینت نے ریسیور رکھا تو وہ کافی پُرسکون نظر آ رہی تھیں۔

"خدا تمہیں ہزاری عمر دے اور نظر بد سے محفوظ رکھے تم نے یہ بہت اچھا کیا۔ اب کم از کم کریم اور دوسرے ملازموں کو اور جان پہچان والوں سے یہ کہہ کر کہ سہیل اور نازش کو اچانک ہی دادو میں زرعی زمینوں پر جانا پڑ گیا تھا اس لیے انہوں نے راتوں رات سلوط کو اپنے یہاں بلوا لیا تھا۔ تاکہ اسے کوثر کے پاس چھوڑ کر چلے جائیں ان سب کا تجسس تو دور کر سکیں گے۔"

"خیر جان پہچان والوں میں سے کوئی بھی سلوط کے بارے میں نہیں پوچھے گا کیونکہ سلوط کسی کے سامنے آتی ہی کب تھیں۔ لیکن اب ڈیڈی سے کیا کہیں گی آپ۔۔۔؟ انہیں تو اصل بات بتانی ہی پڑے گی نا۔" نازو نے ماں کی تجاویز سن کر کہا۔ جو خود اس نے ہی سوچی تھیں۔

"ہاں لیکن میں تو ہرگز نہیں بتاؤں گی انہیں۔۔۔ تم ہی ان سے کہہ دینا۔۔۔ جس طرح بھی بہتر سمجھو۔۔۔ مگر پہلے کریم کو مطمئن کر دو تاکہ یہ بات باہر نہ پھیلے۔۔۔" زینت نے کہا۔ اور کریم کو آواز دی۔

اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ کمرے میں داخل ہو رہا ہے تو وہ یوں بن گئیں جیسے انہوں نے اسے آتے دیکھا ہی نہ ہو اور نازو سے اس انداز میں بولیں جیسے پہلے سے بات کر رہی ہوں۔

"مگر تم نے بھی تو حد کر دی۔ مجھے پہلے ہی بتا دیتیں تو مجھے اتنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

"لیکن میں تو یہی سمجھی تھی کہ سلوط آپ سے بھی مل کر گئی ہوں گی۔ میرے خیال میں تو آپ سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں جا چکی ہوں گی۔ اور ادھر وہ بہت عجلت میں تھیں۔ نازش کو بھیجا تھا انہیں لینے، وہ بھی ٹیکسی میں۔ اس لیے آپ سے نہ مل سکی ہوں گی۔" سلوط کا ذکر ہو رہا تھا اس لیے کریم کے کان آپ ہی آپ کھڑے ہو گئے تھے۔ نازو کے خاموش ہوتے ہی وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو

...ہی بولا۔ "سلوط بی بی کیا چھوٹے صاحب کے گھر گئی ہیں پر کس وقت گئیں؟"

...بات کو کھانے کے بعد زینت نے جواب میں کہا تو نازو بگڑ کر بولی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے کریم۔ تم ہمارے ذاتی معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں لینے لگے ہو۔ اتنے پرانے ملازم ہو کر بھی ہمارے طور طریقے سے واقف ہوئے نہ ہمارے آداب ہی سیکھے۔ کیا چاہتے ہو آخر کیا تمہارا دل بھر گیا ہے یہاں کام کرتے کرتے۔"

اور نازو کے ڈانٹ پلانے پر کریم شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ سہم سا گیا۔ بڑی لجاجت سے بولا۔

"نہیں بٹیا نہیں قصور ہو گیا معاف کر دیجیے۔ میں تو آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کی ہی جوتیوں کے طفیل اس قابل ہوا ہوں کہ اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکوں۔ بھلا میرا دل یہاں کام کرتے بھرے گا۔ مجھے تو یہاں کوئی تکلیف کبھی ہوتی تب بھی میں آپ کی خدمت ہی کرتا رہتا۔ میں نے تو بڑی بٹیا سلوط بی بی کا اس لیے پوچھ لیا تھا کہ میں خود بھی ان کے اکیدم ہی غائب ہو جانے سے پریشان ہو گیا تھا ورنہ آپ کی عجت (عزت)، میری عجت ہے بٹیا سرکار۔"

"ہاں ہاں بٹیا۔ کریم ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ بے چارا بھی سلوط کو غائب دیکھ کر ہراساں ہو گیا تھا۔ خیر کریم میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ اگر خانساماں آ گئے ہوں تو ان سے کہو کہ پہلے بٹیا کا سوپ تیار کر دیں۔ اور لوکی کا رائتہ نہ بنائیں۔"

زینت کا اس کو بلانے کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے کریم کو خانساماں کے پاس بھیج کر ٹالا۔ اور جب کریم چلا گیا تو نازو نے پوچھا۔

"ممی آپ نے یہ لوکی کا رائتہ تیار کرنے کو کیوں منع کر دیا۔ میں تو اپنی سسرال میں بھی دہی کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھی۔"

"وہ اور بات تھی۔ اس وقت تک تم حاملہ تھیں۔۔۔ اور اب خیر سے زچہ ہو۔ اور ایام زچگی میں زچہ کے لیے دہی زہر کی تاثیر رکھتا ہے۔ زچہ خواہ چلے کے آخری دنوں میں ہی دہی کھائے۔ وہ زہر باد کا باعث بن جاتا ہے اور ہاں انار خواہ قندھاری ہو یا بے دانہ زچہ کے لیے دہی کی سی ہی خاصیت رکھتا ہے۔ دیکھو اب ہم موجود ہیں اور کبھی ایسا بھی ہو گا کہ نہیں بھی ہوں گے۔ مگر میری یہ نصیحت تم گرہ میں باندھ لو۔ کہ چلے میں کبھی دہی اور انار نہیں کھانا۔" زینت نے بہت سنجیدہ ہو کر نصیحت کی تو نازو ہنس کر بولی۔

"اچھا اچھا ممی۔ آپ اطمینان رکھیے، میں آپ کی اس نصیحت پر اپنے آخری سانسوں تک عمل کروں گی۔"

"اے لو۔ بولیں بھی تو کیا۔ بھلا یہ آخری سانسوں تک کہنے کی کیا تک تھی۔ بُرے الفاظ بھی بداخلاقی کا ثبوت ہوتے ہیں۔" زینت اس کے آخری سانسوں کہنے پر اندر ہی اندر ہول کر بولیں۔

"چھوڑیں ممی اس ذکر کو، اب کریم کا مسئلہ تو حل ہو گیا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اس معاملے میں ڈیڈی سے کیسے نمٹوں گی، اور اگر آپ خاموش رہیں تو کہیں وہ آپ کی خاموشی کا کوئی غلط مطلب نہ نکال بیٹھیں۔ میرے خیال میں تو مناسب یہی ہو گا کہ آپ خود ہی علیحدگی میں انہیں بتا دیں۔" تو زینت نے چڑ کر پوچھا۔

"کیا یہ کہ بابا نے اسے ذلیل و خوار کر کے گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ یہ ذکر تو آپ لبوں پر بھی نہ لائیے گا۔ بس اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے یہی بتا دیجیے گا کہ سلوط اچانک نا معلوم کیس کہیں غائب ہو گئی ہے۔" تو زینت کچھ سوچ کر بولیں۔

"ان کا کچھ ٹھیک نہیں کہ دوپہر کو آئیں یا سہ پہر کو۔ میٹنگیں ہو رہی ہیں۔ اس لیے شام بھی ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں خیر وہ جس وقت بھی آئیں گے، یہ نہیں پوچھیں گے کہ اتنے اہم معاملے میں تم نے اب تک خاموشی کیوں اختیار کر رکھی۔ کیوں نہ تم نے مجھے فون پر اطلاع دے دی۔" زینت نے تردد سے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ ڈیڈی صرف کہیں گے ہی نہیں بلکہ ایک قیامت کھڑی کر دیں گے۔ ایسا کریں کہ میں ان کے آفس کا نمبر ملا دیتی ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ مگر انہیں اکیدم ہی بتانا ٹھیک نہیں۔ بس یہ کہہ دیجیے گا کہ اگر آپ میٹنگ سے فارغ ہو گئے ہیں تو فوراً گھر آ جائیے۔ ایک ایمرجنسی پڑ گئی ہے۔" نازو نے کہا۔

"یہ تو تم ہی ان سے کہہ سکتی ہو۔ بلکہ میرے خیال میں تمہارا کہنا ہی مناسب ہو گا۔" زینت بے زاری سے بولیں۔

"نہیں ممی! امیر جنسی کا سن کر وہ مجھ سے مزید استفسار کریں گے۔ میرے خیال میں ان کے استفسار کا جواب آپ ہی بہتر دے سکیں گی۔" نازو نے اپنا پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی نہ لینا امیر جنسی وِمر جنسی کا نام۔ بس یہ کہہ دینا کہ ایک ضروری کام ہے۔" زینت بیزاری سے بولیں۔ تو نازو ڈائل کرنے لگی۔ مگر ایک تو نمبر ہی بڑی دیر بعد ملا، دوسرے ملا بھی تو معلوم ہوا کہ شعیب منصور آفس سے جا چکے ہیں۔ یہی سمجھیں کہ وہ کسی لمحے بھی گھر پہنچنے والے ہیں۔ مگر انتظار کرتے کرتے شام ہو گئی تب کہیں مغرب کے بعد نکل کر آئے۔

نازو تو اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی۔ اور زینت چائے کے لوازمات سجائے شوہر کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ بہت فکرمند اور بیکل سی نظر آ رہی تھیں۔ خوشی کی بات ہوتی یا غمی کی وہ شوہر کے آتے ہی ان سے کوئی بات نہ کہتی تھیں۔ بلکہ جب وہ نہا دھو کر تازہ ہو جاتے اور کھانا پی لیتے۔ تب ہی وہ ان سے ذکر کرتی تھیں۔

اپنے بزرگوں کی یہ نصیحت انہوں نے بھی گرہ میں باندھ لی تھی۔ کہ مرد باہر سے آئے تو آتے ہی کبھی اس سے کوئی بات نہ کہو۔ کیونکہ مرد اچھے موڈ میں ہوتا ہے، اور کوئی بُری بات یا خبر سنتا ہے تو اس کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر بُرے موڈ میں ہوتا ہے اور کوئی بری بات یا خبر سنتا ہے تو کچھ ایسا فساد مچاتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں گھل جاتی ہیں۔ چنانچہ جب شعیب منصور چائے سے فارغ ہوئے تب انہوں نے آہستہ آہستہ انہیں سلوط کے بارے میں بتا دیا۔ مگر وہ تو ایکدم ہی اچھل پڑے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ سلوط کیسے کہیں جا سکتی ہے اور کہاں جا سکتی ہے آخر۔ ضرور تم نے ہی اسے دھکے دے کر نکالا ہوگا۔ بہت کھل رہا تھا نا تمہیں اس کا یہاں رہنا۔ جبھی تو ہمدردی جتا جتا کر اس کے خلاف زہر اُگل رہی تھیں۔" انہوں نے الٹا بیوی کو ہی تاکا۔

"نہیں نہیں حاشا وکلّا۔ میں نے اسے نہیں نکالا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ جا رہی ہے۔" زینت شوہر کے تیور دیکھ کر ڈر سی گئیں۔

"مگر کب گئی وہ؟ کیسے گئی؟ کیا مکھی بن کر اُڑ گئی تھی وہ۔ جو تمہیں جاتی نظر نہ آئی۔ اور کیوں گئی۔ کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی ورنہ بلاوجہ تو نہیں جا سکتی تھی۔" شعیب منصور نے کچھ زیادہ بگڑ کر پوچھا۔

"وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ رات کو تو اچھی بھلی نازو کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ بلکہ نازو کو زبردستی کھانے پر بھیج کر بچے کو بھی اس نے سلایا تھا۔ صبح دیکھا تو سامان سمیت غائب تھی۔" زینت نے منمناتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے صبح ہی مجھے کیوں نہ بتا دیا۔ جو سارا دن گزار کر اب بتا رہی ہو۔"

"کیسے بتاتی۔ گیارہ بجے کے قریب تو خود مجھے بھی معلوم ہوا تھا۔ وہ بھی جب میں نے دیکھا گیارہ بج گئے ہیں۔ اور سلوط ابھی تک اٹھی ہی نہیں تو کریم کو ان کی خیر خبر لینے بھیجا۔ مگر کریم نے آ کر بتایا کہ ان کے کمرے اور الماری کے دروازے چوپٹ پڑے ہیں۔ اور الماری سے کپڑے اور سوٹ کیس سمیت خود سلوط بھی غائب ہیں تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے تو نازش کو بھی فون کر کے پوچھ لیا کہ کہیں وہ ان کے یہاں تو نہیں گئیں۔ مگر انہوں نے بھی انکار کر دیا کہ سلوط یہاں نہیں آئیں۔ پھر فوراً ہی آپ کے آفس فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ آفس سے چلے گئے ہیں۔ پھر کیسے آپ کو بتاتی جب آپ کہیں ملے ہی نہیں۔ اور آئے بھی ہیں تو اب شام کو نکل کر۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ کیا سبب تھا اس کے جانے کا؟ اور وہ کب گئی؟" شعیب منصور کو جیسے بیوی کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔ انہوں نے ڈپٹ کر بیوی سے پوچھا۔

"اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کب گئی ہیں تو پھر بھلا میں انہیں جانے دیتی۔ اور سبب کیا ہو سکتا ہے ماسوا اس کے کہ وہ عرصے سے ملازمت کی تلاش میں تھیں اور کئی جگہ درخواستیں بھی بھیج رکھی تھیں۔ ممکن ہے انہیں کوئی ملازمت ہی مل گئی ہو۔"

زینت نے حسبِ لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے سلوط کے بارے میں قیاس آرائی کی۔ شعیب منصور کو غصہ آ گیا۔ وہ بھڑکے جذبے کے عالم میں بڑے تڑخ کر بولے۔

"ملازمت مل جاتی ہے تو یوں چوروں کی طرح چھپ کر نہیں جاتے۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ جسے تم چھپانا چاہ رہی ہو۔"

"نہیں بھلا وہ کیا بات ہو سکتی ہے جو میں آپ سے چھپاؤں گی ——— سلوط نے کوئی نہ کوئی بندوبست تو کر لیا ہوگا اپنی رہائش کا، جبھی تو اتنے اطمینان سے نکل گئیں۔"

"واہ۔ بڑے اطمینان سے کہہ دیا کہ نکل گئیں۔ آخر ہماری بھی تو کچھ حمیت اور کچھ عزت ہے۔ اور صرف یہ سوچ لینا کافی نہیں کہ وہ ملازمت مل جانے کی وجہ سے چلی گئی ہے۔ اب بھلا میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ کہاں تلاش کروں۔ یہ کراچی تو حوادث کی دلدل ہے جو انسان کو اندر کھینچ لیتی ہے۔ پولیس میں بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا کہ بدنامی ہو گی۔ صبح ہی بتا دیا ہوتا تو ذرا ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں سڑکیں ناپنا محض حماقت ہی ہو گی۔ تمہاری نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اور یہ اسفند کہاں ہے۔ اس وقت؟"

شعیب منصور نے بیوی کو ملامت کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ غصے میں ہمیشہ بیوی کو تم سے مخاطب کرتے تھے۔

"بابا تو کل رات سے ایسے ڈیوٹی پہ گئے ہیں کہ اب تک آئے ہی نہیں۔ کریم بتا رہا تھا کہ ہسپتال سے کسی ڈاکٹر نے فون کر کے انہیں فوراً ڈیوٹی پہ آنے کے لیے کہا تھا۔" زینت نے بتایا۔

"خیر وہ تو یوں بھی گھر کے کسی معاملے میں دلچسپی نہیں لیتا۔ کوئی مرے یا جیے۔ اس کی بلا سے۔ وہ تو اتنا بددماغ ہو گیا ہے کہ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔" شعیب منصور جلے کٹے انداز میں بولے۔

"اب بابا کو کیا معلوم تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں سلوط غائب ہو جائے گی۔ اور اگر وہ وہاں ہوتے بھی تو کیا کر لیتے۔ بقول آپ کے سڑکیں ناپ کر ناکام ہی لوٹتے۔"

"ہوں۔" شعیب منصور نے کہا۔ جو پشت پر ہاتھ باندھے غصے میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر کچھ سوچ کر وہ اپنی الماری کی طرف بڑھے، اسے کھول کر ہینگر پر لٹکا اپنا سوٹ نکالا۔ اور ڈریسنگ روم کا رُخ کرنے لگے تو زینت نے تعجب سے پوچھا۔

"اس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنے اعمالوں کی سزا بھگتنے۔" انہوں نے جلے کٹے انداز میں کہا اور پھر ڈریسنگ روم میں گھس گئے۔ اور زینت ان کے ڈریسنگ روم سے نکلنے کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ شوہر کے ساتھ خود بھی سلوط کو تلاش کرنے نکلیں۔ تھوڑی دیر بعد شعیب منصور سوٹ پہنے ڈریسنگ سے نکلے تو انہوں نے کہا۔

"اگر آپ اپنے کسی دوست کے یہاں جا رہے ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" تو شعیب منصور نے انہیں بڑی ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"میں کسی خوش وقتی میں تو نہیں جا رہا۔ جو آپ کو سیر و تفریح کی سوجھ رہی ہے۔ ظاہر ہے۔ اپنی مصیبت میں ہی جا رہا ہوں۔ پھر آپ کے ساتھ چلنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"اُفوہ۔ آپ تو سچ مچ کاٹنے ہی لگتے ہیں۔ ورنہ میں نے یوں ہی پریشانی میں پوچھ لیا تھا۔" مگر شعیب منصور نے جیسے ان کی بات ہی نہیں سنی الٹا انہی سے پوچھا۔

"یہ تینوں بچیاں کہاں ہیں نظر نہیں آ رہیں۔"

"اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ نیلوفر اور نیلما تو اس وقت کالج گئی ہوئی تھیں میں نے اب انہیں بتایا ہے۔" زینت بولیں۔ شعیب منصور نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ الماری کو بند کر کے اسے لاک کیا اور پھر بیوی کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔ پھر وہ رات کے گیارہ بجے گھر لوٹے۔ سلوط ان کو بھلا کہیں ملتی۔ وہ تو کراچی کی وسعتوں میں کہیں گم ہو گئی تھی۔

شعیب منصور بھائی کے یہاں بھی ہو کر آئے تھے۔ نازش نے انہیں یہ بتا دیا تھا کہ سلوط کی گمشدگی کے بارے میں ملازموں کو یہ بتانے کا طے کیا گیا ہے کہ انہوں نے اسے بلایا تھا۔ اور وہ آج کل ان کے یہاں رہ رہی ہے۔ لیکن شعیب منصور نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اب نہیں تو جلد ہی سب کو سلوط کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔

وہ تو نازش نے انہیں معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا کہ اس بات کو الم نشرح کرنے سے خود ان کی رسوائی ہو گی۔ لوگ کہیں گے کہ ان کے گھر سے ایک جوان لڑکی بھاگ گئی ہے۔ لہٰذا ابھی کچھ روز تک سب پر یہی ظاہر کیا جائے گا کہ سلوط کو میں نے اپنے

پاس بُلا لیا ہے۔ بعد میں جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو حالات کے پیش نظر جو مناسب معلوم ہو گا کہہ دیا جائے گا۔ جا کر ان کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی۔ بھائی کے یہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر اور بھائی بھاوج سے مشورہ کر کے شعیب منصور لوٹے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

سلوط کی پریشانی میں زینت سارا دن اِدھر اُدھر پھرتی رہی تھیں۔ ڈھنگ سے کھانا کھایا تھا نہ دوپہر میں آرام کیا، اس لیے شوہر کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ شعیب منصور نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ بھی بہت تھکے ہوئے تھے۔ لباس تبدیل کر کے جلدی سے بستر پر لیٹ گئے تھے۔ گو سلوط کی پریشانی میں انہیں دیر تک نیند نہیں آئی تھی کہ بیوی کی غفلت اور سلوط کے ساتھ کی گئی زیادتیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ سلوط کے بارے میں بھی وہ سخت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ کہاں گئی ہو۔ کن ہاتھوں میں چڑھی ہو۔ اور اس کا کیا حشر ہو۔

انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ گزشتہ رات ہی ان کا گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ دن کے وقت گئی ہے۔ ممکن ہے اسے ملازمت مل گئی ہو۔ اور اس کے ساتھ رہائشی سہولت بھی دی گئی ہو۔ تبھی تو وہ اتنے چپکے اور اطمینان سے گئی ہے۔ ممکن ہے کہ خود کو اس جگہ ایڈجسٹ کر کے کسی روز خود ہی ملنے آ جائے۔ لیکن اگر ایسی بات نہ ہوئی۔ اور یونہی چلی گئی ہے تو نہ معلوم کن ہاتھوں میں پڑے اور اس کی کیا درگت بنے۔ اور اس طرح تو شاید زندگی بھر بھی لوٹ کر نہ آئے۔

پھر میں فاخرہ اور سب سے بڑھ کر ثاقب کو کیا جواب دوں گا۔ کیا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں گا۔ اور ثاقب تو فاخرہ کی زندگی کو اور بھی عذاب بنا دیں گے۔ پہلے ہی کیا کم تکلیفیں دیتے رہے ہیں میری بہن کو۔ گنگ ہو کر رہ گئی ہے ان کی زیادتیاں برداشت کرتے کرتے۔ اس پر قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ اسے اولاد سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور پھر یہ کسی چیز یا پالتو جانور کا تو نہ تھا۔ ایک انسانی جان کا معاملہ تھا۔ ایک جوان اور پلی پلائی عزت دار لڑکی کا معاملہ تھا۔ جس کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر رکھی تھی۔ اور اب اس کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے خاندان میں ان کی تھو تھو ہوتی، اور یوں بیٹھے بٹھائے کوئی غائب تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسے خود غائب نہ کیا جائے یا گھر سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔

گزشتہ شب رات کے کھانے پر ان کی بیوی اور بیٹی اسفند ان کے اور اسفند کے سامنے جس طرح ہمدردی جتا جتا کر اس کے اپنے گھر میں رہنے پر اعتراض کر رہی تھیں اس ذکر کو وہ بھولے تو نہ تھے۔ اور انہیں یہ تو معلوم تھا کہ سلوط شادی شدہ ہے۔ اور پچھلے دو سال سے میکہ بسائے بیٹھی ہے۔ اور وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اور ثاقب حسن کے گھر ہی اس نے اسی لیے غنڈے کدوائے تھے کہ اس کا ثاقب حسن سے مقدمہ چل رہا تھا۔ لیکن بیوی کی زبانی انہوں نے جو باتیں سنی تھیں انہوں نے انہیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اور اس معاملے میں اسی وجہ سے زبان نہیں کھول سکے تھے کہ انہیں اصل حالات کا کچھ علم ہی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی کے احساس دلانے پر کہ انہوں نے کسی دوسرے کی بیوی کو اپنے گھر میں دکھ رکھا ہے وہ چُپ سے ہو کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

مگر اب۔ آج کے تازہ معاملات پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یا تو سلوط نے گزشتہ روز زینت کی گفتگو سُن لی تھی یا پھر خود زینت اور نازو نے اس سے کچھ ایسی بات کہی ہے۔ جس نے اسے ان کا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اگلے روز صبح کو ناشتے کی میز پر سب موجود تھے۔ حتیٰ کہ اسفند بھی جو دو راتیں ہسپتال میں گزار کر اسی وقت گھر لوٹا تھا۔ یوں تو نازو کھانا اور ناشتا اپنے کمرے میں ہی کھاتی تھی لیکن اس روز وہ بھی زینت کے کہنے پر سب کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھی تھی۔ البتہ نیلوفر اور نیلما کالج جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کہ صبح کے آٹھ کب کے بج چکے تھے۔ شعیب منصور چونکہ عدد رجہ ... تھے اس لیے انہوں نے بیٹے کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا بھی نہیں، اور اس کے سلام کا جواب دے کر چپ چاپ ناشتا کرتے رہے۔ زینت اور نازو بھی اپنی اپنی سوچ میں گم تھیں۔

اسفند کچھ اتنے عین موقع پر ہسپتال سے آیا تھا۔ اور کچھ ایسے خستہ و خراب موڈ میں آیا تھا کہ زینت کو اسے سلوط کے بارے میں بتانے کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ ماں کے کہنے پر کہ ناشتا تیار رہے آ کر کر لو۔۔ لباس تبدیل کر کے وہ چپ چاپ کھانے کی میز پر آ بیٹھا تھا۔ وہ بھی بہت خاموش اور سنجیدہ سی شکل بنائے خاموش بیٹھا تھا۔ نازو نے خود ہی اس

بیالی میں جانے انڈیلی تھی۔ خلافِ عادت وہ بھی چُپ چپ سی تھی کہ تبھی چھری اور کانٹا پلیٹ کے بیچوں بیچ رکھتے ہوئے نیپکن سے ہونٹ صاف کیے اور بولے۔

شعیب منصور نے ٹشو سے ... ہوں اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ یہی سمجھ میں آیا کہ سلوط کو ایسے اداروں میں تلاش کروں جو لاوارث اور مصیبت زدہ لڑکیوں کو پناہ اور تحفظ دیتے ہیں۔ لہٰذا دو تین اداروں میں تو کل رات کو ہی جا کر دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ اور ایسی جگہ پر اس کا مل جانا کچھ یقینی تو نہیں۔ کس وقت گئی تھی وہ یہاں سے؟"

شعیب منصور نے اسفند پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ جواب لاتعلق اور بے نیاز سا بیٹھا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ یا باپ کی باتیں سُن ہی نہ سکا ہو۔

"یہی تو معلوم نہیں کہ وہ کب گئی تھیں۔ رات کو یا صبح کو۔ وہ تو مجھے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان کریم نے آکر بتایا کہ وہ سامان سمیت اپنے کمرے سے غائب ہیں۔"

زینت نے جواب میں کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کب اور کس وقت ان کے گھر سے نکلی تھی۔ مگر شعیب منصور تو جیسے بھرے ہی بیٹھے تھے۔

"خیر اب تو تمہارے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو گی۔ کیونکہ تمہارے دل میں چُبھی فاخرہ کے حسد کی پھانس کتنی آسانی سے آپ ہی آپ نکل گئی۔" انہوں نے طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھی۔" بیٹے کی موجودگی میں ایک ایسی بات کہہ دینا جو عرصے سے زینت کے دل میں واقعی پھانس بن کر اتری ہوئی تھی۔ انہیں بہت کھلی تھی۔

"کیسی باتیں میں کر رہا ہوں یا تم کر رہی ہو۔ تمہیں تو شروع سے سلوط کا اچانک آ جانا ہی بہت کھلا تھا۔ ہمیشہ اس کے خلاف زہر ہی اگلتی رہتی تھیں۔ تمہارا سلوک شروع ہی سے بہت ناروا تھا۔ تم نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے ہی اسے گھر سے نکالا ہے۔ اور اب چندرا چندرا کر کہہ رہی ہو کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس وقت یہاں سے گئی تھی۔"

شعیب منصور تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اب جو بیوی نے مظلومیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ کمال ہے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ؟۔۔ تو وہ پھٹ ہی پڑے تھے زینت نے بھی بجھی بجھی صورت کے ساتھ امداد طلب نظروں سے پہلے نازو کی طرف دیکھا اور پھر اسفند کی طرف۔ اسے ماں پر ترس آ گیا۔ وہ فوراً ہی بولا

"او نو ڈیڈی۔ سلوط کو ممی نے نہیں میں نے گھر سے نکالا ہے میں نے۔"

"ہیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم اسفند۔ اپنے ہوش میں تو ہو۔ یا پھر ماں کی ہمدردی نے تمہیں ایک ایسی غلط بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

بیٹے کے منہ سے ایک بہت ہی غیر متوقع اور ناقابلِ یقین بات سُن کر شعیب منصور اچھل سے پڑے۔ انہوں نے قدرے ناراضگی لہجے میں ایک بے یقینی سی شامل کر کے پوچھا۔

"ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیڈی۔ اور میں کسی پریشر میں آنے والا انسان بھی نہیں ہوں۔ مبالغے سے کام لینا بھی مجھے ... کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں نے سلوط کو گھر سے نکالا ہے۔"

اسفند کے سنجیدہ لہجے میں کچھ اتنی قطعیت تھی کہ شعیب منصور کو یقین کر لینا ہی پڑا۔ اور انہوں نے بہت ڈپٹ کر بڑے ... لہجے میں اس سے پوچھا۔

"مگر تمہیں کیا حق پہنچتا تھا اسے گھر سے نکالنے کا۔ یہ گھر میرا ہے اور اس میں میری مرضی اور حکم ہی چل سکتا ہے۔ پھر تمہیں یہ کیسے جرأت ہوئی۔"

"سوال گھر اور جائیداد کی ملکیت کا نہیں۔ بلکہ گھر کی عزت بچانے کا ہے ڈیڈی۔ وہ مجھ پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ مجھے گمراہ کرنا چاہتی تھی۔ شادی شدہ ہو کر خود کو کنواری مریم ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ گھر میں میری دو جوان بہنیں بھی موجود تھیں۔ ایسی ... لڑکی کا ان کے ساتھ رہنا مجھے مناسب نہیں لگا۔ اس لیے میں نے اپنے گھر کو اس کے ناپاک وجود سے صاف کرنا ہی بہتر سمجھا۔"

اسفند نے باپ کا ادب لحاظ بھی نہ کیا۔ اور ایک جذب کے عالم میں باپ کو اصل وجوہات سے آگاہ کر دیا۔

"لیکن اگر دو نوجوان بہنوں کے بھائی ہو تو زبان کو ذرا روک کر بات کرو۔ کیونکہ جب جوان بہنیں آگے موجود ہوں تو کو بہت احتیاط سے اور سوچ سمجھ کر کسی لڑکی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ سُنی سُنائی اور غیر مصدقہ باتوں پر نہیں۔ کیونکہ بہنوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے نا۔ کبھی کبھی کسی کے متعلق زبان سے نکلی ایک ذرا سی بات کی بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ تم اعلا تعلیم یافتہ اور باشعور انسان ہو۔ اور اماں جان جیسی نیک اور اعلا ہستی کے تربیت یافتہ۔ کانوں کے کچے اور پست ذہنیت مرد میری نظر میں مردانگی سے عاری ہوتے ہیں۔ مرد تو وہی ہوتا ہے جو وسعت نظر کے ساتھ ساتھ دل بھی فراخ رکھے۔ اور کسی سخت اور غلط بات کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی۔ سمجھے میاں صاحبزادے۔ اتنا ہی کافی نہیں کہ انسان پڑھ لکھ کر زندگی کی طرح چڑھتے ہوئے اس دور میں کوئی پروفیشن اپنا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس نے ہمالیہ کی چوٹی سر کر لی ہے۔"

باپ کی باتوں میں وزن بھی تھا نصیحت اور صداقت بھی۔ وہ چہرہ جھکائے بڑی خاموشی اور غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن جب شعیب نے بات ختم کی تو اس نے جھنجھلائی سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اور انہوں نے جو دیکھا کہ بنی ہوئی بات اکیدم ہی بگڑنے لگی ہے تو جلدی سے بولیں۔

"لیکن میں نے سلوطہ پر کوئی بہتان تو نہیں باندھا۔ کوئی تہمت تو نہیں لگائی۔ اور کیا اس حقیقت سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ وہ شادی شدہ ہے؟ اور شوہر سے ناچاقی کی وجہ سے گذشتہ دو برس سے میکے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور فاخرہ اور ان کے میاں نے اسے اسی غرض سے ہمارے پاس بھیجا ہے کہ ہمارے یہاں وہ اپنے شوہر کی دسترس سے محفوظ رہ سکے گی۔ کیوں کیا کچھ غلط کہہ رہی ہوں میں۔"

"نہیں یہ تو حقیقت ہے لیکن اس کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے کردار پر کیچڑ اچھالنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہوتے ہیں۔ جو انسان کو اتنا — عاجز اور بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے حالات پر گرفت رکھنے کی قوت ہی نہیں رکھتا۔" شعیب منصور نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم کہاں چلے۔ تم تو اب آرام کرو تین روز بعد آئے ہو، بُری طرح تھک رہے ہو گے۔" زینت نے بیٹے کو کھڑا ہوتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں ہاں۔ اب تم تو آرام ہی کرلو بلکہ سکھ چین کی بنسی بجاؤ۔ کہ گھر کی فضاؤں کو تم نے گندگی سے پاک کر دیا ہے۔ خوب عیش کرو خوشیاں مناؤ مگر اتنا سمجھ لو کہ اگر میں اس کی تلاش میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ گندگی۔ وہ غلاظت کا ڈھیر سلوطہ اسی گھر میں رہے گی۔ اور اب صرف فاخرہ بی بی کی نند کی حیثیت سے ہی رہے گی۔"

شعیب منصور بیوی کی بات پر جل کر بولے اور پھر قدم بڑھا کر ایک جھپاکے سے کھانے کے کمرے سے نکل گئے۔ مگر اسفند خاموش اور بلا کوئی تاثر دیے ہی کھڑا رہا۔

"لو سن لیا تم نے سنی۔ یہ سب کہہ کر گویا تمہارے ڈیڈی نے تمہیں چیلنج کیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ان کو مل گئی تو ان سے کوئی بعید بھی نہیں کہ اسے یہیں لے آئیں۔ اپنی بات کو پورا کر کے دکھانے کی عادت ہے نا انہیں۔" زینت بولیں۔

"لیکن ممی بالفرض محال سلوطہ اگر انہیں مل بھی گئی تو گھر میں لانے کے سوا وہ اسے اور کہاں رکھ سکتے ہیں۔ یوں بھی ڈیڈی نے ان کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اور پھر یہ پھپھو بیگم کا نہیں پھوپھا جان کا معاملہ ہے۔ سلوطہ ان کی بہن ہی تو ہیں نا۔ کوئی گھر کی پروردہ تو نہیں۔ اور پھر بھلا اس میں بھائی جان کو چیلنج کرنے کی کیا بات ہے۔ بھائی جان اتنا گھر پہ رہتے ہی کب ہیں۔ اور میری سمجھ میں یہ بات تو" نازو نے کہا۔

"اچھا خیر چھوڑو اس فضول قصے کو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو اپنے بھائی جان کو آرام کرنے دو۔ معلوم نہیں کتنی راتوں سے سوئے بھی ہیں یا مسلسل جاگتے ہی رہے ہیں۔" اصل میں زینت بیٹے کی خاموشی سے اندر ہی اندر ہولے جا رہی تھیں۔ انہوں نے نازو کی باتوں پر بھی دھیان نہیں دیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ انہوں نے بڑے دُلار سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ بیٹے کے دماغ میں خیالات کی کچھ ایسی کھچڑی پک رہی ہے جس کی کھد بد میں ان کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی۔

"...سن رہے ہو بابا۔ جاکر آرام کیوں نہیں کرتے۔ اگر ہسپتال سے کوئی ایمرجنسی کال آگئی تو پھر اتنا موقع بھی نہیں ملے گا۔" انہوں نے اُٹھ کر اس کا بازو ہلا کر کہا۔ تب وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"جاؤ آرام کیوں نہیں کرتے۔ کیا پھر سے نائٹ ڈیوٹی پہ جانا ہے؟" ماں نے کہا تو وہ "اچھا اچھا"۔ "ہاں ہاں" کہتا ہوا کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔ اور تینوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو کچھ دیر تک کمرے کے وسط میں ہی رُک کر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر کچھ سوچ کر۔ فون کی طرف بڑھا۔ کوئی نمبر ڈائل کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے لیے کمرہ ریزرو کرا رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے سوٹ کیس میں چند جوڑے ڈالے اور پھر کریم کو بلا کر وہ سوٹ کیس اس کو تھماتے ہوئے اس نے کمرہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

"صاحب اور بیگم سے کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔" اور پھر وہ سیدھا اپنی کار کے قریب آیا۔ کریم سے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوانے کے بجائے پچھلی سیٹ پہ رکھوایا۔ اور دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے زن سے کار کو بھگاتا ہوا باہر مین روڈ پہ نکل گیا

"ارے باجی جان ذرا باہر آکر تو دیکھیے کون آیا ہے۔" سلمیٰ بیگم کے چھوٹے بھائی کی بیوی۔ صالحہ بیگم نے انہیں پکار کر کہا۔
سلمیٰ بیگم جو اپنے کمرے میں نواڑی پلنگ پر بیٹھی نظر کا چشمہ لگائے اپنے کُرتے کا دامن ترپ رہی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ روکے بغیر پلنگ پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"اے ایسا کون آیا ہے یہیں لے آؤ اسے۔ جس کے لیے دل تڑپ رہا ہے اس کا تو کوئی خط آیا ہے نہ خیر خبر ہی معلوم ہوئی ہے۔ اب میری بلا سے جو بھی آئے۔"

گو آخری دونوں فقرے ________ انہوں نے قدرے نیچی آواز میں کہے تھے لیکن اندر آتے ہوئے اسفند نے سن لیے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا ان کے پہلو میں کھڑا ہو کر بولا۔

"خط اور خیر خبر کے بجائے آپ کا یہ نگوڑ مارا خود ہی حاضر ہو گیا ہے اماں جان۔"

اور اس کی آواز سن کر وہ بھونچکا سی رہ گئیں۔

"ہائیں تم نھنے۔ اے کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ ارے تم کیسے آ گئے بچّے۔"

"جی نہیں خواب نہیں بلکہ آپ جاگتی آنکھوں سے میرا حقیقی وجود دیکھ رہی ہیں لہٰذا، السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔"

وہ ان کے آخری فقرے کا جواب گول کر کے دھم سے ان کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"وعلیکم السلام۔ خوش رہو، شاد و آباد رہو، ہزاری عمر ہو تمہاری۔"

"ارے ارے۔ کیا قیامت کے بعد یہ سمٹوانے کا ارادہ ہے جو مجھے ہزاری عمر کی دعا دے رہی ہیں جبکہ یہاں یہ عالم ہے۔ اٹھائیس انتیس بھی گزارتے دوبھر لگ رہے ہیں۔" وہ مزے سے ان کا تکیہ پلنگ کی پٹی پر رکھ کر ان کے آگے آڑا ترچھا ہو کر لیٹتا ہوا بولا۔

"کیوں دشمن دور پار تمہیں ایسی کیا پریشانی لاحق ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہو۔ پڑھ لکھ کر اگر قابل ہو گئے ہو تو اتنے ہی جتنی تمہاری عمر ہے۔ ارے میری گود میں تو آج بھی تیرا پھول سا وزن ہمکتا محسوس ہوتا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں۔ ابھی تو تیرے منہ سے دودھ کی بُو بھی نہیں گئی۔ ابھی تو تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ یہ کہنا [..] گئیں آپ شاید۔ توبہ توبہ۔ اپنی ایک بات کیا بتا دی کہ آپ حسب عادت فال اور شگون لینے بیٹھ گئیں۔ آپ سے تو کچھ کہنا [..]ت ہے۔"

[اس] نے سلمیٰ بیگم کی نصیحتوں سے گھبرا کر ان کی بات قطع کر کے کہا۔

"اچھا تو کوئی بات بھی ہے۔ ارے تجھے اس قدر غیر متوقع دیکھ کر میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔" اس کے جلے کٹے انداز اور باتوں [..] سلمیٰ بیگم متحیر سی ہو کر بولیں۔

"اُفوہ۔ اماں جان پتا نہیں آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ اور یہاں تھکن کے مارے میرا برا حال ہو رہا ہے۔ بڑی سخت نیند آ رہی ہے [اما]ں جان۔"

وہ ایک طویل سی جمائی لے کر بولا۔ تو سلمیٰ بیگم نے عینک سمیت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"اے کیوں کیا کراچی سے ملتان تک پیدل سفر کیا تم نے جو تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔ یہ کہو کہ [..]ں بات کو ٹالنا چاہ رہے ہو۔ ہاں یہ بتاؤ کہ یہ اچانک اطلاع دیے بغیر کیسے آ گئے تم۔ اور کس لیے آئے ہو۔"

"کس لیے آیا جاتا ہے اماں جان۔ ملنے ملانے کی غرض ہی سے تو نا۔ اب مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں آنے کے لیے پاسپورٹ ویزا اور اجازت نامہ حاصل کرنا بھی ضروری ہوگا۔ ورنہ حاصل کر کے ہی آتا۔ بہرحال اب تو آ ہی گیا ہوں۔" وہ قدرے جھنجلا کر بولا۔

"اے لو بھلا۔ ہمیں چرا دُگے۔ بڈھے طوطوں کو۔ میں سب سمجھتی ہوں تیری۔"

"محاورہ غلط ہو گیا ہے اماں جان۔ ورنہ طوطے نہیں ڈھور ڈنگر چرائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے آپ تو زبان داں ہیں پھر بھی۔"

اس نے سلمیٰ بیگم کی بات پھر قطع کی۔ تو وہ بھی اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے بولیں۔

"ارے بس۔ اب مجھے باتوں میں نہ اُڑا۔ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو تو مجھ سے چھپانا چاہ رہا ہے۔"

سلمیٰ بیگم جو اس کے رگ و ریشے سے واقف تھیں سمجھ گئی تھیں کہ وہ جان کر ٹال مٹول کر رہا ہے۔

"کمال ہے اماں جان۔ ہیں اور بھلا آپ سے کچھ چھپاؤں گا۔ بس ایک ہی معمول سے زندگی گزارتے گزارتے تنگ آ گیا تھا۔ اور آپ [سـ]ے ملنے کو بھی دل چاہ رہا تھا اس لیے چلا آیا۔ اچھا اب تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے پلک جھپکانے کی اجازت دے دیں۔ یقین جانیں [..] راتوں سے نہیں سو سکا ہوں۔" وہ پلنگ پر یونہی آڑا لیٹے لیٹے تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"اچھا اچھا چلو سو جاؤ۔ مگر یہ کونسا طریقہ ہے سونے کا۔ پہلے اپنا یہ بوٹ اتارو۔ اور پیر اُٹھا کر یہاں سرہانے تکیہ رکھ کر آرام سے لیٹو۔"

سلمیٰ بیگم جو سرہانے کی طرف بیٹھی تھیں۔ اسے آرام سے لٹانے کے خیال سے اُٹھتی ہوئی بولیں۔

"مگر اماں جان۔ آپ کے کہنے کے بموجب اگر پیر اُٹھا کر لیٹا تو کیا عجوبہ نہیں لگوں گا۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر پوچھا تو سلمیٰ بیگم اپنی ہنسی روک کر بولیں۔

"اے یہ ذرا ذرا سی بات پکڑنے کی عادت کب سے ہوئی تم کو۔ میں تو آرام سے پیر پسار کر سونے کو کہہ رہی تھی۔ اور اگر نہاؤ نہیں تو کم از کم منہ ہاتھ ہی دھو لو۔ ورنہ کیا یونہی دھول میں اَٹے اَٹے سونے کا ارادہ ہے۔"

"بس اس وقت تو یونہی ٹھیک ہے اماں جان۔ یوں بھی کوئی ابدی نیند تو نہیں سو رہا۔ بس آدھ پون گھنٹے ہی سوؤں گا۔ [اٹھ]نے کے بعد منہ ہاتھ کیا سارا جسم ہی دھو لوں گا۔"

اس نے جوتے تو نہیں اتارے البتہ تکیہ سرہانے کی طرف رکھ کر جوتے پائنتی سے تھوڑے سے آگے نکال کر لیٹتے ہوئے کہا۔

"[..]ے ہے۔ یہ تو کیسی زبان بولنے لگا ہے بچّے۔ تیرے دشمن ابدی نیند سوئیں میرا تو دل ہولا کر رکھ دیا تو نے۔ یوں بھی [ہز]ار بار کہا ہے کہ بدکلام آدمی کی زبان دوزخ کا کندہ ہوتی ہے۔ یوں تو بڑا کہتا ہے کہ تیرے دل میں اللہ کا بڑا خوف ہے۔"

سلمیٰ بیگم اس کی باتوں پر سچ مچ ہول کر بولیں۔

"اچھا اچھا۔ ویری سوری اللہ میاں۔ مگر اب میری اماں جان کو اتنی ہدایت کر دیجیے کہ یہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے سونے تو دے دیں۔"

اس نے جس طرح ہاتھ اٹھا کر اللہ میاں کو مخاطب کر کے کہا۔ سلمیٰ بیگم کو اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو گئی۔

"ارے تو میں نے کب منع کیا ہے۔ جتنی دیر چاہو سو لو۔ اتنے میں تمہارے لیے کھانا تیار کراتی ہوں۔"

سلمیٰ بیگم نے پلنگ کے سرہانے کی کھڑکی کا پردہ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا آج گھر میں کچھ نہیں پکا جو میرے لیے آپ کھانا تیار کراتے جا رہی ہیں۔" اس نے بند آنکھوں کو کھول کر پوچھا۔

"اے پکا کیوں نہیں۔ مگر آج خشکہ (سادے چاول) اور بینگن کا رائتہ ہی بنایا ہے دلہن نے۔ اصل میں نوکر تو کوئی ہے نہیں۔ اب زیادہ جھکندن نہیں کرتیں وہ کھانے پکانے میں اور پھر خیر سے دم ہی کتنے ہیں۔ مجھ سمیت کل چھ۔ اللہ صالحہ کو بھی ایک بیٹی دے دیتا تو کم از کم وہ ان کا ہاتھ تو بٹا دیا کرتی۔"

"اُفوہ اماں جان ان وضاحتوں کی کیا ضرورت ہے بھلا کیا میں کوئی غیر ہوں۔ اپنے ماموں کے یہاں آیا ہوں۔ جو کچھ دال دلیا انہوں نے پکوایا ہو گا اس میں، میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔"

وہ سلمیٰ بیگم کی کمپلیکس میں ڈوبی ہوئی گفتگو پر چڑ کر بولا۔

"اے دال دلیا کیسا خدا کے فضل سے ہر نعمت گھر میں موجود ہے یہ تو کہو کہ صالحہ بیگم پکانے رکانے کی کھکھیڑ سے کبھی کبھی جی چرا جاتی ہیں اور اب وہ تم کو صرف خشکے پر تو نہیں ٹرخائیں گی۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"اچھا اگر یہی بات ہے تو اڑد کی وہی دال جو میں بہت شوق سے کھاتا ہوں پکوا دیجیے مگر اس کے ساتھ آم کا اچار بھی ہونا چاہیے اصل میں ہمارے یہاں تو ایسی چیزوں سے بہت الرجک رہتے ہیں نا، اس لیے عرصہ ہو گیا کھائے ہوئے۔" وہ پھر آنکھیں بند کر کے بولا۔

"اچھا۔ وہ بھی تیار کر دوں گی۔ صالحہ دلہن کے یہاں تو ماشاء اللہ سات قسم کے اچار ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ بڑی سگھڑ ہیں میری بھاوج اور ہاں کیا تم اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لائے۔؟"

"لایا کیوں نہیں۔ مگر صرف ایک سوٹ کیس لایا ہوں جو آتے ہی ممانی جان کو تھما دیا تھا۔"

اس نے آنکھیں بند کیے کیے غنودگی کے عالم میں کہا اور پھر کروٹ لے لی اور سلمیٰ بیگم بھی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"لو دیکھا دلہن ایک تو آیا بھی ہے تو یوں جیسے میری سات پشت پر احسان کر رہا ہو۔ دوسرے نہ معلوم کون سے ہل جوت کر آیا ہے جو آتے ہی سو بھی گیا۔ اور یہ کہہ کر سویا کہ اڑد کی پھریری دال اور آم کے اچار کے سوا کچھ نہیں کھائے گا۔ لو اب نئے سرے سے اس کے لیے دال بھی تیار کرو۔"

کمرے سے باہر نکل کر سلمیٰ بیگم نے اپنی بھاوج صالحہ بیگم سے کہا۔

"تو دال تیار کرنے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں باجی جان۔ زیادہ سے زیادہ آدھ پون گھنٹے میں تیار ہو جائے گی۔ آم کے اچار کا مرتبان تو منہ تک بھرا رکھا ہے۔ لیکن بھلا یہ کوئی کھانا ہو گا۔ اتنے دنوں بعد تو اسفند یہاں آئے ہیں۔ شامی کباب کا پسا ہوا قیمہ فرج میں رکھا ہے میں چٹکی بجاتے میں کباب بھی تل دوں گی اور ایک آدھ چیز اور۔"

"نہیں۔ تکلف سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ اس نے جس چیز کی فرمائش کی ہے وہی کھائے گا۔ ہاں اگر وافر مقدار میں دودھ ہو تو تھوڑی سی کھیر پکا لینا۔ مگر ذرا جلدی کرنا۔ دوپہر کا کھانا وہ ساڑھے بارہ بجے کھا لیتا ہے۔" سلمیٰ بیگم نے بھاوج کی بات کاٹ کر کہا۔

"خیر آپ اس کی تو فکر نہ کریں۔ ابھی صرف گیارہ ہی بجے ہیں ایک گھنٹے کے اندر اندر دونوں چیزیں تیار کر دوں گی۔" صالحہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔

اور کچن کا رخ کرنے لگیں تو سلمیٰ بیگم نے پوچھا۔

"مگر اڑد کی دال کس طریقے سے پکاؤ گی؟"

"اسی طریقے سے جیسے مونگ کی پھریری دال پکتی ہے۔" صالحہ بیگم نے جاتے جاتے کہا۔

"نہیں۔ جو دال اسے پسند ہے وہ دوسرے طریقے سے پکتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ایک پاؤ دال پانی میں بھگو دو اور پندرہ منٹ کے بعد دال جب نرم پڑ جائے تو اسے دھو کر اس میں اتنا پانی ڈالنا کہ دال سے ایک پور اونچا ہو۔ سات چوتھے(؟) لہسن کے اور دو انچ کے برابر ادرک باریک کاٹ کر اس میں ڈال دینا۔ اور ہاں تو ثابت سرخ مرچیں بھی۔ جب دال کا پانی خشک ہو جائے اور وہ گل جائے تو اسے زیرے اور پیاز سے بگھار دینا۔ اور اس پر پودینے کی پتیاں کتر کر اور تھوڑی سی پسی ہوئی سونٹھ چھڑک دینا۔ تھوڑی سی سونٹھ تو گھر میں موجود ہو گی نا۔" سلمیٰ بیگم نے اڑد کی دال پکانے کی ترکیب بتا کر پوچھا۔

"نہیں پسی ہوئی تو نہیں البتہ ثابت سونٹھ ضرور موجود ہے۔ خیر میں پیس کر ڈال دوں گی۔" صالحہ بیگم بولیں۔

"ارے نہیں رہنے دو اب کہاں سونٹھ پیسو گی۔ یوں بھی بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ کی کھکھیڑ پڑ گئی تمہارے سر۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"ارے نہیں نہیں باجی جان۔ آپ کا بھانجا کیا ہمارے لیے غیر ہے۔ اور اللہ اسے خوش رکھے ملتا بھی اسی طرح ہے جیسے ہم اس کے اپنے سگے ہوں۔ غرور تو نام کو بھی نہیں اس کے اندر۔ آتے ہی پہلے انہیں پوچھا پھر تینوں بچوں کو۔ اور مذاق کرنے لگا کہ آپ کے یہاں دھرنا دینے آیا ہوں۔ میں نے کہا جم جم آؤ۔ سر آنکھوں پر آؤ یہ بھی تمہارا گھر ہی ہے۔" صالحہ بیگم نے بڑی لگاوٹ سے نام لیتے ہوئے بتایا۔

"ہاں اللہ اسے عمر دے بڑا ہی منکسر المزاج اور مخلص بچہ ہے۔ اے ہاں وہ اس کا سوٹ کیس کہاں ہے۔ کیا لایا بھی ساتھ یا یونہی چلا آیا مجھے۔"

"نہیں نہیں سوٹ کیس تو لائے ہیں اسفند میاں۔ میں نے اسے ارشد کے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔ بستر وغیرہ بھی ابھی نیا لگوا دوں گی۔ آپ کا کمرہ تو چھوٹا ہے اب اس میں بھلا وہ کہاں رہ سکیں گے۔ میں نے سوچا جب تک وہ یہاں رہیں گے اس وقت تک ارشد بیٹھک والے کمرے میں سو جایا کرے گا۔" صالحہ بیگم نے کہا۔

"نہیں تم ارشد کو بے ٹھکانے نہ کرو۔ سائنس کا اسٹوڈنٹ ہے بے چارا اس کی پڑھائی میں بھی خلل پڑے گا۔ تم تو ایک پلنگ میرے کمرے میں ڈلوا دو۔ وہ میرے ساتھ ہی رہ لے گا۔ اور یہ کسے معلوم کہ وہ یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے آیا بھی ہے یا نہیں۔ جس طرح اچانک ہی آیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ضروری کام سے ہی یہاں ملتان آیا ہے۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"اچھا تو کیا آپ نے پوچھا نہیں اسفند میاں سے۔" صالحہ بیگم نے پوچھا۔

"نہیں نوبت ہی کہاں آئی۔ آتے ہی تو پڑ کر سو گیا اب اٹھے گا تو پوچھوں گی۔" سلمیٰ بیگم نے بتایا۔

تو صالحہ بیگم خاموش ہو کر اس کے لیے دال بنانے کچن میں چلی گئیں اور سلمیٰ بیگم اسفند کی نیند میں خلل پڑ جانے کے ڈر سے اندر کمرے میں نہیں گئیں بلکہ وہیں اندرونی برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچنے لگیں۔

ایک تو اس نے شیو نہیں کیا تھا دوسرے اس کے چہرے پر اضمحلال سا تھا۔ اور تیسرے ان کے بہت سے سوالوں کا جواب بھی وہ گول کر گیا تھا۔ اس پر مستزاد آتے ہی تھکن اور نیند کی رٹ لگانا۔ گویا ان کے خیال میں دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ گو وہ بہت مضبوط طبیعت کی مالک تھیں پھر بھی چونکہ یہ معاملہ ان کے لخت جگر کا تھا اس لیے کافی متجسس ہی نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک آپ ہی آپ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر بھاوج کے پاس باورچی خانے میں چلی آئیں۔

"تم اکیلی کیا کیا کرو گی۔ لاؤ میں بھی تمہارا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دوں۔" انہوں نے بھاوج سے کہا۔

تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے بولیں۔

"کام ہی کتنا ہے جو آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ تو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھیے باجی جان۔ میں ساری چیزیں آپ کی مرضی کے مطابق ہی پکاؤں گی۔ اتنا اطمینان رکھیے۔"

"اے لو شرمندہ تو تم مجھے کر رہی ہو۔ ورنہ میرا مقصد یہ تو نہ تھا۔ میں تو زبردستی کا کام تمہارے سر پڑ جانے کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" سلمیٰ بیگم خفیف سی ہو کر بولیں۔

"لیجیے زبردستی کا کام کیسا یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آج آپ نے اپنا کوئی کام تو مجھے کرنے کو دیا ہے۔ آپ پر تو یا سے تو ایسا کوئی خیال ہی نہ لائیے" صالحہ بیگم عجز و انکسار سے کام لیتی ہوئی بولیں۔

"ہاں ہاں خدا تمہیں خوش رکھے بوڑھ سہاگن ہو۔ تم جتنا میرا خیال رکھتی ہو اتنا تو اگر میری کوئی بیٹی بھی ہوتی تو وہ بھی نہ رکھتی" سلمیٰ بیگم ان کی باتوں پر خوش ہو کر بولیں۔

"لیجیے دعا بھی دیتی ہیں تو ہمیشہ اپنے بھائی کو" صالحہ بیگم ہنس کر بولیں۔

"اے لو تمہارا سہاگ سلامت رہے گا تو کیا تم سہاگن نہیں رہو گی سارے بیوی عورت کے لیے اس سے بڑھ کر کون سی دعا ہوتی ہے۔ اچھا خیر خدا تمہیں عمر دے۔ اپنے بچوں کی بہاریں دیکھو اور جو کچھ میرے لیے کر رہی ہو اس کی جزا دے"

"جی ہاں اور خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے کہ ہمیں آپ کی دعائیں ہی درکار ہیں" صالحہ بیگم نے ان کی دعا سے متاثر ہو کر کہا۔ پھر بولیں۔

"اچھا اب آپ اندر چلیے۔ ورنہ آپ کی وجہ سے میں سچ مچ کوئی چیز خراب کر دوں گی۔ آپ کا رعب بھی تو ایسا پڑتا ہے ویسے بھی اتنے برس گزر گئے اسکول چھوڑے مگر آپ کا رعب اب بھی جوں کا توں قائم ہے"

اصل میں صالحہ بیگم جس اسکول میں پڑھتی تھیں اس میں سلمیٰ بیگم ہیڈ مسٹریس کے عہدے پر فائز تھیں اور انہوں نے اپنے بھائی کے لیے صالحہ بیگم کا انتخاب کیا تھا۔ بھاوج کی بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ہنستی ہوئی باورچی خانے سے نکل آئیں۔

یوں تو سلمیٰ بیگم کے بھائی ان کی طرح زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ اصل میں ان کے والد کا انتقال ان کے عہد طفولیت میں ہی ہو گیا تھا۔ تین جوان بہنوں اور ایک بیوہ ماں کا گزر بسر سلمیٰ بیگم کی قلیل سی تنخواہ میں نہ ہوتا تھا۔ اور ادھر باپ بھی کوئی اثاثہ چھوڑ کر نہیں مرے تھے۔ بیچارے ایک نیم سرکاری محکمے میں کلرک لگے ہوئے تھے۔ سلمیٰ بیگم سب سے بڑی لڑکی تھیں اور ان دنوں جب ان کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا وہ ایک پرائمری اسکول میں معلمہ کی حیثیت سے نئی نئی ملازم ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں استانیوں کی تنخواہیں سو سوا سو روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ بہت سے بہت سب ملا کے ڈیڑھ سو بن جاتے تھے۔ اور دم تھے پورے چھ۔ اس پر باپ کی بھی پینشن ہو گئی تھی۔ اور اس پر مستزاد جب باپ نے ایک دن سرے سے زندگی سے ہی ریٹائرمنٹ حاصل کر لی تو۔ اکٹھے پانچ آدمیوں کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کے لیے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

سلمیٰ بیگم کی دلی خواہش تو یہی تھی کہ اپنے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں مگر ان کے حالات نے انہیں ایف اے یا انٹر سے زیادہ پڑھنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ چنانچہ سلمیٰ بیگم کی کوشش اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے ان کے بھائی——

—— صابر علی کو شروع میں تو ریلوے کے محکمے میں ٹائم کیپر کی ملازمت مل گئی تھی جس کے بعد سلمیٰ بیگم کے بہت کہنے سننے اور زور دینے پر انہوں نے نئے سرے سے تعلیم کا آغاز کیا۔ یعنی ملازمت کے ساتھ ساتھ کامرس کا کورس شروع کر دیا اور وقت نہ ملنے کے باعث چار سال کے بجائے پانچ سال میں بی کام کیا اور پھر ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ کا منصب سنبھال لیا۔ پہلے کئی برس لاہور میں رہے پھر ان کا تبادلہ ملتان کی برانچ میں ہو گیا اور اب وہ پورے آٹھ سال سے ملتان میں ہی مقیم تھے۔ قناعت پسند آدمی تھے ورنہ کئی برس کا تجربہ پاس تھا۔ چاہتے تو بڑی آسانی سے کسی بڑے بینک میں ملازم ہو جاتے۔ مگر انہیں نئے نئے در جھانکنا بالکل گوارا نہ ہوا۔ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی سے ملتان ہی میں مکان بنوایا اور وہیں رہ بسے۔ تینوں لڑکوں کو اعلا تعلیم دلوا رہے تھے اور پھر گھر کے دیگر اخراجات اس پر مہنگائی کا زمانہ اور اس پر اچھا کھانا اور اچھا پہننا۔ مشاہرہ کل ڈھائی ہزار روپے تھا۔ ادھر بچتا کچھ بھی نہ تھا۔ ادھر پچھلے دنوں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ گھٹنوں میں گنٹھیا کی تکلیف نے کئی سال تک اٹھنے کے قابل بھی نہ رکھا تھا۔

بس سلمیٰ بیگم جو کچھ ان کا لگا بندھا آتا تھا۔ وہ بھائی بھاوج اور بھتیجوں پر خرچ کر دیتی تھیں اور ان کا بھائی بھاوج اور بھتیجوں کے سوا تھا ہی کون۔ ایک بہن انتقال کر چکی تھیں اور چھوٹی بہن بیاہ کر بہت پہلے ہی مدراس چلی گئی تھی۔ صرف دو یا تین بار ہی ان سے ملنے پاکستان آسکی تھی۔ اور اب تو وہ بھی بوڑھی ہو چکی تھی اور اگر انہوں نے بھائی کے لیے صالحہ بیگم کا انتخاب

[صالحہ بیگم نے بھی بھاوج] بننے کے بعد انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ بڑی خدمت کرتی تھیں وہ بڑی نند کی اور اسی قدر ادب و احترام بھی۔ اور سلمیٰ بیگم اس وقت انہی کی اتنی محبت، محنت اور جانفشانی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

لیکن باہر آ کر بھی اپنے کمرے میں نہیں گئی تھیں۔ لیکن آخر کب تک نہ جاتیں۔ انہیں اس وقت اسفند کا سونا دو پہر سے کھل رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد آیا تو پڑ کر سو ہی گیا نہ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔ یہاں ابھی تک اس سے بات کہنے سننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیسا بے پروا اور بے غرض بچہ ہے۔ لو بھلا یہ تک پوچھنے کا موقع نہیں دیا کہ سب کیسے ہیں۔ اور اس کے بچے کا کیا حال ہے — اور — اور وہ بچی — سلوطا — اس کی کیسی گزر بسر ہو رہی ہے۔ بس اب بہت ہو چکا سونا سلانا۔ ابھی جا کر جگاتی ہوں اس شرارت کے پڑیا کو۔ وہ یہی سب سوچتے سوچتے آپ ہی آپ کمرے میں جا پہنچیں — دیکھا تو وہ سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے آنکھیں کھولے سامنے دیوار کو دیکھ رہا ہے۔

"ہاں بھئی یہ اچھا ہی ہوا کہ تم جاگ گئے۔ ورنہ مجھے تو سخت وحشت ہو رہی تھی تمہارے سونے سے" سلمیٰ بیگم اسے جاگتا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو کر بولیں۔

"اوہ! اماں جان! تھوڑی دیر تو اور سو لینے دیتیں۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ جو آپ کو وحشت ہونے لگی" وہ دیوار سے بدستور ٹکٹکی باندھے باندھے بولا۔

"اچھا تو کیا تم آنکھیں کھول کر سونے لگے ہو۔ تمہارا تو بھئی باوا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے کراچی میں رہ کر" سلمیٰ بیگم اس کی باتوں پر چہک کر بولیں۔

"ہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے ناں۔ میں تو نہیں ہوا" اس نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے سے نکال کر ان کی طرف کروٹ لی اور تکیے پر کہنی ٹکا کر تھوڑا سا اونچا ہو کر بولا۔

"اب اگر نہیں اٹھوں گا تو کہیں گی کہ تم کو بڑوں کا ذرا سا بھی احترام نہیں ہے۔ آرام سے پسرے پڑے ہو"

"ارے جا زیادہ باتیں نہ بنا۔ ابھی آتے ہی جو میرے آگے ڈھ گیا تھا۔ اس وقت تہذیب اور اخلاق کا خیال نہیں آیا تھا تجھے۔ خیر اب اٹھ گئے ہو تو جاؤ جا کر پہلے نہا دھو لو۔ اس کے بعد باتیں مٹھارنا۔"

"او ہو اماں جان! آپ کو میرے نہانے کی اتنی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے۔ صبح نہا کر ہی چلا تھا — ہو — ہوٹل — گھر سے —"

"ہیں یہ ہوٹل — گھر کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں، اصل میں میں — ہاسپٹل کہنا چاہ رہا تھا۔ ہوٹل نکل گیا منہ سے۔ حالانکہ چلا تو گھر سے ہی تھا" اس نے فوراً ہی بات بنائی۔ ہی نہیں نبھائی بھی۔ سلمیٰ بیگم جواب میں خاموش ہی رہیں۔ انہیں چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ زیادہ دیر تک کھڑی بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔ مگر وہ آیا تھا ان کا نور نظر — اس کے آنے کی خوشی میں آج اتنا چل پھر لی تھیں۔ وہ اس کے پاس ہی پلنگ پر ٹکتی ہوئی بولیں۔

"صالحہ سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارے لیے دال پکا رہی ہیں۔ بس بارہ بجے تک کھانا تیار ہو جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ابھی سو کر اٹھ جاؤ گے۔ ورنہ تمہارے لیے چائے ہی بنوا دیتی"

"چائے میں صرف صبح کے ناشتے پر پیتا ہوں۔ آپ کو شاید معلوم ہے۔ اب تو بس کھانا ہی کھاؤں گا اور اس کے بعد ذرا گھومنے پھرنے نکلوں گا۔"

"ارے ایسی جلدی کیا ہے گھومنے پھرنے کی۔ اب آئے ہو تو اطمینان سے گھوم پھر لینا۔ اور یہاں ملتان میں رکھا ہی کیا ہے۔ گرد۔ گدا۔ گور۔ گرما۔ صرف چار چیزیں ہی تو مشہور ہیں ملتان کی اور پھر اس بھری دوپہر میں بھی بھلا کوئی گھومنے پھرنے نکلتا ہے۔ اور ہاں تم آئے کتنے دنوں کے لیے ہو؟" سلمیٰ بیگم نے اس کے گھومنے پھرنے پر بہت دھیمے انداز میں اسے پچکار کر پوچھا۔

"بس جب تک یہاں کا آب و دانہ میری قسمت میں ہو گا۔" اس نے کہا۔

"اے چل — مجھ سے معموں میں باتیں نہ کر — مجھے سب معلوم ہے کہ تو میری ہر بات کو ٹال رہا ہے۔ مگر آخر

ماجرا کیا ہے۔ پہلے تو تُو مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیا کرتا تھا۔ کیا اب میں اس قابل نہیں رہی ہوں کہ گول مول جواب پر ٹرخا دیا جائے۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"ارے نہیں اماں جان، صرف ایک ہی تو راز دار اور دمساز ہے میرا۔ میری اماں جان! پھر قابل کیسے نہیں رہیں گی آپ۔ اپنے دل کا سارا غبار یہیں تو نکالنے آیا ہوں۔ بتا دوں گا سب مگر آہستہ آہستہ۔" وہ جو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس نے سلمیٰ بیگم کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ اور سلمیٰ بیگم کھل سی اٹھیں۔

"اے تو پھر اتنی جھجک ہیچ کیوں کی۔ پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ بعد میں پوچھ لینا۔ خیر میں تمہارا سوٹ کیس یہیں منگوا دیتی ہوں۔ صالحہ سے کمرے میں ایک پلنگ اور ڈالنے کو کہہ دیا ہے۔ ویسے دلہن کا ارادہ تو تمہیں ارشد کے کمرے میں ٹھہرانے کا تھا مگر میں نے کہا۔ اتنے دن بعد تو میرا بچہ آیا ہے میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گی۔" سلمیٰ بیگم آپ ہی بولتی رہیں اور وہ خاموشی سے ٹیک لگائے بیٹھا نا معلوم کیا سوچتا رہا۔

"اے ہاں، تم نے تو آتے ہی سونے کی ایسی راگنی الاپی کہ میں تو یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ گھر میں سب کیسے ہیں۔ نازو اور اس کے بچے کا کیا حال ہے۔ سنا تھا۔ اس کا کیس بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ نئی زندگی ملی ہے اسے۔"

"جی ہاں۔ واقعی نازو کو نئی زندگی ہی ملی ہے۔ ورنہ میں تو بالکل مایوس ہی ہو گیا تھا اس کی طرف سے۔ خدا کا شکر ہے بچ گئی اور اب ماں بیٹے دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور آج کل ہمارے یہاں ہی ہیں۔ باقی اور بھی سب خیریت سے ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز میں بتایا جیسے محض ان کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"اچھا۔ اور تمہارا کیا حال ہے۔ تم تو ہسپتال میں ملازم ہو۔ کیا چھٹی لے کر آئے ہو یا کوئی سروے کرنے کی غرض سے ادھر کا رخ کر لیا ہے۔" سلمیٰ بیگم نے پوچھا۔

"جواب نمبر ایک کہ میرا حال ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں۔ جواب نمبر دو۔ ہسپتال کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر آیا ہوں۔ اور ان دونوں جوابوں کے بعد جواب نمبر تین کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔" اس نے کچھ بیزار کن سے انداز میں کہا۔

"اے ہے یہ ہسپتال کی سروس کیوں چھوڑ دی تم نے نخنے۔ مانا کہ خیر سے صاحب جائیداد ہو۔ بہت کافی بینک بیلنس بھی رکھتے ہو پھر بھی بیٹا۔ یہ روپیہ پیسہ تو ہاتھ کے میل کی طرح ہوتا ہے جو ڈھلتے ہی صاف ہو جاتا ہے اور پھر وہ جو کہتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ تو اسی لیے تو کہتے ہیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ تو منٹوں میں جاتا ہے مگر آتا بڑے جوکھوں سے ہے۔ میرا مطلب ہے ملازمت کرتے رہتے تو جمع جکڑی میں اضافہ ہی ہوتا رہتا۔"

سلمیٰ بیگم نے اس کے ملازمت چھوڑ دینے پر ایک لیکچر سا دے ڈالا۔

"لیکن اماں جان! میں نے ہمیشہ کے لیے تو نہیں چھوڑی ملازمت۔ کچھ عرصے بعد پھر کہیں ڈھونڈ لوں گا۔" وہ ان کی ناصحانہ سی گفتگو پر قدرے چڑ کر بولا۔

"اے ملازمت میں کیا رکھا ہے بیٹے! تم تو اپنا ذاتی کلینک کھولو۔ روپے پیسے کی بھی تمہارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ تم ماشاء اللہ ہونہار ڈاکٹر ہو۔ اتنی ساری ڈگریاں تمہارے پاس ہیں۔ چند ہی دنوں میں دھن برسنے لگے گا دھن۔" سلمیٰ بیگم نے مشورہ دیا۔

"جی ہاں، خیال تو میرا بھی شروع سے یہی ہے لیکن فی الحال میں کسی بات میں بھی خود کو پابند کرنا نہیں چاہتا۔ اماں جان! اصل میں میں آزاد منش آدمی ہوں۔ ایک جگہ بندھ کر بیٹھ سکتا ہوں نہ ہی کسی کام کا بوجھ اپنے اوپر ڈالنے کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ بس اپنی اسی فطرت کے موجب کراچی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسی لیے ملازمت پر بھی لات مار کر چلا آیا۔"

اسفند نے اتنی دیر میں پہلی بار اپنے بارے میں بہت کھل کر بتایا۔

"اچھا تو کیا یہاں ملتان میں تمہارے مطلب کی کوئی ملازمت تمہیں مل جائے گی؟" سلمیٰ بیگم نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں یہاں مستقل اقامت کی غرض سے تو نہیں آیا۔ صرف تین چار روز قیام کی غرض سے آیا ہوں۔ وہ بھی صرف آپ سے ملنے۔ اس کے بعد آگے نکل جاؤں گا۔ اور جہاں میرے مطلب کی ملازمت ملے گی وہ کر لوں گا۔" اس نے بتایا تو وہ

صرف چار دن قیام کا سن کر رنجیدہ سی ہو گئیں۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ بلکہ موضوع ہی پلٹ دیا۔

"...اور تمہارے چھوٹے ابا کیسے ہیں۔ بے چاری چھوٹی دلہن ہی مجھے خط کے ذریعے سب کی خیریت سے مطلع کرتی ہیں۔ مگر کافی عرصے سے ان کا بھی کوئی خط نہیں آیا۔"

"...وہ لوگ بھی بالکل خیریت سے ہیں۔ اصل میں چھوٹے ابا نے حال ہی میں دادو میں کچھ اراضی خریدی ہے۔ بس آج کل اسی ... لگے ہوئے ہیں۔ ویسے ڈیڈی سے تو آپ کی خط و کتابت رہتی ہے نا۔"

"...نہیں کہاں۔ انہوں نے تو بس جب میں یہاں آئی تھی تو شروع شروع میں خط کے ذریعے صابر علی کی خیریت ضرور معلوم کرائی تھی اور بس۔ یوں بھی بھلا مجھ سے کون خط و کتابت کرے گا۔ نازو کے بچے کی پیدائش پر مبارک بادی کا تار بھی دیا تھا اور خط بھی لکھا تھا لیکن مجھے معلوم ہے زینت دلہن کو بیٹی کی وجہ سے فرصت ہی کہاں ملی ہو گی جو میرے خط کا جواب دیتیں۔ لیکن ...ایسی باتوں کا بالکل خیال نہیں کرتی کیونکہ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔" سلمیٰ بیگم نے ڈھکے ڈھکے انداز میں سوتیلے بیٹوں اور بہو کی بے رخی کا شکوہ کیا۔

"لیکن احساس تو کرتی ہیں نا ورنہ پھر مجھے جتاتی ہی کیوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"خیر چھوڑو۔ احساس کروں یا نہ کروں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بتاؤ کہ سلوط کیسی ہے۔ فاخرہ اور ثاقب تو اب تک واپس آ گئے ہوں گے۔" انہوں نے اس کی بات کا نوٹس لیے بغیر پھر بات کا رخ موڑا۔

"نہیں وہ دونوں تو اشتہاری ملزم سے بن گئے ہیں کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہیں۔ البتہ آپ کی وہ۔ بیچاری غریب گھر چھوڑ کر چلے کہیں چمپت ہو گئی ہے۔" تو سلمیٰ بیگم اچھلنے کے سے انداز میں بولیں۔

"ہیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ اتنی بڑی بات۔ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ بلاوجہ ہی اس بے چاری کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہو۔ وہ بھلا کیوں جانے لگی کہیں۔ وہ بھی بغیر کچھ بتائے۔ کچھ تو اللہ کا خوف کرو بچے۔"

سلمیٰ بیگم نے بری طرح اسے لتاڑا تو وہ چھت کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اللہ اللہ۔ کیسے کیسے ہمدرد پیدا کر دیتا ہے تو غلط اور ریا کار لوگوں کے۔ کس قدر حمایت کی جا رہی ہے اس مکار لڑکی کی جو پورے ایک ڈیڑھ سال ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور جب اس کی اصلیت کا بھانڈا پھوٹا تو یہیں چل دے کر کہیں غائب ہو گئی۔" وہ جوش میں آ کر آگے سرکا اور پیر لٹکا کر بڑے جلے کٹے انداز میں بولا۔

"ہے ہے یہ تم کیا کہہ رہے ہو بچے۔ کبھی تو آدمیت سے بات کر لیا کرو اور تم نے کیا وطیرہ اختیار کیا ہے مجھ سے بات کرنے کا کیا میں نے تمہیں یہی تربیت دی تھی کہ تم بڑوں کا ادب رکھو نہ لحاظ۔"

"لیجیے اب سچی بات کہہ دی تو یہ کہا جا رہا ہے۔ آپ تو میری قبلہ و کعبہ ہیں امی جان۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا۔ جب کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔" وہ کچھ برا مان کر بولا۔

"ہاں ہاں تو میں کون سا تمہیں جھٹلا رہی ہوں مگر یہ کیا سن رہی ہوں سلوط کے بارے میں کہیں کسی نے تمہیں اس کے خلاف ورغلایا تو نہیں۔ ورنہ آخر اس کی کس بات کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے اور گھر چھوڑ کر وہ کہاں جا سکتی ہے۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"اب یہ تو خدا ہی جانے لیکن کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ تھی۔" اسفند نے بڑے تلخ و ترش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں معلوم کیوں نہیں تھا۔ بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ شادی شدہ ہی نہیں طلاق یافتہ بھی ہے۔" سلمیٰ بیگم بولیں۔

"ہیں۔ طلاق یافتہ۔ مگر ممی نے تو کچھ اور ہی بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کو اس لیے چھوڑے بیٹھی ہے کہ وہ بوڑھا ہے۔"

"اچھا۔ اگر تمہاری ممی نے تمہیں یہ بتایا ہے تو یہی درست ہو گا۔ کیونکہ مجھے تو اس کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں، اور معلوم بھی کیسے ہو گا۔ فاخرہ سے ملے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔"

"بہرحال اب یہی دیکھ لیجیے اماں جان۔ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا تو اس نے بھی آپ کو کچھ نہیں بتایا۔ ... بنانے کے ساتھ ساتھ وہ آپ کی ہمدردیاں اور عنایتیں بھی سمیٹتی رہی۔ مگر میں بھی اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا

— نہ تھا۔ میں بھی اس سے اگلوا کر ہی رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راتوں رات چپکے سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔"
اسفند یہ سب کہتے کہتے آپ ہی آپ سلگ سا پڑا۔ اور سلمیٰ بیگم نے چپ سادھ لی جیسے اب بھی انہیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ ان کی اس خاموشی پر وہ چڑ کر بولا۔

"آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اگر وہ شادی شدہ بھی تھی۔ اور اس نے اس بات کو ہم سے چھپایا بھی تھا۔ تو اس میں بگڑنے اور برا ماننے کی کیا بات تھی تو ساتھ کے ساتھ آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ موصوفہ مجھ سے محبت کا کھیل رچا کر مجھے بھی نہیں اور ہیں ان کے جھانسے میں ایسا آیا تھا کہ سچ مچ چاروں خانے چت ہو گیا تھا۔ وہ تو کلائمکس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس ناٹک کا ڈراپ سین ہو گیا جو انہوں نے معصومیت اور شرافت کا لبادہ اوڑھ کر رچایا تھا۔ ورنہ —"

"نہیں نہیں۔ وہ ایسی بے کردار لڑکی ہرگز نہیں ہے بیٹے۔ تمہاری ہر بات کا یقین کر سکتی ہوں مگر اس بات سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتی۔" سلمیٰ بیگم اس کی بات کاٹ کر ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"نہیں اماں جان۔ اس نے جو شرافت اور معصومیت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ آپ بھی اس سے دھوکا کھا گئی ہیں۔ ورنہ میں خود پر گزری سنا رہا ہوں کسی ہما شما کا قصہ تو بیان نہیں کر رہا۔ واقعی وہ بہت مکار اور چالاک لڑکی تھی۔ تبھی تو بھید کھل جانے پر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور ادھر وہ ہمارے ڈیڈی صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسی کا کلمہ پڑھے جا رہے ہیں۔ اور اسے ہی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"ہاں تو وہ بھی جہاندیدہ انسان ہیں۔ اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے اور میں نے بھی ایک دنیا دیکھ رکھی ہے۔ لاکھوں نہ سہی ہزاروں لڑکیاں میری نظر سے گزری ہیں۔ میں نے انہیں پڑھا یا بھی ہے اور آزمایا بھی۔ میں اب بھی تم سے یہی کہتی ہوں کہ وہ ایسی لڑکی نہیں جیسا تم اسے سمجھ رہے ہو۔ دیکھو میری نظروں سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی جن دنوں میں وہاں تھی۔ تو اس کی ذات میں تمہاری بڑھتی ہوئی دلچسپی بھی میری نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ تم اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔ محض اس سے باتیں کرنے کی غرض سے بلا مقصد ہی میرے کمرے میں آجایا کرتے تھے اور تمہیں دیکھ کر اس کے چہرے سے جو تاثرات ہویدا ہوتے تھے ان سے خوف اور گریز کا ہی اظہار ہوتا تھا۔ اس روز سہیل منصور کے یہاں دعوت میں بھی تمہارے بے ساختگی کے مظاہرے سے وہ خوف کے مارے نڈھال سی ہو گئی تھی۔ اگر ایسی ویسی ہوتی تو اس کے بجائے خوش ہوتی اتراتی اور تمہیں رجھاتی لبھاتی اور اگر وہ شادی شدہ بھی تھی تو تمہیں اس کے بارے میں اتنی غلط رائے قائم کرنی نہیں چاہیے تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کن مجبوریوں میں گھری ہوئی تھی۔ اور اس پر کیا بپتا پڑی تھی — جو اپنا گھر بار چھوڑ کے تمہارے در پر آ بیٹھی تھی۔"

سلمیٰ بیگم کو اس کی الزام تراشی پر تاؤ آ گیا تو انہوں نے اچھی طرح اسے پھٹکار ڈالا۔ مگر چونکہ معاملہ ابھی تازہ تازہ تھا۔ اور اسفند پر اپنی ناکامی کا غم و غصہ سوار تھا۔ اس لیے اتنی بڑی تقریر نما جھاڑ سن کر بھی وہ قائل نہیں ہوا۔ ان کے پاس سے اٹھتا ہوا بولا۔

"خیر، خیر اگر میرے ساتھ یہ سب نہ ہو گزرتا تو شاید میں آپ کے ان ٹھوس دلائل پر ایمان لے آتا۔ یوں بھی سنی سنائی کا قائل ہوں نہ سنی سنائی پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اگر سچ پوچھتی ہیں تو میں نے ہی اسے گھر سے چلے جانے پر مجبور کیا ہے میں نے اسے گھر سے نکالا ہے اور یہ بات میں ڈیڈی کو بتا چکا ہوں۔ اس لیے اب مزید اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ ہو تو بہتر ہے۔"
سلمیٰ بیگم سمجھ گئی تھیں کہ چونکہ اس کے جذبۂ عشق نے بڑی سخت چوٹ کھائی ہے اس لیے وہ اس قدر آپے سے باہر ہو رہا ہے تو پھر مزید کچھ سمجھانا بے سود ہی ہوگا۔ لہٰذا خاموش رہنا ہی بہتر ہے کہ یوں بھی اگر عقل سے کام لے تو جتنا کچھ سمجھا دیا ہے وہی بہت ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہاں چھوڑو۔ بلکہ ان دل آزار باتوں کو بھول ہی جاؤ اور آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ میں تمہارے لیے بھی کھانا لاتی ہوں۔" مگر اس نے کہا۔

"نہیں۔ میں سب کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ ماموں جان تو آ گئے ہوں گے نا؟"
"نہیں وہ تو شام کو آئیں گے۔ البتہ ارشد وغیرہ ضرور آ گئے ہوں گے۔ اچھا آؤ چلو سب کے ساتھ ہی کھا لو" سلمیٰ بیگم بولیں۔ اور پھر ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیٹھا ممانی اور ارشد وغیرہ سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر ارشد کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ...نے کے بعد وہ دیر تک سوٹ کیس رکھا تھا۔ جسے کھول کر اس نے ایک فائل نکالی۔ اور پھر فائل کے مطالعے میں کچھ وقت اور گزارا۔ اصل میں تو وہ ...بیگم کے استفسارات اور ناصحانہ گفتگو سے بچنا چاہ رہا تھا اس لیے بلا مقصد ہی فائل کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا۔
سلمیٰ بیگم بھی سمجھ گئی تھیں کہ وہ اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس لیے چپ چاپ اپنے بستر پر پڑ کر سو گئی تھیں۔ ...جب اٹھیں تو دیکھا وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ وہ بیچاری دل ہی دل میں ...پچھتاتی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
"...کہاں چلے تم بیٹے۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔" ...گلہ آمیز لہجے میں تردد سا شامل تھا۔
"بس کیا کروں اماں جان دل یہاں بھی نہیں لگا۔ اب ذرا آگے جاؤں گا۔ مگر آپ فکر نہ کریں میں واپسی میں ضرور آپ کے پاس چند دن گزار کر ہی کراچی جاؤں گا۔" وہ اپنا سوٹ کیس فرش پر رکھ کر اسے کھولتا ہوا بولا۔
"...تمہیں معلوم کہ تمہاری واپسی کب ہو اور کب تم میرے ہاں چند دن گزارو۔ مگر یہ ایک دم ہی بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا وحشت ہوئی جو بلا کہے اور پوچھے جانے کا پروگرام بھی بنا لیا۔ جبکہ آتے اپنی مرضی سے اور جاتے دوسرے کی مرضی سے ہیں۔ ...ایک رات کے لیے ہی رک جاؤ۔ میں تو تم سے ابھی ڈھنگ سے بات بھی نہیں کر سکی۔"
"نہیں سوری اماں جان۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ میں تو خود بھی یہاں تین چار روز رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔" اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر سلمیٰ بیگم کے تکیے پر رکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا جیسی تمہاری مرضی۔" سلمیٰ بیگم نے کہا جو بڑی دل گرفتہ سی ہو رہی تھیں۔ جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ اخبار لے کر اس ...میں اپنے اتارے ہوئے کپڑے پیٹنے لگا۔ سلمیٰ بیگم نے اٹھ کر اپنے چھوٹے سے کمرے میں رکھی ایک پرانی سی الماری کو کھول کر ...میں سے کچھ نکالا۔ اور پھر اس کے پاس کھڑی ہو کر بولیں۔
"تھوڑا سا جھکو تو۔ میں تمہارا صدقہ اتار دوں۔"
"ارے نہیں اماں جان۔ میں ایسے صدقے ودقے کو نہیں مانتا۔ بس آپ تو دعائیں دے دیجیے وہی میرے لیے بہت ہوں گی۔" وہ تھوڑا سا پیچھے سرک کر بولا۔
"تم نہیں مانتے مگر میں تو مانتی ہوں۔ چلو جھکو جلدی سے۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔
"اُفوہ اماں جان اب یہ خواہ مخواہ کی فارمیلٹی۔" وہ ان کے آگے تھوڑا سا جھک کر بولا۔ مگر سلمیٰ بیگم نے اس کی بات کی طرف ...توجہ نہیں دی۔ دس روپے کے ایک کرارے نوٹ سے سر سے پیر تک سات بار اس کا صدقہ اتارا۔ اور پھر اس کی جیب ...میں ڈالتی ہوئی بولیں۔
"لو یہ نوٹ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ راستے میں کوئی فقیر مل جائے تو اسے دے دینا۔"
"اچھا جو حکم۔" وہ سیدھا ہو کر بولا۔
"ارے چلو کیسا حکم اور کس کا حکم۔ میرے اپنے پیٹ کی اولاد ہوتے نا تم تو تمہارا کان پکڑ کر یہیں بٹھا لیتی۔" سلمیٰ بیگم جو اس ...کے جانے سے آزردہ ہو رہی تھیں جل کر بولیں۔
"جی ہاں اگر میں آپ کے پیٹ کی اولاد ہوتا نا تو آپ مجھے وہاں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر کبھی اپنے بھائی کے یہاں جم کر نہ ...بیٹھتیں۔" اس نے بھی جلے کٹے انداز میں اپنے دل کا غبار نکالا۔
"ارے اگر تیرا گھر ہوتا تو میں وہاں زندگی کی آخری گھڑیاں بھی گزار دیتی۔ لیکن وہ تو تیرے باوا کا گھر ہے جہاں میں ...تمہارے نکالی مکھی کی طرح ایک طرف پڑی رہتی تھی۔ اور تم بھی تو کئی کئی دن پلٹ کر خبر نہیں لیتے تھے میری آتے بھی ...ن سلوط کے کارن۔" سلمیٰ بیگم نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔
"اچھا تو اب اسی وقت آؤں گا جب اپنے لیے علیحدہ گھر لے لوں گا۔" اس سے کوئی جواب نہ بن سکا تو اس نے یہ کہہ دیا۔
"...نہیں تمہیں گھر تو تمہارا معلوم کب بنے۔ اب تم مجھے اپنی صورت کو نہ ترسا دینا۔ ہواؤں کی زد میں رکھے ہوئے ...کی مانند ہوں میں۔ نہ معلوم کب اور کونسی گھڑی بجھ جاؤں۔ ارے تمہارے سوا میرا ہے ہی کون۔ ایک بھائی ہے تو وہ

بھی بیمار اور اپنے جھمیلوں میں اُلجھا ہوا۔"

اپنی بات کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا تھا اور آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔

"اچھا اچھا اماں جان میں جلد آنے کا وعدہ تو نہیں کرتا۔ البتہ آپ کو اتنا یقین ضرور دلائے دیتا ہوں کہ میں" وہ سلمیٰ بیگم کی باتوں سے متاثر ہو کر بولا۔ اور پھر کاغذ میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے لگا تو سلمیٰ بیگم نے کہا

"ارے یہ لفافہ تو باہر ہی رہ گیا اسے بھی تو سوٹ کیس میں رکھ لو۔"

"اچھا ابھی رکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ اور پھر دیوار پر آویزاں چھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔

"دیکھو میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم نے سلوط کے بارے میں جو کچھ سنا غلط سنا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی کے منہ سے کوئی بات نکلتی ہے تو دوسرے کے کانوں میں جانے تک بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ اب جیسے تم کسی سے یہ کہو کہ میاں فلاں جگہ جانے کا ارادہ ہے تو وہ اس بات میں تھوڑا سا اضافہ کرے دوسرے سے یوں کہے گا کہ اسفند تو فلاں جگہ جا رہے ہیں جانے کی تیاری بھی مکمل کر لی ہے اور کسی بھی وقت پرواز کر جائیں گے۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ جب کوئی بات منہ سے نکلتی ہے تو اپنی نہیں رہتی بلکہ پرائی ہو جاتی ہے۔"

"لیکن یہ سب کہنے سے آخر آپ کا مقصد کیا ہے۔ کیا آپ مجھے یہ باور کرانا چاہ رہی ہیں کہ میں نے سلوط پر بہتان باندھا ہے۔ یا اس کے خلاف مجھے بھڑکایا ہے۔ تو میں اسے آپ کی زیادتی ہی سمجھوں گا۔" وہ بالوں میں کنگھا پھیرتے پھیرتے ان کی طرف مڑ کر بولا۔

"نہیں۔ نہیں تمہاری ماں کا تو یہاں کوئی ذکر ہی نہیں ہے میں تو محض تمہاری یہ ادلتی بدلتی سی کیفیت دیکھ کر اپنی طرف سے تمہیں سمجھانا چاہ رہی تھی۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تمہیں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن اس کا انتقام تم اس بچاری پر اتنے رکیک الزامات لگا کر تو نہ لو۔ اگر اس سے ایسا ہی عشق ہے تو جاؤ اس کے بارے میں جا کر معلومات۔"

"اوہ۔ اماں جان پلیز۔ اب اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہیں۔ بلکہ کوئی اور بات کریں۔"

وہ کچھ اس قدر جھنجلا کر بولا کہ سلمیٰ بیگم نے پھر۔۔۔ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں بھی اس کے اچانک آنے اور اچانک ہی جانے پر ان کو اتنا قلق ہو رہا تھا کہ بات کرنے کو جی کہاں چاہ رہا تھا۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنا جیبی کنگھا پتلون کی جیب میں ڈالا۔ اخبار میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور سوٹ کیس کو بند کر کے مسکراتا ہوا سلمیٰ بیگم کی طرف پلٹا۔ جو ابھی تک کھڑی ہی تھیں۔

"اچھا اماں جان کہا سنا معاف۔ اب میں چلوں گا۔" اور پھر ان کے آگے جھک گیا۔

"اچھا جاؤ میرے بچے تمہیں خدا کو سونپا۔" ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود سلمیٰ بیگم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہت سے آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے اس کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔

"ہائیں ابھی سے۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں بھویں اچکا کر پوچھا۔

"ہے ہے پاجی کہیں کا۔ اب جاتے جاتے بھی میرے دل میں بھالا اتار کر جا رہا ہے۔ خدا تجھے سدا سلامت رکھے میں نے تو تجھے اللہ کی حفظ و امان میں دیا ہے۔ اور تو ایسی بد فال منہ سے نکال رہا ہے۔" انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر آہستہ سے ایک دھپ جماتے ہوئے بگڑ کر کہا۔

"اچھا۔ اچھا پھر تو ٹھیک ہے۔ اچھا السلام علیکم اور خدا حافظ۔" اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ۔ مگر تم جاؤ گے کیسے۔ ارشد سے کہہ دیا ہوتا تو وہ ٹیکسی ہی لے آتا۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔

"نہیں ارشد کو کیوں زحمت دیتا۔ کیا میری ٹانگیں نہیں ہیں جو تھوڑی دور بھی چلنے کے قابل نہ ہوں۔" اس نے کہا تو سلمیٰ بیگم کو بڑا اچنبھا ہوا کہ یا تو وہ کار کے بغیر گھر سے قدم ہی نہ نکالتا تھا اور یا یہ عالم کہ سوٹ کیس لادے اب سواری بھی ڈھونڈتا پھرے گا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو سلمیٰ بیگم بھی اس کے پیچھے باہر آگئیں۔ اور جب وہ صالحہ بیگم سے رخصت۔۔۔ ہو کر باہر نکل گیا

تو وہ آنسو پونچھتی اپنے کمرے میں آگئیں۔ آتے ہی ان کی نظر سب سے پہلے اس لفافے پر پڑی جو اب تک ان کے تکیے پر رکھا زرد اپنے سفید اور بڑا سا لفافہ تھا جسے وہ اپنے سوٹ کیس میں رکھنا بھول گیا تھا۔ انہوں نے اپنے پلنگ کی طرف بڑھ کر جلدی سے اٹھایا تاکہ ارشد کو جلدی سے دوڑا کر اس کے پاس پہنچوا دیں۔ لیکن لفافہ اٹھاتے ہی اس میں سو سو کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی لفافہ کھلا ہوا ہونے کی وجہ سے تکیے پر گری تو وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔ انہوں نے لفافے کے اندر دیکھا تو اس میں ایک رقعہ بھی رکھا نظر آیا۔ تکیے کے پاس ہی پڑا اپنی نظر کا چشمہ اٹھا کر انہوں نے اس رقعے کو کھول کر پڑھا صرف ایک ہی سطر اس پر درج تھی۔

"اپنی بہت ہی عزیزہ اماں جان کی خدمت میں حقیر سا نذرانہ جنہوں نے مجھے جوہر انسانیت سے متعارف کرایا۔"

سلمیٰ بیگم نے برستی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر گنی۔ پورے دو ہزار روپے کی گڈی تھی۔ ان آنکھوں کی برکھا میں شامل ان کے دل اور روئیں روئیں سے نکلتی دعائیں۔ اس کی فصل زیست پر باران رحمت بن کر برسنے لگیں۔ وہ ہمیشہ کچھ ایسے ہی طریقوں سے انہیں پیسے دیتا تھا۔ کبھی ان کے پرس میں چپکے سے رقم رکھ جاتا۔ کبھی ان کے تکیے کے نیچے۔ اور جب سے وہ ملتان گئی تھیں وہ ہر ماہ باقاعدہ طور پر ان کا اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونے کی وجہ سے بالا ہی بالا پانچ صد روپے کی رقم ان کے بینک میں منتقل کرا دیتا تھا اور اس کی اطلاع سلمیٰ بیگم کے بینک والے ہی انہیں دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے سوتیلے بیٹوں نے باپ کے انتقال کے بعد ان کا پانچ صد روپے کا جو وظیفہ مقرر کر رکھا تھا وہ بھی اسی بینک میں جمع ہوتا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو کہہ سن کر اسے مزید دو تین روز کے لیے روک بھی سکتی تھیں لیکن ان دنوں وہ جس ذہنی اور قلبی اذیت سے گزر رہا تھا اس کا بھی انہیں پورا پورا احساس تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ شہزادوں کی طرح عیش و آرام سے زندگی گزارنے والا۔ بھلا ان کے مڈل کلاس بھائی کے بہت سی سہولتوں سے محروم گھر میں کیسے رہ سکتا تھا۔ جس کے کل تین رہائشی کمرے تھے۔ بلکہ ڈھائی کمرے۔ کیونکہ جس کمرے میں وہ رہتی تھیں۔ وہ کسی سٹور یا کوٹھڑی کا سا نقشہ پیش کرتا تھا۔ گو سلمیٰ بیگم نے بھی اچھے ہی نہیں بلکہ بہت ہی اچھے دن دیکھے تھے۔ ایک ایسے مرد کے دل پر حکومت کی تھی جو بڑا ہی سخت گیر، تند مزاج اور غصیل تھا اور جس کے پیروں کے نیچے ایک دنیا تھی۔

کیونکہ وہ دولت مند تھا رئیس تھا۔

اور دولت ہی طاقت بھی ہوتی ہے اور کشش بھی۔

جس سے سب ہی زیر نظر آتے ہیں۔

مگر سلمیٰ بیگم نے شوہر کے تقابل میں اپنی کم عمری۔ اپنی فطری صلاحیتوں، اور خوبیوں کے باعث نادار ہوتے ہوئے بھی ان پر حکومت کی تھی۔

بہت ہی اچھا وقت دیکھا تھا۔ مگر چونکہ زمانے کے سرد و گرم کا مزا چکھے ہوئے تھیں اس لیے اس عالم پیری میں بھی ہر طرح کے ماحول کا خود کو عادی بنا لیا تھا۔ ورنہ عام طور پر ہوتا تو یہی ہے کہ جب انسان پستیوں سے اٹھ کر ایک دم بلندیوں پر چلا جاتا ہے تو بعد میں خواہ حالات کیسا ہی رخ اختیار کر لیں وہ زمین پر پاؤں دھرنے کو تیار ہی ہوتا۔

مگر ایسے لوگوں کا پیمانۂ ظرف بہت چھوٹا اور کچا ہوتا ہے۔

جبکہ سلمیٰ بیگم کا ظرف ہی تو اعلا تھا۔ وہ ہر قسم کے ماحول کا خود کو عادی کر لیتی تھیں اور اس سمے دوسری دعاؤں کے ساتھ ان کی سب سے اول اور خصوصی دعا یہی تھی۔

"یا الٰہی۔ تو ہی اپنے بندوں پر عنایات اور کرم کی بارش کرتا ہے۔ اور تو نے ہی اس عاجز اور گناہ گار بندی پر بھی بڑے احسان و اکرام کیے ہیں۔ اب تو اتنا کرم اور کر دے کہ میرے تنفے کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مکان بنائے تاکہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام اسی کے گھر میں کاٹ سکوں۔"

ادھر سلمیٰ بیگم کا رواں رواں اس کے لیے دعا گو تھا۔ اور ادھر وہ باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اب جائے تو کہاں جائے۔ اور جہاں بھی جائے تو ریل کے ذریعے جائے یا ہوائی جہاز کے۔

جبکہ وہ یہاں آیا تو بڑے ذوق و شوق سے تھا۔ اماں جان کی محبت اور یاد اور سب سے بڑھ کر ان کی پھولوں کا احساس ... کا خیال ہی اسے ملتان کھینچ کر لایا تھا۔ مگر آتے ہی گھر کے ماحول میں رچی لوریت سے اسے کچھ ایسی وحشت ہوئی کہ پھر وہاں رکنا بھی اسے گوارا نہ ہوا۔ اور وہ اماں جان کو دل برداشتہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔

اسے اپنے ذہن کے گوشوں پر اپنی جان چھڑکنے والی فرشتہ صفت اماں جان کی اشکبار آنکھیں بھی چھلک محسوس ہو رہی تھیں۔ اور اس بات کا بھی احساس تھا کہ ماں اور بہنیں حتیٰ کہ باپ بھی اس کے اچانک کہیں غائب ہو جانے پر دوہری پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ مگر وہ کرتا بھی کیا۔ باپ نے تو گویا یہ کہہ کر اسے چیلنج کیا تھا کہ سلوط کو تلاش کر کے اسے پھر اس کے گھر میں لے آئیں گے۔ جبکہ اسے سلوط کا نام تو کیا تصور بھی گوارا نہ تھا۔ اسی لیے وہ گھر سے نکل کر یونہی چلا آیا تھا۔ اور اگلے ہی دن اس نے اپنا استعفےٰ بمعہ درخواست بھی پیش کر دیا تھا۔ جس کی منظوری میں دس دن لگ گئے روز تک وہ یہی سوچتا رہا کہ اب کرے تو کیا کرے۔

کراچی سے واقعی اس کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ زیادہ پابندیوں سے گھبراتا تھا۔

بلکہ کسی بھی بات میں اس قدر پابند ہونے کا عادی نہ تھا جو اس کی آزادانہ فطرت پر بار بن جائے۔

یوں بھی اگر کراچی میں اس کا دل لگا رہا تھا تو وہ بھی صرف سلوط کی وجہ سے جس نے اس کے خیال میں اس کے اتنے اور سچے جذبے کو محض ایک جز وقتی کھیل ہی سمجھا تھا۔ تبھی تو وہ کھلی آنکھوں اسے دھوکا دیتی رہی۔ اور جب اسے کا جذبہ چاک ہوا تو چپکے سے فرار ہو گئی۔ وہ یہ ماننے پر تو تیار ہی نہ تھا کہ وہ اس کی لعنت ملامت کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ اس معاملے میں تو وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اتنا غیرت مند ہی کب تصور کرتا تھا۔

اسفند ہزار تعلیم یافتہ بلکہ اعلا تعلیم یافتہ۔ باشعور اور ایک اہم عہدے پر فائز انسان سہی مگر ناتجربہ کار تھا۔ وہ فطرتاً لاابالی سا تھا اور والدین کی بے توجہی کا شکار رہی۔

اس پر اسے اپنی اہمیت اور انفرادیت کا بھی شدت سے احساس تھا۔

اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہے۔

شروع ہی سے بڑے رعب داب والے دادا کا منظور نظر اور دادی کی آنکھوں کا نور بن کر رہا ہے۔ اور دادا نے اسے بیٹے کی حیثیت دے کر اپنی زندگی میں ہی اسے اپنی جائیداد کے ایک وسیع حصہ کا مالک بنا دیا تھا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے والدین اس کی جا اور بے جا پوری کر کے دوسرے معنوں میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ اس کا موڈ اور تیور دیکھ کر چلتے ہیں۔ اور باپ سے زیادہ ماں اس سے تھوڑی تھوڑی خائف رہتی ہیں بہنیں بھی ڈر ڈر کر بات کرتی ہیں اور اس کے سامنے لیے دیے سی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا۔ جو کچھ کہتا ہے اسے ہی پورا کیا جاتا ہے۔ وہ ہنستا ہے تو سب ہنستے ہیں۔ وہ سنجیدہ ہوتا ہے تو سب کے لب ساکت ہو جاتے ہیں۔ گویا سب اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آخر کس وجہ سے ہوتا ہے؟ جبکہ میں بھی ان اپنوں میں سے ایک ہوں۔ انہی کا خون اور گوشت پوست ہوں۔ انہی کی اولاد ہوں۔ اور اسی واسطے اور رشتے سے ابا جان (دادا) نے مجھے اپنی جائیداد کے ایک حصّے کا مالک بنایا ہے۔

ڈیڈی کے بجائے اگر کسی غیر کا بیٹا ہوتا تو پھر یہ اتنی مراعات کیوں دی جاتیں۔

مجھ پر اس قدر انعام و اکرام کی بارش ہی کیوں کی جاتی۔ آخر ممی کیوں مجھ پر حکم نہیں چلاتیں۔ کیوں مجھے نہیں ڈانٹتیں ڈیڈی کس وجہ سے مجھے نہیں روکتے ٹوکتے۔ کیوں مجھے سرزنش نہیں کرتے۔ بہنیں کیوں مجھ سے بے تکلف نہیں ہوتیں کیوں اِٹھلا اِترا کر نہیں کہتیں کہ بھائی جان ہمیں یہ لا دیجیے وہ لا دیجیے۔ یا ہمیں فلاں جگہ لے چلیے۔ تھوڑی سی ٹریٹ ہی دیجیے۔

اُف اپنے گھر میں رہتا ہوں اور اپنے سگوں سے کس قدر اجنبیت محسوس کرتا ہوں۔

کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے۔؟

ن سے تو کوثر ہی اچھی ہے۔ جو مجھ سے خائف بھی نہیں رہتی۔ اور ہنس بول بھی لیتی ہے چھیڑتی بھی ہے مذاق بھی کرتی

ں روز بھی کہہ رہی تھی کہ بھائی جان آپ کبھی تو ہمیں بھی ٹریٹ دے دیا کیجیے۔"

ور سلوط کا نام لے لے کر چھیڑتی ہی رہتی ہے۔

جبکہ وہ میری ماں جائی بھی نہیں ہے ہاں چچا زاد ضرور ہے۔ مگر سگا بھائی سمجھتی ہے نا۔ پھر یہ میری بہنیں کیوں

بہنیں؟ وہ اکثر و بیشتر ایسے ہی خیالوں میں الجھا رہتا تھا۔

ئی بار اس نے اپنے اچھے موڈ اور شگفتگی کا مظاہرہ کر کے خود بھی اپنے اور بہنوں کے درمیان حائل تکلفات

بریت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تھا۔

بہنیں ہنسی بولی تھیں تو اس طرح جیسے باتوں کے درمیان کوئی لطیفہ یا چٹکلہ سُن کر انسان اس سے لطف اٹھا لینے لگتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ سلوط کی ذات سے اپنی ان ساری محرومیوں کا صلہ چاہتا تھا۔

وہ اس کی خاموشی۔ حجاب اور گریز کو محض شرم اور احساس کمتری پر محمول کرتا تھا۔ اور اس کی شرم جھجک اور

لڑکی کے احساس کو توڑ دینا چاہتا تھا۔

وہ انجانے میں ہی بڑے غیر محسوس طریقے سے اس کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ اسے دیکھے بغیر چین سے نہ رہتا تھا

جہاں بھی ہوتا۔ سلوط کا تصور دل پر احاطہ کیے رہتا۔

حد تو یہ تھی کہ کسی مریضہ کو دیکھتا یا راؤنڈ پر جاتا اور کسی بیڈ پر کوئی نئی مریضہ نظر آتی تو اس کے چہرے میں سلوط کے نقوش ڈھونڈتا۔

وہ سلوط کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ سلوط اس کی اس چاہت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

یوں بھی وہ اپنی اتنی زیادہ چاہت کو سلوط پر ظاہر نہیں کر سکا۔

جس کی وجہ کچھ تو اس کی اس معاملے میں ناتجربہ کاری تھی۔

اور کچھ اسے ظاہر کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

بلکہ خود سلوط ہی نے اسے اظہار کا موقع نہیں دیا تھا۔ کہ اس پر ہمیشہ اندیشوں اور رسوائی کا ہوا چڑھا رہتا تھا۔

اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اپنے جذبے کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا بالکل نہ آتا تھا۔

بس وہ تو فطرت۔ فطری تقاضوں میں جو بے ساختگی اور بے پاکی ہوتی ہے اسے ہی اظہار کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

تو پھر ظاہر تھا کہ جب اس پر یہ بھید کھلا کہ سلوط شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کو اس جرم میں چھوڑے بیٹھی ہے کہ وہ بوڑھا ہے اور اس کی جوانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور محض وقت گزاری کی غرض سے اس سے محبت کا کھیل کھیلتی رہی ہے۔ دوسرے معنوں میں اسے فریب دیتی رہی ہے۔ اسے بیوقوف بناتی رہی ہے تو اس کا آپے سے باہر ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اتنا آتشِ زیر پا ہوا تھا کہ اسے گھر بدر کر دیا تھا۔

مگر اس کے باوجود بھی ایک پھانس تھی جو بری طرح دل میں کھٹک رہی تھی۔

ایک خلش تھی جو اپنے نوکیلے دندانوں سے اس کا قلب و جگر کاٹے دیتی تھی۔

ایک بے کلی تھی جو کسی کل اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

وہ اس گھر اس شہر سے دُور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے اتنے پاک اور سچّے جذبے کا اس بری طرح خون ہوا تھا۔ سو وہ گھر بار ہی نہیں ملازمت بھی چھوڑ کر ملتان آ گیا تھا۔ اور اب یہاں سے ایک نامعلوم منزل کی سمت جا رہا تھا

کہا بھی جاتا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ دیوانگی پر محمول ایک پر اسرار جذبہ ہوتی ہے یا پھر بے وقوفی اور بے حیائی کا دوسرا نام ہے۔ جو نہ صرف عقل ہی نہیں بلکہ انسان کی صلاحیتوں کو ناکارہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ایک ایسا روگ ہوتی ہے جو کسی کو لگ جائے تو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی ہے۔

بہر حال جیسی بھی ہوتی ہے مگر جذبۂ محبت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جسے جھٹلانا ممکن ہی نہیں۔ اس جذبے میں ارادے یا منصوبے کو دخل نہیں ہوتا۔

بس یہ تو آپ ہی آپ ایکا ایکی اور اچانک طور پر گویا پلک جھپکتے ہیں دل کو لگتے کسی احساس یا بات سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تو آن کی آن میں انسان کے دل کی دنیا کو ہی یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔

سچی اور پاک محبت کرنے والوں کے نزدیک دو روحوں کا سنگم محبت کی معراج نہیں ہوتا۔ ورنہ قیس اور فرہاد وغیرہ جیسے گرم جوان اپنی لیلیٰ اور شیریں کے فراق میں دشت و کوہ کی خاک نہ چھانا کرتے۔ کیونکہ سچی محبت جذبات کی آسودگی کا سہارا نہیں لیتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کے حصول سے منہ موڑ لینا چاہیے کہ ایک دوسرے کا حصول ہی تو محبت کی سب سے بڑی لگن اور اولین مقصد ہوتا ہے کہ عاشق اور معشوق تو مثبت اور منفی یعنی الیکٹرون اور پروٹون کی سی کیفیت میں ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔

اگر ان کے راستے۔ یا انہیں جدا کر دیا جائے تو پھر وہ ایک مرکز پر قائم نہیں رہتے اور سدا مایوسیوں اور ناکامیوں کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور یوں حسرتیں اور تشنہ کامی ان کے جذبۂ محبت کو شدید تر کر دیتی ہے۔ جیسا کہ قیس اور فرہاد کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہجر اور فراق کی صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے بے چاروں کا ملیدہ نہیں ٹائٹ ہو گیا تھا۔ بلکہ سرے سے لائف بیلنس میں پنچر ہی ہو گیا تھا۔ مگر وہ سچائی اور سادگی کا زمانہ تھا۔ مگر آج کی زندگی اور زمانے سے کہیں نفر (مشکل سخت)

تبھی تو فرہاد نے اپنی جوہری توانائی صرف کر کے اور اپنی جان پر ظلم کر کے دودھ کی نہر کھود ڈالی تھی کہ اناج اور اور گھی وغیرہ تو کیا اس زمانے کی ہوا بھی اصلی ہوتی تھی۔ مثلاً تابکاری اثرات کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ اس پر ضروریات محدود۔ وسائل نہ ہونے کے برابر۔

کھوٹ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس چڑیا کا نام ہوتا ہے۔

البتہ اگر کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ تھی خواہش۔

لیلیٰ کو پانے کی خواہش۔

شیریں کے حصول کی خواہش۔

مگر اسفند کے دل میں تو ایسی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔ یوں بھی وہ اس دور میں سانس لے رہا تھا جب دنیا آخری دموں پر تھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں اب وہ دشت کی سیاحی یا کوہ پیمائی تو کرنے سے رہا تھا۔ البتہ شہروں اور قریوں کی خاک چھاننے ضرور نکلا تھا۔

مگر سلوط کی تلاش میں نہیں بلکہ وحشتِ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا پھر صابر علی کے مکان سے کچھ فاصلے پر جا کر سواری کے انتظار میں کھڑے کھڑے ہی اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گو روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ اس کے پاس اس وقت بھی تین چار ہزار کی رقم موجود تھی۔ اور اس کے علاوہ اس کے پاس کراچی کے ایک معروف بینک کی چیک بک بھی موجود تھی۔ اس بینک کی شاخیں ملک میں کیا ملک سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی آسانی سے اپنی حسبِ ضرورت رقم اس بینک کی کسی بھی شاخ سے نکلوا سکتا تھا۔ مگر اس نے وقت کٹنے کے خیال سے ریل کے سفر کو ترجیح دی تھی۔ حسنِ اتفاق سے جس وقت وہ اسٹیشن پہنچا۔ لاہور جانے والی میل پلیٹ فارم پر کوچ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس نے فوراً ہی اے سی کلاس کا ٹکٹ خریدا اور ریل میں سوار ہو گیا۔

پورا راستہ ہی اس نے سخت بوریت میں کاٹا تھا۔ کیونکہ اے سی کلاس میں کراچی سے لاہور تک کوئی دوسرا مسافر ہی نہیں آیا تھا۔ جب کہ اس کوپے میں دو مسافروں کی گنجائش تھی۔ بہر حال اگلے روز شام کے قریب وہ لاہور پہنچا اور ٹرین سے اترتے ہی۔ پھر اسٹیشن کے ایک کارکن سے لاہور کے کسی بڑے ہوٹل کا پتا پوچھا۔ پھر ٹیکسی لی اور اس ہوٹل میں پہنچ کر کمرے کا کرایہ ادا کیا اور پھر اپنا سوٹ کیس لے کر اس کمرے میں چلا آیا۔ یہ بھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور کمرہ بھی تو کراچی کے فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے سے قدرے چھوٹا تھا لیکن بہت آراستہ اور پیراستہ تھا۔ اس نے نہا دھو کر اپنے لیے کھانا منگوایا اور پھر ٹی وی کھولا مگر وہاں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ اس لیے اکتا کر ٹی وی بند کر دیا۔ اور پھر ہوٹل کے نرم اور گداز بیڈ پر لیٹ گیا۔

تھکن اسے بری طرح چڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

یہاں وہ لاہور کی سیاحی کرنے کی غرض سے نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس لیے آیا تھا کہ ان دنوں اس کے جگری دوست کیپٹن آفتاب کی پوسٹنگ لاہور چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح غیر شادی شدہ یا کنوارا تھا اور چھاؤنی کے میس میں رہ رہا تھا۔ آفتاب انصاری سے اس کی دوستی کالج کے زمانے سے تھی۔ آفتاب یوں تو ناٹا یعنی موٹا اور کوتاہ قد تھا مگر خاصا خوش شکل اور گورا چٹا تھا۔ اور بڑی باغ و بہار سی طبیعت کا مالک تھا۔

بہت پُرمزاح۔ شگفتہ مزاج۔

روتوں کو ہنسانے والا۔

پھر بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ خواہ کہیں بھی جانا ہو مگر وہ ہر حالت میں لاہور سے ضرور نکل جائے گا چھٹے دن علی الصبح سو کر اُٹھتے ہی اس نے اپنی اگلی منزل کا تعین بھی کر لیا۔

اسلام آباد کا تعین۔

اگلے دن علی الصبح ہی وہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس روز بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

کچھ اس لیے بھی کہ وہ جلد از جلد لاہور چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح دن نکلا تو وہ بھی جہاز سے اپنی سیٹ بُک کروانے کی غرض سے نیچے منیجر سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے دونوں شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیے اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اس کا مدتے بچھڑا ہوا جگری دوست آفتاب انصاری اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آخاہ تم!" اس نے جذباتی سے انداز میں نعرہ مارنے کے سے انداز میں کہا اور پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

آفتاب پانچ فٹا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں اسفند کا قد چھ فٹ ایک انچ تھا۔ اور اس سے گلے ملنے کے لیے اسے جھکنا پڑا تھا۔ وہ وہیں کاؤنٹر کے آگے ہی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے تھے اور وہاں موجود لوگ بڑی دلچسپی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یار ایکسر سائز کر کے ہی تھوڑا سا قد بڑھا لیا ہوتا تو مجھے اس قدر جھکنا تو نہیں پڑتا۔" اس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر آفتاب سے علیحدہ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یار یہی تو کمال ہے میری چھوٹے قد کا کہ وہ بڑے بڑوں کو میرے سامنے جھکوا دیتا ہے۔" آفتاب نے کچھ اکڑ کر جواب دیا تو اسفند ہنسنے لگا۔

"چلو یہ اچھا ہی ہوا جو تم اس وقت آ گئے ورنہ بعد میں آتے تو میں یہاں سے فلائی ــــ کر چکا تھا۔" اسفند نے ہنس لینے

...پہ کہا۔ "کس طرف فلائی کرنے کا ارادہ تھا تمہارا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"...یوں۔ کچھ دن کے لیے اسلام آباد ہی جانے کا تھا۔" اسفند نے بتایا۔

"...فی الحال تو کچھ دن کے لیے اسلام آباد ہی جانے کا تھا۔"

"کیوں۔ کیا اسلام آباد کسی خاص مقصد سے جا رہے تھے؟" آفتاب نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔ کسی مقصد سے تو کیا بس ذرا اسلام آباد کو بھی گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر تو اگر بستر بوریا بھی باندھ لیا ہے تو اسے بھی کھول دو۔ کیونکہ اب میں آ گیا ہوں۔ اور تمہیں جانے کی اجازت نہ دوں گا۔" آفتاب نے کہا۔

"ارے بھئی نہیں۔ اب ارادہ کر لیا ہے تو جا کر رہوں گا۔ ہاں اگر ایسا ہی ہے تو واپسی میں ضرور تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر جاؤں گا۔ اس کا ضرور وعدہ کرتا ہوں۔" اسفند نے گویا اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"اجی ایسی کی تیسی تمہارے وعدے وعید کی۔ خیر اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ لیکن کیا تم ڈاکٹر بن کر تہذیب و اخلاق سے بھی عاری ہو گئے ہو۔ جو اتنا بھی نہ ہوا کہ مجھے اپنے روم میں ہی لے چلتے۔ کیا یہیں سے مجھے ٹرخانے کا ارادہ ہے۔" آفتاب نے شکوہ کیا۔ تو اسفند قدرے جھینپ کر بولا۔

"ارے نہیں مجھے تو خود یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا آکورڈ سا لگ رہا ہے۔ بس ذرا ریزرویشن آفس میں فون کر کے جہاز کی سیٹ بُک کرا دوں پھر تمہیں اپنے روم میں لیے چلتا ہوں۔"

"ارے چھوڑو سیٹ ویٹ کو اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو تمہارے ان فالتو کاموں میں ضائع کروں۔ چلو سیدھی طرح سے مجھے اپنے روم میں لے چلو۔ ورنہ پھر یہیں سے خدا حافظ۔"

"ارے نہیں یہ تم اتنے نازک مزاج کب سے ہو گئے۔ آؤ چلو میرے روم میں چلو۔" اسفند نے اسے برا مانتے دیکھ تو سب کچھ چھوڑ کر اسے اپنے کمرے میں ــ لے جانے لگا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ ڈیوٹی پر ہو پھر یہ تم نے سولین ڈریس کیوں پہن رکھا ہے۔" اسفند نے اس کے ساتھ اپنے کمرے کا رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بس۔ تم سے ملنے یہاں آ رہا تھا۔ اس لیے وردی پہن کر آنا کچھ اچھا نہیں لگا۔" آفتاب نے گول مول سا جواب دیا۔ اور اسفند کو اس سے ملنے کی خوشی میں احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے یا اس کا آج آف ڈے ہے۔ اور یہ جھوٹ بھی محض اسے اسلام آباد جانے کے ارادے سے باز رکھنے کی غرض سے بولا ہے۔

ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آفتاب نے "او ــــ واؤ" کہتے ہوئے نظریں گھما کر کمرے کا ایک بھرپور جائزہ لے کر کہا۔

"ہوں تو یہ ٹھاٹھ ہیں۔ مگر اس کمرے کا یومیہ کرایہ کیا ہوگا؟"

"پانچ سو روپے۔" اسفند نے قدرے لاپروائی سے بتایا۔

"پانچ سو روپے ــ مائی گاڈ ــ مگر کب سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔؟"

"آج چھٹا روز ہے۔" اس نے بتایا۔

"چھٹا روز ہے۔ یعنی پورے تین ہزار ــ یار اتنی فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ کسی اوسط درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا ہوتا۔" آفتاب نکتہ چینی کرنے کے انداز میں بولا۔

"اسلم ابھی بنیوں کی سی ذہنیت میں مجھے تو نہ لپیٹو۔ ارے یار پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ تم جیسے کنجوسوں کی طرح جوڑ جوڑ کر رکھنے کے لیے نہیں۔" اسفند کو اس کا نکتہ چینی کرنے کا انداز اچھا نہ لگا تو قدرے چڑ کر بولا۔

"ہاں بھئی تمہارا باپ تاجر ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ ورنہ اور کسی کو نہ سہی مجھے دیکھ لو کتنی محنت اور جانفشانی سے اپنی روزی کماتا ہوں۔" آفتاب بولا۔

"کمال ہے تم تو یوں کہہ رہے ہو۔ جیسے تمہیں پتھر ڈھونے پڑتے ہوں ــ جب کہ تم فوج میں ملازم ہو اور مجھے معلوم ہے فوجیوں کو عام ملازمین سے کہیں زیادہ مراعات اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔" اسفند نے کہا۔

"ہاں اس میں شک نہیں کہ مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں اور سہولتیں بھی مگر ایک لمٹس (حد) ہیں ہی ہوتی ہیں یعنی ہم ہر
طرح ایک دنیا تو نہیں خرید سکتے۔" آفتاب اُلٹا اسے قائل کرنے کی غرض سے بولا۔
"خیر۔ خیر۔ یہ محض تمہارا خیال ہی ہے ورنہ دنیا تو ہم بھی نہیں خرید سکتے۔ اچھا چھوڑو اس ذکر کو یہ بتاؤ کہ اب تک
شادی بھی کی یا یونہی تن تنہا ایک پہیے سے زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہو؟"
"نہیں یار۔ ابھی تو صرف دو بہنوں کے فرائض سے ہی سبکدوش ہو سکا ہوں جب کہ دو چھوٹی بہنیں مزید میری ذمہ داری
بنی بیٹھی ہیں۔ والدین کی بڑی اولاد ہوں اور والد صاحب کو ریٹائرمنٹ مل گئی ہے۔" آفتاب نے اپنی شادی نہ کرنے کی مجبوری
بیان کی۔
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو جانا۔" اسفند بولا۔
"نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو بیوی آ جاتی ہے تو اخراجات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ یہ پسند نہیں
کرتی کہ اس کے شوہر کی کمائی کسی دوسرے پر خرچ ہو۔ خواہ وہ شوہر کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ بڑی اُلجھنیں اور تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں
اس طرح۔ ویسے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تیسری بہن کی شادی کے بعد ضرور اپنی شادی کر لوں گا۔ کیونکہ سب سے چھوٹی بہن تیرہ سال
کی ہے اور جب تک اس کی شادی کا وقت آیا دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اس عرصے میں میں
بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ جمع کرتا رہوں گا۔"
آفتاب نے مزید بتایا پھر کہا۔
"ارے چھوڑو یار اس فضول ٹاپک کو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں آج کل یہاں لاہور میں تعینات ہوں؟"
"بس الہام ہوا تھا۔" اسفند نے روکھا سا منہ بنا کر کہا۔
"اب زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو یار اور سیدھی سیدھی طرح بتا دو۔" آفتاب قدرے چمک کر بولا۔
"اوہو بھئی، یہ ایسی کوئی پُراسرار بات تو نہیں ہے تمہیں یاد تو ہو گا وہ ایف ایس سی میں شبیر نامی ایک لڑکا ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔"
"ہاں ہاں وہی نا جسے ہم سب خچر کی دم مچھر کی ٹانگ کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔" آفتاب اس کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی بولا۔
"خیر۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ تم لوگ ہی چھیڑتے تھے۔" اسفند بولا۔
"ہاں ہاں تم تو ہو ہی سدا کے کوئی آسمانی مخلوق مگر یہاں شبیر کا کیا ذکر۔۔؟" آفتاب خاصا متجسس سا نظر آ رہا تھا۔
"بھئی وہی تو کوئی تین ہفتے قبل بڑے اتفاقی طور پر جب میں راؤنڈ پر تھا میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔"
"ہائیں مڈبھیڑ؟" آفتاب نے کہا۔
"ہاں کیونکہ میں تو اسے بالکل نہیں پہچانا تھا۔"
"مگر وہ زبردستی تمہارے متھے پڑ گیا تھا۔" آفتاب اس کے چبا چبا کر بات کرنے پر چڑ کر بولا۔
"نہیں خیر، متھے وتھے تو نہیں پڑا تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد کے گُردے کے آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال آیا تھا۔ اتفاق سے مجھ
سے سامنا ہو گیا تو وہ مجھے فوراً ہی پہچان گیا۔ اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم آج کل لاہور میں تعینات ہو۔" اسفند نے بتایا تو
آفتاب اپنے حافظے پر زور ڈالنے کے سے انداز میں تعجب کا اظہار کرتا ہوا بولا۔
"کمال ہے۔ اسے تو میں نے اس رونق کے بعد سے جس روز کالج چھوڑا تھا کبھی دیکھا ہی نہیں۔ پھر اس نے میرے متعلق کہاں
سے اتنی معلومات فراہم کر لیں؟"
"اب یہ تو خدا ہی جانے۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اس کی معلومات بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ورنہ لاہور کا رخ کرتے ہوئے تمہاری
طرف سے میں ایک مخمصے میں مبتلا تھا کہ نہ معلوم تم ملو بھی یا نہیں۔" اسفند نے کہا۔
"چلو خیر۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یاد تو رکھا۔ ورنہ آج کے اس بے ثبات دور میں تو اپنے سے کمتر رشتے دار بھی
قابلِ اعتنا نہیں سمجھے جاتے۔" آفتاب نے اظہارِ ممنونیت کے طور پر کہا۔
"اب یہ چمپو پنے کی باتیں مجھ سے تو نہ کرو۔ ورنہ گُدی پہ ایک ایسا ہاتھ دوں گا کہ ساری کیپٹنی نکل جائے گی تمہاری۔" اسفند
نے ہاتھ اٹھا کر اسے دھمکایا تو وہ ہنسنے لگا۔
"ویسے بائی دا وے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے لاہور آنے کا مقصد کیا صرف مجھ سے ملاقات کرنا ہی تھا۔" آفتاب نے جو

بے یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا تھا بہت گھما پھرا کر یہ فقرہ ادا کیا۔
"ہاں کسی حد تک تو یہی مقصد تھا۔" اسفند بولا۔
"کسی حد تک کیا مطلب؟" آفتاب نے پوچھا۔
"بھئی اصل میں میں اپنی دادی کی عیادت کو ملتان گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پہ ایک دم ہی لاہور آنے کو دل چاہا تو یہاں چلا آیا۔
مجھے معلوم تھا کہ تم بھی یہیں ہو اور لگے ہاتھوں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" اسفند نے کچھ توقف کے بعد بتایا۔
"چلو خیر دی مثل ہے کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو لگے ہاتھوں ہم سے بھی مل لیے۔"
"نہیں خیر لاہور تو مجھے تمہاری کشش ہی کھینچ کر لائی ہے۔" اسفند بولا۔
"اچھا تو کیا تم کراچی میں اپنا کوئی اسسٹنٹ چھوڑ کر آئے ہو جو تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے قائم مقام کے فرائض انجام
دیتا ہے۔" آفتاب کی یہ عادت اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ بال کی کھال کھینچنے کا عادی تھا۔
"نہیں۔ کیسا اسسٹنٹ اور قائم مقام۔ میں سمجھا نہیں۔" اسفند نے سادگی سے پوچھا۔
"بھئی، جہاں تک میرا خیال ہے تم نے کراچی میں اپنا پرائیویٹ کلینک تو کھول رکھا ہو گا۔ بس اسی کے متعلق پوچھ رہا ہوں کہ
اس کا نظم و نسق کس پر چھوڑ آئے ہو؟" آفتاب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔
"لیکن میں نے تو ابھی اپنا پرائیویٹ کلینک نہیں کھولا۔ البتہ مستقبلِ قریب میں کھولنے کا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔" اسفند بولا۔
"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ شبیر سے تمہاری ملاقات ہاسپٹل میں ہوئی تھی۔" آفتاب نے پوچھا۔
"ہاں، وہ تو کراچی کے سول ہسپتال میں ہوئی تھی۔ میں نے وہاں سروس کر رکھی تھی۔"
"سروس کر رکھی تھی۔ مگر تمہیں سروس کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟" آفتاب نے پوچھا۔
"بس یونہی تھوڑا تجربہ گین کرنے کی غرض سے۔ بلکہ اصل میں تو ٹائم پاس کرنے کے لیے۔" اسفند بولا۔
"واہ۔ یہ بھی خوب رہی۔ جب کہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اتنی بڑی ڈگریاں لے کر آئے ہو تو اپنا ذاتی کلینک کھول کر دونوں ہاتھوں سے
خوب خوب لوگوں کی جیبیں جھڑوا رہے ہو گے۔"
"جی نہیں۔ میرے دل میں تو شروع ہی سے خدمتِ خلق کا جذبہ اور دیانتداری سے کام کرنے کی لگن ہے اور پھر میرے پاس بھلا
کس چیز کی کمی ہے جو میں لوگوں کی جیبیں جھڑواتا یا انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتا۔" اسفند تھوڑا سا چمک کر بولا۔
"بھئی، برا ماننے کی بات نہیں۔ عموماً ہوتا کچھ یہی ہے کہ جن لوگوں کے پاس دولت کی بہتات ہوتی ہے انہیں پیسے کی ہوس
اور حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ھل من مزید کے خواہاں ہی نظر آتے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔
"پھر تو وہ لالچی، حریص یا ایسے لوگ ہوتے ہوں گے جنہوں نے کبھی پیسہ نہ دیکھا ہو گا اور ایسے ہی لوگ عموماً بے ظرف اور
بے صبرے ہوتے ہیں۔ ورنہ میرا اپنا نظریہ تو یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی بنتا ہے یا بناتا ہے خود اپنی محنت، لگن اور قسمت سے ہی بناتا ہے۔
اور یا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی دولت پر تکیہ لیے بیٹھا رہوں گا۔ اگر ایسا ہی خیال ہوتا تو پھر میں اتنے عرصے تک تعلیم میں سر کیوں
کھپاتا اور یہ بڑی بڑی ڈگریاں کیوں لیتا۔ یقین جانو۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی خرچ کیا ہے اپنی جیب سے ہی کیا ہے۔ اصل میں
میرے خیالات اس معاملے میں بہت مختلف ہیں۔ میں اپنی جائیداد اور والد کی کمائی کے ذریعے سے زندگی نہیں گزارنا چاہتا بلکہ
از خود کچھ بننا چاہتا ہوں۔" اسفند نے پُرعزم لہجے میں آخری فقرہ کہا۔
"تو پھر کماتے کیوں نہیں۔ تم نے تو ابھی تک کلینک بھی نہیں کھولا۔ چلو مانے لیتا ہوں کہ تجربہ گین کرنے کے لیے ہی سروس کی تھی مگر پھر
پر لات کیوں مار آئے؟" آفتاب نے پوچھا تو اسفند تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔
"اصل میں میری طبیعت میں کچھ تلون سا پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ایک جگہ جم کر نہ بیٹھ سکتا ہوں نہ کوئی کام ہی کر سکتا ہوں اور
سب سے بڑھ کر کسی پابندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مجھے کسی ایسے کام کی تلاش ہے جس میں میں گھوم پھر سکوں۔"
"ایسے کام کا ڈاکٹری کے پیشے میں تو کہیں گزر نہیں ہو سکتا۔ البتہ خاکروبی۔۔ کے پیشے میں آسانی سے مل سکتا ہے۔" آفتاب
اس کی عجیب و غریب منطق پر جل کر بولا۔
"نہیں یار تم سمجھے نہیں۔ در اصل میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسی گشتی پارٹی میں شامل ہو جاؤں جو ایسے پسماندہ علاقوں کا دورہ

کرتی ہیں جہاں کے باشندوں کو طبی سہولتیں میسّر نہیں ہوتیں۔" اسفند نے کہا۔

"کیوں کیا اب چھابڑی لگا کر دوائیں بیچنے کا ارادہ ہے۔ کیوں فضول باتیں کرتے ہو۔ تم جیسا اعلا ڈگری یافتہ ڈاکٹر بھلا ان نچلے درجے کے ڈاکٹروں میں جو عام طور پر کمپاؤڈرز ہوتے ہیں، شامل ہوتا اچھا لگے گا۔" آفتاب جل کر بولا۔

"سو وہاٹ۔ بھئی میں یہی تو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے چھوٹے درجے کے ڈاکٹروں کے ساتھ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر بھی شامل ہو سکتا ہے۔ تاکہ مجھے دیکھ کر دوسرے اونچے درجے کے ڈاکٹرز بھی غیرت پکڑیں۔" اسفند نے قدرے فخریہ انداز میں کہا۔

"تب تو تمہیں ایل آر سی۔ پی کے بجائے آر۔ ایس وی پی ہی ہونا چاہیے تھا۔" آفتاب نے جلے کٹے انداز میں کہا تو اس نے قافیہ جوڑنے کی کوشش میں ایک بالکل ہی مختلف بات کہنے پر اسفند ہنسے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

"واہ یار۔ یہ آر۔ ایس۔ وی۔ پی کی بھی خوب کہی تم نے۔" اُس نے ہنس ہنس کے بعد کہا۔

"ہاں تو پھر اور کیا کہتا۔ تمہارے دماغ میں تو کچھ خلل واقع ہو گیا ہے۔ ورنہ اتنا تو سوچ لیا ہوتا کہ ہمارے ملک میں ایسا کون سا حصّہ ہے جس میں پسماندہ لوگ موجود نہیں ہیں۔ یہ جو تمہارا عروس البلاد کراچی ہے نا اس میں بھی ایسے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی کوئی کمی نہیں، بلکہ میرے اندازے کے مطابق تو اس اتنے بڑے شہر میں امیروں سے زیادہ ایسے ہی لوگ آباد ہیں۔ تم وہیں کلینک کھولو اور ایسا ہی خدمت خلق کا جذبہ اور غریب اور ناداروں کا درد تمہارے دل میں ہے تو ان کا مفت علاج کرو۔ خدا تو نیت اور جذبے کو ہی دیکھتا ہے نا۔" آفتاب نے بڑے ٹھوس دلائل دے کر اسے سمجھایا۔ تو جواب میں اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

"لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"ہوں تو اس کا مطلب ہے تمہارے والدین نے بے نتھے بیل کی طرح تمہیں بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یا پھر تم ان کے کنٹرول سے باہر ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ شادی وادی بھی کی یا اب تک یونہی الل ٹپیروں کی طرح۔"

"ارے یار شادی وادی بھی کبھی کر ہی لیں گے۔ ابھی تو ایک عمر پڑی ہے۔" اسفند نے اس موضوع کو لاپروائی سے اڑاتے ہوئے کہا اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر بولا۔

"اوہو۔ باتوں میں بالکل خیال ہی نہ رہا کہ مجھے تو اسلام آباد کے لیے سیٹ بک کروانی تھی۔"

"کیوں۔ اسلام آباد کس خوشی میں جا رہے ہو؟" آفتاب نے پوچھا۔

"بس یونہی ذرا گھومنے پھرنے۔ اصل میں اسلام آباد میں ڈیڈی کی فرسٹ کزن عائشہ پھپھو کے بڑے بیٹے عاطف بھائی منسٹری آف ہیلتھ میں سیکریٹری لگے ہوئے ہیں۔ بس انہی کے پاس جا رہا ہوں۔" اسفند نے بتایا۔

"کیا کسی گشتی شفاخانے میں شمولیت کے لیے سفارش کرانے؟" آفتاب نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ بس یونہی ملنے کی غرض سے۔ کیونکہ میں نے سوچا کہ جب لاہور تک آ گیا ہوں تو ذرا اور آگے بڑھ کر اسلام آباد کی بھی سیر کر لوں۔" اسفند بولا۔

"لیکن جہاں تک سیر سپاٹے کا تعلق ہے، پاکستان کی حدیں اسلام آباد تک تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ یہ کہو کہ مجھے پتا ہے ہو۔ ورنہ اسلام آباد تم محض اپنے مطلب کا کام ڈھونڈنے جا رہے ہو۔" آفتاب قدرے چیخ کر بولا۔

"ہاں۔ کسی حد تک تو تمہارا خیال درست ہی ہے۔ کیونکہ اسلام آباد میں۔"

"خیر خیر، تم خواہ اپنے کزن سے ملنے جا رہے ہو یا دیہی علاقوں کی خاک چھاننے۔ مگر اتنا جان لو کہ آج تو میں تمہیں کسی قیمت پر کہیں جانے نہیں دوں گا۔" آفتاب بولا۔

"لیکن میں آج تو جا ہی نہیں سکتا اب تو کل ہی جاؤں گا۔" اسفند بولا۔

"اونہوں۔ کل بھی نہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"کیوں بھئی، یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات وات تو کچھ نہیں ہوئی۔ بس تم مجھ سے ملنے اتنی دور دراز کا سفر کر کے یہاں آئے تھے۔ اب یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے لاہور سے باہر تھا۔ لیکن آج آیا تو آتے ہی اپنے ضروری کام نمٹانے کے بعد فارغ ہوا تبھی کیپٹن سرفراز نے تمہارا کارڈ ہاتھ میں تھماتے ہوئے بتایا کہ تم میری غیر موجودگی میں مجھے پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ اور فلاں ہوٹل میں مقیم ہو۔

کچھ روز گزر گئے تھے پھر بھی میں سارے کام چھوڑ کر ایک امید موہوم پر ایکسپریس ڈیلیوری کی طرح تمہارے پاس اس بات کو ...

... خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے۔ اب میں اتنی آسانی سے تو تمہیں جانے نہیں دوں گا۔" آفتاب نے ہیکڑی سی جمائی۔

"لیکن تم تو اپنی ڈیوٹی پر ہو گے۔ تمہارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوگا جو میرے ساتھ گزار سکو گے۔" اسفند بولا۔

"نہیں۔ کل تو جمعے کی وجہ سے عام تعطیل ہوگی اور سنیچر اور اتوار کو میں آف ڈیوٹی ہوں گا۔ کیونکہ اپنے آفیشل ٹرپ سے پورے ایک ماہ بعد آیا ہوں اور قاعدے کے مطابق دو تین روز کی چھٹی تو مل ہی جاتی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

تو اسفند کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"اچھا چلو۔ تمہاری خاطر یہی سہی۔"

"ہُرّاہ۔ یہ بات ہوئی نا۔ مگر تم اب ہوٹل میں نہیں ٹھہرو گے۔ سمجھے۔" آفتاب خوش ہو کر بولا۔

"ہائیں۔ کیا مطلب۔ یہاں نہیں ٹھہروں گا تو پھر کہاں ٹھہروں گا؟" اسفند نے چونکنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"ہائیں۔ ٹھہرو۔ ابھی بتاتا ہوں۔" آفتاب بولا اور پھر کنپٹی پر انگلیاں مار کر کچھ سوچنے لگا۔

"ہاں۔ وہ میرا ایک کزن لاہور میں مزنگ کے علاقے میں رہتا ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا تو اسفند بری طرح چونک کر بولا۔

"مزنگ کے علاقے میں۔ اس علاقے کا نام تو میں نے پہلے بھی کہیں سن رکھا ہے۔ مگر یہ علاقہ ہے کہاں؟"

"ہاں جب تم لاہور کے حدود اربعے سے واقف ہی نہیں ہو تو میں مزنگ کا محل وقوع تمہیں کیسے بتاؤں۔ ہاں البتہ اتنا بتا سکتا ہوں کہ یہ علاقہ بھی شہر کے وسط میں ہے اور بہت گنجان ہے اور اس علاقے میں زیادہ تر اوسط اور نچلا طبقہ ہی آباد ہے۔ بہت غل غپاڑہ بھی مچا رہتا ہے۔ لیکن میرے کزن اجمال احمد نے حال ہی میں اپنے آبائی مکان کو نئے سرے سے تعمیر کرا کے بنگلے میں تبدیل کر لیا ہے۔ بس اسی بنگلے میں تمہارے لیے ایک پُر آسائش کمرہ مختص کرا دوں گا۔ باقی اللہ اللہ اور خیر صلّا۔" آفتاب نے اس کے سوال کے جواب میں اپنی تفصیل بیان کر دی۔ لیکن نہ معلوم وہ کیا سوچتا رہا۔

"کیوں کیا میرے کزن کے گھر رہنے پر تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ ویسے اتنا اطمینان ضرور دلا دیتا ہوں کہ اجمال ایک تو اس گھر میں تنہا رہتا ہے دوسرے زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا ہے۔ اس لیے تمہاری پرائیویسی میں کسی کے مخل ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوگا۔" آفتاب نے اسے خاموش بلکہ گم صم سا دیکھ کر پھر کہا۔

اب اسے کیا معلوم تھا کہ اسفند اس وقت اپنے پھوپھا اور پھوپھی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند سال پیشتر مزنگ کے علاقے میں ہی رہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی گردش کر رہا تھا کہ کہیں وہ دونوں بھی اسی مکان میں نہ رہ رہے ہوں۔ جس کا نمبر حافظے پر زور ڈالنے کے باوجود بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"اچھا جس بنگلے میں تمہارا کزن رہتا ہے اس کا کوئی نمبر تو ہوگا؟" یادداشت کی سطح سے پھپھی کے گھر کا نمبر ہٹ گیا تھا اس لیے آفتاب کی اپنی ساری باتوں کے جواب میں یہ سوال کیا تو آفتاب تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یار عجیب گم صم کے لٹّو قسم کی چیز ہو گئے ہو۔ بھلا ایسا کون سا گھر ہو سکتا ہے جس کا کوئی نمبر نہ ہوگا۔ اور پھر تمہیں انجم کے گھر کے نمبر سے کیا سروکار۔" اور اس کی بات پر وہ بھی خیالوں کی دنیا سے نکل کر ایک دم حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

"اوہ۔ ہاں ہاں واقعی مجھے کیا سروکار۔ میں نے تو بس ویسے ہی بائی داوے ہی پوچھ لیا تھا۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"یار۔ ایک زبردست تبدیلی دیکھ رہا ہوں تمہارے مزاج اور انداز میں مگر کیا یہ وقت کی چھ سات سالہ گردش نے پیدا کی ہے یا پھر کسی مہوش اور مہ جبین کی محبت نے۔ جو بیٹھے بیٹھے ایک دم ہی کہیں کھو سے جاتے ہو۔ بات بھی کرتے ہو تو غیر حاضر دماغی کے ساتھ۔ وہی مثل ہے کہ اِلّا الذی نہ اُللذی۔ آخر یہ کیا چکر ہے؟" آفتاب نے تعجب اور تجسس کی ملی جلی کیفیت میں سر کو موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے آخری فقرے کہہ کر گویا اسفند کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جس سے اسے تکلیف تو بہت پہنچی لیکن اس نے ایک پھیکی سی مسکان اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا سر۔ ورنہ بھلا میرے ساتھ کیا چکر ہو سکتا ہے۔ بھئی بڑی سیدھی اور صاف ستھری زندگی ہے اپنی تو۔"

"اچھا۔ تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟" آفتاب کو تو بس اسے ہوٹل سے نکالنے کی ہی پڑی تھی۔

"کیسا فیصلہ؟" اس نے پوچھا۔

"بھئی وہی مزنگ میں شفٹ ہو جانے کا۔" آفتاب اس کے چند رانے پر جھلا کر بولا۔

"بھئی مزنگ میں رہوں یا یہاں۔ میرے لیے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور پھر جب چھ روز سے یہیں رہ رہا ہوں تو مزید دو تین روز گزارنے میں حرج ہی کیا ہوگا؟" اسفند بولا۔

"ہونہہ۔ حرج ہی کیا ہوگا۔ پانچ صد روپے کمرے کے اور ڈیڑھ دو سو روپے اوپر کے اخراجات کے گویا مزید دو ڈھائی ہزار۔ نہیں بھئی میں تمہیں ایسی عیاشی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ اماں قارون کا خزانہ بھی ہو تو اتنی عیاشی میں خالی ہو جائے۔ تم سیدھی طرح ابھی اور اسی وقت مزنگ والے گھر میں شفٹ ہو جاؤ۔" آفتاب اپنی ہی بات پر اڑ کر بولا۔

"ارے نہیں یار۔ اب میں ایسی عیاشی بھی نہیں کر رہا۔ اور پھر پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ کوئی انسان اسے اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جاتا۔" اسفند نے اس کی بات کو لاپروائی میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں قبر میں تو نہیں لے جاتا لیکن یوں پانی کی طرح بھی نہیں بہانا ہے جیسے کہ تم بہا رہے ہو۔ یوں مذہباً بھی اتنی فضول خرچی جائز نہیں۔ خدا نے اپنے بندے کو میانہ روی اختیار کرنے کی جگہ جگہ تلقین کی ہے۔" آفتاب اسے قائل کرنے کی غرض سے ارشادِ ربانی کا حوالہ دیتا ہوا بولا۔

"پائی پائی جوڑ کر رکھنے اور پیسے خرچ نہ کرنے والوں کے لیے بھی ایک پوری سورۃ اتاری گئی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو بخیل کہا گیا ہے اور بخل کرنے والوں کو خدا بالکل پسند نہیں فرماتا۔ جگہ جگہ ایسے لوگوں کی مذمت ہی نہیں کی گئی بلکہ انہیں بخل کرنے سے باز رہنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ رہا فضول خرچی کا سوال تو فضول خرچی تو وہ ہوتی ہے جو انسان اپنی بساط اور اوقات سے بڑھ کر اپنے پیسے کا زیاں کرتا ہے یا پھر جو بالکل بیکار اور واہیات چیزوں پر اپنا پیسہ لنڈھاتا ہے۔ مثلاً ریس پر۔ لاٹری پر۔ ویڈیو گیمز پر موور پرادر شادی بیاہ اور دیگر بہت سی تقریبات میں جو واہیات اور فرسودہ رسومات ہوتی ہیں اس پر۔ ناچنے گانے والوں پر پنکھا وغیرہ میں۔ ورنہ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اگر انسان کو اپنی جیب پر گرانی۔ زیر باری اور فکر و پریشانی کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ضروریات پر جتنی چاہے رقم خرچ کر سکتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میں صرف بنیادی ضروریات پر ہی پیسہ خرچ کرتا ہوں۔ فالتو باتوں پر نہیں۔" اسفند نے ایک تقریر کی صورت میں اپنی بات کہی تو آفتاب نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات توجہ سے سنی ہی نہ ہو۔

"خیر، تمہارا نظریہ جو بھی سہی لیکن میں تمہارا دوست ہوں اور تمہارے کسی بھی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے بک رہا تھا۔ اب تم مزنگ والے بنگلے میں جانے پر تیار نہیں ہو تو تمہیں زبردستی اٹھا کر تو نہیں لے جا سکتا۔" آفتاب کا انداز ایسا تھا جیسے وہ برا مان گیا ہو۔

"ارے نہیں یار۔ میں نے انکار کب کیا ہے۔ تم مجھے مزنگ لے جانے پر بضد ہو تو میں وہیں چلا چلوں گا۔" اسفند نے آفتاب کی توقع کے خلاف مزنگ چلنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو آفتاب خوش ہو کر اس کے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"ارے جیو جیو میرے بچے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔

"اچھا اچھا بزرگوار مزنگ تو بعد میں چلیں گے اس وقت تو تم ہمارے ساتھ ذرا سیر سپاٹے کو چلو۔ کیونکہ آج کے دن کا کرایہ کل صبح آٹھ بجے تک پورا ہوگا۔ اتنے تم میرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کروا لینا۔ سمجھے۔" اسفند ایک دم ہی چونچال سا ہو کر بولا۔

"ہاں ہاں خوب سمجھے۔ اور تمہاری اطلاع کو اس وقت ما بدولت جیپ میں یہاں قدم رنجہ فرمانے آئے تھے۔ لہٰذا اگر شاہدرے اور مغل پورہ سے بھی آنے جانے کا ارادہ ہے تو بلا خوف و خطر چل پڑو۔" آفتاب بولا۔ کمرہ لاک کر کے دونوں دوست ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

پھر دونوں بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور رات کے آٹھ بجے واپس لوٹے۔ اسفند نے آفتاب کو بڑے اصرار سے رات کا کھانا ہوٹل میں ہی کھلایا۔ اور جب کوئی دس بجے کے بعد آفتاب اگلی صبح آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا تو لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹنے کے بعد اسفند کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ کہ دماغ تو اس کا اسی وقت سے الجھا ہوا تھا جب آفتاب نے اسے مزنگ کے ایک بنگلے میں منتقل ہو جانے کی پیشکش کی تھی۔۔۔۔ وہ اس کے ساتھ اتنی دیر تک گھومتا رہا تھا تو اس سارے عرصے میں اور اس وقت بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اپنے حافظے پر زور دینے کی کوشش میں مصروف رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی اسے اپنی پھپھی کے مکان کا نمبر یاد نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ انگلستان میں اپنی رہائش کے دوران اسے اپنی پھپھو بیگم کی طرف سے دو خط بھی [ملے] تھے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پھپھو کے خط کا جواب دیے کئی سال ہوئے تھے اس لیے ان کے گھر کا نمبر ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

یوں تو اپنے گھر سلوط کی اچانک آمد پر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی پھپھو اور پھوپھا وہ مکان چھوڑ چکے ہیں اور کسی ایسی جگہ روپوش ہو چکے ہیں جہاں تک کم از کم اس کی اور اس کے والدین کی رسائی ممکن ہی نہیں۔ اس کے باوجود بھی مزنگ کے علاقے کا نام سن کر ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے اسی گھر میں رہ رہے ہوں اور اپنی کسی مصلحت کے تحت انہوں نے سلوط کو ان کے ہاں بھیج دیا ہو۔ یوں بھی اس نے ماں کی زبانی یہی سنا تھا کہ ان کے گھر میں کچھ غنڈے کودے تھے اور سلوط کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور یہ بات اسے زینت نے نہیں بلکہ بابا شرافت نے اس وقت بتائی تھی جب وہ باپ کی اس بات کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر کہ وہ سلوط کو تلاش کر کے اپنے گھر میں ہی لے آئیں گے، غصے میں گھر سے نکل آیا تھا اور سلوط کے بارے میں مزید اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے دوسرے روز بابا شرافت کے پاس پہنچا تھا۔

وہ بھی یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ خاص طور پر ان سے ہی ملنے آیا ہے۔ کیونکہ بظاہر تو وہ سہیل منصور سے ہی ملنے گیا تھا۔ مگر اندر جانے کے بجائے کار سے اتر کر بنگلے کے عقب میں چلا گیا تھا جہاں ایک سرونٹ کوارٹر میں بابا شرافت رہتے تھے۔ بابا شرافت باہر ہی اسے مل گئے تھے اور چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے خود ہی اس سے فاخرہ بیگم کے بارے میں پوچھا تھا اور یوں اس نے بڑی خوبصورتی سے ان سے سب کچھ اگلوا لیا تھا۔ جانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ کیونکہ سلوط کو تو اس نے یوں دل سے نکال پھینکا تھا جیسے سمندر کی بپھری ہوئی لہریں اپنے اندر کی ساری گند دور ساحل پر اچھال پھینکتی ہیں۔ اس روز تو نہیں مگر اب وہ اپنے بستر پر پڑا اسی سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

بابا شرافت پرانے نمک خوار ہی نہیں بلکہ اس کے دادا کے گھر کے پروردہ تھے۔ اور یہ پروردگی کا سلسلہ بابا شرافت کے پردادا کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اس لیے سب انہیں بہت معتبر اور نمک حلال سمجھتے تھے اور ان کا تھوڑا بہت احترام بھی کرتے تھے۔ بابا شرافت نے چونکہ سہیل منصور کو گودوں کھلایا تھا اس لیے سہیل منصور کے کینیڈا سے لوٹ آنے پر وہ ان کے پاس ہی آ بسے تھے۔ جب کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں بھی کراچی کے ہی پسماندہ علاقے میں رہتے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا پھر اس لیے بھی وہ اولاد سے کٹ سے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سہیل منصور کے پاکستان آنے سے قبل وہ شعیب منصور کے پاس ہی رہتے تھے۔

بہرکیف سارے معاملات اسفند کے گوش گزار کر کے انہوں نے آخر میں یہ کہہ کر کہ ایک بات ضرور ذہن میں رکھ لیجیے چھوٹے صاحب کہ نند اور بھاوج کے رشتے میں قینچی کی کاٹ ہوتی ہے۔ چھوٹی بیگم (فاخرہ) نے یہ جتنا بھی بتایا ہے وہ بھاوج بن کے بتایا ہے ہمدرد بن کر ہرگز نہیں۔ اب اس میں کون سی بات سچ ہے اور کون سی جھوٹ یہ تو وہ نیلی چھتری والا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے احساسات میں ایک چنگاری سی پھینک دی تھی۔ اس پر سلمیٰ بیگم کسی طرح یہ مان لینے کو تیار ہی نظر نہیں آتی تھیں کہ سلوط فریبی اور مکار بھی ہو سکتی ہے۔ بس یہی ایک بات اس کے لیے تجسس کا باعث بنی ہوئی تھی اور آفتاب کے منہ سے مزنگ کے علاقے کا نام سن کر اس کی جستجو میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے ذہن میں ایک خیال سا بندھ گیا تھا کہ کہیں اس کی پھپھی پھوپھا مزنگ میں ہی اقامت پذیر نہ ہوں۔ اور اسی جستجو کے تحت اس نے مزنگ جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد وہ دیر تک طرح طرح کے خیالوں میں الجھا رہا تھا۔ پتا نہیں مزنگ کے علاقے کو کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ جو پھپھو کو ڈھونڈنا اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔ جو سوچے جا رہا تھا جب کہ بات ساری ایک امید موہوم تک ہی محدود تھی۔ پھر بھی آدھی نہیں تو ایک چوتھائی رات اس نے طرح طرح کی تدبیریں سوچنے میں گزار دی تھی یعنی بارہ بجے کے بعد میں جا کر سویا تھا مگر صبح تڑکے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کہ عادت سے زیادہ اس میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ خواہ اسے پوری رات میں ایک گھنٹے سونے کا موقع ہی ملا ہوتا لیکن اس کی آنکھ ٹھیک اذانوں کے وقت کھل جاتی تھی۔ اصل میں صغر سنی سے ہی سلمیٰ بیگم نے اسے نماز کا عادی بنا دیا تھا اور لڑکپن تک تو وہ پنج وقتہ نماز بڑی پابندی سے پڑھتا رہا تھا۔ مگر جب کالج ۔ کالج سے میڈیکل کالج اور میڈیکل کالج سے اعلیٰ ڈگری لینے کی غرض سے انگلستان گیا تو گنڈے دار نمازیں ہی ادا کرتا تھا۔ یعنی جس وقت بھی جس نماز کو ادا کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن فجر کی نماز وہ کسی حال میں قضا نہ کرتا تھا۔ سلمیٰ بیگم نے کچھ تربیت ایسی دی تھی۔ انہوں نے نہ صرف فجر کی نماز کے سلسلے میں دو آیات کریمہ اور ان کا ترجمہ اسے پڑھوایا تھا بلکہ نمازِ فجر کے فضائل اور اہمیت بیان کرتے ہوئے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ نمازِ فجر کا وقت فرشتوں کی حاضری کا وقت ہوتا ہے یعنی بارگاہِ الٰہی میں رات بھر حاضری دینے والے فرشتوں کے جانے اور دن

بہر حاضری دینے والے فرشتوں کے آنے کا وقت ہوتا ہے اسی لیے تمام فرشتے یکجا ہو کر اپنے معبودِ حقیقی اور مالک کون و مکاں کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں۔ اور انسان تو خدا کی ساری مخلوق میں اشرف ہے۔
مسجودِ ملائک ہے۔
اسے فرشتوں سے پہلے ہی بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہونا چاہیے۔
کہ اتنی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر ہی اپنے انعام و اکرام کی بارش کی ہے۔
اب اس بات سے اندازہ لگا لو کہ جس روز تمہیں اسکول پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب تمہیں پر کس قدر غصے ہوتے ہیں بلکہ تمہیں سزا بھی دے دیتے ہیں۔ کیونکہ تم وقت پر اسکول نہیں پہنچتے۔ جب کہ اسکول کے بھی قواعد، ضوابط اور اصول ہوتے ہیں۔
اسکول وقت سے لگتا ہے اور وقت پر چھوٹتا ہے۔ تم اسکول کے اوقات میں سے کوئی پیریڈ گول کر دو تو تمہیں سزا ملتی ہے۔ تو اللہ پاک تو سب سے بڑا معلم — سب سے بڑا حاکم ہے۔
جو اصول اس نے بندوں کے لیے وضع کیے ہیں ان میں وہ بھی اپنے بندوں کو پورا اُترتے دیکھنا پسند فرماتا ہے۔ کہ دونوں جہانوں میں اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں دونوں جہانوں کا نظام ہے۔ اور فجر کا وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ منادی کرنے والا فرشتہ اس کے بندوں کے لبوں سے نکلی ہوئی دعاؤں اور حاجتوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا تم فجر کی اذان سنتے ہی اٹھ جایا کرو۔
جو فجر کے وقت اُٹھنے میں کسل سے کام لیتے ہیں یا نماز ادا کرنے سے جی چراتے ہیں انہیں شیطان لوری دے کر سلا دیتا ہے اور فرشتے اس شخص پر لعنت کرتے ہیں۔
اور عمر کے اس کچے دور میں سلمیٰ بیگم کی ان ساری باتوں میں سے جس بات نے اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا کر دیا وہ فرشتوں کے لعنت بھیجنے کی بات تھی۔
کہ فرشتے جو اتنے پاک و صاف اور اچھے ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر رحم دل بھی۔ جن کی پر لگی رنگین اور خوبصورت چھوٹے چھوٹے بچوں کی صورت میں وہ تصویریں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کسی پر لعنت بھیجیں۔ توبہ توبہ — وہ بچہ تو پھر بہت ہی خراب ہو گا ایک دم ڈیول (شیطان)، جیسا بالکل ڈریکولا کی شکل۔ وہ دل میں سوچ سوچ کر ایک جھرجھری لیتا۔ اور اسی ڈراؤنے خیال کے تحت صبح تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سلمیٰ بیگم نے تو اس کے سامنے دوسری چاروں نمازوں کے بھی فضائل بیان کیے تھے۔ خصوصیت سے عصر کی نماز۔ اور وہ شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پنجگانہ نماز ادا کرتا تھا مگر بعد میں اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے اگرچہ اس کی دوسری نمازیں قضا ہونے لگی تھیں لیکن فجر کی نماز اور جمعے کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی۔
کہ اب شعور و آگہی کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد بچپنے کے — وہ فرشتوں کے تصوراتی پیکر کے بجائے فہم و ادراک کے دروا نے اس پر کھل گئے تھے۔ اور اپنے اشرف بنا دیے جانے کا احساس آپ ہی آپ اسے بارگاہِ الٰہیہ میں سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

بہرحال — اگلے روز آفتاب ٹھیک نو بجے اسے لینے آ گیا اور ہوٹل کا حساب چکا کر وہ اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر اجمال احمد کے گھر پہنچ گیا۔ آفتاب کے کہنے کے مطابق مزنگ کا علاقہ بالکل ویسا ہی علاقہ تھا جیسے کہ شہر کے وسط میں — گنجان اور آباد علاقے ہوتے ہیں جن میں زیادہ تر اوسط اور نچلے طبقے کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ ویسی ہی دوکانیں، بازار اور گلیاں — وہی شور شرابا اور مکانات بھی بالکل کھچ بیچ یعنی پاس پاس جُڑ کر بنے ہوئے۔ انہی میں کچھ کوٹھیاں بھی تھیں اور نو تعمیر بنگلے اور فلیٹ بھی۔ اجمال احمد کا ہٹ سا نو تعمیر بنگلہ بھی ان ہی بنگلوں میں شامل تھا۔ مگر اندر سے قدرے پُرسکون تھا اور وہ کمرہ بھی خاصا آرام دہ اور سجا سنورا تھا جو اسے دیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ اجمال احمد ان دنوں پشاور گیا ہوا تھا۔ دوسرے آفتاب دو دن کی چھٹی پر تھا اس لیے اسفند کو اس کمرے میں صرف راتیں گزارنے کا ہی موقع مل سکا تھا۔ کیونکہ دونوں دوست صبح کو گھر سے نکلتے تو رات کو ہی گھر لوٹتے تھے۔ اور آفتاب اسے ڈراپ کر کے لینے میس چلا جاتا تھا۔ کچھ اس لیے جو مقصد لیے وہ اجمال کے بنگلے یا مزنگ کے علاقے میں آیا تھا۔ اس پر عمل درآمد کرنے کی اسے مہلت ہی نہیں ملی تھی۔
پھر کے روز چونکہ آفتاب کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اس لیے گزشتہ شب ہی اسفند نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پیر کو شام کی فلائٹ سے اسلام آباد چلا جائے گا۔
مگر اتوار کی شب جب آفتاب کے ساتھ وہ شہر نوردی کر کے واپس آیا تو اجمال احمد کو گھر میں موجود پایا۔ آفتاب نے اس کا تعارف کرایا۔ اجمال احمد بڑے تپاک سے اس سے ملا۔ اور جب آفتاب کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ وہ اگلے روز جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے سر ہی ہو گیا کہ مزید دو تین دن ٹھہر کر اسے میزبانی کا شرف بخشے۔ آفتاب تو خود بھی اس کے جانے کے حق میں نہ تھا۔ وہ بھی اس کا ہم زبان ہو گیا۔ اور اسفند کو مجبوراً بلکہ صحیح معنوں میں طوعاً و کرہاً ایک دو روز مزید رکنا ہی پڑا۔
اجمال احمد بے حد خلیق ہی نہیں بلکہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی بہت خوش شکل اور ہنس مکھ سا انسان تھا۔ اس نے بڑی آؤبھگت کی اور آفتاب کی غیر موجودگی میں اپنی دلچسپ باتوں سے اس کا دل بھی بہلاتا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی چونکہ اسفند کا دل لاہور سے اُچاٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ بہرصورت وہ بدھ کی شام کو اسلام آباد روانہ ہو جائے گا۔ اور بدھ کے روز اسی ارادے سے گھر سے نکلا تھا کہ خاموشی سے جا کر جہاز سے اپنی سیٹ بک کرا لے گا۔ گھر سے نکلا تو دور تک چلنے کے باوجود اسے کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ البتہ تانگے اور موٹر رکشائیں ادھر اُدھر تیزی سے آتے جاتے نظر آئے۔
تانگے میں بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ تقریباً سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ کراچی والے تانگے کی سواری کو گدھا گاڑی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ بھی بڑے طبقے کے لوگ جو رکشا اور ٹیکسیوں کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں۔ کہ کراچی میں تو ان پرائیویٹ کاروں کا ایک سیل سا بہتا نظر آتا ہے۔ کراچی کے تو عوام الناس بھی تانگے کی سواری پر بس کی سواری کو ترجیح دیتے ہیں۔ رہ گئی موٹر رکشہ تو بعض لوگ اسے خطرناک اور جان لیوا سواری قرار دیتے ہوئے پیدل یا بس سے سفر کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر اس کا تعلق بعض لوگوں میں سے نہیں بلکہ اعلیٰ طبقے سے تھا۔
وہ اپنی اٹھائیس انتیس سالہ زندگی میں کبھی رکشہ میں نہیں بیٹھا تھا۔ لیکن اس روز چونکہ وہ چپکے سے اجمال احمد کے گھر سے نکلا تھا اور کوئی دوسری سواری مل ہی نہیں رہی تھی اس لیے ایک موٹر رکشہ روک کر اس میں بیٹھ گیا۔
"کدھر جانا ہے باؤ جی؟" رکشہ والے نے پوچھا۔ اب اسے کسی علاقے کا نام معلوم ہوتا تو بتاتا بھی۔ بس اسی ہوٹل کا نام بتایا تھا جس میں ٹھہرا تھا۔ اصل میں تو اس ہوٹل کے بینجر نے ہی اس روز جس روز آفتاب اچانک ہی اس سے ملنے پہنچ گیا تھا اس سے کہا تھا سیٹ بُک کرانے کے سلسلے میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ فون پر ہی ایک فضائی کمپنی سے اس کی بات کروا دے گا اور اس کی بکنگ بھی آسانی سے ہو جائے گی۔
مگر — اب یہ بھی اتفاق کی بات ہی تھی کہ رکشہ والا بھی لاہور میں نو وارد تھا۔
وہ نامعلوم کون کون سے راستے ناپتا اسے ایک دوسرے ہوٹل کے سامنے اُتار گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اس علاقے میں کئی ہوٹل ہیں۔ اور آپ کا ہوٹل بھی یہیں کہیں ہوگا۔ بہرکیف! وہ بھی خاموشی سے رکشہ سے اُتر گیا تھا۔ کیونکہ رکشہ میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع تھا اور جھٹکے کھا کھا کر اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اور وہ خود بھی اس تکلیف دہ سواری سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا کہ خود پیدل چل کر ہی اس ہوٹل کو کسی نہ کسی طرح تلاش کرے گا۔ جہاں وہ اترا تھا وہ بھی بڑا گنجان علاقہ تھا۔
ٹریفک بھی زبردست اور بھیڑ بھی بہت زیادہ — اور گرمی بھی بہت سخت پڑ رہی تھی جس ہوٹل کے آگے وہ اترا تھا وہ ایک نچلے درجے کا ہوٹل تھا۔ وہ پہلے ہوٹل کے قرب و جوار میں اپنا مطلوبہ ہوٹل تلاش کرتا رہا۔ خیر اس نے سوچا کہ کیوں نہ سڑک پار کر کے دوسری جانب جا کر دیکھے یا پھر کسی سے پوچھ لے۔
سڑک پر بھاری ٹریفک رواں دواں تھا۔ اور وہ پیدل تھا۔ ٹریفک سگنل کے سامنے سڑک کے کنارے چند راہگیروں کے ساتھ وہ بھی پیدل چلنے والوں کے لیے راستہ کھلنے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ تبھی — فٹ پاتھ سے کوئی دو بالشت کے فاصلے پر عین اس کے سامنے سرخ بتی جل اٹھنے کی وجہ سے ایک رکشہ آ کر رکی۔ حالانکہ اسی وقت پیدل سڑک پار کرنے والوں کے لیے راستہ کھل گیا تھا۔ لیکن رکشہ میں بیٹھے ہوئے شخص پر نظر پڑتے ہی اس کا اُٹھتا ہوا قدم وہیں جم کر رہ گیا۔
حالانکہ اس شخص نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا شیو بھی تھوڑا تھوڑا بڑھا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کی تعجب سے پھیلتی آنکھوں نے فوراً ہی پہچان لیا تھا کہ وہ اس کے پھوپھا ہیں۔

ان تیزی سے گزرتے ہوئے لمحوں میں اس شخص نے بھی اس کی طرف بڑے تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔ اور اس شخص کی
نظروں میں یہ پہچان کے سائے سے بھی لہرائے تھے بلکہ اسفند سے اس کی نظریں بھی چار ہوئی تھیں۔ مگر اسفند جوں ہی پھوپھا جان کی
کی طرف بڑھا۔ اس نے نظروں ہی نہیں کترائیں بلکہ منہ بھی دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر جونہی اسفند قدم بڑھا کر رکشہ کی طرف بڑھا
شومیٔ قسمت سے سبز بتی روشن ہوگئی اور رکشہ والا تیزی سے رکشہ کو بھگاتا ہوا آگے لے گیا۔ اور بس اسفند کا پیر رکشہ کے پہیے کے نیچے
جانے میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ اسفند جلدی سے ہٹ کر پھر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اور تھوڑی دیر وہاں کھڑا یہی سوچتا رہا کہ کہیں وہ کوئی
اور شخص تو نہیں تھا جو پھوپھا سے اتنی زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔

یوں بھی پھوپھا سے ملے اسے چھ سات سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اور اس عرصے میں ظاہر ہے پھوپھا کی عمر میں اضافہ ہی ہو گیا ہو گا
اور اگرچہ ان کی ہیئت نہ بدلی ہوگی تو بھی ان کے اندر بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہوں گی۔

وہی تبدیلیاں جو عمر کے طولانی دور کے ڈھلنے کے بعد انسان کے اندر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ جبکہ رکشہ میں بیٹھنے والا شخص سات سال
قبل والے پھوپھا کی بعین کاپی تھا۔ مگر نہیں یہ صدفی صد پھوپھا جان ہی تھے۔ کیونکہ وہ اگر ان سے مشابہت رکھنے والے کوئی اور شخص
ہوتے تو مجھے یوں اچانک دیکھ کر ان کی نگاہوں میں حیرت نہ امنڈتی۔ یوں پہچان لینے کا تاثر ہویدا نہ ہوتا۔ اور میرے پھوپھا جان کے علاوہ
پر وہ ہرگز اس طرح نظریں نہ کتراتے۔ جیسے دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہوں۔ یوں منہ نہ پھیرتے جیسے روگردانی سے کام لینا
چاہ رہے ہوں۔ نہیں نہیں وہ یقیناً پھوپھا جان ہی تھے۔

پھر جونہی اسے خیال آیا کہ وہ بڑی دیر سے فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑا ہوا ہے تو اس نے قریب ہی سے گزرتی ایک مقامی ٹیکسی
روکی اور اس میں بیٹھ کر ٹیکسی والے سے مزنگ چلنے کو کہا۔ کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ تو بتا سکتا تھا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ
اجمال احمد کا گھر مزنگ کے کس علاقے میں ہے۔ کون سی جگہ ہے یا پھر اس کا نمبر کیا ہے۔

بہرحال مزنگ تک کا علاقہ بھی اس نے یہی سوچنے میں طے کیا کہ کیا پھوپھا نے سلوط کو اس کے یہاں بھیجنے کے بعد لاہور میں
ہی اقامت اختیار کر رکھی ہے۔؟ کیا وہ ملک سے باہر گئے ہی نہیں۔ جو لاہور ہی میں نظر آ رہے ہیں اور کیا اب تک مزنگ والے
مکان ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ اور اگر ان کا کہیں جانے کا پروگرام نہیں تھا تو انہوں نے سلوط کو کس وجہ سے آخر اس کے گھر بھیج دیا تھا
نہ صرف بھیج دیا تھا بلکہ ڈیڑھ برس کے عرصے میں پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ ان باتوں سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ ساری گڑبڑ
سلوط کی وجہ سے ہی تھی۔ اچھے بھلے شوہر کو چھوڑے بیٹھی تھی۔ اس لیے سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلا ہوگا تو اس کے شوہر نے ٹیڑھی انگلیوں
سے نکالنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھوپھا کو اس کے شوہر کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا ہوگا اسی لیے انہوں نے سلوط کو ہمارے
گھر بھیج دیا ہوگا۔ یقیناً کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔ اور بہانہ یہ کر دیا کہ ورلڈ ٹور پہ گئے ہیں ـــــ ہونہہ بقول ممی "ایک دمڑی تو جیب میں
نہیں ہے اور ثاقب بھائی فاخرہ کو لے کر ورلڈ ٹور پہ گئے ہیں۔ بھلا حد بھی ہوتی ہے جھوٹ بولنے کی۔

واقعی میری عقل پہ بھی پتھر ہی پڑ گئے تھے۔ ورنہ میں نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ پھوپھا جان کی اتنی تو حیثیت نہیں کہ کراچی تک ہی پھوپھو
بیگم کے ساتھ سفر کر سکیں۔ پھر بھلا وہ ورلڈ ٹور پہ کیسے جا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی رکشہ میں ایسا ڈھیلا ڈھالا اور ملگجا سفاری سوٹ
پہنے بیٹھے تھے جیسے کسی کی اترن پہن رکھی ہو۔ نہ معلوم کس حال میں ہیں اور کہاں رہ رہے ہیں۔ اور بے چاری پھپھو بیگم ان کے ساتھ نہ معلوم
ان کے کس گناہ کی سزا بھگت رہی ہیں۔ جبکہ وہ تو بڑے ناز و نعم میں پلی بڑھی ہیں۔ اپنے انہیں منتشر سے خیالوں میں گم ـــــ وہ یہ بھی بھول
گیا تھا کہ اپنی پرائیویٹ کار میں نہیں ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ یا اسے کہیں اترنا بھی ہے وہ تو ٹیکسی ڈرائیور نے خود ہی اس سے پوچھا۔

"مزنگ تو پیچھے رہ گیا باؤجی۔ آخر آپ کو جانا کہاں ہے۔؟" تب وہ اپنی محویت سے بری طرح چونکا۔ اور ڈرائیور سے بولا۔
"بھئی مزنگ ہی جانا ہے۔ اصل میں، میں یہاں نیا نیا آیا ہوں اسی لیے مجھے یہاں کے راستوں کا بالکل علم نہیں۔ تم گاڑی موڑ لو۔"
اور تب ٹیکسی ڈرائیور نے چپ چاپ گاڑی موڑ لی۔

"مزنگ تو کافی بڑا علاقہ ہے آپ کو کون سی جگہ اترنا ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر پوچھا۔ اور اس نے سوچا کہ جگہ کا نام اور پتا
تو اسے معلوم ہی نہیں پھر بھلا ڈرائیور کو کیا بتائے۔ کیوں نہ خود ہی اتر کر ڈھونڈ لے۔ بس یہ خیال آتے ہی اس نے ڈرائیور سے کہا۔
"بس وہ جو آگے جا کر ایک چوراہا سا بنا ہوا ہے۔ وہیں مجھے اتار دینا۔" ڈرائیور نے پلٹ کر عجیب سی نظروں سے اس کی طرف
دیکھا اور تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے اسی چوراہے پر اتار دیا۔ اس نے اتر کر میٹر دیکھے بغیر ہی ٹیکسی والے کے ہاتھ میں بند

سے تھما دیے اور پھر اسے حیران اور متعجب سا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اصل میں وہ چوراہا جس پر وہ اترا تھا۔ جاتے وقت بھی اس کے
راستے میں پڑا تھا۔ اور رکشہ والا پتلی سی سڑکوں کے موڑ کاٹتا ہوا اس طرف سے نکلا تھا۔ اور چونکہ رکشہ کا سفر اس کے لیے ایک نیا
تجربہ تھا۔ اسی لیے اس نے بالکل دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اسے کن کن راستوں سے نکال کر لے گیا تھا۔ وہ تو کچھ آگے جا کر قسمت
سے اجمال احمد کے ملازم نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور بھاگ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی بڑی آسانی سے گھر پہنچ گیا تھا۔
ورنہ نہ معلوم اسے کتنی دیر بھٹکنا پڑتا۔

اپنے رہائشی کمرے میں آ کر ہی اسے یاد آیا تھا کہ وہ کس مقصد سے گھر سے نکلا تھا۔ ورنہ پھوپھا کو اس قدر غیر متوقع اور اتفاقی
طور پر دیکھ کر تو وہ سب کچھ ہی بھول گیا تھا۔ مگر اب کمرے میں واپس آنے کے بعد اسلام آباد جانے کا خیال آیا تو پھوپھی اور پھوپھا کی
خیال نے اس خیال کو سختی سے جھٹک دیا۔ وہ تو بس یہی سوچے جا رہا تھا کہ کس طرح اور کیوں کر پھوپھا تک رسائی حاصل کی جائے
ان کے بارے میں کس سے پوچھے اور کیا کہے۔؟

نمبر اگر یاد بھی آیا تو بیکار ہی تھا۔ کہ کیوں کہ صرف پہلا ہندسہ ہی دماغ پر بہت زور دینے پر یاد آ سکا تھا۔ اور وہ ایک کا ہندسہ تھا
گر وہاں تو نمبر ایک سو بانا کچھ تھا۔ اور اسی وقت اسے اپنی اس غفلت کا احساس بھی ہوا تھا کہ اس نے ان تین چار دنوں میں آتے اور جاتے
بھی اجمال احمد کا نمبر پڑھنے یا معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اصل میں تو چونکہ وہ پورچ سے جیپ میں سوار ہو کر باہر نکلتا تھا۔
اور رات کو بھی جیپ میں بیٹھ کر اندر آتا تھا۔ اتنا موقع ہی کہاں ہوتا تھا۔ کہ باہر گیٹ کے پہلو میں نیم پلیٹ کے عین نیچے درج مکان کے نمبر
کو پڑھ سکتا۔ مگر اب جونہی اپنی اس کوتاہی کا خیال آیا۔ اس نے اجمال احمد کے ملازم کو بلا کر اجمال احمد کے مکان کا نمبر پوچھا۔

"جی $\frac{154}{2}$ D" ملازم نے بتایا تو وہ اچھل پڑا۔

"ہاں کچھ یہی نمبر تو تھا۔ یا پھر کچھ اس سے ملتا جلتا۔ کیونکہ اس میں D وغیرہ کی بخ نہیں تھی مگر ایک سو کچھ نے ضرور تھا۔ ممکن ہے یہیں
قریب ہی کہیں ہو وہ گھر ـــــ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے کو آہستہ سے بجا کر اجمال نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اور پھر اس کے
کچھ کہنے سے پہلے ہی اندر آ گیا۔

"ہیلو، کہاں گھوم پھر آئے آپ"، اس نے آتے ہی پوچھا۔

"وہ بس ـــ ذرا یونہی گھومنے پھرنے گیا تھا۔ آپ تشریف رکھیے۔" وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔

"ارے نہیں آپ بیٹھے رہیں۔" اجمال احمد نے کہا اور پھر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ ٹیکسی کا تکلف کیوں برتا آپ نے۔ کیا ہمیں کسی خدمت کا موقع دینا آپ گوارا نہیں کرتے۔" اجمال نے بیٹھنے کے بعد گلہ سا کیا۔

"ارے نہیں۔ وہ اصل میں سیٹ بک کرانے کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر ـــ" اسفند نے کہنا چاہا تو اجمال اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مگر کار تو موجود تھی گھر میں۔ اسی میں چلے جاتے۔ ویسے کیا سیٹ بک کرا لی آپ نے۔" اجمال احمد نے اپنی بات کہہ کر پوچھا۔

"نہیں ـ وہ ٹیکسی والا بھی اتفاق سے میری طرح لاہور میں نووارد تھا۔ اس نے مجھے کسی اور جگہ اتار دیا تھا۔ میں بس یونہی گھوم
پھر کے واپس آ گیا۔" اس نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"او ہو تو آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا۔ میں گھر بیٹھے بیٹھے ہی آپ کی سیٹ بک کروا دیتا۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا۔ اس بہانے آپ
شاید ایک روز اور رک جائیں گے۔ اصل میں مجھے آپ کی خاطر تواضع کرنے کا ڈھنگ سے موقع ہی کہاں ملا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک وقت
کھانا بھی آپ کو نہیں کھلا سکا۔" اجمال احمد نے بڑے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں اجمال صاحب آپ تو کچھ بہت ہی انکسار سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ ـــ ورنہ میں اتنے دن سے آپ کے یہاں ہی ٹھہرا ہوا
ہوں۔ ناشتہ بھی یہیں کرتا ہوں اور چائے پانی وغیرہ بھی یہیں کا پیتا ہوں۔ اب اس سے بڑھ کر اور میری تواضع کیا ہو سکتی ہے۔؟" وہ
بڑے ہی بہت منکسرانہ لہجے میں بولا۔

"یہ کہہ کر تو آپ تکلف سے نہیں غیریت سے کام لے رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ یہاں رہ کر آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔؟"
"کیسی تکلیف ـ؟" اس نے پوچھا۔

"یہی یہاں کے شور شرابے کی۔ اصل میں یہ علاقہ ایک تو شہر کے وسط میں ہے دوسرے بہت پرانا ہے۔ یہ بنگلے اور فلیٹس جو آپ
دیکھ رہے ہیں یہ تو حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ورنہ جیسے مکانات اندرون میں بنے ہوئے ہیں۔ اسی وضع قطع کا کبھی یہ بنگلہ بھی تھا۔ جس

میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔" اجمال نے بتایا۔ اس نے خود ہی ایسا موضوع نکالا تھا جس پر وہ خود بھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر
کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیوں کر ابتدا کرے۔ لیکن اب تو اجمال احمد نے خود ہی ابتدا کر دی تھی۔

"اچھا اچھا ۔۔۔ تو یہ بنگلہ آپ نے حال ہی میں تعمیر کرایا ہے۔ شاید یہ آپ کا آبائی مکان ہوگا۔" اسفند بولا۔

"نہیں آبائی تو کیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اباجی نے جو ورثے میں جائیداد چھوڑی تھی اسی میں یہ مکان بھی شامل تھا۔ اور ہم لوگ تو
ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ لیکن ۔۔۔ بہت مجبوری کے تحت مجھے یہاں شفٹ ہونا پڑا تھا۔" اجمال احمد نے کہا۔ جواب میں پوچھنے کو
بہت سے سوال تھے مگر وہ خاموش ہی رہا۔ قدرے توقف کے بعد اجمال احمد خود ہی بولا۔

"اصل میں ہمارے اس مکان کے پہلے دو پورشن تھے اور دونوں ہی کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ اور چونکہ ادھر کچھ جائیداد کا جھگڑا
اٹھ کھڑا ہوا تھا اس لیے اس مکان کو خالی کرانا ناگزیر ہوگیا تھا۔ مگر صاحب ۔۔۔ آجکل کرائے داروں سے مکان خالی کرانا گویا جوئے شیر
لانے کے مترادف ہے۔"

اجمال احمد خاصا باتونی ثابت ہوا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی بہت ہی غیر دلچسپ اور غیر واسطہ باتوں سے اکتا جاتا،
لیکن اس سمے تو وہ خود ہی اس سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اجمال احمد خاموش ہوا تو اس سے اس نے رائے زنی کے
طور پر کہا۔

"جی ہاں۔ آپ درست ہی کہہ رہے ہیں۔ اصل میں رہائش کا مسئلہ تو اجتماعی طور پر آجکل سب ہی کو لاحق ہے۔ کیونکہ ہمارے
ملک میں مڈل اور لوئر کلاس کی ایک اکثریت آباد ہے۔ جو اتنی استطاعت ہی کہاں رکھتی ہے کہ اپنے ذاتی مکانات تعمیر کرا سکے۔"

"لیکن میرے کرائے داروں کو ایسا کوئی مسئلہ تو لاحق نہیں تھا۔ بڑے پورشن کا کرائے دار تو دس برس سے اس مکان میں
رہ رہا تھا اور چھوٹے پورشن کے کرائے دار کو رہتے تین سال ہوئے تھے۔ وہ کوئی اسمگلر تھا۔" اجمال نے یہ کہہ کر اسے چونکا دیا۔

"اچھا۔ وہ کوئی اسمگلر تھا؟" اس نے پہلو بدل کر کچھ اس انداز میں پوچھا کہ اجمال متعجب ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور ایک قہقہہ
لگا کر بولا۔

"اجی تو اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ ہمارے ملک میں تو تقریباً ہر بیسواں آدمی اسمگلر ہی ہوتا ہے۔"

"او ہو نہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی کہ آپ نے ایک ایسے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے شخص کو کرائے دار کیسے بنا لیا۔"
اس نے اندر ہی اندر جھینپ کر جلدی سے بات بنائی۔

"اب کوئی کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیسا شخص ہے۔ جب کہ بظاہر تو وہ بہت شریف اور مرنجان مرنج
سا نظر آتا تھا۔ اور فیملی بھی بہت مختصر سی تھی اس کی۔ صرف ایک بیوی اور ایک جوان بہن۔ مگر جب واسطہ پڑا تو ڈنڈے ہی
بلوا دیے اس نے۔" اجمال نے بتایا تو اب اسے یقین کر لینے میں کوئی شبہ باقی ہی نہ رہا کہ وہ اس کے پھوپھا کے بارے میں
ہی کہہ رہا تھا۔

"لیکن تعجب ہے کہ آپ کو مکان خالی کرانے میں اتنی دقت اٹھانی پڑی۔ ورنہ وہ تو ایک اسمگلر تھا۔ آپ نے اس کی
رپورٹ پولیس میں کیوں نہ درج کرا دی؟" اسفند اس خیال سے کہ کہیں اسے یہ خیال نہ گزرے کہ وہ اس اسمگلر کے معاملے میں
اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے اس انداز میں یہ بات کہی جیسے برسبیل تذکرہ کہہ رہا ہو۔ یا پھر محض اس کی بات کے جواب
میں۔ اجمال احمد یوں کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے ملازم کو بلا کر اس سے پوچھا کہ کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے اور
پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اصل میں وہ ایک تباہ حال اسمگلر تھا۔ غالباً آپ سمجھ تو گئے ہوں گے کہ تباہ حال سے میری مراد کیا ہے؟"

"ہائیں نہیں۔ بھلا سمجھ بھی کیسے سکتا ہوں جب کہ اسمگلر کے ساتھ یہ تباہ حال لفظ نے ۔۔۔ میری سمجھ کو ناکارہ بنا دیا ہے۔"
اسفند نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اسے تو صرف اور صرف پھوپھا کے بارے میں جاننے کی پڑی تھی۔ اجمال احمد
نے اس کی بات پر ایک قہقہہ لگایا اور پھر سوچ کر بولا۔

"تباہ حال سے میری مراد یہ ہے کہ آپس میں جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے گینگ (گروپ) سے کٹ کر بیٹھ گیا
تھا اور ایک طرح کی گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور یہ بات مجھے اسی وقت معلوم ہوئی تھی جب میری طرف سے دیے
گئے مکان خالی کرنے کے نوٹس کی میعاد ختم ہوگئی تھی اور میرے بہت زور دینے کے باوجود بھی وہ کسی طرح مکان خالی

... آمادہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ مالی طور پر بالکل قلاش تھا۔ اس صورت حال میں اگر بے چارے پر مقدمہ بھی چلتا تو اُلٹا
... نقصان ہی ہوتا۔ جب کہ دوسرے کرایے دار سے بھی میں کیس لڑ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس اسمگلر سے مکان خالی کرانے
... ہی ترکیب سوچی۔"

... اسفند نے انتہائی متجسس ہونے کے باوجود اس نے پُرسکون انداز میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

... کیا کریں جی۔ ہمارا اپنا بہت حرج ہو رہا تھا اور مکان تو خالی کرانا ہی تھا کسی نہ کسی طرح۔ اسی لیے میں
... چال چلی تھی جب کہ بعد میں مجھے افسوس تو بہت ہوا تھا اپنی اس حرکت پر۔" اُف تو یہ عجب نامعقول شخص ہے
... خواہ مخواہ ہی طول دے کر میرے تجسس میں اضافہ کیے جا رہا ہے۔ اجمال کے چبا چبا کر بات کرنے پر
... ہو کر اسفند نے دل میں سوچا۔

... افسوس کی اس میں کیا بات ہے بھئی، آپ کا ذاتی مکان تھا کہ آپ ہر طرح سے اسے خالی کرانے میں
... بجانب تھے۔ کوئی ساری زندگی تو کرائے دار کر لئے کے مکان پر قبضہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔" اسفند نے گویا یہ کہہ
... بات کو آگے بڑھایا۔

... ہاں بھلا دیکھیے کرایہ دار کو کہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے کے مکان پر قابض ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لیے
... نے بھی بہت مجبور ہو کر وہ چال چلی تھی۔ میں نے اس کے گروہ کے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر کے کہ
... فلاں فلاں جگہ رہتا ہے حتیٰ کہ گھر کا پتا بھی انہیں بتا دیا تھا اور یہی سوچ کر بتایا تھا کہ وہ لوگ جونہی اس تک رسائی
... حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ان کے ڈر سے وہ خود ہی مکان چھوڑ کر بھاگ جائے گا لیکن مجھے یہ اندازہ بالکل نہ تھا۔
... مجرمانہ ذہنیتیں رکھنے والوں کی نیتیں اور عزائم اس قدر ناپاک ہوتے ہیں۔ ان بدبختوں نے نہ صرف اسے چاروں طرف
... سے گھیر لیا بلکہ اس کی جوان بہن پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک رات اس کے گھر میں غنڈے گھُس آئے
... اور لڑکی کو اٹھا کر لے جانا ہی چاہتے تھے کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ریوالور سے فائر کر کے ان غنڈوں کو بھگا
... دیا۔ مگر اس واقعے کے تیسرے ہی دن لڑکی اچانک ہی کہیں غائب ہوگئی۔ اور شاید اسی غم میں وہ اگلے ہی روز چپ
... چاپ مکان خالی کر کے چلا گیا۔" گو یہ آخری فقرے اجمال نے بڑی خجالت اور تاسف سے کہے تھے لیکن اسفند
... نے اس کے لب و لہجے پر بالکل دھیان نہیں دیا بلکہ اس کے ذہن میں تو اس سمے بابا شرافت کے کہے یہ فقرے گونج
رہے تھے۔

"ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا نھنے صاحب کہ نند اور بھاوج کے رشتے میں قینچی کی کاٹ ہوتی ہے۔ چھوٹی
بیگم (ناہید) نے یہ جتنا بھی بتایا ہے وہ بھاوج بن کر بتایا ہے ہمدرد بن کر نہیں۔ اب اس میں کون سی بات سچ ہے اور
کون سی جھوٹی، یہ تو وہ نیلی چھتری والا ہی جانتا ہے۔" اور بابا شرافت کے ان فقروں کی بازگشت کے ساتھ ہی اسے
اپنے سینے سے ایک بوجھ سا اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا تو کیا وہ اسمگلر یہ شہر ہی چھوڑ گیا؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اجمال کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہا ہو۔

"ظاہر ہے لاہور سے بھی کہیں چلا گیا ہوگا جو دو برس ہونے کو آئے آج تک تو پھر کبھی نظر ہی نہیں آیا۔" اجمال
... اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اس نے کہا۔

"اوہ ... بج رہا ہے۔ کمال ہے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور باتیں بھی ایسی غیر متعلقہ۔
... کیا سوچ رہے ہوں گے کہ یہ شخص پورے پون گھنٹے سے بور کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"ارے نہیں، بور کرنا کیسا مجھے تو آپ کی دلچسپ باتوں نے بہت محظوظ کیا ہے مسٹر اجمال!" وہ خوش دلی کا
... کرتے ہوئے بولا۔

"یہ عنایت ہے آپ کی ورنہ بندہ کس لائق۔" اجمال نے مسکرا کر کہا اور پھر اٹھتا ہوا بولا۔ "تھوڑی دیر کے لیے
... چاہوں گا۔ اصل میں کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ ذرا جا کر دیکھ لوں پھر آپ کو کھانے کی میز تک زحمت دوں گا۔"

"اوہ نو شکریہ۔ آپ بالکل تکلف نہ کریں۔ مجھے اس وقت ذرا سی بھی اشتہا نہیں ہے کچھ بھی کھانے کی۔" اسفند
... تکلف سے کام لیتا ہوا بولا تو اجمال نے بڑی شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کمال ہے اسفند صاحب۔! آپ اس قدر تکلف سے کام لے رہے ہیں ورنہ وہ آپ کا دوست آفتاب عزیز

افی۔ میرا فرسٹ کزن ہی نہیں بلکہ لنگوٹیا بھی ہے اور اگر آپ اس کے یار ہیں تو ہم یاروں کے یار ہیں۔ پھر بھی اس قدر

غربت سے کام لیتے ہیں آپ۔ یا آپ اگر بہت مقوی اور مرغن غذائیں کھانے کے عادی ہیں تو حکم کیجیے وہ بھی منٹوں میں

تیار کروالیں گے۔"

"ارے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ اب میں کوئی آسمان سے تو نہیں اُترا سیدھا سادھا نارمل سا آدمی ہوں۔ میں

نے خود کو عمدہ خوراک کا کبھی خوگر نہیں بنایا بلکہ دال اور چٹنی بھی مل جائے تو صبر وشکر کرکے کھالیتا ہوں۔" اجمال کے پیار

بھرے شکوے پر اسفند جھینپ کر بولا۔

"ہا ہا ہا۔ دال اور چٹنی۔ یعنی کچھ زیادہ ہی کسر نفسی سے کام لینے کے عادی ہیں آپ۔ تو چلیے یہی سہی مگر کسی

طرح اس غربت کدے پر کھانا نہ کھانے کی قسم تو توڑ ہی دیجیے آپ۔" اجمال اس کی بات پر ایک قہقہہ لگاکر بولا اور ابھی

آتا ہوں کہہ کر اس کے رہائشی کمرے سے نکل گیا۔

اور اس کے جاتے ہی اسفند پھر اس کی زبانی سنی ـــ باتوں پر غور کرنے لگا۔ اپنی پھوپھو کی اتنا زیادہ غلط بیانی

پر ان کے لیے اس کے دل میں جو ایک خاص مقام تھا وہ بھی اس کی نظروں سے گرگیا۔ اور پھوپھو کے خلاف ماں کی وہ ساری

باتیں سچ نظر آنے لگیں جو اکثر و بیشتر وہ اس سامنے دہراتی رہتی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی پھوپھو کے پاس جائے

اور ان کی اس قدر گری ہوئی باتوں یا بعض دیگر الزام تراشی پر انہیں خوب ملامت کرے۔ مگر پھوپھو کے پاس جانا آسان

تو نہ تھا۔ اور اجمال نے تو پھوپھو اور پھوپھا کے بارے میں۔ یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے ہی نہیں لاہور سے ہی

چلے گئے ہیں لیکن یہ بات وہ کیسے مان لیتا جب چند گھنٹے پیشتر اس نے اپنی آنکھوں سے پھوپھا کو بہت قریب سے

رکشے میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور یہ سوچنا تو اس کی حماقت تھی کہ وہ شخص پھوپھا کا ہمشکل تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھوپھا

یہیں لاہور میں ہی موجود ہیں۔ مگر کہاں، اس سوال کا جواب دینا واقعی ممکن نہ تھا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ملازم اسے کھانے پر بُلانے آگیا۔

اور اسے با دلِ نخواستہ اجمال کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی پڑا۔

جب کہ وہ اس پر زیادہ بوجھ ڈالنے کے بالکل حق میں نہ تھا کہ اس کے یہاں قیام کرنا ہی کیا کم تھا۔

بہر حال، کھانے سے فارغ ہوکر وہ اپنے رہائشی کمرے میں آیا تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بجائے تمام وقت پھوپھا

کا اتا پتا معلوم کرنے کے بارے میں ہی سوچتا رہا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی کونسے سے مار رہا تھا کہ کہیں سلوط لوٹ کر

انہی کے پاس نہ آگئی ہو ورنہ وہ جا کہاں سکتی ہے اور جہاں تک ڈیڈی کے اسے تلاش کرنے کا سوال تھا تو وہ ابھی کوشش

میں اب تک کامیاب ہی نہ ہوسکے ہوں گے۔ ہاں بھلا اپنے غدار اور پُرہنگام کراچی شہر میں کسی کو ڈھونڈ نکالنا ممکن ہی کہاں

ہے۔ وہ تو اگر خدانخواستہ پھوپھا کے پاس نہیں پہنچی ہوگی۔ تو پھر یقیناً بہت غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوگی کہ فی زمانہ ایک جوان اور

خوبصورت بلکہ بے یار و مددگار لڑکی جب گھر سے قدم نکالتی ہے تو اسے اُجلی پوشاکوں کے اندر چھپے بھیڑیے نما انسان اپنی

خوراک بنالیتے ہیں اور اگر وہ پھوپھا کے پاس واپس نہیں پہنچی ہوگی تو یقیناً کسی حریص اور اوباش شخص کی ہوس کا شکار بن گئی ہوگی اور

اسے بے آبرو کرنے کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ میں ـــ

نہیں نہیں ـــ خواہ کچھ بھی ہو۔

لاہور میں میرے قیام کی مدت چاہے کتنی ہی بڑھ جائے۔ میں پھوپھی اور پھوپھا کو کھوج کر ہی رہوں گا۔

یہی سب سوچتے اور تہیہ کرتے اسے پتا تک نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ اس کی محویت تو اس وقت ٹوٹی جب اجمال

احمد کا ملازم چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے چائے کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی تو اسفند نے اپنی محویت سے چونک کر کہا۔

"یہ تم میری چائے یہاں کیوں لے آئے۔ مجھ سے کہہ دیتے تو میں اندر آکر تمہارے صاحب کے ساتھ پی لیتا۔"

"پر جی چھوٹے میاں تو گھنٹہ ہوا کہیں باہر چلے گئے ہیں اور جی آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو اندر بلاکے کیا تکلیف

دینی تھی۔" ملازم نے جس کا نام شیر محمد عرف شیرا تھا جواب میں کہا اور پھر جھک کر اس کے لیے پیالی میں چائے انڈیلنے لگا۔

"شکر کتنی پاؤں جی۔" اس نے پوچھا۔

"ذرا وہ چمچ۔" اسفند بولا۔ تو اس نے پیالی میں دودھ اور چینی ڈال کر سینٹر ٹیبل کو تھوڑا سا آگے کرکے چائے کی پیالی

بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ کھائیں وی نا صاب جی۔ یہ بسکٹ اور شامی کباب۔ کچھ تو لیں ناں جی۔"

"نہیں بس یہ چائے ہی کافی ہے۔" وہ تردد سے انداز میں بولا کہ ایک تو سہ پہر کی چائے پر کچھ کھانے کا عادی نہ تھا۔

دوسرے اس کا ذہن اس سمے سخت الجھا ہوا تھا۔ ملازم نے پھر کچھ نہیں کہا۔ اور ہتھیلیوں کو باہم جوڑ کر تھوڑا سا سرک کر کھڑا ہو

گیا جبکہ اس کا اس طرح ـــ سر پر سوار ہونا اسفند کو بہت کھلا۔ وہ چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے

بعد شیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں کے پرانے ملازم ہو۔" بہت ہی بے تکا سا سوال تھا پھر بھی شیرا ایک دم پھڑک ہی اٹھا اور

فخریہ انداز میں بولا۔

"اجی صاحب جی! پرانا ملازم کیسا میں تے کیا میرا تے پیو بھی اسی گھار رچ پیدا ہویا سی۔ اسے چھیڑا چھوٹے میاں جی ہے نا

ہیں نوں وی میں نے گود کھلایا ہے۔" اس نے آدھی اُردو، آدھی پنجابی میں بتایا۔ گو اس کی بات اچھی طرح اسفند کے پلے نہیں

پڑی تھی۔ مگر تھوڑی بہت پڑی تھی اس کے تحت اسفند کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ بات تو اس نے محض اسے سر سے ٹالنے کی غرض سے

شروع کی تھی۔ مگر جب ملازم کی زبانی اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اجمال احمد کے گھر کا پروردہ ہے تو اس نے اپنے اس خیال کے تحت

اس نے اس کی ذات میں دلچسپی لیتے ہوئے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

"اچھا اچھا تم گویا تم اس گھر کے پشتینی نمک خوار ہو۔" اب بات خواہ شیرا کے پلے پڑی یا نہ پڑی مگر اس نے اپنی ساری

بتیسی نکال کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسفند کچھ دیر تک تو یہی سوچتا رہا کہ جو بات وہ پوچھنا چاہتا ہے اس کی ابتدا کیسے کرے۔

اسی اثنا میں چائے کی پیالی بھی خالی ہوچکی تھی۔ جس کی کچھ وجہ یہ تھی کہ شیرا نے اس کی پیالی میں فرج کا ٹھنڈا دودھ ڈالا تھا۔ اس

لیے چائے کچھ ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ جسے اسفند حسبِ عادت آہستہ آہستہ پینے کے بجائے جلد ہی پی گیا تھا۔ اس نے پیالی خالی

کرکے ٹرے میں رکھی تو شیرا نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ایک کپ ہور (اور) بنا دوں؟" حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اسی بہانے شیرا کو باتوں میں الجھانے

کی غرض سے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شیرا نے اس پیالی کے بجائے دوسری صاف ستھری پیالی میں جلدی جلدی

اس کے لیے چائے انڈیلی اور پھر بڑے ادب سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھما دیا۔

"یہ بنگلہ تو ابھی نیا نیا ہی بنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں جی نواں نواں ہی بنا ہے۔ پر اگے تے ایک مکان ہی سی۔" شیرا نے بتایا۔

"اچھا اچھا۔ تو گویا مکان کو توڑ کر یہ بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ پلاٹ وغیرہ پر بنایا گیا ہوگا۔" اسفند بولا۔

"نئیں جی۔ پلاٹ ولاٹ کیسا۔ اے تے چھوٹے میاں جی کے دادا کا گھر سی۔ پر ادھر آگے والے پورشن میں چھوٹے میاں جی

کے پھوپھا رہندا سی۔ پچھلے دو کمرے اوس نے کرائے پے چڑھائے ہوئے تھے۔ جی ڈاڈا رولا پیا سی مکان کا کبجہ (قبضہ)

لینے کے لیے۔ نالش کیتی سی چھوٹے میاں جی نے عدالت میں پورے ایک سال۔ تب جا کر مکان کا کبجہ (قبضہ) ملا سی چھوٹے میاں جی

نوں۔" شیرا نے مزید انکشاف کیے۔

"اچھا دوسرے کرائے دار نے بھی بڑی مشکل سے گھر خالی کیا ہوگا۔" اسفند اب اصل مقاصد کی طرف آتا ہوا بولا۔

"نئیں جی ـــ وہ تو وڈا شریف (شریف) بندہ سی ـــ بالکل بکری جیسا ـــ اس نے کیا جگڑھا (جھگڑا) کرنا تھا۔ اوس

نوں تے چھوٹے میاں جی نے ذرا دھمکا کے پہلوں ہی بھگا دیا سی۔"

"چلو اجمال صاحب نے یہ اچھا ہی کیا۔ کیونکہ وہ اسمگلر بھی تو تھا۔ اور ایسے لوگوں کو گھر میں رکھنے سے انسان بہت سی مشکلات

میں پھنس سکتا ہے۔ مگر کیا وہ تنہا ہی رہتا تھا۔" اسفند نے شیرا سے مزید باتیں اگلوانے کی غرض سے بڑی چالاکی سے کام لے

کر اس کے پھوپھا کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں جی دو زنانیاں وی سیں اس کے ساتھ۔ ہیک اس کی دہاٹی (بیوی) سی تے ہیک بھین ـــ پر جی وڈی شریف

اور عجت (عزت) والیاں تھیں دونوں۔ گھر سے باہر قدم نکالنا۔ نہ کسی سے ملنا جلنا۔ بس اپنے کام سے کام رکھنا۔ پر اس کی بھین (بہن) وڈی سونی (خوبصورت) سی۔ ایسی سونی جیسی رانیاں ہوندی ہیں۔ چھوٹے میاں جی نے اس کی کھبصورتی (خوبصورتی) سے فیدا (فائدہ) اُٹھایا۔ اپنے دو چار بندے اکھٹا کر کے اس کے گھر وچ کدوا دیے۔ اور بس اس بات سے ڈر کر وہ مکان چھوڑ کے نس گیا (بھاگ گیا)۔ پر جی چھوٹے میاں جی وڈا نیک بندہ ہے اس نے کسی کو بری نیت سے نہیں کدوا ئے تھے اپنے بندے۔" شیرا نے آپ ہی آپ سب کچھ اگل دیا۔

"ہاں ہاں ظاہر ہے۔ اجمال صاحب تو بہت ہی ڈیسینٹ آدمی ہیں اور بہت ہی مہمان نواز۔ مگر کیا وہ اسمگلر لاہور چھوڑ کر ہی چلا گیا۔"

"جی صاحب جی۔ اسے اسمگلر تو نہ کہیں۔ وہ بے چارا تے خود اسمگلروں کے پھندے میں پھنس گیا سی۔ نشئی ہی دو جی اسمگلر بھلا اتنے غریب دی ہوندے ہیں۔ جتنا کہ وہ تھا۔ ہور (اور) وہ لہور (لاہور) چھڈ کے تے نئیں گیا۔ وہ تے مغل پورہ میں رہندا اے۔ پر میرے سوا کسی نوں وی پتا نئیں کہ کدھر رہندا اے۔ چھوٹے میاں جی نوں وی نئیں۔" شیرا نے آخری فقرہ بڑی رازدارانہ انداز میں بتایا۔ تو گویا اسفند کی باچھیں کھل گئیں۔

مگر — اپنی خوشی کو اس نے شیرا پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"لیکن اس میں ابن قدر رازداری سے کام لینے کی کیا بات ہے جو تم نے اپنے چھوٹے میاں جی سے بھی اس بات کو چھپا رکھا ہے۔" اسفند نے یوں ہی بات کا سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے پوچھا۔

"جی وہ بتانے کی گل تے نئیں ہے۔ پر تسی آکھدے سے (کہتے) او تے فیر بتانا ای پڑیں گا۔ وہ جیہڑی اس کی بھین سی۔ ڈاڈی بدنامی ہوئی سی اس دی۔ ایس محلے دے وچ کہ وہ دے چارہ منہ چھپا کے ویٹھ (بیٹھ) گیا سی تے فیر میں نے کسی نوں کیا بتانا تھا۔ ویسے وی صاحب جی! کوئی بندہ کسی کی عجت نوں چھپا کے رکھدا ہے تے اس کا رب بھی اس بندے کی عجت پر پردہ ڈال دیندا اے۔ میرے مولا دا بھرمان (فرمان) اے کہ توں کسی دا اک عیب چھپائے گا۔ میں تیری دس عیباں تے پردہ ڈال دیواں گا۔" شیرا نے یہ آخری فقرے کو بڑے سیدھے سادھے انداز میں کہے تھے مگر اسفند کے قلب پر ان سادگی سے کہے فقروں نے بڑا گہرا اثر کیا کہ اس بے چارے سیدھے سادے اور جاہل سے شخص کو بھی اتنی ہدایت ملی تھی کہ ناخواندہ ہوتے ہوئے بھی وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں بات کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ ٹرے اٹھا کر جانے لگا تو اس نے کچھ سوچ کر اس سے پوچھا۔

"یہ مغل پورہ آخر ہے کس طرف؟ میں تو لاہور کی سیر کرنے کی غرض سے ہی آیا تھا۔ اور تقریباً پورا لاہور ہی گھوم پھر کر دیکھ لیا حتیٰ کہ شاہدرہ تک بھی ہو آیا۔ مگر مغل پورہ کا نام آج تمہاری زبان سے پہلی بار ہی سنا ہے۔"

"وہ جی بس لاہور شہر سے چند کوس آگے ہے۔ پورا شہر آباد ہے ادھر وی۔ پر کوئی ایسی ویکھن والی شے نئیں۔" شیرا ٹرے اٹھا کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"خیر، پھر بھی ایک علاقہ تو ہے ناں۔ اب میں کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ شام کو کسی وقت میرے ساتھ چل کر مجھے وہ جگہ بھی دکھا دو۔" اسفند نے کہا۔ اصل میں وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے اس کرایہ دار کے گھر لے چلو۔ لیکن بھلا کیسے کہتا کہ شیرا کو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کرایہ دار سے اس کی قرابت داری ہے۔

"پر صاب جی مغل پورہ دی سیر ہی کرنی ہے تے چھوٹے میاں جی کے ساتھ ان کی گاڈی میں بیٹھ کر کر آئیں۔ بھلا میں کیس طرح آپ کے ساتھ جا سکدا ہوں۔" اس کی بات پر شیرا کچھ بدک گیا۔

"ارے نہیں بھائی، اب میں اتنی سی بات کے لیے اجمال صاحب کو تو ہرگز زحمت نہیں دوں گا۔ ہاں البتہ ان کی کار خود ڈرائیو کر کے تمہیں مغل پورہ لے چلوں گا۔ اور پھر جب سے آیا ہوں میں نے تم کو کچھ بھی نہیں دیا۔ حالانکہ تم کتنے دل اور مستعدی سے میرے کام کرتے رہے ہو۔ ساتھ کے ساتھ تمہیں تھوڑی سی شاپنگ بھی کرا دوں گا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟" اسفند نے گویا اسے انعام و اکرام کا لالچ دیا۔

"اجی نئیں صاحب جی! آپ کی وڈی (بڑی) مہربانی۔ آپ تے ساڈے مہمان ہیں۔ ہنس کر بات کر لیندے ہیں یہی میرے لیے سب تے وڈا انعام اے۔" شیرا دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر بڑے فدویانہ انداز میں بولا۔

"خیر خیر صرف خالی خولی ہنس کر بات کرنے سے تو کام نہیں چلتا۔ ہم تو تمہیں کوئی نہ کوئی انعام دے کر رہیں گے۔ بس تم شام کو اپنے سارے کام نمٹانے کے بعد تیار ہو جانا۔ اور اب جاؤ یہ ٹرے یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔" اسفند کھڑا ہوتا ہوا بولا تو "چنگا جی" کہہ کر شیرا نے ٹرے اٹھائی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی ریسٹ واچ میں وقت دیکھا تو معاً اسے یاد آیا کہ آفتاب بس گھنٹہ آدھا گھنٹہ میں پہنچنے ہی والا ہوگا۔ پہلے سوچا کہ اسے ساری بات بتا دے مگر پھر خیال آیا کہ پھوپھا کی شہرت اچھی نہیں ہے اور اس کا یہ گھر یلو معاملہ ہے جس سے کسی دوسرے انسان کو آگاہ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے ادھر اس پر مغل پورہ جانے کی بھی سوار تھی۔ اور اس سمے سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ اور ابھی مغل پورہ جانے میں بھی تین گھنٹے باقی تھے۔ اس لیے اس نے ہینگر سے کوٹ اتار کر جلدی جلدی پہنا اور پھر آفتاب کے آکر چلے جانے تک کا وقت گزارنے کے لیے وہ ٹہلتے ٹہلتے اجمال کے بنگلے سے خاصی دور نکل آیا۔ اور اس وقت ادھر ادھر گھومتا رہا جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو گیا کہ آفتاب آکر اور تھوڑی دیر اس کا انتظار کر کے واپس چلا گیا ہوگا۔

وہ سخت بے چینی میں مبتلا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر پھوپھا تک پہنچ جائے۔ اس لیے وقت بہت سست رفتاری سے گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس پر اسے اس بات پر بھی پورا یقین نہیں تھا کہ شیرا واقعی اسے اس کے پھوپھا کے گھر کا پتا بتا دے گا۔ یوں بھی اس نے شیرا کی باتوں سے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی — بات ایسی ضرور تھی جسے شیرا چھپانا چاہ رہا تھا۔

بہرحال خدا خدا کر کے شام بھی رات میں ڈھل گئی۔ وہ گھر واپس آیا تو اجمال احمد کہیں باہر جانے کے لیے تیار کھڑا نظر آیا۔ اس کے پاس ایک جیپ اور دو کاریں تھیں۔ اسفند بہت غیور اور خوددار آدمی تھا۔ پھر بھی اپنی ضرورت کے تحت اس نے اپنی خودداری کو تج کر اجمال سے کہا۔

"مجھے ذرا چھاؤنی تک جانا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں خود آپ کی کار ڈرائیو کر کے لے جاؤں۔"

"اوہ ہاں ہاں، بصد شوق۔ یار کیوں خواہ مخواہ اتنی غیریت سے کام لیتے ہو۔ مہمان کے لیے تو ہم اپنا دل بھی پلیٹ میں رکھ کر حاضر کر دیتے ہیں۔ ایک کار کی کیا حیثیت۔ یہ میری نہیں آپ کی ہے۔" اجمال اتنی اپنائیت اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا کہ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"واہ ایک طرف کہہ رہے ہو کہ غیریت سے کام لیتے ہو اور دوسری طرف مہمان بھی کہتے ہو۔ بہرحال اے بنڈل آف تھینکس۔" اس نے اپنی شرمندگی اس طرح مٹائی۔

"ہاں یار! بات تو تم نے بڑے پتے کی کی ہے۔ بہرحال لیجیے کار کی چابی۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ خاص طور پر آپ کے بنڈل آف تھینکس کا ریٹرن۔" اجمال نے ہنس کر کہا۔ اور چابی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"اوکے سپیرز۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ پھر ڈنر ساتھ ہی لیں گے۔" اجمال اپنی کار کی طرف بڑھنے سے پہلے بولا۔

"اچھا، وِش سو لانگ۔" اسفند نے بھی چابی گھما کر گیراج کی طرف کا رخ کرتے ہوئے کہا جس کے باہر ہی دوسری کار کھڑی تھی۔ اجمال تو اسی وقت زن سے کار لے اڑا تھا۔ مگر دوسری کار کے قریب پہنچ کر اسفند کو کچھ دیر تک شیرا کا انتظار کرنا پڑا جو آیا بھی تو یہی کہتا ہوا کہ صاب جی جلدی لوٹ آئیے گا کیونکہ میز پر کھانا لگانے کی ڈیوٹی بھی میرے ہی سر ہے۔ بہرحال اسے کار میں بٹھا کر اسفند نے کار اسٹارٹ کی اور اسی سے مغل پورہ کی سمت اور راستہ پوچھتا ہوا بالآخر مغل پورہ پہنچ ہی گیا۔ کچھ دیر تک تو ادھر ادھر بلا مقصد کار گھماتا رہا پھر اس نے شیرا سے کہا۔

"کیا یہاں کے بازار میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز مل جائے گی۔ اصل میں کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ ورنہ سب سے پہلے انارکلی بازار چلتے۔"

"نئیں نئیں صاب جی! مینوں کچھ وی نہیں چاہیے۔ یوں وی تنخواہ دیندے ہیں چھوٹے میاں جی مینوں پورے ہزار روپے مہینا۔ بس ایہی بوت اے۔"

"خیر وہ تو تم تمہارے میاں جی تمہیں کام کا معاوضہ دیتے ہیں۔ لیکن میں تو انعام دینا چاہ رہا ہوں۔ اچھا خیر یہ لو۔ اپنا انعام اور ان روپوں سے جو چیز چاہو خرید لینا۔" دورانِ گفتگو ہی اسفند نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بٹوہ نکال لیا تھا۔ جسے کھول کر اس نے سو روپے کا ایک کرارا اور اُجلا اُجلا نوٹ نکال کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے شیر محمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نئیں جی نئیں میں نے تو نئیں لینا۔ تُسی انی تکلیف کیوں کر دے او۔" کچھ ایسے ہی رسمی سے جملے کہنے کے بعد گویا ہزار ناں ناں کرنے کے باوجود شیر انے وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لے ہی لیا۔ اور پھر پُرجوش انداز میں سلیوٹ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا سلام صاحب جی!" اور اسفند آہستہ سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے دماغ میں اگر طرح طرح کے خیالات کی کھچڑی پک رہی تھی۔ تو دل میں بھی طرح طرح کے ملے جلے احساسات کی کھد بد ہو رہی تھی۔

ایسے حالات سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوا تھا جن میں زندگی اتفاقات پر ہی منحصر ہو کر رہ گئی ہو۔ ہاں یہ اتفاقات ہی تو تھے جو ایک تواتر سے پیش آ رہے تھے۔ اس کا لاہور آنا بھی ایک اتفاقی امر ہی تھا کیونکہ لاہور آنے میں اس کے کسی ارادے کو دخل نہ تھا۔ پھر اس کے بعد۔ آفتاب سے اچانک اور غیر متوقع طور پر مل جانا کہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر تو وہ اسی روز اسلام آباد جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک وہ اس سے ملنے آ گیا۔ پھر اس کا ہوٹل کا قیام چھوڑ کر اجمال احمد کے ہاں رہائش اختیار کر لینا۔

پھوپھا کا اچانک نظر آ جانا۔

اور اجمال کی زبانی پھوپھا کے حالات کا علم ہونا

اور سب سے بڑھ کر شیر محمد کی زبانی یہ معلوم ہونا کہ پھوپھا لاہور میں موجود ہیں اور مغل پورہ میں رہتے ہیں۔

ہاں یہ سب اتفاقات ہی تو تھے۔

جو کم از کم اس کی زندگی کو تو ایک نئے تجربے سے دوچار کر رہے تھے۔

کم از کم اسے یہ تجربہ تو ہو گیا تھا کہ کوئی بات جس کے بارے میں انسان کو ایک ادھیڑ بُن سی لگی ہو۔

اگر قدرت کو منظور ہوتا ہے تو خود بخود کُھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا تھا۔

اسے پھوپھا کے بارے میں ایک جستجو سی تو لگ گئی تھی لیکن اس میں اس کے کسی ایسے عزم کو کوئی دخل نہ تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ کر ہی چھوڑے گا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ وہ اس محلے کے کسی شخص سے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا اور یہ معلومات ڈاکخانے سے بڑھ کر کوئی بھی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فی الوقت اسلام آباد جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس پر اجمال نے بھی اتنی ساری باتیں کی تھیں مگر ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ لائیے اگر آپ کی سیٹ ہی بک کرانی ہے تو میں آپ کا یہ مسئلہ حل کر دوں۔ کچھ اس وجہ سے بھی اسے اس کے ہاں ایک دو روز مزید قیام کا بہانہ سا مل گیا تھا۔

بہر کیف شیراں کو سو روپے کا نوٹ تھما کر وہ سوچنے لگا کہ اب کیا تدبیر کی جائے جو پھوپھا کے گھر تک رسائی ہو سکے۔ اگر اس سے یہ

کہتا کہ مجھے اپنے اس کرائے دار سے ملوانے لے چلو تو یہ بات کسی طور بھی مناسب نہ ہوتی۔ شیراں سوچے بغیر نہ رہتا کہ صاب جی کی آخر کیا غرض اٹکی ہوئی ہے اس انتہائی غیر واسطہ شخص سے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اسفند نے اس سے کہا۔

"تم نے تو یہاں کا چپہ چپہ دیکھ رکھا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ اگر تمہارا دل چاہے تو اس اٹھگر سے جا کر مل آؤ۔ اتنے میں میں بھی یہاں کو ... دیکھ لوں گا۔"

"ہیں جی؟" شیراں شاید اس کی پیشکش پر ایک دم عمل درآمد کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ یا پھر ایسی کسی بات کا متوقع نہ تھا۔ اس نے قدرے اُچک کر کہا۔

"ہاں بھئی، اب بار بار تو تمہیں یہاں آنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ تم اگر چاہو تو چلے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں یہیں سے پک کرلوں گا۔ میرا مطلب ہے کار میں بٹھالوں گا۔" اسفند نے ایک مقام پر سڑک کے کنارے کار روک کر کہا۔ شیراں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر دروازہ کھول کر اُترتا ہوا بولا۔

"چنگا جی۔ وڈی مہربانی آپ کی۔ وس میں پنج منٹ بعد اسی جگہ پر آجاواں گا۔"

"خیر خیر۔ تم اطمینان رکھو اگر واپسی میں تمہیں پانچ کے بجائے دس منٹ بھی لگ گئے تو میں تمہارا انتظار کرلوں گا۔" اس نے جلدی سے کہا اور کار آگے بڑھالی۔ آگے کچھ فاصلے پر جا کر اس نے کار پھر روکی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

شیراں سڑک کراس کر کے مخالف سمت میں بنی ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بھی جلدی سے کار کو ریورس دے کر اسی طرف آگیا۔ اور جب اس لمبی سی گلی کے ایک سرے پر جا کر شیراں نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ کار سے اُتر کر بڑے بڑے قدم اٹھاتا اسی طرف آگیا۔ جدھر شیراں مڑا تھا۔ وہ بھی ایک تنگ سی گلی تھی۔ جس میں اوپر تلے بڑے بے ڈھب انداز میں کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے اور اسی گلی کے آخری سرے پر بنے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا شیراں دستک دے رہا تھا۔ اور بس اسفند کے لیے اتنا ہی جان لینا کافی تھا۔ پھوپھا کے مکان کی نشاندہی اس نے کر ہی دی تھی۔ اسی لیے وہ اُلٹے پیروں چل کر کار میں آبیٹھا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا کہ اس وقت شیراں کی موجودگی میں پھوپھا کے ہاں جانے کا موقع ہی نہ تھا۔ تو یہ بھی اس کے لیے ایک عجیب و غریب تجربہ ہی ثابت ہوا تھا۔ یہ نہایت غیر معقول سہی۔ کار سے اُتر کر چوروں کی طرح شیر محمد کے پیچھے آنے کی حرکت۔ کہ وہ تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایسی کسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ یا پھر اپنی زندگی میں اسے اتنے بھلے طریقے سے سراغ رسانی کے تجربے سے بھی گزرنا پڑے گا۔ گویا ہر بات ہی اس کے لیے نرالی اور انوکھی ثابت ہو رہی تھی۔

بہر حال شیر محمد حسب وعدہ پانچ منٹ بعد ہی واپس آگیا اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا جلدی سے کار میں بیٹھ گیا اور پھر دونوں گھر چلے آئے۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ شیر محمد کو ڈراپ کر کے وہ پھر مغل پورہ چلا جائے گا۔ لیکن اجمال احمد اس کے انتظار میں باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ اسی لیے اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

مگر اگلے روز ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ جلد جلد تیار ہوا۔ اجمال کی کار کو تصرف میں لانا اسے گوارا نہ ہوا۔ یوں بھی وہ جگہ تو دیکھ ہی آیا تھا اس لیے چپ چاپ گھر سے نکل کر باہر آگیا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر مغل پورہ کا رُخ کیا اور پھر اس جگہ جہاں کار کو روک کر شیراں کو اُتارا تھا ٹیکسی رُکوائی اور کرایہ ادا کر کے پیادہ پا چلتا ہوا اسی لمبی سی گلی میں داخل ہوگیا۔

پھوپھا کے گھر کا رُخ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی خیال تھا تو یہی کہ اسے اس قدر اچانک اور غیر متوقع اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر پھوپھی اور پھوپھا کس قدر متعجب ہوں گے۔ ممکن ہے پریشان اور شرمندہ بھی ہو جائیں یا پھر میرا اچانک نزول انہیں ناگوار بھی گزرے۔ خیر جو بھی سہی۔ لیکن کم از کم مجھے اصل واقعات کا علم تو ہو جائے گا۔

یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

بس وہ پھوپھا کے گھر پہنچنے تک یہی سوچتا رہا۔

پھر اس نے دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے دستک دی۔

مگر جب دو تین دستکیں دینے پر بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو بُری طرح دھڑ دھڑا ڈالا۔ تب کہیں جا کر دروازے کی دوسری طرف سے پھوپھو کی لہراتی ہوئی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"بھئی، کون ہے؟" لہجے سے بیزاری بھی مترشح تھی اور تندی بھی۔

"میں اسفند ہوں پھوپھو بیگم۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی کو سرپرائز دیتے وقت بہت لہک کر کہا جاتا ہے۔

"نہیں۔ سچ کہو۔" اندر سے دروازہ کھولے بغیر ہی فاخرہ بے یقینی کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔

"سچ ہی کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اپنے زندہ وجود میں یہاں موجود ہوں۔ مگر پہلے آپ دروازہ کھولیے تو یقین بھی دلاؤں۔" اسفند قدرے شریر سے انداز میں بولا اور اگلے ہی لمحے فاخرہ نے دروازہ کھول دیا اور اپنے لاڈلے بھتیجے کو اپنے جیتے جاگتے وجود میں مسکراتا ہوا اپنی نظروں کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں مبتلا ہوگئیں۔

پژمردہ سے چہرے پر ایک دم ہی خوشیوں کے گلال سے بکھر اُٹھے۔

یک لخت ستاروں کی بساط کی مانند چمک اُٹھنے والی آنکھوں کی جوت میں اچانک یورش کرنے والے مسرتوں کے ہجوم نے نمی کی سی پیدا کردی۔

دل بھی بڑی مدت بعد انبساط کی لہروں کی زد میں آکر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جس سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

سینے میں ہلچل مچاتے الفاظ زبان تک تو آئے لیکن لبوں سے ادا نہ ہو سکے۔

لب صرف تھرتھرا کر ہی رہ گئے۔

اور وہ جیسے خون کی کشش نے اس سمے بڑا جذباتی سا کر دیا تھا۔ انہیں سلام کر کے مسکراتا ہوا بولا۔

"ہاں ہاں اچھی طرح پہچان لیجیے۔ میں اسفند ہی ہوں پھوپھو بیگم اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اسی سائز میں آپ سے جدا ہوا تھا جتنا کہ اس وقت ہوں۔"

تب بھی اچانک ملنے والی اتنی بڑی خوشی کو ان کی گویائی شاید سنبھال نہ سکی۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولیں البتہ اپنے دونوں ہاتھ وا کر دیے اور اسفند بھاگ کر ان کی باہنوں میں سما گیا۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کا سر چوما اور پھر اس بری طرح روئیں کہ اسفند گھبرا اُٹھا۔ گو جانتا تھا کہ یہ گریہ وزاری اچانک ملنے والی بے پایاں خوشی اور اتنی مدت تک بچھڑے رہنے کا غم۔ اور دوسرے بھی بہت سے کئی احساسات اور جذبوں کی یک لخت دل پر ٹوٹ پڑنے والی یورش کے نتیجے میں تھی۔ اس کے دل میں بھی ہلکی ہلکی سی کسک ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے تھے۔

لیکن پھوپھی کی بگڑتی ہوئی طبیعت کو سنبھالنا بھی ضروری تھا۔

اس نے اپنے دل میں ہوتی کسک کو دبا کر بڑے چونچال سے لہجے میں کہا۔

"پھوپھو بیگم تعجب ہے۔ ورنہ میٹرولوجیکل والوں نے تو یہی پیش گوئی کی تھی کہ صوبہ پنجاب میں دور دور تک مطلع اس قدر صاف ہے کہ بارش تو کیا بادل ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ اور ہوا میں خشکی کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ ندی نالوں کے خشک ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود بھی آپ مواصلاتی نظام میں گڑبڑ پیدا کرنے کے درپے نظر آرہی ہیں۔"

اپنی بات کہہ کر وہ یوں ہنسا جیسے خود اپنے اس مذاق سے محظوظ ہو رہا ہو۔ لیکن فاخرہ پر اس کے پُرمزاح فقروں نے اُلٹا ہی اثر کیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بلک اُٹھیں اور اسفند کی سمجھ میں نہ آیا کہ مزید کیا کہے، کیا ترکیب کرے جو ان کی آنکھوں سے بہتا اشکوں کا سیلِ رواں رُک جائے۔ بند ہو جائے۔

"پھوپھو بیگم پلیز۔ اب اتنا بھی نہ روئیں۔ آپ تو بڑی صابر اور شاکر سی ہستی ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ یہ اشکوں کا خزانہ خالی کر کے اپنے اتنے دن کی ریاضت کو کھونے پر تُلی ہوئی ہیں۔ مجھے آپ کے دلی جذبات اور احساسات کا پورا پورا احساس ہے۔ جانتا ہوں کہ اس وقت آپ کے دل کا کیا عالم ہو رہا ہے۔ کیونکہ میرے اپنے دل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے لیکن دیکھیے۔ میرے آنسوؤں کے سوتے تو بالکل خشک ہیں۔ میری ان آنکھوں میں ہلکی سی نمی تک نہیں ہے۔ اچھا آئیے۔ تھوڑا سا پانی ہی پی لیجیے کہ طبیعت کچھ تو ٹھہر جائے۔ اور پھر کیا مجھے یہیں سے رخصت کر دینے کا ارادہ ہے جو اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر میں واپس چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی پھوپھا جان نے مجھے پہچاننے کے باوجود نظریں کترالی تھیں۔ شاید آپ کو بھی میرا آنا ناگوار گزرا ہے۔" اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے اُلٹا سیدھا جو دماغ میں آیا بولتا رہا کہ اس کی کوئی بات تو اتنی اثر انگیز ہو کہ پھوپھی کے آنسوؤں پر بند باندھنے کا سبب بن سکے۔ اور اس کا آخری فقرہ واقعی کارگر ہی ثابت ہوا۔ چھکوں اور پھکوں روتی ہوئی فاخرہ نے جلدی جلدی ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھ کر رندھی ہوئی گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"لو بھلا۔ تمہارا آنا مجھے ناگوار گزر سکتا ہے۔ ارے بچے بھتیجے اور بیٹے میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ بس میں تو تمہیں اتنے عرصے بعد

اچانک دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ اور یہ تو خوشی کے آنسو تھے بیٹے۔ اتنی زیادہ خوشی ملی تھی کہ مجھے شادیٔ مرگ کا گمان ہونے لگا۔"
اپنی بات کہتے کہتے آنسو پونچھنے کے باوجود ان کی آنکھوں سے پھر اشکوں کی لڑیاں سی بہہ نکلیں۔ جن کو جلدی جلدی پونچھ کر انہوں نے کہا۔
"آؤ۔ اندر آ جاؤ بیٹے۔ مجھے تو اپنے رونے دھونے میں خیال ہی نہ رہا کہ تم ابھی تک دہلیز کے آگے ہی کھڑے ہو۔ اندر چل کر بیٹھو تو میں تمہارے لیے چائے اور ناشتا تیار کر دوں۔"
"نہیں پھپھو بیگم میں چائے اور ناشتے سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔ یوں بھی میں چائے کم ہی پیتا ہوں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔" وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اندر لے جاتا ہوا بولا۔ صحن ہی کتنا تھا بمشکل بارہ مربع فٹ۔ سامنے ہی ایک رہائشی کوٹھری نما کمرہ بنا ہوا تھا جس سے ملحق غسلخانہ، باورچی خانہ اور پھر صحن کی بائیں جانب بیت الخلا تھا۔
اتنا چھوٹا اور تنگ سا مکان کہ جسے دوسرے معنوں میں انسانوں کی کابک ہی کہا جا سکتا تھا۔
دیواروں پر کاہی کا روغن۔
کمرے میں قدم رکھا تو اس کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔
کہ اس میں فرش پر ایک میلی سی دری بچھی تھی۔ اور دری پر ایک میل خوری چادر۔ ایک کونے میں صراحی اور ناشتے دان وغیرہ رکھا تھا اور دوسرے کونے میں بان کی ایک کھری چارپائی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔
اف۔ تو یہ پھپھو کی رہائش گاہ ہے۔
میری اتنی ناز و نعم میں پلی۔ نکیلی اور وضع دار پھپھو کی۔ جو بہت نفاست پسند تھیں۔ بے حد نازک طبع تھیں۔
بلکہ جن کو صفائی ستھرائی کا مینیا تھا۔ وہی مثل تھی کہ آنکھ میں بال آ جائے مگر کیا مجال جو گھر یا لباس پر ہلکا سا میل بھی نظر آ جائے
وہ اس سمے ملگجی اور شکن آلود معمولی سے کپڑے کی ساڑھی میں ملبوس تھیں۔
وہ جن کے گھر کے ملازمین بھی اس سے کہیں بہتر حالت میں رہتے تھے اور رہتے ہیں۔
آخر یہ سب کیا ہے؟
ایسا کیوں ہے؟
پھوپھو بیگم ان حالوں کو کیسے پہنچیں؟ جب کہ ان کی ذاتی مالی پوزیشن بھی بڑی مستحکم ہے۔
دل پر پڑتی چوٹوں کی دھمک میں اس نے بہت آزردہ ہو کر سوچا۔
اپنی اکلوتی اور عزیز پھوپھو کو اتنی خستہ و خراب حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔
شاید اسی وجہ سے وہ ایک دم ہی اپنے تجسس اور تعجب کو زبان نہیں دے سکا تھا۔
اس کوٹھری نما کمرے میں داخل ہوتے ہی فاخرہ لپک کر چارپائی کی طرف بڑھیں۔ اور اسے جلدی سے بچھا کر کونے میں پڑے صندوق پر رکھی ہوئی جاجم اٹھا کر چارپائی پر بچھانا چاہ رہی تھیں کہ اسفند نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے وہ جاجم لیتے ہوئے کہا۔
"یہ اتنے تکلف سے کام کیوں لے رہی ہیں آپ۔ میں تو آرام سے آپ کے ساتھ یہاں نیچے فرش پر بیٹھوں گا۔"
"مگر تم نے تو پتلون پہن رکھی ہے۔ فرش پر بیٹھنے میں تمہیں تکلیف۔"
انہوں نے کہنا چاہا تو وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولا۔
"نہیں پھپھو بیگم آپ میری تکلیف کی پروا نہ کریں۔ میں ہر ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کا عادی ہوں۔" اسفند نے جاجم کو چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنا گریشین پمپ (جوتا) اتار کر دری پر بچھی ملگجی سی سوزنی پر بیٹھ گیا۔
دل تو چاہ رہا تھا کہ ساری باتیں ایک ساتھ ہی پوچھ لے۔
سارے سوالات ایکدم ہی کر ڈالے اور یہی سوچ رہا تھا کہ بات یا سوالات کی ابتدا کیوں کر کرے کہ فاخرہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں اب بتاؤ۔ گھر میں تو سب خیریت سے ہیں نا۔ چھوٹے ابا کیسے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے بھی کراچی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ اور ہاں وہ ہماری نازو، بٹیا کیسی ہیں۔ اپنے گھر میں خوش تو ہیں نا۔؟" انہوں نے ایکدم ہی کئی سوالات کر ڈالے تھے۔ اندر ہی اندر ملول اور متاسف ہونے کے باوجود وہ قدرے شوخ سا ہو کر بولا۔

"جی ہاں بفضل تعالیٰ گھر میں سب خیریت سے ہیں۔ ممی ڈیڈی اور بہنیں سب ہی اور چھوٹے ابا بھی بمعہ اپنی فیملی خیر و عافیت سے ہیں۔ حتیٰ کہ اماں جان بھی اور نازو تو اپنے گھر میں اتنی زیادہ خوش ہیں کہ انہوں نے اس خوشی میں اپنے گھر میں ایک فرد کا اضافہ بھی کر لیا ہے۔"
"ہائیں تو کیا خیر سے ناز پرور ماں بھی بن گئیں۔!" انہوں نے مسرت آمیز تحیر سے پوچھا۔
"جی ہاں۔ ایک عدد بہت ہی خوبصورت اور پیارے سے بیٹے شارع احمد کی۔" اسفند شگفتہ سے لہجے میں بولا۔
"چلو خدا مبارک کرے تم کو بھی اور نازو کو بھی۔ نام بھی بہت خوبصورت ہے نومولود کا۔ خدا اسے عمر دے۔" اور اسفند نے دل ہی دل میں آمین کہا۔ کہ بھانجا اسے بھی کچھ کم عزیز نہ تھا۔
"ناز پرور تو ماشاء اللہ شروع ہی سے بڑی پیاری تھی۔ اب شادی کے بعد خصوصاً ماں بن کر تو اور بھی نکھر آئی ہو گی۔" اس نے محسوس کیا کہ پھپھو بھی صرف ایک ہی موضوع پر بات کیے جا رہی ہیں تو ان کی بات کے جواب میں اختصار سے کام لیتا ہوا بولا۔
"جی ہاں ظاہر ہے پھپھو بیگم۔ نکھری نہیں آئیں بلکہ کچھ مجرب سی بھی ہو گئی ہیں ماں بن کر۔ لیکن۔"
مگر اس کے مجرب سی ہو گئی ہیں کہنے پر فاخرہ بیگم کے بے ساختگی سے ہنسنے پر اسے لیکن کے آگے مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔
"واہ مجرب ہو جانے کی بھی خوب کہی تم نے۔ ارے بیٹے جیسے دلہنا پے کا بھین دلہن بن کر لڑکی پر آتا ہے۔ اسی طرح زچگی کا بھی بھین ہوتا ہے۔ بس وہی آیا ہو گا نازو پر۔"
فاخرہ نے ہنس لینے کے بعد کہا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کا تجسس اس سمے انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر فاخرہ سے پوچھا۔
"پھوپھا جان نظر نہیں آ رہے پھپھو بیگم کیا کہیں گئے ہوئے ہیں۔؟" میاں کے ذکر پر فاخرہ بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔
"ہاں وہ تو بہت سویرے ناشتا کرنے کے بعد ہی چلے گئے تھے۔" انہوں نے عجب گمبھیر سے انداز میں جواب دیا۔
"کیوں کیا وہ کہیں ملازمت کر رہے ہیں۔؟" اسفند نے ان کے گمبھیر سے جواب پر تھوڑا سا الجھ کر پوچھا۔
"نہیں بھلا ملازمت انہیں کہاں مل سکتی ہے۔ بس ایک ضروری کام سے شہر گئے ہوئے ہیں۔" فاخرہ بولیں تو اسفند خاموش سا ہو گیا۔
"مگر تم اپنی سناؤ۔ کیا تم یہاں لاہور میں کسی کام سے آئے ہو۔" صاف ظاہر تھا انہوں نے یہ کہہ کر شوہر کے ذکر سے احتراز کیا تھا۔ اسفند بھی سمجھ گیا اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"نہیں۔ کوئی مقصد کار فرما تھا نہ کوئی دوسری غرض و غایت تھی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ صرف آپ کی کشش مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔ پھوپھو بیگم یہاں آ کر تو میں قدرت کی مصلحتوں اور اتفاقات کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ اب۔ اب ان اتفاقات کو ہی دیکھ لیجیے جو لاہور آ کر مجھے پیش آئے کہ میں ٹھہرا تو انٹر کان میں تھا مگر میرا ایک جگری دوست زبردستی ہوٹل کی رہائش ترک کر کے مجھے زبردستی ماڈل ٹاؤن لے گیا۔ اپنے ایک کزن شیخ اجمال احمد کے نو تعمیر بنگلے میں جہاں میں صرف دو راتیں ہی گزاریں۔ تیسرے روز اسلام آباد جانے کی غرض سے جہاز کی سیٹ بک کرانے گھر سے نکلا تو راستے میں بہت غیر متوقع اور اتفاقیہ طور پر مجھے پھوپھا جان نظر آ گئے۔ اور مجھے تو کیا میرے تو فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ اجمال کی کرایہ دار رہ چکی ہیں۔ وہ تو دالیپنی میں حالات نے خود بخود ہی کچھ ایسی کروٹ لی کہ ساری حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی۔ اور میں کسی نہ کسی طرح آپ کا پتا لگا کر یہاں تک پہنچ گیا۔"
"ہاں تمہارے پھوپھا جان نے تمہارا ذکر تو کیا تھا۔ مگر تمہیں لاہور میں دیکھ کر وہ یہی سمجھے تھے کہ کسی اور پر انہیں تمہارا گمان ہوا ہے۔ ورنہ تم ہی سوچو تمہاری لاہور میں آمد کا تو انہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سچ پوچھو تو میں بھی یہی سمجھی تھی۔" پھر فاخرہ بیگم نے یہ بات کہہ کر پاندان اپنے آگے کھینچ کر اس سے پوچھا۔
"تمہارے لیے پان بناؤں۔؟"
"نہیں شکریہ پان اور سگریٹ کا تو میری زندگی میں کوئی گزر ہی نہیں۔" وہ الجھے الجھے ذہن کے ساتھ بولا۔
"چلو یہ تو بہت اچھا ہے۔" فاخرہ نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں وہ تو ہے ہی لیکن پھپھو بیگم آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں۔ آخر آپ اور پھوپھا جان ایسی گمنامی کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں۔؟ کیوں ایسی۔ کسمپرسی کے عالم میں نظر آ رہے ہیں۔ کہ میرے دل کو دھچکا سا لگا آپ کو اس عالم میں دیکھ کر"

اسفند مزید اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو اس نے پوچھ لیا۔ جواب میں فاخرہ نے پاندان کھول کر صافی میں سے پان نکالنے کے بعد کہا۔

"ہاں ضرور لگا ہوگا۔ مگر اب تو یوں سمجھو کہ سارے جسم کی سوئیاں نکل گئی ہیں اب صرف آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔ پھپھو بیگم۔" ان کا محاورہ اسفند کے پلے نہ پڑا تو اس نے قدرے اچک کر پوچھا۔

"نہ ہی سمجھو تو بہتر ہے بیٹے کیونکہ جب سمجھنے کا وقت آئے گا تو خود ہی ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔"

فاخرہ بیگم پان پر کتھا اور چونا لگاتے ہوئے ایک پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں جبکہ اسفند کو ان کا پہیلیاں سی بجھوانے کا انداز بالکل نہ بھایا وہ قدرے چمک کر بولا۔

"کمال ہے پھپھو بیگم آپ نے خود ہی تو جسم اور آنکھوں کی سوئیوں کا ذکر چھیڑا اور اب خود ہی اس کی وضاحت سے گریز کر رہی ہیں لیکن آپ کی اطلاع کو اتنا بتا دوں کہ میں بھی آپ کے حالات سے کسی حد تک باخبر ہو چکا ہوں۔ بابا شرافت نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔"

"ہائیں، بابا شرافت نے تمہیں ایسا کیا بتایا ہے جبکہ میری تو ان سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی تھی ماسوا اس کے کہ ہم دونوں چونکہ پاکستان سے باہر جا رہے تھے اس لیے سلوط کو کچھ عرصے کے لیے منجھلے ابا کے پاس کراچی بھیج رہے تھے اور بس میں نے منجھلے ابا کے نام ایک خط دے کر یہی کہا تھا۔ بلکہ انہیں لاہور بلایا ہی اسی مقصد سے تھا کہ وہ سلوط کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں اور تم تو جانتے ہی ہو کہ تمہارے پھوپھا جان کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کے عادی نہیں ہیں اور ان دنوں تو وہ کچھ نفسیاتی مریض سے ہو رہے تھے پھر بھلا بابا شرافت نے کیسے۔" وہ بات کرتے کرتے ایک دم ہی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔

انہوں نے تقریباً سبھی کی خیریت پوچھی تھی۔ مگر اب تک اشارتاً بھی سلوط کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور اسی بات پر اسے حیرت ہی نہیں کوفت بھی ہو رہی تھی۔ اب جو اتنی دیر بعد ان کے منہ سے ایک دم ہی سلوط کا نام نکلا تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ پوچھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا۔

کہ آخر اس بیگانگی اور بے نیازی کی وجہ کیا ہے۔

اور یہ شوہر کی بہن سے جلاپے کا سبب کیا ہوتا ہے کہ خود اس نے بھی تو اپنی ماں کو پھوپھو کے خلاف زہر اگلتے دیکھا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں پوچھ سکا۔

بلکہ فاخرہ نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔

کیونکہ انہوں نے اپنی سوچ سے نکل کر اس کی سوچ پر ایک زقند سی ماری۔

"اچھا اب سمجھی۔ اس کلمو ہے بلّو نے بابا شرافت سے الٹی سیدھی لگائی ہوگی۔ ورنہ میں بھی تو کہوں کہ بابا شرافت کو الہام تو ہونے سے رہا۔" وہ یوں اچھل کر زور سے بولیں جیسے کسی بہت ہی گہرے راز پر سے پردہ اٹھا لیا ہو۔

"یہ بلّو کون ہے پھپھو بیگم۔" اسفند نے پوچھا۔

"ارے بابا شرافت کا بھتیجا ہے نامراد۔ یہیں لاہور میں ہی رہتا تھا۔ موا کاہل الوجود ایک نمبر کا۔ بابا شرافت نے ہی خط لکھ لکھ کر اسے ہمارے گھر ملازم رکھوایا تھا۔ ورنہ سارا وقت ماں باپ کے سر پر بوجھ بنا اینڈتا ہی رہتا تھا کمبخت۔ اب معلوم کیا الٹی سیدھی لگائی ہو بابا شرافت سے اور انہوں نے اس میں نمک مرچ لگا کر تم لوگوں سے کیا کہا ہو۔"

فاخرہ نے اتنی دیر بعد پان کا بیڑہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا جواب تک وہ ہاتھ میں ہی لیے بیٹھی تھیں۔

"ویسے بابا شرافت نے تم لوگوں کو کیا بتلایا ہے۔" انہوں نے پان چبانے کے بعد اسے ایک طرف کلّے میں دبا کر پوچھا۔

"بس یہی کہ سلوط اپنے مالدار شوہر کو صرف اس وجہ سے چھوڑے بیٹھی ہیں کہ وہ بوڑھے ہیں۔ اور شاید انہوں نے کوئی اور چکّر چلا رکھا تھا جس کی وجہ سے انہیں اغوا بھی کیا گیا تھا۔" اسفند نے بتایا۔ جبکہ چکّر چلانے کی بات اس نے خود اپنے دل

ہائے ہائے توبہ توبہ۔ استغفار کہاں ہیں، یہ بابا شرافت۔" فاخرہ نے کلّے پیٹتے ہوئے کہا۔

"فی الوقت تو وہ کراچی ہی میں ہیں پھپھو بیگم۔" اسفند نے استہزائی سے انداز میں کہا۔

"ہاں وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ لیکن کبھی مل گئے تو میں ان کی گدی سے زبان کھینچے بغیر نہ رہوں گی۔ لو بھلا اتنا بڑا اتہام اس معصوم بچی پہ۔ اور یہ بلّو تو آتا ہی رہتا ہے نہ کھینچی ہو اس کی کھال تو میرا نام بھی فاخرہ نہیں۔" فاخرہ چیں بجبیں کی سی کیفیت میں بولیں۔

"لیکن اس سے حاصل ہی کیا ہوگا پھپھو بیگم۔ الفاظ تو ترکش میں پڑے تیروں کی طرح ہوتے ہیں جو کمان سے نکل جائیں تو نہیں پھرا جا سکتا ہے نہ واپس ترکش میں ہی ڈالا جا سکتا ہے۔" اسفند انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مگر اتنی بے بنیاد باتیں کر کے کسی کو بدنام کرنا وہ بھی ایک نیک اور شریف لڑکی کو کسی طور پر بھی جائز نہیں اور اب معلوم چھوٹے ابا وغیرہ سے بھی بابا شرافت نے کیا کہا ہوگا۔ واقعی بڑی غلطی ہو گئی سلوط کو ان کے ساتھ کراچی بھیج کر۔ اس سے تو اچھا تھا ہم اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔" فاخرہ بیگم بھتیجے کی باتوں پر قائل ہو کر بولیں۔

"کیا ورلڈ ٹور پہ پھپھو بیگم۔" اس نے پھر طنز سے کہا۔

"ارے نہیں بچے۔ کیسا ورلڈ ٹور اور کس کے ورلڈ ٹور۔ وہاں تو الٰہ آباد جانا ہی دوبھر ہو رہا تھا۔" فاخرہ بیگم بولیں۔

"اچھا تو آپ لوگ الٰہ آباد گئے تھے۔" اسفند نے یوں کہا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں۔ مگر گئے بھی تھے تو بیکار ہی ہوا تھا وہاں جانا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ قسمت میں جو کھکھیڑ لکھی ہوتی ہے وہ ہر جگہ سامنے آتی ہے کن دقتوں سے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے الٰہ آباد پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحب معاملہ نے تو بیکانیر میں اپنے بڑے بیٹے کے یہاں رہائش اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا واپسی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ پاسپورٹ میں بیکانیر کا تو کہیں نام ہی نہ تھا۔ یونہی ناکام اور نامراد لوٹ رہے تھے کہ قدرت کو خود ہی ہماری حالت زار پر رحم آ گیا۔ گھر کے پرانے ملازم نے ہماری پریشانی بھانپ کر درانی صاحب کو تار دے دیا تھا۔ جس روز ہم واپسی کے لیے پر تول رہے تھے اسی روز درانی صاحب خود ہی آ گئے۔" اپنی روئیداد کہتے کہتے فاخرہ کو کوئی خیال آیا تو وہ اٹھتی ہوئی بولیں۔

"اے ہے شاید ہنڈیا لگ گئی ہے۔ بس ایک منٹ ذرا میں جا کر چولہا بجھا آؤں۔"

اتنا کہہ کر وہ اس کوٹھڑی نما کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اففوہ۔ یہ پھپھو بیگم تو میرے ضبط کا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہیں۔ ایک تو گفتگو میں اتنی طوالت اس پہ چولہا بجھانا بھی رہ گیا تھا اسفند نے ان کے جانے کے بعد سخت ناگواری سے سوچا۔

بارے وہ چولہا بجھا کر جلدی واپس لوٹ آئیں اور آتے ہی بولیں۔

"اے ہاں مجھے باورچی خانے میں جاتے جاتے خیال آیا کہ تم بھلا درانی صاحب کو کیا جانو۔"

"ظاہر ہے میں جان بھی کیسے سکتا ہوں۔" اسفند بولا۔

"ہاں ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ اصل میں درانی صاحب ہی سے تو سلوط کا نکاح ہوا تھا۔ یعنی سلوط کے شوہر تھے وہ۔" فاخرہ بیگم نے یہ کہہ کر گویا درانی صاحب کا اس سے تعارف کرایا۔

"مگر تھے سے کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا ہیں نہیں۔" اسفند نے یوں کہا جیسے ان کی بات کی تصحیح کرنا چاہ رہا ہو۔

"نہیں اب نہیں ہیں۔" فاخرہ بیگم نے کہا اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک۔ حتیٰ کہ مسعود الحسن کا زہرہ کو طلاق دینا اور درانی کا بہن کی میت پر کھڑے ہو کر انتقام لینے کی قسم کھانا۔ اور پھر اس کے بعد کے سارے واقعات سب کچھ ہی اسفند کے گوش گزار کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"پھر جب درانی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی انتقامانہ کارروائی مغالطے کی بنا پر ہوئی تھی۔ یعنی سلوط کا مسعود الحسن کے خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مسعود الحسن کی چھوٹی بہن کی سوتیلی بیٹی تھی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ بڑی دیر تک معذرت کرتے رہے۔ جب ملے تھے تو بڑے آڑے ترچھے انداز میں ہی ملے تھے مگر اصل حالات سے باخبر ہونے کے بعد ہماری اتنی خاطر مدارات کی کہ ہم شرمندہ ہو ہو گئے۔"

فاخرہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوئیں تو اسفند نے پہلو بدل کر پوچھا۔

"اچھا تو پھر نتیجہ کیا رہا؟"

"نتیجہ کیا رہتا۔ درانی صاحب سلوط کو اپنے پاس بلا کر اپنی زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہمارا دل نہ مانا کہ ہم سلوط کو پھر اس جہنم میں جھونک دیں۔ سلوط تو شاید مر کر بھی یہ پسند نہ کرتی وہ بڑی خوددار اور ٹھہری طبیعت کی لڑکی ہے ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ سلوط کسی قیمت پر بھی آپ کے پاس آنا گوارا نہ کرے گی۔ اور اگر آپ ازالہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو اسے آزاد کر دیجیے۔" فاخرہ بیگم پھر خاموش ہوئیں تو اسفند نے جلدی سے پوچھا۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟"

"درانی صاحب یہ سن کر خاموش سے ہو گئے اور پھر ایسے کہیں غائب ہوئے کئی دن تک نظر ہی نہ آئے۔ پھر ایک صبح ہی صبح انہوں نے ثاقب کو بلایا۔ اور طلاق نامے کے ساتھ ہی سلوط کے زیورات کی پوٹلی ان کے حوالے کر دی۔ اور وہ جو انہوں نے محض سلوط کے حصول کی خاطر کالے دھندے کا چکر چلایا تھا اور باون لاکھ روپے کی چوٹ دی تھی۔ ان میں سے صرف بیس لاکھ روپے کی رقم واپس کر دینے پر آمادہ ہوئے۔ وہ بھی قسطوں میں ادا کریں گے۔ یعنی وقتاً فوقتاً اپنے ایک دوست کے ذریعے سے جو یہیں لاہور میں ہی رہتا ہے۔ اب اس بات کو ایک سال کا عرصہ ہونے کو آیا۔ جب سے تمہارے پھوپھا برابر اسی دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح قسطوں ہی میں وہ رقم وصول کر لیں اور اسی وجہ سے روز صبح تیار ہو کر جاتے ہیں۔" فاخرہ بیگم نے مزید بتایا۔

"اچھا تو کیا درانی صاحب نے اس سال بھر کے عرصے میں کچھ بھیجا بھی؟" اسفند نے پوچھا۔

"نہیں ایک پائی بھی نہیں بھیجی ابھی تک۔ البتہ شروع میں ہی سلوط کے نام پانچ لاکھ روپیہ ضرور بینک میں منتقل کرایا تھا۔"

"مائی گاڈ۔ پانچ لاکھ روپے دے دیے تھے انہوں نے اور اس کے باوجود بھی آپ اس تباہ حال گھر میں رہ رہی ہیں!" اسفند نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا

"مگر وہ پانچ لاکھ کی رقم ہماری تو نہیں سلوط کی امانت ہے۔ اور ویسے بھی مصلحت کا تقاضا بھی کچھ یہی ہے کہ کچھ عرصے مزید ہم گمنامی کی زندگی بسر کریں۔ اصل میں وہ اجمال ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اسی نے اسمگلروں کے اس گروہ سے ساز باز کر رکھی ہے جو تمہارے پھوپھا جان کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اس کے کان میں اگر بھنک بھی پڑ گئی۔ کہ ہمارے ہاتھ میں پیسہ آ گیا ہے تو وہ پھر اس گروہ کو ہمارے پیچھے لگا دے گا۔"

فاخرہ کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اجمال احمد سے سخت خائف ہیں اور اسی کی وجہ سے اتنی گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ جب کہ اجمال نے جو کچھ بتایا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے صرف اپنا مکان خالی کرانے کی غرض سے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ دل تو چاہا کہ پھوپھی کو اطمینان دلا دے کہ اب اجمال آپ دونوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور یہ بھی کہ اسے اپنے کیے پر سخت پچھتاوا ہے۔ لیکن پھوپھی گھر میں غنڈے کدوانے کی بات تو چھپا گئی تھیں۔ پھر وہ ان کو کیسے تسلی دیتا وہ سر کو جھنگل سے کھجا کر بولا۔

"کمال ہے یہ بابا شرافت بھی بڑے فتنہ پرداز آدمی ہیں معلوم بھی ہے پھپھو بیگم انہوں نے وہاں سب کو کیا بتا رکھا ہے؟"

"کیا؟" وہ چونک کر بولیں۔

"اب چھوڑیں قلعی تو کھل ہی گئی ان کی جھوٹی باتوں کی۔ پھر سننے سے کیا فائدہ۔" اسفند نے گویا ان کے تجسس کو مزید ابھارا۔

"فائدہ ہو۔ یا نہ ہو مگر تم بتاؤ تو سہی کہ اس موئے مرگھٹ کے چیونٹے نے آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ اور پھر اس کی قلعی تمہارے سامنے کھلی ہے دوسروں کے سامنے تو نہیں وہ سب تو اس جھوٹے مکار کی باتوں پر ایمان ہی لے آئے ہوں گے۔"

فاخرہ بیگم نے ایک جذب کے عالم میں پاندان کو دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ظاہر ہے۔ دوسروں کو حقیقت کا کچھ علم بھی تو نہیں ہے۔ ویسے انہوں نے غالباً یہ بتایا تھا کہ آدھی رات کو غنڈے آپ کے گھر میں کود سے تھے اور سلوط کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔" اسفند نے مسمسی سی شکل بنا کر بتایا۔

"اے نوج خدا کی مار اس جھوٹے کاذب پر۔ ورنہ حقیقت کچھ یہ تھی کہ اجمال نے ان اسمگلروں کو چونکہ ہمارے پیچھے لگا دیا تھا پہلے وہ تمہارے پھوپھا کو مارنے کی غرض سے گھر میں کود آئے تھے۔ سلوط کی آنکھ سب سے پہلے کھلی تھی اس نے خوف سے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا اس لیے ان بدبختوں نے سب سے پہلے اسے ہی قابو میں کرنا چاہا تھا۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تمہارے پھوپھا کی آنکھ کھل گئی اور وہ اپنا ریوالور لے کر ان کی طرف دوڑے۔ ایک ہوائی فائر بھی کر دیا جس سے خوف زدہ ہو کر وہ بھی جاگ کھڑے ہوئے۔ ارے بیٹا وہ تو تمہارے پھوپھا کی جان کے۔ کچھ ایسے لاگو ہو گئے تھے کہ اور بھی کئی موقعوں پر انہوں نے تمہارے پھوپھا کو زک پہنچائی تھی۔ اصل میں اپنی رقم واپس لینا چاہتے تھے جو درانی اپنے پیٹ میں ٹھونس کر بیٹھ گیا تھا۔ اور بس اسی وجہ سے تو اور بھی ہمیں انڈیا جانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ تاکہ درانی کی غلط فہمی دور کر کے بات صاف ہو جائے۔" فاخرہ بھڑک کر بولیں۔

"بہرحال اگر آپ اجمال سے اس قدر خائف ہیں تو اب اس کی مجال نہیں جو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ اور پھر اسے تو اپنے کیے پر سخت پچھتاوا ہے بلکہ وہ سخت نادم ہے" اسفند بولا۔

"وہ کیسے؟ میرا مطلب ہے تم نے یہ کیونکر جان لیا" فاخرہ نے چونک کر پوچھا تو اسفند نے وہ ساری گفتگو انہیں سنا دی جو اس ضمن میں اجمال نے اس سے کی تھی۔

"اے بڑا چلتر اور کائیاں ہے وہ اس نے یونہی خود کو شریف ظاہر کرنے کے لیے بڑ ہانک دی ہو گی۔ ورنہ معلوم ہی ہے اس کی سلوط پر نظر تھی۔ شبیر محمد کے ہاتھ ایک مرتبہ اس نے سلوط سے شادی کا پیغام بھی بھجوایا تھا۔ مگر جب ہم نے اسے بتایا کہ سلوط شادی شدہ ہے تو اسے بہانہ سمجھ کر وہ یہ بات دل میں لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اسی لیے اس نے سلوط کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔ اور اس گروہ سے بھی مل گیا تھا۔"

فاخرہ نے حقیقت بتائی تو اسفند نے دل میں سوچا ممکن ہے یہی بات ہو۔ یوں بھی نہ معلوم وہ کیا دھندا کرتا ہے جو کئی کئی روز تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ اور کر و فر بھی بہت شاہانہ سے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتا ہے۔ آخر اس کی بھی تو کوئی فیملی ہو گی۔ اسے بلا کر اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔

"اے ہاں یہ تو بتاؤ وہ کیسی ہے؟" فاخرہ نے ایک بار پھر اس کی سوچ کے تانوں بانوں کو منتشر کیا۔

"کون پھپھو بیگم؟" اس نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"ارے وہی اپنی سلوط۔ کیا اس کا دل لگ گیا تمہارے یہاں؟" فاخرہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ اور اتنی دیر بعد کیسے گئے اس سوال نے اسفند کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

"اے کس سوچ میں ہو تم؟ میں سلوط کے بارے میں پوچھ رہی ہوں؟"

"جی اچھا اچھا سلوط کے" اس نے باقی فقرہ تھوک کے ساتھ نگلا۔ کہ پھوپھی سے یہ کہنے کی ہمت پڑ ہی نہیں رہی تھی جو اصل بات بتاتا۔ یا صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ وہ تو چپکے سے ہمارا گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے کہ خود اپنا ضمیر مجرم تھا پھوپھی نا کل نہ معلوم کیا ہوتا اور وہ اس سے کیا کیا پوچھتیں۔

"ہاں ہاں سلوط کے بارے میں ہی" اور بھلا کس کے بارے میں پوچھوں گی۔ سب کی خیر خیریت تو تم سے معلوم کر چکی ہوں" فاخرہ قدرے چونک کر بولیں۔

"وہ۔ وہ ٹھیک ہی ہوں گی" اس سے صرف اسی قدر کہا جا سکا۔

"ہائیں ٹھیک ہی ہوں گی سے کیا مطلب کیا وہ تمہارے گھر میں نہیں رہتی جو اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں" اس کا جواب فاخرہ کی تشفی نہ کر سکا تو انہوں نے کچھ زیادہ ہی چونک کر پوچھا۔

"وہ اصل میں پھپھو بیگم" وہ انہیں حقیقت سے آگاہ ہی کرنا چاہ رہا تھا کہ تبھی ثاقب حسن کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے

دونوں ہاتھوں میں پھلوں اور گھر کی چند استعمالی چیزوں کے پیکٹ تھام رکھے تھے۔ آتے ہی سب سے پہلے ان کی نظر اسفند پر پڑی۔ تو انہوں نے نزدیک آکر دونوں پیکٹ چارپائی پر ڈالے اور وہ جو انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا، سے بغلگیر ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آخاہ بھئی آج یہ عید کا چاند رجب کے مہینے میں کیسے نکل آیا۔ ٹھیک ٹھاک تو ہو تم؟"

"جی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مگر۔" وہ ان سے علیحدہ ہو کر مسکراتا ہوا بولا تو انہوں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"دیکھو بھئی اب شکوے شکایات کا دفتر کھول کر نہ بیٹھ جانا۔ ہم نے تمہیں اس روز روڈ کراس کرتے ہوئے بہت نزدیک سے دیکھا ضرور تھا لیکن ہم تو کیا ہمارے تو فرشتوں کے بھی وہم گمان میں۔ نہ تھا کہ تم یوں پیادہ پا دہ بھی ... نظر پڑ جاؤ گے۔ ہم تو یہی سمجھے کہ ہمیں کسی اور پہ تمہارا دھوکا ہوا ہے۔" ویسے بھی تم پہلے کی نسبت خاصے تنومند اور ... ہو گئے ہو۔"

"جی ہاں یہی میں بھی انہیں بتا رہی تھی کہ آپ ان کو پہچان ہی نہیں سکے تھے۔" فاخرہ نے فوراً ان کی بات کی تائید میں کہا۔

"جی ہاں مجھے بھی آپ کے یوں چشم پوشی سے کام لینے پر تعجب ہی نہیں ملال بھی ہوا تھا۔ بہر حال اب تو آپ نے مجھے پہچان لیا نا۔" اسفند نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔ ثاقب حسن بھی اب تک کھڑے تھے۔ دونوں پیکٹ پیچھے کر کے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"جوڑوں کے درد کی وجہ سے ہمیں فرش پر بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ تم بھی ہمارے پاس یہیں پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اسفند جلدی سے فرش پر بیٹھا ہوا بولا۔ پھر ثاقب حسن بھی امی سے سب کی خیریت پوچھنے لگے اور وہ انہیں بتاتا رہا

"چلو شکر ہے خدا کا کہ سب خیر و عافیت سے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں لیکن وہ ہماری چھوٹی سی بھتو (بہن) کیسی ہیں ان کے بارے میں تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

پھوپھا کے لہجے میں بہن کی خیریت معلوم کرنے کا اشتیاق نمایاں نہیں تھا۔ بلکہ کچھ ایسا تاثر تھا جیسے وہ طنز سا کر رہے ہوں۔ اسفند کی سٹی ایک مرتبہ پھر گم ہو گئی۔

"وہ پھپھو بیگم نے بھی کچھ ایسا ہی سوال کیا تھا اور میں بتانا ہی چاہ رہا تھا کہ دفعتاً آپ آ گئے۔" اس نے ایک بار پھر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"لو بھلا اتنی باتیں کر رہے ہو اور اصل بات بتا کر ہی نہیں دے رہے تمہارے اندر سے ابھی بچپنا نہیں گیا۔" فاخرہ مسکرا کر بولیں۔ ثاقب اس کی شکل غور سے دیکھ رہے تھے۔ اسے آخر اصل بات بتانی ہی پڑی۔

"ویسے اب تک وہ ہمارے یہاں بڑے آرام سے رہیں لیکن میرے کراچی چھوڑنے سے چار پانچ روز قبل ہی کسی کو بتائے بغیر گھر سے چلی گئی تھیں۔ اب بھلا مجھے۔"

"ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے۔ لو بھلا سوچنے کی بات ہے وہ بے چاری تنہا کسی کو بتائے بغیر کہیں جا سکتی ہے۔"

"ارے یہ آپ کو کیا بتائیں گے ہم بتاتے ہیں۔" ثاقب حسن نے نہایت ناگوارانہ سے لہجے میں اپنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہائیں آپ بتائیں گے۔ میں سمجھی نہیں۔" فاخرہ نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"ہاں ہم ہی بتائیں گے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا یا ہماری خوش بختی جو قدرت نے خود بخود ہمیں تمام حقیقت سے آگاہ کر دیا۔" ثاقب حسن نے جیب سے ڈاک کا ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔

پھوپھا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالتے ہوئے جو طرز تخاطب اختیار کیا تھا اس نے اس کے تجسس اور تعجب کو انتہا پر پہنچا دیا تھا۔

پھوپھا کی خصلت اور طرز تکلم میں وہ جو ایک زبردست تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے نہایت غیر متوقع ہی نہیں بلکہ نہایت تعجب خیز تھی۔ کہ کہاں وہ اکھل کھرے اور کم گو سے انسان جو بات کرنے میں کچھ ایسے بخل سے کام لیتے تھے جیسے انہیں اپنے الفاظ کا خزانہ ختم ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ اور بات بھی کرتے تھے تو ایسے ریتیلے انداز میں کہ مخاطب کے حلق کے نیچے تک ریت ہی ریت بھر جاتی تھی۔ اس پر انتہائی بے اعتنا اور بیگانہ سا رویہ۔

مگر آج تو وہ بالکل ہی نئے انداز میں۔ دوسرے معنوں میں بڑے تپاک سے ملے تھے۔ بڑی یگانگت کا اظہار کرتے ہوئے فرداً فرداً سب کی خیریت پوچھی تھی۔ گویا گفتگو کرنے میں بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اسے سلوط کے ذکر سے پہلو بچاتے دیکھ کر۔ اس پر طنز بھی کر بیٹھے تھے۔

اور اس سمے اس کی تمام تر توجہ ان کی طرف ہی تھی۔ کیا پھوپھا کو سلوط کی گمشدگی کی اطلاع مل چکی ہے۔؟ اگر مل چکی ہے تو پھر انہیں اس کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی وجوہات بھی معلوم ہو گئی ہوں گی۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ سلوط کو میں نے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا اف یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہو گی۔

چہرے پہ سراسیمگی کا تاثر لیے اس نے لمحے کی چوتھائی میں سوچا۔

اس اثنا میں ثاقب حسن لفافے میں سے خط نکال چکے تھے۔

"ہوں تو بیگم اس خط کا ہم تک پہنچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے پرانے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ وہ تو بہت غنیمت ہوا کہ شیر محمد نے دوسری ڈاک کے ساتھ یہ خط بھی وصول کر لیا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں ہے پھر بھی نہ معلوم کیسے سمجھ گیا کہ یہ خط ہمارے نام آیا ہے۔" پھوپھا نے خط کھولتے ہوئے کہا۔

فاخرہ ان کی باتوں سے زچ سی ہو کر بولیں۔

"اُفوہ آپ خواہ مخواہ ہی بات کو اتنا طول کیوں دے رہے ہیں۔ آخر یہ کس کا خط ہے اور آپ پڑھ کر کیوں نہیں سناتے۔"

"بیگم صبر کیجیے صبر۔ خط پڑھ کر سنانے کی غرض سے ہی نکالا ہے۔" انہوں نے ترش سے لہجے میں کہا اور پھر خط کی عبارت پر نظریں مرکوز کر دیں اور پھر قدرے توقف کے بعد انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

قبلہ بھائی اور بھابی جان۔ آداب

میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ ٹھکانہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی ہوں جس کا انتخاب آپ نے اپنی مرضی اور حکم سے کیا تھا۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہیں اس وقت جہاں رہ رہی ہوں وہاں۔ مجھے پورا پورا تحفظ مل رہا ہے صرف اس خیال سے کہ میری اچانک گمشدگی آپ کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث نہ بنے یہ چند سطور اطلاعاً رقم کر رہی ہوں۔ اب خدا کرے میرا یہ خط آپ تک بحفاظت پہنچ جائے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر کی طرح یہ غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے بس خدا کے بھروسے پر ہی ارسال کر رہی ہوں باقی۔ والسلام۔

جب وہ خط پڑھ رہے تھے۔ فاخرہ اٹھ کر ان کے پاس ہی آ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے خط ختم کیا تو ایک گہرا سانس لے کر بولیں۔

"لیجیے سلوط نے تو اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ شاید پریشانی میں بے چاری بھول گئی ہو گی۔ آہ مظلوم بچی۔"

"خیر مظلوم تو کیا ہمارے ہاتھوں ستائی ہوئی ہے اور اگر نام نہیں لکھا تو فرق کیا پڑ گیا۔ اس کی تو تحریر ہی سے ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔" ثاقب حسن پژمردگی سے بولے۔

"ہائے بے چاری بچی نہ معلوم کس کے در پر پڑی ہو گی اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو گا اسے۔ اس کے پاس تو اتنی رقم بھی نہ ہو گی۔ گیا بالکل ہی خالی ہاتھ۔ گئی تھی تمہارے گھر سے۔" فاخرہ بیگم نے بڑے حزنیہ انداز میں بات کرتے کرتے اسفند کو مخاطب کر کے پوچھا۔ تو وہ چور سا بنا بیٹھا تھا دبی زبان سے بولا۔

"نہیں۔ وہ صرف اپنا وہی سوٹ کیس لے کر گئی تھیں جو لاہور سے ساتھ لائی تھیں۔"

"ہمیں اس بات کا سخت افسوس ہے اسفند میاں کہ ہر بات کا علم ہوتے ہوئے آپ اب تک ساری باتیں دبائے بیٹھے رہے۔"

ثاقب حسن کے لہجے میں شکایت نہیں ملامت سی تھی۔ اسفند شرمندگی کے مارے کوئی جواب ہی نہیں دے سکا۔ اصل میں تو سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔ اور وہ جو بہت صاف گو اور ہمیشہ سچ بات کہنے کا عادی تھا یہ گوارا ہی نہیں ہوا کہ وہ اصل بات بتا کر خود کو پھوپھی اور پھوپھا کی نظروں سے گرا لے۔

"بہر حال۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہمارے اعمالوں کی پاداش میں ہی ہوا۔ ہم اس معاملے میں کسی کو دوش نہیں دیں گے لیکن اسفند میاں آپ تو اس گھر کے ایک اہم فرد ہیں۔ کیا آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا یعنی کس بات سے تنگ ہو کر ہماری بٹیا کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔" پھوپھا نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔ تب بھی وہ انہیں اصل بات بتلانے کی ہمت نہ کر سکا اور بہت سوچ کر بولا۔

"خیر روشنی تو کیا ڈالوں گا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے بلکہ یقین ہے یہ سارا فساد بابا شرافت کی جھوٹی اور بے بنیاد باتوں نے پھیلایا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہی سلوط کے متعلق بہت غلط اور غلیظ باتیں ممی اور چھوٹے ابا کو بتائی تھیں۔ اور ممکن ہے سب کے رویوں سے تنگ آکر سلوط ہمارا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔"

"ارے نہیں یہ ساری آگ اسی نامراد بلو کی لگائی ہوئی ہے ورنہ بابا شرافت کو کوئی الہام تو نہیں ہوتا جو وہ جھوٹی سچی اپنے دل سے گھڑ دیتے۔" فاخرہ فوراً ہی بولیں۔

"خیر خیر جس کی بھی لگائی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ایسی کیا باتیں تھیں جنہیں سن کر بھابی جان وغیرہ بابا شرافت کی زبان پر ایمان لے آئیں۔"

ثاقب حسن نے جن کے چہرے سے ناگواری ہویدا تھی پوچھا تو اسفند کے کچھ بولنے سے پہلے فاخرہ بیگم نے اسفند کی زبانی سنی ساری باتیں شوہر کے گوش گزار کر دیں۔

"خیر بلو کو تو ہم ایسی چار چوٹ کی مار دیں گے کہ اس کا سارا کھایا پیا برابر ہو جائے گا۔ لیکن ہمیں تعجب اس بات پر ہے کہ اگر ہماری بٹیا کا کردار منجھلے ابا وغیرہ کی نظروں میں مشتبہ بھی ہو گیا تھا تب بھی وہ ان کے پاس ہماری امانت تھی۔ انہیں کیا حق پہنچتا تھا اسے گھر سے چلے جانے کے لیے مجبور کر دینے پر۔" ثاقب حسن کے لہجے میں رعونت سی بھر آئی۔

"ہاں بھلا دیکھو یہ کیسے شقی دل لوگ ہیں۔ بچی گھر سے چلی گئی اور انہوں نے ہمیں اطلاع تک نہیں کی۔ بھلا جوان جہان لڑکی کس کے رحم و کرم پر پڑی ہوگی۔ زمانہ تو پہلے ہی اتنا خراب ہے سارے ہم تو اسے تمہارے یہاں بھیجتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے یہ سارا کیا دھرا تمہاری ماں کا ہوگا۔ ریل سے گئی تھی نا۔ ہوائی جہاز سے نوابزادوں کی طرح جاتی تو تم لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ارے دولت نے تم لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔ تم سے انسان کی پہچان بھی چھین لی ہے۔ چلیے ثاقب اسٹیشن جا کر میرا ٹکٹ خرید یئے۔ میں تو آج ہی کراچی روانہ ہو جاؤں گی اور وہاں پہنچ کر بھابی جان کا گریبان نہیں کھینچا تو بات نہیں۔"

فاخرہ جو خط سننے کے بعد شوہر کے پاس چارپائی پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ ایک دم ہی بھڑک کر اٹھتی ہوئی بولیں۔

"اس قدر جذباتی بننے کی ضرورت نہیں۔ فاخرہ بیگم آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ہم اتنی آسانی سے کسی کو چھوڑ دیں گے۔ سارے ہم تو سیدھے منجھلے ابا کا گریبان پکڑیں گے جا کر مگر ابھی نہیں موقع ہے۔" ثاقب حسن گویا انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"لیکن ڈیڈی تو آپ سے زیادہ سلوط کے لیے پریشان ہیں پھوپھا جان! سارے کام چھوڑ کر پورے پورے دن کار لیے انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔" اسفند باپ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش میں بولا۔

"لیں دیکھا آپ نے۔ میں نہ کہہ رہی تھی کہ سلوط کو گھر سے نکالنے میں بھابی جان کا ہاتھ ہوگا۔ خیر وہ تمہاری ماں ہیں خواہ تم برا ہی مانو۔ مگر میں انہیں ایسا مزا چکھاؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھیں گی۔ کیونکہ بہت سہہ لیے میں نے ان کے ظلم۔ جو وہ تمہارے باپ کے آفس جانے کے بعد مجھ پر توڑا کرتی تھیں۔ اور منجھلے ابا کے سامنے ایسی بھیگی بلی بنی رہتی تھیں جیسے الٹی خود مظلوم

ہوں۔ پوری میٹھی چھری ہیں وہ۔ ان کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا بچے۔ شکر کرو کہ اماں جان کے زیر سایہ پروان چڑھے ہو ورنہ۔"

"ارے یہ آپ کیا چلے پھپھولے توڑنے بیٹھ گئیں بیگم۔ لو بھلا اسے بتا رہی ہیں جیسے ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ ارے انہی کی بے سلوکی کی وجہ سے تو آج آپ اپنے سگوں سے کٹی بیٹھی ہیں۔ مگر آپ کے لیے نہ سہی ہمارے لیے ان باتوں کا موقع نہیں۔ ہمارے گھر کی عزت تو معلوم کن ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہے ہماری تو اس وقت جان پر بنی ہوئی ہے۔" ثاقب حسن کا دھیما سا لہجہ بات کرتے کرتے ایک دم ہی کرخت سا ہو گیا۔

"آپ کی جان پر بنی ہوئی ہے تو میں بھی کوئی خوشی کے شادیانے نہیں بجا رہی۔ یہ میری بھی عزت کا مسئلہ ہے۔ خود میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ ارے جانور بھی پالو تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے وہ تو پھر انسان تھی وہ بھی آپ کی بہن۔"

فاخرہ میاں کی بات کا برا مان کر بولیں۔

"اچھا تو گویا آپ نے اسے میری بہن تسلیم کر لیا ہے۔" ثاقب حسن نے عجب سے لہجے میں پوچھا۔ جو چبھتا سا بھی تھا اور تمسخرانہ بھی۔

"واہ کیوں نہیں کرتی۔ بہن ہے تو بہن ہی۔"

"دیکھیے۔ ہم غلط سننے کے عادی ہیں نہ آپ کہنے کی اس کے باوجود بھی محض حالات کے پیش نظر غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔" ثاقب حسن نے ان کی بات کاٹ کر فوراً انہیں ٹوکا۔

"لیکن میں نے اسے لے پالک تو کبھی نہیں سمجھا اور یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔" فاخرہ بیگم قدرے ٹھنڈی سی پڑ کر بولیں۔

"ہاں یہ تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر آپ نے اسے ہمیشہ میری بیٹی۔ میری اپنی اولاد ضرور سمجھا کہہ دیجیے کہ یہ بھی غلط ہے۔" ثاقب حسن نے تہدیدی سے انداز میں کہا۔

"نہیں خیر غلط تو نہیں مگر میرے اولاد سے محرومی کے مسئلے سے آپ بھی واقف تھے۔ اور پھر آپ کے والد اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ اس عمر میں ان سے کوئی اتنی چھوٹی اولاد ہوتے کا میں یقین بھی نہیں کر سکتی تھی۔" فاخرہ بیگم دھیمی پڑ کر بولیں۔

"ظاہر ہے بہت صحیح خیال تھا آپ کا۔ جبھی تو آپ نے اسے میری اولاد سمجھ کر اسے کبھی اپنی محبت اور توجہ سے نہیں نوازا تھا۔ ورنہ اگر میری بہن ہوتی تو آپ کا رویہ یکسر جداگانہ ہی ہوتا۔" ثاقب حسن نے کہا۔ اور فاخرہ بیگم کوئی جواب ہی دینے والی تھیں کہ ثاقب حسن نے کہا۔

"بہر حال۔ آپ کی اطلاع کو سلوط میری بہن نہیں بیٹی ہی ہے۔ جسے صرف میں آپ کی وجہ سے باپ کا پیار دے سکا نہ توجہ۔ ارے میں تو دل بھر کے کبھی اسے سینے سے بھی نہیں لگا سکا۔ میں نے تو اس سے کبھی محبت کے دو میٹھے بول بھی نہیں کہے۔"

اس انکشاف پر جہاں فاخرہ ہیں کہہ کر اچھل پڑیں وہاں اسفند کا منہ بھی حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مگر ثاقب حسن نے زور سے بیوی کے "ہیں" پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ تو اپنی دھن میں بولے چلے گئے۔

"ارے ہم نے تو اس پر ایک ظلم توڑا ہے۔ وہ ہماری طرف میٹھی میٹھی چمکیلی نظروں سے دیکھتی تھی تو ہم منہ پھیر لیتے تھے۔ وہ ننھی شروع شروع میں ابو کہتی تھی تو ہم اسے دھمکا کر بھائی جان کہنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہمارے التفات کی خواہاں ہوتی تو ہم اسے بری ڈانٹ دیتے تھے۔ وہ کسی بات پر ضد کرتی تو ہم اسے بری طرح جھنجوڑ دیتے تھے۔ ہم نے اس سے اس حد تک بے اعتنائی اور بیگانگی برتی کہ بڑی ہو کر اس کے سارے احساسات مردہ ہو گئے۔ مگر اس پہ۔ اس پر بھی شاید ہمارا بس نہیں چلا تھا۔ جبھی تو ہم نے اسے اپنے سے بڑی عمر کے انسان کے ساتھ جھونک دیا تھا۔ اُف ہم کتنے ظالم اور جابر ہیں۔ اور کتنے ناقدرے ناشکرے بھی۔ خدا نے ہمیں گلوں کی طرح شگفتہ اور حسین سی بیٹی دی تھی مگر ہم نے اس کی بھی قدر نہیں کی۔ اور آج۔" ثاقب حسن آنکھیں بند کیے۔ ایک ہذیانی سی کیفیت میں یہ سب کچھ کہہ رہے تھے۔

کوئی ہچکی بھی نہ سسکی۔

مگر بند آنکھوں سے نکلتے اشکوں کے موتی ان کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

انہوں نے اپنی بات کہتے کہتے رک کر زور سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا۔

میاں کو روتے دیکھ کر فاخرہ بیگم کا بھی دل بھر آیا۔ اور اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔ لیکن اس سے سلوط پر اپنی زیادتیوں کے احساس نے انہیں ندامت اور پچھتاوے کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا اسی لیے بالکل خاموش تھیں۔ اور اسفند وہ تو کچھ ایسی گم صم سی کیفیت میں بیٹھا تھا جیسے اُسے اردگرد کا ہوش ہی نہ ہو۔

"مگر۔ ہم اس معاملے میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرائیں گے۔ کیونکہ یہ ہمارے اپنے اعمالوں کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ یہاں دنیا کے قانون کا تو کوئی بھروسا ہی نہیں۔ خریدا بھی جاسکتا ہے مگر قدرت کا قانون اٹل اور لاگو ہوتا ہے اور ہم اسی قانون کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔" ثاقب حسن نے اتنا کہہ کر پھر تھوڑا سا توقف کیا اور بولے۔

"لیکن ہم نے جو کچھ کیا تھا آپ کی محبت میں کیا تھا آپ کی وجہ سے کیا تھا۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے بہت بُرا کیا تھا۔ بلکہ ایک طرح خود پر ہی ظلم کیا تھا۔ کیونکہ جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ آخرت تو دور کی بات ہے دنیا میں ہی وہ ظلم ظالم پر ہی لوٹ آتا ہے۔ اور یہ ظلم کا فلسفہ قرآن اور سنت کی روشنی میں تو بہت ادق اور بہت ہی مفصل ہے لیکن یہ

ثاقب حسن اتنا کہہ کر خاموش سے ہو گئے۔ تو فاخرہ نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کیسا ظلم اور کس کا ظلم۔ کیا آپ کا مقصد درانی سے سلوط کو بیاہ دینا ہے؟"

"نہیں۔ یہ بالکل ہی دوسرا معاملہ ہے۔ بہرحال ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں تاکہ دل پر عرصے سے پڑا بوجھ گھٹ جائے۔" ثاقب حسن بولے تو اسفند بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"آپ کو معلوم نہیں فاخرہ ہم نے درد کے کس صحرا کو پیادہ پا عبور کیا ہے بے چارگی اور بے بسی کی کن کن منزلوں سے گزرے ہیں۔ ارے ہم نے تو کئی جانوں پر نہیں واقعی خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

شدت غم سے شاید ثاقب حسن کی آواز ترخ سی گئی تھی اسی لیے وہ پھر خاموش ہو گئے۔ فاخرہ خود بھی ندامت اور پچھتاوے کی اذیت میں مبتلا تھیں اسی لیے انہوں نے اپنے لب ہی سی لیے تھے اور اسفند بھی سناٹوں کی زد میں آیا ساکت سا بیٹھا تھا۔

"آپ کو یاد ہو گا جب طبی رپورٹ کے مطابق آپ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم قرار دے دی گئی تھیں تو آپ پر حزن و ملال اور مایوسی کا تاثر دیکھ کر ہم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کسی دوسرے کے بچے کو متبنّٰی کر لیں لیکن آپ نے بڑی سختی سے انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ پرائی اولاد پر خواہ آپ کتنی ہی جان ماریں گے وہ کبھی اپنی نہیں ہو گی۔ اور پرائی اولاد کو گود لینے کے باوجود آپ کی ممتا کبھی تسکین نہیں پاسکے گی۔ جبکہ اولاد کی خواہش ہماری کمزوری بن گئی تھی۔ بلکہ ہم اولاد کی خواہش میں پاگل ہو رہے تھے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان میں پوتے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی اگر ہماری کوئی نرینہ اولاد ہوتی تو ہم باوا جانی کی نصف جائیداد کے وارث قرار دیے جاتے۔" وہ بات کرتے کرتے پھر خاموش ہو گئے۔

"مگر آپ کے والد کے پاس اتنی جائیداد تھی ہی کہاں۔ وہ تو سنا تھا کہ اپنا سب کچھ عیاشی میں ختم کر چکے تھے۔" فاخرہ جتلانا نہ رہ سکیں۔

"نہیں نہیں بہت غلط لفظ استعمال کر رہی ہیں آپ۔ شاید یہ بھول گئی ہیں کہ وہ ہمارے والد تھے اور ان کے احترام کا اطلاق آپ پر بھی ہوتا ہے۔" ثاقب حسن نے فوراً ہی انہیں ٹوکا۔

"ہاں ہاں ہوتا تو ہے لیکن جو سنا تھا وہی کہہ دیا۔" فاخرہ نے بُرا مان جانے کے خیال سے فوراً ہی کہا۔

"ہاں اس کے باوجود بھی باوا جان کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے تو کچھ یہی مثل ان پر بھی صادق آتی تھی۔ بہرکیف باوا جان کی پہلی بیوی سے بڑے بھیا اور باجی اماں تھیں۔ دوسری بیوی سے صرف ہم اور تیسری بیوی سے مسعود الحسن تعلقہ دار کی چھوٹی بہن تھیں صرف چار لڑکیاں ہی تھیں۔ بڑے بھیا کی پہلوٹھی کی اولاد تو لڑکی ہی تھی مگر اس سے چھوٹا ایک لڑکا بھی تھا۔ اسی لیے باوا جان کی وراثت میں ان کی پوزیشن بڑی مستحکم ہو گئی تھی جبکہ ان کے مقابلے میں ہمارے ہاں اولاد ہی نہیں ہوئی تھی۔ —— ادھر ہماری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ ہم پاکستانی قومیت اختیار کر چکے تھے۔ اور ادھر باوا جان ہم پہ جان چھڑکتے تھے۔ اس پر مستزاد بڑے بھیا ان کی زندگی میں ہی بڑی حد تک ان کی ...

... ملکیت پر قابض ہو چکے تھے۔ اور شروع سے ہی ان کا رویہ کچھ خودسرانہ سا تھا یعنی وہ اپنی من مانی کرنے کے عادی تھے۔ اور اسی وجہ سے باوا جان ان سے خوش نہیں رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم ان کی زندگی میں ہی مزید ایک عقد کر لیں۔ جبکہ آپ پر سوکن لانا اور ان کے بطن سے بچہ پیدا کرا کے آپ کے محرومی کے احساس میں اضافہ کرنا ہمیں کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا۔ اس لیے ہم انکار ہی کرتے رہے۔ مگر ادھر سے تقاضے اتنے بڑھے کہ باوا جان ہی کیا چچا، پھپھیاں، دوست احباب سبھی مصر ہو گئے کہ بس بلاخوف خطر جھٹ پٹ تیسری شادی رچالو۔"

بات کرتے کرتے گلا خشک ہو گیا تھا شاید جبھی کھنکھار کر صاف کرنے کی غرض سے ثاقب حسن نے رک کر تھوڑا سا توقف کیا۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ بات کرتے کرتے خاموش ہو جانا اس سمے فاخرہ کو کس قدر کھل رہا ہے جو بار بار بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں۔ اس سمے انہیں یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ اسفند بھی اس وقت یہیں موجود ہے۔

"ہم تو اس وقت بھی راضی نہ تھے اور سب کو یونہی بکتا جھینکتا چھوڑ کر لاہور چلے آئے تھے۔ مگر۔ قدرت کے کھیل نرالے ہی ہوتے ہیں اور باوا جان یوں تو کافی عرصے سے علیل تھے کہ ضعیفی بذات خود ایک عارضہ ہی ہوتی ہے۔ کہ ایک دم ہی ان پر ہمارے خاندانی مرض دمے نے غلبہ کر دیا اور اس کے ساتھ ان پر ڈبل نمونیے کا حملہ ہوا۔ وہ تو زندگی باقی تھی جو بروقت علاج معالجے سے نمونیے پر قابو پا لیا گیا۔ مگر اسی علالت کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ہم تو ان کی علالت کا تار ملتے ہی روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو باوا جان کا پھر وہی تقاضا تھا کہ فوراً شادی رچالو۔ یہ ہماری آخری خواہش ہے اور تمہارے لیے ایک شریف خاندان کی لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے۔ چنانچہ ہم ان کی آخری خواہش کا احترام کرنے پر بالآخر مجبور ہی ہو گئے۔ اور ایک روز نہایت سادگی سے ہمارا نکاح پٹن صاحب کی نواسی فخر النساء سے ہو گیا جو مسعود الحسن تعلقہ دار کے ننھیالی عزیزوں میں سے ہوتی تھیں۔

فخر النساء خوبرو تو بہت تھیں مگر یتیم اور نادار تھیں۔ واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی انہوں نے لیکن بڑی سمجھدار اور سلیقہ شعار تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر خاصی پکی عمر کی تھیں کیونکہ غربت کی وجہ سے ان پر کوئی معقول پیغام ہی نہیں آیا تھا۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی لحاظ سے بھی بُری نہیں تھیں۔ مگر ہم ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکے تھے کیونکہ ہمارا ایک پیر کانپور میں اور ایک لاہور میں ہوتا تھا۔

بس سال میں دو تین پھیرے لگا آتے تھے۔ وہ بھی چند روز کے لیے۔ اور وہ ہماری صورت ہی تکتی رہ جاتی تھیں۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں نہ ہم نے کبھی انہیں یہ بتایا تھا کہ ہم کب تک رہیں گے کب واپس جائیں گے اور کب لوٹیں گے اور نہ انہوں نے کبھی پوچھا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ حاملہ ہوئیں اس وقت بھی نہیں۔ اصل میں اس وقت تو ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے سرکش موجوں میں گھرے قریب ہی نظروں کے سامنے پھیلے ساحل کو پرامید نظروں سے دیکھ رہے ہوں کہ شاید کوئی مہربان لہر ہمیں ساحل تک بہا کر لے جائے۔ کہ ہمیں تو صرف اور صرف بیٹے کی تمنا تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔

دوسرے معنوں میں ہم نے ساری خواہشوں اور تمناؤں کو داؤں پر لگا رکھا تھا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہہ لیں یا قسمت کا مذاق کہ اتنی آس امیدوں کے بعد اولاد بھی ہوئی تو ایک لڑکی کی صورت میں۔" ثاقب حسن ایک تسلسل سے بولتے بولتے شاید تھک گئے تھے اس لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

"یعنی سلوط؟" فاخرہ سے بولے بغیر نہ رہا گیا تو انہوں نے یہی کہہ دیا۔

"ہاں سلوط ہی۔" ثاقب حسن نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"لیکن سلوط نوزائیدہ تو نہیں تھی جب آپ اسے میرے پاس لائے تھے۔" فاخرہ نے کہا۔

"نہیں صرف ڈھائی سال کی تھی۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے ہم نے لڑکی پیدا کرنے کی پاداش میں فخر النساء کو قلبی اور روحانی۔ بڑی اذیتیں دیں۔ ہم نے بیٹے کے بجائے بیٹی کو ان کے پہلو میں پڑا دیکھ کر فوراً ہی اٹھا لیا اور اسے اپنی پھوپھی زاد عفت آرا کی تحویل میں دے دیا۔ فخر النساء روتی اور تڑپتی ہی رہ گئیں۔ ہم نے سلوط کو انہیں سونپنا گوارا نہیں کیا۔ باوا جان کا ڈنڈا سر پر تھا اس لیے ہم —— فوری طور پر انہیں طلاق نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن باوا جان کی آنکھ بند ہوتے ہی۔ ان کے چالیسویں کے بعد ہم نے انہیں طلاق دے دی۔

اور سلوط کو لے کر یہاں چلے آئے۔"

انہوں نے بات کرتے کرتے ایک سرد آہ بھری اور پھر گویا ہوئے۔

" قدرت نے مرد پر عورت کو قوام بنا کر اس لیے برتری دی ہے کہ وہ اسے پورا پورا تحفظ دے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھے اس کے احساسات اور خواہشات کا احترام کرے کہ وہ مرد کے مقابلے میں ایک کمزور اور نازک سی شے ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس پر جبر و ظلم کی انتہا کر دے۔ شوہر ہو تو اسے محکوم اور زر خرید سمجھے۔ اس کے حقوق پائمال کرے۔ اس کے احساسات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دے اور اپنا سب سے بڑا ہتھیار یعنی طلاق کا لفظ بار بار اس پر آزمائے۔ بلکہ قصور بے قصور صرف اپنی حاکمیت کے زعم میں اسے سرے سے طلاق ہی دے دے۔ جیسے کہ ہم نے دی تھی۔ اور وہ نیک بخت جو کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی تھی۔ ہمارے ارادوں سے آگاہ ہو کر لکھنؤ سے کانپور تک کا سفر تنہا طے کر کے ہمارے پاس آئی تھی

کس قدر روئی اور گڑگڑائی تھی وہ۔ حتیٰ کہ ہمارے قدموں میں سر بھی رکھ دیا کہ مجھے طلاق نہ دیں۔ اگر آپ میری رفاقت برداشت نہیں کر سکتے تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر کبھی میری شکل نہ دیکھیں۔ جہاں چاہیں رہیں۔ میری بیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں لیکن للہ مجھے طلاق نہ دیں۔ میں اپنے پیدا کرنے والے کی قسم کھاتی ہوں کہ کبھی آپ سے کوئی تعلق رکھوں گی نہ توقع۔ بس آپ کے نام پر ہی بیٹھے بیٹھے زندگی گزار دوں گی۔ دیکھیں میرے سر پر میرے باپ کا سایہ نہیں ہے۔ بہنیں ہیں تو وہ پردیس میں اور بھائی اور بھاوج وہ مجھ طلاق یافتہ کو اپنے گھر میں قدم بھی نہیں — رکھنے نہیں دیں گے۔" وہ رو رو اور تڑپ تڑپ کر کہتی رہی۔

مگر ہمارے کان تو بہرے ہو گئے تھے اور دل پتھر۔ اور ہمارے ہاتھ میں تو جیسے ساری خدائی تھی کہ ہم اس کے شوہر تھے۔ ہمیں تو اس کی باتوں نے کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا اور ہم نے مشتعل ہو کر وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔

گلا رندھ جانے کی وجہ سے ان کی آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ تیزی سے امڈتے ہوئے اشکوں کو سختی سے روکنے کے باوجود اشکوں کی چند لڑیاں ان کی پلکوں سے پھسل کر ان کے دامن پر آ گریں۔

" لیکن لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا۔ یہ اتنا بڑا ظلم۔ میں تو کبھی بھول کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ۔" فاخرہ کے دل میں سوت کی ہمدردی ایک دم ہی ابلی تو انہوں نے ملامت آمیز لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر ثاقب حسن نے انہیں فقرہ پورا کرنے کی مہلت نہیں دی۔

" ارے ظلم کیا تھا تو اس کی سزا بھی تو بھگتی ہے۔ اور بھلا ایک ظلم کیا تھا ہم نے۔ سب سے پہلے تو خدا کی ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے۔ کہ لڑکی ہی سہی خدا نے ہمیں اولاد سے تو نوازا تھا۔ اور ناشکروں کو قدرت معاف نہیں کرتی۔ اس پر ہم نے فخر النساء پر اتنا بڑا ظلم بھی توڑا۔ کہ انہیں طلاق دے کر اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور اس سے بڑا ظلم یہ کہ خود اپنے جگر گوشے کو بھی محبت اور التفات نہ دے سکے۔ اور خود اپنے ہاتھوں اس کی زندگی تباہ کر دی۔ بلکہ اسے اپنے ہاتھوں سے کھو ہی دیا۔ اب ہمیں معلوم ہے قدرت ہمیں اس کی اتنی بڑی سزا دے گی کہ ہم اسے کبھی دیکھ نہ سکیں گے۔" اتنا کہہ کر ثاقب حسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

فاخرہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس گریہ زاری میں ان کا ساتھ دینے لگیں۔

" ارے آپ کیوں رو رہی ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ کہ اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود آپ دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ آپ نے تو اچھے برے وقت میں کتنا ہمارا ساتھ دیا ہے آپ نے سلوط کی سرپرستی قبول کر کے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ آپ تو ہماری محسن اور مربی ہیں۔" ثاقب حسن بیوی کو روتا دیکھ کر بھری اور موٹی آواز میں بولے۔

" نہیں نہیں خدارا۔ آپ مجھے یوں تو ٹھنڈے لفظوں کی مار نہیں دیجیے ثاقب۔ میں تو پہلے ہی پچھتاوے کی آگ میں جھلسی جا رہی ہوں کس قدر شرمندگی محسوس کر رہی ہوں اپنی کوتاہیوں پر۔ میرا دل تو اس بچی کے المیے پر خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ میرے رویّے نے تو ممتا کے جذبے کو بھی شرمسار کر کے رکھ دیا ہے۔ ارے ہر عورت کا دل ممتا کے جذبے سے لبریز ہوتا ہے اور میرے دل میں تو یہ جذبہ ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ لیکن میں نے محض شک اور غلط فہمی کی بنا پر اس جذبے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ہم تو آپ کے قصور وار اور خطا کار ہیں ہم تو منہ ہی نہیں رکھتے کہ۔" اتنا کہہ کر فاخرہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔

"آپ نے اس غریب سے ہمارا انتقام لیا اور قدرت نے ہمارے ظلم اور زیادتیوں کی ایسی سزا دی کہ ہماری بیٹیا کو ہی ہم سے چھین لیا۔ اب ہم شاید کبھی اسے دیکھ سکیں۔ آپ کو کیا معلوم فاخرہ بیگم ہمارا سینہ غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ ہم جانکنی کی سی کیفیت میں گرفتار ہیں۔ ہائے آج تو ہم بالکل ہی برباد ہو گئے۔" ثاقب حسن بھوں بھوں کر کے رونے لگے تو اسفند نے اٹھ کر ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

" دل کو سنبھالیے پھوپھا جان۔ آپ کی تسلی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سلوط کا خط تو آپ تک پہنچ گیا۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی کبھی نہ کبھی آپ کو مل جائیں گی۔ بلکہ میں ان کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ ملک کا چپہ چپہ چھان ماروں گا ان کے لیے۔ یوں بھی پھوپھا جان۔ ڈھونڈے سے جب خدا مل جاتا ہے تو وہ تو انسان ہیں۔ آپ اس قدر مایوس نہ ہوں۔"

" ہاں ہاں بیٹا خدا تمہیں عمر دے تم یہ بے لوث فریضہ انجام دو گے تو خدا تم کو اس کا بہت بڑا اجر دے گا۔ ہماری تو بس ہی نہیں دل بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ اسے تلاش کرتے پھریں۔" فاخرہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔

" نہیں پھپھو بیگم۔ آپ اس طرح ممنونیت کا اظہار کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ کیونکہ سلوط کی تلاش میں میری اپنی غرض بھی شامل ہو گی۔ اس لیے کہ میں بہت پہلے ہی انہیں اپنے لائف پارٹنر کی حیثیت سے سلیکٹ کر چکا ہوں۔ اور اصل میں میرے معاندانہ رویّے کی وجہ سے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔" اسفند نے بڑی صداقت سے اصل بات بتا دی۔

" ہائیں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں اسفند بیٹے۔" ثاقب حسن رونا دھونا بھول کر اچھل پڑے۔

" اے سنیں گے کیا میں تو ان کی غیر متوقع آمد سے ہی کھٹک گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔" فاخرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کراری سی آواز میں کہا۔ مگر اسفند نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ثاقب حسن کو مخاطب کر کے پوچھا۔

" پھوپھا جان کیا میں سلوط کا خط دیکھ سکتا ہوں۔"

" ہاں کیوں نہیں۔ لو ضرور دیکھو کیونکہ اب تم نے اقبال جرم کر کے اسے تلاش کرنے کا وعدہ ہی کر لیا ہے تو پھر

شکوے شکایت اور خفگی کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔"

ثاقب حسن نے جیب سے لفافہ نکال کر اسے تھماتے ہوئے قدرے بشاش لہجے میں کہا۔ سفند نے ان کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اندر سے خط نکال کر پڑھنے کے بجائے صرف لفافے کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر وہ لفافہ انہیں واپس دیتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے آپ اطمینان رکھیں پھوپھا جان انشاء اللہ میں جلد ہی انہیں ڈھونڈ نکالوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ انہیں اپنی تحویل میں لینے کے بعد آپ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیں گے۔"

"ہاں ہاں بالکل۔ اس طرف سے تو تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہاری یہ شرط دل و جان سے پوری کریں گے انشاء اللہ۔"

ثاقب حسن نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے مگن سے لہجے میں کہا۔ پھر تھوڑی دیر مزید ان کے پاس بیٹھ کر وہ ان دونوں سے جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے اپنی عارضی اقامت گاہ پر چلا آیا۔

سڑک تو پکی اور ڈامر کی ہی تھی جس پر وہ نئے ماڈل کی لینڈ روور برق رفتاری سے اڑائے لیے جا رہا تھا۔ اب یہ اور بات تھی کہ گزشتہ دو تین یوم سے مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے سڑک چکنی اور پھسلواں ہو گئی تھی اور سڑک کے دونوں اطراف میں بنی کچی فٹ پاتھ تو بارش کے جمع شدہ پانی کی وجہ سے سچ مچ دلدل کا نقشہ ہی پیش کر رہی تھی۔

لیکن وہ ــ بے خوف و خطر بڑی بے پروائی اور بے احتیاطی سے اپنے خیالات کی پرواز سے کہیں زیادہ اونچی اڑان سے گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔ اس کا رخ سرگودھا شہر کی طرف تھا۔

جہاں پہنچنے کی اسے ایسی جلدی تھی نہ ایسی کوئی ایمرجنسی ہی پڑ گئی تھی جو گھڑی کی چوتھائی میں سارے فاصلے ناپ لیتا۔

البتہ اسے پہلی بار سرگودھا آنے کا اتفاق ہوا تھا اور وہ شام پڑنے سے قبل ہی اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جبکہ ابھی تو سہ پہر ہی ڈھل رہی تھی۔

آسمان کی نیلی ردا کو سرمئی بادلوں کی ہلکی سی تہہ نے ضرور ڈھانپ رکھا تھا مگر مغربی افق پر سمٹ جانے والی دھوپ نے آکاش کی وسعتوں میں دور تک ایک شنگرفی اجالا سا پھیلا رکھا تھا۔

جو یہ تصور کر لیا جاتا کہ اسے شام کا دھندلکا پھیل جانے کی وجہ سے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ جب کہ اس کے گاڑی چلانے کا انداز کچھ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ یا تو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا یا وہ آنکھیں بند کر کے گاڑی چلا رہا ہے۔

یا پھر اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

اور حقیقت بھی کچھ یہی تھی۔

وہ واقعی اس سمے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

اس کے خیالات بھٹکے ہوئے تھے۔

اور بھٹکے ہوئے خیالات کے تانے بانے میں اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

ذہنی الجھاؤ کی یہ کیفیت اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے تھی۔ جب ایک ہفتے قبل وہ پھوپھا سے بڑے دعوے سے یہ کہہ کر بلکہ ان دونوں میاں بیوی کو یہ اطمینان دلا کر آیا تھا کہ انہیں پریشان یا ہراساں ہونے کی مطلقاً ضرورت نہیں چونکہ سلوط کو بے ٹھکانے کرنے کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف سلوط کو کھوج نکالے گا۔ بلکہ سیدھا ان دونوں کے پاس پہنچا کر ہی دم لے گا۔

لیکن ــ اپنی رہائش گاہ پر واپس آنے کے بعد لاہور سے کوچ کر جانا تو کجا اس نے گھر سے باہر بھی قدم نہیں نکالا تھا۔

کہاں یہ عالم تھا کہ وہ لاہور سے جانے کے لیے رسیاں تڑا رہا تھا۔

دل پہ ایک دہشت سی طاری رہتی تھی اور اجمال کے گھر میں اسے ایک منٹ رکنا بھی گوارا نہ ہو رہا تھا۔

اور کہاں یہ عالم کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

اور اس ایک ہفتے کے عرصے میں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار ہی سہی۔ پھوپھی پھوپھا سے مل کر آ جاتا۔

اصل میں تو پھوپھو کی زبانی سلوط کا سارا احوال سن کر وہ سخت دل برداشتہ ہو گیا تھا اور ذہنی طور پر بھی بری طرح ... گیا تھا۔

حالانکہ ماں اور بابا شرافت کی زبانی بہت پہلے ہی وہ سن چکا تھا کہ سلوط شادی شدہ ہے۔ لیکن اب پھوپھو کی زبانی سلوط کی ساری روداد سن کر اور یہ جان کر کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ وہ سلوط کی طرف سے بددل سا ہو گیا تھا۔

کیونکہ اسے اپنے معیار پر پوری اترنے والی کسی ایسی رفیق زندگی کی تلاش تھی جو خوبصورت اور حیادار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش خلق اور اچھوتی بھی ہوتی۔ بالکل شفاف پانیوں میں کھلے تر و تازہ کنول کے اس پھول کی طرح جسے کسی انسانی ہاتھ نے چھوا تک نہ ہو۔

جبکہ شادی شدہ ــ اور اس پر طلاق یافتہ بھی۔

جب کہ وہ تو لاعلمی میں سلوط کی ظاہری صفات اور خوبیوں پر ہی فریفتہ ہوا تھا۔

اس کی خوبصورتی پر مر مٹا تھا۔

لیکن جذبہ عشق اپنی جگہ۔

چونکہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں حقائق کو سامنے رکھ کر عمل کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے یہ حقیقت اس پر بڑی گراں گزری تھی کہ جس ہستی کو اس نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔

دل و جان سے چاہا تھا۔ اس ہستی پر صرف اس کا حق نہیں ہے یا وہ محض اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس ... اس ملکیت پر بہت پہلے ہی کوئی اور مرد اپنا قبضہ جما چکا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہو گا۔

اور یہ بھی کہ سلوط کے بارے میں اس کی ماں اور بہنوں کے خیالات کیا ہیں۔

اور وہ سلوط کے ساتھ گھر کی ایک پروردہ لڑکی کی حیثیت سے ہی پیش آتی رہی ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔

ان کا واحد سہارا ہے۔ لہٰذا سلوط سے شادی کر کے وہ ان کی ساری امیدیں خاک میں ملا دے گا۔ ان کے ارمانوں پر پانی پھیر دے گا۔ اور اگر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے بھی لیا تب بھی بات بالکل نہیں بنے گی۔

کم از کم سلوط کو وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں ملے گا جس کی اس کی بیوی یا گھر کی واحد بہو کی حیثیت سے وہ مستحق ہو گی۔

لہٰذا وہ کرے تو کیا کرے۔ کیا سلوط کا خیال بالکل ہی چھوڑ دے۔ بس وہ اسی ادھیڑ بن میں کئی روز تک لگا رہا تھا۔

اور بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی اب تک کسی نتیجے پر نہ پہنچا تھا۔ ورنہ اصولاً تو اسے اسی روز ــ جس روز پھوپھا سے سلوط کو ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ شام کی فلائٹ سے کراچی لوٹ جانا چاہیے تھا کیونکہ اس لفافے پر کراچی کی مہر لگی ہوئی تھی جس میں سلوط نے خط رکھ کر پھوپھا کو بھیجا تھا۔ مگر وہ پورے سات روز کا عرصہ ضائع کر کے سرگودھا جا رہا تھا۔ اب یہ بھی نہیں تھا کہ اسے سلوط پر کی گئی اپنی زیادتی کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ بلکہ اسے تو اپنی زیادتی پر سخت افسوس تھا۔ رنج تھا ــ پچھتاوا اور ندامت تھی۔ اس کے خیال میں اس نے سلوط جیسی مظلوم لڑکی پر بڑا ظلم توڑا تھا۔ ستم ڈھایا تھا۔ حتیٰ کہ اسے تو پھوپھا سے کیا اپنا وعدہ بھی یاد تھا۔ اور اس نے سلوط کو تلاش کرنے کا خیال بھی نہیں چھوڑا تھا۔

البتہ یہ ضرور تھا کہ اب اس کے دل میں وہ لگن، وہ تڑپ باقی نہیں رہی تھی۔ جو ایک چاہت بھرے دل کی کسک بن جاتی ہے۔ اگر سلوط کے بارے میں کوئی فکر اسے دامن گیر رہتی تو بس یہی کہ نہ معلوم وہ کن لوگوں میں جا پھنسی ہو گی۔ کیا حالات پیش آئے ہوں گے اور کیونکر زندگی گزار رہی ہو گی۔

ہر چند کہ پھوپھا کو اس نے اپنے خط میں یہی اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ لیکن پھر بھی زمانہ اتنا خراب ہے۔ اپنے جان پہچان والوں پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ آجکل سب اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور حرص و ہوس کے غلام ہو گئے ہیں۔ تو پھر بھلا اس کے تحفظ کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ تو ایک روایتی سے ماحول کی پروردہ گھریلو ٹائپ سی لڑکی ہے۔ جیسے جبراً ایک بڈھے شخص کے پلے باندھ دیا گیا تھا۔ تب بھی وہ کوئی احتجاج نہیں کر سکی تھی۔

آہ یہ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ہی سراسر ذمہ دار اور قصور وار ہوں۔ مگر کراچی اتنا بڑا شہر ہے جس میں سڑکوں کی طرح محلوں کا بھی ایک جال سا بنا ہوا ہے۔ پوری ایک بھول بھلیاں ہے یہ شہر کراچی، سمندر کی عمیق گہرائیوں کی طرح اس میں بھی کوئی شے گم ہو جائے تو پھر اس کا ملنا محال ہو جاتا ہے۔ میں بھلا اسے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ یہ تو ۔۔۔ قدرت کا ہی کوئی کرشمہ ہو گا یا پھر حالات اور اتفاقات پر ہی موقوف ہو گا کہ وہ ایسا ہی رخ اختیار کر لیں جیسا کہ میری یہاں لاہور میں آمد پر کیا تھا کہ ایک تو ہوٹل سے اجمال احمد کے بنگلے میں میرا منتقل ہونا۔

دوسرے بہت اتفاقی بلکہ حادثاتی طور پر پھوپھا کا نظر پڑ جانا۔ شیراں کی زبانی تمام واقعات کا پتا چلنا اور پھوپھو تک رسائی۔ یہ سب کسی انسان کے بس کا کام تو نہ تھا۔

یہ تو قدرت نے ہی کچھ ایسے حالات پیدا کیے تھے۔

ورنہ ملتان سے روانگی کے وقت میرے تو سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ لاہور پہنچنے کے بعد پھوپھو بیگم اور پھوپھا جان سے میری ملاقات ہو گی اور بہت اتفاقی طور پر سلوطا کا خط آئے گا۔ جس سے اس کا کچھ اتا پتا تو مل جائے گا۔ لہٰذا جب واپس کراچی جاؤں گا تو اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کروں گا اور اگر قدرت کو منظور ہوا تو میری کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔

بس وہ کچھ ایسے ہی خیالات میں غلطاں اور پیچاں ایسی فکروں میں گھرا تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ یا پھر دوسرے معنوں میں اپنے ہوش وحواس میں نہ تھا۔ ہوش تو اسی وقت ہی آیا جب سامنے مخالف سمت سے آتے ایک تیز رفتار اور دیو قامت ٹرک کی زد سے اپنی لینڈ روور کو بچانے کی غرض سے اس نے گاڑی بائیں سمت کاٹنی چاہی مگر شومئی قسمت سے آگے سڑک کا بایاں حصہ تیز رفتار ٹریفک کی آمد ورفت سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے رفتار ہلکی کیے بغیر تیزی سے اسٹیرنگ کو بائیں سمت گھمایا تو گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو کر تیزی سے دلدلی فٹ پاتھ پر اتری اور ایک تناور درخت سے جا ٹکرائی۔

ٹکراؤ اس قدر شدید تھا کہ اس کی طرف کا دروازہ جو بے دھیانی میں اس نے لاک بھی نہیں کیا تھا۔ زور سے کھلا اور وہ ایک شدید جھٹکے سے نیچے دلدلی زمین پر آ گرا۔ اس شدید جھٹکے میں سر بری طرح اسٹیرنگ سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کی ایک پتلی سی سر سے بہہ نکلی تھی۔

مگر اس ساری تکلیف سے بے نیاز وہ کیچڑ میں لت پت زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ٹرک اسی تیز رفتاری سے کب کا زن سے اس کے پاس سے نکل کر بہت دور چلا گیا تھا۔ اور وہ ایک کسمپرسی کے عالم میں بے سدھ زمین پر پڑا تھا۔ نمعلوم جیتا تھا یا مر گیا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کا پتا نہ تھا۔ جو کم از کم اتنا ہی معلوم کر لیتا کہ وہ کس حال میں ہے۔

کتنی عجیب بات تھی۔

ہر دم کراچی کے لیے پر تولنے والے کو نمعلوم کون سی مجبوریاں لاحق ہو گئی تھیں جو وہ اجمال احمد کے گھر میں ہی چپک کر رہ گیا تھا۔

یا پھر یہ خونیں حادثہ اس کا منتظر تھا۔

وہ پھوپھا کے یہاں سے آیا تھا تو اسی عزم کے ساتھ کہ سب سے پہلی فلائٹ سے وہ کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اپنی رہائش گاہ پر آ کر اس کے خیالات نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ جس کی وجہ سے دل سے وہ لگن اور امنگ ہی ختم ہو گئی۔ جس کا اظہار وہ پھوپھی اور پھوپھا کے سامنے کر کے آیا تھا۔

اس سمے دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ مگر اس کی بھوک وپیاس سب کچھ اڑ چکی تھی۔ اس لیے کمرے کا اندر سے کھٹکا لگا کر بیٹھ گیا تھا اور الجھے ہوئے ذہن اور لوٹے ہوئے دل کے ساتھ نمعلوم کیا کیا سوچ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔

دروازہ کھلتے ہی آفتاب اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے اجمال بھی تھا۔

ایک تو یہی بات بہت غیر معمولی تھی کہ آفتاب دوپہر کے وقت آیا تھا۔ جب کہ ہمیشہ وہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد شام کو ہی آتا تھا۔ دوسرے اجمال اس کے پیچھے لگا لگا اس طرح کبھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ بہرحال اسے اس معاملے میں زیادہ متجسس نہیں ہونا پڑا۔

آفتاب نے آتے ہی اسے بھینچ کر گلے لگاتے ہوئے اپنی آمد کی غرض وغایت بیان کر دی۔

یار آج خلافِ معمول میرے اس وقت اچانک ہی ٹپک پڑنے پر تمہیں تعجب تو ہو رہا ہو گا۔ مگر کیا کروں ...ت ہی کم ہے۔ میرا ٹرانسفر سرگودھا میں کر دیا گیا ہے۔ اس لیے آج میں آف ڈیوٹی تھا۔ سوچا تم سے ملتا چلوں۔ ...تم تو تم نے بڑی راہ دکھائی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایک دم ہی۔" اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بس وہ ذرا گھومنے چلا گیا تھا۔ مگر تمہاری روانگی کب تک ہو گی؟" آفتاب سرگودھا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک ...ن کے کزن کے گھر میں ہی دھرنا دیے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے اس نے بڑی سبکی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

آج شام کی ٹرین سے فیصل آباد جا رہا ہوں۔ ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے تین یوم کی چھٹی ملی ہے۔ اباجی کی طبیعت ناساز ہے اس لیے یہ چھٹی گھر پر ہی گزاروں گا۔ اس کے بعد سیدھا سرگودھا پہنچ جاؤں گا۔" آفتاب نے اپنا پروگرام بتایا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم بھی آج ہی روانہ ہو رہے ہو۔" اسفند نے کہا۔ تو آفتاب اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔

"اچھا تو کیا تم بھی آج شام ہی یہاں سے کوچ کرنے والے ہو۔"

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ ابھی بکنگ کرانے جانے ہی والا تھا کہ تم آ گئے۔" اپنی بات اونچی رکھنے کی غرض سے اسفند غلط بیانی سے کام لے کر بولا۔

"لیکن اگر بکنگ بھی کرائی تو شام کی فلائٹ تو تمہیں ملے گی ہی نہیں۔ البتہ کل صبح یا شام کو ہی جا سکو گے۔" آفتاب نے کہا۔

"چلو تو جہاں اتنے دن زحمت دی وہاں ایک رات اور سہی کیوں اجمال صاحب۔" اسفند نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات کہہ کر اجمال کو مخاطب کیا۔

"واہ یہ بھی خوب رہی۔ سنتے تو یہی آئے ہیں بلکہ کچھ دستور بھی یہی ہے کہ انسان آتا تو اپنی مرضی سے ہے مگر اس کی واپسی دوسرے کی مرضی سے ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آپ آفتاب کے نہیں میرے مہمان تھے۔ اب آپ کی یہ بکنگ وکنگ بھی میری مرضی اور اجازت سے ہو گی۔" اجمال نے بڑے مخلصانہ سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"او نہیں جمال صاحب! آپ کو اتنے دن زحمت دے دی بس وہی کافی ہے۔ یوں بھی اب آفتاب کے جانے کے بعد لاہور میں میرے لیے رہ ہی کیا جائے گا۔ اور میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جا رہا تھا۔ مگر آپ خود ان سے پوچھ لیجیے کہ ان کے اصرار پر میں نے یہاں اتنا عرصہ بھی گزار دیا۔" اسفند نے کہا۔ تو آفتاب سر کو ہلکے سے جھٹک کر بولا۔

"کمال ہے یار! تم تو کچھ ۔۔۔ کچھ کمپلکسڈ سے ہو گئے ہو۔ یوں بھی تم اسلام آباد جا کر کون سے تارے توڑ لاؤ گے۔ اگر ایسا ہی سیاحی کا شوق ہے تو چلو میرے ساتھ سرگودھا چلے چلو۔"

"لیکن تم تو فیصل آباد جا رہے ہو اور میں اسلام آباد تو نہیں جا رہا۔ میں تو اب سیدھا کراچی ہی جاؤں گا۔" اسفند نے کہا۔

"خیر یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کراچی کے علاوہ تم کسی اور جگہ رہ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ کراچی کی رونق اور ہما ہمی کے عادی انسان کا دل کسی اور جگہ لگ ہی نہیں سکتا لیکن جیسا کہ تمہارا خیال تھا کہ کسی کشتی شفاخانے کے ساتھ وطن کے دور دراز علاقوں میں گھوم پھر کر اپنے خدمتِ خلق کے جذبے کو تسکین دو گے تو پھر اس سے

تو یہی بہتر ہے۔ کہ سرگودھا چلے چلو۔ بہت ممکن ہے کہ وہاں بھی ایم ایچ میں تمہیں کوئی معقول آسامی مل جائے۔
آفتاب نے بات اس کے مطلب کی کہی تھی اس لیے اس کے دل کو لگی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو مگر اس کا کیا یقین کہ وہاں مجھے کوئی ویکینسی مل ہی جائے۔
اسفند اس کے مشورے پر دل ہی دل میں غور کرتے ہوئے بولا۔

"اب پانی سے پہلے پاڑھ باندھنے کی کوشش تو نہ کرو۔ کیونکہ یہ ایسی کوئی محال یا غیر ممکن بات تو نہیں۔ تقریباً ہر دن ہی ہر جگہ بہت سی ایسی آسامیاں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ بس قسمت آزمائی شرط ہے۔ اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں سرگودھا کی سیر بھی ہو جائے گی۔"

آفتاب نے کہا تو اس نے بھی سوچا کہ چلو کیا حرج ہے۔ اسی بہانے کم از کم میں ایک نئی جگہ ہی دیکھ لوں گا وہاں کے ساتھ وہاں کے ماحول کا اندازہ بھی لگا لوں گا کہ کیسا ہے۔ یعنی میری طبیعت سے میل بھی کھاتا ہے یا نہیں۔ یہی سوچ کر اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے بقول تمہارے میں وہاں بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا لیکن ابھی تو تم خود بھی وہاں نہیں جاؤ گے یعنی تین چار روز بعد ہی جاؤ گے۔ اتنے میں۔ میں بھی اسلام آباد کا چکر لگا آؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"اوہو۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ اسلام آباد جانے کے لیے کیا کسی حکیم یا ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے یا پھر تمہارے لیے فرض ہو گیا ہے وہاں جانا۔ ارے بھئی آرام سے یہیں لاہور میں ہی بیٹھے رہو۔ یہ اپنا اجی راجمال اتنا خوفناک یا ہیبت ناک بھی نہیں جس سے تمہیں جان جانے کا خطرہ لاحق ہو۔" آفتاب کچھ اتنا چڑ کر بولا کہ اجمال تو اجمال خود اسفند کو بھی بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"خیر یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ اپنی بات کو اسی طرح منواتے ہو لیکن میں نے انکار تو نہیں کیا سرگودھا جانے سے۔ آج پیر کا دن ہے۔ میں ہفتے کے روز وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔" دوست کے خلوص کے آگے آخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ بھی سن لو کہ تم اسلام آباد ہرگز نہیں جاؤ گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ تم ہاتھ سے نکل گئے تو پنجرے سے نکلے ہوئے پرندے کی طرح ایسے پھر سے اڑو گے کہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آؤ گے۔" آفتاب اٹھتا ہوا بولا۔

"ارے انی یہ ایک دم ہی کیوں اٹھ کھڑے ہوئے تم۔ اگر کھانا نہ سہی تو کچھ ٹھنڈا گرم ہی پی لو۔" اجمال نے اسے ایکدم ہی اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں کچھ کھانے پینے کا موڈ ہوتا تو تم سے پوچھے بغیر ہی کیا پی لیتا۔ اس وقت تو مجھ پر سفر سوار ہے میں جا کر سامان بھی چیک کرنا ہے۔ ایک آدھ چیز ادھر رہ گئی تو پھر کون لینے آئے گا۔" آفتاب نے کہا۔ اور پھر اجمال کا شانہ تھپتھپا کر اور اسفند سے ہاتھ ملا کر اسے سرگودھا پہنچنے کی تاکید کر کے اسی وقت چلا گیا۔

تو یوں وہ دوست سے کیے دعوے کو ایفا کرنے کی غرض سے سرگودھا جا رہا تھا۔ ارادہ تو اس کا بذریعہ ٹرین ہی جانے کا تھا۔ مگر اجمال نے اسے ٹرین کے تکلیف دہ سفر سے بچانے اور کچھ اس غرض سے کہ وہ نئے ماڈل کی لینڈ روور جو آفتاب کی ملکیت تھی۔ اسے آفتاب تک پہنچانے کے خیال سے اسے یہی مشورہ دیا کہ اگر وہ کار کے ذریعے قومی شاہراہ سے سفر کرے گا تو وقت کی بھی بچت ہو گی اور سفر بھی آسان ہو جائے گا۔

یہ لینڈ روور آفتاب نے بےچارے نے پائی پائی جمع کر کے خریدی تھی۔ اور وہ تو راستوں سے ناواقف ہی تھا۔ اجمال نے اس کی سہولت کے لیے ——— اپنا ایک آدمی جو شاہین آباد اپنے گھر والوں سے ملنے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ شاہین آباد سے سرگودھا بمشکل تیس پینتیس میل پر واقع ہے اور راستہ بھی سیدھا۔

اس لیے اس شخص کے بہت کہنے سننے کے باوجود کہ وہ اسے سرگودھا ہی پہنچا کر آئے گا۔ اسفند نے اسے زحمت دینی گوارا نہ کی۔ اور اسے اس کی منزل پر اتار کر تنہا ہی سرگودھا کا رخ کیا۔
کہ یہ حادثہ پیش آگیا۔

...جانے آفتاب کے اصرار نے اسے اس حادثے سے دوچار کیا تھا۔
...پھر اسے قضا یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جو وہ سرگودھا سے ادھر ہی حادثے کا شکار ہو گیا تھا ——— ٹرک والا تو ...جانے کے ڈر سے ٹرک کو بھگا لے گیا تھا اور وہ مشیتِ الٰہی کے رحم و کرم پر سڑک کے کنارے درخت ...کے قریب کیچڑ میں لت پت بے سدھ پڑا تھا۔

...شام کا دھندلکا اب سیاہیوں میں تبدیل ہونے لگا۔ یا آسمان پر چھائی بدلیوں کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ ہی بڑھ ...تھا۔ تبھی شاہین آباد کی سمت سے آتی ایک ایمبولینس جس میں کسی ہسپتال کا کچھ عملہ بمع ڈاکٹرز بھرا ہوا تھا۔ اس کے ...قریب آکر رکی۔

"...کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایک آواز آئی۔
"نہیں یہ تو ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کسی شخص کی ڈیڈ باڈی (لاش) ہے۔" کسی اور نے اپنا خیال ظاہر کیا اور ...پھر جلد جلد دروازے کھلے اور کئی شخص تیزی سے باہر اتر آئے۔

ان میں سے وہ اشخاص جو ڈاکٹرز تھے۔ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ بڑے غور اور توجہ سے اس کا معاینہ کیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ زخم ٹٹولے۔ اور پھر بڑی عجلت اور پھرتی میں اسے احتیاط سے اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا اور سرگودھا شہر کے ایک سرکاری ہسپتال میں پہنچا دیا۔

اس کے تقریباً سارے جسم پر چوٹیں آئی تھیں۔ مگر سر کی چوٹ بہت خطرناک اور شدید تھی۔ خون بھی بہت بہہ گیا تھا۔

اس کی نبض ڈوب رہی تھی نزع کا سا عالم طاری تھا۔ آپریشن تھیٹر کی میز پر وہ جانکنی کے عالم میں پڑا تھا۔
مسلسل چار گھنٹے سے ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی ان تھک کوششوں میں مصروف تھے۔ دو مرتبہ خون بھی دیا جا چکا تھا۔ پوری چار بوتلیں چڑھائی گئی تھیں۔ لیکن یہ چار بوتلیں بھی اس کے جسم سے بہہ جانے والے خون کی کمی کو پورا نہ کر سکی تھیں۔

اسے مزید خون دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہسپتال کے بلڈ بنک میں یونیورسل پول زیرو نمبر کا خون ختم ہو چکا تھا۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ اس پر موسلا دھار بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ سڑکیں دریا بنی ہوئی تھیں اور ...رات گئے۔ اس چھاجوں برستے پانی میں یونیورسل پول کسی اور جگہ سے حاصل کرنا ——— جوئے شیر لانے کے مترادف ہی لگ رہا تھا۔

ادھر زندگی کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری تھا۔ عرصۂ حیات تنگ ہو کر بالکل موت کے دہانے سے جا لگا تھا۔ جبکہ ...اس ہسپتال میں وہ سب کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ یعنی کوئی اسے جانتا تھا نہ اس سے کوئی واسطہ رکھتا تھا۔
اس کے باوجود بھی انسانی برادری کے مربوط سلسلے سے منسلک دردمندی۔ ہمدردی اور ایک دوسرے کے ...کام آنے کا جذبہ تقریباً" اس کے تمام مسیحاؤں کے دلوں میں موجزن تھا۔

وہ ہر قیمت پر ایک کڑیل نوجوان اور بے یار و مددگار شخص کی جان بچا لینا چاہتے تھے۔ اور اسی جد و جہد میں انہوں نے دوسرے اسپتالوں سے زیرو نمبر کے خون کی دستیابی کے لیے فون پر رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ مگر ابھی تک کہیں سے ...بھی کوئی مدد نہیں آئی تھی۔ اور ادھر وقت تھا کہ نکلا جا رہا تھا۔
بلکہ اسفند کی جان تھی کہ اس کے خاکی جسد سے کسی بھی لمحے نکلنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہسپتال میں ایک کھلبلی ...سی مچی تھی۔

...زمین تک اپنے چہروں پر تردد کے آثار لیے۔ انسانیت کے سب سے بڑے جوہر۔ یعنی بے لوث جذبے اور ...خلوص کا اظہار کر رہی تھیں۔
کیونکہ اس موت کے دہانے پر کھڑے شخص سے ان کی کوئی غرض اٹکی تھی نہ ہی ان کا اس سے کوئی نزدیکی رشتہ تھا۔ ...وہ انسان تھا۔ ان کا ہم قوم اور ہم مذہب تھا۔ سبھی کے قلوب سے اس کی سلامتی کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ ...سبھی کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا۔ کہ زیرو نمبر کا خون کہاں سے حاصل کیا جائے؟

اور تبھی ہسپتال کی ایک نووارد معمولی سی نرس نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا خون زیرو نمبر ہی ہے۔ آپ جتنا چاہیں میرے جسم سے لے سکتے ہیں۔"

"آپ کا خون زیرو نمبر کا ہے مس شان! مگر آپ کو کیسے معلوم؟" ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے استہزا پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں۔ ویسے آپ چاہیں تو میرا خون ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔" مس شان نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن مس شان! آپ تو خود ہی بہت نازک سی ہیں۔ بالفرض اگر آپ کا خون زیرو نمبر کا بھی ہے اور ہم نے لے بھی لیا تو پھر آپ کے اندر رہ ہی کیا جائے گا۔" سرجن انصار بھی ہنس کر بولے۔ جو بہت ہی خوش مزاج اور خوش گفتار ملنے جاتے تھے۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ ویسے بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ آپ پلیز زخمی کی جان بچانے کی کوشش کیجیے۔" مس شان کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا تھا۔

اس وقت وہاں دو سرجن اور دو ڈاکٹر کھڑے تھے۔ نرس کے جذبے سے متاثر ہو کر انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور مس شان کو اس کمرے میں لے گئے جہاں خون ٹیسٹ کیا جاتا تھا۔ فوراً اس کا خون ٹیسٹ کیا گیا۔ نرس کا دعویٰ درست ہی ثابت ہوا۔ چنانچہ اگلے ہی چند لمحوں بعد اس کا خون لیا گیا۔ اور پھر اسے پندرہ بیس منٹ تک لیٹے رہنے کی ہدایت کر کے اور جوس وغیرہ پلا کر سب اس روم سے چلے گئے مگر مس شان کو تو جیسے قرار ہی نہیں تھا۔

وہ کبھی اُٹھ کر بیٹھتی کبھی لیٹ جاتی۔ چشم تصور میں زخمی نوجوان کا پٹیوں میں جکڑا چہرہ اور چہرے پر کھنڈی موت کی زردی، آپریشن کی میز پر بے حس و حرکت پڑا سراپا۔ اور ناک میں ٹھنسی آکسیجن کی نالی بار بار سامنے آ کر اس کے اضطراب میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

دل اندر ہی اندر ٹکڑے ہوا جا رہا تھا اور لبوں سے آہستہ آہستہ دعائیں نکل رہی تھیں۔ "اے ربِ رحیم وہ جو کوئی بھی ہے اس پر رحم کر۔ اے زندگی دینے والے اسے بچا لے۔ اسے زندگی دے دے۔ میری زندگی میری عمر بھی اسے ہی عطا کر دے۔ میں نے جس جذبے کے تحت اسے اپنا خون دیا ہے تو اس جذبے کی لاج رکھ لے۔ اے میرے مولا تو میری سن لے۔ میری سن لے۔"

اسے معلوم تھا کہ زخمی نوجوان کے جسم میں اس کا خون پہنچانے کی تیاری کی جا رہی ہو گی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ صرف ایک خون کی بوتل جو اس کے جسم سے نکالی گئی ہے کافی نہیں ہو گی۔ جب کہ اس سے قبل چڑھائی گئی خون کی چار بوتلیں اس کے خون کی کمی پوری نہ کر سکیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر جائے اور آپریشن روم میں نصب شیشے کے پیچھے سے اندر کا احوال معلوم کر لے۔

مگر وہاں ہسپتال کے عملے کے علاوہ کچھ اور لوگوں کی موجودگی کا بھی امکان تھا۔ اور وہ کسی کے سامنے پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے تو اپنا خون دے کر کسی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک انسانی فریضہ انجام دیا تھا۔

کسی کے سامنے جا کر وہ اپنی اس نیکی کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

یوں بھی یہ نفسیاتی اثر تھا۔

یا جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل جانے کا سبب۔

جو وہ واقعی نقاہت سی محسوس کر رہی تھی۔

اُٹھ کر ڈیوٹی روم میں آئی تو سر میں ایک گھمیری آنے کی وجہ سے لڑکھڑا سی گئی۔ اتفاق سے ایک سینئر نرس سسٹر نائمہ اس وقت ڈیوٹی روم میں موجود تھی۔ اس کے لڑکھڑا جانے پر۔ وہ زبردستی اسے پکڑ کر اس سائیڈ روم میں لے آئی جو سک روم کہلاتا تھا اور وہاں عموماً طبیعت خراب ہونے پر نرسیں اور سسٹرز آرام کیا کرتی تھیں۔ اصل میں تو چونکہ رات کا وقت تھا اور باہر شدید بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے چھٹی دلوا کر اس کے گھر بھی نہیں بھجوا سکتی تھی۔ البتہ سسٹر نائمہ نے جا کر ڈاکٹر کو بتا ضرور دیا تھا۔ مس شان بہت کمزوری محسوس کر رہی ہے، لہٰذا وہ جا کر اس کا معاینہ ضرور کر لے۔

مگر مس شان کا تلوا سک روم میں بھی نہیں ٹکا۔ سسٹر نائمہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

ایک بے کلی سی اس پر مسلط تھی۔

بار بار اس کا دھیان اسی زخمی مریض کی طرف جا رہا تھا۔

ایک جستجو ایک چبھن سی لگی تھی۔

ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اور دل میں خدشات کی ایک روشنی جل رہی تھی۔

کہ کہیں اس کی قربانی رائیگاں نہ چلی جائے۔

یوں اس زخمی کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

اور سرجن عارف نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صرف خون کی ایک بوتل کافی نہیں ہو گی۔ اس لیے مزید دو تین بوتلوں کا ...ے انتظام کر لینا چاہیے۔ اس پر ایک دوسرے سرجن نے کہا تھا کہ انتظام تو ہم نے کر لیا ہے لیکن اس اتنے خراب موسم میں ...ری طور پر خون فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا فی الوقت تو مس شان کے خون سے ہی کام چلا لینا چاہیے۔ اور سک روم میں بیٹھے ...ب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ اُٹھ کر پھر باہر آ گئی۔ یہی معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے خون دینے کا نتیجہ کیا رہا۔

مگر باہر آ کر دیکھا تو آپریشن روم کا دروازہ بند تھا اور دونوں سرجن اور ڈاکٹرز نرس سمیت اندر ہی سرگرمِ عمل تھے۔

وہ ستون کی آڑ میں ستون کا ہی سہارا لیے بڑی دیر تک آپریشن تھیٹر کے سامنے ہی کھڑی رہی۔

تب خاصے تکلیف دہ انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور دونوں سرجنوں کے ساتھ تینوں ڈاکٹرز اور دو نرسیں باہر نکلیں تو وہ ستون کی آڑ سے نکل کر بے تابانہ ان کی طرف بڑھی۔

"اینی نیوز سر؟" (کوئی خبر سر) اس نے اسی بے تابانہ لہجے میں پوچھا۔

"او یس یس۔ (ہاں ہاں) زخمی کے جسم میں آپ کا خون چڑھا دیا گیا ہے۔" ایک ڈاکٹر نے بتایا۔

"تو کیا کوئی امکان ہے اس کے بچ جانے کا؟" اس نے ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ چلتے ہوئے پھر سوال کیا۔

"خیر امکان تو نہیں کہہ سکتے البتہ اُمید ضرور ہے۔ کیونکہ موت و زیست تو خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ بندہ تو صرف کوشش ہی کر سکتا ہے سو ہم اس کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔" اس ڈاکٹر نے کہا تو اس کا چہرہ اُتر سا گیا۔

"ویسے بائی دا وے کیا اس سے آپ کی کچھ رشتے داری ہوتی ہے؟" اسی ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں سر رشتے داری تو دور کی بات میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔" اس نے کہا۔

"پھر تو آپ کا جذبہ قابلِ تحسین ہے۔ لیکن آپ کیسا فیل کر رہی ہیں۔ کوئی ویک نیس کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہوئی آپ کو خون دینے کے بعد۔" ڈاکٹر کو اس سے باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی خیال آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خاصی مقدار میں اپنا خون ...یا ہے تو اس نے پوچھا۔

"نو سر میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے اتنا ہی کہا اور وہاں سے پلٹ کر ڈیوٹی روم میں چلی آئی کہ ایک معمولی سی نووارد نرس ...ے ہوئے اس نے ایک ڈاکٹر سے جتنا بھی پوچھ لیا تھا وہی بہت تھا۔

اس سرکاری ہسپتال کے تقریباً تمام ہی عملے میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ڈاکٹرز سے لے کر چھوٹے درجے کے ملازمین سبھی منکسر مزاج اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

اگلی صبح بارش تھم گئی تھی اور چونکہ مس شان کی ڈیوٹی رات کی تھی اس لیے اور کچھ اس لیے بھی کہ ساری رات وہ بہت بے سکون رہی تھی اس کا چارج لینے والی دوسری نرس کے آنے سے قبل ہی وہ سسٹر نائمہ سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ اس کا گھر یا ...ہ کا بھی ہسپتال سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بلکہ ہسپتال کی عقبی باؤنڈری وال کے پیچھے ہزار گز کے فاصلے پر بنے نرسوں کے ...ل کے ایک کمرے میں ہی تھی۔ جہاں اس کی ہم پیشہ دوسری نرسیں بھی اقامت پذیر تھیں۔ پروین، شازیہ، عفت اور شمیم اس ...ہی کام کرتی تھیں۔

اگلے پورے دن ہی وہ سخت نقاہت محسوس کرتی رہی تھی اور اس نے تو اس نقاہت کا سبب کسی کو بتایا ہی نہیں تھا مگر ... نے آ کر بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ہاسٹل کی انچارج جو ایک پرائیوٹ کلینک میں مڈوائف بھی تھی اور اس ہاسٹل کا نظم و نسق

چلا رہی تھی۔ سب کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے فوراً ہی طاقت کا انجکشن دیا اور تقریباً سارا دن ہی مختلف اوقات میں اسے دودھ، جوس اور مقوی غذائیں کھلاتی رہی تھی اور اس نے اس کے بہت کہنے سننے کے باوجود اسے شام کو ڈیوٹی پر بھی نہیں جانے دیا تھا۔ جب کہ اس کا دھیان برابر اسی زخمی مریض کی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نے اسے اپنا خون دیا تھا لیکن وہ صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیسا ہے؟

کیا اس کے بچ جانے کے کچھ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

آخر خدا خدا کر کے شام کو پروین اور عفت وغیرہ اپنی اپنی ڈیوٹیز بھگتا کر آئیں تو ان کی زبانی اس نے یہ مژدہ سنا کر زخمی زندہ ہے بلکہ اس کے زندگی کی طرف لوٹ آنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سجدے میں گر گئی۔

زخمی نوجوان موت کے منہ میں جاتے جاتے واقعی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ مس شان کا خون دینے کے بعد اسے مزید خون چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی جب کہ تقریباً سارے سرجنز اور ڈاکٹرز اس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بس اس اُمید موہوم پر کہ شاید ان کی کوششیں بار آور ہو جائیں اور شاید مالک کون و مکاں اسے زندگی دے دے وہ اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مس شان کا خون اس کے جسم میں داخل کرنے کے بعد بھی وہ اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے مگر ان کی بے لوث خدمات، انتھک کوششیں اور پھر سب سے بڑھ کر جذبۂ ترحم اور ہمدردی، اس پر مستزاد مس شان کا اتنا بڑا ایثار شاید یہ سارے بے لوث اور بے کھوٹ صادق جذبے حق سبحان تعالیٰ کو پسند آ گئے تھے جو ہر عیب سے مبرا ہے اور صداقتوں کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

تبھی تو اس نے ایسے صادق اور ـــ بے لوث جذبوں کو دیکھتے ہوئے زخمی نوجوان کو اس کی زندگی لوٹا دی تھی ورنہ سر سے لے کر پیروں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو زخمی نہ ہوئی ہو۔

اس پر والدین، بہنیں اور رشتے دار۔

یعنی اس کے لیے سچے دل سے دعائیں کرنے والے۔

اس کی حالت زار پر رونے اور تڑپنے والوں کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیسے زبردست حادثے کا شکار ہوا ہے۔ اور لقمۂ اجل بنتے بنتے اجنبی اور انجان لوگوں کی بے لوث خدمات، کوششوں اور صادق جذبوں کے طفیل موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ اور خدا ہی دوسروں کے دلوں میں رحم و ہمدردی ڈالتا ہے۔

وہی ضرب المثل کہ خدا مہربان تو کل مہربان۔

مگر بندہ ـــ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو اپنی عاجل، بے صبری اور ناشکری فطرت کی وجہ سے اس ارحم الراحمین کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کی رحمت تو بے پایاں اور بے حساب ہے۔ اس کی رحمت کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے کہ رحمت کے سارے باب اسی کی طرف سے کھلتے ہیں۔ کرم کی برکھا وہی برساتا ہے۔

تین روز تک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ کر آیا تھا تو بڑے حیرت انگیز طور پر روبصحت ہو رہا تھا۔ کم از کم کرنل عارف تو اسے ایک مریکل ہی کہتے تھے۔

پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے اپنا تعارف بھی کرا دیا تھا اور آفتاب کا پتا بتا کر اسے بھی بلا لیا تھا۔ آفتاب بڑی پابندی سے تقریباً روز ہی اس سے ملنے آتا تھا اور وہاں ہسپتال میں، ـــ اس کی ایک بہت ہی اعلیٰ ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ تقریباً تمام ڈاکٹروں سے ہی دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہاں۔

ایک خبر یہ بھی گرم تھی کہ ہسپتال کی ایک نرس نے اپنا خون دے کر اسے زندگی کی طرف لوٹایا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خون کی چار بوتلیں چڑھانے کے باوجود بھی چونکہ اس کے جسم میں خون کی کمی پوری نہیں ہو سکی تھی اس لیے یونیورسل پول کی مزید ضرورت تھی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے فوری طور پر دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے مجبوراً نرس کی درخواست پر اس کا خون لیا گیا تھا۔ بہر حال دوسروں کے نزدیک یا دوسرے معنوں میں ہسپتال کے عملے کے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم یا خاص بات نہ تھی۔

کیونکہ طبی امداد کے طور پر عموماً ایسی مدد دینی ہی پڑتی ہے۔

مگر خود اسفند کے نزدیک یہ بہت اہم اور بڑی بات تھی۔

وہ اس نرس کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے اسے زندگی کے سب سے نازک لمحات میں اپنا خون دیا تھا۔

اس کے خیال میں وہ اس کی محسنہ تھی اور وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار اسٹاف کے لوگوں سے بھی اس کے متعلق پوچھ چکا تھا۔

بلکہ اسے بلوا بھی چکا تھا۔

مگر یا تو وہ آف ڈیوٹی ہوتی یا پھر بہت مصروف۔

اور پھر اس کی ڈیوٹی عموماً رات کو ہی لگتی تھی۔

گو رات کے آٹھ بجے سے لگتی تھی مگر جہاں وہ ہمیشہ کنی کترا جاتی۔

وہاں ادھر ـــ وہ اس کے انتظار میں سلیپنگ پلز کے اثر سے پڑ کر سو جاتا۔

یوں یہ آنکھ مچولی کئی روز تک قائم رہی۔

اصل میں مس شان نے دانستہ اس سے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ روگردانی سے کام لے رہی تھی۔ کیونکہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے سامنے جا کر اسے خواہ مخواہ ہی احساسِ ممنونیت میں مبتلا کر کے گویا اپنی ایک چھوٹی سی نیکی کو برباد کرے۔

جب کہ بات بھی کافی پرانی ہو چکی تھی۔

بلکہ ہسپتال کے عملے کے نزدیک آئی گئی ہوئی تھی۔

مگر وہ تھا کہ اس کے نزدیک نرس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے سوا کوئی دوسرا مقصد باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔

اب تک پٹیوں کی قید میں جکڑا پڑا تھا۔ ورنہ خود اُٹھ کر اس سے ملنے، اس کا شکریہ ادا کرنے جاتا۔

وہ بارہا آفتاب سے بھی اس بات کا تذکرہ کر چکا تھا۔

مگر آفتاب نے کبھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ اکثر یہ ـــ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ۔

"اچھا بھئی۔ پہلے ٹھیک تو ہو جاؤ پھر اس کا شکریہ بھی ادا کر لینا۔ وہ یہیں تو ملازمت کرتی ہے۔ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔"

کیونکہ آفتاب کے نزدیک اپنا لہو دے کر کسی کی جان بچانی ایک لائقِ تحسین بات ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں جتنا کہ وہ ظاہر کر رہا تھا یا سمجھ رہا تھا۔ یوں تو اس کے زخم تیزی سے بھرنے شروع ہو گئے تھے۔ پیشانی اسٹیرنگ سے ٹکرائی تھی تو بھوں بری طرح پھٹ گئی تھی اور نصف سر تک سر کی کھال بری طرح رگڑ کھانے کی وجہ سے کٹ کر آنکھوں اور پیشانی پر آ پڑی تھی جسے دوبارہ اپنی جگہ جمانے کی غرض سے اٹھارہ ٹانکے ـــ لگے تھے۔ گھٹنے کہنیاں سبھی زخمی ہو گئے تھے اور ٹخنے کی ہڈی اگر ٹوٹی نہیں تو اپنی جگہ سے کھسک ضرور گئی تھی جسے آپریشن کے ذریعے اس کی جگہ پر سیٹ کر کے تلوے سے پنڈلی تک پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے ہسپتال میں اس کا قیام طویل ہو گیا تھا مگر جب سے وہ ہوش میں آیا تھا اپنے سارے اخراجات خود اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا۔ وہ کیئرولٹی سے اسپیشل وارڈ میں منتقل ہو گیا تھا۔

چہرہ ہی کیا۔ اس کی گفت و شنید۔ عادات و اطوار اور رکھ رکھاؤ سبھی کچھ اس کے اعلیٰ طبقے سے ہونے کی نمایندگی کرتے تھے۔ پھر سب کو ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ ڈگری اور تعلیم یافتہ انگلینڈ ریٹرن ڈاکٹر بھی ہے۔ اسی لیے سب اس کی بہت عزت کرتے تھے اور وہ سب میں بے حد ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ عام دستور کے مطابق جو ہسپتالوں کا ایک چلن سا بن گیا ہے اس کے قیام کی طوالت ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے کی بے نیازی اور لاپروائی کا شکار نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے برعکس اسے خصوصی توجہ سے نوازا جاتا تھا۔

بہر کیف ـــ پھر وہ دن بھی آ گیا جب پٹیوں سے آزاد ہو کر وہ اس قابل ہو گیا کہ ہسپتال سے ڈسچارج لے سکے۔ ایک بس ٹخنے کی چوٹ ہی تکلیف دیتی تھی جس کی وجہ سے اس کے پیر میں لنگ سا آ گیا تھا۔ اصل میں آفتاب نے اپنے ایک دوست کیپٹن احتشام کے ہاں جو اتفاق سے سرگودھا کا ہی رہنے والا تھا اس کی رہائش کا بندوبست کیا تھا اور محض اس کی خاطر ہی چند گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔

اور جب تقریباً سارے ہی عملے کا شکریہ ادا کر کے اور رخصتی کلمات کہنے کے بعد وہ آفتاب کے ساتھ باہر کا رُخ کر نے لگا تبھی اسے اپنی محسنہ بڑی شدت سے یاد آگئی۔ اس نے چلتے چلتے کسی خیال سے رُک کر ہیڈ نرس سسٹر ضیا سے پوچھا۔

"مس شان کہاں مل سکیں گی سسٹر ضیا؟" اور اس سوال پر سسٹر ضیا نے پہلے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر تھوڑا سا مسکرائی۔

"ڈارک روم میں سر۔" اور اس کے مسکرا کر ڈارک روم کہنے پر آفتاب کچھ اور ہی سمجھا۔ اسے ٹہوکا مار کر آہستہ سے بولا۔

"یار کیوں ایک معمولی سی نرس پر اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو۔ تم سے کھڑا تو ہوا نہیں جا رہا۔ چلو سیدھی طرح جیپ میں جا کر بیٹھو۔" مگر جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

ضیا کو مخاطب کر کے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا ڈارک روم میں کوئی اور بھی موجود ہو گا۔ میرا مطلب ہے مس شان کو کیونکر شناخت کر سکوں گا۔" اس کے اس سوال کا جواب بھی سسٹر ضیا نے دانت نکال کر ہی دیا۔

"سر اسے شناخت کر لینا کچھ مشکل تو نہیں ہو گا۔ کیونکہ جب وہ ڈارک روم میں پہنچتی ہے تو وہاں اُجالا سا پھیل جاتا ہے۔ سر وہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ دیکھیے۔ وہ سامنے۔ وہ جو ڈیوٹی روم کی طرف جا رہی ہے وہی مس شان ہے۔"

سسٹر ضیا کی زبانی اس کا اتا پتا معلوم کرتے کرتے وہ سامنے آگئی تو آفتاب کو بھی وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کمال ہے۔ عجیب شاعرانہ مزاج رکھتی ہے یہ سسٹر ضیا بھی۔ مگر اب تم بھی ذرا دل تھام کے ڈارک روم میں قدم رکھنا۔ پہلے ہی چلنے میں لڑکھڑا رہے ہو۔ اس کے حسن کا جلوہ دیکھ کر کہیں پھسل پڑے تو کہیں پھر تمہارے ٹخنے میں پلاسٹر نہ چڑھوانا پڑے۔" آفتاب بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

"میں تمہاری طرح بے پیندی کا بدھنا نہیں کہ ذرا کوئی اچھی صورت دیکھی اور ہو گئے چاروں خانے چت۔ اور نہ اس وقت میں کسی مذاق کے موڈ میں ہوں۔ انسانیت کے اصول کے تحت اس کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور بس۔" وہ آفتاب کے مزاحیہ فقروں پر قدرے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں بولا۔

اسی اثنا میں دونوں ڈیوٹی روم کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے ڈیوٹی روم میں قدم رکھا تو آفتاب فقرہ چست کیے بغیر نہ رہا۔

"ذرا سنبھل کے میری جان۔" مگر اس نے اس کی بکواس پر کوئی دھیان نہ دیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ بڑی سی ٹیبل پر رکھے کسی چارٹ پر جھکی شاید اسی کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس نے اس سے تھوڑے فاصلے پر رک کر پوچھا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ ہی مس شان ہیں۔" اور وہ بڑے غیر ارادی طور پر اس کی آواز پر چونکتے ہوئے سیدھی ہو کر اس کی طرف پلٹی تو اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اسفند کو یوں لگا جیسے زمین کی گردش تھم گئی ہو۔

اور زمین تو کیا کائنات کی ہر شے سائیں سائیں کرنے لگی ہو۔ کہنے کو ہزار باتیں تھیں اور پوچھنے کو بے شمار سوالات مگر تعجب اور بے یقینی کی یلغار میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گویائی سلب ہو گئی ہو۔ اور ہونٹوں پر تالے سے پڑ گئے ہوں وہ ساکت سا۔ تعجب سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

جب کہ اس کے برعکس مس شان کی شفاف پیشانی پہ ناگواری کی شکنیں سی اُبھر آئیں۔ اور حسین تر چہرے سے برہمی کے آثار ہویدا ہونے لگے۔

اس نے میز پہ پڑا وہی چارٹ اٹھایا اور پلٹ کر ڈیوٹی روم سے جانے لگی تو آفتاب نے جس کے لیے سارا عمل اور ردعمل نہایت ہی ناقابل فہم تھا آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اس کے ڈیوٹی روم میں آنے کی غرض و غایت بیان کی۔

"یہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند چونکہ صحتیاب ہو کر گھر جا رہے ہیں اس لیے اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ نے اپنا خون دے کر نہ صرف ان پر احسانِ عظیم کیا ہے بلکہ دوسرے معنوں میں انہیں خرید لیا ہے۔"

گو آخری فقرہ آفتاب نے بظاہر نہایت سادگی سے کہا تھا مگر نرس مس شان کو ذو معنی سا لگا۔ وہ کچھ کڑوی کسیلی ہو کر بولی۔

"میرے خیال میں آپ کو شدید قسم کا مغالطہ ہوا ہے ورنہ میں نے کسی پر احسان کیا ہے نہ کسی کو خریدا ہے۔ بس ایک انسانی فریضہ ادا کیا ہے جس کی ادائیگی ہر انسان پر ہی لازم ہے۔" اس نے آفتاب کی طرف دیکھے یا گھومے بغیر ہی کہا۔ اور پھر چپاک سے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی آفتاب اس کی طرف گھوما جو ڈیوٹی روم میں رکھی ٹیبل سے کچھ فاصلے پر اسی ساکت اور صامت سی کیفیت میں کھڑا تھا۔

آفتاب نے اس کے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے ہاتھ ہلایا۔ پھر اس کی پیشانی چھو کر تشویشناک انداز میں منہ بنایا اور پھر اس کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔

مگر نہ معلوم کہاں پہنچا ہوا تھا اس وقت وہ کہ اس نے جنبش کی نہ پلک جھپکائی۔

آخر جب تنگ آ کر آفتاب نے اسے بری طرح جھنجھوڑا تو اس نے بری طرح آفتاب کو جھڑکا۔

"یہ کیا حماقت ہے، آفتاب تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"ہائیں ہوش تو تمہارے گم ہیں اور اُلٹا مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں اپنے ہوش میں تو ہوں۔ کمال ہے یار۔ تم تو اسے دیکھ کر ایسے چوپٹ ہوئے جیسے اس سے قبل تم نے کوئی حسین چہرہ دیکھا ہی نہ ہو۔ جبکہ تم تو کئی سال انگلینڈ کے پرستان میں گزار کر آئے ہو۔ بھلا وہ بھی دل میں کیا سوچ رہی ہو گی کہ ڈاکٹر سردار محمد اسفند ایف آر سی پی اظہار تشکر نہیں بلکہ اظہار عشق کرنے کی غرض سے آئے تھے حد ہو گئی اس دیوان پن کی بھی۔" آفتاب نے الٹا اسے لتاڑا۔

لیکن وہ اپنے حواس میں تھا ہی کہاں۔؟

اس کے ہوش تو وہ گم کر گئی تھی۔ وہی ایک معمولی سی لڑکی مس شان۔ وہ اسی کے خیالوں میں گم تھا۔

اور خود کو اس بات کا یقین دلانے میں کوشاں تھا کہ اس نے جو صورت ابھی ابھی دیکھی ہے وہ سلوط کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اور ادھر آفتاب تھا کہ ایک تسلسل سے بولے جا رہا تھا۔ آخر وہ بہت جھنجلا کر بولا۔

"افوہ بھئی تم تھوڑی دیر کے لیے اپنا منہ بند نہیں کر سکتے بیکار میں ہی میرے کان کھائے جا رہے ہو۔"

"میں تو کان ہی کھا رہا ہوں مگر وہ تو تمہاری عقل ہی چر گئی ہے۔ کہ آخر بات کیا ہے کچھ تو بتاؤ۔" آفتاب نے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہنوز ایک خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

"جب کوئی بات نہیں تو پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ چلو آؤ اب چلتے کیوں نہیں یوں تو بڑی عجلت دکھا رہے تھے۔" وہ آفتاب کی باتوں سے زچ سا ہو کر بولا اور اپنی بات کہتا ہوا ڈیوٹی روم سے باہر نکل آیا۔

"ہوں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہے جو تم یوں کنی کترا رہے ہو۔" آفتاب اس کے ساتھ ڈیوٹی روم سے باہر آتا ہوا بولا۔ کہ بچہ یا اتنا بیوقوف تو نہیں تھا جو مس شان کو دیکھ کر اس کے بے خودی کے مظاہرے کو سمجھ نہ سکتا۔

"ارے نہیں یار دال میں کچھ کالا ہے نہ ہرا۔ اصل میں، میں تو اب تک یہی سمجھتا آ رہا تھا کہ وہ بہت ضعیف نہ سہی تو پکی عمر کی ہٹی کٹی عورت ضرور ہو گی مگر اب جو اسے دیکھا تو سارے اندازے ہی باطل نکلے۔ اور بس۔" آفتاب کو اس قدر متجسس دیکھ کر آخر اسے بات بتانی ہی پڑی۔

"ہونہہ اور بس۔ اور وہ جو سسٹر ضیا اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آ رہی تھی اس کی باتوں کو کیا تم نے دیوانے کی بڑ سمجھا تھا۔" آفتاب اس کے ساتھ چلتا ہوا جیپ کے نزدیک آ کر بولا۔

"ہاں میں اس کی باتوں کو بڑ ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ جس انداز میں وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی اسے میں نے مذاق پہ ہی محمول کیا تھا جبھی تو میں ایک دم ہی سیریس ہو گیا تھا۔" مگر اس کی اس وضاحت پر بھی آفتاب کو یقین نہیں آیا۔

"لیکن اسے دیکھ کر اگر تمہیں تعجب بھی ہوا تھا تو اس قدر تو نہیں ہونا چاہیے تھا کہ تمہارا از ہرا ہی شق ہو گیا۔" آفتاب نے اس کے ساتھ جیپ میں ـــــ بیٹھ کر جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہو بھئی اب یہ اگر مگر کی رٹ لگا کر بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ میں تو اسے دیکھ کر اس وجہ سے بھی دنگ رہ گیا تھا کہ بھلا اس نازک اندام سی لڑکی کے جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل گئی ہو گی تو اس کے اندر باقی کیا رہا ہو گا۔" اس نے آفتاب کے تجسس کو ختم کرنے کی غرض سے مزید بات بنائی۔

"ہا ہا ہا۔ اماں باقی تو اتنا رہا کہ تم اسے دیکھ کر چاروں خانے چت ہو گئے۔ خیر اب زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔ ہم بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں تمہارے رُخِ روشن پر اس وقت جو بمباٹمنٹ کے بعد کی سی کیفیت طاری ہے۔

پہلے اسے تو معمول پر لے آؤ پھر صفائیاں بھی پیش کر لینا۔" آفتاب بھی ایک کائیاں تھا۔ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ بات کچھ ہے ضرور مگر کیا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا۔

"تمہارے دماغ میں تو شیطان نے گھونسلہ بنا کر رکھا ہے ہمیں ایسی باتوں کے سوا اور سوجھ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر اب اس ناٹک کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔" وہ اتنی بیزاری اور ناگواری سے بولا کہ آفتاب کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ اصل میں وہ اسفند کے خیالات میں بری طرح حارج ہو رہا تھا۔ جونہی وہ چپ ہوا اسفند کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات کی ایک روسی چلنے لگی مس شان کا چہرہ۔ انداز۔ قد و قامت بلکہ پورا سراپا ہی زندہ وجود کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔

وہی چہرہ۔ وہی رنگت۔ وہی سراپا۔ وہی تیکھا سا انداز اور وہی آواز جو اس کے دل میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی چیز بھی تو اس بات کی نفی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ سلوط نہیں ہے۔ اور اگر وہ سلوط سے اتنی زیادہ مشابہت بھی رکھتی ہے تب بھی میں یہی کہوں گا کہ وہ سلوط ہی ہے۔ کیونکہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ اتنا صاف اور صریح دھوکا۔ میں تو ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں بھی اسے پہچان سکتا ہوں۔

وہ خواہ کسی روپ اور کسی بھیس میں بھی میرے سامنے آئے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی آواز بھی ہو بہو وہی ہے۔ ہاں وہ صدفی صد سلوط ہی ہے۔ تبھی تو وہ میرے بلانے کے باوجود میرے پاس نہیں آئی۔ میرا سامنا کرنے سے گریزاں رہی۔ کہ کہیں میں اسے پہچان نہ جاؤں۔ ورنہ اگر وہ مس شان ہی ہوتی تو مجھے دیکھ کر اس قدر چونکتی اور گھبراتی نہیں۔ یوں جلدی سے کترا کر نہ نکل جاتی۔ نہ ہی اس قدر ناگواری اور برہمی کا اظہار ہی کرتی بلکہ بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتی کیونکہ بوقت رخصت میں اس کا شکریہ ادا کرنے ہی تو گیا تھا اسے کاٹنے یا پھاڑنے کی غرض سے تو نہیں۔

یوں بھی یہ عام سی نرسیں بڑی ہنس مکھ اور تھوڑی تھوڑی خوشامدی سی ہوتی ہیں کہ ان کا پیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

اپنی طبیعت پر جبر کر کے دوسروں کی دلجوئی اور خدمت کرنا۔ اور ان کا غم بٹانا۔ مگر وہ سلوط ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے رویے اور الزام تراشی نے اسے مجھ سے سخت بدظن اور متنفر کر دیا ہے لیکن تعجب ہے اس قدر متنفر ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنا خون دے کر میری جان کیوں بچائی؟

جبکہ میں نے تو اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اب یہ سمجھ لوں کہ اس نے انجانے میں ہمدردی کے جذبے سے زیر ہو کر اور میری بے بسی اور بے کسی پر ترس کھا کر مجھے اپنا خون دیا تھا تو یہ میری بیوقوفی ہی ہو گی۔ اس نے یقیناً زخمی حالت میں دیکھ کر مجھے پہچان لیا ہو گا۔ مگر وہ یہاں سرگودھا تک آئی کیسے؟ کیونکہ جبکہ لفافے پر تو کراچی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

اور پھر دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے اور مجھے گھر سے نکلے۔ ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی تو گھر چھوڑا تھا اور اتنے قلیل ترین عرصے میں وہ یہاں سرگودھا بھی پہنچ گئی اور میرے یہاں پہنچنے سے قبل وہ ملازمت پر بھی لگ گئی۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔؟

پھر وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ سلوط کو اس کا گھر چھوڑے آخر کتنے دن ہوئے ہیں۔

اس کے جانے کے اگلے ہی دن وہ گھر کو خیرباد کہہ کر ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے پورا ایک ہفتہ گزارا تھا۔ کراچی سے ملتان اور ملتان سے لاہور تین روز سفر میں گزارے تھے اور تین ہفتے لاہور میں۔ سرگودھا میں قیام کے علاوہ گویا چونتیس دن اور اسی چونتیس دن کے عرصے میں وہ طویل فاصلے پھلانگ کر کراچی سے سرگودھا بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی ہسپتال میں اس کی انٹری سے بہت پہلے۔

کیونکہ وہ وہاں پہلے سے ہی ملازمت کر رہی تھی۔

مگر وہ کس طرح اور کس کے ساتھ آئی۔؟ اور اسے ہسپتال میں اتنی جلد ملازمت کیسے مل گئی؟ کیا اس نے پہلے سے نرسنگ کی ٹریننگ لے رکھی تھی یا کسی کی خاص سفارش پر اسے ہسپتال میں ملازم رکھا گیا ہے۔؟

اور وہ رہتی کہاں ہے۔؟ کس کے پاس رہتی ہے؟

ان۔ اس قسم کے سینکڑوں سوالات تھے جو اس کے ذہن میں کلبلا کلبلا کر ایک ڈنڈ سی مچا رہے تھے۔ وہ سوالات کی اس یلغار تلے دبا گم صم سا بیٹھا تھا۔ یوں جیسے جیپ میں موجود ہی نہ ہو۔ آفتاب بار بار کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے جیپ کی رفتار بھی دھیمی کر رکھی تھی۔ ورنہ اس کے دوست اور کولیگ کیپٹن احتشام کا گھر چھاؤنی میں ہی تھا۔

اور چھاؤنی یعنی کینٹ ایریا ہسپتال سے کل چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اصل میں تو آفتاب یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا دوست ایک عام سی نرس کو دیکھ کر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی فطرت مزاج بلکہ ٹھوس کردار سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا دوست آجکل کے چھچھورے نوجوانوں کی طرح خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر پھسل جانے کا عادی نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت معزز۔ باوقار۔ مستقل مزاج اور معتبر سا انسان ہے۔ اعلیٰ نسب بھی رکھتا ہے اور حیثیت بھی۔

بہرحال وقت کم تھا اور آفتاب کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ اپنے کمپنی کمانڈر سے حادثے میں بری طرح زخمی ہو جانے والے کزن کو ہسپتال سے گھر لے کر آنے کا عذر کر کے ہی تین گھنٹے کی چھٹی لے سکا تھا۔ اس لیے کیپٹن احتشام کے بنگلے پر اسے اتار کر۔ بلکہ احتشام کے بھائی سے اس کا تعارف کرا کے اس کی رہائش کے لیے مختص کیے گئے کمرے میں چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔

وہ بھی خدا سے یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے تنہائی اور یکسوئی نصیب ہو تو وہ سارے معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

اصل میں اپنے تئیں یہ یقین دلانے کے باوجود بھی کہ مس شان اصل میں سلوط ہی ہے اسے کلی طور پر اطمینان نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ حالات اور کوائف ہی کچھ ایسے تھے۔

اور پھر وقت کا دائرہ درمیان میں حائل ہو رہا تھا۔ دل تو یہی گواہی دے رہا تھا کہ بلاشبہ وہ سلوط ہی ہے۔ لیکن دماغ دل کی اس گواہی کی نفی کرتا نظر آ رہا تھا۔ حالات بھی تو کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ ان سارے واقعات کا انحصار۔ اتفاقات۔ حادثات۔ معجزات اور کرشمات پر ہو کر رہ گیا تھا۔

یعنی اس کا مرنگ تک آنا اور پھوپھا پھوپھی سے ملنا تو اتفاقات پر ہی منحصر تھا۔ اور اس کے نزدیک یہ کوئی ایسا معجزہ یا کرشمہ نہیں تھا کیونکہ دنیا میں آئے دن ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مگر یہ اس کا سرگودھا آتے ہوئے ایک حادثے سے دوچار ہو جانا اور ایک ایسے ہسپتال میں داخل ہو جانا جہاں انسان دوستی میں نرس مس شان کا اسے خون دینا اور پھر۔ اس کی سلوط سے اتنی زیادہ مشابہت کہ ایک کو چھپا دو اور دوسری کو سامنے کر دو۔

پھر بھی دیکھنے والا اس میں کوئی خامی۔ کوئی فرق نہ تلاش کر سکے۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس نے پڑھا ہی نہیں سن اور دیکھ بھی رکھا تھا کہ جڑواں بچوں میں آپس میں بہت مشابہت ہوتی ہے۔

بعض میں اتنی کہ ان کی علیحدہ علیحدہ شناخت کے لیے۔ کوئی نہ کوئی شناختی نشان لگانا پڑتا ہے اور اتنی زیادہ مشابہت صرف جڑواں بچوں میں ہی ہوتی ہے۔ اوپر تلے کے بہن بھائیوں میں اگر ہوتی بھی ہے تو اتنی زیادہ نہیں۔ اور ایسے لوگ جن کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا۔ جن کی قومیت بھی جداگانہ ہوتی ہے اور وطن بھی۔ ان کی بھی اگر آپس میں مشابہت ہوتی ہے تو اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ اس مس شان اور سلوط میں تھی۔

جب کہ وہ پھوپھا کی زبانی یہ بھی سن چکا تھا کہ ان کی دوسری بیوی کے بطن سے صرف اور صرف سلوط ہی تولد ہوئی تھی۔ گویا اس کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری جڑواں بہن بھی ہو سکتی ہے۔ اس نکتے پر غور کرتے کرتے وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ خود جا کر مس شان سے ملے گا اور یہ معلوم کر کے ہی دم لے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ ایک آس اسے یہ بھی بندھ گئی تھی کہ اگر وہ واقعی سلوط ہی ہے تو پھر اس کے لیے تو مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔

چینگ تو بہت معمولی سی بات تھی۔ اسفند کو تو ایک بیقراری سی تھی کہ نہ اُٹھتے چین نہ بیٹھتے چین بس ایک ہی خیال ایک ہی تصور، ایک ہی دھن کہ بس کسی نہ کسی طور پر مس شان کی اصلیت کو دریافت یا دوسرے معنوں میں اس کی اصلیت کا پردہ چاک کر کے سلوط کو برآمد کر لے۔ گویا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح مس شان کو سلوط ثابت کر کے دکھائے۔

ان دنوں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ پھوپھا سے وعدہ کر کے آنے کے بعد سلوط کی طرف سے اس کا امپریشن بہت خراب ہو گیا تھا یا اس کے بارے میں کیسے خیالات تھے۔ جن کے پیش نظر وہ سلوط کو کھوج نکالنے میں لیت لعل سے کام لے رہا تھا۔

جبھی تو لفافے پر کراچی کی مہر دیکھ کر اس خیال سے وہ لاپروا سا ہو گیا تھا کہ کراچی جیسے غدار شہر میں جو سمندر کی سرکش لہروں کی طرح چھوٹی بڑی ہر شے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے سلوط کو آسانی سے ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہ تھا۔ البتہ جب وہ کراچی واپس لوٹے گا تو اسے ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اور اس کا اصل سبب یہی تھا کہ اس کے دل سے سلوط کے حصول کی لگن جاتی رہی تھی۔ وہ تو حالات کشاں کشاں اسے سرگودھا لے آئے تھے اور اس اتفاق پر تو وہ صدقِ دل سے کرشمہ قدرت اور معجزات پر ایمان لے آیا تھا۔

اسے اسپتال سے آفتاب کے دوست کے گھر آئے دو روز ہو گئے تھے۔ اور جب سے بارہا وہ ان حالات پر غور کر کر کے واقعات کی کڑیاں جوڑتا رہا تھا۔

جس روز وہ کیپٹن احتشام کے گھر آیا اس سے اگلے روز اپنی شدید مصروفیت کی وجہ سے آفتاب اس سے ملنے نہیں آ سکا تھا۔ اس نے فون پر اس سے معذرت بھی کر لی تھی۔ مگر اس سے اگلے روز بھی اس کے آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کیونکہ اس کی راہ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی تھی وہ چاہتا تو خود بھی اسپتال جا سکتا تھا۔ مگر اسپتال جانے کا ایک تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ٹخنے پر جو بینڈیج بندھی ہوئی تھی وہ ہڈیوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے ہی باندھی گئی تھی اور اس کے کھلنے یا تبدیل کیے جانے کا فی الوقت کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

جبکہ چلنے پھرنے میں اسے کوئی تکلیف یا دقت بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس کبھی کبھی پیر زمین پر ٹکاتے وقت درد کی ہلکی سی چبھن ضرور محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ کوئی ایسی قابل تشویش بات نہیں تھی۔

دوسرے وہ آفتاب کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ آفتاب کو نہ صرف بات کرنے کا ٹکٹ آتا تھا بلکہ وہ اسپتال کے عملے سے خاصا گھل مل بھی گیا تھا۔ (کہ اس کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی) اور اگر وہ مس شان کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچا سکتا تھا تو اسی کے ذریعے پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو مس شان سے ملنے اور اسے غور سے دیکھنے کو مچلا جا رہا تھا۔ بس یہی ایک اشتیاق ہی ایک آرزو تھی جس نے اسے کیپٹن احتشام کے گھر کے اجنبی سے ماحول میں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ تو ایک دن بھی سرگودھا میں رہنے کا روادار نہ ہوتا۔

کیونکہ مس شان اس کی راہ میں ایک رکاوٹ سی بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور وہ اس کا معمہ حل کر کے ہی وہاں سے جا سکتا تھا۔ بہر حال پورا دن گزار کر کہیں بعد مغرب آفتاب نکل کے آیا تھا اس نے آتے ہی گزشتہ روز نہ آسکنے کی گویا صفائی پیش کی۔

”ویری سوری یار پرسوں ڈیوٹی پر واپس پہنچتے ہی کچھ ایسے اہم کام سر پر ڈال دیے گئے کہ پلک جھپکانے کی بھی مہلت نہیں ملی یقین کرو دو راتوں سے سویا ہی نہیں۔ آج تین بجے کے قریب کہیں جا کر فرصت ملی تو اتنا تھک گیا تھا کہ میں پہنچتے ہی وردی اور جوتوں سمیت ہی پڑ کر سو گیا۔ اب آنکھ کھلی تو بس لباس تبدیل کر کے سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔“

اور وہ جس کا موڈ آفتاب کا انتظار کرتے کرتے نہ صرف آف ہو گیا تھا بلکہ اس اجنبی ماحول میں تنہا بیٹھے بیٹھے وہ بوریت کا شکار بھی ہو گیا تھا پھولے پھولے منہ کے ساتھ نروٹھے سے انداز میں بولا۔

”جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو کم از کم میرے سامنے تو تمہیں کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمہارے فرائض کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوں۔“

”اچھا اگر واقف ہی ہو تو پھر تمہارے رخ روشن پر یہ اتنی موٹی چربی کی تہہ کیوں جمی نظر آ رہی ہے اس پر انداز تکلم بھی ایسا جیسے کورے مٹکے میں پتھر بھر کر کوئی اسے ہلا رہا ہو۔“ آفتاب نے اسے منہ پھلائے دیکھ کر پوچھا۔

”چربی کی تہہ میرے چہرے پر نہیں تمہاری آنکھوں پر چڑھ گئی ہے تبھی تو ساون کے اندھے کی طرح تمہیں ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے ورنہ میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں اب تمہیں دیکھ کر ٹھمکا لگانے سے تو رہا تھا۔“ اسفند نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔

”ہا ہا ہا یہ ٹھمکا بھی خوب کہا تم نے۔ گویا رقص کے فن پر بھی تمہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ واہ کیسے مٹک کر ٹھمکا کہا ہے۔ واہ جواب نہیں اس ادا کا بھی۔“ آفتاب ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ اب آفتاب کو اس کی ناراضگی کا اصل سبب تو معلوم نہ تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی دو دن کی غیر حاضری نے اسے ناراض کر دیا ہے۔ اسفند نے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا۔ بس اس پر ایک جلتی سلگتی نظر ڈال کر رہ گیا۔

”ارے یار جب میری مجبوری سے واقف ہی ہو تو پھر اتنا تیہاؤ کھانے کی کیا ضرورت ہے جانتا ہوں کہ اس اجنبی اور نئے سے ماحول میں تنہا رہ کر تم نے بڑی کوفت اُٹھائی ہو گی۔ مگر خیر اب تو میں فارغ ہوں کل عام تعطیل ہے اور پرسوں بھی سمجھو چھٹی ہی ہو گی اس کے بعد پورا نہیں تو کم از کم آدھا دن بلکہ آدھی رات تو تمہارے ساتھ ہی گزرا کرے گی۔“ آفتاب اسے اس قدر چیں بجبیں دیکھ کر بولا۔

”ہونہہ آدھا دن اور آدھی رات۔ جیسے میں ساری زندگی یہیں گزارنے آیا ہوں۔ پتا نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو مجھے بیٹھے بٹھائے یہاں آنے کی سُوجھی تھی۔ جو یہاں آ کر ایسا پھنسا کہ آج بیس بائیس روز ہو گئے اور کوشش کے باوجود یہاں سے نکل ہی نہ سکا۔ مگر اب ایک دن بھی مزید مجھے یہاں گزارنا گوارا نہیں میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ اسفند بگڑے بگڑے انداز میں بولا۔

”اچھا تو کیا تمہارے ٹخنے کی چوٹ ٹھیک ہو گئی ہے۔“ آفتاب نے واپسی کے لیے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر اسے ٹخنے کی تکلیف کا احساس دلایا۔

”ٹخنے کی چوٹ کوئی ایسا مشکل یا تشویش ناک مسئلہ نہیں ہے۔ جونہی ہڈی اپنی جگہ پر جم جائے گی بینڈیج بھی کھول دی جائے گی اور یہ کام کراچی میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ زیادہ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔“ اس نے بیزار کن سے لہجے میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو تمہارے سر کے ٹانکے بھی خشک نہیں ہوئے۔ تمہیں جانے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ کرنل عارف کو دکھا دینا چاہیے تھا۔ اور چلنے پھرنے میں تمہارے پیر میں تکلیف تو نہیں ہوتی۔“ آفتاب چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے وہ اپنے دوست کو جانے سے باز رکھے۔

”نہیں۔ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ سر کے ٹانکے بھی آدھے سے زیادہ خشک ہو کر جھڑ چکے ہیں۔ اور اگر نہ بھی جھڑے ہوں گے تب بھی میں یہاں سے جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔“ اسفند اٹل سے لہجے میں بولا۔

”خیر تمہاری مرضی۔ ورنہ میں نے تو ایک قاعدے کی بات کہی تھی۔ کہ ایک تو تم خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہو۔ دوسرے جانے سے پہلے تمہیں کم از کم کرنل عارف اور سرجن افتخار وغیرہ کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا۔ جنہوں نے تمہیں بچانے کے لیے ایڑی اور چوٹی کا زور لگا دیا تھا بلکہ دوسرے معنوں میں دن کو دن سمجھا تھا نہ رات کو رات۔“ آفتاب نے کہا۔

”خیر ان دونوں سرجنز کا ہی نہیں بلکہ تقریباً پورے ہی عملے کا شکریہ میں پرسوں وہاں سے روانگی کے وقت ادا کر چکا ہوں اور جہاں تک میری جان بچانے کا سوال ہے تو وہ اللہ تعالیٰ نے ایک نرس کے دل میں میری ہمدردی اور رحم ڈال کر بچائی تھی۔ ویسے بھی موت اور زیست خدا کے ہی اختیار میں ہوتی ہے۔ کسی بندے میں اتنی تاب اور مجال نہیں کہ وہ کسی کو مار یا جلا سکے۔“ اسفند بولا۔

”خیر یہ تو ایک جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ موت و زیست خدا کے اختیار میں ہی ہوتی ہے۔ مگر موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی طرف لے جانے کا فرض بھی خدا نے بندے کو ہی سونپا ہے۔ ورنہ ایکسیڈنٹ کے بعد جو حالت تمہاری ہو گئی تھی اگر ایسی حالت میں تمہیں یونہی چھوڑ دیا جاتا یعنی فی سبیل اللہ تو پھر آج تم یوں ہٹر ہٹر باتیں کرتے نہ نظر آتے۔ ویسے یار ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تم نے اپنے شوق سے یہ میڈیکل لائن اختیار کی تھی یا محض اپنے والدین کی دیرینہ خواہش پر یہ لائن اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔“ آفتاب اس کی باتوں پر قدرے جزبز سا ہو کر بولا۔

”کیوں بھئی یہ خیال تمہیں کیوں آیا۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا شروع سے رجحان ہی اس طرف تھا۔ اور پھر میں کسی پریشر میں آ کر وہ بھی سبجیکٹ کا چناؤ کرنے میں تو کسی کا بھی دخل برداشت نہیں کر سکتا تھا یوں بھی میں نے جتنا پڑھا ہے اپنے شوق سے ہی پڑھا۔“ وہ بھی قدرے چمک کر بولا۔

”تو پھر میں یہی کہوں گا کہ تم نے اتنا کچھ پڑھ کر محض گدھوں پہ ہی لادا ہے۔ تبھی تو ڈاکٹر ہو کر تم ایسی باتیں کر رہے ہو جو صرف اَن پڑھ ہی کر سکتے ہیں۔“

آفتاب نے کہا۔ اور اسفند نے سوچا کہ اس نے آفتاب کی اسپتال جانے کی اچھی خاصی تجویز کو رد کر کے سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے ورنہ اتنا اچھا موقع ملا تھا مس شان تک رسائی کا۔ اب بھلا اس سے کیونکر کہے کہ میں تو تمہارے انتظار میں اپنی غرض سے بیٹھا تھا کہ کب تم آؤ اور کب میں کسی نہ کسی بہانے سے اسپتال پہنچوں۔

”یار یہ بے ثباتی اور بے مروتی کم از کم تمہارے پیشے سے تو مطابقت نہیں رکھتی۔ تمہیں تو بہت خلیق۔ بہت مخلص اور منکسر المزاج ہونا چاہیے۔“ اسے خاموش دیکھ کر آفتاب سمجھا کہ اس نے اپنی باتوں سے اسے قائل کر دیا ہے۔

”اوہو بھئی آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا یہی کہ میں کل اپنا جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں تو یہ ممکن ہی نہیں۔“ اس نے دانستہ تھوڑا سا چڑ کر کہا۔

”خیر ممکن اور ناممکن کی بات تو رہنے ہی دو کیونکہ ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ انسان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا دوسری کی مرضی سے۔ لیکن میں اب تمہیں روکوں گا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنا چیک اپ ضرور کرا لو۔“ آفتاب بولا۔

"مگر اب وقت ہی کہاں رہا ہے چیک اپ کرانے کا۔ صبح میں جا رہا ہوں اور اس وقت رات ہو گئی ہے۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے آفتاب کی باتوں سے زچ ہو گیا ہو۔

"رات ہو گئی ہے تو کون سی ایسی آدھی یا تین چوتھائی رات ہوئی ہے۔ ابھی تو مغربی افق پر شفق کے رنگ بھی نہیں دھندلائے۔ یہ کہو کہ تم جانے کے موڈ میں نہیں ہو۔" آفتاب اس کے اوپر ڈر سے پکڑتے پر چڑ کر بولا۔

"ارے نہیں یار موڈ موڈ کیسا۔ کہیں نا کہیں تو چلنا ہی ہے تو پھر چلو اسپتال ہی چلے چلتے ہیں۔" اس نے مزید انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسپتال جانے کے لیے آمادگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"او گڈ۔ تو چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" آفتاب نے اس کی آمادگی پر خوش ہو کہا۔

"ہیں تیار ہو تا گیا ہے۔ میں کوئی بر دکھوے کو تو جا نہیں رہا۔ بس اسی پینٹ اور شرٹ میں چلا چلتا ہوں۔ بہت ہوا تو اس پر کوٹ پہن لوں گا۔"

"ہاں کوٹ ضرور پہن لو کیونکہ گلابی جاڑا شروع ہو چکا ہے اور خنکی بھی بڑھ گئی ہے۔" آفتاب نے کہا تو اس نے اٹھ کر کوٹ پہنا اور چپ چاپ آفتاب کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھ کر اسپتال کا رخ کیا۔

وہ بڑے مخمصے میں پڑ گیا تھا یعنی آفتاب کے ساتھ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن دل کی بات اسے نہیں بتا سکا تھا۔ اور پھر اس نے تو آفتاب پر ظاہر بھی یہی کیا تھا کہ اسے اس وقت اسپتال کی کوئی احتیاج ہے نہ دلچسپی۔ اس کے باوجود بھی وہ چاہ رہا تھا کہ آفتاب کے ذریعے مس شان سے ملے اور اسی کی وساطت سے مس شان سے بات کرے۔ مگر ایسا کرے تو کیونکر کرے۔ کیونکہ اسے کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہ تھا کہ سلوط سے اپنے تعلق کو بیان کرنا تو بڑی بات وہ سلوط کا نام بھی اس کے سامنے لے۔ کہ یہ اس کا اور اس کی پھوپھی کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اور آفتاب کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا وہ اپنے وقار کے منافی سمجھتا تھا۔

ویسے بھی بھلا وہ سلوط سے متعلق ساری تفصیل کیونکر بیان کر سکتا تھا۔ آفتاب سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس کے پھوپھا کی بہن یا پھر صحیح معنوں میں بیٹی گھر چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گئی تھی وہ بھی اس کے گھر سے بلکہ خود اسی نے اسے گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اس ضمن میں باقی تمام واقعات بھلا وہ کیسے اسے بتا تا کہ میں مس شان کی خوبصورتی پر نہیں مر مٹا بلکہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ کیا وہ سلوط ہی ہے اور اسی لیے بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر تھا کہ تم آؤ اور تمہارے ساتھ چل کر مس شان کی اصلیت کا پتا چلاؤں۔ اور اسی جستجو نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ میں حقیقت معلوم کیے بغیر یہاں سے جا ہی نہیں سکتا۔ وہ تو بس تمہاری دو دن کی غیر حاضری پر خفگی کا ایک اظہار تھا۔ ورنہ میرا تو دور تک بھی واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔

گو مگوں سی کیفیت میں مبتلا وہ یہی سوچے جا رہا تھا کہ آفتاب کو کن الفاظ اور معنوں میں اپنے اسپتال جانے کا مقصد سمجھائے۔ آخر بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے موضوع نکالا۔

"یار یوں تو تقریباً ہر اسپتال کا عملہ ہی فرض شناس اور مستعد ہوتا ہے لیکن — اس اسپتال کے عملے کے خلوص، اپنائیت اور توجہ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور خاص طور پر نرس شان سے جس نے مجھے اپنا خون دے کر زندگی کی طرف لوٹا دیا۔ اصل میں تو شکریہ مجھے اس کا ادا کرنا چاہیے۔"

"لیکن تم نے اس کا شکریہ ادا تو کر دیا اب کتنی بار کرو گے آخر جبکہ وہ تو ایسی بگڑی جیسے تم نے کوئی بے جا بات کہہ دی ہو۔" آفتاب بولا۔

"لیکن میں نے تو اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ وہ تو تم نے ہی بیچ میں کود کر نہ جانے کیا انٹ شنٹ بک دیا تھا تبھی تو اس کی تیوری ایک دم ہی چڑھ گئی تھی۔" اسفند نے کہا۔

"لو یہ اور ہوئی۔ ارے گھاس تو اس نے تمہیں نہیں ڈالی تھی۔ اس پر اسے دیکھ کر تمہاری سٹی ہی گم ہو گئی تھی آخر مجھے ہی بیچ میں کودنا پڑا تھا اور میں نے اس سے کون سا ایسا اظہار عشق کیا تھا صرف تمہارے آنے کی غرض و غایت ہی تو بیان کی تھی۔"

"او ہاں ہاں یہ تو تم نے اچھا ہی کیا تھا۔ مگر میں خود اپنی زبان سے ایک مرتبہ اور اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بقول اگر وہ ایک معمولی سی نرس بھی ہے تب بھی ہر مرد پر عورت کا احترام کرنا واجب ہے۔ خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو اور اس نے تو مجھ پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اسپتال پہنچ کر سب سے پہلے ہی اس کا شکریہ ادا کروں گا۔" اسفند نے آخر اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔

"ہا ہا ہا تو یہ کہو کہ اس کے تیر نظر نے تمہیں گھائل ہی کر کے چھوڑا۔ ویسے وہ جو انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔

Love at first sight saves lot of money and time.

پہلی نظر کی محبت میں پیسہ بھی بچتا ہے اور وقت بھی، تو تمہارے لیے تو یہ بہت سود مند رہے گا۔ یعنی خیال برا نہیں ماسوا اس کے کہ وہ لڑکی تمہارے طبقے سے میل نہیں کھاتی۔"

آفتاب نے ٹھٹھہ مار کر کہا۔ مگر اس کا لہجہ چبھتا سا تھا۔ اور وہ جو نہایت صبر و تحمل سے اس کی بکواس سن رہا تھا۔ اس نے الٹا اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اس لو ٹینڈنسی (LOW TENDENCY) سے اس سے زیادہ اور میں کیا ایکسپیکٹ (توقع کر) سکتا ہوں۔ ورنہ میں تو ایک اخلاقی فریضہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔ اور تم ہو کہ اپنی بھٹکی ہوئی ذہنیت میں بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔"

"اے کاش جیسا کہ تم کہہ رہے ہو یہ بات وہیں تک محدود ہو۔" آفتاب پھر فقرہ کسنے سے باز نہ آیا۔ اسفند نے اس کے اس فقرے کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ اس گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا نہ اہمیت ہی۔ یوں بھی اس نے یہ موضوع آفتاب کو پہلے سے ہموار کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ مبادا عین وقت کے وقت وہ ہتھے سے اکھڑ جائے۔

بہر حال۔ کچھ ہی دیر بعد راستہ تمام ہوا اور وہ دونوں اسپتال پہنچ گئے۔ اندر عمارت میں قدم رکھتے ہی فرش سے اٹھتی فنائل اور دواؤں کی ملی جلی بو نے ان کا سواگت کیا۔

اسپتال کا ماحول بھی وہی تھا جو تقریباً سارے اسپتالوں کا ہوتا ہے۔ وہی مریضوں کی آمد و رفت۔ وہی ادھر ادھر پھرتی نرسیں۔ اسٹریچر اور ٹرالیاں دھکیلتے وارڈ بوائز۔ اکا دکا راؤنڈ لگاتے ہوئے ڈاکٹرز اور وارڈ کے کھلتے بند ہوتے دروازے۔ مگر اس پر بھی ایک سونا سونا پن۔ ایک ویرانی سی۔ یوں بھی اس لمحے اسپتال میں اتنا رش نہیں تھا۔ زندگی کی تحریک اگر رواں دواں تھی تو بہت نپے تلے انداز میں ایک قاعدے کے ساتھ ایک گمبھیر سی خاموشی چہار طرف مسلط تھی۔

"باہر تو کوئی نظر نہیں آ رہا آؤ سرجن عارف کے روم میں چلتے ہیں۔" آفتاب نے ادھر ادھر گھومتی غیر شناسا صورتوں کو دیکھ کر برآمدے کے چکنے اور چمکتے ہوئے فرش پر چلتے ہوئے کہا۔

جبکہ اسے کسی سرجن سے غرض تھی نہ ڈاکٹر سے۔ وہ تو اندر داخل ہوتے ہی ادھر ادھر دیکھ دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ دیکھو اب مس شان ملتی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی ڈیوٹی چینج ہو گئی ہو۔ اور رات کے بجائے صبح ہی تبدیل کر دی گئی ہو۔ یا پھر وہ اندر کسی وارڈ یا روم میں موجود ہو۔ اب بھلا میں اس کی تلاش میں کمرہ کمرہ چھاننے سے تو رہا آفتاب نے اس سے سرجن عارف کے روم میں چلنے کو کہا تو وہ انہی خیالات میں کھویا کھویا اس کے ساتھ سرجن عارف کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور جب وہ دونوں ایک طویل راہداری سے گزر اور ایک نصف سے زیادہ کوریڈور عبور کر کے سرجن عارف کے کمرے تک پہنچے تو باہر بیٹھے ہوئے چپراسی نے ان کا راستہ روک کر بتایا کہ سرجن عارف ابھی تک نہیں آئے اور آج ان کے آنے کا کوئی امکان ہی ہے۔ تب آفتاب نے اسفند سے کہا۔

"چلو پھر واپس چلتے ہیں۔"

"ہاں خواہ مخواہ یہاں آ کر وقت ضائع کیا۔" اسفند بھی بولا کہ اسے مس شان کے ملنے کی بھی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی اور اندر ہی اندر وہ بجھ سا گیا تھا۔ دفعتاً آفتاب نے اسے ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی کنواں آج خود چل کر پیاسے کے پاس آرہا ہے۔ خاصے خوش قسمت ہو تم اس معاملے میں۔"
"بائیں دہاٹ۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔" اسفند۔ اس کے ٹہوکا مارنے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو وہ دیکھو سامنے۔ وہ تمہاری گل اندام ادھر ہی کا رُخ کر رہی ہیں۔" اور اس کی بات پر اسفند نے بہت چونک کر سامنے دیکھا۔ اصل میں دونوں دوست راہداری عبور کر کے پیسج سے ہوتے اس برآمدے میں آگئے تھے۔ جہاں مریضوں کے وارڈ تھے اور سرے پر ڈیوٹی روم۔ اور مس شان شاید ڈیوٹی سے ہی نکلی تھی اس کا رُخ ان دونوں کی طرف ہی تھا۔ اسے دیکھ کر اسفند کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

قدرت اس پر اس قدر مہربان بھی ہو سکتی ہے اسے یقین ہی نہ آیا۔

اصل میں وہ اس قدر غیر متوقع اس وقت نظر آئی تھی جب وہ اس طرف سے مایوس ہو کر واپس جارہا تھا۔

وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ اور آفتاب کو پیچھے ہی چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور وہ جو اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر جلدی سے دوسری طرف گھوم کر واپس جانے لگی تھی۔ وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے قریب جا کر بولا۔

"سنیے مس شان میں آپ سے۔" تو اس نے گھڑی بھر کو رک کر اس کی طرف گھومے بغیر بڑے درشت لہجے میں کہا۔

"میں اس وقت سخت مصروف ہوں آپ پلیز میرا ٹائم ویسٹ نہ کیجیے۔" اور اتنا کہہ کر وہ بڑی سرعت سے چلتی ایک وارڈ میں گھس گئی۔ اور وہ اپنا سا منہ لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے مس شان نے گھاس نہیں ڈالی۔ تبھی تو تم ریوڑ سے بچھڑ جانے والے مینڈھے کی طرح ایک دم بے کسی کا اشتہار بنے نظر آرہے ہو۔ مگر خیر ہمت نہیں ہارتے دیر آید درست آید۔" آفتاب نے جو اسے مس شان کی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی جگہ پر ہی رُک گیا تھا۔ اچانک پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو بری طرح چونک کر اس نے اپنے شانے پر رکھا اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔

"ہونہہ بھی تمہیں تو سوائے اول فول بکنے کے کچھ آتا ہی نہیں۔ ورنہ اس کی کیا مجال جو مجھے گھاس نہیں ڈالے ایک بیچی سی نرس۔ مائی فٹ۔" اس وقت تو نہیں مگر آفتاب کے کہنے پر ہی اسے اپنی اور شان کے درمیان حیثیتوں کے فرق اور اس کے ہاتھوں خوار ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس لیے وہ ایک دم ہی کھول اُٹھا تھا۔

"ہیں ہیں اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بات کیا ہوئی کچھ تو بتاؤ۔" آفتاب نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"بات کیا ہوتی۔ اسی روز کی طرح نخرہ دکھا کر گئی ہے۔ مگر خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ اب چلتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ آفتاب مزید کوئی سوال کرے اسفند نے جلدی سے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ پھر جیپ میں بیٹھنے کے بعد بھی خاموش خاموش سا رہا۔ جبکہ آفتاب بہت کچھ تاڑ گیا تھا اور بہت کچھ کہنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اسفند کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کہ اس سے کچھ اگلوانا تو کجا۔ اس معاملے کو زیادہ کریدنے پر وہ اس سے خفا ہو جائے گا۔ وہ اس کا موڈ بحال کرنے کی غرض سے اسے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔ موضوع بدلا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔

اس کے باوجود بھی اسفند اُلجھا اُلجھا سا رہا۔

پھر آفتاب اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر صبح آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور وہ شب خوابی کا لباس تبدیل کیے بغیر۔ بڑی دیر تک بیٹھا۔ اپنے اس حد تک گر جانے پر کھولتا ہی رہا۔

آخر مجھے کیا ضرورت تھی اس قدر بے قابو ہو جانے کی کہ اسے دیکھ کر بلا سوچے سمجھے اس کی طرف دوڑ ہی پڑا۔ اور نتیجے میں منہ کی کھائی کس قدر ذلیل ہوا ہوں میں خود اپنے ہاتھوں۔ آفتاب بھی کیا سوچتا ہوگا کہ میں کس قدر گیا گزرا انسان ہوں۔ کہ اتنی اعلیٰ حیثیت اور نسب رکھتے ہوئے بھی ایک معمولی سی نرس کی خوبصورتی پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ آخر میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ میری بھی ایک مستحکم اور اعلا شخصیت ہے۔ میں معاشرے میں ایک اونچا مقام رکھتا

ہوں۔ اور ذاتی طور بھی اونچا ہوں۔ اب آفتاب کو یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ غیر معمولی حد تک سلوط سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور میں یہی معلوم کرنے کی غرض سے اسے اتنی اہمیت دے رہا ہوں۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ عمر کے تقاضے اور جوانی کے جوش نے مجھے اس کی طرف مائل کر رکھا ہے۔ اور اس کی یہ سوچ کچھ غلط بھی نہیں کہ ظاہری طور پہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ اگر کوئی اور بھی دیکھتا تو یہی سمجھتا۔ تبھی تو وہ اپنی دانست میں وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے جلی کٹی سنا تا رہتا ہے۔ تف ہے ایسے جذبے پر اور لعنت ہے ایسی سوچ پہ۔ اب سلوط خواہ ساری عمر ہی نہ ملے میں تو اس کے پیچھے خود کو خوار نہیں کروں گا۔

یہی سب سوچتے ہوئے اس نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ اور انہی خیالات میں اُلجھے اُلجھے وہ سونے کی غرض سے لیٹ گیا۔ چند کروٹیں لیں۔ اور سلوط کی تلاش سے بری الذمہ ہونے کے بعد۔ ذہن کو کچھ سکون ملا تو اس نے ٹھنڈے دماغ سے پھر سوچنا شروع کیا۔

نہ دل۔ دماغ کا ساتھ دے رہا تھا نہ دماغ سے کیے گئے فیصلے کی تائید کر رہا تھا۔ بلکہ اسے سختی سے ڈانٹنے اور دھتکارنے کے باوجود چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ بلاشبہ مس شان سلوط ہی ہے۔ بڑے ٹھوس دلائل پیش کر رہا تھا کہ اگر مس شان سلوط نہ ہوتی تو بھی اس کی کبھی یہ مجال نہ ہوتی کہ اتنی حقارت سے اسے نظر انداز کر دے۔ اس کے سلوط ہونے کے اگلے اور پچھلے سارے ثبوت پیش کر رہا تھا۔

اسے سلوط کا رویہ۔ اس سے روگردانی کرنا۔ اس کے سامنے پڑنے سے کترانا۔ اور سب سے بڑھ کر اپنا خون دینا۔ اور اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس سے سامنا ہونے میں سخت ناگواری اور برہمی کا اظہار کرنا۔ اور ابھی چند گھنٹے بیشتر اس بری طرح اسے دھتکار دینا۔ ہر ثبوت ہر دلیل۔ اس کے سلوط ہونے کی تصدیق کرتی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ غلطی اصل میں اس کی تھی۔

اس نے اگر آفتاب کو اتنا ہی بتا دیا ہوتا کہ وہ مس شان کی خوبصورتی پر نہیں مرمٹا بلکہ اسے ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو ہو بہو مس شان کی ہمشکل تھی۔ اور اسے مس شان پر اس لڑکی کا شبہ ہے۔ اور اپنے اس شبے کو یقین میں بدلنے کی کوشش میں وہ مس شان تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور بس۔ تو پھر بات اتنی نہیں گرتی۔ یا پھر کم از کم آفتاب کا امپریشن اس کی طرف سے خراب نہ ہوتا۔

اسے ملال تھا تو صرف اس بات کا کہ آفتاب کے سامنے اس کی پوزیشن کس قدر آکورڈ ہو گئی ہے۔

اصل میں تو دل کی پکار پر اس نے یہ مصمم ———— فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سلوط کو مس شان کے خول سے نکال کر رہے گا۔ خواہ اس کوشش میں اسے کتنا ہی خوار کیوں نہ ہونا پڑے۔ اور پھر جو کچھ اس نے سوچا تھا اس میں خوار ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس معاملے میں آفتاب کا تعاون حاصل کیے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ اس شش و پنج میں تھا کہ آفتاب سے کیا کہہ کر اسے اس معاملے میں شامل کرے کہ وہ کسی قیمت پر بھی سلوط کے اتنے آسانی سے ہاتھ آجانے کا موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

گویا اب مس شان کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا تھا اور اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ سلوط ہی ہے یوں بھی دل میں چھپی سلوط کی محبت نے اسے کچھ اتنا بے کل سا کر رکھا تھا کہ اس نے وہ پوری رات کچھ سو کر اور کچھ جاگ کر کاٹی تھی۔

اگلے روز وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ آفتاب اُسے لینے آپہنچا۔ پروگرام تو کوئی خاص نہیں تھا۔ پھر بھی یہ دونوں گھومنے پھرنے کی غرض سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تو اِدھر اُدھر باتیں کرتے رہے پھر اسفند نے کسی خیال کے تحت آفتاب سے پوچھا۔

"ہاں وہ تمہاری لینڈ روور سا اس کا کیا بنا۔؟"

"پھر تا۔" آفتاب بولا۔

"اوہ ویری سیڈ ـــ گویا بالکل ہی ناکارہ ہو گئی۔" وہ تاسف سے بولا۔

"نہیں خیر اتنی ناکارہ تو نہیں ہوئی۔ صرف انجن کی باڈی پچک گئی ہے۔ اور باڈی کی دونوں سائیڈز پر بھی ڈینٹ آیا ہے۔ اور ڈیش بورڈ کے اوپر کا شیشہ بھی چکنا چور ہو گیا ہے۔ ویسے انجن اور ٹائر وغیرہ ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"مگر انجن وغیرہ ٹھیک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ساری شو تو ختم ہو گئی تمہاری برانڈ نیو گاڑی کی ۔ اور اتنا زیادہ نقصان بھی ہوا۔" اسفند خجالت سے بولا۔

"ہاں نقصان تو بہت ہوا ہے۔ ظاہر ہے نئے سرے سے آگے کی باڈی بنوانے ۔ ڈینٹ بھروانے اور سیٹس کو جڑوانے میں خاصی رقم خرچ ہوئی ہے۔ لیکن اپنی جیب سے تو کچھ نہیں گیا۔ سب کچھ انشورنس والوں نے بھگتا ہے۔ لہٰذا اب تم یہ کہنا کہ اس نقصان کو میں پورا کروں گا۔" آفتاب نے کہا تو وہ چپ سا ہو گیا۔ کیونکہ حقیقتاً وہ یہی چاہ رہا تھا کہ گاڑی کا جتنا نقصان ہوا ہے اُسے وہ پورا کرے۔

"کیوں بھئی مس شان کے گرد اب تک کتنے چکر لگائے ہیں تم نے۔" آفتاب نے اسے خاموش اور کھویا کھویا سا دیکھ کر پوچھا۔

"میں تم سے ایک مشورہ لینا چاہ رہا تھا آفتاب۔" اس نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

"ہیں کہیں جذبۂ دل کے بارے میں تو نہیں ہو گا وہ مشورہ۔

خیر شکر ہے تم کچھ ڈھب پر تو آئے ــــ اماں ہم تو ایسے فیاض ہیں کہ دور سے ہی مریض کی شکل دیکھ کر مرض کی تشخیص کر دیتے ہیں۔" آفتاب کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نہایت غیر سنجیدہ موڈ میں ہے۔

سخت کوفت کے باوجود اسفند کو ہنسی آگئی۔ مگر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔

"بات اتنی آگے بڑھ گئی ہے دوست کہ میری سمجھ ہی ناکارہ ہو کر رہ گئی۔" اسفند نے گویا تمہید باندھنی چاہی۔ مگر آفتاب بیچ میں بول اٹھا۔

"وہ تو ظاہر ہے۔ اپنی سمجھ تو تم مس شان کی چراگاہ میں چھوڑ آئے ہو۔ خیر فکر کرنے کی ضرورت نہیں ایسے مرحلوں پہ بات اس سے بھی کہیں زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے۔"

"جہنم میں جاؤ ــــ میں کچھ نہیں بتاتا ــــ میں نے خواہ مخواہ ہی بھینس کے آگے بین بجانی شروع کر دی تھی۔" اسفند جل کر بولا۔

"یعنی اب ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ کر کیا تمہارا کام یہی رہ گیا ہے۔ کہ بھینسوں کے آگے بین بجاتے پھرتے ہو۔ تچ تچ نوبت بہ اینجا رسید لیکن اسقدر گرمی تو نہ دکھاؤ۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں اکثر و بیشتر منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کو بقول تمہارے اُلٹی سیدھی بکواس کر لیا کرتا ہوں۔ پھر اس میں اس قدر بسکنے کی کیا بات ہے۔" اور ظاہرہ نہیں مگر اس کی بات پر دل میں قائل ہو کر اسفند نے بھی سوچا کہ اس کی تو فطرت میں مزاح ہے۔ اسے اس کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔

"ہاں تو ارشاد ــــ" آفتاب کا تجسس بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے اسے خاموش سا دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"ارے بس ارشاد ارشاد کیا۔ میں اصل میں اس نرس مس شان کے بارے میں بڑا پزلڈ ہو گیا ہوں۔ تم نے تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس روز جب میں اس سے بات کرنے اس کی طرف بڑھا تو وہ میری بات سُنے بغیر بڑی بے نیازی سے یہ کہتی ہوئی واپس پلٹ گئی کہ میں اس وقت بہت مصروف ہوں آپ پلیز میرا ٹائم ویسٹ نہیں کیجیے۔" اسفند نے ابھی پوری طرح بات ختم نہیں کی تھی کہ آفتاب پھڑک کر بولا۔

"اچھا کیا واقعی اس نے یہ کہا تھا۔ تب تو سمجھو کہ تمہارا بیڑہ پار ہے ــ واللہ آغاز اتنا جاندار ہے تو ــــ"

"لاحول ولاقوۃ ــــ یار تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم کو کچھ بتایا جائے مشورہ لینا تو در کنار ــــ" اسفند جلے بھُنے انداز میں بولا۔

"مگر بتانے کو اب رہا ہی کیا ہے۔ ارے سینکڑوں مرتبہ تم نے فلموں میں دیکھا ہو گا کہ ہیروئن سے پہلی ملاقات کسی نہ کسی ٹکراؤ کے سبب ہوتی ہے۔ اس کی کار بگڑ جاتی ہے تو وہ لبِ سڑک، جنگل یا بیابان یا کسی میدان میں انجن پر جھکی اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش میں بے حال سی نظر آتی ہے۔ تبھی ہیرو صاحب کہیں سے اچانک نمودار ہو کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ یا پھر ہیروئن چلتے چلتے ہیرو سے بری طرح ٹکرا جاتی ہے اور لال پیلی ہو کر ہیرو کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ برا بھلا کہتی ہے اور کوستی پیٹتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہیرو کے دانت نکالنے یا اظہارِ الفت کرنے پر ایک زناٹے دار تھپڑ بھی رسید کر دیتی ہے۔ اور پھر ہیرو کے جاتے ہی اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور پھر فوراً ہی عشق کے چکر چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یکایک کانوں کو پھاڑ دینے والے میوزک کی آواز کے ساتھ ہیروئن بھاگتی ہوئی گلا پھاڑتی ہے۔

او جانے والے بالموا لوٹ کے آ لوٹ کے آ ــــ

اور ہیرو صاحب جو اسی اثنا میں میلوں دور نکل جاتے ہیں۔ جواب میں وہیں سے ہانک لگاتے ہیں۔ جا میں نہ تیرا بالموا بے وفا

[illegible] مگر خیر ہر جگہ اظہار کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ یعنی اس نے صرف مصروفیت کا ہی عذر کیا ہے۔" آفتاب [illegible] کی طرف دیکھے بغیر کہتا رہا۔ اور وہ بگڑے تیور لیے خاموش بیٹھا رہا۔

خیر گھبراؤ نہیں دوست جیت انشاء اللہ تمہاری ہی ہو گی اب وہ کچے دھاگے میں بندھی تمہارے قدموں میں آگرے گی۔" آفتاب [illegible] بے بس سا دیکھ کر اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے گویا اُسے دلاسہ دیا۔

اب تم ایسا کیا کرو کہ اُس کے آنے سے پہلے ہی ہسپتال کے گیٹ پر جا کر کھڑے ہو جایا کرو ــــ اور جونہی وہ قریب سے گزرنے لگے [illegible] زمانے بھر کی حسرتیں سمیٹ کر کوئی دردناک سا نغمہ الاپنا شروع کر دیا کرو ــــ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔" آفتاب نے اُس [illegible] میں گویا مزید نشتا سا لگایا۔ اسے بھی احساس تھا کہ آفتاب مذاق سے زیادہ اس پر طنز کر رہا ہے۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کی غرض [illegible] مسکرا کر بولا۔

"تمہارا سر ــ اب میں تمہیں مار بیٹھوں گا آفتاب ــــ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم مجھے کوئی معقول مشورہ دو گے۔ مگر تم نے اپنے چکر [illegible] میں اصل بات کہنے کا موقع ہی نہیں دیا ــ میں تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کروں گا۔ اب تو مجھے معاف کر دو ــ"

"اچھا بھئی غلطی ہو گئی مجھ سے ــ میں تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کروں گا۔ اب تو مجھے معاف کر دو ــ"

"اچھا اچھا اب میری توبہ جو میں کچھ بولوں ــ" آفتاب نے کانوں کی لوؤں کو چھو کر کہا۔

"نہیں اب تم سیدھے گھر ہی چلو ــ ویسے بھی ہم صبح سے شہر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔" اسفند بولا۔ آفتاب کو معلوم تھا کہ اب [illegible] خواہ وہ کتنا ہی پوچھے ـ سنجیدگی کا کیسا ہی دبیز لبادہ اوڑھ لے مگر اس کا دوست اسے کچھ بھی نہیں بتائے گا ــ یوں بھی گھومتے گھومتے [illegible] دوپہر ہو گئی تھی۔ آفتاب نے بہت اصرار کر کے اسے ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھلایا۔ اور اسے احتشام کے گھر چھوڑنے کے بجائے میس [illegible] لے گیا۔ جہاں دونوں شام تک بڑے دلچسپ مشاغل میں وقت گزارتے رہے پھر سرِ شام ہی آفتاب اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ گیا۔ کیونکہ صبح چار بجے اسے پریڈ پر جانا تھا۔

وہ دن بھی یونہی بیکار گیا تھا۔ اور اس بات پر اسفند کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ جلد از جلد سرگودھا سے نکل جانا چاہتا تھا اور اس سے زیادہ جلدی اُسے مس شان کی اصلیت جاننے کے بارے میں تھی۔ مگر وہاں جتنی بے چینی اور بے قراری تھی۔ اتنا ہی [illegible] معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا ــ آفتاب کی چرب زبانی میں اُسے اصل بات بتانے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اور وہ اس حد تک کسی بھی چیز کے پیچھے دوڑنے کا عادی نہ تھا ــ بلکہ کسی الجھے ہوئے مسئلے سے جلد اوبھ جاتا تھا۔

مگر چونکہ یہ سلوط کو شناخت کرنے کا مسئلہ تھا اس لیے وہ اب تک اس میں الجھا ہوا تھا ــ اس پر اُسے آفتاب پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جس نے اپنی بک بک میں اسے اصل بات بتانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا ــ بلکہ بک بک کیا وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک [illegible] اس پر طنز کر رہا تھا۔ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ مس شان سے جا کر صاف صاف کہہ دے کہ میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ضرورت نہیں [illegible] سلوط ہو۔ اور اب تم سیدھی طرح میرے ساتھ پھوپھا کے پاس لاہور چلو۔

مگر سوچنے کی حد تک تو یہ ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے نزدیک عملی طور پر یہ سب کہہ دینا اتنا آسان نہ تھا۔

اگلے روز شام کو آفتاب اس سے ملنے آیا تو کچھ انسانیت کی جون میں تھا۔ آتے ہی اس کی خیریت پوچھی اور پھر گزشتہ روز کے لیے [illegible] سنجیدہ موڈ پر معذرت بھی کی۔

"ارے نہیں یار میں نے تو بالکل برا نہیں مانا ــ کیا تمہاری فطرت سے واقف نہیں ہوں۔ میں تو بھول بھال بھی گیا۔" اس نے جواب [illegible] خندہ پیشانی سے کہا اور گویا اس کے انتظار میں تیار ہی بیٹھا تھا۔ آفتاب نے اسے سیر سپاٹے کی پیشکش کی تو وہ اُٹھ کر فوراً ہی ساتھ [illegible]

"[illegible] لنگڑا کر کیوں چل رہے ہو ــ؟" آفتاب نے پوچھا۔

"وہ بس زمین پہ پیر جماتے وقت ہلکی سی درد کی چبھک ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" اُس نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر خاص بات نہیں بھی ہے تب بھی تمہیں کم از کم دکھا تو دینا چاہیے تھا۔" آفتاب نے گویا بڑی ترکیب سے ہسپتال کا ذکر چھیڑا۔

"کہہ تو دیا کہ ایسی تشویش کی بات نہیں ہے تو پھر دکھانے سے فائدہ۔" وہ قدرے چڑ کر بولا۔

"اچھا تو گویا آج بھی ہسپتال نہیں جاؤ گے۔" آفتاب نے پوچھا۔

"نہیں ——— ضرورت ہی کیا ہے۔ وہاں جانے کی ——" وہ بیزاری سے بولا۔

"اچھا —— مگر وہ تمہاری مس شان ——"

"میری تو کیا وہ تمہاری ہی ہوگی۔ دیکھو پھر وہی باتیں کرنی شروع کر دیں تم نے۔" وہ ایکدم ہی بگڑ اُٹھا۔

"ارے نہیں یار ——— میں نے سوچا جب باہر ہی نکلے ہیں تو کیوں نہ مس شان سے ملتے چلیں۔ تم نے کہا تھا نا کہ بعد میں کبھی اس کا شکریہ ضرور ادا کرو گے تو پھر آج میں اُسے باتوں میں لگا کر تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کر دوں گا ——" آفتاب بے نے کہا۔

"بس تم تو معاف ہی رکھو —— بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کے بجائے مار کھلوانے کے اسباب ضرور پیدا کر دو گے ۔ اور ہاں میں اب سلوط کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتا —— بس تم نے میری طرف سے کر دیا تھا —— یہی بہت ہے۔"

"مگر یہ سلوط کون ہے۔ ؟ کیا مس شان کی طرف سے مایوس ہو کر تم نے کسی سلوط کا سہارا لیا ہے۔ یار میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر چاکلیٹ سی فطرت کے مالک ہو گے۔" آفتاب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں ایک ملامت سی پنہاں تھی۔

"ارے نہیں یار۔ میں شان ہی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا اصل نام سلوط ہی ہے۔"

"اچھا۔ مگر یہ معلومات تم نے کیسے فراہم کیں۔ ؟" آفتاب نے پوچھا تو اس نے مختصر الفاظ میں اسے سلوط کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے پھوپھا کی سوتیلی بہن ہے اور پھوپھا اور پھوپھی کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اور وہ اسی کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔

"مگر تمہیں اپنے پھوپھا کی سوتیلی بہن سے ایسی کیا نسبت تھی جو تم اس کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہو۔"

"کیونکہ یہ میرے پھوپھا کی عزت کا معاملہ ہے۔ تم ہی سوچو کوئی جوان جہان لڑکی راتوں رات چپکے سے گھر سے بھاگ جائے تو۔" اسفند بولا۔

"تو کیا وہ کسی کے ساتھ گھر سے فرار ہوئی تھی۔ ؟" آفتاب نے پوچھا۔

"نہیں بھئی یہ وہ کیس نہیں ہے ——— وہ تو خفا ہو کر غصے میں تنہا ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور جب سے لاپتا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات تھی —— تعجب ہے تم نے یہ بات مجھے شروع میں ہی کیوں نہ بتا دی۔" آفتاب ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر بولا

"تم نے موقع ہی کب دیا کچھ بتانے کا —— ورنہ میں تو کل تم سے یہی کہنا چاہ رہا تھا ——" اسفند نے کہا۔

"خیر شکر ہے اصل بات معلوم ہو گئی —— ورنہ تمہیں اس معمولی سی نرس پر مائل دیکھ کر میں نے یہی تاثر لیا تھا کہ تم بھی آجکل کے ذہنی بے راہ روی کا شکار انہیں رئیس زادوں میں سے ہو جو اپنے خاندانی وقار اور عزت کو پسِ پشت ڈال کر ایسی پستیوں میں گر جاتے ہیں۔" آفتاب نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"کمال ہے تم تو میری فطرت سے بخوبی واقف ہو پھر بھی میرے بارے میں اتنی غلط رائے قائم کر لی۔" اسفند قدرے گلہ آمیز لہجے میں بولا۔

"لیکن ——— اب کیا کرتا کچھ سچویشن ہی ایسی پیدا کر دی تھی تم نے —— ویسے بائی دا وے کیا مس شان نے ایڈمٹ کر لیا ہے کہ وہ سلوط ہی ہے۔" آفتاب نے اس کے گلے کا جواب دے کر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں ابھی اس سے کچھ پوچھنے کا موقع ہی کب ملا —— لیکن اب جلد ہی اس سے قبول والوں گا۔" اسفند بولا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی —— آفتاب بھی خلاف عادت اور معمول خاموشی سے جیپ چلاتا رہا۔ پھر اسفند نے کہا۔

"آؤ چلو وہیں چلتے ہیں۔ اگر سرجن عارف مل گئے تو ساتھ کے ساتھ پیر بھی دکھا دوں گا ——"

آفتاب —— کچھ نہیں بولا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑے تھے۔

"یار ایسا کرو کہ سیدھے ڈیوٹی روم میں چلو —— کیونکہ وہاں اس کے ملنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔" آفتاب نے اس کے ساتھ ہسپتال کی عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے مشورہ دیا۔

"مگر کوئی یقینی تو نہیں کہ وہ ڈیوٹی روم میں تنہا ہی مل جائے وہاں دوسری نرسیں بھی موجود ہوں گی۔ اور وہاں جا کر الٹی ہماری پوزیشن ان آکورڈ ہو گی ——" اسفند نے کہا۔

"بھئی پوزیشن آکورڈ ہونے کا کیا سوال ہے۔ کوئی تم وہاں اس سے اظہارِ عشق کرنے تو نہیں جا رہے۔ کوئی بہانہ کر دیں گے کہ فلاں سے ملنا ہے۔ اگر وہاں مل سکتا ہے یا پھر سرجن عارف کا ہی پوچھ لیں گے۔" آفتاب اس کی ہچکچاہٹ پر چڑ کر بولا۔

"اچھا پھر چلو وہیں چلتے ہیں۔" اسفند نے آمادہ ہو کر کہا۔ اس اثنا میں دونوں ہسپتال کی بیرونی سیڑھیاں عبور کر کے آگے بڑھے ہی تھے کہ وہ سامنے ہی بالائی منزل پر جاتے زینے سے اترتی نظر آئی —— اُس کے ساتھ کوئی دوسری نرس بھی تھی۔ اور وہ دونوں ہنستی مسکراتی آپس میں باتیں کرتی نیچے اتر رہی تھیں کہ آؤ اسے یہیں پکڑ لیں —— کہہ کر اسفند اس کی طرف لپکا —— اور نچلی سیڑھی کے آگے کھڑا ہو کر بولا۔

"سلوط۔" مس شان جو اس کے راستہ روک کر کھڑے ہونے پر دو تین سیڑھیاں اوپر ہی رُک گئی تھی ——

اس نے اپنی ساتھی نرس سے آہستہ سے کچھ کہا۔ اور جواب میں سر ہلا کر اس نے اسفند سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"جی، آپ کو کس سے ملنا ہے ؟"

"ان سے میرا مطلب ہے مس شان سے۔" اسفند نے انگلی سے مس شان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نرس نے مسکرا کر شان کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ دونوں کُھسر پُھسر کرنے لگیں۔

"دیکھیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مس شان، آپ پہلے میری بات سن لیں۔" اس کی خاموشی سے اسفند کی کچھ ہمت بندھی تو اس نے تھوڑی سی عجلت دکھاتے ہوئے مس شان سے کہا۔

تو مس شان اس کو جواب دینے کے بجائے دوسری نرس سے بولی۔

"پتا نہیں کون شخص ہے یہ، روز آ کے مجھے تنگ کرتا رہتا ہے —— نئے نئے نام لے کر مجھے پکارتا ہے —— ذرا تم ہی اس کی بات سن لو عفت۔" اتنا کہہ کر وہ دو تین سیڑھیاں اوپر چڑھ گئی۔ اور عفت نے پہلے بڑی ملامت آمیز اور لعنتی نظروں سے گھور کر اسے دیکھا اور بولی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی مسٹر۔ بظاہر تو تم خاصے شریف لگتے ہو مگر حرکتیں ساری لوفروں کی سی کرتے ہو۔ آئندہ اگر تم نے اسے چھیڑا تو تمہاری ایسی درگت بناؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔ جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔" اسے اس بری طرح دھتکار کر عفت بھی تیزی سے مڑی اور مس شان کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ ایک تو اُس کی آواز بہت اونچی تھی، اس پر اوپر کا رخ کرتے ہوئے بھی وہ اسے بڑے گھسے ہوئے الفاظ سے نواز رہی تھی۔

اُف ذلت کی انتہا ہو گئی تھی۔

آفتاب بھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

اور سامنے طویل سی گیلری کے آخری سرے پر ریسیپشن پہ بیٹھا شخص بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا اس لمحے وہاں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی اپنی اس حد تک ذلت کے احساس نے اسفند کو سرتاپا کھولا کر رکھ دیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ جھپٹ کر اوپر جائے اور مس شان کو گھسیٹتا ہوا نیچے لا کر اتنا مارے کہ اس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دے۔

اور اسے اتنا مجبور کر دے کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ ہاں میں ہی سلوط ہوں۔ مگر اسی دم آفتاب نے بھی اس کی شتعال انگیز سی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بہت دھیمے اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"آؤ یار، واپس چلتے ہیں۔ ان آنتی تھرڈ کلاس عورتوں سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے —— وہ جو کہتے ہیں بازاری گالی ہنس کر ٹالی تو ان چیپ گرلز کی باتوں کو بھی اسی طرح ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینا

چاہیے۔ آؤ دوست، لعنت بھیجو ان دونوں پر اور میرے ساتھ چلو۔" مگر اسفند ایک دم ہی اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر چپ چاپ جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

"غصہ کرنا اسی لیے حرام ہے کہ غصے کی حالت میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ذرا سوچو غلطی ہماری نہیں تھی۔ یہ جو فی زمانہ منچلے اور بھٹکے ہوئے نوجوان اپنی ہی قوم کی عزت و ناموس کے رہزن ہر جگہ دندناتے پھرتے ہیں۔ اس نے ہمیں انہی میں شمار کیا ہوگا ہمیں اس طرح بغیر موقع اور محل دیکھے اس سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

آفتاب تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اور بھی بہت کچھ کہتا رہا تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد اسے صرف ایک بات ہی یاد رہ گئی تھی کہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ کیا غلطی ہماری نہیں تھی۔ اور وہ بڑی دیر تک صرف یہی سوچتا رہا کہ اس نے ایسی کیا غلطی کی تھی۔ اسے چھیڑا تھا۔ نہ کوئی عامیانہ سا فقرہ ہی چست کیا تھا۔ اور نہ کوئی عشقیہ ڈائیلاگ ہی بولا تھا۔ پہلے دو مرتبہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تھا اور آج بھی بہانہ وہی تھا البتہ اس نے اسے سلوط کہہ کر ضرور مخاطب کیا تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے منہ سے اپنا اصلی نام سن کر ہی وہ چڑ گئی تھی۔ کیونکہ اپنا نام سن کر اس کے چہرے کا تاثر یکدم بدل گیا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ایک لحظے کو اس کے چہرے پر سہم اور گھبراہٹ کے سے آثار ہویدا ہوئے تھے۔ تبھی تو اس نے اپنا چہرہ عفت کی جانب پھیر کر اس سے کچھ کہا تھا۔

بلکہ عفت اس سے کچھ پوچھ رہی تھی اور اس کے استفسار پر اصل بات بتانے کے بجائے اس نے اتنا سنگین جھوٹ بولا تھا۔ "پتا نہیں یہ کون شخص ہے روز آ کر مجھے تنگ کرتا ہے۔ نئے نئے نام لے کر پکارتا ہے۔ ذرا تم ہی اس کی بات سن لو عفت۔" اور جواب میں عفت نے وہی کیا تھا جو ایک دوست کو کسی بدقماش شخص سے بچانے کے لیے ایک دوست کرتی ہے۔

کیونکہ ایک تو وہ اچھی طرح اسے جانتی تھی۔ اگر سلوط بھی نہیں تھی تب بھی اسے یہ بھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جسے مرتی حالت میں اس نے اپنا خون دیا تھا۔

دوسرے وہ شکل و صورت اور لباس اور حلیے، کسی اعتبار سے بھی لوفر نہیں لگتا تھا۔ اب سے کچھ دن پہلے جب وہ ہسپتال میں زیرِ علاج تھا تو آفتاب سے بھی سب کی شناسائی ہو گئی تھی اور سب اسے بڑے احترام سے کیپٹن صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور وہاں کا ہاؤس سرجن ڈاکٹر قیوم رضا، آفتاب کا پرانا واقف کار تھا۔ تو کیا اس نے میری ہاتھوں ہوئی اپنی تذلیل کا بدلہ اس صورت میں لیا ہے؟ پھر اسے اپنے رویے اور اس اہانت آمیز گفتگو کا خیال آیا۔ جو اس نے ماں کے اکسانے یا غلط بیانی پر اس سے کی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اس کی اہانت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اسے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر یہ جو کچھ بھی کیا تھا کسی تھرڈ پرسن کے سامنے نہیں کیا تھا۔

کیونکہ اس وقت میں اور وہ کمرے میں تنہا تھے

مگر اس نے تو۔۔۔ نہ صرف خود بلکہ عفت سے کہہ کر میری تذلیل کروائی تھی۔ وہ بھی آفتاب کے سامنے۔ ریسیپشنسٹ کے اور وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کے سامنے جو زکا تو نہیں تھا مگر اس نے یقیناً سن ضرور لیا ہوگا۔ اور اس پر آفتاب کہتا ہے کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں۔ دوسرے معنوں میں گویا اتنی آسانی سے اس کا لگایا ہوا الزام اپنے سر لے لوں۔ نہیں نہیں، ایسا تو مر کر بھی مجھے گوارا نہیں۔ اور پھر مجھے پھوپھا جان سے کیا وعدہ بھی تو پورا کرنا ہے۔ اگر مس شان، سلوط نہ بھی ہوئی تو بھی میں اسے سلوط ہی بنا کر پھوپھا جان سے کیا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے مس شان کو اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر نہیں، وہ سلوط ہی ہے۔ سلوط ہی ہے۔

یہ سب سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔

دو روز مزید گزر گئے تھے۔ گویا کیپٹن احتشام کے یہاں اس کا قیام طویل ہوتا جا رہا تھا اور یہ احساس اس پر بڑا گراں گزر رہا تھا۔ آفتاب دانستہ یا پھر اپنی مصروفیات کی وجہ سے گذشتہ روز نہیں آیا تھا۔ وہ یہی انتظار کر رہا تھا کہ آفتاب آئے تو وہ اسے اپنے ارادوں سے باخبر کر کے اسی کے ذریعے احتشام کے گھر سے کسی عمدہ سے ہوٹل میں شفٹ ہو جائے۔ آخر شام کو آفتاب آیا تو آتے ہی اس نے معذرتی سے انداز میں کہا۔

"کل کتنی کوشش کی یار کہ وقت نکال کر تھوڑی دیر کے لیے تم سے مل آؤں مگر مصروفیت ہی کچھ ایسی نوعیت کی تھی کہ آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"

"یار تم یہ اپنے نہ آنے کی صفائیاں کیوں پیش کرتے ہو۔ اب میں مہمان تو نہیں رہا اور پھر خوامخواہ ہی یہاں جما بیٹھا ہوں۔ تمہارے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہوگا کہ تم روز روز میرے پاس آتے رہو گے۔" اس نے عجیب بیزار کن انداز میں کہا تو آفتاب سمجھا کہ اس پر ابھی تک غصہ چڑھا ہوا ہے۔ اس نے تعجب سے کہا۔

"ہائیں۔ کیا مطلب؟ تمہارا غصہ ابھی تک فرو نہیں ہوا جو اب تم مجھ پر اتارنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لو بھلا روز روز آنا تو دوسری بات، مجھے تو ہر وقت ہی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم میرے بلانے پر ہی تو یہاں آئے ہو۔"

"اوہو، تم سمجھے نہیں یار، میرا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو تمہیں اتنی کڑی ڈیوٹی انجام دینی ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ بے چارا احتشام۔۔۔ وہ بھلا اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں تو اس کے گھر میں دھرنا ہی دے کر بیٹھ گیا ہوں۔ ادھر میری مشکل یہ ہے کہ میں ابھی یہاں سے جا بھی نہیں سکتا۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ میرے لیے کسی عمدہ ہوٹل کا کمرہ بک کرا دو۔"

"بہ نصیب دشمناں۔ تمہاری دماغی صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے جو بیٹھے بٹھائے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے۔ ویسے کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے یا پھر گھر کے مکینوں سے کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں بھئی۔ نہ تکلیف ہے اور نہ شکایت بلکہ ان لوگوں کی خاطر مدارات اور خلوص سے تو ہی ان کے احسانوں تلے دبا جا رہا ہوں مگر۔۔۔"

"آفتاب نے اس کی بات کاٹ دی اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ پھر تمہیں اس کے گھر میں رہتے دن ہی کتنے ہوئے ہیں مشکل سے ایک ہفتہ۔ بقول تمہارے کوئی ساری زندگی تو رہنے سے رہے یہاں۔ اس لیے مزید جتنے دن رہنے کا ارادہ ہے آرام سے یہیں رہو۔ احتشام اپنا پرانا یار ہے ویسے بائی دا وے کتنے دن رہنے کا ارادہ ہے یہاں؟" آفتاب نے بڑی خوبصورتی سے اس سوال کو الفاظ کا جامہ پہنایا جو کچھ دیر سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"ہائیں۔ یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ زیادہ عرصے نہیں رہوں گا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز میں اپنا کام نمٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اسفند نے بتایا۔

"مگر کون سا کام؟" آفتاب نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔ کیونکہ جہاں تک اسے معلوم تھا سرگودھا میں تو اسے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا جو اس کی واپسی میں رکاوٹ بنتا۔

"بھئی وہی سلوط کو دریافت کرنے کا کام۔ اس کے علاوہ میری اور کون سی ایسی غرض اٹکی ہوئی ہے یہاں۔" اسفند بڑی متانت سے بولا۔

"ہیں تو کیا ابھی تک تمہارے سر پر سلوط کو برآمد کرنے کا بھوت سوار ہے؟ مگر کیا دو روز پہلے کا تلخ تجربہ تمہارے لیے کافی نہیں جو مزید خود کو خوار کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کمال ہے یار تم تو ایک دم بنڈل قسم کی شے ثابت ہوئے ہو۔" آفتاب نے تیز لہجے میں اسے ملامت سی کی۔

"مزید کچھ کہنا چاہتے ہو اس سلسلے میں تو وہ بھی کہہ دو۔ پھر میں تمہاری ساری باتوں کا جواب اکٹھا ہی دے دوں گا۔" اسفند جیسے بالکل چکنا گھڑا ہی ثابت ہوا۔

"مزید کیا کہوں۔ جبکہ تمہاری عقل تو شاید بھیجے کے بجائے گدی میں ہے بلکہ سرے سے بھیجے میں ڈالی ہی

نہیں گئی۔ اب بھلا اپنے پھوپھا کی سوتیلی اور مغرور بہن کی ذات سے تمہیں ایسی کیا دلچسپی ہے جو تم اپنی عزت اور وقار کو داؤں پر لگانا چاہ رہے ہو۔" اس کی بات پر آفتاب جلے کٹے انداز میں بولا اور تب اسفند کو ساری بات اس کے گوش گزار کرنی ہی پڑی۔

"ہوں تو یہ بات ہے ورنہ میں بھی تو کہوں کہ اتنا شریف اور حسب نسب والا دوست اس قدر گراوٹ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ اور میں تو تمہارے یہ سب بتانے سے بہت پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کالا کچھ ضرور ہے۔ اسی وجہ سے تو میں روز تمہیں جتاتے کہ میں تم سے کڑوی کسیلی۔"

"اُفوہ۔ سیدھے چلتے چلتے تو تم پھر پٹڑی سے اتر گئے۔ میں تمہاری ذہانت کا امتحان تو نہیں لے رہا۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ اس سے کہاں ملوں اور اصل حقیقت کیسے اگلواؤں۔ کیونکہ اسپتال میں اس سے ملنا کچھ مناسب نہیں۔ ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ جب وہ اسپتال سے باہر نکلے تو گھر تک اس کا تعاقب کیا جائے تاکہ اس کا پتا معلوم ہو سکے۔"

"ہائیں تعاقب۔ نا بابا نا۔ تعاقب تو میں نے کبھی دشمن کا بھی نہیں کیا زیادہ سے زیادہ یہی کیا کہ بھاگتے ہوئے دشمن کا نشانہ باندھ کر گولی داغ دی۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔" آفتاب ایک دم ہی بدک کر بولا۔ اس کی باتوں سے اندیشوں سے زیادہ تمسخر جھلک رہا تھا۔

"تو پھر یہ کریں گے کہ کسی سے اس کا اتا پتا معلوم کر کے سیدھے اس کے گھر ہی پہنچ جائیں گے۔"

"ہائیں کیا کہا۔ اس کے گھر پر جاؤ گے تم۔ اس کے گھر پر۔ وہ بھی گویا میرے کاندھے پر بندوق رکھ کے۔ نہیں بھئی میری توبہ۔ میں تو یہی شکر کر رہا ہوں کہ اس روز پٹتے پٹتے بچ گیا تھا نہ جانے کون سی نیکی آڑے آ گئی تھی۔ ورنہ چنوں کے ساتھ ساتھ گھن کی طرح تمہارے ساتھ میں بھی پس کر رہ جاتا۔ کیونکہ تمہاری تو وہی مثل ہے کہ ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" آفتاب نے گویا ہنسی ہنسی میں ہی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"اچھا چھوڑو تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو نہ دو۔ مگر اتنا تو کر دو کہ میرے ساتھ اسپتال چلے چلو۔ تم بے شک جیپ سے نہ اترنا۔ مگر جیپ میں بیٹھ کر میرا انتظار ضرور کرنا۔ باقی کام میں خود نمٹا لوں گا۔" اور آفتاب نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔

"اچھا چلو یہاں تک تو میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مس شان حسینہ عالم تو نہیں ہے جو اس کا حصول تمہاری زندگی کا نصب العین بن جائے۔ تم کہو تو میں اس سے کہیں بڑھ کر حسین اور خاندانی لڑکی تمہارے لیے فراہم کر سکتا ہوں۔ دیکھو بُرا ماننے کی بات نہیں یہ محض میرا ایک مخلصانہ سا مشورہ ہے۔" آفتاب نے اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"چلو خیر تم اسپتال چلو اب مجھے کوئی احمقانہ مشورہ نہ دینا کیونکہ صرف حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ سیرت۔ شرم و حیا کے علاوہ بھی بہت ہوتا ہے۔ بہت سی خوبیاں جو سلوط میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔"

"او کے چیف۔ اینڈ ود مائی اپولوجیز سر۔ دل پری پر آئے یا گدھی پر۔ دل ہی ہوتا ہے جو پریوں کی صفات گدھیوں میں بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔" آفتاب آخر دل کی بات زبان پر لے ہی آیا کہ وہ بہت سطحی سی نظر رکھنے والا شخص تھا۔ اگر مس شان سلوط ہی تھی تو اس نے اسے ایک معمولی نرس کے روپ میں دیکھا تھا اس لیے وہ سلوط کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔ اسفند بھی سمجھ رہا تھا مگر اس پر اس سمے کوئی اور ہی دھن سوار تھی اس لیے اس نے آفتاب کی بات کا جواب دینا یا اسے قائل کرنا ضروری نہ سمجھا۔

کچھ ہی دیر بعد۔ اسپتال کی باؤنڈری وال کے باہر جیپ رکوا کر وہ جیپ سے اترا اور آفتاب کو جیپ میں ہی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اور سیدھا ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ اتفاق سے اس سمے سسٹر ضیا اور کئی دوسری نرسیں جو اس سے واقف تھیں وہیں موجود تھیں۔ جو اس سے بڑے تپاک سے ملیں۔ اور اس کی خیر خیریت پوچھتی رہیں۔ تب اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر سسٹر ضیا سے پوچھا۔

"کیا مس شان آج آف ڈیوٹی ہیں جو نظر نہیں آ رہیں۔"

"نہیں۔ ان کی ڈیوٹی تو آج میٹرنٹی وارڈ میں لگی ہوئی ہے اور وہ اوپر آفس میں موجود ہے۔" سسٹر ضیا نے حسب عادت مسکرا کر بتایا۔ مگر اس کے انداز میں معنی خیزی تھی۔

"اوہ عجیب اتفاق ہے۔ اس روز بھی آپ کے بتانے پر میں ان کا شکریہ ادا کرنے یہاں آیا تھا تو وہ کسی مریض کو اٹینڈ کرنے گئی ہوئی تھیں۔" اس نے اس تاثر کو توڑنے کی غرض سے جو سسٹر ضیا نے باندھا تھا۔ گویا مس شان کے بارے میں پوچھنے کی وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے سر آپ اوپر جانے کی زحمت نہ کریں اُسے میں بلوائے دیتی ہوں۔" سسٹر ضیا بولی۔

"نہیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ میں ابھی رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ اگر آپ کچھ کر سکتی ہیں تو بتا دیجیے کہ مجھے ان کے گھر کا پتا بتا دیجیے۔ اگر ہو سکا تو میں خط کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کر دوں گا۔"

"ویسے تو وہ برابر والے نرسوں کے ہوسٹل میں رہتی ہے مگر آپ اسپتال کا پتا لکھ کر نرسوں کے ہوسٹل کے حوالے سے اسے خط لکھ سکتے ہیں۔"

ہوسٹل کی انچارج اس وقت اتفاق سے آفس میں موجود تھی۔ وہ سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اور جاتے ہی مدعا بیان کیے بغیر اس نے اس سے پوچھا۔

"میڈم کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کے ہوسٹل میں رہائش پذیر نرس مس شان کا اصلی نام کیا ہے۔" سوال بے تکا ہی نہیں بہت ذاتی اور مشتبہ سا تھا۔ انچارج۔ میڈم پریرا نے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات اُبھر آئے۔

"جی نہیں مجھے بالکل نہیں معلوم۔ اگر معلوم بھی ہوتا تب بھی نہیں بتاتی۔ کیونکہ ہمارے ہوسٹل کے اصولوں میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ کسی تھرڈ پرسن کو یہاں رہنے والے کسی فرد کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔" میڈم پریرا نے بڑی صاف اور شستہ اردو میں جواب دیا۔

"لیکن معاملہ کسی تھرڈ پرسن کا نہیں میڈم بلکہ بڑا سیریس ہے۔ جس سے میں آپ کو باخبر کر دینا چاہتا ہوں۔" اس کی بات پر وہ تھوڑا سا نرم پڑ کر بولی۔

"لیکن مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ بڑی بے ضرر سی لڑکی ہے۔ مصیبت زدہ اور بے یار و مددگار بھی۔"

"نہیں وہ مصیبت زدہ ہے نہ بے یار و مددگار۔ بلکہ اس کے سارے رشتے دار موجود ہیں۔ اس کے والد ہندوستان سے آ گئے ہیں اور اس کے ایک دم ہی غائب ہو جانے کی وجہ سے سخت علیل ہیں۔" اسفند نے اس کی معلومات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جناب ہم آپ کی بات پر کیونکر یقین کر سکتے ہیں۔ جبکہ آج سے پہلے ہم نے آپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔" وہ پھر بتھے سے اُکھڑ گئی۔

"آپ زیادتی سے کام لے رہی ہیں میڈم۔ ورنہ ہم یونہی تفریح کی غرض سے نہیں آئے جیسا کہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند نے کہا ہے معاملہ واقعی کافی سیریس ہے۔ اور ہم تو صرف اس کا نام ہی معلوم کرنا چاہتے ہیں اس سے رابطہ قائم کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔" آفتاب جس کا تجسس اسفند کو ہوسٹل میں جاتے دیکھ کر انتہا کو پہنچ گیا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بھی جیپ سے اتر کر آفس میں آ گیا تھا اور چونکہ ڈیوٹی سے سیدھا اس کے پاس آیا تھا اس لیے اتفاق سے وردی میں ملبوس تھا۔

اور اس کی فوجی وردی نے ہی میڈم پریرا کو حد درجے متاثر کیا۔ بلکہ دوسرے معنوں میں سہما کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر زمانے بھر کا انکسار سمیٹ کر بڑی لجاجت بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ یقین جانیں سر۔ مجھے اس کا نام بالکل معلوم نہیں۔ البتہ اس کے بارے میں ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک ڈیڑھ ماہ قبل کراچی سے آئی ہے۔ بلکہ میری ایک پرانی دوست جو میری طرح ایک پرائیویٹ کلینک میں مڈوائف ہے نے یہاں بھیجا ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ فلورا کا ایڈریس آپ کو دیے دیتی ہوں باقی تفصیل آپ اس سے معلوم کر

لیجیے گا۔" میڈم پرپریا کی بات پر دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر آفتاب نے اسفند کے قریب ہو کر آہستہ سے اس سے کچھ کہا۔ مگر اسفند نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میڈم پرپریا کو مخاطب کر کے کہا۔

"نہیں ہمیں کسی کا ایڈریس درکار نہیں۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا ہم معلوم کر چکے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"تو کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں؟" پرپریا نے سہمے سہمے متفکر سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ فی الوقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ البتہ بعد میں اگر ضرورت پڑی تو ہم مجبور ہوں گے۔" اسفند نے اسے مرعوب دیکھ کر قدرے رعونت سے کہا اور پھر وہاں سے جانے لگا تو تنبیہی سے انداز میں میڈم پرپریا کو مخاطب کر کے بولا۔

"آپ اس معاملے کو اگر صیغہ راز میں رکھیں گی تو یہ آپ کے لیے ہی بہتر ہوگا۔ اوکے بائے۔" اور پھر آفتاب کو ساتھ لے کر آفس سے نکل آیا۔

"دیکھو یار۔ میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ تم نے جو اس پر ظلم ڈھایا اس کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے نہ اس سے یہ اگلوا لینا کہ وہ سلوطا ہی ہے۔ اس لیے اُسے منانے ونانے کا خیال تو چھوڑ ہی دو۔ تم تو ایسا کرو کہ اگر وہ واقعی سلوطا ہی ہے تو اپنے پھوپھا کو اس کی یہاں موجودگی سے مطلع کر دو۔ ظاہر ہی وہ یہ اطلاع ملتے ہی بھاگے بھاگے یہاں آجائیں گے اور اس طرح ساتھ کے ساتھ تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

پہلی بار نہایت سنجیدگی اور مدبرانہ انداز میں اسے مشورہ دیا۔ جسے سن کر وہ پھڑک ہی اٹھا۔ اور آفتاب کے جاتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ پوری تفصیل کے ساتھ پھوپھا کو خط لکھ کر رات ہی کو اسے لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ اور پھر پھوپھا کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اسفند اور آفتاب کے جانے کے بعد سسٹر پرپریا کو ایک دم ہی خیال آیا کہ یہ دونوں نوجوان مونا شان کے بارے ہی میں جو اتنی پوچھ گچھ کر کے گئے ہیں کہیں ہاسٹل سے سیدھے اسپتال پہنچ کر مونا سے اُلٹے سیدھے سوالات نہ کر بیٹھیں یا پھر وہ ان سے ڈر کر خود ہی کچھ نہ بک دے۔ اسی خیال کے تحت سسٹر پرپریا نے اسی وقت اسپتال فون کر کے میٹرنٹی وارڈ کا نمبر لیا۔ اتفاق سے خود مس شان نے ہی ریسیو کیا۔ سسٹر پرپریا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہیلو مونا۔ تم اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

"ڈیوٹی انجام دے رہی ہوں۔ لیکن سسٹر پرپریا آج فون کیسے کر لیا آپ نے؟" اس نے اس کے سوال کا جواب دے کر متعجب سے لہجے میں پوچھا۔

"بس یونہی کر لیا۔ ویسے تم ڈیوٹی سے کب تک فارغ ہو گی؟" یہ بھی ایک تعجب خیز بات تھی کہ سسٹر پرپریا معمولات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے ایسا بے تکا سوال پوچھ رہی تھی اسے کچھ زیادہ ہی اچھنبا ہوا۔

"وہی شام تک سسٹر۔"

"ہاں ہاں وہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر خیر تم ایسا کرنا کہ ڈیوٹی کے بعد کہیں اور نہیں جانا۔ سیدھی ہاسٹل چلی آنا۔" یہ اس سے بھی کہیں زیادہ تعجب خیز بات تھی جو اب تک اس نے کہی تھی۔ ورطہ حیرت میں غوطے کھانے کے باوجود اس کی اس بات پر اسے تاؤ آگیا۔

"مگر سسٹر میں بھلا ڈیوٹی کے بعد کہاں جاتی ہوں جو آج جاؤں گی۔ میں تو روز ہی اسپتال سے سیدھی گھر آتی ہوں۔"

"ارے نہیں میرا مطلب کچھ اور ہے۔ خیر تم جب ڈیوٹی سے واپس آؤ گی تو بتاؤں گی۔ اوکے سو لونگ۔" سسٹر پرپریا نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جبکہ وہ ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی۔

اصل میں تو سسٹر پرپریا نے ایکسٹینشن فون ہونے کی وجہ سے اسے فون پر کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر

ایک تو بہت خلافِ توقع اور معمول پہلی بار اس نے مس شان کو فون کیا تھا اور یہی کیا کم تعجب کی بات تھی اس پر فون جس نوعیت کا تھا اس نے اسے سخت الجھن میں ڈال دیا تھا۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟ سسٹر پریرا کو کیا ضرورت پڑ گئی مجھے فون کرنے اور یہ کہنے کی کہ میں سیدھی ہاسٹل آؤں اور کہیں نہ جاؤں جبکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور کہیں جاتی ہی نہیں۔ صرف کبھی کبھار مارکیٹ چلی جاتی ہوں تو وہ بھی چھٹی کے دن۔

پھر اس نے ایسی بات کیوں کہی؟ ظاہر ہے بلاوجہ تو نہیں کہی ہو گی؟ تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے یہ کہنے کا؟

کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جبھی تو کہہ رہی تھی کہ جب ڈیوٹی سے واپس آؤ گی تو بتاؤں گی۔ یہی سب سوچتے سوچتے اس کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا اور ابھی صرف دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ اور اپنے ڈیوٹی آورز (گھنٹے) پورے ہونے تک تو تجسس کے مارے اس کی حالت ہی غیر ہو جاتی۔ اس لیے لنچ ٹائم کے فوراً ہی بعد اس نے میٹرنٹی ہوم کی وارڈن سے سر درد کا بہانہ کر کے آدھے دن کی چھٹی مانگی اور سیدھی ہاسٹل چلی آئی۔

اور تب سسٹر پریرا کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اسفند اپنے ایک دوست کے ساتھ اسے پوچھتا ہاسٹل آیا تھا اسے اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ سسٹر پریرا کو ماسوائے اس کے کہ وہ ایک مصیبت زدہ اور بے سہارا لڑکی ہے جسے اس کی ایک بہت ہی عزیز دوست نے کراچی سے اس کے پاس بھیجا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ حتیٰ کہ اس کا اصل نام بھی نہیں۔ اور اب دو آدمیوں کے اچانک آ جانے اور اس کے بارے میں استفسار کرنے پر وہ اس کی طرف سے خاصی مشکوک ہو گئی تھی۔

اس نے اسے یہ بتانے کے بعد کہ دو اشخاص جن میں ایک فوجی تھا تمہیں پوچھتے ہوئے آئے تھے اور تمہارا نام سلوط بتا رہے تھے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں جو تاثر دیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم بغیر کسی کو بتلائے چپکے سے گھر سے بھاگ آئی ہو اور تم نے اپنا نام بھی تبدیل کر رکھا ہے۔ تم نے ظاہر کیا ہے کہ تم اس دنیا میں تنہا اور بے یارومددگار ہو۔ اور ان دونوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے سارے رشتے دار موجود ہیں حتیٰ کہ باپ بھی جو حال ہی میں انڈیا سے واپس آئے ہیں۔ سسٹر پریرا نے گویا اس کی خبر لینے کے انداز میں کہا۔

”لیکن لیکن سسٹر یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ یقین مانیں۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”میں اب تمہاری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ وہ جس طرح بات کر رہا تھا اسے کسی طرح بھی جھوٹ نہیں سمجھا جا سکتا اور وہ مجھے وارن بھی کر گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی وقت بھی تمہیں لینے آ جائے گا۔ دیکھو سونا۔ خواہ وہ جھوٹ بول رہا ہو یا تم۔ لیکن کم از کم میں اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اگر سچ مچ وہ دونوں کل آ گئے تو میں بلا کسی انکوائری اور تصدیق تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ کیونکہ اس معاملے میں ان دونوں سے ——— ٹکر لے کر اپنے ہاسٹل کی ریپوٹیشن خراب نہیں کر دوں گی۔ میری مشکل یہ بھی ہے کہ میں تم کو یہاں سے کہیں بھیج بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ تمہیں غائب پا کر وہ دونوں میری گردن ناپیں گے۔ البتہ ایک صورت میں تم ان سے خود کو بچا سکتی ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنا پورا پتا، رشتے داروں کے نام اور خود اپنا اصلی نام بتا دو۔ ہم وہاں باقاعدہ انکوائری کرائیں گے اگر تمہاری بات سچ ثابت ہوئی تو پھر کسی کی مجال نہ ہو گی جو تمہارے حصول کے لیے ہاسٹل میں قدم بھی رکھ سکے۔“

لیکن وہ بھلا کیسے بتاتی اپنا اصلی نام۔

جبکہ وہ تو ہمیشہ کے لیے اسفند کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

بلکہ وہ اس کی زندگی میں داخل ہی کب ہوئی تھی ـــ خود اسفند ہی گویا زبردستی اپنے یک طرفہ جذبے سے مغلوب ہو کر دوسرے معنوں میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا اور کچھ اس طرح پڑا تھا کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ اور اسے اس بری طرح اپنی محبت میں غرق دیکھ کر وہ اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کر کے اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور چونکہ بات اتنی زیادہ آگے بڑھ گئی تھی اور ادھر وہ ایک ٹھکرائی ہوئی ہستی تھی بلکہ

ایک دوسرے مرد کی ملکیت تھی۔ اس لیے اسے یہ گوارا ہی نہیں ہوا تھا کہ اصل بات بتا کر نہ صرف اسفند کی نظروں سے گر جائے بلکہ اس کی نفرتیں بھی مول لے لے۔

اصل میں تو شروع شروع میں وہ یہی ـــ سوچ کر خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی تھی کہ جیسا کہ اس کے بھائی اور بھابی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دونوں زیادہ سے زیادہ چار ماہ بعد اسے واپس بلا لیں گے۔ کہ ہندوستان تو وہ صرف ایک ڈیڑھ ماہ قیام کی غرض سے ہی گئے تھے تو اسفند اپنے گھر خوش رہے گا اور وہ اپنے گھر خوش۔ پھر اگر اسفند اس کے معاملے میں سیریس بھی ہو گیا تو اس کے بھائی بھاوج اسے اصل معاملے سے آگاہ کر دیں گے۔ اور اس طرح گویا سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ بلکہ الٹی اسفند کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو جائیں گی۔

لیکن چار سے چھ ماہ ہو گئے اور پھر چھ سے ایک سال بلکہ ایک سال سے کہیں اوپر۔ لیکن خبر لینی تو کجا خود بھائی بھاوج ہی کی خیر خبر نہیں ملی۔ حد تو یہ تھی کہ انہوں نے خط کے طور پر دو حرف بھی اسے لکھ کر نہیں بھیجے۔

بیچاری لڑکی اٹھان سمیت ہر طرح سے حسین تر تھی۔

لیکن حیثیت کے لحاظ سے اس کی وہی مثل تھی جیسے مورنی اپنے بدنما پیروں کو دیکھ کر ناچتے ناچتے رک جاتی ہے۔

شعیب منصور کا گھرانا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

ان کے تمام ملاقاتی دوست احباب بھی تمام کے تمام متمول تھے اور ان سے بھی کہیں زیادہ تھے اور ایسے لوگ اپنے سے بھی اونچی حیثیت کی لڑکیاں مانگتے ہیں۔

کیونکہ بڑے اسٹیٹس والوں کی لڑکیاں جہیز بھی بہت اونچا لاتی ہیں۔ اور پھر بڑی ترت پھرت۔ اسٹائلش اور سیماب صفت لڑکیوں کو ہی پسند کیا جاتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ پھر بھلا پیسے والوں کی اس دوڑ میں بیچاری دبی دبائی اور ایک روایتی مشرقی لڑکی کی دال کہاں گل سکتی تھی۔ یوں بھی حیثیت اور اسٹیٹس کے سامنے آج کل حسن اور شرافت کوئی وقعت ہی کہاں رکھتے ہیں۔ کچھ یہ وجہ تھی اور کچھ اس لیے بھی کہ زینت اور نازش وغیرہ جب بھی کوئی بہت ٹٹول ٹٹول کر اس کے بارے میں پوچھتا تو اس سے یہی کہہ دیتیں کہ اس کی تو منگنی ہو چکی ہے اور پوچھنے والا پھر چپ سادھ لیتا۔ وہ تو اسفند ہی تھا جو اس کے لیے جھاڑ کا کانٹا ثابت ہوا تھا اور اس کے کانٹا بنا دیے جاتے ہیں تمام تر غلطی اس کی تھی۔

اس نے اگر شروع میں ہی اسفند کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوتا تو بات اس حد تک نہ بگڑتی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ خود اسے بھی اسفند دل سے پسند تھا۔ کیونکہ درانی سے تو زبردستی اس کے جسم کا سودا ہوا تھا وہ بھی صرف چار ماہ کے لیے۔ مگر اس کے بعد بھی وہ درانی کے نام پر تو چڑھا دی گئی تھی۔

لیکن اسفند ہی وہ پہلی ہستی پہلا مرد تھا جو اس کے دل میں آ بسا تھا۔ ایک دو نہیں سینکڑوں مرتبہ جب بھی اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تھا اسے اپنے دل کے سنگھاسن پر اسفند ہی بیٹھا نظر آیا تھا۔ جبکہ وہ اسفند کے لیے شجرِ ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

پھر بھی دل پر کسے اختیار ہوتا ہے۔ کہ دل اور خیالات دونوں ہی آزاد ہوتے ہیں۔

اور زندگی کے بیشتر اہم اور نازک مسائل میں بہت ہی غیر جانبدارانہ رول ادا کرتے ہیں۔ اور وہ اسے اس لیے بھی اتنا زیادہ چاہنے لگی تھی کہ وہ محبت کے جذبے کو بہت پاک اور مقدس سمجھتی تھی۔ اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ جب اسفند کو اس پر بیتی ہوئی بیداد کا علم ہو گا تو ہمدردی کے ساتھ اس کی چاہت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اور اگر درانی نے اسے آزاد کر دیا تو اسفند یقیناً اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ کیونکہ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی اور بھاوج اسے درانی کی قید سے آزاد کرانے کی غرض سے ہی انڈیا گئے ہیں۔ گو اسے یقین تو نہ تھا کہ ایسا ہو ہی جائے گا لیکن وہی مثل تھی کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

اور بس اسی امید موہوم کے سہارے محض اسفند کی شدید چاہت کے بل بوتے پر اس نے اپنے اس معاملے میں چپ سادھ رکھی تھی۔ مگر بھانڈا پھوٹا تو بھلا کس طرح۔

اور اسفند کی شدید چاہت کا پول بھی کُھلا تو بھلا کیسے۔ کہ ڈراپ سین اس کی شدید اور ازلی نفرت پر ہی ہوا کہ اخلاق اور لحاظ تو بڑی شے اس نے تو رواداری اور مروّت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور جہاں مروت باقی نہ رہے وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ماسوا بربریت اور حیوانیت کے۔ کیونکہ انسانیت کا دوسرا نام مروت ہی ہے۔

ورنہ آپس میں مروت باقی نہ رہے تو انسان جانور بن کر ایک دوسرے کو کاٹنے پھاڑنے لگے۔

انسانیت میں اخلاق کا درجہ بھی دوسرے نمبر پہ آتا ہے۔ سب سے اصل مروت اور رواداری ہوتی ہے۔

اور اسفند نے سب کچھ اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اسے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔

اور اس کے گھر سے نکل کر ہر قدم اُٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ان بڑھتے ہوئے قدموں میں کوئی قدم اس کی عزت پر حرف لانے کا باعث بنا تو اس سے پہلے ہی وہ خود کو ختم کر لے گی۔

پھر بھلا وہ اسفند سے کوئی واسطہ رکھنا پسند کرتی۔ بلکہ اسے تو مر کر بھی یہ گوارا نہ تھا۔

اس لیے سسٹر پیرا کو اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

”نہیں سسٹر آپ میری بات کا یقین کریں۔ یا تو وہ شخص کسی اور کے دھوکے میں مجھے سلوط سمجھ بیٹھا ہے یا پھر کوئی اور چکر چلا نا چاہ رہا ہے ورنہ میں تو اس اتنی بڑی دنیا میں تن تنہا ہوں۔ والدین تو کیا میرا کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے معلوم کر لیں۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں فلورا سے بات کر کے ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گی“ سسٹر پیرا نے کہا۔

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے اس کی تصدیق کر لیں ۔کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی اس وقت تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ سسٹر پیرا سے پہلے ہی سسٹر فلورا کو کراچی فون کر کے اسے ساری بات بتا دے گی کیونکہ وہی مہربان اور شفیق سی ہستی اس کی رازداں، خیر خواہ اور ہمدرد تھی۔ لیکن شام تک اسی کوشش میں فون کے اردگرد منڈلاتے کے باوجود بھی اسے سسٹر فلورا سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ رات کو سسٹر فلورا کو فون کرنا بیکار ہی تھا کیونکہ فلورا کی ڈیوٹی شام کو ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس کا فون پہ ملنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جبکہ شام تک تو وہ یہی سوچ سوچ کر اپنا خون خشک کرتی رہی کہ پیرا نے ضرور فلورا سے بات کر لی ہوگی۔ اور اب وہ کسی وقت بھی مجھے طلب کر لے گی۔ اور کسے معلوم کہ میرے ساتھ ساتھ وہ ان دونوں کو بھی طلب کر لے اور مجھے زبردستی اس کے ساتھ جانے پر مجبور کر دے۔ اس سے پیشتر کہ ایسی کوئی بات ہو میں خود ہی کیوں نہ یہاں سے چلی جاؤں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے کمرے میں اس سمیت تین نرسیں اور رہتی تھیں۔ اور سب ہی اپنی اپنی ڈیوٹی بھگتا کر واپس آ گئی تھیں۔ ان میں عفت بھی شامل تھی۔

اس لیے فی الفور جانا تو بڑی بات وہ اپنا ضروری سامان بھی پیک نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ جب سب سو جائیں گی اس وقت وہ اُٹھ کر چپکے چپکے اپنا سامان باندھ لے گی۔ اور اگلے روز بارہ بجے کے قریب جب پیرا نیچے آفس میں ہوتی ہے اور نرسیں اپنی اپنی ڈیوٹی پر وہ اپنا سوٹ کیس لے کر عقبی دروازے سے نکل جائے گی۔

اس پروگرام کے تحت اس نے یہی کیا جو سوچا تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے تک بستر پر خاموش پڑی اپنی روم میٹس کے سونے کا انتظار کرتی رہی اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ سب بے سدھ پڑ کر سو گئی ہیں تو اس نے بہت احتیاط سے آواز پیدا کیے بغیر الماری میں رکھا اپنا کچھ سامان سوٹ کیس میں ڈالا۔ کپڑے وغیرہ تو اس کے سوٹ کیس میں ہی رکھے رہتے تھے۔ البتہ سوٹ کیس کو بھی الماری میں ہی مقفل کرتی تھی وہ۔ کیونکہ الماری بھی مشترکہ ہی تھی۔ بہرحال اس نے اپنا سوٹ کیس الماری سے نکال کر اسے اپنے سرہانے کی طرف بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر سونے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی لیکن کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی کہ یوں تو اسفند

کا خیال اس دن کے بعد سے جس روز اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا اسے بار بار آیا تھا۔ مگر ان خیالات سے کوئی اچھی یاد وابستہ نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر ہوتی بھی تو صرف تھوڑی دیر کے لیے پھر وہی اس کی اہانت آمیز گفتگو۔ غصے سے آگ بگولا ہونا اور گھر سے نکال دینا ہی چشم تصور میں گھومتا رہتا تھا۔ اور پھر گھر سے نکلنے کے بعد کی ٹھوکریں۔ فلورا سے ملاقات اور پھر سرگودھا پہنچنا۔ اور اس وقت بھی اسے اس بے سرو سامانی اور کسمپرسی کے عالم میں اسفند کے گھر سے نکل کر جو واقعات پیش آئے تھے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ بلکہ کسی فلم کی ریل کی طرح ایک ایک کر کے اس کی یادداشت کی سطح پر اتر رہے تھے۔

وہ رات کے نو بجے کا عمل تھا جب وہ شعیب منصور کے گھر سے نکلی تھی۔ شاہراہ فیصل پر ٹریفک اسی زور شور سے رواں دواں تھا جیسے کہ دن کی پرہنگامہ ساعتوں میں ہوتا ہے۔

بسیں اور منی بسیں بھی انسانوں کے ہجوم سے لبریز۔ اسٹاپوں پر ٹھہرتی اپنے اپنے روٹس پر آ اور جا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ شاہراہ کے دونوں اطراف میں فٹ پاتھوں پر بھی راہ گیروں کی آمدورفت جاری تھی۔ جبکہ وہ کوئی الہڑ اور معصوم دوشیزہ تو نہیں تھی کہ زمانے کے نشیب و فراز سے واقف ہی نہ ہوتی۔

وہ جن لمحات میں گھر سے نکلی تھی۔ ان میں ایک جوان لڑکی کے لیے قدم قدم پر خطرات پنہاں تھے۔ اس لمحے اس کی مثال کچھ ایسی ہی تھی جیسے بازوں اور شکروں کے نرغے میں ایک ننھی منی کمزور سی چڑیا ہوتی ہے۔

جسے ان عقابی نظروں سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ملتی لیکن حتیٰ الامکان وہ کوشش یہی کرتی ہے کہ عقابی نظروں سے بچی ہی رہے۔ اور اسی کوشش میں اس نے فٹ پاتھ چھوڑ کر بنگلوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ بنگلوں کے آس پاس کا ماحول قدرے سنسان اور نیم تاریک تھا وہ چاہتی تو یہ راستہ چھوڑ کر سیدھی فٹ پاتھ پر آ جاتی اور کسی بس اسٹاپ پر رک کر بس کا انتظار کرتی۔

مگر اس کی تو کوئی منزل تھی نہ ٹھکانہ۔ سامنے سڑک پر رواں دواں بھاری ٹریفک کا ایک شور بپا تھا۔ کاروں، بسوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کی ہیڈ لائٹس آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کرتی لگ رہی تھیں۔ مگر اس کے اندر تاریکی اور سناٹے سے اُتر آئے تھے۔ وحشت اور دہشت نے ڈیرے سے جما رکھے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جائے تو کہاں جائے؟ کرے تو کیا کرے؟

مگر اس اتنے عظیم شہر کراچی کے لاکھوں لاکھ باسیوں میں سے کسی سے بھی تو اس کی واقفیت نہیں۔ کوئی ایک بھی تو اس کی جان پہچان والا نہ تھا۔ ماسوا سہیل منصور کے۔ مگر ان لوگوں سے تو ہمیشہ کے لیے ہر تعلق قطع کر آئی تھی۔

لاہور بھی واپس نہیں جا سکتی تھی کہ اول تو لاہور میں اس کا تھا ہی کون؟ اور لاہور کی اقامت نے ہی تو اس پر دنیاوی جہنم کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔

بھائی اور بھاوج کا بھی کوئی پتا و نشان نہ تھا۔ اور ادھر رات کے وقت تن تنہا یوں سڑکیں ناپنا بھی خود اپنے لیے ہزاروں خدشات اور خطرات پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اس پر اِدھر اُدھر گھومتے بھیڑیا صفت انسانوں کا خوف۔

اور وہ لمحے لمحے سے چوکنا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتی۔ بنگلوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

یہاں تک کہ بنگلوں کا سلسلہ ختم ہو کر کمرشل ایریا شروع ہو گیا۔ جہاں بہت گہما گہمی تھی۔ برابر کٹی پر ریسٹورنٹ سگریٹ پان کی دکان۔ الیکٹرک اپلائنسز کی دکانیں تھیں۔ اور اندر ایک سپر مارکیٹ بھی تھی۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں دکانوں کے آگے پارک کی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ ایک سروس لین تھی پھر بھی اس پر ایک تسلسل سے کاریں، ٹیکسیاں اور اسکوٹرز وغیرہ گزر رہے تھے۔ اور راہ گیر بھی خاصی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور وہ بڑی آسانی سے سب کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ گو کراچی میں ایک خوبی یا خامی یہ بھی ہے کہ عام حالات اور معاملات میں کوئی کسی کی

طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

لیکن جوان لڑکی کی مثال رنگین آنچل کی سی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک دیکھتے ہی مردوں کے دل مچل مچل اُٹھتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ میں تو سوٹ کیس بھی لٹک رہا تھا۔ اور وقت بھی ناوقتی کی نزاکت کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔ اس پر بعض لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے۔ گویا خطرہ عین اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کے نزدیک آ کر اس سے کچھ پوچھے گچھے۔ یا اسے تنہا دیکھ کر کوئی مذموم حرکت کر بیٹھے کہ عورت کی آبرو تو سیپ میں بند آبدار موتی کی طرح ہوتی ہے جس سے کوئی انسانی ہاتھ مس بھی کر جائے تو اس کی نرمی اور آب و تاب ماند پڑ جاتی ہے اسے ڈر تھا تو بس اسی بات کا ورنہ جان کی کسے پرواتھی۔ اس لیے ایسے حالات میں جن سے وہ دوچار تھی کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھ کر وہ جلدی سروس لین پار کر کے فٹ پاتھ پر بنے بس اسٹینڈ پر آ کھڑی ہوئی۔ پھر کتنی ہی بسیں آئیں اور مسافروں کو اتار اور چڑھا کر اپنی راہ ہولیں مگر وہ چپ چاپ کھڑی ہی رہی۔ حتیٰ کہ بس اسٹینڈ پر شیڈ کے نیچے ایک بینچ بھی پڑا تھا اور اتفاق سے خالی تھا۔ مگر وہ اس بینچ پر بھی نہیں بیٹھی۔ کیونکہ منزل تو بڑی چیز اسے تو کسی سمت کا ابھی اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر بھلا کسی بس میں بیٹھنے سے فائدہ ہی کیا ہوتا۔ بڑے ہی کٹھن لمحات تھے اس لیے۔

کہ پیچھے جو راستہ چھوڑ کر آئی تھی اُس پر پلٹ کر جانا ممکن تھا نہ آگے جانے کی کوئی راہ نظر آ رہی تھی۔

کیسی بے بسی اور کسمپرسی کے لمحات تھے۔ کہ سوچ بھی ناکارہ ہو گئی تھی اور دماغ بھی جواب دیتا لگ رہا تھا۔ اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے ٹریفک پر بلا مقصد ہی نگاہیں مرکوز کیے۔ نامعلوم کن خیالوں میں گم کھڑی تھی۔ شانے پر ہلکے سے دباؤ کے ساتھ ہی ایک غیر مانوس مگر نرم سی آواز نے اس کی بند بند سی کیفیت کو یک لخت منتشر سا کر دیا۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟" اس سوال پر اس نے گردن موڑ کر بائیں سمت دیکھا۔ شلوار سوٹ میں ملبوس، اچکن نما اوڑھنی کو ماتھے پر بالوں کی آخری حد تک ڈھانپے اور عمر کے جولانی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آنے والے جھول کھائے ہوئے چہرے کی وہ ایک معمر سی خاتون تھی۔ جس کے چہرے پر عمارت کے عظیم ہونے کی بھی کوئی نشانی یا آثار موجود نہ تھے۔ لیکن اس کی آنکھیں۔

قدرے چھوٹی اور متجسس سی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اس کے خوف کو کسی حد تک زائل کر دیا تھا۔ لیکن وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ کہ کہنے کو تھا ہی کیا۔

"کیا نو وارد ہو یہاں؟" اس نے پھر سوال داغا۔ اور اسے جھوٹ بولتے ہی بنی۔

"جی" اس نے پست سی آواز میں کہا۔

"اچھا مگر کہاں سے آئی ہو۔؟"

"لاہور سے"

"کب آئی ہو"

"ابھی"

"کیا تنہا ہو۔؟"

"جی"

"ارے تنہا آئی ہو تو۔ جن کے یہاں آئی ہو کیا وہ لوگ تمہیں لینے اسٹیشن بھی نہیں آئے"

"نہیں، کیونکہ میرا یہاں کوئی رشتہ دار ہے نہ واقف کار"

"او ہو تو پھر تم یقیناً یہاں کسی ملازمت کے سلسلے میں آئی ہو گی"، خاتون نے سر ہلا کر کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ تنہا اس کی کراچی آمد کا مفہوم سمجھ گئی ہو۔

"جی نہیں میں ملازمت کے سلسلے میں بھی نہیں آئی" اسے مزید جھوٹ بولنا گوارا نہ ہوا۔

"تو پھر کیا گھر سے بھاگ کر آئی ہو" عورت نے ایک دم ہی مشکوک ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ میں گھر سے بھاگی بھی نہیں۔ کیونکہ میرا تو یہاں نہ وہاں کوئی رشتے دار ہی نہیں ہے۔ میں تو اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوں" اس نے پہلی بار کھل کر بات کی۔

"اچھا اگر بالکل تنہا ہو تو اب تک کیا درختوں اور بھٹوں میں زندگی گزارتی آئی ہو"

"اب تک" سوال چونکہ بہت ٹیڑھا تھا اس لیے اس نے تھوک نگلتے ہوئے سوچا۔ اگر اس خاتون کو اب بھی صحیح بات نہ بتائی تو عین ممکن ہے کہ یہ میری طرف سے مشکوک ہو کر میرے لیے کوئی نئی مشکل کھڑی کر دے۔

"بھابی کے ایک عزیز کے یہاں رہ رہی تھی" اس نے بتایا بھی تو کچھ اس طرح جیسے دل سے گھڑ کر بتا رہی ہو۔ وہ خاتون سچ مچ اس کی طرف سے مشکوک ہی ہو گئی اور اسے قائل یا شرمندہ کرنے کی غرض سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"لو ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں پھر یہ بھابی ایک دم ہی کہاں سے پیدا ہو گئیں" کوئی اور وقت یعنی وہ اتنے خدشات میں نہ گھری ہوتی تو اس خاتون کو بری طرح لتاڑ دیتی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اس کی ذاتیات میں دخل نہ دے۔ مگر اس لمحے تو عرصہ حیات ہی اس پر تنگ ہو رہا تھا۔ مگر بھلا وہ خاتون کے اس سوال کا کیا جواب دیتی کیونکر اسے اپنے نجی معاملات سے آگاہ کرتی۔ یا اتنا ہی کہہ دیتی کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہ رہی تھی انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"دیکھیں آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں کسی کے یہاں ڈاکہ ڈال کر آ رہی ہوں نہ کسی کے ساتھ بھاگ کر ہی۔ بلکہ میں واقعی ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں"

"ٹھیک ہے اگر تم مصیبت زدہ بھی ہو تو آخر جا کہاں رہی ہو۔ کون سے روٹ کی بس پکڑنا چاہتی ہو جو آدھ پون گھنٹے سے یہاں کھڑی ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ آدھے گھنٹے سے تو میں تمہیں یہاں کھڑا دیکھ رہی ہوں"

"اصل میں تو میں لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے یہاں آ کر کھڑی ہو گئی تھی ورنہ خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے تو پھر کوئی بس پکڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔" اس نے کہا تو خاتون نے بڑی کھوجتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کمال ہے بظاہر تو تم پوری جوان اور سیانی ہو مگر یا تو باتیں بچوں کی سی کر رہی ہو یا پھر مجھے باتوں میں اڑانا چاہ رہی ہو۔ ابھی تم کہتی ہو کہ تم سیدھی لاہور سے یہاں آ رہی ہو۔ تو جب تمہارا کوئی ٹھیا ٹھکانہ ہی نہ تھا تو اسٹیشن کے ویٹنگ روم ہی میں کیوں نہ رُک گئیں۔ یہاں ــــ بازار کھڑے ہو کر اپنی آبرو کو داؤ ــ پر لگانے کیوں آ گئیں۔ دیکھو میں خفیہ پولیس کی ایک کارندہ ہوں اور مجھ سے جھوٹ بول کر تمہیں سخت نقصان اُٹھانا پڑے گا۔" وہ تو آہستہ بول رہی تھی مگر وہ خاتون اتنی اُونچی آواز میں بات کر رہی تھی کہ ارد گرد کھڑے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس پر وہ بتا رہی تھی کہ وہ خفیہ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس صورت حال سے سہم کر اس نے ملتجی سے لہجے میں کہا۔

"خدا کے لیے مجھے غلط نہ سمجھیے اور ذرا آہستہ بولیے۔ آپ اگر پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتی ہیں تو خدارا مجھ مصیبت زدہ کی مدد کیجیے۔ اور مجھے کسی ایسے ادارے تک پہنچا دیجیے جہاں مجھ جیسی لاوارث اور مصیبت زدہ لڑکیوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ جہاں سے آ رہی ہوں ان لوگوں نے میری زندگی کچھ ایسی عذاب بنا دی تھی کہ میں نے وہاں سے نکلنے ہی میں اپنی بہتری سمجھی" سچ کے اندر اپنے آپ کو منوانے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ شاید اسی قوت نے اس مشکوک خاتون کو متاثر کیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولی۔

"تم نے ایسے ناوقت اس گھر سے نکل آنے میں اپنی بہتری سمجھ کر سخت حماقت کی ہے۔ بہر حال سب کے اپنے اپنے حالات اور مجبوریاں ہوتی ہیں اور تمہاری بھی یہ کوئی مجبوری ہی ہو گی۔ لیکن میں اس وقت تو تمہیں کسی ایسے ادارے تک نہیں پہنچا سکتی البتہ میں تمہیں اپنے گھر لیے چلتی ہوں جہاں تم آرام سے رات گزار لینا۔ پھر میں کل کسی دارالامان

کا پتا معلوم کر کے تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گی۔"

مگر خاتون کی اس ہمدردانہ پیشکش کو غنیمت سمجھنے کے بجائے وہ بدک سی اٹھی۔ کہ کسی انجانی اور اجنبی خاتون کے ساتھ یونہی بلا سوچے سمجھے جا بھی کیسے سکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کون ہو اور کیسی ہو۔ اسے ساتھ لے جا کر اور اس پر قبضہ کر کے کہیں کسی کے ہاتھ اسے بیچ دیا تو پھر وہ دین کی رہے گی نہ دنیا کی۔ اسی خدشے کے تحت اس نے کہا۔

"نہیں میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آپ میں اگر تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو بس مجھے کسی ادارے کا پتا بتا دیں میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔" خاتون نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تم خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہو اور مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں تو تمہاری عقلمندی ہے کیونکہ آج کل تو اپنوں پر بھی مشکل ہی سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہو تو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں تمہارے اس ٹھکانے پر چھوڑ دوں جہاں سے تم آئی ہو۔"

"نہیں نہیں وہاں اب پھر پلٹ کر جانا مجھے مر کر بھی گوارا نہیں۔" وہ ہٹیلے سے انداز میں بولی۔

"تو کیا یہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر خود اپنے آپ ہی خطرات کو دعوت دو گی۔ دیکھو میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گی کہ مجھ پر اعتماد کرو۔ کیونکہ ایسا کہنا نری حماقت ہی ہو گا کہ میں تمہارے لیے ایک بالکل ہی اجنبی اور غیر عورت ہوں۔ البتہ اتنا اطمینان ضرور دلا سکتی ہوں کہ وہ جو اوپر بیٹھا اپنے بندوں کی ہر اچھی اور بری بات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ میری نیت اور ارادوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس لیے میری نیت اور ارادوں میں کسی فتور کو دخل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم اس ذات برحق پر ایمان رکھتی ہو تو میرے ساتھ چلی چلو ورنہ تمہاری مرضی میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔" دوسرے معنوں میں اس خاتون نے اپنے نیک ارادوں اور نیک نیتی کا خدا کو گواہ بنایا تھا۔ اور ایسی بات اگر کوئی عام بندہ بھی کہہ سکتا ہے تو اسی وقت جب اس کا دل نور ایمان سے معمور ہو۔ اس نے بھی سوچا کہ اب مزید انکار اس کی راست گوئی کی توہین ہو گا۔ اس لیے اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلیے مگر برائے مہربانی حسب وعدہ مجھے کل کسی ادارے میں ضرور پہنچا دیجیے گا۔" وہ پہلی بار ہنس کر بولی۔

"میں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا لیکن اگر تم اسے وعدہ ہی سمجھ رہی ہو تو میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ کل ہی تم کو کسی دارالامان میں پہنچا دوں۔" اپنی بات کہہ کر اس نے قریب سے گزرتی ہوئی موٹر رکشا کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر اس کے ساتھ رکشا کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"یوں تو عموماً میں بس سے ہی سفر کرتی ہوں مگر اب مزید بس کے انتظار میں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ اس لیے رکشا میں ہی چلتے ہیں۔" اور پھر اس کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر اس نے رکشا والے سے کہا۔

"مارٹن روڈ لے چلو۔" اور پھر شاہراہ فیصل پر واپس پلٹ کر ایک موڑ مڑنے کے بعد ناک کی سیدھ میں جو رکشا نے فراٹا بھرا تو سڑک شیطان کی آنت بن گئی۔ جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اور راستہ بھی کہیں بہت روشن تھا اور کہیں نیم تاریک مگر ٹریفک تھا کہ چاروں طرف سے اُبلے پڑ رہا تھا۔

اصل میں وہ شہید ملت روڈ تھی جو شاہراہ فیصل سے شروع ہو کر جیل کے آخری سرے تک ختم ہوتی ہے۔ اور وہیں بائیں ہاتھ کو مارٹن کوارٹرز کا علاقہ تھا۔ خاتون تمام راستے ایک لفظ نہیں بولی تھی۔

جہاں تک اس نے محسوس کیا وہ تمام راستے زیر لب کچھ پڑھتی رہی تھی۔ رکشا والے نے اس کے بتانے پر اندر گلی در گلی میں کوارٹروں میں ایک کوارٹر کے آگے رکشا روکی۔ خاتون نے پہلے اسے اتارا پھر خود اتر کر میٹر جھانک کر کرایہ ادا کیا۔ اور سامنے بنے ایک چھوٹے سے کوارٹر کی طرف بڑھتی ہوئی اس سے بولی۔

"آؤ بسم اللہ۔ اندر چلو۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر پہنچ کر کنڈے میں پڑے بڑے سے تالے کو کھولا اور اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔

روشنی ہو جانے کی وجہ سے کمرے کی ہر شے واضح ہو گئی۔

کمرے میں ایک پلنگ۔ ایک چوکور میز دو کرسیوں۔ دو صندوقوں اور صراحی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ فرش پر ایک خوش نما سا غالیچہ ضرور بچھا ہوا تھا۔ مگر چیزوں کی سیٹنگ کچھ اتنے قرینے سے کی گئی تھی کہ نفاست کے ساتھ ساتھ خوش سلیقگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اب تک منہ اسی طرح ڈھانپے کہ صرف اس کی آنکھیں ہی تھوڑی سی نکلی نظر آ رہی تھیں دروازے کے آگے ہی کھڑی تھی۔ خاتون نے دروازے کا اندر سے کھٹکا لگاتے ہوئے اس سے کہا۔

"بیٹی آرام سے میرے پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ اطمینان رکھو یہاں کوئی مرد تو کیا عورت بھی نہیں آئے گی۔ تم بے فکر ہو کر اپنا یہ چادر وہ بھی چہرے سے ہٹا دو۔ اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دے دو۔ اصل میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں ابھی تک عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ بس ذرا نماز پڑھ لوں پھر تم سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" سلوط پر گویا پہلا امپریشن ہی اس کی پرہیزگاری کا پڑا تھا۔ اس کے دل میں جو شک و شبہات باقی رہ گئے تھے وہ بھی دور ہو گئے۔ عورت دوسرا دروازہ کھول کر باہر صحن میں کہیں وضو کرنے چلی گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد۔ وضو سے تر چہرہ لیے اندر آئی اس کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر جانماز بچھا کر نماز ادا کرنے لگی اور سلوط نے اٹھ کر پہلے دوسرے کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھانکا۔

باہر اسے ایک تنگ سا صحن نظر آیا جس کے بائیں طرف باورچی خانہ، غسلخانہ اور بیت الخلا بنا ہوا تھا۔ باہر صحن میں ہلکی پاور کا بلب جل رہا تھا اس لیے ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ باہر صحن میں بالکل سناٹا پڑا تھا پھر بھی سلوط نے اس کے پلنگ کی طرف پلٹنے سے پہلے دوسرے دروازے کی بھی اندر سے چٹخنی لگائی اور اپنی چادر اُتار کر اور دوپٹے کو قرینے سے اوڑھ کر اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

پھر تھوڑی دیر نہیں بلکہ خاصی دیر اسے انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر وہ خاتون نماز سے فارغ ہوئی اور جانماز تہہ کر کے اسے صندوق پر رکھ کر بولی۔

"پہلے میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔ آج تو صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں کام ہی کچھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ تمہیں بھی تو بھوک لگ رہی ہو گی۔"

"نہیں میں تو کھانا کھانے کے بعد ہی وہاں سے نکلی تھی۔ لیکن آپ ضرور کھائیں آپ نے ویسے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" سلوط بولی۔

"ہاں ہاں بھئی۔ میں تو ضرور کھاؤں گی میں بھوک کے معاملے میں ویسے بھی کچی ہوں۔ یوں بھی بیٹی بڑھاپے میں انسان صرف کھانے کے سہارے جیتا ہے۔ کیونکہ جوانی میں تو پانی بھی اسے خون بن کر لگتا ہے۔ اصل میں عمر عمر کا فرق ہوتا ہے نا۔" خاتون نے کہا اور پھر چٹخنی کھول کر باہر نکل گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں بڑی نفاست سے کھانا چنا ہوا تھا۔

ایک خوبصورت سے نقشین پیالے میں تھوڑی سی دال تھی۔

ایک میں سالن۔ اچار کی بوتل۔ ایک پلیٹ میں روٹی اور پانی سے لبالب شیشے کا گلاس۔ جبکہ ٹرے میں ایک سفید جھک ٹرے کلاتھ بھی بچھا تھا۔ ٹرے کو اس نے ایک چھوٹی سی چوکور میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے آگے ہی بیٹھ گئی۔ سلوط نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ اس کے دل میں پھر شک و شبہات سر ابھارنے لگے تھے۔ کہیں یہ محض ایک دکھاوا ہی نہ ہو۔ پارسائی کا ڈھونگ ہی نہ ہو۔ چھوٹا سا بھی سہی مگر کوارٹر کے اس کمرے میں وہ تنہا تو ہرگز نہیں رہتی ہو گی۔ یہی سب سوچ سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہولتی رہی۔

ادھر وہ خاتون بڑی باتونی ثابت ہوئی تھی اور ٹیپ کی طرح مسلسل بجے ہی جا رہی تھی۔

"بازار کا کھانا خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو مگر مجھے تو اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ہی مزا دیتا ہے۔ اس لیے میں صبح تڑکے اٹھ کر نماز اور گھر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کھانا تیار کر کے جاتی ہوں۔ مگر ساتھ اس لیے نہیں لے جاتی کہ ایک تو فرصت ہی مشکل سے ملتی ہے دوسرے ٹھنڈا کھانا مجھے ہضم نہیں ہوتا۔ چاول

مجھے بہت مرغوب ہیں مگر چاول کھانے سے میرے پیٹ میں اپھارا سا ہوتا ہے جوڑوں میں بھی درد ہونے لگتا ہے اس لیے عرصہ ہوا میں نے چاول کھانے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ اصل میں یہ کراچی کی ہوا بہت مرطوب ہوتی ہے نا اس لیے بادی چیزیں مجھے بہت نقصان دیتی ہیں۔"

اف ادھر اس کی جان پر بنی تھی اور ادھر یہ نہایت غیر متعلقہ اور فضول سی باتیں سننے کو مل رہی تھیں گویا دوسرے معنوں میں خاتون کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کسی خوش وقتی میں اس کے یہاں نہیں آئی ہے۔ یا پھر وہ دانستہ ایسی باتیں کر کے اسے پٹانا چاہ رہی تھی۔ مارے کوفت کے سلوط کا برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کی لنترانی کو برداشت کر رہی تھی۔

آخر کھانے کے اختتام پر وہ خاتون خود ہی خاموش ہو گئی۔ اٹھ کر خاموشی سے ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی دیر لگا کر آئی۔ مگر آئی تو ایک چھوٹی سی طشتری میں چائے کے دو کپ لے کر آئی۔

"یوں تو خاصی گرمی پڑ رہی ہے۔ مگر ہم کراچی والے تو صدفی صد چائے کے رسیا ہوتے ہیں اس لیے میں تمہارے لیے یہ گرم گرم چائے بنا کر لائی ہوں جبکہ چاہیے تو تھا کوئی ٹھنڈی چیز یا مشروب پیش کرتی۔ مگر مجھ غریب کے پاس فرج ہے نہ بازار سے کوئی برف لانے والا ــــ بس تھوڑی دیر کے لیے یہ سمجھ لو کہ جیسا ساز ویسا راگ۔ اب یہاں تمہیں برف میں لگا ٹھنڈا پانی بھی نہیں مل سکے گا۔"

"لیجیے۔ میں ایسی کون سی برف کی عادی ہوں۔ بس جیسا مل جاتا ہے وہی کھا پی لیتی ہوں۔ اصل میں، میں نے خود کو ہر طرح کا عادی بنا رکھا ہے۔" سلوط بولی۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹی۔ کیونکہ اس مزاج کا انسان برے سے برے حالات کا سامنا کر سکتا ہے۔ ہاں اب بتاؤ کہ تمہاری بھابی کے رشتے داروں نے تمہارے ساتھ ایسی کیا بدسلوکی کی تھی جو تمہیں ان کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔" خاتون نے گویا اب اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بڑی طویل داستان ہے خالہ جان۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ کچھ ایسی ہی نوبت آ گئی تھی جو میں نے ان کے گھر سے نکل کر اپنی عزت پر بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ معاف کیجیے گا میں نے آپ کو خالہ جان کہہ دیا۔" سلوط نے گویا یہ کہہ کر بڑی خوبصورتی سے اپنے معاملات پر پردہ ڈالا۔

"خیر خالہ جان ہی کیا تم مجھے اماں جان بھی کہہ سکتی ہو۔ لیکن اگر آنٹی فلورا کہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" خاتون مسکرا کر بولی۔

"آنٹی فلورا۔ لیکن آپ تو مسلمان ہیں ابھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔" سلوط نے سخت متعجب ہو کر کہا۔

"ہاں الحمدللہ میں مسلمان ہی ہوں۔ لیکن تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے۔ اگر موقع ملا تو پھر کبھی سنا دوں گی۔ اس وقت تو تم اپنی سناؤ۔" خاتون نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے آپ اپنی داستان سنائیے۔ ورنہ میری عادت ہے کہ تجسس کے عالم میں کوئی بات ہی نہیں کر سکتی۔"

"اچھا پہلے تم چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی تو کیا خاک مزا دے گی۔" لیکن اس نے سنا تھا کہ بعض لوگ چائے یا پانی وغیرہ میں بےہوشی کی کوئی دوا ملا دیتے ہیں۔ کہیں ان آنٹی فلورا نے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی ہو جو یہ چائے پی کر بعد میں مجھے پچھتانا پڑے۔

"آپ اتنی محبت سے میرے لیے چائے بنا کر لائی ہیں اس لیے انکار کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ ورنہ یقین جانیں میں صبح ناشتے کے سوا بالکل چائے نہیں پیتی۔ اور رات کو پینے سے تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ خیر پی لوں گی مگر ذرا ٹھنڈی ہو جائے۔" اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد گویا بہت خوبصورتی سے چائے پینے سے انکار کیا تو آنٹی فلورا نے اس کے آگے سے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اگر نیند اڑ جاتی ہے تو ہرگز نہ پینا۔ یوں بھی بہت تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔ تمہارے چاند سے مکھڑے پر جو یہ اضمحلال سا نظر آ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کئی راتوں سے نہیں سوئیں۔ میرے خیال میں تو اب تم آرام سے پڑ کر سو جاؤ باقی باتیں ہم کل کسی وقت کر لیں گے" اور اس نے سوچا کہ کل باتیں کرنے کا موقع ہی

کب ملے گا۔ وہ تو کسی دارالامان میں چلی جائے گی۔

"جی ہاں تھکی ہوئی ضرور ہوں مگر اب اتنی بھی نیند نہیں آ رہی۔ اور کم از کم آپ کی داستان سننے کے قبل تو بالکل نہیں آئے گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ارے بچی دنیا میں ایسا کون ہوگا جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی داستان۔ کوئی نہ کوئی المیہ نہ لگا ہوگا۔ جبکہ میں تو ایک بہت ہی معمولی بہت ہی حقیر شے ہوں۔ خیر تمہیں اس قدر اشتیاق ہی ہے میری داستان سننے کا تو سنو۔" اس نے اپنی بات کہہ کر قدرے توقف کیا اور پھر بولی۔

"میں اپنی داستان تو تمہیں بعد میں سناؤں گی لیکن پہلے میں تم سے ایک جھوٹ بات کہنے پر معذرت کر لوں۔"

"جھوٹ بات۔" سلوط نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں میں نے خود کو پولیس کا کارندہ ظاہر کر کے جھوٹ ہی بولا تھا۔ اصل میں اس وقت کچھ سچویشن ہی ایسی تھی کہ مصلحتاً مجھے غلط بیانی سے ہی کام لینا پڑا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر تم کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوئیں تو میرے اتنے ذاتی استفسارات پر کہیں الٹا مجھے ہی پھنسوا دو۔ کہ آج کے کھوٹے اور مطلبی زمانے میں ایسا ہی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی کی ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں الٹی آنتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔" خاتون نے کہا تو سلوط بولی۔

"لیکن یقین جانیں آنٹی میں آپ کو پولیس کے محکمے سے متعلق سمجھ کر بھی بالکل مرعوب نہیں ہوئی تھی کیونکہ میرا ضمیر مجرم نہیں تھا۔"

"ہاں ہاں میں تو چند سوالات کے بعد ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بہت راست گو اور بے قصور ہو۔ لیکن یہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں تم سے اپنی دروغ گوئی کی معذرت کر لوں۔ بہرحال اس وقت رات کے گیارہ بج چکے ہیں تم اگر چاہو تو سو سکتی ہو ورنہ۔"

"نہیں نہیں آپ اپنی داستان سنائیے۔" سلوط جلدی سے بولی۔ حالانکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ آنٹی فلورا کو سخت نیند آ رہی ہے۔ وہ بار بار جمائیاں بھی لے رہی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی بند ہو رہی ہیں۔ مگر اس کا خود ارادہ نہیں تھا سونے کا۔ وہ ساری رات جاگ کر گزار دینا چاہتی تھی۔ خاتون نے پہلی بار تھوڑا سا منہ بنایا پھر دیوار کی طرف سرک کر تکیے سے ٹیک لگا لی۔

"میرے والد گڑھ مکتیشر میں انگریز کمشنر کے اردلی تھے۔ بہت اچھی تنخواہ تھی اور تنخواہ کے علاوہ ٹپ وغیرہ بھی بہت مل جاتی تھی۔ اس پر ان کے پاس چند بیگھے زمین بھی تھی اور ذاتی مکان بھی۔ یعنی کوئی مالی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ میں تو اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے آتا ہے۔

مرغن کھانے۔ کیک پیسٹریاں، بسکٹ، چاکلیٹ، ٹافیاں، پھل اور میوے کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو کھانے کو نہ ملتی ہو۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بڑا بھائی زبانی زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا جو شہر سے باہر ایک قریبی گاؤں میں تھی اور جس میں ابا کا ذاتی یا آبائی مکان بھی تھا جس میں بڑا بھائی رہتا تھا۔ ہم باقی بہن بھائی اور والدین ابا کو محکمے کی طرف سے ملے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ بڑے سے چھوٹی آپا تھیں اور اس سے چھوٹے بھائی کو ابا نے ایک مشنری اسکول میں داخل کرا رکھا تھا۔ اس بھائی سے چھوٹی بہن تھی اور میرے بعد چھوٹا بھائی۔ اتنے سکھ چین سے زندگی گزر رہی تھی کہ آج کل کے زمانے میں کوئی چاہے بھی تو نہیں گزار سکتا ــــ میری عمر اس وقت مشکل سے سات سال کی تھی اور میں کچھ بہت ہی لاپروا کھلنڈری واقع ہوئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہ تھا کہ گھر میں اور گھر سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یوں بھی گھر میں، میں ٹکتی ہی کب تھی۔ ہمارے پڑوس میں ایک مسیحی گھرانا آباد تھا۔ آنٹی پامیلا اور انکل کرسٹوفر۔ ان کے بھی کئی بچے تھے۔ میں سارا سارا دن ان کے گھر میں گھسی ان کے بچوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اماں سے اسی بات پر بہت پٹتی بھی تھی کہ میں گھر میں ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتی۔ مگر آنٹی پامیلا ہمیشہ مجھے پٹنے سے بچا لیتی تھیں۔

ان کے اور اماں کے درمیان بہت گہری دوستی تھی۔ ابا جو کچھ بھی کمشنر صاحب کے یہاں سے بچا کھچا لاتے اماں

اس میں سے آنٹی پا میلا کا حصہ ضرور علیحدہ نکال کر رکھ لیتی تھیں۔ مگر خود ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا یا بھیجا ہوا کبھی نہ کھاتی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے کتے پال رکھے تھے جو اُن کے ہاتھوں اور کپڑوں کو حتیٰ کہ کبھی کبھی منہ کو بھی چاٹ لیا کرتے تھے مگر وہ کبھی ہاتھ یا منہ نہیں دھوتی تھیں۔ جبکہ اماں پنج وقتہ نمازی اور پرہیز گار تھیں۔ اور ان دنوں بھی ہمارے مذہب میں کتے کی رال ناپاک ہوتی ہے۔ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں نیکی کے فرشتے نہیں آتے اور ہم کتے کو انتہائی پلید سمجھتے ہیں۔ خیر آنٹی پا میلا بھی اماں کی اس بات کا ذرا بھی برا نہیں مانتی تھیں۔ بلکہ اماں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی کتوں سے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اصل میں اماں ان کا بہت خیال رکھتی تھیں مجھے تو یہی یاد ہے کہ بعض دن تو اماں انہیں پورا پورا کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ انکل کرسٹوفر گو بڑے بد مزاج آدمی تھے ان کے بچوں کی ان سے جان نکلتی تھی لیکن میرے ساتھ وہ بڑی نرمی اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ بیسیوں بار انہوں نے ابا سے کہا تھا کہ مجھے اسکول میں داخل کرا دیں۔

مگر چونکہ سرکاری اسکول ہمارے کوارٹر سے بہت دور تھا اور مشنری اسکول میں بھائی کو بھی مشکل سے داخلہ ملا تھا شاید اس لیے ابا نے مجھے اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا آنٹی پا میلا بھی مجھے انگریزی کا قاعدہ پڑھایا کرتی تھیں کیونکہ اردو پڑھنی اور لکھنی انہیں آتی ہی نہیں تھی۔

بہر حال۔ جانے ایک دم ہی بیٹھے بٹھائے سب کو کیا ہو گیا تھا کہ ابا نے بڑے بھائی کو بھی اپنے بلا لیا تھا۔ اور ہم سب کو لے کر کوارٹر میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ دن کو بند ہو کر بیٹھے تھے یا رات کو لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ جھٹپٹے کا وقت تھا بہن شاہدہ گھر کی بندش سے ہی گھبرا کر گھر سے باہر نکل گئی تھی حالانکہ اماں مجھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی تھیں مگر میں بھاگ کر برابر والے آنٹی کے کوارٹر میں جا کر چھپ گئی تھی۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا تھا میں آنٹی کے اس چھوٹے سے اسٹور میں کب تک اور کتنی دیر تک چھپی رہی تھی۔

لیکن باہر نکلی تو رات ہو چکی تھی۔ اور کچھ ایسا غل مچا ہوا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ بھائیں بھائیں کی آوازیں۔ ”جے ہند اور ست سری اکال کے نعرے“ اور لوگوں کی چیخ و پکار۔

ظاہر تھا میں ایک کمسن سی بچی تھی اس لیے ان ڈراؤنی آوازوں اور شور سے خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود بھی میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا میں یہ دیکھنے کے لیے اسٹور سے نکل کر سیدھی باہر بھاگی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تو کسی نے بھاگ کر مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ آنٹی تھیں جنہوں نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور یوں میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

” باہر نہیں جاؤ۔ باہر تمہارا واسطے بہت کھترا (خطرہ) ہے۔ آؤ ہم تم کو اپنا باہر والا کھولی میں چھپا دیں۔ آؤ پوار گل“ آنٹی جلدی سے مجھے اسٹور روم میں گھسیٹ کر بولیں۔

وہ بہت خوفزدہ لگ رہی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس لیے شاید میں بھی ڈر گئی تھی۔ ورنہ ان دنوں مجھے خطرے کا مفہوم ہی معلوم نہیں تھا۔

پھر آنٹی مجھے اپنے بچوں کی آنکھ بچا کر کوارٹر کے عقبی حصے میں ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں لے آئیں جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اس قدر اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

” دیکھو اچھے بے بی لوگ کے ماپھک (موافق) ادھر آرام سے بیٹھو۔ ہم ابھی تھوڑا دیر بعد آ کر تمہیں ادھر سے نکال لے گا۔ دیکھو اگر تم باہر آیا تو ادھر یہ بوچر (قصائی) لوگ چاکو (چاقو) سے تمہارا گلا کاٹ دے گا“۔ آنٹی نے بہت عجلت میں مجھے تاکید کی اور پھر بھاگ کر اندر چلی گئیں۔ اور مجھے دیکھو۔ میں اسی کھولی کے فرش پر تھوڑی سی جگہ بنا کر بیٹھی اور پڑ کر بے سدھ سو گئی“۔ اپنی داستان یا روداد سناتے سناتے خاتون کو شاید کسی دلخراش یاد نے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ مگر پھر کچھ ہی دیر بعد۔ وہ اپنی آنکھوں کو رگڑنے کے بعد بولی۔

” اور جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ تباہ ہو چکا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی اور گھر جسے ہندوؤں اور سکھوں نے جلا ڈالا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہا تھا ماسوا میری اپنی ذات کے ورنہ بڑا بھائی اگر گاؤں سے نہ بلایا جاتا تو اس کے بچنے کے تو امکانات ہو سکتے تھے۔ مگر وہاں تو سب ہی شہید کر دیے گئے تھے۔ اور مجھ شقی دل کو دیکھو کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچھڑ جانے پر روئی۔ چلائی نہ تڑپی۔ البتہ گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

آنٹی کے ملنے جلنے والوں اور دوستوں کے بچے آتے تو میں بہت فخر یہ انہیں اپنا کوارٹر دکھا کر کہتی۔

” دیکھو یہ میرا کوارٹر تھا۔ اس میں میں میرے والدین اور بھائی بہن رہتے تھے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے سب کو مار ڈالا۔ اب میں ہی بچی ہوں۔ میں “ یہ کہہ کر کبھی میں ہنسنے لگتی اور کبھی رونے لگتی۔

آنٹی نے مجھے اپنے یہاں پناہ دی تھی اور سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ مگر دوسروں پہ یہ راز جلد ہی فاش ہو گیا کہ قائم علی کی چھوٹی بیٹی کو مسٹر کرسٹوفر نے اپنے یہاں چھپا رکھا ہے۔

مسلمانوں کے خون کے پیاسے کتے ابھی تک مسلمانوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے انہیں معلوم ہوا تو آنٹی پر چڑھ دوڑے۔ اور مجھے ان کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکل کرسٹوفر نے بھی کہا کہ ”ہاں اس مسلمان لڑکی کو ان لوگوں کے حوالے کر دو“ مگر آنٹی پا میلا کسی طور پر مانی ہی نہیں۔

” ہم نے فریدہ کو اپنی بیٹی بنایا ہے۔ اور اسے کرسچین بنا کر اس کا نام فلورا رکھ دیا ہے ہم اس کو ہرگز ہرگز تم لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا“۔ آنٹی بھی اپنے موقف پر اڑ ہی گئیں۔ اصل میں تو میری زندگی باقی تھی اس پر قدرت کی مصلحت کچھ یہی تھی کہ اس نے آنٹی پا میلا کے دل میں میری محبت ڈال دی تھی۔ جو ان درندہ صفت وحشی لوگوں نے زیادہ حیل و حجت نہیں کی اور مجھے آنٹی کے پاس چھوڑنے کے لیے راضی ہو گئے۔

پھر میری پرورش آنٹی کے یہاں ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے گڑھ مکتیسر کے واحد مشنری اسکول میں داخل کرا دیا اور خود بھی مجھے عیسائی مذہب کی تعلیم دینے لگیں۔ ہر اتوار کو وہ مجھے گرجا بھی لے جاتی تھیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بت کے سامنے وہ مجھے گھٹنے ٹیکنے اور سر جھکانے کو کہتیں۔ وہ مجھے بائبل کے کوٹیشن پڑھنے کو کہتیں تو میں وہ بھی پڑھ لیتی لیکن جب مقدس پانی پینے کو دیتیں تو میں انکار کر دیتی۔

اور جب بھی وہ مجھے مسیحیوں کے مخصوص اشارے کراس بنانے کو کہتیں تو کراس بناتے ہوئے میرے منہ سے آپ ہی آپ کلمہ طیبہ جاری ہو جاتا۔ اور اس پر وہ کبھی کبھی اتنی خفا ہوتیں کہ مجھے مارتے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔

اور کبھی مجھے یہ ڈراوا دیتیں کہ اگر تم نے ہمارے کہنے کے مطابق نہیں کیا تو ہندو اور سکھ لوگ تم کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر تمہیں قتل کر دیں گے۔

لیکن اس وقت مجھے موت کا مفہوم معلوم ہی نہ تھا البتہ میں گلا والا کاٹ دینے کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔

اصل میں میرے لاشعور میں اماں کی بھائیوں اور بہنوں کو نصیحتیں اور ان کا سختی سے صوم و صلوٰۃ کا پابند ہونا کتوں سے اس قدر پرہیز کرنا کچھ اس مضبوطی سے جم کر بیٹھ گیا تھا کہ آنٹی کا کوئی بڑے سے بڑا ڈراوا بھی مجھے متاثر نہیں کرتا تھا۔ اور اس بات کا احساس تو مجھے بہت بعد میں ہوا اس وقت تو مجھے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

اصل میں جو انسان پیدائشی مسلمان ہوتا ہے وہ مرتے دم تک مسلمان ہی رہتا ہے خواہ اس کی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو وہ مسلمان ہی رہتا ہے کیونکہ اسے اندر ہی اندر غیبی طور پر ہدایت ملتی رہتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

پھر میں اس مسیحی ماحول میں گویا چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ یعنی پورے چھ سال تک آنٹی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہی۔ اور اس عرصے میں آنٹی اور انکل نے ہر ممکن طریقے سے مجھ پر زور ڈالا کہ میں ان کا مذہب اپنا لوں مگر جب میں آمادہ نہ ہوئی تو آنٹی نے میری طرف سے مایوس ہو کر مجھے مشنری ایک نن کے ساتھ جو پاکستان جا رہی تھی۔ لاہور بھیج دیا۔ لاہور میں بھی مجھ پر کافی زور ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ مجھ پر سختی بھی کی گئی۔ مگر میری نا ہاں میں نہ بدل سکی۔ اصل میں آنٹی پا میلا نے بوقت رخصت میرے سامنے ہی اس نن سے کہہ دیا تھا کہ میری دلی خواہش تو یہی ہے کہ یہ میرا مذہب اختیار کر لے لیکن اگر یہ آپ کے بھلانے پھسلانے سے بھی نہ مانے تو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیجیے گا۔ اصل میں میں نہیں چاہتی کہ اس پر کوئی زیادتی کی جائے کیونکہ اس

کی ماں کے مجھ پر بہت سارے احسانات ہیں۔ اور یہ مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نرس نے تنگ آ کر مجھے ایک رئیس خاتون کے یہاں ملازم رکھوا دیا جو پیروں سے معذور تھی اور میری خوش قسمتی سے مسلمان تھی۔ اس نے میری بپتا سنی تو مجھ پر ایسی مہربان ہوئی کہ اس نے اپنی خدمت کرانے کے ساتھ ساتھ مجھے تعلیم بھی دلوائی اور اس طرح گھر میں ہی ایک استانی سے پڑھ کر میں نے چار برس کے اندر اندر میٹرک کا امتحان دے دیا۔ مگر یہ میری بدنصیبی ہی تھی کہ بیگم صاحبہ پر ایک رات فالج گرا اور وہ چند روز ہی میں چٹ پٹ ہو کر رہ گئیں۔ بیگم صاحبہ ایک تو لاولد تھیں اس پر بیوہ بھی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شوہر کے بھتیجوں نے ان کے گھر اور املاک پر قبضہ کر لیا۔ اور یوں انیس سال کی عمر میں مجھے ان کے گھر سے نکلنا پڑا۔ مگر اس دوران میں اس نرس سے جو ان کی تیمارداری کرنے پر مقرر کی گئی تھی۔ میری اچھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے نرسنگ اسکول میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ خود میرا داخلہ کرا دیا تھا۔ میرے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ جس سے میں نے نرسنگ کورس کیا اور پھر جلد ہی مجھے ایک ہسپتال میں نوکری مل گئی اور وہ دن اور آج کا دن میں اس پیشے پر لگی ہوئی ہوں۔ البتہ لاہور میں تھی اور اب کراچی آ گئی ہوں۔" خاتون نے گویا اپنی داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے اپنا نام کیوں نہیں بدلا؟" سلوط نے پوچھا۔

"ارے بیٹی! نام بدلنے سے بھی کیا فرق پڑتا۔ یوں بھی اگر نام کے کچھ اثرات بھی ہوتے ہیں تو فریدہ نام میرے لیے بہت منحوس ثابت ہوا تھا کیونکہ اس نام نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اور پھر فلورا کی مجھے شروع ہی سے عادت پڑ گئی تھی۔ اس پر آنٹی پامیلا نے ہی مجھے یہ نام دیا تھا اور مجھ سے رخصت ہوتے وقت وہ جس طرح بلک بلک کر روئی تھیں۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ان کے دیے ہوئے نام کو بدل دوں۔" فلورا نے مجھے بتایا اور پھر ایک طویل سی جمائی لے کر بولی۔

"اوہو ایک بج رہا ہے۔ جبھی تو مجھے اتنی سخت نیند آ رہی ہے۔ ویسے بھی میں صبح کی اذان کے وقت اٹھنے کی عادی ہوں۔ رات میں زیادہ سے زیادہ دس بجے تک سو جاتی ہوں مگر اب تو خدا ہی ہے جو اتنے سویرے آنکھ کھلے۔ خیر اب تم یہیں پلنگ پر سو جاؤ۔ میں نیچے غالیچے پر سو جاؤں گی اور خود اٹھ کر دونوں دروازوں کے کھٹکے چیک کر لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ شک و شبہات میں تمام رات جاگتی رہو۔"

"اوہ! آنٹی فلورا دل کی بات کیسے پڑھ لیتی ہیں۔" اس نے شرمندہ ہو کر دل میں سوچا اور جلدی سے بولی۔

"نہیں غالیچے پر تو میں سوؤں گی۔ آپ اپنے پلنگ پر سوئیے اور بلاوجہ ہی میری خاطر اپنے آرام میں خلل نہ ڈالیے۔"

مگر فلورا نے اس کی بات نہیں مانی اور غالیچے پر ہی سوئی۔

فلورا تو کچھ ہی دیر بعد غالیچے پر لیٹ کر بے سدھ ہو گئی۔ مگر اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ اس نے اٹھ کر پہلے دروازوں کے کھٹکے چیک کیے۔ پھر پلنگ پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی رہی کہ آیا اس کی باتوں میں کچھ صداقت بھی ہے یا نہیں۔ اور یہی سب سوچتے سوچتے جاگتے رہنے کی ہزار کوشش کے باوجود رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اور جب کھلی تو یہ دیکھ کر کہ کمرے کا بلب جل رہا ہے اور صحن کی طرف کھلنے والا دروازہ چوپٹ کھلا ہے اور فلورا بھی کمرے سے غائب ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ کہیں وہ میرے سونے سے فائدہ اٹھا کر کسی کو بلانے تو نہیں گئی۔ یا پھر مجھے اس مکان میں اکیلا چھوڑ کر کہیں چمپت نہ ہو گئی ہو۔ اس خیال نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ کیوں نہ میں دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر بیٹھ جاؤں۔ اس طرح کم از کم وہ کسی کو اندر لانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے فی الوقت اسے یہی ترکیب نظر آئی۔ مگر ابھی اس نے اٹھنے کی غرض سے اپنے پیر فرش پر جمائے ہی تھے کہ وہ کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔

"ارے تم بھی جاگ گئیں۔ چلو اچھا ہوا۔ جلدی سے جا کر وضو کر آؤ۔ اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے جاگتا ہوا دیکھ کر کہا۔ تو سلوط نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔ اتنی بے اعتمادی بھی اچھی نہیں ہوتی سلوط بلکہ بدگمانی بن جاتی ہے اور بدگمانی بہت بڑا گناہ ہے۔

بہرحال۔ اس نے محض اس پر یہ جتانے کی خاطر وہ اس کی طرف سے بدگمان نہیں ہوئی ہے اٹھ کر وضو کیا اور پھر کمرے میں آ کر نماز فجر ادا کی۔

"مجھے تو ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ ایک دو گھنٹے اور آرام کر لو پھر کلینک جاتے وقت میں تمہیں جگا دوں گی۔" فلورا نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔ اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بلا جواب دیے خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرے کلینک میں ڈاکٹر صاحب سے علاج کرانے ایک سوشل ورکر آتی ہیں۔ میں ان سے آج ضرور کسی نہ کسی ایسے ادارے کے بارے میں معلوم کروں گی جہاں تم عزت کے ساتھ رہ سکو۔" فلورا نے اسے اس قدر خاموش دیکھ کر گویا اطمینان دلایا۔

"یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ کلینک لے چلیں۔ ویسے بھی میں یہاں تنہا رہ کر کیسے وقت گزاروں گی۔" سلوط نے تکیے سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ہیں۔ اچھا تم بھی چلی چلنا۔ اصل میں ڈاکٹر صاحب بڑے خرد ماغ ہیں۔ مگر خیر، میں اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کروں گی۔" فلورا نے اسے ساتھ لے جانے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تب وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گئی۔

پھر سات بجے کے قریب فلورا نے اسے جگایا اور چلنے کے ساتھ ایسے سک پیش کرتے ہوئے اسے تیار ہو جانے کو کہا۔ تو وہ جلد جلد ناشتا کر کے اس کے ساتھ کلینک روانہ ہو گئی۔ کلینک تک کا سفر اس نے بس سے کیا جو نرسری میں واقع تھا۔ مگر جیسی کہ اس کی خواہش تھی اور فلورا کا خیال تھا کہ وہ اس سوشل ورکر کے ذریعہ سے کسی دارالامان جیسے ادارے کا پتا چلا لے گی تو اس روز وہ سوشل ورکر ہی نہیں آئی۔ فلورا نے دوسری نرسوں وغیرہ سے بھی پوچھا لیکن تقریباً سب ہی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور تین روز گزر گئے۔ فلورا نے کہا تھا کہ چھٹی کے دن وہ خود جا کر معلوم کرے گی۔ مگر ہوا یوں کہ اس روز جس کے اگلے دن عام تعطیل کا دن تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کلینک لے کر گئی تو اتفاق سے فلورا کی ایک جگری دوست شیلا جو لاہور سے آئی ہوئی تھی۔ اس سے ملنے آ گئی۔ وہ اب تک اس ہسپتال میں کام کر رہی تھی جس میں فلورا عرصے تک ملازمت کرتی رہی تھی۔ دونوں بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملیں اور بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں مگر ڈیوٹی کا سوال تھا۔ اور وہ کلینک میں بیٹھ کر اتنے آرام سے باتیں نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے ڈیوٹی ختم ہونے سے دو گھنٹے قبل ہی وہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر اسے اپنے گھر لے آئی۔ شیلا چاہ رہی تھی کہ فلورا اس کے ساتھ لاہور چلے اور اپنی پرانی ملازمت سنبھال لے۔ لیکن فلورا کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوئی۔ تب معاً اسے سلوط کا خیال آیا تو اس نے شیلا سے پوچھا۔

"ارے ہاں شیلا! تم اس مونا کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ تمہارے پاس تو اسے رکھنے کے لیے جگہ بھی بہت ہے۔ اور پھر تم اسے نرسنگ کے کام پر لگوا دینا۔" مگر اس سے پہلے کہ شیلا کچھ کہتی، سلوط نے کہا۔

"لیکن میں تو لاہور ہرگز نہیں جاؤں گی آنٹی فلورا! ہاں البتہ مجھے کسی اور جگہ لگوا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔" اور فلورا چونکہ اس کے لاہور جانے سے انکار کر دینے کی وجہ معلوم تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مگر اور کس جگہ بھیجوں تمہیں۔ کیوں شیلا پنڈی یا کسی اور شہر میں کوئی ایسا نرسنگ ہوم ہے جہاں کسی سے تمہاری واقفیت ہو کیونکہ مونا کو نرسنگ کی ٹریننگ بھی تو لینی پڑے گی۔" شیلا نے پہلے تو نفی میں گردن ہلا دی پھر کچھ یاد کر کے بولی۔

"ارے ہاں۔ وہ اپنی ونی ہے نا۔ وہی ونیفرڈ ڈبریرا۔"

"ہاں ہاں۔" فلورا نے جلدی سے کہا۔

"وہ آج کل سرگودھا میں نرسوں کے ہوسٹل کی انچارج لگی ہوئی ہے۔ تم اس سے بات کرو نا۔"

"اب میں کیا بات کروں تم لاہور میں رہتی ہو تم خود ہی اس سے رابطہ قائم کر کے پوچھ لو۔ بلکہ ایسا کرو کہ مونا کو اپنے ساتھ لاہور لے جاؤ۔ پھر ونی سے بات کر کے اسے سرگودھا بھیج دینا۔" شیلا پہلے تو راضی نہیں ہوئی پھر کچھ سوچ کر اس نے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے پر تم بھی ونی سے بات کر لو۔ مجھ سے زیادہ تمہاری اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ تمہاری بات ٹالے گی نہیں۔ ٹھہرو ابھی اپنے پرس میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری پاکٹ ڈائری میں اس کا نمبر بھی موجود ہو۔" شیلا نے اتنا کہتے کہتے اپنا پرس کھول کر اس میں جھانکا اور پھر تھوڑی دیر اسے ٹٹولنے کے بعد ایک چھوٹی سی ڈائری پرس سے نکال کر اس میں درج ونی کا نمبر تلاش کر کے اس نے کہا۔

"او گڈ لک۔ یہ دیکھو اس کا نمبر بھی مل گیا۔ چلو اب اسے کسی کاپی پر نوٹ کر لو۔" اور پھر فلورا نے اٹھ کر ایک کاغذ پر ونی کا نمبر لکھ لیا۔

"میں کل دوپہر کی گاڑی سے لاہور واپس جا رہی ہوں۔ اگر مونا کو میرے ساتھ بھیجنا ہی ہے تو پھر ساتھ کے ساتھ اس کا ٹکٹ خرید لو۔ میرا کزن جو نی ہے نا وہ شام کو میرا ٹکٹ خریدنے جائے گا تو ساتھ کے ساتھ اس کے ٹکٹ کے پیسے بھی اسے دے دوں گی" اور فلورا نے ایکدم ہی ہامی بھری نہ سلوط سے پیسے ہی مانگے۔ بلکہ وہ کچھ سوچنے لگی اور قدرے توقف کے بعد بولی۔

"نہیں اب اسے تمہارے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے فون پر ونی سے بات کروں گی۔ اور اگر اس نے اسے کہیں ملازم رکھوانے کی ہامی بھر لی تو فوراً اسے سرگودھا لے کر جاؤں گی۔ ویسے تمہارا بے حد شکریہ کہ تم نے مجھے ونی کا نمبر دیا۔"

"اچھا جیسی مرضی تمہاری۔" شیلا نے کہا اور پھر کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ اور یوں صرف دس روز کے اندر اندر وہ فلورا کے ساتھ سرگودھا پہنچ گئی۔ فلورا واقعی اس کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ اس نے سلوط کی پوری داستان سن کر اس نے فلورا کو یہ بتایا تھا کہ دراصل درانی اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جوشِ انتقام میں اس کی جان لینا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کے یہاں جا کر وہ اس سے چھپی تھی۔ انہوں نے اس سے ساز باز کر کے اس کا پتا دیا تھا۔ اس لیے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا اور اسی کہانی کے پیشِ نظر مصلحتاً فلورا نے اسے نام تبدیل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ اس کا نام مونا رکھ دیا تھا۔

بہرحال سرگودھا آ کر نرسوں کے ہوسٹل میں جگہ دینے کے ساتھ ساتھ ونی نے اسے قریبی ہسپتال میں ہیلپر کے طور پر کام پر لگوا دیا تھا۔ تاکہ پریکٹیکلی اسے نرسنگ کا تجربہ بھی حاصل ہوتا رہے اور تنخواہ بھی ملتی رہے اور تنخواہ بھی صرف تین سو روپے ماہوار تھی۔

سرگودھا آنے کے بعد اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بالخصوص اپنی خوبصورتی کی وجہ سے۔ یوں بھی وہ ایک معمولی سی نرس تھی۔ اور آج کے حرص و ہوس کے زمانے میں کسی بے حیثیت اور بے زر کی کوئی قدر و منزلت ہی کہاں ہوتی ہے۔ اور ایسے انسان کو خود اپنی حفاظت کے لیے بہت دلیر اور سخت بننا پڑتا ہے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ ونی فریڈ بریرا جیسی دبنگ اور مردمار قسم کی عورت نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا۔ اور ونی سے چھوٹے بڑے سب ہی ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہسپتال کے ایڈمنسٹریشن کی نگران بھی تھی۔ اور اس کی وجہ سے اس نے ہسپتال میں کچھ قدم بھی جما لیے تھے۔ مگر ابھی اسے ہسپتال میں کام کرتے دو ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ نیا اور اس کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دینے والا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

وہ تو اس دن کو کوستی تھی جس روز اس نے ہمدردی میں آ کر اسفند کو خون دیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اسفند اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہے۔ اور صہیب منصور اور سہیل منصور کے یہاں بھی صرف بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔ اس لیے اسے ہر طور زندہ رہنا چاہیے۔ لیکن اسے خون دینا تو غضب ہی ہو گیا۔

حالانکہ تینوں مرتبہ جب وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ تو اس نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ شدید مغالطے کا شکار ہے۔ یعنی وہ ہرگز ہرگز سلوط نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی وہ ماننے پر تیار نہیں ہوا تھا اور ستم یہ کیا تھا کہ ونی کے پاس ہوسٹل تک پہنچ گیا تھا اور ونی کو معلوم ہو جانا گویا غضب ہو گیا تھا۔ وہ تو بال کی کھال کھینچنے کی عادی تھی اور انسان کو گھر لے جا کر ہی اس کا پیچھا چھوڑتی تھی جبکہ وہ اپنے ہوسٹل کی ریپوٹیشن خراب ہونے سے بھی ڈرتی تھی۔ کہ اس طرح اس کی بدنامی ہوتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ بلکہ خود اپنے ہاتھوں اسے ان لوگوں کے حوالے کر کے رہے گی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے ہوسٹل سے چپ چاپ نکل جانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ اور اگلے دن اس خیال سے کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ ہوسٹل کو خیرباد کہنے والی ہے وہ حسبِ معمول۔ تیار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ اصل میں تو یہی وقت ہوتا تھا۔ ہاسٹل میں سناٹا ہونے کا۔ کیونکہ تقریباً ساری ہی نرسیں اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلی جاتی تھیں اور ونی بھی اس وقت اپنے آفس میں ہوتی تھی۔ صرف چوکیدار اور جمعدار قسم کے لوگ ہی گیٹ پر ادھر ادھر کی ہانکتے نظر آتے تھے۔ اور ہاسٹل کے عقبی سمت کا چھوٹا سا دروازہ ویران ہی پڑا رہتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر بند ہی رہتا تھا کیوں کہ وہ دروازہ آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔

گویا یہی موقع تھا باہر نکل جانے کا۔

مگر اس روز جاتے ہی اسے کچھ ایسے کام سونپے گئے تھے کہ تمام وقت نرسوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ پھر کہیں لنچ ٹائم میں جا کر اسے فرصت ملی تو اس نے وقت کھوٹا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سب کی نظر بچا کر چپکے سے ہسپتال سے نکل کر ہاسٹل اپنے روم میں پہنچی۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اسے ہوسٹل میں آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس سمے بھی اس کے روم میں کوئی موجود تھا۔ اس نے روم میں آ کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ جلدی سے الماری کھول کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر روم سے نکل کر عقبی زینے کا رخ کیا اور بڑے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی نیچے پچھلا گیٹ کھول کر ہاسٹل سے باہر نکل آئی۔ فلورا کے پاس جانے کے سوا اس کا اور کوئی ٹھکانہ تھا نہ کوئی راستہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس لیے اس نے ایک رکشا لے کر سیدھا اسٹیشن کا رُخ کیا۔

پھوپھا کو خط بھیجے دو روز ہو گئے تھے۔ اور تیسرے روز بھی ان کے آنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے ادھر چونکہ پھوپھا کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا اس لیے اسفند نے اجمال کے ملازم شیر محمد عرف شیرا کی معرفت انہیں وہ خط بھیجا تھا۔ وہ بھی اجمال کے پتے پر۔ اول تو اسے یہی یقین نہ تھا کہ اس کا خط وقت پر پہنچ ہی گیا ہو گا۔ کیونکہ محکمہ ڈاک کی ناقص کارکردگی سے وہ بخوبی واقف تھا کہ بعض خطوط دوسرے روز ہی پہنچ جاتے ہیں اور بعض محکمہ ڈاک کے ہی کھاتے میں دنوں پڑے رہتے ہیں اور ہفتے عشرے سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتے ہیں۔ دوسرے بالفرض اگر وقت سے پہنچ بھی گیا ہو گا تو شیرا نے اپنے تمام کام نمٹانے کے بعد شام کو ہی وہ خط پھوپھا تک پہنچایا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے روز پہنچایا ہو۔ یا پھر شیرا کو وہ خط سرے سے ملا ہی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تو سارا کام ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہی سب سوچ کر اس نے شیرا کو فون کرنے کی ٹھانی تھی کہ اسے اجمال کا فون نمبر معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اجمال یا تو کہیں باہر گیا ہوا ہو گا یا پھر گھر ہی میں ہو گا تو سو رہا ہو گا۔ کیونکہ وہ دن کے بارہ بجے اٹھنے کا عادی تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور ہشام کے بھائی اکرام کے ساتھ اس کی کار میں ٹیلی فون آفس جا رہا تھا کہ تبھی پھوپھا کی ٹیکسی گیٹ کے آگے آ کر رکی تو وہ کار سے اتر کر اس کی طرف لپکا۔ اسی اثنا میں ثاقب حسن بھی ٹیکسی سے اتر چکے تھے۔ اس نے انہیں سلام کر کے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کو پکڑایا اور پھوپھا کو لے کر اندر آ گیا۔ اکرام بھی کار سے اتر کر باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے پاس آتے ہی پھوپھا کا اس سے تعارف کرایا اور پھر معذرتی لہجے میں بولا۔

"مائنڈ نہ کرنا یار۔ جن کی خاطر فون کرنے جا رہا تھا وہ خود ہی آ پہنچے ہیں۔"

"ارے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بھلا مائنڈ کرنے کی اس میں کیا بات ہے۔ بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان کا اور اضافہ ہو گیا۔" اکرام نہایت خوشدلی سے بولا۔

"ارے نہیں صاحبزادے۔ ہم مہمان کی حیثیت سے آپ کو زحمت دینے یہاں نہیں آئے بلکہ ہمارا یہاں قیام بہت مختصر ہو گا۔ شاید دو تین گھنٹے۔" ثاقب حسن نے مسکرا کر کہا۔

"دو تین گھنٹے کیوں پھوپھا جان۔ کیا آپ کا آج ہی واپسی کا ارادہ ہے؟" اسفند نے ان کی بات پر متعجب سا ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ ارادہ تو نہیں ہے لیکن ہم زبردستی کے مہمان بننے کے قائل نہیں۔ یہاں کے کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔" ثاقب حسن بولے۔

"واہ یہ تو سراسر غیریت ہوئی پھوپھا جان کہ ہمارا گھر موجود ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں قیام کریں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ خود آپ کو یہاں رہنا پسند نہ ہو۔" اکرام بڑی اپنائیت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"اچھا بھتیجے۔ اب آپ اپنائیت کو بیچ میں لے آئے ہیں تو پھر ہم سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" ثاقب حسن نے اس کی اپنائیت سے متاثر ہو کر شگفتہ لہجے میں کہا۔ اسفند کا دل چاہا کہے کہ یہ لکھنوی تکلف آپ ان لوگوں سے کہاں برتنے بیٹھ گئے یہ لوگ بہت سادہ لوح اور مخلص ہیں۔ مگر اس نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"اچھا آیئے۔ آپ اندر تو چلیے پھوپھا جان۔ آپ کے قیام کا مسئلہ بعد میں حل ہو جائے گا۔" ثاقب حسن شاید خود بھی یہی چاہ رہے تھے۔ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔

"آپ نے یہاں پہنچنے میں بڑی دیر لگا دی۔ پھوپھا جان اور ادھر میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔" اسفند نے کمرے میں آ کر انہیں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے ہم نے تو بالکل دیر نہیں لگائی۔ گزشتہ شب تمہارا خط ملا اور آج ہم آ گئے۔" ثاقب حسن بولے۔

"لیکن میں نے تو آپ کو بدھ کی رات ہی وہ خط روانہ کر دیا تھا جو میرے اندازے کے مطابق جمعرات کی شام تک آپ کو مل جانا چاہیے تھا۔ اور آپ کہہ رہے ہیں وہ کل جمعہ کی رات کو آپ کو ملا تھا۔" اسفند دنوں اور گھڑیوں کا حساب لگاتا ہوا بولا۔

"ارے بھئی تم نے خط ہی بھیجا تھا کوئی ٹیلیگرام تو نہیں۔ اور شیر محمد کہہ رہا تھا کہ اسے کل جمعہ کی صبح کو تمہارا خط ملا تھا مگر ہاں جمعہ کو تو عام تعطیل ہوتی ہے۔ پھر اسے جمعرات کو ہی ملا ہو گا اور اسے ہم تک پہنچانے کی فرصت اسے جمعہ کو ہی ملی۔" ثاقب حسن نے خود ہی حساب لگاتے ہوئے اپنی غلطی کی تصحیح کی۔ پھر بولے۔

"خیر چلو۔ اب تو ہم آ ہی گئے۔ مگر جس کار ن آئے اس کا تو تم نے اب تک کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ جب کہ ہم تو اسٹیشن سے یہی سوچ کر چلے تھے کہ جس ٹیکسی میں جا رہے ہیں اسی میں تمہیں بٹھا کر سیدھے بٹیا کے پاس پہنچیں گے اور پھر اسی ٹیکسی میں بٹیا کو لے کر اسٹیشن کا رخ کریں گے۔ اسی لیے تو ہم نے تمہارے میزبان سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا بہت مختصر قیام ہو گا۔" اور پھوپھا کی اس سادگی پر دل ہی دل میں وہ خوب ہنسا۔

"لیکن پھوپھا جان۔ آپ نے حالات کا جائزہ لیے بغیر پہلے سے ہی یہ پروگرام کیسے مرتب کر لیا۔ میرا مطلب ہے پہلے چل کر یہ تو معلوم کریں کہ آیا آپ کی بٹیا آپ کو پہچانتی بھی ہیں۔ انہیں ساتھ لے جانے کا سوال تو بعد میں ہی آتا ہے۔" اسفند نے کہا۔

"ہائیں کیا مطلب۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ وہ نرس سلوط ہی ہے۔ پھر تو تم نے خواہ مخواہ ہی ہمارا وقت کھوٹا کیا۔ اور ادھر وہ تمہاری پھوپھو بیگم۔" ثاقب حسن بہت چمک کر بولے تو اس نے ان کی بات قطع کر کے کہا۔

"نہیں پھوپھا جان۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ نہ ہی ایسا احمق یا عقل سے پیدل ہوں کہ سلوط کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیے بغیر صرف دھوکے اور شبہے کی بنا پر کسی دوسری لڑکی پر سلوط کا گمان کرتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ اس قدر بدظن اور متنفر نظر آتی ہیں کہ کہیں میری طرح آپ کو بھی پہچاننے سے انکار نہ کر دیں۔" اسفند نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"خیر خیر اب تو ہم آ ہی گئے ہیں۔ اور صورتِ حال خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو ہم ان سے ملے بغیر جائیں گے ہی نہیں۔ لہٰذا اب تم وقت ضائع کرنے کے بجائے ابھی اور اسی وقت ہمیں ان کے پاس لے چلو۔" ثاقب حسن اپنی بیتابی دکھاتے ہوئے بولے

"جی۔ جی ہاں ضرور۔ میں خود بھی ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ بس ابھی ملازم سے ٹیکسی منگواتا ہوں۔" اسفند اٹھتا ہوا بولا اور پھر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد واپس آیا تو ثاقب حسن سے بولا۔

"چلیے پھوپھا جان۔"

"ہائیں۔ کیا یہاں گھر سے ہی آواز دینے پر ٹیکسی آ جاتی ہے۔" ثاقب حسن نے اٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ اصل میں میں نے ملازم کو ٹیکسی منگوانے کے لیے بلوایا تو اکرام نے کہا کہ آپ میری کار لے جائیں۔"

اسفند نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ کم از کم پرائیویٹ سواری میں یہ تو آسانی رہتی ہے کہ انسان اسے اپنی مرضی سے جہاں اور جتنی دیر چاہے لے جاسکتا ہے۔" ثاقب حسن نے اس کے ساتھ کار کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اس سمے بیٹی سے ملنے کے خیال سے ان کا دل بھی کھلا جارہا تھا۔

بلکہ وہ جو اتنی زیادہ باتیں کر رہے تھے اور اس قدر شگفتہ موڈ میں نظر آرہے تھے تو بیٹی سے ملنے کی خوشی میں ہی نظر آرہے تھے۔

پھر دونوں کار میں بیٹھ کر ہوسٹل روانہ ہوئے۔ تب بھی ہوسٹل پہنچنے تک ثاقب حسن مسلسل بولتے ہی رہے جب کہ فطرتاً کم گو اور روکھے پھیکے سے انسان تصوّر کیے جاتے تھے۔ اسفند بھی ان کے اس وقت کے جذبات کو سمجھ رہا تھا اس لیے اسے ان کے اتنے زیادہ چہکنے پر تعجب نہیں ہوا۔

پھر کوئی آدھ پون گھنٹے کا فاصلہ طے کر کے اسفند نے ہوسٹل سے گیٹ کے قریب ہی کار روکی اور اسے لاک کر کے گیٹ میں داخل ہونے لگا تو وہاں موجود دربان نے اس کا راستہ روکا۔ کیوں کہ ہوسٹل میں ہر کس و ناکس کے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دو روز قبل بھی جب اسفند ہوسٹل آیا تھا تو کوئی دوسرا دربان موجود تھا جس نے بہت ردّ و قدح کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ اور اس روز بھی اسفند کو کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہرحال اس نے یہی کہا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ہوسٹل کی انچارج سسٹر پیریرا سے ملنے آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے اپنا کارڈ بھی اسے نکال کر دکھایا جب کہ وہ ان پڑھ ہی تھا۔ تب کہیں جا کر دربان نے ان دونوں کو اندر جانے کی اجازت دی۔

وہ پھوپھا کے ساتھ سیدھا سسٹر پیریرا کے آفس میں پہنچا۔ سسٹر پیریرا کی آفس ٹیبل کے گرد اس سمے دو اشخاص بیٹھے تھے جن سے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اسے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو بات ہی کرنا بھول گئی اور اندر ہی اندر ایک پھریری سی بھی آئی۔ کیونکہ وہ اسفند کے آنے کی نوعیت سے واقف تھی۔ مگر تھی بڑی ہی مضبوط قوّتِ ارادی کی مالک اور بڑی دبنگ قسم کی عورت۔ اس نے دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پالیا اور پھر باتوں میں مشغول ہوگئی۔ اسفند سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آیا۔

"گڈ مارننگ مسز پیریرا۔" اسفند نے متبسّم سے انداز میں کہا۔

"گڈ مارننگ سر۔" پیریرا نے باتیں کرتے کرتے چونک کر یوں اس کے سلام کا جواب دیا جیسے وہ اس کے آفس میں آجانے سے لاعلم ہو۔ پھر اس انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو اب آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ اسفند بھی اس کی ہچکچاہٹ کو سمجھ گیا تھا مسکرا کر بولا۔

"میرے خیال میں اپنا تعارف پیش کرنے کی مجھے ضرورت تو نہیں کیونکہ تین روز قبل بھی میں کیپٹن آفتاب کے ساتھ یہاں آچکا ہوں۔"

"جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" پیریرا نے نروٹھے پن سے کہا۔

"پھر تو آپ کو میرے یہاں آنے کی غرض و غایت کا بھی اچھی طرح علم ہوگا۔" اسفند نے جتانے کے سے انداز میں بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ بخوبی۔" وہ قدرے رعونت سے بولی۔

"تو پھر آپ سے التماس ہے کہ آپ ۔" اسفند نے اپنا مدّعا بیان کرنا چاہا تو پیریرا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"لیکن سر اس معاملے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ اچھا ایک منٹ۔" اتنا کہہ کر گویا اس نے ایک منٹ کی مہلت مانگی۔ اور پھر ان دونوں آدمیوں سے جو ابھی تک میز کے گرد ہی بیٹھے تھے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا۔ آپ ایسا کریں کہ کل آفس آورز میں کسی وقت میرے پاس آجائیں۔ اس وقت تو میں بہت بزی ہوں۔" اصل میں وہ بظاہر جتنی نروٹھا سی نظر آرہی تھی اندر ہی اندر اتنی ہی خوف زدہ تھی۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اسفند کو یہ بتانے کی کہ سلوط ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ بلکہ ایسا سخت اور روکھا پھیکا رویّہ اختیار کر کے وہ چاہ رہی تھی کسی طرح اسفند کو سرسے ٹال دے۔ اور یہ ایک منٹ کی مہلت اس نے صرف ان دونوں آدمیوں کو ہٹانے کی غرض سے نہیں مانگی تھی بلکہ اصل حقیقت سے روگردانی کرنے کی غرض سے بھی مانگی تھی۔ مگر یہ ایک منٹ کا وقفہ بھی اسفند کو بہت شاق گزرا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے جاتے ہی وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"میں آپ سے کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے نہیں آیا۔ بلکہ مس شان سے ملنے آیا ہوں۔ براہِ کرم آپ انہیں یہاں بلوا دیں۔" اور اس کی اس بات پر پیریرا بغلیں جھانکتی ہوئی بولی۔

"لیکن سر وہ تو اس وقت ہوسٹل میں موجود نہیں ہے بلکہ ۔"

"دیکھیں زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں مسز پیریرا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ شام کو ڈیوٹی پر جاتی ہیں اور دن کے وقت ہوسٹل میں ہی ہوتی ہیں۔" اسفند اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولا۔

"لیکن ڈیوٹیز چینج بھی ہوتی رہتی ہیں سر۔ آج کل تو اس کی ڈیوٹی دن ہی کو لگتی ہے لیکن اگر نہ بھی لگتی تو ۔"

"افوہ ۔ میں یہ لگتی اور نہ لگتی کچھ نہیں جانتا۔ میں تو مس شان سے ملنے آیا ہوں۔ اور یہ ان کے والد ہیں۔ اب آپ سیدھی طرح انہیں بلوا دیجیے۔" اس کے حیص بیص کرنے پر اسفند کو بیچ بیچ تاؤ آگیا۔ اس نے بڑے سخت اور کرخت لہجے میں کہا۔ اور اس کے منہ سے والد کا لفظ سن کر پیریرا کی سٹی ہی گم ہوگئی۔ وہ ایک دم ہی نرم پڑ کر بولی۔

"پلیز سر۔ آپ پہلے پوری بات تو سن لیں۔"

"سنائیے، کیا سنانا چاہتی ہیں آپ۔" ثاقب حسن نے پہلی بار لب کشائی کی۔ مگر پیریرا اسفند ہی کو مخاطب کر کے بولی۔

"مس شان تو آپ کے آنے کے دوسرے روز ہی یہ ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جہاں تک مجھے یقین ہے آپ کی وجہ سے ہی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ میڈم۔ کیا ہم آپ کو بہت ہی بے وقوف نظر آرہے ہیں لیجیے بھلا یہ بنا شوشہ چھوڑا آپ نے۔" ثاقب حسن بگڑ کر بولے۔

"نہیں۔ شوشہ نہیں ہے سر۔ بلکہ حقیقت ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو آپ یہاں ہوسٹل میں بلکہ ہسپتال میں کسی سے بھی پوچھ کر اپنی تسلّی کر سکتے ہیں۔" پیریرا ثاقب حسن کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔

"خیر۔ آپ کے اس مفروضے پر ہوسٹل اور ہوسٹل کے لوگ تو ایمان لا سکتے ہیں لیکن میں آپ کی بات کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں ہوں۔" اسفند بھی بڑے کڑے تیور سے بولا اور پھر ثاقب حسن سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

"یہ کارستانی ان محترمہ کی ہی ہے۔ اصل میں انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں سلوط کو واپس لے جانے کی غرض سے ضرور آؤں گا اور اسی لیے اس روز انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی غرض سے آئے ہیں۔ تو میں اسی وقت کھٹکا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ میں نے ان کو بڑی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ میرے آنے کی غرض و غایت کو راز ہی میں رکھیں۔ لیکن انہوں نے نہ معلوم کس رنگ اور معنوں میں سلوط کو سب کچھ بتا دیا ہوگا، ورنہ بھلا یوں بھی کوئی چپکے سے ہوسٹل چھوڑ کر جا سکتا ہے۔"

"ارے میاں ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ سلوط خود اپنی مرضی سے ہوسٹل چھوڑ کر گئی ہے یا انہوں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا ہے چنانچہ اب اس معاملے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کیے بغیر کوئی کام ہی نہیں بنے گا۔ یوں بھی تین روز ہوگئے ہیں اس کی گمشدگی کو۔ ہمیں اب یہاں وقت برباد کرنے کے بجائے فوری طور پر پولیس اسٹیشن چلنا چاہیے۔" ثاقب حسن نے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ وہ تھانے جانے کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ یوں بھی بیٹی کے اچانک مل کر کھو جانے پر ان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

"جی ہاں۔ علیٰ ہذالقیاس پھوپھا جان۔ وقت کھوٹا کرنے سے فائدہ۔ ہم اس علاقے کے پولیس اسٹیشن ہی چلتے ہیں۔" اسفند کو بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی یہی ترکیب نظر آئی۔

"چلو۔" ثاقب حسن نے کہا۔ دونوں جانے لگے تو مسز پیریرا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے ملتجی لہجے میں انہیں پکارا۔

"سنیے پلیز۔ میری صرف ایک بات اور سن لیجیے۔" اسفند نے تو اس کی بات سنی ان سنی کر دی لیکن ثاقب حسن نے پلٹ کر پوچھا۔

"اچھا سنائیے مزید کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ۔" ان کی بات پر پیریرا نے جھک کر میز کی دراز سے ایک چھوٹی سی مجلّد

کتاب نکالی اور پھر اس پر ہاتھ رکھ کر کھڑے کھڑے ہی بولی۔

"دیکھیں اگر آپ مسلمان ہیں تو میرا بھی کچھ دین و ایمان ہے اور میں اس مقدس بائیبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ مونا اپنے بیڈ پر صرف اپنا ریزیڈینشن لیٹر ہی چھوڑ کر گئی ہے ورنہ میں نے اسے کہیں چھپایا ہے نہ چھپنے کی تلقین کی ہے اور نہ مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں سے کب گئی اور کہاں گئی ہے۔" پیریرا نے صرف حلف ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کی آواز میں بھی صداقت اور کچھ ایسی بے بسی سی جھلک رہی تھی جیسے ایک سچی بات کو جھوٹا ثابت کر دینے پر سچے انسان پر طاری ہوتی ہے۔ دونوں کو پیریرا کی باتوں پر یقین کر لینا ہی پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اسفند نے اس کی میز کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ہمیں آپ کی باتوں کا یقین آ گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں آپ کو موردِ الزام ٹھہراؤں گا کیونکہ اگر آپ میرے آنے کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ نہ کرتیں تو مایوس کن صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے نرس شان کی گمشدگی کی ذمہ دار آپ ہیں صرف آپ۔"

"اوہ۔ نو نو۔ دیکھیں آپ مجھے الزام نہیں دیں سر۔ بلکہ اس میں میرا کوئی قصور ہی نہیں۔"

پیریرا نے اسفند سے کہہ کر پھر ثاقب حسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں آپ ہی انصاف سے کام لے کر سوچیں بندہ گوار کہ میں اس ہوسٹل کی انچارج ہوں۔ یہ آپ کے بھتیجے صاحب ایک روز اچانک ہی میرے پاس ایک ایسی اسٹوری لے کر آئے جسے سُن کر میں بڑے مخمصے میں پڑ گئی۔ کیونکہ مونا کے متعلق جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا وہ کچھ اور ہی تھا اور پھر۔۔۔ ایک تو میرے ہوسٹل کے اصول اور قوانین بہت سخت ہیں دوسرے میں یہاں کی انچارج تھی اور یہ میری ذمہ داری بنتی تھی کہ میں مونا سے اصل حقیقت کے بارے میں استفسار کروں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ آج کل کے زمانے کی رفتار دیکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں میں ڈاکٹر صاحب کی باتوں کی مونا سے تصدیق کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم۔ لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ جب آپ کے ہوسٹل کے قوانین اتنے ہی سخت ہیں تو آپ کی نالج (علم) میں لائے بغیر ہمارا مطلب ہے آپ کی اجازت کے بغیر کسی لڑکی کا ہوسٹل سے نکل جانا کیا معنی رکھتا ہے۔" ثاقب حسن بولے۔

"ارے چھوڑیں پھوپھا جان۔ یہ قوانین اور اصول سب دکھاوے اور پبلسٹی کی باتیں ہیں ورنہ ایسے ادارے محض پیسہ کمانے کی غرض سے خوگیر کی بھرتی بھرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لوگ جس طرح بھرتے ہیں اسی طرح نکل جاتے ہیں۔" اسفند جلے کٹے سے انداز میں بولا

"مگر یہ تو ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو بٹیا کو تلاش کرنے کا ہے۔ ان کی نشاندہی کرانے کا ہے۔ کہ وقت بھی تیزی سے بیتتا جا رہا ہے۔ اگر مزید دیر ہو گئی تو پھر تو ہم ہمیشہ کے لیے ان سے محروم ہو جائیں گے۔" یہ جملے ثاقب حسن نے بڑے جذباتی سے انداز میں ہلکی ہلکی سی رقت کے ساتھ کہے۔ اور شاید انہی جملوں سے متاثر ہو کر اسفند کو معاً کچھ خیال آیا۔

"ویسے بائی داوے مسز پیریرا۔ نرس شان جس طرح چپکے سے یہاں سے گئی ہیں ظاہر ہے بلا آپ کی اجازت اور لاعلمی میں تو یہاں نہیں آئی ہوں گی۔ میرا مطلب ہے کوئی تو ان کو یہاں لایا ہو گا یا پھر وہ خود ہی آئی ہوں گی۔"

"او۔ یس یس۔ ناؤ یو ہیو کم ٹو دا پوائنٹ۔ ہم سے غلطی ہو گئی ورنہ ہمیں یہ سوال بہت پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔" ثاقب حسن خوش ہو کر بولے۔

"او۔ یس۔ میرا بھی یہی اوپینین (خیال) ہے۔" پیریرا جو اسفند کے جلے کٹے سے انداز میں سوال کہنے پر کسی سوچ میں پڑ گئی تھی اتنی دیر میں پہلی بار تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

"یعنی یہی کہ آپ کو بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔" اسفند اس پر مسلسل طنز کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوال سے قدرے مختلف۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجھ سے آتے ہی یہ بات پوچھ لیتے تو بات اتنی نہ بڑھتی۔" پیریرا بولی۔

"لیکن یہ فرض تو آپ کا تھا کہ آپ خود ہی ہمیں بتا دیتیں۔" اسفند پھر بھی اس پر طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

"دیکھیں میں بھی آپ کی طرح انسان ہی ہوں۔۔۔ اور مونا کے معاملے میں میں آپ سے زیادہ پریشان بھی کیونکہ اس کے ایک دم غائب ہو جانے کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہی آنی تھی۔ اور پھر آپ نے آتے ہی مجھ سے کراس ایگزامن کرنا شروع کیا تو میں بالکل ہی بوکھلا گئی۔ ورنہ۔۔۔"

"خیر خیر۔ وہ تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب آپ بتا دیں۔" ثاقب حسن نے انتہا کو پہنچے ہوئے تجسس کے سبب اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اصل میں اسے میری ایک بہت ہی پرانی دوست جو کبھی میری کولیگ بھی رہ چکی تھی کراچی سے اپنے ساتھ یہاں لائی تھی اور اپنی بھانجی کی حیثیت سے اس نے مونا کا مجھ سے تعارف کرایا تھا۔ اور اس کے بارے میں جو اسٹوری سنائی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ مونا کا سوتیلا باپ اس کی شادی ایک عیاش اور رئیس بڈھے سے کر رہا تھا جس کے پوتا پوتی مونا کی عمر کے تھے۔ مونا کی ماں سے یہ سب گوارا نہ ہوا تو اس نے چپکے سے مونا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ مگر خالہ کے پاس رہنے میں مونا کو خطرہ لاحق تھا اس لیے وہ اسے سرگودھا لے آئی تھی تاکہ میری نگرانی میں ہوسٹل میں رہ سکے اور ساتھ ساتھ سروس بھی کرتی رہے۔ بس جی یہ تھی اس کی اسٹوری۔"

"وہ تو خیر حالات کے تحت بنانی پڑی ہو گی مگر وہ آپ کی دوست آخر رہتی کہاں ہیں؟" اسفند نے قدرے بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کراچی میں ہی عرصے سے اس نے سکونت اختیار کر رکھی ہے۔" پیریرا نے بتایا۔

"تو کچھ ان کا اتا پتا بھی تو ہو گا آپ کے پاس۔" ثاقب حسن نے پوچھا۔

"جی۔ گھر کا ایڈریس تو مجھے معلوم نہیں البتہ جس کلینک میں وہ کام کرتی ہے اس کا ضرور معلوم ہے بلکہ فون نمبر بھی۔"

"پھر تو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لائیے جلدی سے کلینک کا ایڈریس بمعہ فون نمبر عنایت کر دیجیے۔" ثاقب حسن بے تابی سے بولے تو فلورا نے دراز کھول کر اپنا پرس نکالا اور پھر پرس کھول کر ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور فلورا کے کلینک کا پتا بمعہ فون نمبر ٹیبل ڈائری کا صفحہ پھاڑ کر اس پر درج کیا اور ثاقب حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اس کے ساتھ آئی وش یو گڈ لک۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مونا فلورا کے پاس ہی گئی ہو گی۔"

"فلورا۔ ! کیا آپ کی دوست کا نام فلورا ہے؟" اسفند نے متعجب سے انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ اور وہ اسی کلینک میں مڈوائف لگی ہوئی ہے مگر بہت ہی نیک خاتون ہے یعنی پنج وقتہ نمازی اور پرہیزگار اور اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہے۔" پیریرا نے متبسم سے انداز میں فلورا کے بارے میں تفصیل بتائی۔ دونوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر ہوسٹل سے باہر نکل آئے۔ واپسی میں ثاقب حسن چپ چپ سے نظر آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی طرح انہیں بھی سلوط کی طرف سے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کراچی میں انہیں مل جائے گی اور وہ جو بہت گہری اور مضبوط طبیعت رکھتے ہیں آج کی ناکامی پر اندر سے کتنے ٹوٹ پھوٹ رہے ہوں گے۔ ان کا دھیان پلٹنے کی غرض سے اسفند نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"میرے خیال میں تو ہمیں آج ہی کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ کیوں پھوپھا جان۔"

"ہاں بالکل۔ ہم خود بھی وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔" ثاقب حسن نے جواباً کہا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ثاقب حسن نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"یہ کیا نام تھا ہوسٹل کی انچارج کا اس کے۔"

"مسز پیریرا۔" اسفند نے ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے نام بتایا۔

"ہاں مسز پیریرا کے بیان کے مطابق تو اب تک سلوط کراچی پہنچ گئی ہو گی۔ کیونکہ ٹرین سے سفر کیا ہو گا اس نے۔"

"کراچی تو وہ پرسوں شام کو ہی پہنچ گئی ہوں گی پھوپھا جان۔ کیونکہ انہوں نے بدھ کو ہوسٹل چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے سیدھا اسٹیشن کا رخ ہی کیا ہو گا۔ کہ یہاں تو ان کا کوئی اور واقف بھی نہیں ہے۔ لیکن بشرطیکہ وہ کراچی ہی گئی ہوں۔" اسفند نے اپنے دل کی بات کو لفظوں میں ڈھالا۔

"لیکن بقول تمہارے اُس کا یہاں نہیں تو کہیں بھی کوئی واقف کار نہیں ہے۔ ورنہ وہ اُدھر کا رُخ ہی کیوں کرتی۔ اب خدا جانے کن حالات میں فلورا اُسے ٹکرائی ہو۔۔۔ خیر میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ اس معاملے میں کوئی اور رسک لینا گوارا نہیں کر سکتی۔" ثاقب حسن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ ورنہ انہیں ڈھونڈنے میں بڑی مشکلات درپیش آ جائیں گی۔" اسفند ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"خیر ہم اپنی طرف سے تو بڑی اُمیدیں لے کر جا رہے ہیں باقی معاملہ خدا کو سونپا وہی ہماری مدد کرے گا۔"

"جی ہاں اُمید پر ہی دنیا قائم ہے لیکن پھوپھا جان اگر آپ یہاں سے براہِ راست کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر کیا پھپھو بیگم عرصے تک لاہور میں تنہا نہیں رہ جائیں گی کیونکہ کسے معلوم کہ کراچی میں آپ کا قیام کب تک ہو۔" اسفند نے ایک بہت ہی اہم بات کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ تو انہوں نے ہنس کر کہا۔

"تازہ اور نئے دماغ کی یہی خوبی ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھی اور کام کی باتیں سوچتا ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ذہانت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس پر تم بہت حساس بھی ہو۔ ہمارے معیار کی کسوٹی پر سو فیصد پورے اُترتے ہو۔"

"لیکن بات پھپھو بیگم کی ہو رہی تھی میری ذہانت کی نہیں۔" ان کی بات میں جو معنویت تھی۔ اُسے سمجھتے ہوئے اسفند نے بھی ہنس کر کہا۔

"ویسے تم نے ایک اہم بات کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ تمہارا شکریہ لیکن ہم بھی اپنی شریکِ حیات کی طرف سے اتنے لاپروا۔ ہیں نہ یہاں سے براہ راست کراچی جانے کا ارادہ ہی رکھتے ہیں۔ بلکہ ابھی دوپہر کی فلائیٹ سے سیدھے لاہور جائیں گے۔ اور پھر شام کی فلائیٹ سے آپ کی پھپھو بیگم کے ہمراہ کراچی۔" ثاقب حسن نے اپنا پروگرام بتایا۔

"اچھا تو کیا آپ اپنے گھر کو مقفل کر کے جائیں گے پھوپھا جان۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے جانے کے بعد وہ محفوظ بھی رہ سکے گا۔" اسفند نے پوچھا۔

"جہاں تک محفوظ رہنے کا سوال ہے تو اس میں چند معمولی برتنوں، مٹکوں اور چارپائیوں کے کچھ ہوگا ہی نہیں اور مقفل اس لیے کر کے جائیں گے وہ ہمارا ذاتی گھر ہے۔ اگر کبھی۔ کوئی اچھا گاہک مل گیا تو اسے فروخت بھی کر دیں گے کیونکہ اب ہم لاہور کی رہائش ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ اور کراچی میں ہی سکونت اختیار کریں گے۔"

"اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھوپھا جان۔ پھپھو بیگم ایک عرصے سے ہم سب سے دور ہی ہیں۔ اس طرح کم از کم سب اپنوں سے قریب تو ہو جائیں گی۔" اسفند نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اجی ہم ان کے شوہر یعنی سر کے تاج ہیں وہ ہم سے ہی قریب نہیں ہوئیں تو آپ سب سے کیا ہوں گی۔" ثاقب نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا تو اسفند بھی ہنسنے لگا۔ یہی باتیں کرتے ہوئے وہ احتشام کے بنگلے پر پہنچ گئے۔

"اب تم سب سے پہلا کام یہ کرو کہ جہاز کی سیٹس کا انتظام کر لو۔" ثاقب حسن نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔

"وہ کوئی مسئلہ نہیں پھوپھا جان۔ لیکن پہلے طعام بعدہٗ الکلام۔" بات کے اختتام پر اسفند ہنسنے لگا۔

"یعنی ہاتھ منہ کی لڑائی۔ چلو خیر اس کی اجازت ہے۔" ثاقب حسن نے بھی شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر اسفند انہیں اپنے رہائشی کمرے میں لے آیا۔

"دھب دھب دھب۔" رات کے سناٹے کو چیرتی۔ دستک کی آواز آئی تو پلنگ پر لیٹی کسی رسالے کا مطالعہ کرتی۔ سلوط ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر جانماز پر عشا کی نماز ادا کرتی فلورا کی طرف۔

اِس وقت بھلا کون یہاں آسکتا ہے۔؟

ممکن ہے کوئی پڑوسی یا محلے والا ہو۔

یا پھر کسی کیس کے سلسلے میں کوئی آیا ہو۔

مگر نہیں۔ آج تک تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی اتنے بے وقت آکر دروازہ کھٹکھٹائے۔ فلورا کو نماز میں مشغول دیکھ کر وہ سراسیمگی کے عالم میں سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔

جو پہلے کی نسبت قدرے زور سے دی گئی تھی۔

گویا میرا وہم نہیں بلکہ واقعی کوئی ہے۔ مگر کون۔؟ اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ اس اثنا میں فلورا نے جلد جلد التحیات پڑھ کر سلام پھیرا۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر کوئی دعا دم کی اور پھر ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے کے بعد۔ جانماز سمیٹتے ہوئے اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"کوئی دروازہ بجا رہا ہے مگر اس وقت کون آسکتا ہے بھلا۔؟" اور اس کی بات کا جواب سلوط نے دیا۔

"یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔ کہیں برابر والی کلثوم خالہ نہ ہوں۔"

"نہیں۔ کلثوم کے دروازہ کھٹکھٹانے کا انداز یہ نہیں ہوتا۔ وہ تو دروازے کو توڑ دینے کے سے انداز میں بجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زور زور سے بولتی بھی جاتی ہے۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے آخر۔؟" سلوط نے سہمے سہمے سے انداز میں کہا۔

"اب یہ تو پوچھنے پر ہی معلوم ہوگا۔" فلورا بولی۔

"میرے خیال میں تو جواب ہی نہیں دیجیے۔ نہ معلوم کون ہو اور کس مقصد سے آیا ہو۔" سلوط نے مشورہ دیا۔

"لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ میں سرے سے جواب ہی نہ دوں۔ تم اطمینان رکھو۔ میں بلا جانے بوجھے ہرگز دروازہ نہیں کھولوں گی۔ پہلے پوچھ لیتی ہوں کہ کون آیا ہے اس کے بعد ہی۔" تبھی تیسری بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ بھی زور زور سے۔ فلورا جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی اور جھری سے منہ لگا کر پوچھا۔

"کون صاحب ہیں بھئی۔" اس کے لہجے سے جھلاہٹ صاف نمایاں تھی۔ جواب میں باہر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"میں فاخرہ ہوں سلوط کی بھابی سسٹر فلورا۔ آپ برائے مہربانی دروازہ تو کھولیں۔" فاخرہ کی آواز اتنی صاف اور اونچی تھی کہ اپنے بستر کے قریب کھڑی سلوط نے بھی سن لی تھی۔ فلورا نے مڑ کر سلوط کی طرف دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا وہ دروازہ کھولے یا آنے والی کو باہر سے ہی واپس کر دے۔ مگر سلوط گم صم سی کھڑی ہی رہی۔

"سنیں سسٹر فلورا اگر سلوط یہاں موجود ہیں تو آپ اُن سے پوچھ لیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔" اندر سے جواب نہ پا کر فاخرہ نے دروازے کو کھٹکھٹا کر پھر کہا۔ تو فلورا نے "اچھا ٹھہریں" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں۔" فاخرہ نے باہر ہی کھڑے کھڑے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بصد شوق۔" فلورا نے بڑے تپاک سے کہا۔ تو فاخرہ اندر آگئیں۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ نظریں جھکائے اسی گم صم سی کیفیت میں۔

اس پر نظر پڑتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر فاخرہ اس کی طرف لپکیں۔

"ارے سلوط میری بچی میری چاند۔ تم نے تو ہمیں اپنی صورت کو ہی ترسا دیا۔" فاخرہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن وہ یونہی اکڑی اکڑی سی بلا کوئی تاثر دیے کھڑی رہی۔

"شکر خدا کا کہ تم مل گئیں ورنہ تمہاری گمشدگی نے تو ہماری نیندیں حرام کر دی تھیں تمہاری پریشانی میں تو ہماری بھوک و پیاس تک مٹ کر رہ گئی تھی بیٹا۔" بڑی جذباتی سی کیفیت میں یہ جملے کہتے کہتے فاخرہ کا گلا رندھ گیا۔ تو سلوط متاثر ہونے کے بجائے اُن سے الگ ہو کر بڑی ناگواری سے بولی۔

"میری طرف سے تو شروع ہی سے آپ پریشانی اُٹھاتی آرہی ہیں۔ اب میں آپ کی زندگی سے نکل آئی ہوں تو آپ نے میری وجہ سے خود کو ہلکان کیوں کیا۔؟" اور اس جواب پر فاخرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اور قدرے توقف کے بعد بڑی بے بسی سے بولیں۔

"اب میں تمہارے اس سوال کا کیا جواب دوں۔ جبکہ اتنا منہ میں نہیں رکھتی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہم جو کچھ کرنا چاہ رہے تھے۔ تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے ازالے کے طور پر ہی کرنا چاہ رہے تھے۔ اور تم بھی اس بات سے لاعلم نہیں تھیں اب یہ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں اتنی دیر ہو گئی۔ اور ادھر تمہیں سارا بھگتان بھگتنا پڑا۔ اب میں یہاں کھڑے کھڑے اپنی ساری سرگزشت تمہیں کیسے سناؤں۔ جب اطمینان سے بیٹھوں گی تبھی سناؤں گی۔" فاخرہ بولیں۔ وہ جو سیدھے منہ بات کرنے کی روادار نہ تھیں۔ اس وقت کس عاجزی سے بات کر رہی تھیں۔ اسے تعجب ضرور ہوا مگر وہ ان کی لاگ لپیٹ کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی بلکہ بہت ہی درشتی سے بولی۔

"لیکن مجھے کچھ سننے کا شوق ہے نہ میں اس کی ضرورت ہی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ میں اس کا کسی کو دوش دیتی ہوں نہ ذمّہ دار ٹھہراتی ہوں۔ بلکہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا ہے میں نے۔"

"اب تم اس قدر خفا ہو کہ بات تک سننے کی روادار نہیں تو میں سوائے اس کے تم سے اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ کہ تم ہمیں معاف کر دو کہ خدا بھی اپنے بندوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔" کوئی اور وقت ہوتا تو بھابی سے اس قدر ملتجیانہ گفتگو سُن کر سلوط فرطِ حیرت سے بے ہوش ہو جاتی۔ مگر اس سمے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فاخرہ کے منہ سے نکلی کوئی بھی بات اسے متاثر نہیں کر سکے گی۔

" دیکھیں بھابی جان۔ آپ یہ گھسے پٹے عام سے مکالمے نہ بولیں۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ جیسی بلند و بالا ہستی کا اپنے مقام سے نیچے اُتر کر بات کرنا مجھے شرمندہ اور ذلیل کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں۔ میں نے اپنی زندگی کا جو نیا راستہ چُنا ہے۔ اِس پر اطمینان سے مجھے چلنے دیں۔ میرا سکون اور آرام غارت کرنے کی کوشش نہ کریں۔" وہ ان کی باتوں سے متاثر ہونے کے بجائے الٹا ان پر برس سی پڑی۔ فلورا جو اتنی دیر سے تھوڑے فاصلے پر خاموش کھڑی اُن دونوں کی باتیں سُن رہی تھی۔ سلوط کی باتوں پر اس نے اُسے ٹوکنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہائیں ہائیں مونا بیٹی ــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارے دل میں اپنے بڑوں کا ذرا سا بھی احترام نہیں۔" اور پھر فاخرہ سے بولی۔

" آپ تشریف تو رکھیں بیگم صاحبہ ــــ جب سے آئی ہیں کھڑی ہی ہیں۔ اصل میں آپ مونا سے باتوں میں ایسی محو تھیں کہ میں ــــ"

"کہ میں بھی آپ سے دعا سلام کر سکی نہ آپ سے تعارف ہی حاصل کر سکی۔ لیکن غائبانہ طور پر ضرور آپ کو جانتی ہوں ــــ" فاخرہ نے اس کا باقی ماندہ فقرہ یوں پورا کیا تو وہ ہنس کر بولی۔

"جی یہ میری خوش نصیبی ہی ہے کہ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہیں۔ اچھا آپ تشریف تو رکھیں۔"

"نہیں اس وقت میں بیٹھ نہیں سکتی کیونکہ میرے شوہر باہر کار میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔" فاخرہ نے نہ بیٹھنے کا عذر پیش کیا۔

"اوہو، تو آپ انہیں اپنے ساتھ اندر کیوں نہ لیتی آئیں۔ خیر اب بلا لیجیے۔ یوں باہر کار میں اُن کا بیٹھنا کچھ مناسب نہیں۔" فلورا نے کہا۔ تو سلوط بڑے برہم سے انداز میں بولی۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں کسی کو اندر بلانے کی آنٹی بس یہ مل لیں میرے لیے یہی بہت ہے۔"

"مونا۔" فلورا نے اُسے بڑے تنبیہی انداز میں مخاطب کیا۔

"اگر دشمن بھی ملنے آئے تو اس کے ساتھ بھی مروّت اور اخلاق کے ساتھ پیش آنے کا حکم صادر کیا گیا ہے جبکہ یہ تو تمہارے اپنے بھائی کا معاملہ ہے جو تمہارے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے تمہاری ان اذیتوں کا احساس ہے جو ان لوگوں کے ہاتھوں تم نے جھیلی ہیں۔ مگر بیٹی سگے رشتے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ناخن گوشت سے۔ اور اگر ناخن گل یا ٹوٹ بھی جاتا ہے تو دوبارہ اُگ آتا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی کوشش بھی کرے تو سگے رشتوں کو توڑ نہیں سکتا کیونکہ ان کا تعلق خون سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خون ہی ہوتا ہے جو رشتوں کی شناخت کرتا ہے۔"

"جو کچھ بھی سہی آنٹی۔ لیکن میرا اعتماد ہر رشتے سے اُٹھ چکا ہے۔ میں سارے رشتے توڑ چکی ہوں آنٹی ــــ آپ ان سے کہیں یہاں سے چلی جائیں اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کریں ورنہ میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔" سلوط کے لہجے میں بیزاری اور ناگواری ہی نہیں بلکہ تنفر بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے فلورا دم سی کھڑی رہ گئی۔

" واہ کیسے چلی جاؤ گی بیٹا ــــ جب تک ہم زندہ ہیں اور ہمارے دم میں دم ہے ہم تمہیں اسی رشتے کو جوڑنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔" ثاقب حسن نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اصل میں وہ فاخرہ بیگم کے انتظار میں بیٹھے تو کار ہی میں تھے۔ لیکن جب فاخرہ کو واپسی میں دیر ہو گئی تو ان سے ضبط نہ ہو سکا ــــ بیٹی سے ملنے کے لیے پہلے ہی بیتاب ہو رہے تھے ــــ اسی لیے اتر کر دروازے کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ چھوٹا سا تو کمرہ ہی تھا۔ سب کی آوازیں بہت واضح طور پر باہر آ رہی تھیں۔ انہوں نے سلوط کی بات بھی سُن لی تھی۔ اور بلا اجازت اندر آنے پر مجبور ہو گئے تھے ــــ مگر آتے ہی انہوں نے فلورا سے معذرت کی۔

"معاف کیجیے گا ہمشیرہ ہمیں اپنی بیٹی کی محبت نے آپ کی اجازت کے بغیر اندر آنے پر مجبور کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں برادرِ محترم۔ میں نے ابھی کچھ دیر قبل ہی آپ کو اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔" فلورا نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

سلوط سامنے ہی کھڑی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر ــ اور ان کے اچانک اندر آ جانے پر حسب عادت سہم سی اٹھی تھی ــ کہ وہ شروع سے ان سے بہت ڈرتی تھی۔ اور بچپن ہی سے ان سے تھپڑ کھانے کے بعد ان کا خوف کچھ ایسا دل میں بیٹھا تھا کہ ان کی یگانگت اور التفات بھی اس خوف کے اندر زائل ہو کر رہ جاتا تھا اور اس سمے اپنی آنکھوں میں غصے اور کھسیاہٹ کی چنگاریاں بھرے جس انداز میں وہ فاخرہ سے باتیں کر رہی تھی بھائی کو دیکھ کر وہ نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ ثاقب حسن قدم بڑھا کر اس کے قریب جا کھڑے ہوئے اور قدرے فہمائشی انداز میں بولے۔

"ہم تمہاری نظر میں ہزار قصوروار سہی۔ لاکھ معتوب سہی لیکن بیٹا ہم نے تمہیں آداب و اخلاق سے کبھی عاری نہیں رکھا۔ جو تم ہمیں آداب و سلام تک کرنا بھول گئیں۔" اور وہ جس کا دل ان کے اتنے قریب آ جانے پر خوف سے بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ اس پر اچانک غصّے اور پچھتاوے کی آگ غالب آ گئی۔ اور وہ دل کڑا کر کے بڑی بے مروّتی سے بولی۔

"جب میں ہر تعلق قطع کر چکی ہوں ــــ خود پہ بیتی ہر بات ــــ اپنا ماضی حتیٰ کہ خود اپنا آپ بھلا چکی ہوں تو پھر ان تکلفات اور دکھاوے کی باتوں سے کیا حاصل؟"

"ہے ہے مونا یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی ــــ کم از کم میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس قدر بے مروّت اور بدلحاظ بلکہ گستاخ ہو گی۔" فلورا اس کے گستاخانہ انداز کو برداشت نہ کر سکی تو اس نے فوراً ہی اسے ملامت کی۔

"نہیں ہمشیرہ آپ ہماری بٹیا کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اور جو سلوک کر رہی ہیں۔ ہم اس سے بھی ــــ کہیں زیادہ سخت سست اور بدسلوکی کے مستحق ہیں۔ اصل غلطی ہماری ہی ہے جو ہم اتنے بے موقع آئے اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی ایک خلجان میں مبتلا کر دیا۔" ثاقب حسن خصوصاً بیوی کے سامنے بیٹی کے ہاتھوں خوار ہونے پر اپنی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے بولے۔

"نہیں بھائی صاحب۔ خلجان میں مبتلا ہونا کیسا مجھے تو آپ دونوں کی آمد سے دلی مسرت ہوئی ہے ــ لیکن آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ بھی بیٹھ جائیے نا بیگم صاحبہ۔ اب تو آپ کے شوہر بھی تشریف لے آئے ہیں۔" فلورا بہت ہی خلیق لہجے میں بولی۔

"نہیں شکریہ ہمشیرہ ــ ہم اب چلیں گے ــ یوں بھی ہم نے بے وقت آ کر آپ کے آرام میں خلل ڈالا۔" فاخرہ کے بجائے ثاقب حسن جلدی سے بولے۔ اور پھر انہوں نے سپاٹ چہرہ لیے کھڑی سلوط کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھا بٹیا ــ ہم لاکھ برے سہی ــ اور لاکھ تم ہم سے سارے رشتے توڑ لو۔ لیکن ہمشیرہ کے بقول۔ خون کا رشتہ تو ابد تک قائم رہے گا۔ اور اسی خون کے رشتے کے بتے پر ہم تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم خواہ ہمارے ساتھ نہ چلو۔ لیکن ہماری خطائیں ضرور معاف کر دو۔ اچھا خدا حافظ۔" اتنا کہہ کر انہوں نے فاخرہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے قدم اٹھائیں ثاقب حسن۔ تیزی سے دہلیز پار کر کے گھر سے باہر آ گئے۔ گو فلورا انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی لیکن ــ دونوں میں سے کسی نے بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

سلوط کی بدسلوکی اور گستاخانہ رویّے پر فلورا کو رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا۔ وہ دروازے کا کھٹکا لگا کر اپنے بستر پر بیٹھی تو بات کرنی تو کجا اس کا دل سلوط کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی نہ چاہا۔ یوں بھی عشاء کی نماز پڑھ چکی تھی اور عشاء ہی کے بعد ہی آدھ پاؤ گھنٹے کا ہی وقت ہوتا تھا جب اس سے بات کرنے کی فرصت ہوتی تھی ــ ورنہ ــ اس کے گھر سے کلینک کافی دور تھا۔ اور چونکہ وہ بس کے ذریعے کلینک جاتی تھی اسی لیے ساڑھے سات بجے صبح ہی گھر سے نکل جاتی تھی اور پھر سات بجے شام کو ہی ڈولتی بھٹکتا کے واپس آتی تھی۔ اور اگر کوئی سیریس کیس آ جاتا تھا تو واپسی میں اسے دس بھی بج جاتے تھے۔

اس سمے رات کے نو بج چکے تھے۔ اور سلوط کی طرف سے دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہوئے اس نے فوری طور پر سو جانے

کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسی لیے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کی لائٹ بجھائی اور چپ چاپ اپنے پلنگ پہ جو وہ سلوط کے آجانے کی وجہ سے نیا خرید کرلائی تھی لیٹ گئی۔ جبکہ سلوط ابھی تک کھڑی ہی تھی اور بہت بے دردی سے اپنا ناخن چبا رہی تھی۔ اصل میں تو وہ سمجھ رہی تھی کہ اب فلورا اس کے بری طرح لتے لے گی۔

اسے سمجھائے بجھائے گی اور قائل کرنے کی کوشش کرے گی۔
مگر اس کی باتوں کے ردِّعمل میں اس نے خاموشی اختیار کی۔
بلکہ خفگی کا اظہار کیا اور بتی بھی بجھا دی۔
سلوط کا دل تو پہلے ہی بھرا چلا آرہا تھا۔

فلورا کی ناراضگی نے اسے مزید ہوا دی تو جھر جھر اسکی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیل ساراں ہوگیا اور وہ اندھیرے میں اپنے پلنگ پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔ اس کی شوں شوں۔ اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اتنی واضح تھی کہ فلورا نے بھی سنی۔ لیکن ایک تو وہ اس سے کبیدہ تھی دوسرے سارا دن ڈیوٹی انجام دینے کی وجہ سے بہت تھک گئی تھی اور اسے سخت نیند آرہی تھی۔ اسی لیے وہ اسے یونہی روتا بلکتا چھوڑ کر کچھ ہی دیر بعد پڑ کر سوگئی۔

اگلے روز حسبِ معمول صبح تڑکے ہی بیدار ہوئی تو دیکھا سلوط جا نماز بچھائے فجر کی نماز ادا کررہی ہے۔ نہ معلوم وہ رات کو سوئی بھی تھی یا جاگتی رہی اور روتی ہی رہی تھی۔ فلورا کے دل میں یہ خیال ضرور آیا۔ مگر اس نے سلوط کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی وضو کرکے نماز پڑھی۔ اور وضو کرنے سے قبل اس نے پانی کی کیتلی جو چائے بنانے کی غرض سے چولہے پر رکھی تھی۔ نماز سے فارغ ہوکر اسی میں چائے دم کی۔ اور پیالی میں اپنے لیے چائے بنا کر وہیں کھڑے کھڑے کنستر سے آٹا نکال کر جلد جلد گوندھنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک دو گھونٹ چائے کے بھی پیتی رہی۔ پھر آٹا گوندھنے کے بعد اس نے باقی ماندہ چائے پی کر پیالی دھوئی اور پتیلی کھنگال کر اس نے رات کا لایا ہوا قیمہ دھویا اور مسالے اور گھی سمیت پتیلی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ اور دوسرے چولہے کو سلگا کر توے کو اس چولہے پر رکھ دیا اور کونڈے میں سے پیڑے توڑ توڑ کر خشکی کی پرات پر رکھنے لگی۔

سلوط بھی اس دوران میں چھوٹے اور تنگ سے باورچی خانے کے کھلے در پر آکھڑی ہوئی تھی مگر اس نے اب تک فلورا کو سلام کیا تھا نہ ایک لفظ کہا تھا۔ جبکہ سرگودھا سے واپس آتے ہی یہ سارے کام اس نے بہت زبردستی کرکے اپنے ذمے لے رکھے تھے مگر اس روز فلورا وہ کام خود انجام دے رہی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اس سے سخت خفا ہے اتنی کہ بول لینے کی، کی روادار نہیں مگر اس کی خفگی کی وجہ سلوط کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی بلکہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہورہی تھی کہ یہ میرا اور بھائی جان کا ذاتی معاملہ ہے۔ انہوں نے مجھ پر زیادتیاں ہی نہیں کی تھیں بلکہ ظلم توڑا تھا۔ مجھے برباد اور بے ٹھکانہ کرنے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔ اور آنٹی ان ساری باتوں سے لاعلم نہیں ہیں پر انہیں بھی معلوم ہے کہ میں نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں کتنی اذیتیں جھیلی ہیں۔ اور کیسے کیسے زخم کھائے ہیں۔ کہ میری شخصیت ہی ریزہ ریزہ ہوکر رہ گئی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی ذات تک پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ اور میں نے اپنی ان اذیتوں اپنے ان دکھوں کو خود ہی تو سہا ہے۔ کسی نے میرے دکھ نہیں بانٹے۔ کسی نے اذیتیں جھیلنے میں میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں خود ہی بالکل تنہا اور بے یارومددگار طوفانی ہواؤں کی زد میں آئے تنکے کی طرح اِدھر اُدھر رُلتی پھری ہوں اور اب میں نے اپنا ایک ٹھکانہ بنایا ہے۔ اپنے لیے ایک نئے راستے کا تعین کیا ہے۔ تو پھر بھابی اور بھائی جان اس نئے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے آگئے۔ شاید اس خوش فہمی میں آئے تھے کہ میں اب بھی وہی۔ سہمی سہمی دبی دبائی اور بے زبان سی سلوط ہوں۔ جسے انہوں نے اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اور وہ کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ حتیٰ کہ اشاروں اور کنایوں میں بھی اپنی ناپسندیدگی کو زبان نہیں دے سکی تھی۔ اور حد تو یہ تھی کہ جب لٹ پٹ کر واپس آئی تھی۔ تب بھی اُن کے اشاروں پر ناچتی رہی تھی۔ انہی کی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔

انہوں نے بہت بہلا پھسلا اور سبز باغ دکھا کر کہا کہ میرے برادرِ نسبتی کے یہاں کراچی چلی جاؤ وہ لوگ بہت ہی شریف ہیں اور بڑا اعلیٰ ظرف رکھتے ہیں۔ تم کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ اور پھر صرف ڈیڑھ دو ماہ کا معاملہ ہی تو ہے۔ ہم واپس

آتے ہی تمہیں اپنے پاس بلالیں گے۔ ارے ہم تمہاری خاطر ہی تو انڈیا جارہے ہیں۔ تاکہ اس خبیث کی قید سے تمہیں رہائی دلوادیں ہمیشہ کے لیے۔ اور تب میں نے بھی بھائی جان کی لچھے دار گفتگو کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی کراچی آگئی تھی۔ مگر کراچی آکر تو ایسی خواری کا منہ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اور ان ساری باتوں کے ذمہ دار صرف اور صرف بھائی جان ہیں۔ جو مجھے کراچی بھیج کر بھول ہی گئے تھے کہ ان کی کوئی بہن بھی بستی ہے اِس اتنی بڑی پُرہنگام دنیا میں۔ مگر بھائی جان نے مجھے بہن ہی کب سمجھا۔ میں تو ان کی نظر میں دنیا کی سب سے بیکار اور فالتو شے رہی ہوں۔ بھلا ایک ہی بھائی کی ایک بہن ہوتی ہے تو وہ اس کے کتنے ناز اور نخرے اُٹھاتا ہے۔ کس قدر لاڈ کرتا ہے۔ اور کتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ مگر وہاں تو لاڈ پیار ناز نخرے اُٹھانا اور ٹوٹ کر چاہنا تو بڑی بات ایک نگاہِ التفات کو بھی یہ چھوٹی بہن ترستی تھی۔ جب سگا بھائی ایسا بے حس تھا تو پھر بھابی کو کیا دوش دینا۔

تبھی تو گزشتہ شب مجھے ان کی شیریں کلامی اور اتنی زیادہ یگانگت ذرا بھی متاثر کرسکی نہ متعجب۔ کیونکہ ان کی ساری باتوں کا کھوکھلا پن میں نے محسوس کرلیا تھا۔ ان کی گفتگو سے تصنع اور بناوٹ کی بو آرہی تھی۔ ہونہہ۔ اب انہیں کیا معلوم کہ زندگی کی کٹھنائیوں اور تلخ تجربات نے سلوط کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ انہیں کیا خبر کہ سلوط اب پہلے جیسی دبی دبائی بے زبان بلکہ بے ضرر سی سلوط نہیں رہی ہے مگر ہاں۔ میری گرمیٔ گفتار سے۔ انہوں نے کچھ تو اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔

جانے کتنی دیر تک وہ باورچی خانے کے کھلے در پر کھڑی یہی سوچتی رہی تھی۔ وقت کے گزرنے کا احساس تو اُس وقت ہوا جب توے کو چولھے پر سے اتار کر کیل پر لٹکانے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ تو اس نے بری طرح چونک کر فلورا کی طرف دیکھا۔ جو توا لٹکانے کے بعد دست پنے سے چولھے پر چڑھی قیمے کی پتیلی کا ڈھکنا کھول رہی تھی۔ گو اس کی عادت نہیں تھی۔ کسی بات پر استفسار کرنے یا بولنے کی۔

بڑی سے بڑی بات اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی، اس کے ساتھ ہوتی مگر وہ چپ ہی رہتی تھی حتیٰ کہ بڑی سے بڑی بیدادبھی اس پر توڑی جاتی تب بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ نہ وہ چھچھوری لڑکیوں کی طرح پٹر پٹر بولنے، ہنسی مذاق کرنے اور ہر بات کی ٹوہ میں لگی رہنے کی ہی عادی تھی۔

اس کے مزاج میں بردباری تھی اور فطرتاً بھی باپ کی طرح کم گو تھی۔ بات بھی کرتی تو ضرورتاً۔ ہنستی بھی تو ذرتاً۔ یعنی اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ ایک اسٹائل تھا۔ جس نے اس کے اندر ایک وقار سا پیدا کردیا تھا۔ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ پوچھتی بھی نہیں۔ مگر یہ فلورا کا معاملہ تھا جس کے اس پر بہت سارے احسانات تھے۔ جس نے اسے پناہ ہی نہیں دی تھی بلکہ سہارا بھی دیا تھا، تحفظ دیا تھا اور سب سے بڑھ کر اپنی بے لوث چاہتوں سے نوازا تھا۔ اور فی زمانہ بے لوث چاہتیں مفقود نہ سہی مگر عنقا ضرور ہوکر رہ گئی ہیں۔ اور پھر بے لوث چاہتوں کا متلاشی تو برہنہ پا درد کا جلتا ہوا صحرا بھی عبور کر جاتا ہے۔ کہ یہ چاہتیں اگر ملتی ہیں تو آبلہ پائی کے بعد ہی ملتی ہیں۔

جیسے کہ سلوط کو فلورا سے ملی تھیں۔ پھر بھلا وہ کیسے اس کی ناراضگی برداشت کرسکتی تھی۔ دل کو سنبھال کر وہ تھوڑا سا آگے بڑھی اور پھر قدرے شگفتہ لہجے میں اسے سلام کیا۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام۔" جواب بہت دھیمی آواز میں ملا۔

"ارے یہ آپ کیا کرنے کھڑی ہوگئیں آنٹی؟" اس نے فلورا کے قریب ہوکر پوچھا۔

"بس، یہ میرے کرنے کے کام ہیں۔ اس لیے کررہی ہوں۔" فلورا روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"لیکن یہ کام تو آپ نے مجھے سونپ دیے تھے آنٹی! اور پھلکے تو بعد میں ڈالتی ہوں میں۔ آپ نے آج پھلکے کیوں پکالیے۔ خیر اب بیٹھیے میں قیمہ بھون دوں۔" سلوط اس کے ہاتھ سے کفگیر لینے کی کوشش میں بولی۔

"نہیں بھئی، میری عادتیں نہ بگاڑو۔ تمہارا تو کچھ ٹھیک نہیں کہ کب چلی جاؤ۔ بعد میں تن آسانی کی عادت

مجھے بہت تکلیف دے گی۔" فلورا نے بدستور روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوہ! تو آنٹی میری اس بات پر مجھ سے خفا ہو گئی ہیں۔" سلوطا نے دل میں سوچا اور پھر جھینپے جھینپے انداز میں بولی۔

"وہ تو میں نے بھابی جان سے اس لیے کہہ دیا تھا، تاکہ وہ آئندہ یہاں نہ آئیں۔"

"لیکن اگر وہ یہاں آ گئیں تو پھر تو تم یقیناً یہاں سے چلی ہی جاؤ گی نا۔" فلورا اب چولھے کی طرف منہ کر کے پتیلی میں کفگیر چلا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گھوم کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ سوال اس نے گھوم کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے سوال کا فی الفور کوئی جواب نہ بن سکا وہ توقف کے بعد کچھ سوچ کر بولی۔

"نہیں۔ میں بھلا کہاں جاؤں گی بلکہ جا سکتی ہوں؟"

"نہیں بھئی تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ بس جب تک یہاں ہو، آرام اور بے فکری سے رہو۔ ان کاموں کا کیا ہے۔ یہ تو زندگی کے روزمرہ میں سے ہیں۔ اور میں تو شروع ہی سے انہیں انجام دینے کی عادی ہوں۔ انہیں تم کر دو یا میں انجام دوں میرے لیے ایک ہی بات ہے۔" فلورا پھر چولھے کی طرف گھوم کر پتیلی میں چمچہ چلانے لگی۔

"کمال ہے آنٹی! آپ اتنی سی بات پر اس قدر ناراض ہو گئیں۔ بھلا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور کر سکتی ہوں۔" سلوطا اس کی خفگی سے عاجز ہو کر بولی۔

"کیوں میرے اندر کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ میرا تو تم سے کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ واقفیت۔ جب تم اپنے سگے اور خونی رشتوں کو توڑ سکتی ہو تو میری بھلا کیا بساط اور اوقات۔" فلورا نے اس کی طرف مڑتے ہوئے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"نہیں آنٹی! میرا آپ سے خلوص کا رشتہ ہے بے لوث چاہت کا رشتہ ہے اور سب سے بڑھ کر اسلامی رشتہ ہے جو سگے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے کیونکہ یہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔" سلوط قدرے جوشیلے انداز میں بولی۔

"ہاں اس میں شک نہیں کہ اسلام کا رشتہ بہت مضبوط اور قریبی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق حق باری تعالیٰ کی ذات اور حبیبِ پاکؐ سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی تھی تو بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے کے سامنے شمشیر زن ہوتا تھا۔"

"ہاں تو پھر اسلام کا رشتہ سگے رشتوں سے بڑھ کر ہوا نا۔" سلوطا نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں، بے شک ہوتا ہے لیکن۔ اس رشتے میں ورثوں کی تقسیم نہیں رکھی گئی۔ یعنی ایک مسلمان کی جائیداد اور مال و زر کا حق اس کی زندگی یا وفات کے بعد دوسرے مسلمان کو نہیں دیا گیا بلکہ یہ رعایت یا حق سگے اور خونی رشتوں کو ہی ودیعت کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم پیٹ میں ہی بچے کے رشتوں کا تعین کر دیتے ہیں اور پھر نسل باپ ہی سے چلتی ہے۔ خون باپ کا ہی مانا جاتا ہے بلکہ انسان کی شناخت ہی باپ کے خون سے ہوتی ہے۔ لہٰذا تم ان رشتوں کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔" فلورا اسے قائل کرنے کی غرض سے بڑے ٹھوس دلائل دے کر بولی۔

"لیکن میں نے ان رشتوں کی حقیقت سے کب انکار کیا ہے آنٹی! میں نے تو یہ کہا تھا کہ میں ہر رشتہ توڑ چکی ہوں۔ کیونکہ رشتہ توڑنے کا تو مجھے کم از کم مجھے اختیار تھا۔" وہ فلورا کی باتوں سے زچ ہو کر بولی۔

"اچھا اگر تمہیں اتنا ہی اختیار ہے تو پھر اپنے جسم سے یہ گوشت بھی نوچ کر پھینک دو اور یہ خون جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے اسے بھی نکال پھینکو کہ تمہارے دادا سے تمہارے باپ کی رگوں میں منتقل ہوا ہے۔ اور باپ سے تمہاری رگوں میں ہے۔" فلورا اسے سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی طیش میں آ کر بولی۔ وہ بھی چڑچڑا سی ہو گئی تھی۔ فلورا کے سامنے وضاحتیں پیش کر کر کے روکھی سی ہو کر بولی۔

"میں نے آپ سے ابھی کوئی بات چھپائی ہے نہ جھوٹ ہی بولا ہے بلکہ جتنا بھی بتایا ہے۔ میرے ساتھ جتنا کچھ ہوا ہے اس کے عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ میں بھلا کس دل سے ان لوگوں کے ساتھ دوبارہ رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔"

"خیر، تم چاہو یا نہ چاہو۔ یہ رابطہ تو قائم ہی رہے گا کیوں کہ خون کے رابطے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتے اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے بھائی بھاوج نے تم پر زیادتیاں ہی نہیں بلکہ بڑے مظالم ڈھائے ہیں لیکن تمہاری بربادی کے ذمہ دار وہ نہیں تمہاری قسمت ہے۔ کیونکہ مرد و زن کے رشتے عرش پر طے کیے جاتے ہیں۔ اور فرش پر ان کا سنجوگ ہوتا ہے۔ وہ بھی موت کی طرح ایک معینہ وقت پر۔ تمہاری۔ تمہارے بھائی یا کسی کی بھی طاقت نہیں جو قدرت کے فیصلوں میں دخل دے۔ سو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارا مقدر تھا اور باقی جو حالات اور واقعات پیش آئے یا پیدا کیے گئے۔ ان کے ذمہ دار اور قصوروار تمہارے بھائی ہی ہیں۔ لیکن انہوں نے تم سے معافی تو مانگ لی ہے۔" فلورا نے اس کی کسی بھی تاویل یا عذر کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اب سلوطا اس سلسلے میں مزید کیا کہتی کہ وہ تو اس کی کوئی بات کوئی دلیل ماننے پر تیار ہی نظر نہ آتی تھی۔

"تمہارے بھائی جان تم سے اتنے بڑے ہیں کہ اگر تمہاری بھابی مجھ سے نہ کہتیں کہ باہر کار میں ان کے شوہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں یہی سمجھتی وہ تمہارے باپ ہیں مگر بڑا بھائی بھی باپ کے سمان ہوتا ہے۔ اس پر بھی ان پر شاباش ہے کہ تمہارے اتنے اہانت آمیز سلوک اور باتوں کے باوجود ان کی تیوری پر بل تک نہیں آیا۔ اور وہ تم سے معافی مانگ کر گئے اور معافی تو تمہاری بھابی نے بھی مانگی تھی اور جس طرح وہ تمہاری خوشامد کر رہی تھیں۔ میں نے آج تک کسی بڑی بھابی کو نند کی منت سماجت کرتے نہیں دیکھا۔" اسے خاموش دیکھ کر فلورا نے پھر کہا۔

سلوطا نے بھائی اور بھاوج کے ساتھ بدتمیزی تو کی تھی۔ اور اس کے خیالات بھی ان کی طرف سے بڑے باغیانہ تھے۔ مگر دل ہی دل میں اپنے اس ناروا سلوک پر وہ چور سی بنی ہوئی تھی۔ اس کا ضمیر برابر اسے ملامت کر رہا تھا۔ اب جو فلورا نے ایک طرح اس کے لتے لیے تو اسے رونا آ گیا۔ مگر فلورا نے اس کی آنسوؤں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔

"ارے بچی! بھائی بہن اور رشتے دار بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ ارے ہم سے پوچھو۔ ہم تو ان رشتوں کو ترس گئے ہیں۔ ہمارا سینہ چیر کر دیکھو کہ وہاں کتنے گہرے زخم لگے ہیں۔ ہماری تو ساری فیملی فسادات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دونوں بھائی بہن اور ماں باپ کوئی بھی تو نہیں بچا تھا۔ ایک صرف میں دکھیا ہی سب کے غموں کا بوجھ اٹھانے کے لیے رہ گئی تھی۔ ارے ماں جائے کی بات ہی کچھ اور ہی ہوتی ہے بچی! تم خواہ کہیں بھی رہو کیسی ہی حفاظت میں رہو مگر ہمیشہ خود کو غیر محفوظ ہی محسوس کرو گی۔ کیونکہ اپنوں کے ہوتے دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے والے اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے۔" فلورا نے ایک اور کچوکا لگایا۔ تو وہ روتے روتے بولی۔

"تو پھر آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں۔ میرا دل ان لوگوں سے کھٹا ہو گیا ہے۔ میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی۔ کہ پھر ان لوگوں کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ اور۔ اور اب تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ رات کے سلوک کے بعد تو میں خود بھی ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔" اپنی بات بڑی بے بسی سے کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ فلورا کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"واہ کیوں قابل نہیں رہیں۔ تمہارے بھائی بڑے شریف اور ٹھنڈے مزاج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی حلیمی کا اس سے اندازہ لگا لو کہ تمہارے اتنے اہانت آمیز رویے اور گفتگو کے باوجود بھی کہ جسے سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زیادتیوں کا اعتراف کیا بلکہ تم سے معافی بھی مانگ لی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں فوراً معاف کر دیں گے۔" تو اس نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

"لیکن میں تو ہرگز ان سے معافی نہیں مانگوں گی کیونکہ لڑکپن سے لے کر اب تک ہمیشہ سب کے سامنے ہی خود کو جھکایا ہے۔ میں ہی سب کی کڑوی کسیلی نہایت صبر و سکون سے برداشت کرتی آئی ہوں لیکن اب میرے

اندر برداشت کا مادّہ ختم ہو چکا ہے۔ ہاں البتہ —" سلوط کچھ کہتے کہتے رکی تو فلورا نے فوراً ہی پوچھا۔

"ہاں، ہاں کہو۔"

"البتہ اگر بھائی جان نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تو شاید چلی ہی جاؤں۔" آخری فقرہ سلوط نے دبی دبی زبان سے کہا۔

"یہ شاید کیوں کہا تم نے — بس چلی ہی جانا کیونکہ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ لیکن اب تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب تمہارے بھائی ادھر کا رخ کریں گے۔"

فلورا کی باتوں سے سلوط یہی سمجھی کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہ رہی۔ وہ چپ سی ہو کر یہی سوچنے لگی کہ بھائی تو اب شاید ہی ادھر کا رخ کریں۔ پھر وہ یہاں سے بھلا کہاں جائے گی۔

"غلط باتوں کو دل میں جگہ نہ دو مونا! مجھے تمہاری بہتری اپنے گھر سے زیادہ عزیز ہے۔ ورنہ تمہارے آجانے کی وجہ سے دسرا ہٹ تو نصیب ہوئی۔ میں نے تمہیں اپنی بہن بنایا ہے۔ حتیٰ کہ تمہارا نام بھی تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بھی میں دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ — اوہو — آج تو بڑی دیر ہو گئی۔ اچھا چلو جلدی سے ٹفن میں میرا کھانا رکھ دو۔ اور ہاں تم بھی ناشتہ کر لو۔ میں تو اب دوپہر کو ہی کھانا کھاؤں گی۔ لو میں نے تو ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے۔" فلورا کو باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی وقت گزر جانے کا خیال آیا تو وہ اسے ہدایتیں دیتی اسی دم کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ اور سلوط ٹفن کھنگال کر جلدی سے اس میں قیمہ بھرنے لگی۔

پورا راستہ یعنی مارٹن روڈ سے کینٹ تک کا فاصلہ جس خاموشی سے طے ہوا تھا۔ فاخرہ کو وحشت سی ہونے لگی تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی بہت خاموش طبع تھی۔ اور ان کے شوہر بھی جو ضرورتاً ہی بات کرنے کے عادی تھے مگر پچھلے دو روز سے بہت چہک رہے تھے۔

اصل میں۔ جیسا کہ کار میں احتشام کے گھر تک پہنچنے کے درمیانی وقفے میں طے پایا تھا کہ اسفند اور ثاقب حسن دوپہر کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جائیں گے اور پھر اس کے بعد اپنا ضروری سامان پیک کرا کے بمعہ فاخرہ بیگم شام کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جائیں گے اس کوشش کے باوجود یہ طے شدہ پروگرام فیل ہو گیا تھا کیونکہ — اوّل تو دوپہر کی فلائٹ کے بجائے لاہور کے لیے شام کی فلائٹ مل سکی تھی۔ دوسرے لاہور پہنچنے کے بعد گھر کا سامان سمیٹنے اور پیکنگ کرنے میں اگلا آدھا دن ہی صرف ہو گیا تھا۔ کیونکہ فاخرہ نے گھر میں صرف چار پائیاں ہی چھوڑی تھیں — باقی کاٹھ کباڑ اور غیر استعمالی بے کار سا سامان محلے کے غربا میں بانٹ دیا تھا۔ اس پر ثاقب حسن کو بینک سے کچھ رقم بھی نکلوانی تھی اور کچھ لوگوں کے جو واجبات تھے وہ بھی ادا کرنے تھے۔ یوں تو فاخرہ بیگم کے تقریباً تمام زیورات ہی حالات کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن جو کچھ باقی رہ گئے تھے۔ وہ انہوں نے ان زیورات کے ساتھ جو سلوط کو درّانی نے واپس کیے تھے بینک کے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ انہیں بھی لاکر سے نکلوانا ضروری تھا۔ اس لیے دونوں میاں بیوی اسفند کے ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے اور دونوں کو بینک میں چھوڑ کر اسفند ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کرانے چلا گیا تھا۔

یوں تو یہ تینوں اگلے دن سہ پہر کو ہی کراچی پہنچ گئے تھے مگر رہائش کا مسئلہ چونکہ طے نہیں پایا تھا۔ حالانکہ اسفند نے تو کتنا اصرار بھی کیا تھا۔ کہ پھوپھا پھوپھی اس کے گھر میں ٹھہریں۔ لیکن ثاقب حسن کسی طرح آمادہ ہی نہ ہوئے تھے۔ خود فاخرہ بھی بھائی بھاوج بلکہ سہیل منصور سے بھی کچھ اس درجے کبیدہ ہو گئی تھیں کہ وہ بھی میاں کی ہم زبان ہو گئی تھیں۔ اس پر چونکہ جب تک مکان کا مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔ ہوٹل میں ہی قیام کرنا پڑتا اور ثاقب حسن کسی بہت ہی فائیو اسٹار قسم کے بہت ہی عمدہ اور مہنگے ہوٹل میں قیام کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایک تھری اسٹار کے نسبتاً سستے مگر اچھے ہوٹل میں قیام کرنے کو ترجیح دی — جبکہ اسفند تو یہی چاہ رہا تھا کہ جس عمدہ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں وہ دس بارہ روز قیام کر کے گیا تھا۔ وہیں پھوپھا اور پھوپھی کے لیے بھی ایک سوٹ بک کرا دے اور ان کے ہوٹل کے اخراجات وہ خود اٹھائے لیکن ثاقب حسن نے کسی طرح یہ گوارا ہی نہیں کیا۔

بہرکیف، ایک مقامی میگزین کے ذریعے ہوٹل کا چناؤ کرنے کے بعد کمرہ بک کرانے اور کمرے پر قبضہ جمانے

میں شام ہو گئی اور ادھر ثاقب حسن نے جب سے کراچی ایئرپورٹ پر قدم رکھا تھا مسلسل سلوط کے نام کی مالا جپ رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایئرپورٹ سے سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں مگر اصل مسئلہ کلینک تلاش کر کے فلورا تک رسائی حاصل کرنے کا تھا۔ اور ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی ثاقب حسن نے سلوط کے پاس جانے کی جو رٹ لگائی تھی تو اسفند نے بھی انہیں بہت سمجھایا تھا کہ اس کام کو اب وہ آئندہ روز پر چھوڑ دیں۔ اس وقت تو شام ہو گئی ہے۔ کلینک کو کھلا ہوا ہو گا مگر اس وقت وہاں جانا کسی طور پر مناسب نہیں لیکن ثاقب حسن کا کہنا تھا کہ وہ آج کا کام کل پر چھوڑنے کے عادی نہیں۔ دین (Then) اور دیر (There) کے قائل ہیں۔ اصل میں انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں پریرا — فلورا کو فون کر کے ڈرا ورا نہ دے اور وہ سلوط کو کہیں اور بھجوا دے۔

بہرحال، ثاقب حسن کی ضد کے پیش نظر اسفند نے انہیں کار میں جو اس نے اپنے ایک واقف کار، کار ڈیلر کے پاس رکھوا دی تھی۔ کوئی سات بجے کے قریب فاخرہ بیگم سمیت کلینک کا رخ کیا جسے ڈھونڈنے میں کم و بیش آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا اور جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مڈوائف فلورا کچھ دیر قبل ہی اپنی ڈیوٹی انجام دے کر اپنے گھر جا چکی ہے۔ تب اسی کلینک کی کئی نرسوں سے اس کے گھر کا پتا دریافت کیا مگر سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسنِ اتفاق سے وہ ڈاکٹر آ گیا جو یہ کلینک چلا رہا تھا۔ اس نے فلورا کا پتا بتایا۔

اسی تگ و دو میں رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ ثاقب حسن نے اسی وقت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسفند جو ان کے ساتھ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فاخرہ کو آہستہ سے بتایا کہ وہ اس وقت ان دونوں کے ساتھ فلورا کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اگر پھوپھا۔ جانے کا تہیہ ہی کر چکے ہیں تو پھر وہ کہیں راستے میں ہی اتر جائے۔ مگر مسئلہ تو کار ڈرائیو کرنے کا ہے اور اسی وقت تو کوئی ایسا ریڈی میڈ ڈرائیور ہی نہیں ملے گا تو فاخرہ بولیں۔

"اے لو۔ تو کیا تمہارے خیال میں تمہارے پھوپھا جان کو کار چلانی نہیں آتی۔ ارے وہ تو ایکسپرٹ ہیں ایکسپرٹ۔ اب کچھ نہیں ہیں مگر جب کچھ تھے تو ان کے پاس پانچ پانچ گاڑیاں تھیں پانچ پانچ۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ میں اپنے ہوٹل پر اتر جاؤں گا اور پھوپھا جان خود کار ڈرائیو کریں گے۔" اسفند بولا اور پھر راستے میں ہی اتر گیا لیکن اترنے سے پہلے اس نے انہیں مارٹن روڈ کا راستہ اور محل وقوع ضرور بتا دیا تھا۔ یوں تو شہر کراچی میں کسی کا گھر ڈھونڈنے کا مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے صدیوں سے مدفون کوئی خزانہ ڈھونڈنا کہ اس میں بھی متلاشی کے ہاتھ میں خزانے کا نقشہ ہوتا ہے اور یہاں بھی ڈھونڈنے والے کے ہاتھ میں گھر کا پتا ہوتا ہے اور وہاں کا پتا پاس ہوتا ہے تو انسان اس علاقے کی حدود میں بھی پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ محلّے میں بھی۔ گھر کے بہت قریب یا آس پاس — اس کے باوجود بھی اہلِ محلہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

اور اگر شامتِ اعمال راستے میں کسی راہ گیر یا دکاندار سے پتا پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ یہ جو سامنے مین روڈ جا رہی ہے اس کے سرے پر چلے جائیں اور وہاں سے بائیں یا دائیں فلاں سڑک پر مڑ جائیں۔ بس تھوڑا آگے جا کر آپ کو اپنی مطلوبہ جگہ مل جائے گی — اور اب جو اس مین روڈ پر چلے تو وہ شیطان کی آنت کی طرح کھینچ کر اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی اور جب ناک کی سیدھ میں چلتے چلتے اس سڑک کے سرے پر پہنچتے ہیں تو دائیں یا بائیں پھر وہی لمبی سڑکوں کا جال۔ قسمت سے ہی کسی کو صحیح پتے پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔

مگر اسفند جیل کے سرے پر شہید ملت کا جو آخری راؤنڈ اباؤٹ تھا وہیں انہیں چھوڑ کر کار سے اترا تھا اور اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جیل کی چار دیواری سے آخری سرے کے مقابل میں جو کوارٹر بنے ہوئے ہیں وہ مارٹن روڈ کے ہی ہیں۔ اور آپ وہاں بنے کوارٹروں کے نمبر شمار کرتے ہوئے جلد ہی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ ثاقب حسن اس بات پر سخت جز بز تھے کہ اسفند کو ان کے ساتھ جانے میں کیا عار ہے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ ان کی طلب صادق تھی۔ اور دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس لیے فلورا کا پتا تلاش کرنے میں انہیں دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ جب کہ کوارٹروں کے درمیان بنی تنگ سی گلیوں کا وہاں بھی ایک جال سا بچھا تھا۔ اور انہیں کافی اندر جانا پڑا تھا مگر نمبر پڑھتے ہوئے، بلکہ نمبروں کی ترتیب کے مطابق چل رہے تھے اس لیے کچھ ہی دیر بعد انہیں فلورا کے گھر کا نمبر مل گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے فاخرہ کو بھیج دیا تھا

تاکہ اگر کسی غلط کوارٹر پر آگئے ہوں تو ایسے ناوقت ایک خاتون کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کوئی اعتراض نہ کرے۔

بہرحال یہ ان کی اپنی کوئی مصلحت تھی مگر پہنچے تو صحیح جگہ پر تھے۔ فاخرہ کے دستک دینے پر دروازہ کھول دیا گیا تھا اور وہ اندر چلی گئی تھی۔ اسی سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ٹھیک پتے پر پہنچے ہیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ وہ فاخرہ کے سامنے ہی ہوا تھا۔ ان کے دل، جذبات اور احساسات پر جو بھی گزری تھی۔ اس سے بھی فاخرہ لاعلم نہیں تھیں۔ بے چارے فلورا کے گھر کا رُخ کرنے کے دوران راستے میں کیسے کیسے منصوبے بناتے رہے تھے۔

"بس اب ہم تین چار روز کے اندر اندر ہی یہاں کے کسی معزز علاقے میں ایک مکان خرید لیں گے۔ کیونکہ جوان بیٹی کا زیادہ عرصہ ہوٹل میں رہنا ٹھیک نہیں۔ اب یہ تو اسفند میاں ہی جانتے ہوں گے کہ ہمارے قیام کے لیے یہاں کا کون سا علاقہ موزوں رہے گا۔"

"یہاں کراچی میں کوئی بھی علاقہ کسی خاص طبقے کے لیے مختص نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے جن علاقوں میں شرفا اور معزز رہتے ہیں یا جو علاقے معزز کہلائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی اچھے اور برے ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں اصل میں ان علاقوں کی بیشتر آبادی نودولتیوں پر مشتمل ہے جن میں اچھے ظرف کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ہلکے ظرف کے بھی۔" اسفند نے کہا۔

"خیر خیر۔ ایسی صورتِ حال تو نقریباً پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہے۔ لیکن ہم کسی ایسے علاقے میں مکان خریدنا چاہتے ہیں جو کسی معزز علاقے اور شہر کے وسط میں ہو مگر بہت گنجان نہ ہو اور اب مکان کی خریداری کا معاملہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔" ثاقب حسن نے کہا تو اسفند جلدی سے بولا۔

"لیکن پھوپھا جان! میں تو اس فیلڈ میں بالکل کورا ہوں — مجھے مکانات وغیرہ کی خرید و فروخت کا بالکل تجربہ نہیں البتہ کراچی میں سینکڑوں اسٹیٹ ایجنسیاں ہیں — گو میں کسی سے واقف تو نہیں مگر کسی اسٹیٹ بروکر سے آپ کو ملوا دوں گا۔"

"ارے بھئی نہیں۔ کسی بروکر کے ذریعے مکان خریدنا ہمیں بالکل گوارا نہیں۔ ایک تو یہ بروکر قسم کے لوگ ہمیشہ اپنے فائدے کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ دوسرے کمیشن بھی بہت زیادہ لیتے ہیں۔ اب نامعلوم یہاں مکانات وغیرہ کی کمیشن کی شرح کیا ہو۔ ظاہر ہے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے خود اپنی ذات میں چھوٹا پاکستان۔"

"افوہ! وہی مثل ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اب یہاں آئے ہیں تو یہیں کے اصولوں اور قاعدوں پر چلنا پڑے گا۔ پہلے یہ دعا کیجیے کہ خدا کرے بلقیس مل ہی جائیں۔" فاخرہ نے ان کی بے موقع گفتگو سے اکتا کر کہا۔

"ارے ملیں گی کیوں نہیں۔ بھلا ہم تو اتنے صادق جذبے، ارمان اور آرزوئیں لے کر ان سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان کے نہ ملنے کا کیا سوال۔" ثاقب حسن جذباتی ہو کر بولے تھے مگر اب واپسی میں سلوطا اگرچہ مل بھی گئی۔ تو اس نے ان کے سارے صادق جذبوں ارمانوں اور آرزوؤں پر اپنے بے مہر اور گستاخانہ رویے سے پانی پھیر دیا تھا۔ ساری خوشی، سارے صادق جذبے سارے ارمان اور آرزوئیں سب کچھ پامال ہو گئے تھے۔ فاخرہ کو شدت سے احساس تھا کہ اس سمے شوہر کے دل، جذبات اور احساسات کا کیا عالم رہا ہوگا۔

ٹن ٹن ٹن — فون کی گھنٹی ایک تسلسل سے بج رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور زینت اور شعیب منصور کچھ دیر قبل ہی تھک ہار کر اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ اصل میں شعیب منصور نے چند کاروباری اہم ہستیوں کو ڈنر دیا تھا۔ سارا دن زینت گھر کی سیٹنگ اور کھانا پکوانے میں لگی رہی تھیں اس لیے تھک کر چُور ہو رہی تھیں۔ ان کے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ ابھی سوئی نہیں تھیں۔ مگر اُٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ شعیب منصور خود اٹھ کر فون ریسیو کریں۔ ادھر فون بھی اسی وجہ سے سرہانے سے اٹھا کر کمرے کے دوسرے کونے میں رکھ دیا جاتا تھا کہ رات بے رات ایک دم ہی وہ اٹھے تو نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ کیونکہ اکثر و بیشتر رات میں آنے والی کالیں رانگ نمبر ہی ہوتی تھیں۔ لہٰذا زینت شوہر کے اٹھنے کے انتظار میں ہی پڑی رہیں مگر جب کال بیچ میں سے کٹ کر پھر فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی تو طوعاً و کرہاً زینت ہی کو اٹھ کر فون ریسیو کرنا پڑا۔

"ہیلو بھئی کون بول رہا ہے۔" انہوں نے جھنجلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا آپ شعیب منصور صاحب کے گھر سے بول رہی ہیں۔" ادھر سے فاخرہ نے پوچھا۔

"جی ہاں میں بیگم شعیب بول رہی ہوں۔ مگر آپ کی تعریف۔" انہوں نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

"اوہو آپ ہیں۔ آداب بھابی جان! ذرا منجھلے آکا کو تو بلا دیں۔" فاخرہ نے کہا تو کچھ دیر کو تو جیسے زینت کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر وہ ریسیور ہاتھ میں اٹھائے اس کا تار کھینچتی قدم بڑھا کر بیڈ کے قریب آگئیں اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے شعیب منصور کا پیر ہلا کر آہستہ سے بولیں۔

"سنیں شعیب۔ شاید فاخرہ بی کا فون ہے۔" اور شعیب منصور جو جاگ رہے تھے لیٹے لیٹے ہی بولے۔

"شاید سے آپ کا کیا مطلب ہے کیا آپ نے ان سے پوچھا نہیں یا آپ انہیں پہچانی نہیں۔"

"افوہ۔ اگر پہچانی نہیں تو کیا دل سے گھڑ کر کہہ رہی ہوں۔ وہی ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔" زینت

نے قدرے جھلا کر کہا۔

"اوہ۔ خدا خیر کرے رات کے پونے بارہ بجے فاخرہ بی نے مجھے کیوں فون کیا ہے۔ اچھا لائیے ریسیور مجھے دیجیے۔" شعیب منصور گھبرا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ زینت نے کونے میں رکھا فون ان کے سرہانے لا کر رکھا اور پھر ریسیور ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو۔ شعیب اسپیکنگ۔" شعیب منصور نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔

"اد ہو۔ آداب عرض منجھلے ابّا۔ شکر ہے آپ نے بات تو کی۔ ورنہ بھابی جان تو میری آواز سن کر ایسی خاموش ہوئی تھیں کہ میں سمجھی میری یہ کال ہی ضائع جائے گی۔" فاخرہ نے چہکتے سے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں اصل میں تمہاری بھابی جان اتنے ناوقت اور غیر متوقع تمہاری آواز سن کر بحرِ حیرت میں غوطے کھانے لگی تھیں۔ خیر تم بتاؤ کہاں سے بول رہی ہو۔ باہر کہیں سے یا لاہور سے۔" شعیب منصور نے پوچھا۔

"نہیں میں باہر کہیں سے بول رہی ہوں نہ لاہور سے بلکہ آپ کے شہر کراچی سے ہی بول رہی ہوں۔" فاخرہ نے بتایا تو شعیب منصور ان کی کراچی میں موجودگی کا سن کر اُچھل سے پڑے۔

"اچھا۔" انہوں نے اچھا کو بہت جما کر کہا۔

"مگر کراچی پہنچ گئی ہو تو یہ تو بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو۔ اسٹیشن پر یا ایئرپورٹ پر تاکہ میں تمہیں اپنی کار بھیج دوں۔"

"نہیں بڑی نوازش منجھلے ابّا۔ کار بھیجنے کی زحمت نہ کریں کیونکہ ہم دونوں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" فاخرہ نے مزید ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا تو شعیب منصور کچھ پریشان سے ہو گئے۔

"کمال ہے ہوٹل میں کیوں ٹھہریں کیا میرے گھر کا پتا یاد نہیں رہا تھا یا پھر میرے یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس قدر غیریت برتنے کی کیا ضرورت تھی بھنّو۔ خیر یہ بتاؤ کہ کس ہوٹل میں قیام ہے تمہارا۔" شعیب منصور نے گلہ سا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوٹل کا نام تو مجھے معلوم نہیں منجھلے ابّا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ ہوٹل کینٹ اسٹیشن کے علاقے میں ہی واقع ہے۔" فاخرہ کی بات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہوٹل کا نام نہیں بتانا چاہ رہیں۔

"تعجب ہے تمہیں ہوٹل کا نام تک معلوم نہیں۔ یہ کہو کہ تم بتانا نہیں چاہ رہیں۔" شعیب منصور بُرا مان جانے کے سے انداز میں بولے۔

"لیکن منجھلے ابّا ہوٹل کا نام معلوم کر کے آپ کیا کریں گے۔ جبکہ۔" تو شعیب منصور ان کی بات کاٹ کر بولے۔

"واہ یہ بھی تم نے خوب کہا کہ کیا کریں گے معلوم کر کے۔ ارے بھئی میں تمہارا پتا معلوم کر کے کم از کم تمہیں لینے تو آجاؤں گا۔ کیونکہ میں تو یہ گوارا ہی نہیں کر سکتا کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں قیام کرو۔"

"لیکن ہمارے نزدیک یہاں یا آپ کے یہاں رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا منجھلے ابّا۔ آپ تو یہ بتائیے کہ سب خیریت سے تو ہیں نا اور وہ ہماری بٹیا کیسی ہیں۔" فاخرہ نے اپنے پتے کی بات گول کر کے سب کی خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ سلوط کا حال احوال پوچھا تو شعیب منصور سمجھے کہ وہ ناز پرور کی خیریت پوچھ رہی ہیں۔ خوش ہو کر بولے۔

"بس خدا کے فضل سے بڑے مزے میں ہیں۔ بچہ بھی بڑا صحت مند اور پیارا پیارا سا ہے ان کا۔ اور تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ عرصہ بھی تو ہو گیا تم سے ملے۔"

"ہاں خدا سب کو خوش ہی رکھے۔ لیکن میں سلوط کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ تین ماہ کا کہہ کر گئے تھے مگر ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا واپسی میں۔ بیچاری بچّی تو ہمیں رو پیٹ کر بیٹھ گئی ـــــ ہو گی۔" شعیب منصور تو فاخرہ کی آواز سن کر ہی سمجھ گئے تھے کہ اب وہ سلوط کو ضرور پوچھیں گی۔ اور وہی ہوا بھی۔ انہوں نے سٹپٹا کر زینت کی طرف دیکھا جو نہایت بیزاری کے عالم میں ان کے قریب ہی بیٹھی آنکھوں کو پٹپٹا کر اور جمائیاں لے کر اپنی نیند اور تھکن کا اظہار کر رہی تھیں۔ شعیب منصور نے ماؤتھ پیس کر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے ان سے کہا۔

"سلوط کو پوچھ رہی ہیں۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔" اور زینت جن کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ وہ شوہر کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔ کہتیں بھی کیا۔ فاخرہ کی آواز سن کر تو خود ان کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ منجھلے ابّا۔" اپنے سوال کے جواب میں ـــــ بھائی کو خاموش دیکھ کر فاخرہ نے ہیلو ہیلو کیا تو شعیب منصور جلدی سے بولے۔

"ہاں ہاں ہیلو۔ سلوط بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"اچھا تو ذرا اس کو بلائیے تو۔ کم از کم میں اپنی یہاں موجودگی کی خوشخبری تو اسے سنا دوں۔" فاخرہ نے بڑا اشتیاق دکھاتے ہوئے کہا۔ اور ان کی اس بات پر شعیب منصور بالکل ہی بوکھلا گئے۔ تھوک نگل کر بولے۔

"سلوط کو اس وقت بلواؤں۔ وقت بھی معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ۔ اور اس وقت وہ اپنے کمرے میں پڑی گہری نیند سو رہی ہیں۔ بھلا ان کی نیند میں خلل ڈالنا بھی کوئی معقولیت ہو گی۔"

"نہیں منجھلے ابّا اب اس کی نیند میں خلل پڑے یا وہ بے آرام ہو۔ آپ اسے بلوا ہی لیجیے۔ مجھے اس سے ایک بہت ہی اہم بات بھی پوچھنی ہے۔" فاخرہ نے ہٹیلے سے لہجے میں کہا تو شعیب منصور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بیوی سے بولے۔

"لیجیے اب تو آ ہی گئی ہماری شامت۔ فاخرہ بی سلوط سے فون پر بات کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں میری تو خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" زینت بیزاری سے بولیں۔

"ارے بھئی تو ایسی جلدی کیا ہے۔ کوئی اہم بات بھی کرنی ہے تو کل ـــــ یہاں آ کر کر لینا۔ اس وقت آدھی رات کو یہ بچّوں کی سی ضد کر کے کیوں خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کرنا چاہ رہی ہو۔" شعیب منصور نے زینت کی پوری بات بھی نہیں سنی اور خود ہی بات بنا دی۔

"منجھلے ابّا۔ کم از کم میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی جیسے کہ آپ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی غلط بیانی پر افسوس ہی نہیں ہو رہا بلکہ رونا بھی آ رہا ہے۔" فاخرہ نے ایک دم ہی پینترہ بدل کر کہا۔ تو جواب میں کچھ دیر کے لیے شعیب منصور بغلیں جھانکنے لگے۔ اصل میں تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ فاخرہ سلوط کی گمشدگی کو جتا رہی ہیں یا پھر اس کو نہ بلوانے پر طنز کر رہی ہیں۔ وہ ہکلا کر بولے۔

"مم۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔"

"میں کیا کہنا چاہوں گی منجھلے ابّا۔ آپ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ بڑے مان سے آپ پر بھروسا کر کے بلکہ امانتاً اس بچّی کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اور خط میں بھی پوری تفصیل سے آپ کو اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ تک لکھ دیا تھا کہ انڈیا سے واپسی پر آپ کا سارا حساب چُکا دوں گی۔ اس کے باوجود بھی آپ نے اسے بوجھ سمجھا۔ اور اسے گھر سے نکال باہر کیا۔ کیا سمجھا تھا آخر آپ لوگوں نے اسے لاوارث یا زرخرید۔"

"ارے ارے ذرا مجھے بھی تو کچھ کہنے کا موقع دو۔ میں تو خود تم سے اس قدر شرمندہ ہوں کہ تمہیں اپنی شکل دکھانے کی بھی ہمّت نہیں رکھتا۔" شعیب منصور نے بہن کی بات کاٹ کر گویا اپنی صفائی میں کہنا چاہا۔ مگر فاخرہ تیز لہجے میں بولیں۔

"چھوڑیں منجھلے ابّا۔ شرمندگی ورشرمندگی کو۔ سلوط کی گمشدگی اتنی معمولی بات نہیں کہ صرف شرمندگی کا اظہار کرنے سے دُھل جائے بلکہ یہ تو اس کی عزّت اور جان کا معاملہ ہے۔ آپ نے اسے گھر سے نکالتے وقت یہ نہیں سوچا کہ آخر وہ جائے گی تو کہاں جائے گی۔ اور کچھ نہیں تو اپنے بہنوئی کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا۔ وہ تو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہے۔ میری تو جان منّت میں کر رکھی ہے انہوں نے مگر کچھ غلط تو نہیں کر رکھی۔ بھلا غضب خدا کا ان کی جوان بچّی کو آپ نے کہیں غائب کرا دیا تو پھر وہ اپنا سارا غصّہ مجھ پر ہی گرائیں گے آپ پر تو نہیں۔ آپ تو بڑی آسانی سے شرمندگی کا اظہار کر کے بری الذمّہ ہو گئے۔" بہن کی کھری کھری سنانے پر شعیب منصور خجل سے ہو کر بولے۔

"ہاں ہاں تم ہر بات کہنے میں حق بجانب ہو بھنّو مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے سلوط کو کبھی اپنی بیٹیوں سے کم نہیں سمجھا۔ اور مجھے تو اصلاً یہ خبر نہ تھی کہ وہ کب گھر سے گئی تھی۔ وہ تو دوسرے دن صبح تمہاری بھابی جان کی زبانی ہی علم ہوا تھا کہ وہ گذشتہ رات سے غائب ہے۔"

"کیوں کیا آپ راتوں کو گھر سے غائب رہتے ہیں جو آپ کو صبح کو معلوم ہوا تھا وہ بھی بھابی جان کی زبانی۔ منجھلے ابّا تعجب ہے اس عمر میں آپ اس قدر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

"نہیں بھئی غلط بیانی کیسی۔ جبکہ۔"

"غلط بیانی ایسی کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے آپ سے سلوط کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے کے بجائے اوپر ڈرے پکڑتے رہے یا دوسرے معنوں میں مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے رہے کیا یہ غلط بیانی نہیں ہوئی" فاخرہ نے حد درجے صاف گوئی سے کام لے کر گویا بھائی کو قائل ہی نہیں شرمندہ کرنے کی غرض سے کہا۔

"ارے نہیں بجو غلط بیانی کیسی۔ اصل میں میرا حوصلہ ہی نہیں پڑ رہا تھا تمہیں اصل بات بتانے کا۔ بھلا چھوٹتے ہی تم سے کیسے یہ کہہ دیتا کہ"

"جی ہاں جی ہاں واقعی بہت مشکل کام ہوتا ہے سچ بولنا۔ حوصلہ کیسے پڑ سکتا تھا۔ جبکہ آپ نے خود ہی اس غریب کو دھکے دے کر گھر سے نکالا ہے۔ ورنہ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ کے سامنے کسی کی مجال نہیں ہو سکتی تھی ٹیڑھی نظر سے اس کی طرف دیکھنے کی گھر سے نکالنا تو بڑی بات ہے"

"افوہ۔ اب میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں بجو۔ بس حلف اُٹھانے کی کسر رہ گئی ہے تو میں حلفیہ بھی کہتا ہوں کہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کس وقت یہاں سے گئی تھی تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں صبح کا گیا شام کو گھر آتا ہوں۔ یہ تمہاری بھابی جان ہی گھر میں رہتی ہیں۔ مگر انہیں بھی اگلے روز صبح کو ہی"

"ہاں تو آپ کو گھریلو امور سے کوئی دلچسپی ہے نہ کسی بات کی پرواہ۔ اور آپ کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھابی جان نے میری ساری کسر اس غریب سے نکالی ہو گی۔ یہ سارا کیا دھرا اصل میں انہی کا ہے"

"نہیں نہیں یہ محض تمہارا خیال ہے۔ ورنہ انہیں تم سے ایسی کیا مخاصمت تھی جو وہ تمہاری ساری کسر اس غریب سے نکالتیں" شعیب منصور نے بیوی کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا۔

"اے بس منجھلے اکا۔ اب میرا منہ نہ کھلوائیے۔ بھابی جان نے تو ہمیشہ اور ہر معاملے میں میری کاٹ ہی کی ہے۔ آپ کے سامنے وہ ضرور بھیگی بلی بنی رہتی ہیں مگر دوسرے کے سامنے جو میرے لیے زہر اگلتی ہیں وہ سب مجھ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور تو اور میری برائی کرنے میں میرے میاں کو بھی نہیں بخشا انہوں نے۔ جب بھی انہیں میرے میاں سے بات کرنے کا موقع ملا ہمیشہ انہیں یہی مشورہ دیا کہ عقد ثانی کر لیں۔ تاکہ آپ کا بھی کوئی وارث پیدا ہو جائے جو آپ کی نسل بھی چلا سکے اور آپ کی جائیداد کو بھی بچا سکے۔ جبکہ جائیداد کے نام کی ایک اینٹ بھی نہیں ہے حسن کے پاس۔ مگر وہی جُھس میں چنگاری ڈالنا لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ان کے آگے بھی بیٹیاں ہیں اگر دوسرے پر ظلم کریں گی ان کے آگے بھی آئے گا" زینت کے ذکر پر تو فاخرہ بھڑک ہی اٹھیں۔

"خیر تم میری بیٹیوں کا ذکر تو درمیان میں نہ لاؤ۔ کیونکہ ان بے چاری بچیوں کو تو کوئی واسطہ ہی نہیں کسی بات سے البتہ جہاں تک میری بیوی کا سوال ہے تو تم بڑے شوق سے انہیں جتنا چاہو بُرا کہہ سکتی ہو" شعیب منصور نے فاخرہ کی بات کو کوسنے پر محمول کرتے ہوئے اندر ہی اندر سہم کر کہا۔ تو زینت جن کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے تڑخ کر بولیں۔

"ارے واہ وہی مثل ہے کہ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ یعنی میں اتنی گئی گزری ہوں کہ چھوٹی نند جو جی چاہے مجھے کہہ لے" مگر فاخرہ نے شعیب منصور کو ان کی بات کا جواب دینے کا بھی موقع نہیں دیا۔

"لیکن میں ان کو کیوں برا کہوں۔ سلوط کے معاملے میں تو میں آپ کو قصوروار سمجھتی ہوں۔ کیونکہ آپ کی غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں ہی یہ کچھ ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ اسے اپنی بیوی اور بچیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس کی طرف سے بالکل ہی بری الذمہ ہو گئے ہوں گے۔ اور بھابی جان کی بن آئی ہو گی۔ میں سب جانتی ہوں۔ انہیں تو اگر میرے گھر کا پالتو کتا بھی مل جائے تو وہ اسے زہر کھلا کر مار ڈالیں۔ خیر منجھلے اکا۔ مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو صرف آپ کو جانتی ہوں۔ اب آپ ہی کو اسے تلاش کر کے دینا ہو گا۔ ورنہ یہ سمجھ لیجیے کہ میں اپنے نام کی ایک ہوں۔ اگر سلوط نہ ملی تو میں اپنی اور سب کی جان ایک کر کے رکھ دوں گی۔

ارے آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ مجھ دُکھیا نے اولاد سے محرومی کے سبب کتنی اذیتیں برداشت کر کے یہ تینتیس برس کا بن باس کاٹا ہے۔ کیونکہ اپنا دامن بچا بچا کر اپنی ازدواجی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا سے گزر رہی ہوں۔ اس پر بھی کچھ معلوم ہے آپ کو کہ میرے میاں عقد ثانی کر کے ہی رہے۔ ارے میرے بھیا کبھی آپ نے پلٹ کر میری خبر لی، کبھی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میری بہن کیسا عذاب بُھگت رہی ہے اپنی ایک محرومی اور خامی کا۔ نہیں نہیں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ پرائے گھر جا کر لڑکی بھی پرائی ہو جاتی ہے نا اس سے سارے رشتے ناتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آپ کی کونسی آٹھ دس بہنیں تھیں۔ صرف ایک بہن ہی تو تھی۔ مگر۔ مگر" مگر سے آگے اشک ان کی آواز پر غالب آ گئے۔ اور وہ رونے لگیں۔ بہن کی باتیں سن کر شعیب منصور ان کی بے بسی پر تڑپ سے اٹھے۔

"نہیں نہیں تم روؤ نہیں بجو۔ دیکھو مجھے صرف ہوٹل کا نام بتا دو تاکہ مجھے کم از کم تمہارے میاں سے تو صفائی کرنے کا موقع ملے" مگر فاخرہ نے جواب دینے کے بجائے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور شعیب منصور ہیلو ہیلو ہی کہتے رہ گئے۔

"لو عجب احمق لڑکی ہے پتا بتانے کے بجائے فون ہی ڈسکنیکٹ کر کے رکھ دیا" انہوں نے بڑے کوفت کے عالم میں ریسیور کو کریڈل میں پٹختے ہوئے کہا۔ زینت تو ان کی بات پر پہلے ہی جلی بیٹھی تھیں۔ طنزیہ سے انداز میں ہنس کر بولیں۔

"واہ لڑکی بھی خوب کہا آپ نے۔ اب ڈھلتی ہوئی عمروں کی عورتیں بھی آپ کی نظر میں لڑکیاں ہونے لگیں"

"لیکن یہاں معاملہ عورتوں کا نہیں صرف فاخرہ کا ہے۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے بوڑھی بھی ہو جائے گی تو میری نظر میں چھوٹی ہی رہے گی۔ لیکن تم اتنی جیلس کیوں ہو رہی ہو تم تو پھر بھی عمر میں اس سے دس گیارہ برس بڑی ہو" شعیب منصور نے ان کے طنز کا جواب طنز ہی سے دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تو آپ کی نظر میں سدا سے بری ہوں۔ بوڑھی ہوں۔ جاہل ہوں۔ بدصورت ہوں۔ ساری خامیاں مجھ ہی میں ہیں۔ لو بھلا اب میری عمر کو بھی جتایا جانے لگا۔ اے اگر مجھ میں اتنے عیب تھے تو پھر آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی" شوہر کے عمر جتانے پر زینت تلملا ہی اٹھیں۔

"بس غلطی سے کر لی تھی۔ مگر تم تو میرے لیے سانپ کی چھچھوندر ہی ثابت ہوئیں جو نگلتے بنیں نہ اگلتے" شعیب منصور نے جن کا دل فاخرہ کی باتوں سے دکھ سا رہا تھا نہایت ناگواری سے کہا۔ اور ان کے چھچھوندر کی مثال دینے پر تو زینت سلگ ہی اٹھیں۔

"افوہ چھچھوندر۔ یعنی اب میں آپ کی نظر میں چھچھوندر ۔۔ ہو گئی" غصے میں وہ صرف یہی کہہ سکیں۔

"ہاں میں نے تو صرف چھچھوندر ہی کہا ہے جبکہ تم تو اس سے بھی زیادہ سننے کی مستحق ہو۔ وہ بزرگوں کی اصطلاح میں ادھر ادھر لگائی بجھائی کرنے۔ دلوں میں نفاق ڈالنے اور جھگڑے کرانے والیوں کے لیے جو ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تم نے اسی ٹائپ کی عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے"

"ہیں یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں کٹنی بھی ہوں کٹنی" زینت نے اتنی بڑی بات کہہ جانے پر آنکھیں پھاڑ کر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ ان کے لہجے میں غصہ اور کھسیاہٹ بھی شامل تھی۔

"اب تم خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہو تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں" شعیب منصور نے گویا یہ کہہ کر ان کے دل پر ایک اور چرکا لگایا۔

"اچھا اچھا۔ میں کٹنی ہوں چھچھوندر ہوں۔ گویا سارے عیب مجھ میں ہی ہیں۔ واہ واہ یہ صلہ دیا ہے آپ نے وفاداری اور جانفشانی کا" غم غصے کی زیادتی سے زینت کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"ہاں بس۔ مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔ اور نہ رو کر مجھے ڈرانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت کا آخری حربہ ہوتا ہے کہ جب اس کی اصلیت کُھل کر سامنے آتی ہے تو اپنے دفاع کے طور پر اسی طرح آنسو بہانے لگتی ہے جیسے کہ اس وقت تم بہا رہی ہو۔ مگر میرا دماغ اس وقت بالکل ٹھکانے نہیں ہے تمہارے لیے بہتر یہی ہو گا کہ خاموشی سے پڑ کر سو جاؤ" میاں نے ان کی گریہ زاری کی بھی پرواہ نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ زینت اپنے آنسو پونچھ کر کچھ زیادہ ہی طیش میں آ کر بولیں۔

"نہیں میں آپ کی دبیل ہوں نہ حکم کی بندی ۔ جو آپ کے اشاروں پر ناچوں گی ۔ میں تو خاموش رہوں گی نہ سوؤں گی ۔ بلکہ آپ کے عاید کردہ رکیک الزامات کا آپ سے جواب طلب کر کے ہی دم لوں گی۔"

تب شاید زندگی میں پہلی بار شعیب منصور بھی طیش میں آ گئے ۔ ابھی تک تو وہ ان کے قریب ہی بیٹھے تھے مگر اب غصّے میں کھڑے ہو کر بولے ۔

"دیکھو زینت، میں نے کہا نا کہ اس وقت میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے ۔ کسی کا باپ بھی مجھ سے اس وقت کوئی جواب طلب کرے گا تو میں اس سے بھی یہی کہوں گا جو تم سے کہہ رہا ہوں ۔ ویسے بھی اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے ۔ اور اب تک تو میں تمہاری عزت کرتا رہا ہوں ۔"

یہ کہہ کر تو انہوں نے زینت کے تن بدن میں آگ ہی لگا دی تھی ۔ لیکن ایک تو وہ کبھی اس قدر طیش میں نہیں آئے تھے ۔ نہ ایسی اہانت آمیز زبان ہی بولی تھی ۔ دوسرے کسی کا باپ پس پردہ انہوں نے انہی کے باپ کو کہا تھا ۔ دوسرے عزت کو برقرار رکھنے کی تنبیہہ بھی کی تھی ۔ اس لیے سخت غصے کے باوجود زینت کو خاموش ہی ہونا پڑا ۔ کیوں مرد کے موڈ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ شوہر کے موڈ کا ۔

جو احساس برتری میں ڈوب کر بعض اوقات عورت پر تشدد کرنے سے بھی نہیں چُوکتا ۔ اور پھر اس کے پاس چار حروف پر مشتمل الفاظ کا وہ سب سے خطرناک اور تباہ کُن ہتھیار بھی ہوتا ہے جو پل کے پل میں ایک لتنے اہم، مضبوط اور پائیدار رشتے کو یوں کاٹ کر رکھ دیتا ہے جیسے گنڈاسے کی ایک ضرب کسی پیڑ کی شاخ کو اس کے جوائنٹ سے کاٹ دیتی ہے ۔ اور ایک عزت دار اور وفادار عورت خواہ شوہر پر کتنی ہی حاوی کیوں نہ ہو، بس اسی بات سے توڈرتی ہے لیکن زینت اب اتنی بھی بے قصور نہ تھیں بلکہ خود ان کا اپنا ضمیر بھی مجرم تھا ۔

اصل میں تو سلوط کو گھر سے نکلوانے میں ان کا ہی ہاتھ تھا ۔۔

اس پر انہوں نے سلوط کے ساتھ کچھ ایسا سلوک روا رکھا تھا جیسا کہ عموماً گھر کی پروردہ لڑکیوں سے رکھا جاتا ہے ۔ جبکہ فاخرہ اور ان کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک چپقلش سی قائم تھی ۔

لیکن سلوط کو ناپسند کرنے کا سبب فاخرہ سے کبیدگی نہیں بلکہ سلوط کا حُسنِ بے مثال تھا ۔ وہ سلیقہ، وہ رکھ رکھاؤ، وہ سادگی اور انکسار تھا جو ان کی بیٹیوں میں مفقود تھا اور پھر بدقسمتی سے بالکل ہی بے مایہ اور بے آسرا تھی جبکہ زینت حیثیت کی پجاری تھیں ۔ ان کے حلقۂ احباب میں صرف اور صرف متموّل طبقہ شامل تھا اور وہ خود بھی متموّل اور تونگر تھیں ۔ بس سلوط اسی معاملے میں ان سے مات کھا گئی تھی ۔ اور اس کی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ اس پر حاوی ہو گئی تھیں ۔ لیکن جہاں تک اسفند کی شادی کا سوال تھا ۔ تو وہی کیا، کوئی اور ماں بھی ہوتی تو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی جس کے بارے میں اس نے بہت ساری غلط سلط باتیں سنی ہوتیں اور جو کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہوتی ۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن ان سے یہ غلطی ہو گئی کہ انہوں نے اپنے حسد اور جلن میں بہت ہی غلط انداز میں بلکہ دوسرے معنوں میں اسفند کو اس کے خلاف بھڑکایا اور ورغلایا تھا ۔ ورنہ یہی باتیں وہ رسانیت سے اسے سمجھا بجھا کر کہتیں تو ایسی نوبت کبھی نہ آتی جواب آ گئی تھی ۔

بہرحال شوہر کی دھمکی پر وہ خاموش تو ہو گئی تھیں ۔ مگر منہ ہی منہ میں برابر بڑبڑائے جا رہی تھیں ۔ حتیٰ کہ لیٹنے کے بعد بھی بڑبڑاتی رہیں ۔

"یہ بڑبڑانا بیگمات کی نہیں لونڈی باندیوں کی عادت ہوتی ہے ۔ اگر آپ اپنا منہ بند نہیں کر سکتیں تو پھر لونگ روم میں جا کر سوجاتا ہوں ۔ واہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ چوری اور سینہ زوری ۔ کوئی ایک بات بھی تو ایسی نہیں چھوڑی جس میں نفاق کی قینچی نہیں چلائی ہو آپ نے ۔ حتیٰ کہ میری بہن کے خلاف میرے بہنوئی کو بھی ورغلانے سے نہیں چُوکیں آپ ۔ اور پھر اس بے چاری بچی سے جیسا سلوک روا رکھا، اس سے بھی میں بے خبر نہیں ہوں ۔ اسے آپ نے ہی سنی کو بھڑکا کر گھر سے نکلوایا ہے ۔ خیر اب فاخرہ بی تو آ ہی گئی ہیں ۔ ان کے اور آپ کی جوان جوان اولادوں کے سامنے آپ کی شخصیت پر چڑھے دنیاداری کے خوبصورت پرت اُتریں گے تو سب خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ آپ کس قدر شاطر فطرت کی مالک ہیں ۔" بیوی کو منع کر کے شعیب منصور خود بھی بڑبڑانے کے سے انداز میں کہتے رہے مگر زینت نے ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔

خاموش پڑی بڑی تیزی سے آنسو بہاتی رہیں ۔

جانے کتنی دیر اور کب تک ۔ شعیب منصور تو کچھ دیر کے بعد نہ معلوم کیا کیا سوچنے کے بعد پڑ کر سو گئے تھے ۔

پھوپھا اور پھوپھی کو اپنی کار سونپنے کے بعد، راستے میں ہی ایک جگہ کار سے اُتر کر اسفند کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ سیدھا اسی ہوٹل میں پہنچ جائے جہاں پھوپھا اور پھوپھی کو ٹھہرایا ہے اور وہاں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرے کہ سلوط کو پھوپھا کی بیٹی کے روپ میں دیکھنے کا اسفند کو بہت شوق ہو رہا تھا ۔

یوں بھی دل تھا کہ اسے دیکھنے کو مچلا جا رہا تھا ۔ تڑپا جا رہا تھا ۔

مگر پھر اس نے سوچا کہ پھوپھا کے انتظار میں پہلے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جانا کچھ مناسب نہیں ۔ بھلا پھوپھا اور پھوپھی کیا سوچیں گے کہ میں سلوط کو دیکھنے کے لیے اتنا دیوانہ ہو رہا ہوں ۔ اور پھر خود سلوط بھی مجھے دیکھ کر نہ معلوم کیسا رویہ اختیار کرے ۔ کہیں پھوپھا جان کے سامنے ہی ایسی کوئی بات نہ کہہ دے جس سے مجھے ندامت کا سامنا کرنا پڑے ۔ یا جس سے میری اہانت ہو ۔

بس یہی سب سوچنے کے بعد وہ جذبۂ شوق کو بڑی سختی سے دل کے اندر ہی گھونٹ کر ۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں واپس آ گیا ۔ جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا ۔

آتے ہی کولڈ کافی کا آرڈر دیا ۔ اور پھر ٹی وی پر چلنے والی ایک لیٹ نائٹ انگلش مووی دیکھنے لگا ۔ کچھ دیر تک وہ فلم دیکھتا رہا پھر اٹھ کر لباس تبدیل کیا ۔ اور بستر پر لیٹ گیا ۔ اس روز تقریباً تمام دن وہ گھومتا پھرتا رہا تھا ۔ اس لیے بہت تھک گیا تھا ۔ مگر اس کے باوجود بھی بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی ۔

وہ سارا دن سلوط کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا ۔

کہ پھوپھا اور پھوپھی کی غیر متوقع آمد سے اسے تعجب تو بہت ہوا ہوگا ۔ اور وہ کس طرح بلک کر ان کے گلے لگی ہوگی ۔۔

روئی بھی ہوگی اور خوش بھی ہوئی ہوگی ۔

اور جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ پھوپھا کی بہن نہیں بیٹی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا ہوگا ۔

پھر سلوط کے حسین تر چہرے سے پھوٹتے دھنک رنگ اسے آنکھوں میں جھلملاتے نظر آنے لگے ۔

وہ بڑی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا ۔ اسی کے تصوّر میں کھویا رہا ۔ اس کے خیالوں پر خوابوں پر سلوط ہی چھائی رہی ۔ حتیٰ کہ اس کی بند آنکھوں کے اندر بھی اسی کی شبیہہ تیرتی رہی ۔ دیر سے سویا تھا پھر بھی بہت سویرے اس کی آنکھ کھل گئی ۔ جانے کیسی بے کلی تھی، وہ تو شاید سویا ہی بے کل بے کل سا تھا ۔ پتہ نہیں کیسے نو بجے تک کا وقت کٹا تھا ۔ حالانکہ تیار تو آٹھ بجے سے ہی ہو کر بیٹھ گیا تھا ۔ مگر یہی سوچ کر کہ ابھی تو پھوپھا پھوپھی ۔ اٹھے بھی نہیں ہوں گے ۔ وہ نو بجے تک انتظار کی صلیب پر چڑھا رہا تھا ۔ یوں بھی چونکہ اس کی کار پھوپھا کے پاس تھی ۔ اس لیے باہر نکل کر اسے سواری بھی پکڑنی تھی ۔ اور اس کے خیال میں سواری پکڑنے میں بھی کچھ وقت لگتا تھا ۔ اس لیے نو بجے ہوٹل سے نکلنے کا وقت اس نے مناسب سمجھا تھا ۔

پھر وہ ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل پہنچا تو فاخرہ نے بڑے عجیب سے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھولا اور اس کے سلام کے جواب میں ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر آہستہ سے بولیں ۔

"آہستہ بولو اسفند ۔ تمہارے پھوپھا جان سو رہے ہیں ۔" اور اس سے پہلے کہ وہ آہستہ سے ہی ان سے کچھ پوچھتا، انہوں نے دروازے کے آگے ہی کھڑے کھڑے مڑ کر سوتے ہوئے شوہر پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے بولیں ۔

"آؤ ایسا کرتے ہیں کہ ہوٹل کی لابی یا لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں ۔ یوں بھی میں نے اب تک یہ ہوٹل دیکھا بھی نہیں ۔"

اور اسفند کا دل چاہا کہ کہے کہ آپ کو اس ہوٹل میں آئے ابھی پورا ایک دن بھی نہیں ہوا ۔ اور پھر یہ ہوٹل اتنا بڑا دیکھنے اور دکھلانے کے قابل بھی نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی کوئی لابی تک نہیں ہے مگر وہ خاموش ہی رہا اور اسی خاموشی سے ان کے ساتھ باہر نکل آیا ۔ ان کے عجیب و غریب رویے اور باتوں سے اپنے تئیں اس نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید سلوط نے انہیں منع کر دیا ہوگا کہ مجھے کمرے میں نہ آنے دیا جائے ۔ یوں بھی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی ۔ بہرحال ہوٹل میں ایک چھوٹا سا

لاؤنج ضرور تھا۔ اور اتفاق سے اس وقت خالی پڑا تھا۔ بس اکّا دکّا کسٹمرز اور بیرے ہی وہاں سے آجا رہے تھے۔ فاخرہ وہیں ایک کوچ پر بیٹھ گئیں اور اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے تم لوگوں نے سلوط کو اپنے گھر سے نکال کر۔ یہ تو کہو کہ بہت غنیمت ہوا جو وہ ہمیں مل گئی لیکن اس کے ملنے کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ بلکہ الٹی میری شامت آگئی۔ اب تمہارے پھوپھا تم لوگوں کی شکلیں تک دیکھنے کے روادار نہیں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ تم کسی سے ملوگی نہ میں ملوں گا۔ بلکہ اسفند کو بھی سختی سے منع کر دو کہ وہ یہاں نہ آئے۔ ورنہ میں ایسا کروں گا کہ تمہیں بھی اس کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔" پھوپھی کی ان بے ربط اور بے تکی باتوں سے بھی اس نے یہی اخذ کیا کہ ضرور سلوط نے ہی سب کے خلاف شکایت کی ہوگی۔ جو پھوپھا نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے۔ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں پھپھو بیگم کہ آخر آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں اور پھوپھا جان آخر کس بات پر اتنے خفا ہیں جو سب کا بائیکاٹ کرنا چاہتے ہیں جبکہ اب تو انہیں سلوط کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں رہی۔" تب فاخرہ نے اسے سلوط کے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دینے بلکہ اس کے رویے اور گفتگو کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کے خیالات اور فیصلے کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا اور پھپھو کی زبانی یہ ساری تفصیل سن کر اسفند کو یوں لگا جیسے وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہو۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تھوڑی دیر گم صم سا بیٹھا رہا پھر پھوپھی کے پاس سے اٹھتا ہوا بولا۔

"اچھا، اب آپ اپنے روم میں چلیے پھپھو بیگم، یوں بھی یہ عام گزرگاہ ہے اور یہاں بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" اور فاخرہ بھی جیسے وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہی تھیں۔ اس کے کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ انہیں ان کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر یوں ان سے رخصت ہوا جیسے اپنا سب کچھ ہار کر جا رہا ہو۔

وہ فاخرہ کو خدا حافظ کہہ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ تو غصے کے نہیں بلکہ سخت کوفت کے عالم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ پھوپھا کی فطرت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

یہ تو اسے معلوم تھا کہ پھوپھا کچھ فطرتاً ہی خشک مزاج کم گو اور کھردرے قسم کے انسان ہیں اور ان کے بارے میں یہ بات محض سنی ہی نہیں تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کر چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ پھوپھا کے اس بھرے بھرے سے مزاج میں ایک خوش گوار قسم کی تبدیلی صرف سلوط کی وجہ سے آئی تھی کہ انتہائی مایوس کن حالات میں سلوط کے مل جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ ورنہ کہاں وہ اور کہاں اس قدر شگفتہ اندازِ گفتگو اور چہکنا اور اب سلوط نے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا تو اس کے یا اس کے گھر والوں کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا۔ ظاہر تھا کہ بھائی اور بھابی کی زیادتیوں اور کوتاہیوں سے حد درجہ دل برداشتہ اور بدظن ہو کر ہی کیا تھا۔ لیکن وہ سارا قصور ہمارے سر تھوپ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ تعلق تک قطع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ آجکل تو اپنے سگے بھی بیگانے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کو تعلق قطع کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ چلو اگر ملنا نہیں چاہتے تو نہ سہی تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔ گویا کسی کی کسی کو پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ خصوصاً کراچی میں تو یہ بے ثباتی عام ہے کہ ملے ہوئے عرصہ ہی گزر جائے تو اپنی اپنی مصروفیات میں ایک دوسرے کو پلٹ کر پوچھا ہی نہیں جاتا کیونکہ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ اور میں نے تو الٹا ان پر احسان کیا ہے۔

سلوط کو ڈھونڈ کر دیا ہے۔

ان سے ملوایا ہے۔

اس کے باوجود بھی پھوپھا جان نے میرا ذرا سا—" وہ نیچے اتر کر سواری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اپنے ان خیالات میں ایسا محو تھا کہ بھول گیا تھا کہ کیوں کھڑا ہے جب کہ خالی سواریاں اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں اور ابھی وہ اسی قدر سوچ سکا تھا کہ تبھی ایک کار اس کے اتنے قریب آ کر رکی کہ اگر وہ اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو یقیناً اس کا پیر کار کے اگلے پہیے کے نیچے آجاتا۔ ایک دم دل کو دھچکا بھی لگا تھا اور ظاہر تھا اسے کار چلانے والے کی اس بے ہودگی پر سخت غصہ بھی آیا تھا۔ اس بدتمیزی پر لال پیلا ہو کر اس نے جونہی چلانے والے کی طرف دیکھا۔ تو یوں لگا جیسے سانس بیچ ہی میں اٹک کر رہ گیا ہو۔ کیونکہ ڈرائیونگ سیٹ پر باپ ایک شفیق سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی وہی مثل ہو گئی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن — کہ نہ ان سے چھپ سکتا تھا نہ وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ زمین نے بھی جیسے قدم پکڑ لیے تھے اور وہیں پر جم کر رہ گیا تھا۔ یوں جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

حد تو یہ تھی کہ باپ کو سلام تک کرنا بھول گیا تھا۔ شعیب منصور خود ہی دروازہ کھول کر باہر اترے اور اس کے نزدیک آ کر بولے۔

"ہیلو مائی سن! چلو اچھا ہی ہوا کہ تم مل گئے ورنہ مجھے نہ جانے اور کتنے ہوٹلوں کی خاک چھاننی پڑتی کیونکہ فاخرہ نے غصے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تم انہی سے ملنے آئے ہو۔" باپ کی باتوں سے اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ پھوپھی نے ان تک فون کے ذریعے ہی رسائی حاصل کر لی ہے۔ وہ بجھے بجھے سے انداز میں بولا۔

"جی ہاں مگر آیا ہوں نہیں آیا تھا ڈیڈی—!"

"خیر خیر، ایک ہی بات ہے مگر وہ دونوں ہیں کس روم میں؟ — چلو آؤ مجھے کم از کم ان کے کمرے تک تو پہنچا دو۔" شعیب منصور بہن سے ملنے کی تھوڑی سی بے تابی دکھاتے ہوئے بولے۔

"نہیں ڈیڈی! آپ ان سے نہ ہی ملیں تو بہتر ہے کیونکہ پھوپھا جان نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ہم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے معنوں میں وہ ہماری صورتیں دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں تو ان حالات میں آپ کا ان کے پاس جانا ——— آپ کے وقار کے منافی ہی ہوگا۔" اسفند نے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر اگر وہ روادار نہیں تو میں تو ہوں اور پھر میں اپنی بہن سے ملنے آیا ہوں۔ میرے سامنے ان کی مجال نہیں ہو سکتی کہ مجھے اپنی بہن سے ملنے سے روکیں۔ ارے بیٹا! اگر ایک نالائق ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ہو جائے۔ چلو تم مجھے کسی طرح ان کے پاس تو لے چلو۔" شعیب منصور نے بیٹے کی باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"نہیں ڈیڈی! اصل میں آپ کو معلوم نہیں کہ حالات کتنی سنگینی اختیار کر چکے ہیں۔ سلوط ملی بھی ہیں تو انہوں نے پھوپھا جان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلکہ وہ تو کسی رشتے کی اہمیت کو گردان ہی نہیں رہیں۔"

"واٹ ڈو یو مین؟ خیر آؤ کار میں بیٹھ کر بات کرو۔ یہاں لبِ سڑک اور وہ بھی ایک پبلک پلیس پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔" شعیب منصور نے سلوط کا ذکر سن کر جلدی سے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ شعیب منصور بھی جلدی سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"ہاں، اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم؟" انہوں نے ایک نظر اس پر ڈال کر پوچھا۔ تب اس نے اپنی وہ — ساری باتیں بتا دیں جو سلوط کے متعلق فاخرہ سے سن کر آیا تھا اور یہ بھی کہ اسی غصے میں پھوپھا ہم سے بھی ہر تعلق قطع کر چکے ہیں۔

"لیکن یہ تم نے نہیں بتایا کہ سلوط انہیں ملی کیسے ہے اور وہ یہاں کیسے آئے اور ہاں تمہاری ان سے کیونکر ملاقات ہوئی؟ جب کہ کریم سے تو تم یہ کہہ کر گئے تھے کہ تم لندن جا رہے ہو۔ پھر خدا اماں جان کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے ان کے خط سے معلوم ہو گیا تھا کہ تم یہاں سے لندن نہیں ملتان گئے تھے۔" باپ نے ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے اور وہ جوان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ بظاہر تو ادھر ادھر گھومنے پھرنے ہی نکلا تھا مگر اس کا اصل مقصد سلوط کو ہی تلاش کرنا تھا اور یہ مقصد اس پر اس وقت واضح ہوا تھا جب شیر محمد کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے پھوپھا لاہور میں ہی موجود ہیں۔ اس نے باپ کو یہی بتایا کہ لاہور کے ہوٹل سے جس دوست کے مکان میں منتقل ہوا تھا۔ وہ اتفاق سے وہی مکان تھا جس کے پورشن میں کبھی پھوپھا رہا کرتے تھے مگر پھر انڈیا سے واپسی پر انہوں نے سمن پورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اس گھر میں وہ شیر محمد کے ذریعے ہی پھپھو سے ملنے گیا تھا اور خود اس نے ہی انہیں سلوط کے اچانک لاپتا ہو جانے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کے اس سوال کے جواب میں سلوط پھوپھا کو کیسے مل گئی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ سلوط نے خود خط کے ذریعے انہیں اپنا پتا بتایا تھا۔ اپنی لگن اور کھوج کا ذکر تو وہ گول ہی کر گیا تھا۔

"واہ یہ تو اور بھی اچھا ہوا کہ سلوط انہیں مل گئی۔ پھر وہ کس بات کا تہیا ہمیں دکھا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ وہ فاخرہ

بی سے ہی کسی بات کا بدلہ لے رہے ہوں گے۔ خیر تم میرے ساتھ تو چلو۔"

"لیکن میں جا کر کیا کروں گا ڈیڈی ۔ البتہ آپ کو ان کا روم بتائے دیتا ہوں۔" اسفند گویا ان کے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہوا بولا۔

"خیر چلو یہی سہی ۔ لیکن مجھے ان کے روم میں چھوڑ کر تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ بس بہت کر لی آوارہ گردی کچھ معلوم بھی ہے۔ کہ تمہارے چپکے سے چلے جانے پر تمہاری ممی نے اپنا کیا حشرہ بنا لیا ہے۔ اگر اپنے باپ کا نہیں تو کم از کم اس دکھی ماں کا تو خیال کر لو۔" شعیب منصور نے اترنے سے پہلے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تعجب ہے میرے چلے آنے پر تو ممی کی حالت غیر ہو رہی ہے اور انہوں نے جو ایک جوان لڑکی کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اس پر انہیں تھوڑا سا بھی ملال نہیں ہوا؟" اسفند نے ایک زہر خند سے کہا۔

"نہیں ہوا کیوں نہیں بلکہ بہت ہوا ہے لیکن وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتیں اور سنو بیٹے! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے بڑا غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔ تمہیں تمہاری ضد سے باز رکھنے کے لیے ۔ لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی غلطی پر نہیں تھیں۔ کیونکہ وہی کیا دنیا کی کوئی ماں بھی یہ پسند نہیں کرتی کہ اس کا اکلوتا بیٹا ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے جو کسی دوسرے مرد کے نکاح میں ہو۔ مذہباً بھی ایسی شادی جائز ہی نہیں۔" شعیب منصور ماں کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی غرض سے بولے لیکن کچھ غلط بھی نہیں بولے۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر کہ ساری غلطی اور زیادتی اسی کی تھی۔ اس معاملے میں کچھ نہیں بولا۔

"میرے خیال میں یہ بات تو تم کو بھی معلوم ہوگی ۔" شعیب منصور نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں۔ معلوم تو ہے لیکن سلوط کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا ۔ مگر خیر اب تو انہیں طلاق بھی مل گئی ہے۔ پھوپھا جان اور پھپھو بیگم یہی فیصلہ کرانے تو انڈیا گئے تھے۔ لیکن وہ شخص کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پھوپھا جان کو واپسی میں اتنی دیر ہو گئی تھی لیکن پھوپھا جان نے دیر سویر کی پروا نہیں کی ۔ اور نہ صرف طلاق دلوائی بلکہ لاکھوں کے زیورات جو دونوں طرف سے سلوط کو شادی کے موقع پر چڑھے تھے اور پانچ لاکھ نقد مہر کے وصول کر کے ہی رہے۔ پھر بھی پھوپھا جان کا باون لاکھ روپیہ وہ شخص ہضم کر گیا۔ بزنس پارٹنر شپ تھی نا اس کے ساتھ۔" مہر کی رقم اور زیورات کی بات اسفند نے محض باپ کی نظروں میں سلوط کی اہمیت بڑھانے کی غرض سے بتائی تھی اور پانچ لاکھ نقد اور نصف کروڑ کے بارے میں سن کر شعیب منصور بھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہے۔

"اوہ ویری امیزنگ (بہت تعجب خیز)۔" انہوں نے حد درجے متاثر ہو کر کہا

"جی ہاں اور اس سے زیادہ امیزنگ یہ ہے کہ سلوط پھوپھا جان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہیں۔" اس نے تھوڑا سا مسکرا کر بتایا تو شعیب منصور سچ مچ اچھل ہی پڑے۔

"ہیں آر یو کڈنگ (تم مذاق تو نہیں کر رہے)" انہوں نے بڑے سخت اچنبھے کی لپیٹ میں آ کر پوچھا۔ تب مختصر الفاظ میں ہی اسفند نے انہیں ثاقب حسن کی زبانی سنا ہوا سارا قصہ سنایا تو شعیب منصور کو فاخرہ کی اس بات پر یقین کر لینا ہی پڑا جو انہوں نے ثاقب حسن کے عقد ثانی کرنے کے بارے میں بتائی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ اپنی ایک بہت بڑی محرومی کی وجہ سے فاخرہ میاں کی طرف سے شک و شبہات کا شکار ہو گئی ہیں۔

دونوں باپ بیٹے اب تک کار پارکنگ میں کھڑی کار ہی میں بیٹھے تھے اور انہیں کار میں بیٹھے کم و بیش آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اور شعیب منصور بیٹے کی زبانی نئے نئے انکشافات سن کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

"ڈیڈی بعض اوقات انسان کی قسمت کچھ اتنے حیرت انگیز طور پر پلٹا کھاتی ہے کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔" غالباً اسفند نے یہ بات باپ کے "آر یو کڈنگ" کہنے کے جواب میں کہی تھی۔ مگر شعیب منصور نے شاید سنی نہیں۔ اپنی سوچ سے نکل کر بولے۔

"لیکن یہ سلوط آخر کس کے یہاں ٹھہری ہوئی ہے کیا تم کبھی وہاں گئے ہو؟"

"نہیں میں تو وہاں نہیں گیا لیکن ان کا پتا ضرور جانتا ہوں۔ اصل میں وہ کوئی مڈوائف ہے جو نرسری کے ایک کلینک میں کام کرتی ہے۔ اسی کے یہاں رہ رہی ہیں وہ آج کل۔" اسفند نے کہا۔ تو شعیب منصور نے اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے کار کو

ریورس دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہیں سلوط کا پتا معلوم ہے تو ان حالات میں ہمارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ فاخرہ کے پاس جانے کے بجائے سلوط کے پاس چلیں۔"

"اوہ نو ڈیڈی ہمارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے ۔" اسفند یوں اچک کر بولا جیسے کار کو بریک لگانا چاہتا ہو۔

"کیوں ۔ کیوں مناسب نہیں ہے؟" شعیب منصور نے کار کا رخ مین روڈ کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ جب وہ پھوپھا جان اور پھپھو بیگم کو ہی خاطر میں نہیں لائیں تو ۔ ڈیڈی آپ کا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں کم از کم میں تو بالکل گوارا نہیں کروں گا کہ آپ وہاں جائیں۔" اسفند باپ کو سلوط کے پاس جانے سے باز رکھنے کی کوشش میں بگڑے بگڑے سے انداز میں بولا۔

"نہیں سنو بیٹے! اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خود جا کر سلوط سے ملوں ۔ آخر میری وجہ سے ہی تو اس بے چاری کو اتنی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قصور وار ثاقب یا تم نہیں بلکہ میں ہوں میں کیوں کہ میری غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے ہی یہ سارا فتنہ اور فساد کھڑا ہوا ہے۔" شعیب منصور گویا اپنی ضد پر اڑے رہے ۔ کار کو مین روڈ پر ڈال کر انہوں نے شہر کا رخ کیا۔

"اوہو ڈیڈی آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" اسفند نے جز بز سا ہو کر کہنا چاہا۔

"میں سب سمجھتا ہوں بیٹے! اور میری اپنی بھی کچھ عزت و وقار ہے ۔ لیکن معاملہ اصل میں میری بہن کی زندگی کا ہے۔ تمہیں ابھی ازدواجی زندگی کا تجربہ نہیں ہے۔ نہ تم اس کی سختیوں سے واقف ہی ہو مگر اتنا سمجھ لو کہ جب ثاقب حسن نے بیٹی کے غصے میں ہم سب سے تعلق قطع کر لیا ہے تو تمہاری پھپھو سے تعلق قطع کر لینا کچھ مشکل تو نہ ہوگا۔ یوں بھی فاخرہ بی کی دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب وہ اولاد حاصل کرنے کی خاطر عقد ثانی کرنے سے بھی نہیں چوکے تو سلوط تو ان کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کے ساتھ جو ظلم اور ناانصافی ہوئی ہے۔ اس کی ساری کسر وہ فاخرہ بی سے ہی نکال سکتے ہیں۔ تمہیں ایسا ہی اپنے وقار کا خیال ہے تو تم نہیں جانا مگر مجھے ضرور جانے دو اور اس کا پتا بتا دو۔"

باپ نے تمام اندیشوں اور نزاکتوں کو سامنے رکھ کر بیٹے کو سمجھایا۔ وہ چپ سا ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی! میں آپ کو ان کا پتا بتائے دیتا ہوں مگر آپ مجھے راستے میں کہیں ڈراپ کر دیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر یہ تمہاری کار کہاں ہے جو تم کرائے کی سواری میں پھرتے پھر رہے ہو۔" شعیب منصور نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ پھوپھا جان کے پاس ہے۔ سلوط کے یہاں جانے کی غرض سے رات کو انہیں دی تھی۔ مگر اس وقت ان سے چابی لینا بھول گیا۔ یوں بھی ان حالات میں چابی واپس لینے کا تقاضا کرنا مجھے مناسب نہیں لگا۔" بیٹے نے بتایا تو شعیب منصور سراہتے ہوئے بولے۔

"ہاں، یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔ معلوم ۔ جب مرد داماد بن جاتا ہے تو بچھو کی جون کیوں اختیار کر لیتا ہے اور معمولی سی بات پر بھی ڈنک مارتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم میں ایسے بدطینت مردوں میں سے نہیں ہوں۔" اور جواب میں وہ خاموش ہی رہا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے نیپیئر بیرکس کی طرف آ گئے تھے۔ اسفند نے باپ کو بہت سمجھا بجھا کر سلوط کا پتا بتایا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"ڈیڈی! آپ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں کیونکہ مجھے آگے نہیں پیچھے کی طرف جانا ہوگا۔"

"اچھا ڈراپ تو کیے دیتا ہوں لیکن یہاں نہیں بلکہ تمہارے موجودہ ٹھکانے پر ہی ڈراپ کروں گا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں اترنا ہے۔ تاکہ واپسی میں میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں ۔" شعیب منصور نے کار کی رفتار ہلکی کر کے کہا۔ تب بہت مجبور ہو کر اسفند کو اسی ہوٹل کا نام لینا ہی پڑا۔ جس میں رہ رہا تھا۔

اور پھر آگے تاج محل ہوٹل کے سامنے والے راؤنڈ اباؤٹ سے شعیب منصور نے پھر کار کو واپس موڑ لیا۔

"حالات اور اتفاقات بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اب تم خفا ہو کر گھر سے اس لیے نکلے تھے کہ میں نے سلوط کو گھر واپس لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اب تم خود ہی مجھ سے پہلے اس کے پاس پہنچ گئے۔ ویسے تمہارا جذبہ واقعی بہت

صادق تھا۔ شعیب منصور بات کے اختتام پر ہنسنے لگے۔

"اب آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش تو نہ کریں ٹیڈی۔ ورنہ میں آپ کی اس بات پر ناراض ہو کر نہیں سلوط کو ڈھونڈنے کی غرض سے ہی نکلا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض باتیں اتنے غیر محسوس طریقے سے انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں کہ جن کا احساس انسان کو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ مجھے ہوا۔" اسفند نے جن الفاظ میں سلوط کو تلاش کرنے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

شعیب منصور نے "اچھا" کہہ کر بڑی بے ساختگی سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اسفند کے بتائے ہوئے ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کار روک کر جہاں وہ مقیم تھا۔ کچھ دیر تک اسے کچھ سمجھاتے رہے اور پھر اس سے جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر سلوط کی طرف روانہ ہو گئے۔ اف یہ تو دن چڑھ آیا۔

کچھ کھڑ پھڑ سی ہو رہی تھی اور کچھ گرمی کا احساس۔ جس نے سلوط کو گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو کھلے دروازے سے نظر آتے صحن کے مقابل کی دیوار پر دھوپ چمک رہی تھی۔

کیا میں آج اتنی دیر تک سوتی رہی ہوں؟

اس خیال کے آتے ہی اس نے سرہانے دیوار میں نصب بریکٹ پر رکھی ٹائم پیس پر نظر ڈالی تو دس بج چکے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور بیٹھنے کی پوزیشن میں آتے آتے اس کی نظر سامنے کونے پر پڑی تو دیکھا فرش پر چٹائی بچھائے سر پر ٹوپی باندھے فلورا اپنا بکس کھولے اس میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔ اسے خلافِ توقع گھر میں دیکھ کر اور بھی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ فلورا بڑی بااصول تھی اور کلینک وقت پر جاتی تھی اور پونے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل جاتی تھی۔ مگر اب دس بج چکے تھے۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہی سب سے پہلے اسے ہی مخاطب کر کے پوچھا۔

"آج آپ ڈیوٹی پر نہیں گئیں آنٹی؟"

"نہیں۔" فلورا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیوں آنٹی؟" اس نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔

"جس طرح تمام رات تم جاگتی رہی ہو۔ اسی طرح رات کا بیشتر حصہ میں نے بھی جاگ کر گزارا ہے۔ پھر بھی معمول کے مطابق اپنے وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ بدن بھی ٹوٹ سا رہا تھا۔ اس لیے میری ہمت ہی نہیں ہوئی ڈیوٹی پر جانے کی۔" گو فلورا نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اپنے ڈیوٹی پر نہ جانے کا ذمہ دار وہ اسے ٹھہرا رہی ہے۔ مگر سلوط یہی سمجھی اور ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

"اصل میں میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ خیر لایئے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تو میں آپ کے سر میں تیل کی مالش کر دوں۔ کیونکہ مالش کرنے سے درد بہت کم ہو جاتا ہے۔"

"ارے نہیں کچھ دیوانی ہوئی ہو۔ لو بھلا منہ ہاتھ دھویا نہ ناشتا کیا اور چلی ہو مالش کرنے۔ یوں بھی میں سر دبوانے اور مالش کرانے کی عادی نہیں ہوں۔ بس معمولی سا درد ہے گولی کھائی ہے ابھی جاتا رہے گا۔" فلورا اپنے بکس کا ڈھکنا بند کرتی ہوئی بولی۔

"اچھا اگر آپ عادی نہیں ہیں تو خیر۔ مگر آپ نے مجھے جگایا کیوں نہ دیا۔ میں کم از کم آپ کو چائے اور ناشتا ہی بنا کر دے دیتی۔" سلوط بدستور نادم سے لہجے میں بولی۔

"کیوں کیا میرے ہاتھ پاؤں نہیں تھے جو میں ناشتا بنانے کے لیے تمہیں جگا دیتی۔ ساری رات تو تم جاگتی رہی تھیں اس پر اتنی گہری نیند سو رہی تھیں کہ تمہارے آرام میں خلل ڈالنا مجھے گوارا نہیں ہوا۔" فلورا نے جس سادگی سے اپنے خلوص کا اظہار کیا۔ سلوط کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز سا ہو گیا۔ وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ سر درد کا تو محض بہانہ ہے۔ ورنہ آپ میرے ہونے کی وجہ سے آج ڈیوٹی پر نہیں گئیں۔"

"چلو یہی سمجھ لو۔ یوں بھی اب روز روز تو تم کو اپنے ساتھ کلینک نہیں لے جا سکتی۔ تم گھر میں تنہا رہتی ہو تو میرا سارا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ کیونکہ جوان لڑکی کی ذمہ داری لینا آسان نہیں ہوتا۔ اور آج تو تم بے سدھ پڑی سو رہی تھیں پھر تمہیں بتائے بغیر یونہی سوتا چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔" فلورا نے بھی اصل بات بتا دی۔

"وہ تو ٹھیک لیکن آخر کب تک آپ میرا بوجھ اٹھائیں گی۔ آپ مجھے کسی دارالامان میں داخل کیوں نہیں کرا دیتیں۔ وہاں تو لڑکیوں کو پورا پورا تحفظ ملتا ہے۔ اگر روپے پیسے کا سوال ہے تو میرے پاس تھوڑی نقد رقم اور چند زیورات موجود ہیں۔ جنہیں بیچ کر میرے اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں۔" سلوط یوں بولی جیسے اس زندگی سے عاجز آ گئی ہو جو وہ گزار رہی تھی۔

"نہیں بھئی، خواہ تمہارے پاس لاکھوں کی رقم اور زیورات کیوں نہ ہوں۔ میں تمہارے وارثوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی جس سے بعد میں میری گردن ناپی جائے۔" فلورا بکس کے ڈھکنے پر ہاتھ ٹیک کر اٹھتی ہوئی قدرے بیزاری سے بولی۔

"لیکن میں نے تو پہلے بھی کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ میں کسی کو بھی اپنا وارث نہیں سمجھتی۔ میں بالغ اور خود مختار ہوں اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ پھر آپ سے بھلا کون جواب طلب کر سکتا ہے۔" سلوط قدرے چڑ کر بولی۔

"تم خود کو خواہ کچھ بھی کہو اور سمجھ لو۔ لیکن وارث وارث ہوتا ہے اور تمہارا وارث تو اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہاں بے چاری ایک معمولی سی نرس۔ دیکھو بچی! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب زیادہ عرصے تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتی اور تمہارے بارے میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ان لڑکیوں میں سے نہیں ہو۔ جو آزاد اور خود مختار ہوتے ہی پر پرزے نکال لیتی ہیں اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہیں۔ میں اب بھی تم سے کہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ کیونکہ اسی میں تمہاری عزت اور بہتری ہے۔ آخر میں بڈھی جان کب تک تمہاری حفاظت کر سکوں گی۔ جب کہ میں تو خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" فلورا کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ مزید اسے پناہ اور تحفظ دینے کی روادار نہیں ہے۔ یوں بھی ہمیشہ کی طرح آج اس کے اٹھتے ہی اسے ناشتا کرنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ اس پر اتنے صاف اور واضح الفاظ میں اپنے گھر سے چلے جانے کو بھی کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود سلوط نے جھک کر کہا۔

"نہیں نہیں آنٹی! میں یوں گر کر تو کبھی بھائی جان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ کو معلوم نہیں آنٹی! کہ بچپن سے لے کر اب تک میں سب کے سامنے جھکتی رہی ہوں۔ سب کے طعنے تشنے اور زیادتیاں سہتی رہی ہوں۔ مگر اب مجھ میں اتنی تاب ہے نہ سکت۔ میں تو اب کچھ بن کر ہی انہیں دکھانا چاہتی ہوں اور پھر میں نے ان کی محبت بھری درخواست کو کتنی حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ اب میں ان کے پاس کیا شکل لے کر جاؤں گی۔"

"تعجب ہے۔ وہ تمہارے سگے بھائی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔ جو تم ان کے بارے میں اتنی غلط باتیں سوچ رہی ہو۔ ارے وہ تو تمہیں دیکھ کر الٹا خوش ہو جائیں گے۔" فلورا نے کہا۔

"نہیں، آپ ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ وہ میرے لیے غیروں سے بھی بدتر ہیں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں خود ہی اپنے لیے کوئی دوسرا بندوبست کر لوں گی۔ یوں بھی آخر مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ کوئی ساری عمر آپ کے اوپر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی۔" سلوط اس کی باتوں پر زچ ہو کر بولی۔

"نہیں بندوبست کیسا، میں تو تمہیں گھر سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں دوں گی۔ آخر میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔" فلورا ایک دم ہی بگڑ کر بولی۔ پھر قدرے توقف کے بعد اس نے قدرے نرم پڑ کر کہا۔

"دیکھو بیٹی، اگر تم خود چل کر جانا اپنے وقار کے خلاف سمجھتی ہو تو میں چلی جاؤں گی۔ تمہارے بھائی جان کے پاس، کچھ ایسا ظاہر کر کے کہ میری آمد سے تم لاعلم ہو۔ پھر میں اپنی طرف سے انہیں سمجھاؤں گی کہ وہ کسی طرح خود آ کر تمہیں لے جائیں۔ ورنہ تمہاری بھابھی کو بھیج دیں۔ پھر تو تمہیں ان کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔۔۔؟" فلورا نے آخری فقرے کو سوال کی شکل دے دی تو سلوط کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے، آپ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لیں۔" کہنے کا مقصد جو بھی تھا فلورا نے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اس جواب کو بہت کافی سمجھا۔

"اچھا، اب منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔ بلکہ بہتر ہوتا کہ نہا دھو کر کوئی اچھا سا لباس پہن لیتیں لیکن یہاں تو روز ہی پانی کی قلت رہتی ہے۔ خیر بلا نہائے ہی بدل لو، اصل میں آج چونکہ میں چھٹی پر ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ آج ہی تمہارے بھائی جان کے پاس ہو آؤں۔ ہاں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یوں بھی آج کا کام کل پر ڈالنے کی

عادت نہیں ہے مجھے۔" فلورا نے کہا۔

"لیکن کیا آپ کو بھائی جان کا پتا معلوم ہے؟" سلوط نے پوچھا۔

"ظاہر ہے وہ تمہاری بھابی کے بھائی کے یہاں ٹھہرے ہوں گے۔ اور وہ پتا تو خود تم نے مجھے بتا رکھا ہے۔" فلورا نے جواب میں کہا تو سلوط چپ چاپ منہ دھونے چل دی۔

فلورا کے کہنے کے باوجود اگر سلوط کے کپڑے میلے اور مسلے ہوئے نہ ہوتے تو وہ کبھی لباس تبدیل نہیں کرتی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فلورا نے اس لیے اسے لباس تبدیل کرنے کی تاکید کی ہے کہ اس کے خیال میں اگر کوئی اسے لینے آیا تو اسے عین وقت کے وقت کپڑے تبدیل کرنے نہ پڑیں۔ جبکہ دل ہی دل میں وہ فلورا کی اس خوش فہمی پر ہنس رہی تھی کہ وہ اس کے بھائی بھاوج کو اپنے گھر لانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس تبدیل کر کے وہ باورچی خانے میں آئی تو دوپہر کا کھانا تیار ملا۔ گو فلورا کا معمول تھا کہ وہ ناشتے کے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا تیار کر لیتی تھی۔ کیونکہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کلینک لے کر جایا کرتی تھی۔ مگر اس روز سلوط نے یہی سمجھا کہ اس نے یہ کھانا پکا کر گویا پہلے سے ہی اس کے بھائی کے پاس جانے کی تیاری کر رکھی ہے۔

بہرحال اپنے لیے چائے دم کی۔ گنجینے سے دو پاپے نکال کر ان سے ناشتہ کیا اور پیالی کیتلی دھو کر باہر آ گئی۔ تبھی دروازے پر ہلکی ہلکی سی کٹ کٹ کی آواز آئی تو فلورا نے جو اسی چٹائی پہ بیٹھی اپنی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ اس نے سلوط سے کہا۔

"ارے ذرا دیکھنا تو مونا۔ کہیں وہ وارڈ بوائے عظمت میری خیریت معلوم کرنے نہ آیا ہو۔ بے چارا بچہ میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔" تو سلوط نے دروازے تک جانے میں تھوڑا سا تامل کیا کیونکہ فلورا نے اس کو سختی سے ممانعت کر رکھی تھی کہ وہ کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولے۔ اسی وجہ سے وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ تبھی فلورا کو احساس ہوا تو اٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں، تم ٹھہرو میں دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے؟" اور پھر اس نے کون ہے کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تو دروازے پر ایک سوٹڈ بوٹڈ اور بہت ہی پر وقار شخص کو کھڑا دیکھ کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ کہ یوں بھی دروازہ کھولتے ہی کسی قیمتی خوشبو کا ایک بھبکا اس کی ناک میں گھس آیا تھا۔

"کیا مسٹر فلورا یہیں رہتی ہیں؟" آنے والے نے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں۔"

"اوہ، تو میں ٹھیک جگہ ہی پہنچا ہوں۔" آنے والے نے کہا۔

"لیکن آپ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں؟" فلورا نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں شعیب منصور ہوں، سلوط کا ماموں اور ان سے ملنے آیا ہوں۔" شعیب منصور نے کہا۔ سلوط ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ شعیب منصور کی آواز سن کر اس کی رنگت پھیکی سی پڑ گئی تھی۔ فلورا نے تصدیق کرنے کی غرض سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اسے اضطراری سی کیفیت میں انگلیاں مروڑتے دیکھ کر اس نے نہایت خلیق لہجے میں شعیب منصور سے کہا۔

"اوہ، آپ سلوط کے ماموں ہیں۔ اندر تشریف لے آئیے۔ اصل میں آج کل کچھ واقعات ایسے ہو رہے ہیں کہ بلا پوچھے اور معلوم کیے کسی کو اندر نہیں بلایا جا سکتا۔"

"جی ہاں، درست کیا آپ نے احتیاط تو بہرحال اچھی چیز ہے۔" شعیب منصور نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ان کو اندر آتا دیکھ کر سلوط اتنی گھبرائی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کمرے سے باہر نکل جائے یا وہیں کھڑی رہے۔ ادھر شعیب منصور سیدھے اس کی طرف ہی بڑھ آئے۔

"آہا سلوط، کہو کیسی ہو بیٹا۔ ہم تو تمہاری صورت کو ہی ترس گئے تھے، جونہی سنا کہ تم مل گئی ہو بس اپنی پہلی فرصت میں ہی تم سے ملنے چلے آئے۔" انہوں نے اس کے نزدیک آ کر اس کے تھوڑے تھوڑے جھکے ہوئے سر پہ شفقت

سے ہاتھ پھیرا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ نہ سلام نہ دعا۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اس کے اس طرح رونے پر شعیب منصور کا بھی دل بھر آیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ لیکن بڑی سختی سے خود پر قابو پا کر اپنی آواز کو شگفتہ بنا کر آہستہ سے اس کے سر کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ارر۔ ارے یہ اتنا رونا دھونا۔ اگر یہ خوشی کے آنسو بھی ہیں مائی سویٹ گرل۔ تو بھئی اپنے اشکوں کی اس طغیانی میں ہمیں نہ بہا دینا۔ دیکھو بھئی، ہم تو انشورڈ بھی نہیں ہیں۔ اور پھر کئی جانوں کے کفیل بھی ہیں۔" اور ان کی اس بات پہ آبدیدہ سی فلورا ہنسنے لگی۔ لیکن سلوط کی گریہ وزاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شعیب منصور کچھ پریشان ہو گئے۔

"دیکھو بھئی، رونا تو ہمیں چاہیے تھا کہ ہماری وجہ سے تمہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ارے قصوروار تو تمہارے ہم ہیں بیٹی، پھر تم اتنا رو دھو کر ہماری شرمندگی میں اضافہ کیوں کر رہی ہو؟" شعیب منصور نے گلوگیر آواز میں کہا تو سلوط اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں منجھلے آکا، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ یوں بھی آپ سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"اتنا مت روؤ مونا بیٹی۔ دیکھو تمہارے ماموں تمہارے رونے کی وجہ سے کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ انہیں بٹھاؤ، ان کی خاطر کرو۔" فلورا اس کے قریب آ کر آہستہ سے بولی۔ اور پھر اس نے شعیب منصور سے کہا۔

"جب سے آئے ہیں کھڑے ہی ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں سر، گو میرے پاس آپ کے شایانِ شان بیٹھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے پھر بھی۔"

"ارے نہیں مسٹر، آپ کہاں مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے لگیں۔ میں تو خود ایک ذرۂ حقیر ہوں۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔ ورنہ بیٹھ جاتا۔" شعیب منصور حد درجے انکساری سے کام لے کر بولے۔ اور پھر انہوں نے سلوط سے کہا۔

"اب اپنے آنسو پونچھ لو بیٹی اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کیوں مسٹر، اگر میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔؟" انہوں نے اس سے بات کرتے کرتے فلورا کو مخاطب کر کے پوچھا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے بولی۔

"نہیں نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے سر، آپ ان کے ماموں ہیں اور میں ایک ادنیٰ سی خدمت گزار، آپ انہیں شوق سے لے جائیں۔" لیکن سلوط کو تو کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا کہ وہ پھر پلٹ کر ان کے یہاں جائے، وہ تو ان کے گھر میں قدم رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بولی۔

"نہیں منجھلے آکا۔ آئی ایم سوری، میں آپ کے یہاں نہیں جاؤں گی۔ جس گھر سے اتنی بے عزت کر کے نکالی گئی ہوں، اس گھر میں قدم رکھنا میری توہین اور گراوٹ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" شعیب منصور کو فلورا کے سامنے اس کا یہ کہنا ناگوار تو گزرا لیکن مصلحت کا تقاضا کچھ یہی تھا کہ حلم اور نرمی سے کام لیا جائے۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"لیکن میرا ارادہ تمہیں اس گھر میں لے جانے کا تو نہیں ہے بیٹیا۔ میں تو۔!" اور فلورا نے جو اس کے انکار پہ جزبز سی ہو رہی تھی، ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں بھائی صاحب، اگر آپ اپنے گھر میں انہیں لے جانا چاہ رہے ہیں تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اپنوں کے درمیان تو کبھی کبھی اس سے بھی کہیں بڑی بڑی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اصل میں یہ مونا ابھی بہت ناتجربہ کار اور حساس ہے۔ اس نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ اس لیے اس نے اپنے بھائی کو بھی دھتکار دیا ہے، یہ ان کے ساتھ بھی نہیں گئی مگر میں اسے آپ کے ساتھ بھیج کر رہوں گی۔"

"نہیں۔ آپ کے میرے اوپر بہت زیادہ احسانات ضرور ہیں لیکن آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں آنٹی فلورا۔ آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" سلوط نے ساری مروت اور رواداری کو بالائے طاق رکھ کر سخت برہمی سے کہا۔

"اچھا اچھا بھئی، یہ مسٹر فلورا تو کیا میں بھی تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن بیٹی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کہ میں بھی تمہیں اپنے گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ لے جائے بغیر نہ رہوں گا۔ آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے، کوئی پرسٹیج ہے اور میں بڑے مان اور دعوے سے تمہیں لینے آیا ہوں۔" اپنی بات کہتے کہتے

شعیب منصور جذب میں آ گئے۔

"دیکھو مونا، تمہارے بقول میں تم پر کوئی حق رکھتی ہوں نہ اختیار لیکن اپنی حد تک تمہاری ذمہ داری سے دستبردار ہونے کا حق تو مجھے ہے نا، اور یہ بات میں پہلے بھی تم کو بتا چکی ہوں۔ لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم آج ہی اپنے ماموں کے ساتھ چلی جاؤ۔" فلورا نے یہ کہہ کر گویا اسے اپنے گھر سے نکلنے کا حکم دے دیا۔

"ہاں بیٹی ضرور چلو۔ ہم تو خیر تمہارے لیے غیر ہی ہیں لیکن تمہارے اپنے والد اور والدہ تو موجود ہیں نا۔ اپنا گھر چھوڑ کر ان بے چاری پر اپنی ذمہ داری کا بار ڈالنا کوئی معقول بات تو نہیں۔ چلو، اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" شعیب منصور نے باتوں ہی باتوں میں اس پر بڑی گہری چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ کم از کم اسے تو یہی لگا۔

مگر گویا مجبوری ہی مجبوری تھی۔ کہ اب اُن کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ اس پر غصے میں فلورا کو ایک تیکھا سا جواب دے کر اس نے اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بلکہ اس کے بے لوث جذبے کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔

اس نے فلورا سے آنکھ نہیں ملائی اور چپ چاپ جا کر پلنگ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس گھسیٹا۔ اپنے میلے کپڑے اخبار میں لپیٹ کر اس میں رکھے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آئی۔ جبکہ شعیب منصور نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا بھی چاہا مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ باہر آ کر شعیب منصور نے گز بھر کے فاصلے پر کھڑی کار کی ڈکی کھولی اور اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر ڈکی میں رکھ دیا۔ اور جب شعیب منصور نے فلورا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ کر سلوط کے لیے کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھولا تو اس نے بیٹھتے بیٹھتے پلٹ کر دروازے کی دہلیز پر کھڑی فلورا کی طرف دیکھا۔ اور بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"آنٹی مجھے معاف کر دیجیے، میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ پلیز آنٹی، آپ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کیجیے گا۔ کیونکہ آپ کے میرے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ جن کا اتارنا تو بڑی بات، مجھے وہ الفاظ بھی نہیں مل رہے جن سے آپ کے ان احسانوں کا شکریہ ادا کر سکوں۔" وہ روتی ہوئی بولی تو فلورا جو خود بھی اس سے جدا ہونے کے خیال سے رونے لگی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

"ارے نہیں بیٹی، میں نے تو تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر اپنے پاس رکھا تھا۔ تمہیں تحفظ دیا تھا اور تم مجھ پر میرے احسانات جتا کر غیریت کی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو تمہاری کسی بات کا بھی برا نہیں مانا کہ میں تمہاری ذہنی کیفیت سے واقف ہوں۔ اچھا خیر، جاؤ جہاں بھی رہو خوش و خرم اور سلامت رہو۔" پھر فلورا نے اس کی پیشانی چوم لی۔ اور خود دہلیز سے اتر کر اسے کار میں بٹھا دیا۔ اور ایک بار پھر شعیب منصور نے اسے خدا حافظ کہہ کر کار آگے بڑھائی اور سلوط کو لے کر روانہ ہو گئے۔

اس سمے ان کی کیفیت کسی فاتح کی سی تھی۔

اپنی اتنی زبردست کامیابی پر اتنے مسرور، اتنے سرشار تھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کار میں نہیں ہواؤں کے دوش پر اُڑے جا رہے ہوں۔ یوں بھی سلوط کا ان کی لاعلمی میں ان کے گھر سے چلے جانا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ بڑی ذمہ داری کا معاملہ تھا۔

بلکہ دوسرے معنوں میں ان کی ناک کا معاملہ تھا۔

اور جس روز سے سلوط ان کے یہاں سے گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی چین کا نہ گزارا تھا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے گھر چھوڑ کر جانے کی بھی انہوں نے پروا نہیں کی تھی۔ بلکہ حقیقت جان لینے کے بعد بیٹے سے بھی وہ نالاں ہو گئے تھے اور اس کی اور بیوی کی ملی بھگت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زینت سے بھی ان کا رویہ اچھا نہ رہا تھا۔ اور اب ان کے لیے یہ کتنی خوشی اور سرخروئی کی بات تھی کہ وہی اسے منا کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ گویا پہل انہوں نے کی تھی۔ ان کا رخ شہر کی سمت تھا۔

سلوط ان راستوں سے بالکل واقف نہیں تھی۔

پھر انہوں نے خاصا فاصلہ طے کر کے ایک پُر رونق بازار میں مٹھائی کی دکان کے سامنے اپنی کار روکی۔ اور اس سے

ابھی آتا ہوں کہہ کر کار سے اتر کر وہ مٹھائی کی دکان میں چلے گئے۔ انہوں نے کاؤنٹر پر کھڑے ایک شخص سے کچھ کہہ کر وہیں رکھے فون سے کوئی نمبر ڈائل کیا اور تھوڑی دیر تک کسی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر ریسیور رکھ کر باہر آئے تو دکان کا ملازم ایک بہت بڑا مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے ان کے پیچھے آتا نظر آیا۔ انہوں نے وہ ڈبہ ملازم سے پچھلی سیٹ پر رکھوایا اور کار لے کر پھر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ابھی تک ایک، بات بھی نہیں کی تھی۔ ماسوائے ابھی آتا ہوں کہنے کے اور وہ اس سمے بڑی الجھن میں گرفتار تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ شعیب منصور اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ نہ اس نے کچھ پوچھا ہی تھا۔ وہ تو سیٹ کی پشت سے کمر ٹکائے۔ اپنی طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مٹھائی پچھلی نشست پر رکھوا کر روانہ ہوئے تو کار چلاتے چلاتے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر مسرور کے انداز میں بولے۔

"میں نے سوچا خوشی کا موقع ہے، سب کا منہ میٹھا کرانا بھی ضروری ہو گا۔" وہ جواب میں بھلا کیا کہتی۔ ان پر ایک نظر ان پر ڈال کر رہ گئی۔ لیکن دل میں ان کے اتنے خوش ہونے پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ یوں بھی اسے ان سے کوئی شکوہ تھا نہ پرخاش۔ کیونکہ بھابی کے عزیزوں میں صرف وہی ایک تو تھے۔ جن سے اسے کچھ دلی انسیت تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ بھی آ گئی تھی۔ ورنہ تو اس کا دل سب سے اتنا کھٹا ہوا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی خاطر میں نہیں لائی تھی۔ شعیب منصور چاہتے تھے کہ وہ کچھ بات کرے تاکہ اس کے دل پر چھایا تکدر کچھ کم ہو سکے۔ وہ اس سے فلورا کے متعلق پوچھتے رہے کہ وہ کون ہے، کیسی ہے اور تم سے اس کی واقفیت کیونکر ہوئی؟؟۔ اور وہ نپے تلے انداز میں انہیں فلورا کے متعلق بتاتی رہی۔ پھر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اور مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد شعیب منصور اصل مقصد پر آتے ہوئے بولے۔ جس پر گفتگو کرنے کی غرض سے ہی اصل میں وہ کار کو بلا مقصد ہی ادھر ادھر سڑکوں پر گھما رہے تھے۔ ورنہ فریر ہال کا علاقہ اتنی دور تو نہیں تھا۔ آخر انہوں نے اس بات کی ابتدا کی۔

"دیکھو بیٹی، سب سے پہلے تو میں اپنی اور اسفند کی طرف سے تم سے معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ تم نے میری وجہ سے ہی سب سے زیادہ مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اسفند کا سوال تو بعد میں آتا ہے کیونکہ اسفند کا قصور صرف اتنا تھا کہ اسے تمہارے بارے میں بہت غلط انداز میں بتایا گیا تھا۔ اور اس نے تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔ بیٹی، تم ذرا اس معاملے کو اپنے اوپر رکھ کر سوچو، اگر تم کسی کی ذات میں اتنی دلچسپی لیتیں کہ اسے اپنی موت و زیست کا مسئلہ بنا لیتیں اور پھر ایک دن تم کو معلوم ہوتا کہ وہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے، پرایا ہے۔ تو تمہارے بارے میں میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سننے کے بعد تمہارا کیا ری ایکشن ہوتا یا تمہارے دل پر کیا گزرتی۔ لیکن اسفند چونکہ مرد ہے، اس کے بارے میں دعوے سے۔۔۔ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دل پر یہ انکشاف قیامت بن کر ٹوٹا ہو گا۔ اس لیے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔" اپنی بات کہہ کر انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سیٹ سے پشت ٹکائے چہرہ تھوڑا سا جھکائے بلا کوئی تاثر دیے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ شعیب منصور سمجھ گئے کہ صفائی کے لیے اتنے سے الفاظ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ جبکہ وہاں تو ایک ذخیرۂ الفاظ بھی اس کے دل پر پڑی نفرت اور تکدر کو نہیں چھانٹ سکتا تھا۔ لہٰذا انہیں بڑے تدبر اور حکمت عملی سے کام لینا ہو گا۔ انہوں نے پھر کہا۔

"میں مانتا ہوں اس کی بدسلوکی کی وجہ سے تمہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اور بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک شریف اور پارسا لڑکی کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے تمہاری عزت اور آبرو بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ لیکن بیٹی اس نے بھی تم پر ظلم کر کے خود کو سزا دے لی ہے۔ وہ بھی تمہارے جانے کے اگلے روز بلا کسی کو بتلائے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنی اتنی اچھی ملازمت تمہارے ہی غم میں چھوڑ دی تھی اور پورے ڈیڑھ ماہ تک تمہاری تلاش میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرا تھا۔ دیکھو غلطی تو بڑے بڑے نبیوں اور اولیاؤں سے ہو جاتی ہے۔ وہ تو محض ان کے پیروں کی خاک ہے، ایک معمولی سا شخص۔" تب وہ جوان کے اسفند کی حمایت کرنے کو برداشت نہ کر سکی تھی بڑے تلخ و ترش لہجے میں بولی۔

"ہونہہ۔ آپ ان کی تکلیفوں کا، جو کچھ میں نے بھگتا ہے اس سے مقابلہ کر رہے ہیں منجھلے آ کا۔ شاید آپ یہ بھول گئے۔۔۔ کہ وہ مرد ہیں اور میں ایک کمزور سی عورت، بڑا فرق ہے میری اور ان کی تکلیفوں میں۔ اور پھر میں

نے توکسی سے کسی بات کا بھی شکوہ نہیں کیا۔ کیونکہ میرے نزدیک شکوے شکایت کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ میرے مقدّر میں تھا، وہی ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہر بات کا دارومدار مقدّر پر ہی نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں یا معاملے انسان کے اپنے اختیارات کے دائرے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انسان سے یہ نہ کہا جاتا کہ نیکی یا بدی وہ جو چاہے اختیار کرے بلکہ یا تو محض بدی ہی رہ جاتی یا صرف نیکی۔ میرا مطلب ہے بہت سی باتیں انسان کے اپنے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔ اور ان سے ہٹ کر جو ہوتی ہیں انہیں اتفاقات یا مقدر پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا محض اتفاقات کی بنیاد پر ہوا۔ اور ان اتفاقات کے رونما ہونے میں ہماری کوتاہیوں اور زیادتیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔" شعیب منصور نے اپنا کوئی فلسفہ جھاڑا تو اس نے بیزار ہو کر دل میں سوچا۔ اُف، یہ منجھلے آکا جانے کیوں اتفاقات اتفاقات کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ جبکہ جو کچھ مجھ پہ گزر چکی ہے اس کا مداوا ہو سکتا ہے نہ ازالہ۔ گویا ان کی کوئی بات کوئی دلیل اس کو متاثر نہیں کر سکی تھی۔ انہوں نے بھی اس کی خاموشی اور بے نیازانہ سے انداز سے اخذ کر لیا تھا کہ وہ ان کی کسی بات پہ بھی کان نہیں دھر رہی چنانچہ انہوں نے پھر موضوع ہی بدل دیا۔

"بہرحال۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ آج کا دن میری نصرت اور کامیابی کا دن ہے۔ آج نہایت غیر متوقع طور پر میرا بیٹا مجھے مل گیا، اِدھر تم بھی مل گئیں۔ آج کا دن میرے لیے بہت مُبارک ہے۔ کم از کم اب میں ثاقب حسن کے سامنے سرخروئی سے تو جا سکوں گا۔" شعیب منصور کی اپنی ایک ڈگنٹی ایک وقار تھا۔ وہ نہایت بردبار اور سنجیدہ مزاج بھی تھے۔ کم از کم اپنے چھوٹوں کے لیے تو بہت بارعب تھے۔ اور اس وقت سلوط سے انہوں نے جتنی باتیں بھی کیں، اسفند کی درخواست پر کی تھیں۔ اس نے ہوٹل پہنچ کر باپ سے دبے لفظوں میں کہا تھا۔

"ڈیڈی، سلوط مجھ سے خفا ہی نہیں متنفر بھی ہو گئی ہیں۔ ڈیڈی پلیز، میری طرف سے ان کے دل میں بھرا تکدّر نکالنے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔ کیونکہ میری کوشش کے نتیجے میں تو یہی ہوا تھا کہ انہوں نے ہوسٹل ہی چھوڑ دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا مگر آپ کی بات اور ہوگی۔" اور شعیب منصور نے جواب میں کہا تھا۔

"ڈونٹ وری مائی سن، آئی وِل ٹرائی مائی بیسٹ۔ (تم فکر نہ کرو میرے بیٹے، میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گا)۔"

وہ روشن خیال اور ایڈوانس تھے۔ اور اولاد کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس پر رعب گانٹھ کر اور سختی کر کے نہیں، دوستانہ طریقے سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ سختی کرنے سے اولاد باغی اور اجنبی ہو جاتی ہے۔ ورنہ باپ کے اور اس کے درمیان غیریت کی ایک دیوار سی حائل ہو جاتی ہے۔

مگر انہوں نے کچھ تو بیٹے کی خوشی کی خاطر اس سے اتنی باتیں کی تھیں اور کچھ بہن کا گھر سلامت رکھنے کی غرض سے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب سلوط عرصے بعد ثاقب حسن سے ملے گی اور اسے اس حقیقت کا علم ہوگا کہ وہ ثاقب کی بہن نہیں بیٹی ہے تو ثاقب حسن کے لیے اس کے تاثرات اور جذبات دوسرے ہی ہو جائیں گے۔ عین ممکن ہے وہ باپ کے ساتھ مل کر ہم سب کی زیادتیوں کا بدلہ فاخرہ سے لے یا نہ بھی لے تو بھی فاخرہ کو ہم سب سے چھڑوا دے۔

بہرحال پھر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ یوں بھی ہوٹل نزدیک آ گیا تھا۔ انہوں نے کار ہاربر فٹ پاتھ کے کنارے پارکنگ پلیس میں کھڑی کی اور اسے لے کر اندر آئے تو اسفند انہیں سامنے ہی کھڑا نظر آیا۔ جسے دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ اور جہاں تک ان کے ساتھ آئی تھی۔ وہیں ٹھٹک گئی۔ مگر شعیب منصور اس کے قریب جا کر بولے۔

"شاباش بیٹے، تم ٹھیک وقت پر یہاں پہنچے۔ ورنہ مجھے تو ان دونوں کے کمرے کا نمبر تک معلوم نہیں تھا۔" پھر انہوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور سلوط کو کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھ کر انہوں نے اس سے کہا۔

"آؤ چلو بیٹی! آج تم نے اچانک مل کر مجھے ایک سرپرائز دیا ہے اور اب میں تم کو ایک زبردست سرپرائز دوں گا۔" وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہے تھے۔

پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ثاقب حسن کے کمرے میں پہنچے تو سلوط کو جوان کے پیچھے تھی ان کے سامنے کر کے بولے۔

"ذرا دیکھیے تو ثاقب میاں! کون آیا ہے؟" اور ثاقب حسن جوان کو اور اسفند کو اندر آتا دیکھ کر منہ پھُلا کر ذرا ایسے انجان بن کر بیٹھ گئے تھے۔ جیسے انہیں آتے دیکھا ہی نہ ہو۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور سلوط کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر گھڑی بھر کو تو ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مگر پھر جلدی سے اٹھے اور اپنے دونوں ہاتھ وا کر دیے۔ سلوط بھی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر تک دونوں آنسو بہاتے رہے اور فاخرہ بھی رونے میں ان کا ساتھ دیتی رہیں۔ ماحول کچھ اتنا افسردہ اور اثر انگیز ہو گیا تھا کہ شعیب منصور پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ اور وہ کچھ کہنے والے ہی تھے کہ تبھی آگے پیچھے سہیل منصور اپنی فیملی کے ساتھ اور ان کے پیچھے خود ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں اور بیوی اندر داخل ہوئیں۔ تو شعیب منصور بیوی کو دیکھ کر کھل ہی اٹھے۔ ماحول سارا بدل ہی گیا تھا۔

ہنسی، قہقہے، مبارکباد۔ اور مٹھائی گویا خوشیوں کے سارے رنگ۔ مگر سلوط اسفند کی موجودگی کی وجہ سے بہت چپ چپ سی تھی۔ یوں بھی اسے یہاں آنے سے پہلے بالکل توقع نہیں تھی کہ ثاقب حسن اتنی آسانی سے اسے معاف کر دیں گے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ بھی اکلوتی اولاد کی۔ ایسی اولاد کی جسے تمام عمر انہوں نے غفلت اور بے توجہی کی مار دی تھی۔ اور ایک بوڑھے شخص سے اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ وہ رنج و پچھتاوے کی آگ میں کس بری طرح جل رہے ہیں۔

اور اب وہ آئی ہے تو اسے ہاتھ سے کیسے کھو سکتے ہیں۔

اس لیے انہوں نے اس کے اتنے گستاخانہ رویے کے باوجود اسے سینے سے لگا لیا ہے۔

پھر ثاقب حسن نے خود ہی سب کے سامنے یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ سلوط ان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہے۔ سلوط تو اس انکشاف پر اتنی مسرور ہوئی کہ باپ سے لپٹ گئی کہ اس کی زبان تو ابو کہنے کو ترستی تھی۔ بڑی دیر تک تو اس بات پر ہی مبارک سلامت ہوتی رہی۔ سب کو ان کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر اعتراض تھا اس لیے سب کی متفقہ رائے سے طے یہ پایا کہ وہ سہیل منصور کے ہاں منتقل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اگلے روز ہی وہ ہوٹل کی رہائش چھوڑ کر سہیل منصور کے یہاں آ گئے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ثاقب کو سہیل منصور کے یہاں آئے بیس بائیس روز ہو گئے تھے۔ ان کے لیے کسی معقول اور ڈھنگ کے مکان کی تلاش بھی برابر جاری تھی۔ ادھر وہ سلوط کا جہیز بھی۔ انہیں اسفند سے کیا وعدہ بھی اچھی طرح یاد تھا۔

لیکن وہ اتنے جلد بیٹی کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس لیے خاموش تھے کہ اب تو یہ عالم تھا کہ سلوط کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

ادھر زینت بھی کئی بار اسفند سے کہہ چکی تھیں کہ اگر وہ کہے تو وہ سلوط پر اس کا پیغام دے دیں۔ لیکن وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال دیتا تھا کہ ابھی ایسی کیا جلدی ہے۔

اصل میں تو چونکہ سلوط اس سے سخت خفا تھی بلکہ سخت بدظن تھی۔ اس لیے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے پروپوز کرنے پر انکار ہی نہ کر دے۔ اسی وجہ سے وہ سلوط سے مل کر پہلے اسے منانا چاہتا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ تنہائی میں اس سے بات ہو سکے۔ کوثر ایک طرح اس کی راز داں تھی اور اس کی طرف سے سلوط کا دل صاف کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔ اسی سے اسفند نے کہہ دیا تھا کہ کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کوئی گھر میں موجود نہ ہو تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔ آخر ایک روز جب ثاقب حسن ایک مکان دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ سہیل اپنے آفس اور نازش اور فاخرہ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ کوثر نے موقع دیکھ کر اسے مطلع کر دیا۔

اس لمحے سلوط اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے نئے دوپٹے کے آنچل ترپ رہی تھی جب اسفند نے کمرے میں قدم رکھا۔ فرش پر قالین بچھا ہونے کی وجہ سے سلوط کو اس کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی۔

"ہیلو کیا ہو رہا ہے؟" اسفند نے ایک دم ہی قریب آ کر کہا تو وہ ڈر کر اس بری طرح چونکی کہ سوئی کی نوک اس کی انگلی میں چبھ گئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" اس نے بڑے سخت لہجے میں تیوری چڑھا کر کہا۔

"آپ سے معافی مانگنے اور آپ کو منانے۔" اسفند مسکرا کر بولا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور سفید پینٹ پہنے

ہوئے تھا۔ جو اس پر بہت جچ رہی تھی مگر سلوط کو تو اس سے ایسی نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ ہی کیا وہ خود مجسم اسے زہر لگا۔

"کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ میں ایسے ہی سلوک کی مستحق تھی۔" وہ ایک دم ہی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی

"اوہ نو۔ مستحق تو اصل میں میں ہوں۔ آپ جتنا چاہیں مجھے برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن خدارا اب تو اپنا غصہ تھوک دیں۔ میں ایک بار پھر اپنے کیے کی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ واقعی مجھ سے بڑی زیادتی ہو گئی تھی۔ لیکن یقین جانیے میں نے جو کچھ کیا محض لاعلمی اور غصے میں کیا تھا۔" اسفند کے لہجے میں عاجزی سی آگئی۔

"جب میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر معافی کا سوال نہ کسی۔ وضاحت اور صفائی کا۔ بس آپ یہاں سے چلے جائیے۔ یہی آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔" اس نے بڑے سخت اور تلخ لہجے میں کہا۔

"وضاحت اور صفائی اگر آپ کو نہیں پسند تو مجھے تو پسند ہے۔ اور میں اس وقت آپ کو منانے آیا ہوں تو مناکر ہی جاؤں گا۔ بس اب غصہ تھوک دیجیے۔ کیا آپ کے دل میں میری کوئی عزت نہیں رہی؟" وہ ہٹیلے سے انداز میں اپنے موقف پر ڈٹ کر بولا۔

"نہیں بالکل نہیں ذرا بھی نہیں ہے۔ دیکھیں آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے آپ سے سخت نفرت ہے۔ میں آپ کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ بات کرنی تو کجا۔" اس نے خوبصورت آنکھوں سے قہر کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

اور اس کی یہ باتیں سن کر اسفند کو لگا جیسے اس نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ جس طرح وہ شروع سے بات کر رہی تھی۔ وہ بھی نہ معلوم کیسے برداشت کر رہا تھا۔ مگر اب معاملہ برداشت کی حد سے گزر چکا تھا۔ اور وہ تو یہاں اپنی مراد پانے آیا تھا۔ اپنی خوشیاں لوٹنے آیا تھا۔

یہ احساس اس کے لیے کتنا اطمینان بخش تھا کہ وہ مل گئی ہے اور اس کے قریب ہی آگئی ہے اور پھر پھوپھا کی ٹال مٹول پر اس نے سوچا تھا کہ گھر کا معاملہ ہے۔ میں اسے جلد ہی منا لوں گا اور یہ یقین بھی کہ پھوپھا اپنا وعدہ ضرور نبھائیں گے۔ اور وہ تو اس خوش فہمی میں اس وقت یہاں آیا تھا کہ سلوط پر اپنی تمام تر محبت نچھاور کر کے کسی نہ کسی طرح اسے منا ہی لے گا۔ لیکن اس نے نفرت کا اظہار کر کے اور سب سے بڑھ کر اس کی تحقیر کر کے بری طرح اسے دھتکار دیا تھا۔

بس وہ غصے کی ایک طوفانی سی لہر تھی جو نیچے سے اوپر اٹھی تھی۔ ایک کھولن تھی جس نے تن بدن میں آگ لگا دی۔ تھی۔ جس کے ریلے میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ تیزی سے پلٹا اور آندھی کے کسی تیز جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا سہیل منصور کے کمرے میں پہنچا۔ ان کے چیسٹ کی دراز کھولی اور بھرا ہوا پستول باہر نکال لیا۔ جو سہیل منصور اپنی حفاظت کی غرض سے رات کو اپنے ساتھ رکھ کر سویا کرتے تھے۔ کوثر جو اسے فون کرنے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ وہ ابھی تک آیا بھی نہیں کہ اندر سے سلوط کے لتاڑنے کی آوازیں سن کر وہیں دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آندھی اور طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اس کے باپ کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا تو کسی انجانے سے خیال سے کوثر کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ بھاگ کر سہیل منصور کے کمرے میں پہنچی تو اسے بھرا ہوا پستول ہاتھ میں لیے دیکھا۔ جسے وہ کنپٹی پر لگا رہا تھا۔ اور بس کوثر صرف چیخی ہی تھی۔

اور سلوط کے دل کو اس چیخ سے کچھ ایسا دھچکا لگا تھا کہ وہ دہل اٹھی تھی۔ وہ جس آگ بگولا سی کیفیت میں اس کے کمرے سے نکلا تھا۔ اس پر اندر ہی اندر وہ ہول کر رہ گئی تھی۔ اس پر جب کوثر کے چیخنے کی آواز آئی۔

"نہیں نہیں بھائی جان خدا کے لیے نہیں۔" تو وہ دو پٹہ ایک طرف پھینک کر بری طرح دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ننگے پاؤں باہر بھاگی۔ کوثر کی آواز اب بھی اسے آرہی تھی۔ اس نے بھاگ کر سارے کمرے جھانک ڈالے۔ آخر سہیل منصور کے کمرے میں اسے کوثر اور اسفند نظر آہی گئے۔ اسفند پستول کی نال کنپٹی پر لگائے کھڑا تھا۔ اور کوثر اچک اچک کر اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہ رہی تھی۔ یہ صورتِ حال بڑی خطرناک تھی۔ کیونکہ ٹریگر پر اگر ہلکا سا

بھی دباؤ بھی پڑ جاتا تو اسی وقت گولی چل جاتی۔ لہٰذا وہ بھی بھاگ کر اسفند سے پستول چھیننے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ کہ اس سے ہزار نفرت سہی لیکن اس کے دل کو اب بھی پیارا تھا۔

اس کی جان اسے اب بھی بہت عزیز تھی۔

مگر سلوط کو دیکھ کر تو گویا وہ آپے سے باہر ہی ہو گیا۔

کوثر کو پیچھے دھکیل کر اس نے اس کا ہاتھ بھی بڑی سختی سے جھٹک دیا اور نال کو کنپٹی سے لگا کر ٹریگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں نہیں اسفند! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیز اسفند! پہلے میری بات تو سنیے۔"

"نہیں نہیں۔ اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم تو مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ جاؤ ہٹو۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ گیٹ لاسٹ۔ گو۔" اس نے سلوط کو بھی پیچھے دھکیل دیا۔

"لیٹ می ڈائی (مجھے مرنے دو) میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ میرے سچے جذبے کو تہہ تیغ کر دیا ہے مغرور لڑکی تم نے میرے احساسات کو مجروح کر دیا ہے۔ اب مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ مر ہی جانا چاہیے۔" اس نے پھر پستول کو کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔

"نہیں نہیں، میں نے آپ کی توہین نہیں کی۔ میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔ کر بھی کیسے سکتی ہوں بھلا۔ میں تو آپ سے صرف خفا تھی۔ ایمان سے میں نے یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ سچ یاد بھی نہیں کہ کیا کہا تھا۔ اور آپ نے تو مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بڑے بڑے الزامات لگائے تھے مجھ پر۔ آپ یہ کیوں بھول گئے۔ اس کی وجہ سے ہی سخت بدظن ہو گئی تھی آپ سے۔ مگر اب تو نہیں ہوں۔ نہیں ہوں اسفند!" بات کے اختتام پر وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ تو اسفند نے مسکرا کر کوثر کی طرف دیکھا۔ اور کوثر نے منہ پھیر کر اپنی ہنسی چھپائی۔

"خیر، تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔ مگر اب تو تم مجھ سے کبھی نہیں روٹھو گی؟" اس نے پستول کو اس کی جگہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ اب تک جو زندگی گزاری ہے۔ اس میں زیادہ تر روتی ہی رہی ہوں۔ اب میں اپنے آنسو خشک کر لوں گی۔ اور آئندہ کبھی نہیں روؤں گی۔ کبھی نہیں۔" اس نے گریہ سے بوجھل بھاری اور موٹی آواز میں کہا۔ "اچھا۔" دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر اسفند نے اس کا آنچل اس کے سر پر ڈال دیا۔ اور کوثر ان کے ملن کی خوشی میں گلدان سے پھولوں کی پتیاں توڑ توڑ کر ان پر برسانے لگی۔

✿✿✿